ہندوستانی معیشت

ترقی اردو بیورو کی کتاب

ہندوستانی معیشت

مصنف

الک گھوش

مترجم

محمد خلیق

نیشنل بک ٹرسٹ۔ انڈیا

نئی دہلی

فروری 1974 (پھالگن 1895)

پہلا اردو ایڈیشن

قیمت ۲۵/۲۷

ORIGINAL TITLE : INDIAN ECONOMY

URDU TRANSLATION : HINDUSTANI MA-EE-SHAT

تقسیم کار

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

نئی دہلی 25، دہلی 6، بمبئی 3، علی گڑھ 2

ڈائریکٹر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا A-5 گرین پارک نئی دہلی 16 نے ترقی اردو بورڈ، وزارتِ تعلیم و سماجی بہبود کے لیے لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دریا گنج دہلی 6 میں چھپوا کر شائع کی۔

پیش لفظ

حکومتِ ہند نے اُردو زبان میں کتابیں تیار اور شایع کرنے کے لیے ترقیِ اُردو بورڈ قایم کیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یونیورسٹیوں، علمی انجمنوں، مُصنّفوں، مُترجموں، اُستادوں اور ناشروں کے اشتراک و تعاون سے اُردو میں سائنس کی کتابیں، بچوں کی ضرورت اور دل چسپی کی کتابیں اور یونیورسٹی کی کتابیں لکھوائی اور شایع کی جائیں اور ان موضوعات پر دوسری زبانوں کی مُستند کتابوں کے ترجمے شایع کیے جائیں۔ اس اسکیم کے تحت چھ سو سے زائد کتابیں تصنیف و تالیف کے مختلف مراحل میں ہیں۔

زیرِ نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو منسٹری آف ایجوکیشن اینڈ سوشل ویلفیر کے اہتمام میں نیشنل بُک ٹرسٹ، انڈیا کی وساطت سے شایع ہو رہی ہے۔ اُمّید کی جاتی ہے کہ یہ کتاب طالب علموں، اُستادوں اور اُن تمام حلقوں میں پسند کی جائے گی جنھیں ایک قومی زبان کی حیثیت سے اُردو کے فروغ اور ترقی میں دل چسپی ہے۔

(نور الحسن)

وزیرِ تعلیم، حکومتِ ہند

فہرست

حصّہ اوّل

باب ۱

کم ترقی یافتہ ملکوں کی راہ میں رکاوٹیں

عام طور سے اُن ملکوں کو کم ترقی یافتہ کہا جاتا ہے جن کا معیارِ زندگی کم ہو، جن کی معیشت کا انحصار زراعت پر ہو اور جہاں صنعت و حرفت بہت کم ہو۔ ایسے ملکوں میں "ترقی" کے علوم راستوں میں بہت سی رکاوٹیں ہوتی ہیں، مثلاً سرمائے کی قلت، ماہر کارکنوں کی کم یابی، پیداوار کی ناہمواری، زراعتی نظام کی فرسودگی، ملک گیر غریبی، مؤثر طلب کی کمی کی وجہ سے روزگار تلاش کرنے والوں کی افراط۔ مختصر یہ کہ سرمائے کی قلت، محنت اور انتظامی مہارت کی کمی اور تنظیم ایسی معیشت کے کم زور ترین پہلو ہیں۔ برطانوی ہندوستان میں پیداآوری کمی کے ذمّہ دار یہی بنیادی عناصر تھے۔

ایک طرف زراعتی نظام کی فرسودگی کی وجہ سے پیداآوری کم زور، پیداوار کم اور کھیتوں پر آبادی کی افراط ہوتی ہے اور اُن سے زیادہ سے زیادہ نچوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے، دوسری طرف صنعت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے جس کا سبب صنعتی مشینوں اور آلات کی قلت، ٹکنکل عملے کی کم یابی اور ایسے مہم جو لوگوں کا فقدان ہوتا ہے جو سرمایہ لگاکر جوکھم مول لینے پر آمادہ ہوں۔ اِس کے علاوہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ترقی کی کمی اور وسائل کا پورا نہ ہونا دونوں باتیں ایک ساتھ چلتی ہیں مثلاً برطانوی عہد میں مادّی اور انسانی دونوں وسائل کا پورا استعمال نہیں تھا جس کا ہندوستان کی معیشت پر گہرا اثر پڑا۔ اِس کے باوجود کہ زمین پر آبادی کا دباؤ بہت زیادہ تھا کھیت اِن معنوں میں پورے استعمال نہیں ہوتے تھے کہ ان کی پیدوار فی فصل اور فی ایکڑ بہت کم تھی۔ اس کا سبب پانی، کھاد، اچھے بیج کی کمی، کھیتی کے طریقوں کی خرابی اور زمین کی روز بہ روز گھٹتی ہوئی زرخیزی تھی۔ ہندوستانی زراعت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ظاہری روزگار میں بے روزگاری مضمر تھی۔ یعنی ایک معمولی کسان اگر دو فصلیں نہیں اُگاتا تھا تو سال کے صرف پانچ مہینے باکار رہتا تھا اور باقی حصّے میں

بے کار۔ اِس طرح صنعتی میدان میں آلات اور مشینوں کا پورا استعمال نہیں تھا۔ دورانِ جنگ کی مختصر مدّت کو چھوڑ کر باقی زمانے میں نہ مشینوں سے زائد وقت کام لیا جاتا اور نہ کارخانے ایک شفٹ (SHIFT) سے زیادہ چلتے۔

ترقی کی راہ میں بہت سی رُکاوٹیں ایسی ہیں جو غریبی کا سبب بھی ہیں اور نتیجہ بھی۔ درحقیقت غریبی ایک ایسا اٹوٹ چکر ہے جس کی وجہ سے کم ترقی یافتہ ملکوں کی معیشت کی نشوونما کی سطح بلند نہیں ہو پاتی۔ اس کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ مجموعی پیداوار اتنی کم ہوتی ہے کہ خرچ کی ضروریات کے بعد اتنا نہیں بچتا کہ اُس سے سرمائے میں کوئی نمایاں اضافہ ممکن ہو۔ اِن ملکوں میں حقیقی آمدنی کم ہونے کی وجہ سے بچت بھی کم ہوتی ہے۔ ساتھ ہی حقیقی آمدنی کی وجہ سرمائے کی قلت اور ناقص بازاری ہوتی ہے لیکن سرمائے کی قلت خود حقیقی آمدنی کی کمی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ برطانوی عہد میں صنعتی وسائل کی کمی اور کم پیداآوری، دونوں نمایاں تھیں۔ کم ترقی یافتہ ہونا ہندوستان کی امتیازی خصوصیت اور غریبی کے بُنیادی چکر کا محور تھی۔ دوسرے دائرے اس بنیادی چکر کو صرف مضبوط کرتے ہیں۔ حقیقی آمدنی کی کمی، طلب کی کمی کا سبب بھی ہوتی ہے اور نتیجہ بھی۔ حقیقی آمدنی کم ہونے کی وجہ سے اشیاء کی مانگ کم ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ کم لگایا جاتا ہے اور اس طرح یہ چکر پھر سرمائے کی قلت تک پہنچ جاتا ہے۔ برطانوی عہد میں ایک اور اٹوٹ چکر "ہمارے کم ترقی یافتہ وسائل کے گرد گھومتا ہے۔ ناخواندگی، مہارت کی کمی، ناواقفیت؛ عوامل کی بے حرکتی؛ اور برطانوی حکمرانوں کی بے توجہی کی وجہ سے ہمارے وسائل یا تو بے کار رہے یا اُن کا پورا پورا استعمال نہیں ہوا، یا غلط استعمال ہوا۔ چنانچہ غیر ترقی یافتہ وسائل ہماری ترقی کی کمی کا سبب اور نتیجہ دونوں بن گئے اور ہم ایک نیم جاگیردارانہ اور نیم جامد حالت میں پڑے رہے۔

ہندوستان برطانوی عہد میں ایک غیر ترقی یافتہ معیشت کا مثالی نمونہ

منصوبہ بندی شروع ہونے سے پہلے، خصوصاً برطانوی عہد میں ہندوستان میں ایک کم ترقی یافتہ معیشت کی بیشتر بنیادی خصوصیات نمایاں تھیں۔ برطانوی عہد کے ہندوستان کی کہانی مقید معاشی ترقی کی کہانی ہے۔ برطانوی حکومت کے آغاز کے وقت ہندوستانی معیشت کی رفتار کم ہو کر ایک نیم ساکت حالت اختیار کرنا شروع کر چکی تھی۔ انگریزوں سے پہلے دو بنیادی خصوصیات بہت واضح تھیں۔ آمدنی کی بیّن نابرابری اور دولت مند طبقے کی مقدارِ خرچ، خصوصاً تعیّشات و آسائشات پر۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی ممکن فاضل پیداوار جس کو مزید پیداوار کے لیے دوبارہ لگنا چاہیے تھا تاکہ معاشی ترقی میں سہولت ہو، وہ سب دولت مند

طبقہ یا تو عیش و عشرت پر صرف کرتا تھا یا سونے چاندی کے ذخیرے کی صورت میں بے مصرف رکھتا تھا۔ یہ رجحان جو کہ معاشی ترقی کے عمل کو روکتا ہے۔ انگریزوں کے آنے کے بعد بھی جاری رہا۔ یہ قوش ایس۔ کے۔ نرنجن بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے دوران ہندوستان میں قیمتی دھاتوں کے ذخیرے میں اضافہ ملک کی ظاہری بچت کے کل اضافے کا ۴۰٪ تھا (ظاہری بچت سے مراد بینک میں جمع رقم، سرکاری قرض، جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں کا بے باقی سرمایہ اور محفوظ رقم اور بیمہ کمپنیوں کے پریمیم کی آمدنی ہے)۔

صنعتی انقلاب کے بعد برطانیہ کو ہندوستان سے خصوصی دلچسپی اس لیے پیدا ہوگئی کہ ہندوستان برطانوی مال کی بہت بڑی منڈی بن سکتا تھا اور مغرب کو اناج اور خام مال فراہم کر سکتا تھا۔ ہندوستان کو برطانوی مال کی منڈی بنانے کے لیے انگریزوں نے ہندوستانی صنعت و حرفت کی بیخ کنی کی اور رفتہ رفتہ ہندوستان برطانیہ کا زرعی عقبی علاقہ بن کر رہ گیا۔ برطانیہ کو ہندوستان میں دو کام کرنے تھے، ایک تو ہندوستان کو اس طرح ترقی دینا تھا کہ وہ برطانیہ کی معیشت کا متمم اور جزو بن جائے، دوسرے ہندوستان میں برطانوی سیاسی اقتدار قائم کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ برطانیہ کو ہندوستانی معیشت کی تمام تر نشو و نما کے لیے کسی طلسمی فارمولے سے دلچسپی نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی عہد میں ہندوستان ایک نیم جامد حالت میں انحطاط کا مظہر بن بن گیا۔ یہ ایک ایسا ملک تھا جہاں اناج کی فصل قطعی غیر یقینی تھی، جہاں کی بے کراں آبادی خوفناک غربت میں مبتلا تھی، جہاں بچت کی شرح مایوس کن حد تک کم تھی۔ رسل و رسائل، تجارت، صنعت و حرفت میں جو تھوڑی بہت ترقی بھی ہوئی وہ روز افزوں آبادی کے دباؤ کے آگے قطعی ناکافی تھی۔

مختصر یہ کہ ہندوستان کی معاشرتی ترقی کا سبب بڑی حد تک سیاسی تھا۔ سیاسی محکومی اور معاشی محکومی کا چولی اور دامن کا ساتھ ہے۔ برطانوی اقتدار کے آغاز سے لے کر اس کے خاتمے تک ہندوستان کی حیثیت ایک برطانوی متمم کی تھی۔ چنانچہ برطانوی پالیسی کا یہ مقصد کبھی نہیں رہا کہ ہندوستان کو معاشی اعتبار سے ہموار اور مضبوط بنایا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معاشی ترقی کے ہر محرک کو دبا دیا گیا۔

برطانوی عہد زراعت :

برطانوی عہد کے آخر تیس برسوں میں حکومت کی ادھوری کوششوں کے باوجود کھیتی کے طریقوں میں تبدیلی نہیں آئی اور مشینوں کا استعمال نہ ہونے کے برابر رہا۔ پورے برطانوی عہد میں زراعت سرمائے کے لیے ترستی رہی۔ اس کی کئی وجہیں تھیں، مثلاً کاشتکاری کے سخت اور جابرانہ قوانین، زمین پر آبادی کے بڑھتے ہوئے دباؤ کی وجہ سے لگان میں زیادتی، سود کی شرح کی اونچائی، بارش کے غیر یقینی ہونے کی وجہ سے

ہندوستانی زراعت کی بے اعتباری، آبادی بڑھنے اور مقابلتاً غیر زرعی پیشوں کی کمی کی وجہ سے موروثی کھیتوں کو دن بہ دن چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہونا۔ غرض کہ ہندوستانی زراعت کی حیثیت ایک پست روزگار یا مشغلے کی تھی۔ زراعتی حلقے کی آمدنی غیر زراعتی حلقے کی آمدنی سے نسبتاً کم تھی اور زمین کی مجموعی پیداوار کل زرعی آبادی کے لیے معقول روزی فراہم کرنے کے لیے ناکافی تھی۔

برطانوی عہد میں آبادی کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے باوجود تمام تر توجہ وسیع کاشت پر ہی اور عمیق کاشت کی طرف کم توجہ کی گئی۔ چنانچہ برطانوی عہد کے آخری تیس برسوں میں پیداوار میں جو معمولی اضافہ ہوا وہ کھیتی کے طریقوں سے تبدیلی کی وجہ سے نہیں بلکہ آب پاشی اور نئی زمینوں پر کھیتی کرنے کی وجہ سے ہوا۔ ڈاکٹر بُرامینم (حکومت ہند کے معاشی مشیر۔ ۱۹۴۵) کے مطابق ۱۹۱۹ء اور ۱۹۳۹ء کی دو لڑائیوں کے درمیانی دور میں تجارتی فصلوں کی فی ایکڑ پیداوار میں کچھ اضافہ ہوا لیکن ہندوستان کی اہم غذائی فصل چاول کی فی ایکڑ پیداوار نمایاں حد تک گھٹ گئی۔ عمیق کاشت کا نہ ہونا اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ برطانوی ہندوستان کی کل زیر کاشت زمین کا صرف ۱۵٪ حصہ ایسا تھا جس پر دو فصلیں اگائی جاتی تھیں اگرچہ ملک کے بہت سے علاقے ایسے تھے جہاں اگر آب پاشی کا انتظام ہوتا تو دو فصلیں اُگ سکتی تھیں۔

برطانوی عہد میں صنعت :

صنعت و حرفت کی طرف جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۰ء سے پہلے ہندوستان میں کوئی کارخانہ نہیں تھا۔ اس کے بعد اقتصادی افق پر جدید کارخانوں کی کچھ جھلکیاں ضرور نظر آتی ہیں لیکن صرف اس لیے کہ دو بڑی لڑائیوں کی ضرورتوں کے پیش نظر ان کا قیام ناگزیر ہوگیا تھا۔ مگر اس جدید صنعتی سکٹر کا کوئی ایسا مربوط نظام نہیں تھا جس میں مختلف صنعتیں ایک دوسرے کی ممد ہوں اور ایک دوسرے کو خام مال اور منڈی فراہم کرتی ہوں۔ برطانوی عہد کے آخری تیس برسوں میں مزدوروں کی تعداد کے اعتبار سے سب سے اہم کپڑے کی صنعت تھی۔ انجینئرنگ کے میدان میں روزگار ریلوے ورک شاپ تک محدود تھا۔ بنیادی صنعتوں میں لوہے اور فولاد کے کام کی شروعات ہوئی تھی۔ مشینی آلات اور بھاری کیمیائی صنعتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔

برطانوی عہد میں ملکی راس المال کی کوئی فیصلہ کن حیثیت نہیں تھی۔ وجہ یہ تھی کہ زائد پیداوار (یعنی امکانی معاشی سرپلس) کھنچ کر دولت مند لوگوں کے پاس پہنچ جاتی تھی اور یہ لوگ اس دولت کو قیمتی پتھر اور دھاتوں جیسی دکھاوے کی چیزوں پر اور زمین کی قیمت بڑھانے پر صرف کرتے تھے۔ صنعتی راس المال کی کوتاہی کا ایک سبب یہ تھا کہ ہندوستان کے دولت مند طبقے کی تمام تر دلچسپی زمین، عمارتیں اور دوسری جائدادیں

خریدنے تک محدود تھیں۔ ایسے لوگ کم تھے جو باہمت اور مہم جو ہوں اور صنعتی کاموں میں روپیہ لگاکر جوکھم مول لینے پر آمادہ ہوں۔

برطانیہ کا تسلط صرف اُس سرمایہ کی حد تک نہیں تھا جو برطانیہ نے ہندوستان میں لگایا تھا۔ اس تسلط کی ایک شکل اور تھی جسے منیجنگ ایجنسی کہتے ہیں۔ منیجنگ ایجنٹ جو انگلستان سے ہندوستان آتے تھے اُن تجارتی کمپنیوں کے نمائندے ہوتے تھے جو مختلف شعبوں میں درآمد اور برآمد کا کاروبار کرتی تھیں۔ لیکن جلد ہی ان ایجنٹوں نے دیکھا کہ اس برصغیر میں کاروبار کے اور بہت سے مواقع ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بین الاقوامی تجربے کو نئی صنعتیں شروع کرنے میں استعمال کرنا شروع کیا۔ اس طرح ہر ایجنسی کے دائرۂ اختیار میں بہت سے متفرق اور غیر متعلق کاروبار بھی تھے، مثلاً کانیں، کارخانے، باغات، عام خدمات کی فراہمی (PUBLIC UTILITIES)، جہازرانی، بینک، زرخرید کی بلا شرکت ایجنسیاں وغیرہ۔ ان ایجنٹوں کے تحت جو کمپنیاں ہوتیں وہ اُن سے مختلف قسم کی فیس اور کمیشن خوب اینٹھتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی صنعت میں حقول تعلیم اور کارروائی کا ایک سبب منیجنگ ایجنسی سسٹم تھا جس کی وجہ سے ہندوستانی سرمایہ دار اپنا سرمایہ لگانے سے گریز کرتے تھے۔ جب ہندوستانی منتظمین (ENTREPRENEUR) نے ادھر توجہ بھی دی تو انھوں نے برطانوی منیجنگ ایجنٹوں کی نقل کی، دولوہے، فولاد، سیمنٹ، کاغذ سازی اور پٹسن جیسی صنعتوں میں دلچسپی لی۔ انگریز ہندوستان میں بھاری اور بنیادی صنعتیں نہیں چاہتے تھے کیوں کہ ان سے ملک میں ٹھوس سرمایے کی بنیاد پڑتی جس سے آگے چل کر ترقی کی رفتار تیز کرنے میں آسانی ہوتی۔ ہندوستانی تاجر بھی بھاری صنعتوں میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ یوں تو حکومت کی طرف سے ایسے کاموں کی نہ کوئی ہمت افزائی تھی ورنہ کوئی آسانی فراہم کی جاتی تھی۔

وہ یہ بھی ڈرتے تھے کہ چوں کہ انگریز بھاری صنعتوں میں سرمایہ نہیں لگاتے اس لیے یہ کام خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ پھر ایسی صنعتوں سے منافع حاصل ہونے کی توقع دیر میں تھی۔ اس لیے لوگ سرمایہ لگانے سے گریز کرتے تھے۔ غرض کہ برطانوی ہندوستان کا صنعتی ڈھانچہ بے ڈول اور ناہموار تھا۔ کپڑے کی صنعت اور باغات پر زیادہ زور تھا اور بھاری صنعتوں کو نظرانداز کیا جاتا تھا۔

کم ترقی یافتہ علاقے کی صحیح تعریف :-

کم ترقی یافتہ علاقے یا ملک کی تعریف بڑی مشکل ہے۔ ایسے علاقے کو پہچاننے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہم ملکوں کی فی کس آمدنی کا موازنہ کریں کیوں کہ اس سے اُن ملکوں کا معیار زندگی ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں

نیشنل ایڈ رائزری کونسل آن انٹرنیشنل مونیٹری اینڈ فائنانشل پرابلم نے ۵۳ ملکوں کی فی کس آمدنی کا مطالعہ کیا۔ ان ملکوں کی آبادی دنیا کی کل آبادی کا ۸۵٪ تھی۔ اس کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ان ۵۳ ملکوں کو تین یکساں گروپ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے گروپ میں وہ ملک ہیں جن کی معیشت پورے طور پر ترقی کر چکی ہے مثلاً امریکہ فرانس، برطانیہ۔ ان کی اوسط فی کس سالانہ آمدنی کا تخمینہ ایک ہزار روپے سے اوپر ہے۔ دوسرے گروپ میں جنوبی افریقہ، فن لینڈ، جاپان، آسٹریا، اٹلی اور یونان جیسے ملک ہیں جو نیم ترقی یافتہ ہیں۔ ان کی اوسط فی کس آمدنی ۵۰۰ سے لے کر ... اتک ہے۔ تیسرے گروپ میں ہندوستان، لاطینی امریکہ، برما، سیلون، فلپائن، چین اور انڈونیشیا ہیں جن کی اوسط ۵۰۰ یا ۵۰۰ سے کم ہے۔ اس تیسرے گروپ کے ملکوں کی فی کس آمدنی کم ہونے کی وجہ سے ان کا معیارِ زندگی نیچا ہے۔ انھیں کم ترقی کہا جاتا ہے۔ کم ترقی کے معنی یہ ہیں کہ فی کس حقیقی آمدنی کم ہونے کی وجہ سے یہ ملک معاشی اعتبار سے غریب ہیں۔ چنانچہ جس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ترقی کو اُن تبدیلیوں اور سرمائے کی لاگت کے اعتبار سے جانچا جائے جس سے فی کس حقیقی آمدنی کو امکانی سطح کے قریب تر لایا جاسکے۔

ہندوستان اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی فی کس آمدنی کا موازنہ بڑا ہمت شکن ہے۔ ہندوستان کی ۶۴ ڈالر سالانہ آمدنی کے مقابلے میں امریکہ کی فی کس آمدنی ۲۰۲۱، برطانیہ کی ۹۶۱ اور جاپان کی ۳۱۳ ڈالر ہے۔ یہ فرق سال بہ سال بڑھتا ہی جا رہا ہے اور اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ہم مستقبل میں اس کے قریب بھی پہنچ جائیں گے، آگے جانا تو درکنار۔ قدرے اُمید افزا یہ بات ضرور ہے کہ ہمارے پنج سالہ منصوبوں کے مطابق ۸۰-۱۹۷۹ء تک ہماری فی کس آمدنی ۱۰۰ ڈالر کے قریب ہو جائے گی۔ اگر ترقیاتی کوششوں میں ذرا بھی ڈھیل پڑی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ۹ برسوں میں فی کس آمدنی میں ۴ ڈالر سالانہ کے معمولی اضافے کی اُمید بھی شاید چھوڑنی پڑے۔

معاشی ترقی کی علامتیں:

ایک ملک معاشی ترقی کی کس منزل میں ہے یہ جانچنے کے لیے فی کس آمدنی کے علاوہ اور بھی طریقے ہیں۔ معاشی ترقی کی علامتوں میں سے ایک اہم علامت یہ ہے کہ کس ملک کو کتنی مشینی قوت حاصل ہے۔ ۱۹۳۹ء سے پہلے اُن کم ترقی یافتہ ملکوں میں جن کی فی کس سالانہ آمدنی ۱۰۰ یا سو ڈالر سے کم تھی اُن کی بشری قوت کے علاوہ فی کس فی روز ۰۱ء۲ ہارس پاور گھنٹے قوت دستیاب تھی۔ یہ قوت ہندوستان کے حصے میں صرف ایک ہارس پاور آتی تھی جب کہ ترقی یافتہ ملکوں میں ۲۶۰۷ ہارس پاور تھی، یعنی کم ترقی یافتہ ملکوں کی بیس گنی کے

قریب۔ امریکہ میں مشینی قوت کا اوسط ۳،۰۰۶ ہارس پاور گھنٹہ فی کس فی روز آتا ہے۔

زیرِ نظر ملکوں کی زراعتی پیداوار کے فرق سے بھی ان کی معاشی ترقی کی سطح ظاہر ہوتی ہے کہ اپنی معیشت کے ترقی پذیر سیکٹر ون کی آبادی کے لیے کافی غذا پیدا کرنے کے کس حد تک قابل ہے اس طرح کا موازنہ صرف سرسری خاکہ فراہم کرے گا کیوں کہ زمین، آب و ہوا اور علاقوں کی جغرافیائی حالت میں ہمیشہ فرق ہوگا لیکن ان موٹی علامتوں سے بھی متعلقہ ملکوں کی معاشی ترقی کی سطح کے فرق کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک ہندوستان میں گیہوں کی فی ایکڑ پیداوار گیارہ بُشل تھی جبکہ مغربی یورپ میں یہ پیداوار ۳۴ بُشل۔ اسی طرح جنوب مشرقی ہندوستان کی خاص غذا چاول کی پیداوار میں نمایاں فرق ہے۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک چاول کی فی ایکڑ پیداوار جاپان کی ۷۶ بُشل کے مقابلے میں ہندوستان میں ۲۶ بُشل تھی۔ جاپان کی اتنی زیادہ پیداوار زراعت کے جدید طریقوں کے استعمال کی وجہ سے تھی۔ اقوامِ متحدہ کے زراعتی اور غذائی ادارے نے تخمینہ لگایا ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں کے اوسط درجے کے کسان کی آمدنی کم ترقی یافتہ ملکوں کے کسانوں سے بارہ گنی ہے۔

معاشی ترقی کا مطالعہ کرنے والوں کے ذہن میں ایک معقول سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر اتنے زیادہ ملکوں کی آمدنی کیوں کم ہے اور معیارِ زندگی کیوں نیچا ہے۔ اس سوال کا کوئی سیدھا جواب اس لیے مشکل ہے کہ وہ قوتیں جو ایک ملک کی معاشی ترقی میں مانع ہوتی ہیں اُن کی ماہیت سیاسی، سماجی اور اقتصادی ہوتی ہے۔

سیاسی قوتیں:

برطانیہ، نیوزی لینڈ، فرانس اور دوسرے ملکوں نے جو نوآبادیاتی حکومتیں قائم کیں اُن سے سیاسی استحکام تو ضرور ہوا لیکن یہ استحکام وہ نہیں تھا جو جمہوری قوتوں کے عمل سے خود بخود پیدا ہوتا ہے، بلکہ یہ بیرونی دباؤ کا نتیجہ تھا۔ ایسے ملکوں میں تجارت اور کاروبار سب سے اہم پیشے تھے کیوں کہ ان سے فوری منافع حاصل ہوتا تھا لیکن بدقسمتی سے نہ حکومت نے اِس منافع سے فائدہ اُٹھایا اور نہ کمانے والوں نے اسے اُن کاموں پر صرف کیا جو مقامی لوگوں کی فلاح اور تعلیم سے متعلق تھے۔ عام طور سے دولت مندوں کا ایک چھوٹا سا منتخب طبقہ ہوتا تھا جو زمینوں اور جائدادوں کا مالک ہوتا تھا اور جس کے ہاتھوں میں کافی سیاسی اور اقتصادی طاقت تھی۔ باقی عوام آفاتِ ارضی و سماوی اور عام جہالت کے شکار تھے۔ انھیں ترقی کی آرزو کرنے کا بھی موقع نہیں حاصل تھا۔ یہ لوگ تو بس جی رہے تھے۔ ان کی حالت اتنی ناگفتہ بہ تھی کہ یہ زندگی کو بہت بے دردی اور سنگ دلی سے دیکھتے تھے۔ بیرونی حکومت کے خاتمے کے قریب جب قوم پرستی اور حُبّ الوطنی کے جذبے

نے ان کے دلوں کو گرمایا تب وہ اس قابل ہوئے کہ انھیں کچھ کرنے پر اکسایا جا سکے۔ ہندوستان اس نوع کا ایک مثالی نمونہ ہے۔

سماجی قوتیں :

زیادہ تر کم ترقی یافتہ ملکوں کا معاشرتی نظام ایسا تھا جس میں معاشی اور سماجی فلاح و بہبود کی سطح کا پست ہونا ناگزیر تھا۔ سماجی زینے کی بالائی منزل پر ایک چھوٹا دولت مند جابر اور بداطوار طبقہ تھا جس میں بیشتر زمیندار، تاجر اور سرکاری افسر تھے۔ سب سے نیچے کسان، کاریگر اور شہری مزدور تھے۔ یہ اونچا طبقہ دیہات اور شہر کے مزدوروں کی محنت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی ممتاز حیثیت برقرار رکھتا تھا چنانچہ نچلے طبقے کے لوگوں کو اپنی سماجی و معاشی حالت کو بہتر کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ زندہ رہنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ چھوٹے معمولی پیشوں سے چمٹے رہیں۔ پیٹ بھرنے کے لیے کام کرنا اور کام کرنے کے قابل ہونے کے لیے پیٹ بھرنا ضروری ہوتا ہے۔

ذات پات :

اس عام درجہ وار ترتیب کے علاوہ ہندوستان میں ذریم کا نظام بھی قائم ہے جس کو ذات پات کا نظام کہتے ہیں اور جو ہندو فرقے کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ہندوؤں کی چار بڑی ذاتیں ہیں: برہمن یعنی مذہبی رہنما، کھتری یعنی سپاہی اور منتظم، ویش یعنی تاجر اور کاروبار کرنے والے اور شودر یعنی جسمانی محنت کرنے والے۔ ملک کی معاشی ترقی کے لیے ذات پات کی تفریق بہت مضر ثابت ہوئی۔ اس نے سماجی حرکت پذیری پر پابندی لگا کر اور پیشوں کو موروثی بنا کر سرمائے اور محنت کی نقل و حرکت مشکل اور مہم جوئی کے شوق کو ٹھنڈا کر دیا۔

ایک ترقی پذیر معیشت کا مطالبہ ہوتا ہے کہ اس میں نیا سرمایہ مسلسل لگتا رہے۔ جس کا ... سرمایہ لگے گا معیشت کا متعلقہ حلقہ بڑھے گا۔ اس کی وجہ سے اس سنعت کی پیداوار کی ... بدلے گی۔ مخصوص وسائل، خصوصاً مزدوروں کو اس کا حق ملے گا ... وہ مانگ ... ایک پیشے سے دوسرے پیشے اور ایک علاقے سے دوسرے علاقے کو منتقل ہوسکیں ... پات کی تفریق نے مزدوروں کی نقل و حرکت پر پابندی لگا رکھی تھی جس کی وجہ سے طلب ... کا ردِ عمل بہت سست ہوتا تھا اور جوابًا معاشی ترقی کے عمل میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی ...

ایک ایسی سوسائٹی میں پیشہ ورانہ حرکت کے کوئی معنی نہیں ہوتے جس میں ذات پات کی تفریق ہو جہاں پیداوار کی تنظیم خاندانی بنیاد پر ہو اور جہاں پیشے خاندانی حیثیت سے وابستہ ہوں۔ ذات پات سماجی ... پنے ملے کرنے میں مانع تھی۔ اس کی وجہ سے نیم جامد سماج میں کچھ استحکام ضرور تھا لیکن از حد سماجی بے حرکتی کی وجہ سے معاشی ترقی کا عمل رُکتا تھا۔

مشترک خاندان :

ذات پات کی طرح مشترک خاندان کا نظام بھی ہندوستان کی معاشی ترقی میں مانع رہا۔ چوں کہ خاندان کے ہر فرد کو کھانے، کپڑے کی طرف سے اطمینان تھا اس لیے افراد کو زیادہ محنت کرنے کی فکر نہیں ... تی تھی۔ لوگ کاہلی کی طرف مائل تھے۔ زیادہ تر لوگ گھر پر پڑے رہتے تھے اور رقابت، رشک و حسد ... ور لڑائی جھگڑوں میں مبتلا رہتے تھے۔ اس کی وجہ سے لوگوں کی نقل پذیری کم ہوتی تھی، مہم جوئی کا شوق ... ہیں ہوتا تھا اور اس سب کا ترقی کے عمل پر بہت خراب اثر پڑتا تھا۔

آبادی کا دباؤ :

جنوبی مشرقی ایشیا کے زیادہ تر غیر ترقی یافتہ ملکوں میں جن میں ہندوستان بھی شامل ہے، زمین پر آبادی کا دباؤ زیادہ ہونے سے فی کس پیداوار کم ہے۔ اسی وجہ سے زائد پیداوار یعنی سرپلس ناممکن ہے ... سبب کہ اسی پر معیار زندگی کی اونچائی کا دار و مدار ہوتا ہے۔ سیلون، ہندوستان اور جاوا کے گنجان آبادی کے دیہی علاقوں میں قانون تقلیل حاصل (LAW OF DIMINISHING RETURN) کے عمل کے خلاف ایک مسلسل ... جہد جاری ہے۔ اقوام متحدہ کی دستور شماریات کے مطابق [illegible] میں فی کیلومیٹر آبادی کا دباؤ کا اوسط ... ستان میں ۱۴۲ اور سیلون میں ۱۵۶ تھا۔ اس کے علاوہ ان علاقوں میں پیدائش کی بڑھتی ہوئی ... کی وجہ سے سماجی اور معاشی ترقی کا کام حقیقتاً بڑا مشکل ہے۔ اونچا معیار زندگی صرف تب ممکن ہے ... شیاء کی رسد میں اضافہ ہو۔ سماجی اعتبار سے ہندوستان اور جنوبی ایشیا کے کم ترقی یافتہ ملکوں کا بنیادی ... ضافے کو روکنا اور ان رکاوٹوں کو دور کرنا ہے جو محنت کی نقل و حرکت میں مانع ہیں۔

... نے والی بات ہے کہ ایک کم ترقی یافتہ ملک میں فلاح و بہبود میں اگر اضافہ

کرنا ہے تو پیداوار اتنی ہونی چاہیے کہ بنیادی ضرورتیں پوری ہونے کے بعد کچھ بچ رہے۔ یہ فاضل مقدار جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی زیادہ اشیا اور خدمات سوسائٹی کو حاصل ہوں گی۔ کم ترقی یافتہ ملک میں اصل معاشی مسئلہ ناہموار اور ناکافی پیداوار کا ہے۔

یہ معلوم ہے کہ پیداوار میں اضافے سے معاشی ترقی میں آسانی ہوتی ہے لیکن اصل سوال یہ ہے کہ فی کس پیداوار کیسے بڑھائی جائے؟ معاشیات کے بنیادی اصول ہمیں بتاتے ہیں کہ پیداوار نتیجہ ہوتی ہے زمین پر محنت اور سرمائے کے عمل کا۔ معاشیات کا طالب علم یہ بھی جانتا ہے کہ انتہائی پیداوار اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب عاملین پیداوار بہترین تناسب میں مرتب ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک دی ہوئی زمین اور سرمائے کے ساتھ محنت کا تناسب بہت زیادہ ہے تو فی کس پیداوار کم ہوگی۔ ہندوستان اور جنوبی ایشیا کے کم ترقی یافتہ ملکوں کے ساتھ بالکل یہی صورت ہے اور اسی لیے یہ ملک کم آمدنی والے علاقوں میں شمار ہوتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ملکوں میں جن کی آبادی زیادہ ہے اور بڑھ رہی ہے، دوسرے عاملین پیداوار کے مقابلے میں محنت کی رسد زیادہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں محنت بہ حیثیت عامل دوسرے عاملین کے مقابلے میں افراط سے ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مجموعی پیداوار کا جو حصّہ محنت کو معاوضے کی شکل میں ملتا ہے وہ زیادہ مزدوروں میں تقسیم ہوتا ہے۔ چنانچہ فی مزدور اتنا کم ملتا ہے کہ معمولی زندگی بھی گزارنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ چوں کہ مزدور اور خود روزگار (SELF EMPLOYED) کسان اپنی ساری پیداوار صَرف کر ڈالتے ہیں اس لیے بچت کچھ بھی نہیں ہوتی جس سے سرمائے کی تخلیق ہو۔ دوسری طرف سوسائٹی کا ایک چھوٹا سا حصّہ جو زمینوں اور جائدادوں کا مالک ہوتا ہے بہت خوش حال ہوتا ہے کیوں کہ یہ کسانوں سے زیادہ سے زیادہ لگان وصول کر کے بڑی رقمیں حاصل کرتا ہے۔

غرض کہ اُن کم ترقی یافتہ ملکوں کے لیے جن کی آبادی زیادہ ہے اور بڑھ رہی ہے صرف ایک ہی راستہ ہے کہ یہ سیاسی اور سماجی رُکاوٹوں کو دور کریں اور محنت کی پیداآوری بڑھائیں تاکہ بچت ہو سکے اور اُس کے صحیح استعمال سے سرمائے کے اجتماع اور معاشی ترقی میں آسانی ہو۔ لیکن آگے چل کر جب ہم پچھڑے ملکوں کی معیشت کا تفصیلی جائزہ لیں گے تو بہت پیچیدہ مسائل سامنے آئیں گے اس لیے معاشی ترقی کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ ضروری ہے۔

باب ۲

معاشی ترقی کے مختلف پہلو

صنعت وحرفت شروع ہونے سے پہلے سازگار ماحول پیدا کرنا ضروری ہے۔ صرف بھاری صنعتیں قائم کرنے، بڑی بڑی مشینیں لگانے، زراعت کی مشینیں اور جدید طریقے استعمال کرنے اور پیداوار کے لیے نئی منڈیاں کھلنے سے ترقی کا تیز اور مستحکم عمل نہیں شروع ہو سکتا۔ اس کے لیے دوسری شرائط بھی پوری ہونی ضروری ہیں۔ مثلاً قرض کا معقول انتظام، منصفانہ ٹیکس، مستحکم کرنسی اور مناسب ضابطے اور قوانین اور عدالتی نظام بھی ہونا چاہیے۔

یہ سارے لواحق حکومت کے ہیں۔ اسی لیے ایک ایسی مضبوط حکومت کا ہونا ضروری ہے جو معاشی ترقی کی ان بنیادی شرائط کو پورا کر سکے۔

اس کے علاوہ ایک کم ترقی یافتہ ملک کی یہ بھی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ضروری خدمات کی بھی فراہمی کا انتظام کرے جو ایک جدید سوسائٹی میں درکار ہوتی ہیں۔ بیشتر پس ماندہ ملکوں میں رسل ورسائل ناکافی اور ابتدائی تعلیم کی سہولتیں ناپید ہیں۔ اچھی سڑکیں نہ ہونے کی وجہ سے منڈی کا پھیلاؤ بہت محدود ہوتا ہے۔ چنانچہ تقسیم کار کے ذریعے خصوصی مہارت حاصل ہونا مشکل ہے اور چونکہ مہارت اور تقسیم کار کے بغیر مزدوروں کی پیداآوری (PRODUCTIVITY) نہیں بڑھ سکتی اس لیے معاشی ترقی کی رفتار تیز نہیں کی جا سکتی۔ ناخواندہ عوام کو تعلیم دینا ضروری ہے تاکہ ان کے خیالات موثر طریقے سے بدلے جا سکیں اور یہ صنعتی ترقی میں اپنے رول کو بخوبی سمجھ سکیں۔ اسی لیے حکومت کا فرض ہے کہ وہ سڑکیں بنوائے، رسل ورسائل کا بہتر انتظام کرے اور بچوں اور بالغوں کے لیے ابتدائی تعلیم کی سہولتیں بڑے پیمانے پر مہیا کرے۔ معاشی ترقی حکومت کا بھی اتنا ہی کام ہے جتنا کہ سرمایہ داروں کا، خصوصاً ایسے ملک میں جو سرمائے کی پیش قدمی نہ ہونے کی وجہ سے پچھڑا ہوا ہو۔ ہر کم ترقی یافتہ ملک میں یہ سیاسی شعور ہونا چاہیے کہ حکومت کو معاشی اور صنعتی ترقی میں اہم رول ادا کرنا ہے۔

بیشتر کم ترقی یافتہ ملکوں میں آمدنی اور پیداآوری کا معیار بہت پست ہے۔ اس لیے حال کی ضرورتوں اور مستقبل کی آسودگی کے درمیان جو خلا ہے اُس کو پُر کرنے کا کوئی راستہ نکالنا ضروری ہے۔ چھوٹے پیمانے پر اگر مسلسل ترقی ہوتی بھی رہے تو کارگر نہ ہوگی کیوں کہ ابتدائی ترقی کی کمی کو کسی طرح جلد از جلد پورا ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ کم ترقی یافتہ ملک ترقی کی دوڑ میں دیر سے شامل ہوئے ہیں اس لیے ان کے واسطے وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ انھیں وہ مواقع نہیں حاصل ہیں جو آج کے ترقی یافتہ ملکوں کو اُن کے ابتدائی زمانے میں حاصل تھے جب یہ پس ماندہ ملکوں کے ہجوم میں صنعتی جزیروں کی حیثیت رکھتے تھے اور ان پس ماندہ ملکوں میں اپنا مال کھپا سکتے تھے اور وہاں سے خام مال حاصل کر سکتے تھے۔ کم ترقی یافتہ ملک آج جس معاشی سطح سے اپنی ترقی کی ابتدا کر رہے ہیں وہ اس سطح سے بہت نیچی ہے جن سے آج کے ترقی یافتہ ملکوں نے اپنی ترقی شروع کی تھی۔ آبادی اور وسائل کا تناسب بھی بہت ناموافق ہے۔ آبادی بڑھنے کی رفتار نہایت خطرناک ہے۔ چنانچہ مزید وقت ضائع کیے بغیر جتنی جلدی اور جتنی تیزی سے عمل شروع ہو سکے اتنا ہی اچھا ہے۔ ہندوستان اور اُس جیسے دوسرے ملکوں کے لیے یہ بات اور بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے کیوں کہ آبادی کے تیز اضافے کے پیش نظر یہ اور بھی ضروری ہے کہ ترقی کا اور نئی صنعتوں کے قیام کا عمل تیزی سے شروع ہو۔

اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ حکومت آگے بڑھ کر ترقی کی مشینری کو حرکت میں لائے۔ آزادی کے بعد ہماری قومی حکومت نے ان بنیادی مسائل کو پوری اہمیت دی ہے اور اپریل ۱۹۵۱ء سے معاشی ترقی کے لیے مربوط ترقیاتی منصوبہ بندی شروع کی گئی ہے۔

ابتدائی تعلیم عام کرنے کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ حکومت ایسے تعلیمی پروگرام شروع کرے جس سے لوگوں کو مختلف پیشوں کی تربیت حاصل کرنے کی سہولت فراہم ہو مثلاً کاروباری انتظام، صحتِ عامہ، اور صنعتی و زراعتی پیداوار کے طریقے۔ حکومت کو دِق اور ملیریا جیسی عام بیماریوں کے دفاع اور صحتِ عامہ، صفائی اور رہائش کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے بھی مہم شروع کرنی چاہیے۔ ان سب باتوں سے مزدوروں کی پیداآوری بڑھانے میں مدد ملے گی جس سے نہ صرف زندگی کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوں گی بلکہ زائد صرفی اشیا (CONSUMPTION GOODS) اور بھاری مشینیں وغیرہ پیدا ہوں گی جو معاشی ترقی کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

ترقیاتی عمل کے دوران قابلِ لحاظ معاشی اُمور

کم ترقی یافتہ ملکوں میں ترقیاتی عمل سے متعلق جن معاشی عناصر کی طرف دھیان دینا ہوتا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ زراعتی پیداوار میں اضافہ

۲۔ حکومت کی طرف سے بہت سی معاشی اور سماجی خدمات کا وجود میں آنا

۳۔ صنعت وحرفت کی ضروریات

(۱) زراعتی پیداوار: تقریباً تمام کم ترقی یافتہ ملک ماہیت کے اعتبار سے زرعی ہیں۔ ہندوستان اور اس جیسے دوسرے ملکوں میں بیشتر لوگ زمین سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ زندہ رہنے کے لیے کھیتوں پر کام کرنا ضروری ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ روزگار کے کوئی دوسرے مواقع نہیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ خاندان کے سارے لوگ چھوٹے سے موروثی قطعۂ زمین سے چپٹے رہتے ہیں اور جو کچھ پیدا کرتے ہیں سب کا سب کھا جاتے ہیں۔ اِن حالات میں معاشی ترقی کا عمل شروع کرنے کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ صنعتوں اور غیر زرعی کاموں کو ترقی دے کر روزگار کے نئے مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ دیہی مزدوروں کی فاضل تعداد کو کھیتی باڑی سے الگ کیا جا سکے۔ دوسرا لیکن زیادہ اہم کام یہ ہے کہ زراعتی حلقے کے ترقیاتی امکانات کو بڑھایا جائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے پروگرام شروع کیے جائیں اور ایسے طریقے اپنائے جائیں جن سے زراعتی حلقے کے باقی ماندہ کسانوں کی پیداآوری بڑھے۔

پیداوار نہ صرف اتنی بڑھنی چاہیے جس سے کسانوں کو ایک معقول معیارِ زندگی حاصل ہو سکے بلکہ اتنی کہ معیشت کے غیر زراعتی حلقے کی غذائی اور خام مال کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ زمین کی نسبت سے محنت کی پیداآوری بڑھانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ زراعتی مشینیں استعمال کی جائیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں کھیت اتنے چھوٹے ہیں کہ اِن میں مشینوں کا استعمال تو درکنار، جانوروں ہی کا پورا استعمال کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں زراعتی مشینیں استعمال کرنے سے پہلے کھیتوں کی چک بندی ضروری ہے۔

زراعتی تحقیق: اگر زراعت کے تجرباتی پروگرام بڑے پیمانے پر دیہاتوں میں شروع کیے جائیں تو زراعت کی نئی تنظیم کے ابتدائی دور میں کارآمد نتیجے حاصل ہو سکتے ہیں۔ بیجوں کے مناسب انتخاب، فصلوں کی ترتیب فصلی بیماریوں کی روک تھام اور کاشت کے بہتر طریقوں سے پیداوار کافی بڑھائی جا سکتی ہے۔ تجرباتی فارموں سے جو نتائج برآمد ہوں اُن سے فائدہ اُٹھانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کسانوں کو بڑی بڑی مشینیں مہیا کرنے کے بجائے، حکومت تربیت یافتہ کارکنوں کی مدد سے کسانوں کی زراعتی تعلیم کا انتظام کرے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ لاطینی امریکہ کے بعض ملکوں میں مشینوں کے استعمال کے بغیر فصلوں کی پیداوار میں ۱۰٪ سے ۵۰٪ تک کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ اضافہ آب پاشی کے انتظام، بہتر دستی آلات، بونے کے بہتر طریقوں، دوہری فصلوں اور تسلسل وعمل اور تقسیم کی وسیع تر سہولتوں کے ذریعے ممکن ہوا۔

یہ درست ہے کہ زراعتی تعلیم کے ایک جامع نظام اور تجرباتی فارموں کے قیام کا مطلب یہ ہوگا کہ حکومت کو بہت دنوں تک کافی خرچ کرنا پڑے گا لیکن یہ خرچ یقیناً بارآور ہوگا کیوں کہ آگے چل کر اس کی وجہ سے فی ایکڑ پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ کم ترقی یافتہ ملکوں کی معاشی ترقی کی تدابیر کے بارے میں اقوام متحدہ کی رپورٹ میں اس پہلو کو پوری اہمیت دی گئی ہے۔ تخمینہ ہے کہ ان آسان طریقوں سے جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اگلے بیس برسوں میں زراعتی پیداوار ۵۰٪ بڑھائی جا سکتی ہے۔

ہندوستان میں اس کام کی معمولی ابتدا برطانوی عہد میں امپیریل کونسل آف ایگری کلچرل ریسرچ کے قیام سے ہوئی تھی۔ یہ کونسل ۱۹۲۹ء میں رائل کمیشن کی رپورٹ کے بعد قائم کی گئی تھی۔ پوسا کے امپیریل ایگری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے بھی اس سلسلے میں قیمتی کام انجام دیا۔ لیکن اُس زمانے میں بنیادی خرابی یہ تھی کہ ان تجربوں اور تحقیقوں کے نتائج کسانوں تک پہنچانے کی کوئی ایجنسی نہیں تھی۔

ہندوستان کے تین پانچ سالہ منصوبوں کے دوران کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروجکٹ، کوآپریٹیو فارمنگ اور رورل اکسٹنشن سروس پر خاص زور دیے جانے کی وجہ سے اس بات کی کوشش کی گئی کہ تحقیق اور تجربوں کے نتائج کسانوں تک پہنچائے جائیں۔ ہندوستان کے تیسرے پلان میں زراعتی تحقیق کے لیے ۱۸ کروڑ روپے رکھے گئے تھے (۱۱ کروڑ مرکز میں اور ۷ کروڑ صوبوں میں)۔ لیکن بدقسمتی سے اس رقم کا موثر استعمال نہیں ہوا جس کی وجہ سے مکمل اور وسیع زراعتی انقلاب میں تاخیر ہوئی۔

لگان داری کے قوانین: بیشتر کم ترقی یافتہ ملکوں میں لگان داری کا نظام کچھ ایسا ہے کہ زمین دار اپنی رعایا پر بے حد ظلم کرتے اور ان کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایسے ملکوں کے لیے ضروری ہے کہ وہاں ایسے قوانین بنائے جائیں جن سے کسانوں کو زمین داروں کی دست درازیوں سے نجات ملے اور ان کا حقِ ملکیت اُس وقت تک محفوظ رہے جب تک وہ اپنے کھیتوں پر محنت اور مستعدی سے کام کرتے رہیں۔ لیکن ایسی مثالیں بھی ہیں جہاں لگان داری کے معمولی قوانین کافی نہیں ہیں اور وہاں زیادہ سخت اصلاحات کی ضرورت ہے۔ پس ماندہ علاقوں میں زمین داروں نے کسانوں سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کے لیے ایسی ترکیبیں نکالی ہیں کہ پیداوار میں اگر کچھ اضافہ ہو بھی تو وہ زمین داروں کو مل جائے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ کاشت کار کھیتی کے بہتر طریقے استعمال کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتے اور اسی لیے کم پیداآوری، کم آمدنی اور دائمی غربت کے شکار

رہتے ہیں۔

چین میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ تیز رفتار ترقی کا عمل شروع کرنے سے پہلے منصوبہ بندی کے ذریعے بنیادی اصلاحات کی جائیں۔ برطانوی عہد میں ہندوستان کے صوبوں میں کئی قسم کے قوانینِ آراضی تھے جن سے خود کاشت کرنے والے کسانوں کے مفاد کا تحفظ ہو سکے۔ لیکن یہ پورے طور پر موثر نہیں ثابت ہوئے کیوں کہ ان کے حصار میں بے زمین مزدوروں اور بچولے کسانوں (INTERMEDIARY CULTIVATOR) کی کثیر تعداد نہیں آتی تھی۔ اِس کے علاوہ زمین دار اِن قوانین کی براہِ راست زد میں نہیں آتے تھے جب کہ یہی لوگ کسانوں کے بڑھتے ہوئے افلاس کے ذمّہ دار تھے۔ برطانوی عہد میں بہت سے ماہرینِ معاشیات نے، جن میں ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی بھی ہیں، اِس بات کی طرف اشارہ کیا کہ قانونِ آراضی جیسے نرم اقدام ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے کافی نہیں تھے جن کی تہہ میں غیر ذمّہ دار اور غیر حاضر جاگیرداری تھی۔ اِس بات پر زور دیا گیا کہ اگر زراعت کی ازسرِ نو تنظیم کرنی ہے اور اُس کو مستحکم بنانا ہے تو پہلا کام یہ ہے کہ طفیلی زمین داروں (PARASITICAL LANDLORDS) کو مکمل طور سے ختم کیا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے برطانوی عہد میں اس قسم کی اصلاحات نہیں کی گئیں۔ صرف آزادی کے بعد حکومت نے اِس بنیادی مسئلے کی طرف توجہ دینا شروع کیا۔ بہار، اُڑیسہ، مغربی بنگال، اُتر پردیش اور مدھیہ پردیش میں بچولوں کو ختم کرنے کے واضح اقدام کیے گیے اور قوانین مرتب ہوئے۔ یاد رہے کہ زمین داری کی ابتدا اٹھارہویں صدی میں اُس وقت ہوئی جب لگان وصول کرنے والوں کو موروثی حقِ ملکیت دے دیا گیا اور یہ لوگ اس شرط پر زمین کے مالک بنا دیے گئے کہ یہ حکومت کو مقررہ مال گزاری براہِ راست ادا کرتے رہیں گے۔ جلد ہی اِن زمین داروں کا ایک طاقت ور طبقہ بن گیا۔ انھیں میں سے بہت سے ساہوکار اور مہاجن بن گئے۔

مثلاً اُتر پردیش کا ۱۹۵۱ء کا خاتمۂ زمین داری اور اصلاح آراضی کا قانون ایک سادہ اور یکساں قسم کا قانون ہے جو کسانوں کی ملکیت کو خود مختار دیہی برادری کی ترقی سے منسلک کرتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل میں ہندوستان کا دیہی خاکہ مشترک کوآپریٹیو فارمنگ پر مبنی ہوگا جس میں زمینوں کو مشترک کھیتی کے لیے یکجا کر دیا جائے گا لیکن کسان کی ملکیت باقی رہے گی اور اسے زمین کے تناسب سے پیداوار کا حصّہ ملتا رہے گا۔ اس کے علاوہ جو کسان اِن مشترک کھیتوں میں کام کریں گے اُنھیں کام کے تناسب سے پیداوار کا حصّہ ملے گا چاہے وہ زمین کے مالک ہوں یا نہ ہوں۔

دیہی قرض: زراعتی پیداوار خاصی بڑھانے کے لیے بہت سی صورتوں میں شاید زمینی اصلاحات کافی نہ ہوں۔ ایک پس ماندہ ملک میں جہاں چھوٹے کسان زیادہ قرض لیتے ہوں وہاں قرض کا بوجھ کم کرنے

مد آسان قرض کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے حکومت کو اقدام کرنے چاہئیں۔ مہاجنوں پر قانونی پابندی لگانے سے مدد ضرور ملے گی لیکن اِس سے دیہی قرض کا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ دیہی بینکوں کی توسیع، حکومت کی طرف سے دیہی قرض کے اداروں کا قیام اور فصلوں کے بیمے جیسے اقدام سے اِس مسئلے کے حل کرنے میں مدد ملے گی۔ زراعتی کواپریٹیو سے جو کسانوں کو بیج، کھاد اور آلات فراہم کریں، مقروض کسانوں کی مصیبتیں یقیناً کم ہوں گی۔ خرید و فروخت کی انجمنیں بھی مفید ہوں گی اِس لیے حکومت کو یہ انجمنیں بھی قائم کرنی چاہئیں۔ یہ اقدامات کم ترقی یافتہ ملکوں میں خاص طور سے کیے جانے چاہئیں جو زراعت کی نئی تنظیم اور ترقی کی آرزومند ہیں اور اِن اقدام کو صنعتی ترقی کی طرف پہلا قدم سمجھتی ہیں۔

ہندوستان میں ترقیاتی منصوبہ بندی کے ساتھ متعدد دیہی کواپریٹیو زکی سرکردگی میں دیہی قرض کی ایک جامع اسکیم کا اعلان کیا گیا۔ بہت سی کواپریٹیو سوسائٹیاں قرضوں کی تقسیم میں کچھ کامیاب بھی ہوئیں لیکن بڑے ادارے ہونے کی وجہ سے سرکاری مداخلت سے آزاد نہ رہ سکیں۔ اسی لیے اب برسرِاقتدار پارٹی ایک ایسی اسکیم پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے جس کے تحت ہر گاؤں میں ایک کواپریٹیو سوسائٹی ہوگی۔ توقع ہے کہ یہ یک دیہی کواپریٹیو سوسائٹیاں (ONE-VILLAGE CO-OPERATIVES) ملٹی پرپز سوسائٹیوں کی بنیاد بنیں گی اور مشترک کواپریٹیو فارمنگ کے لیے زمین ہموار کریں گی۔

برطانوی عہد میں زیادہ تر کسان قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے۔ گاؤں کا مہاجن کسانوں کی دائمی غریبی اور ناگہانی ضرورتوں سے فائدہ اُٹھا کر روپے سے روپیہ پیدا کرتا تھا۔ صوبائی حکومتوں نے ساہوکاری اور قرض کی تخفیف کے سلسلے میں جو قوانین بنائے وہ مشکل سے مسئلے کی اوپری سطح کو چھو پاتے تھے۔ یہ اقدام نہیں کیے گئے جن سے گاؤں کے فائدے کے لیے موثر کواپریٹیو تحریک کا آغاز ہوتا۔ زراعتی قرض اور فصلوں کے بیمے کے لیے مخصوص ادارے قائم کیے گئے۔ صرف آزادی کے بعد سے، خاص کر منصوبہ بندی شروع ہونے کے ساتھ حکومت نے کسانوں کو قرض کی بہتر سہولتیں فراہم کرنے اور دیہی کواپریٹیو کا جامع نظام قائم کرنے کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی۔ امپیریل بینک کو قومی ملکیت میں لے آیا گیا۔ اب اس کا نام اسٹیٹ بینک ہے۔ اِس بینک کے بنیادی کاموں میں سے ایک کام دیہی قرض کی سہولتیں بہم پہنچانا ہے۔ پانچ سالہ پلان ([illegible]) کے دوران ریزرو بینک نے نیشنل ایگری کلچرل کریڈٹ فنڈ (NATIONAL AGRICULTURAL CREDIT FUND) اور نیشنل کواپریٹیو ڈیولپمنٹ فنڈ قائم کیا۔ اس کے علاوہ کواپریٹیو فارمنگ کو منصوبے کے زراعتی تنظیم کے حلقے میں اہم جگہ دی گئی۔ ریزرو بینک نے زراعتی ترقی کے لیے درمیانی اور لمبی مدت کے قرضوں کے لیے ایک ایگری کلچرل ری فائنانس کارپوریشن AGRICULTURAL-REFINANCE

CORPORATION قائم کیا جس نے یکم جولائی ۱۹۶۳ء سے کام کرنا شروع کر دیا۔

ایک کم ترقی یافتہ ملک کی زراعت کو مستحکم کرنے اور اُس کو از سرِ نو تنظیم دینے کے لیے جن اقدام پر بحث کی گئی ہے وہ زراعت میں انقلاب پیدا کر دیں گے اور دیہی مزدوروں کی بہت تعداد فاضل ہو جائے گی۔ یہ فاضل مزدور صنعتی کارخانوں اور دوسری معاشی سرگرمیوں میں کام آئیں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زراعتی انقلاب چاہے کسی منصوبے کے تحت ہو یا بلا منصوبہ، صنعتی ترقی کی پہلی شرط ہے۔ لیکن زراعتی ترقی کو سہارا دینے اور صنعتوں کو شروع کرنے کے لیے سماجی سرمائے کی تخلیق ضروری ہے۔ مثلاً ریلیں، رسل و رسائل کا انتظام، بندرگاہوں کی سہولت، آب پاشی کے پروجیکٹ، اور بجلی کی پیداوار میں اضافہ۔ جب تک سماجی سرمائے کی ضرورت پوری نہیں ہوتی اُس وقت تک پس ماندہ ملکوں کی صنعتی ترقی ناممکن ہے۔ اِس لیے آئیے اب سماجی سرمائے کے مسائل کی طرف توجہ کریں۔

(۲) سماجی سرمائے کی ضرورت: سماجی سرمائے سے مراد وہ سماجی اور معاشی خدمات ہیں جن کی بنیادی اہمیت ہے۔ مثلاً تعلیم، صحت کی سہولتیں، رسل و رسائل کا انتظام، اور بجلی کے کارخانے وغیرہ۔ بیشتر کم ترقی یافتہ ملکوں میں سکولوں، اسپتالوں، سڑکوں، تحقیقی سہولتوں اور رفاہِ عامّہ کی سخت کمی ہے جس کی وجہ سے زراعتی ترقی میں رُکاوٹیں ہوتی ہیں اور صنعتی ترقی میں تاخیر ہوتی ہے۔ اِن کاموں کے لیے بہت سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے اور کافی عرصے تک ان سے منافع نہیں ہوتا۔ نقل و حمل کا انتظام، اور آب پاشی اور بجلی ایسے کام ہیں جن میں عموماً نجی سرمایہ نہیں لگتا کیوں کہ نجی سرمایہ دار یہ چاہتے ہیں کہ اُن کے سرمائے سے جلد از جلد اور زیادہ سے زیادہ منافع حاصل ہو۔ لیکن سماجی سرمائے کی ضرورت پر زور دیے بغیر معاشی ترقی کی رفتار نہیں تیز کی جا سکتی۔ چنانچہ سوال اُٹھتا ہے کہ یہ سہولتیں کون فراہم کرے اور اُس کے لیے روپیہ کہاں سے آئے۔

غالباً بیشتر پس ماندہ ملکوں میں صنعتی ترقی شروع ہونے سے پہلے حکومتوں ہی کو سماجی سرمایہ فراہم کرنا ہوگا۔ اس کی کئی وجہیں ہیں: اوّل تو تعلیمی سہولتیں، آب پاشی اور سیلاب کی روک تھام کے پروجیکٹ، سڑکیں، زراعتی تحقیق کے پروگرام، اسپتال اور ایسی ہی دوسری سہولتیں فراہم کرنا حکومت کا کام ہے کیوں کہ موجودہ زمانے میں ہر حکومت کا یہ پہلا فرض ہے کہ عوام کی فلاح و بہبود میں اضافہ کرے۔ پس ماندہ ممالک کی بیشتر حکومتیں جو عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں ہیں اگر اپنے ملک کو ایک خوش حال ریاست بنانے کی خواہش مند ہیں تو انھیں لازمی سماجی سرمائے کی ضرورت پوری کرنی چاہیے۔

دوسری بات یہ کہ حکومت کو اسکولوں، اسپتالوں اور تحقیقاتی مراکز کے علاوہ دوسری سہولتیں بھی

فراہم کرنی چاہئیں مثلاً گودام، ریلیں، بجلی گھر وغیرہ کیوں کہ یہ تیز معاشی ترقی کے دروازے کھولتی ہیں۔ حکومت کو یہ سہولتیں اس لیے اور بھی فراہم کرنا چاہیے کیوں کہ سرمایہ داروں کے پاس نہ کافی سرمایہ ہے اور نہ ہم جوئی کا اتنا شوق ہے کہ وہ اس بوجھ کو اُٹھا سکیں اور سماجی سرمائے کی ضرورت پوری کرسکیں۔ تیسرے یہ کہ ان کم ترقی یافتہ ملکوں کی فضا بیرونی سرمائے کے لیے سازگار نہیں ہے۔ مبادلہ جاتی پابندیاں اور قومی ملکیت میں لانے کا ڈر بیرونی سرمائے کے لیے ہوّا بن گیا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ غیر ملکی سرمایہ دار اُس وقت تک کم ترقی یافتہ ملک میں سرمایہ نہیں لگائیں گے جب تک انھیں اچھے منافع کی توقع نہ ہو اور حکومت کی طرف سے اس کی پوری ضمانت نہ ہو۔ غرض کہ اِن ملکوں کی حکومتوں کو ایسے کاموں میں روپیہ لگانے کے لیے تیار رہنا چاہیے جو سماجی سرمائے کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کریں۔ ساتھ ہی انھیں نجی سرمائے کی بھی بالواسطہ اور بلا واسطہ مدد کرنی چاہیے۔

ممکن ہے کہ حکومت کے پاس اِن کاموں کے لیے کافی ریزرو فنڈ نہ ہوں لیکن حکومت کو خارجی اور داخلی قرض ملنے کے زیادہ مواقع ہیں۔ اگر یہ بھی ناکافی ہو تو نئے نوٹ چھاپ کر تھوڑا سا مالیاتی خسارہ کرنے میں کوئی حرج نہیں کیوں کہ اُڑان بھرنے کے زمانے میں (TAKE OFF STAGE) اِس طرح کے دلیرانہ اقدام معاشی ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔

برطانوی عہد میں تعلیم اور صحت کی سہولتوں، سڑکوں اور بندرگاہوں اور رسل و رسائل کی ترقی کا مقصد انتظامی آسانی کے لیے ملک کے مختلف حصّوں کو جوڑنا تھا۔ سماجی سرمائے کی ضرورت پورا کرنے کا یہ مقصد کبھی نہیں تھا کہ عوام کی فلاح و بہبود میں اضافے کے لیے معاشی ترقی کا تیز عمل شروع کیا جائے۔ ۱۹۵۱ء سے ہندوستان میں منصوبہ بندی کا آغاز ہوا اور اس کے ساتھ ہی تیز معاشی ترقی شروع ہوئی۔ منصوبوں میں نہ صرف تعلیم، صحت اور نقل و حمل کی سہولتوں کی توسیع بلکہ بجلی اور آب پاشی کے پروجکٹ بھی شامل ہیں۔ سماجی سرمائے کی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی وجہ سے سرمایہ لگانے کے نئے اور وسیع مواقع پیدا ہو رہے ہیں اور اِس طرح صنعتوں کے قیام میں آسانی ہو رہی ہے۔

(۳) **صنعتی ترقی**:۔ زراعتی پیداوار میں اضافے اور سماجی سرمائے کی کم سے کم ضروریات کے اہتمام کے بعد بھی صنعتی ترقی کا دارومدار دوسرے اہم عناصر پر ہوتا ہے۔

قدرتی وسائل:۔ ان میں قدرتی وسائل کی دست یابی سب سے زیادہ اہم ہے۔ جس کم ترقی یافتہ ملک کے پاس کوئلہ، لوہا اور ایسے ہی دوسرے وسائل کافی مقدار میں موجود ہوتے ہیں اُن کو اُن ملکوں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے جن کے پاس ان بنیادی وسائل کی کمی ہوتی ہے۔ یہ ہندوستان کی خوش قسمتی

ہے کہ اس کے پاس یہ وسائل کافی مقدار میں موجود ہیں۔ برطانوی عہد میں کوئلہ، لوہا اور تیل نکالا جاتا تھا لیکن اس کا استعمال کسی ایسے جامع صنعتی پروگرام کے لیے نہیں کیا جاتا تھا جس میں بنیادی اور بھاری صنعتوں پر خاص زور دیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ ابرق، مینگنیز، المنائٹ اور مونازائٹ جیسی معدنیات برطانوی کارخانوں کو برآمد کر دی جاتی تھیں۔ المنائٹ ٹیٹے نیم (TITANIUM) کا ماخذ ہے جو رنگ سازی میں کام آتا ہے اور مونازائٹ سے تھوریم نکلتا ہے جو ایٹمی توانائی کا ماخذ ہے۔

آزادی کے بعد سے حکومت نے معدنیاتی ترقی کی پالیسی کو موثر طریقے سے ملک کی معاشی ترقی سے منسلک کیا ہے۔ پہلے پلان کے تحت ملک کے معدنیاتی ذخیرے کا مقداری اور ماہیتی جائزہ لیا گیا۔ نیشنل میٹالرجیکل لیبارٹری اور فیول ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جیسے مخصوص تحقیقاتی ادارے قائم کیے گئے۔ دوسرے پلان میں حکومت نے معدنی ترقی کا پروگرام اور بڑھایا۔ دوسرے پلان کے دوران سرکاری سکٹر میں کوئلے کی نئی کانیں شروع کی گئیں۔ پٹرول کی رسد بڑھانے کے لیے حکومت نے مغربی بنگال میں اسٹینڈرڈ ویکیوم آئل کمپنی کے ساتھ اور آسام میں آسام آئل کمپنی کے ساتھ مل کر تیل نکالنے کا کام شروع کیا۔ تیسرے پلان میں یہ سرگرمیاں شد و مد کے ساتھ جاری ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چوتھے اور اس سے آگے کے منصوبوں میں ایسے اقدام کیے جائیں گے جن سے یہ اہم معدنیات کم سے کم کاموں میں موثر طریقے سے استعمال ہو سکیں۔

انسانی وسائل : صنعتی ترقی کا انحصار قدرتی وسائل کے ساتھ انسانی وسائل پر بھی ہوتا ہے۔ صنعتی ترقی کے لیے قدرتی وسائل کی ترقی ضروری ہوتی ہے اور قدرتی وسائل کی ترقی بار آور انسانی وسائل کی قسم پر منحصر ہوتی ہے۔ کسی ملک کے عوام معاشی اعتبار سے جتنے پس ماندہ ہوں گے اتنے ہی کم ترقی یافتہ اس کے قدرتی وسائل ہوں گے۔ اس کے برعکس جس ملک کے مزدور مستعد ہوں گے اور مشینوں سے دل چسپی رکھتے ہوں گے وہ ملک اپنے قدرتی وسائل کے ذخیروں کو زیادہ موثر طریقے سے استعمال کر سکے گا۔ ہندوستان جیسے کم ترقی یافتہ ملک میں اگرچہ قدرتی وسائل کافی ہیں لیکن ٹکنیکی ماہروں اور کان کنی کی مشینوں کی ابتدائی قلت کی وجہ سے ان وسائل کو جلد اور پورے طور سے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا حل یہ ہے کہ ٹکنیکل ادارے بڑی تعداد میں قائم کیے جائیں جس سے آگے چل کر ماہر کان کنوں کی تعداد بڑھے۔ درمیانی مدت کے لیے ایسے ماہروں کو دوسرے صنعتی ممالک سے لانے کا انتظام ہونا چاہیے۔ اسی لیے ہندوستان اپنی معدنیات کو کام میں لانے اور بھاری صنعتوں کو ترقی دینے کے لیے برطانوی، جرمنی اور روسی ماہروں سے مدد لینے کی کوشش کر رہا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان کا سماجی اور معاشی ڈھانچہ اب بھی مغرب کے صنعتی ممالک سے بہت مختلف ہے۔ مغربی طریقوں اور ٹکنیک کو اگر مقامی حالات کے مطابق بنانا ہے اور انھیں معاشی ترقی کے عمل کو تیز کرنے کے لیے استعمال کرنا ہے اور ان میں رد و بدل کرنا اور انھیں نئی شکل دینا ضروری ہے تو مغربی طریقوں کی نقل سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیوں کہ ہمارے کارکنوں کو مہارت حاصل کرنے میں کافی وقت لگے گا۔ سرکاری اداروں کو ہر سطح پر خصوصی تحقیق کا انتظام کرنا چاہیے تاکہ پیچیدہ طریقوں کو آسان بنایا جاسکے۔ اس سے صنعتی اور معاشی ترقی کے ابتدائی مراحل میں بڑی مدد ملے گی۔ ہندوستان جیسے کم ترقی یافتہ ملکوں کو ٹکنیکی اور سائنسی معلومات کو تو پورے طور پر استعمال کرنا ہی چاہیے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنی قدروں اور حالات کے مطابق مخصوص طریقے نکالیں۔

دوسرا مسئلہ وسعت پذیر معیشت میں بڑھتی ہوئی آبادی کا ہے۔ ایک کم ترقی یافتہ ملک جو معاشی ترقی کی کوشش کر رہا ہے، اگر اس کی آبادی کے اضافے کی شرح اونچی ہے تو اُس کا اثر اُس کی ترقی کی رفتار اور عوام کے معیارِ زندگی پر خراب پڑے گا۔ دراصل ہندوستان کی معاشی ترقی کا مسئلہ بھی یہی ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے آخری اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان کی مجموعی آبادی ۴۳,۹۲,۳۰,۰۰۰ تھی، یعنی ۱۹۵۱ء کے اعداد و شمار کے مقابلے میں ۲۱½٪ زیادہ۔

مجموعی آبادی کے اعتبار سے ہندوستان چین کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ ۱۹۵۱ء میں منصوبہ بندی شروع ہونے کے وقت آبادی ۳۶,۱۱,۳۰,۰۰۰ تھی۔ پلاننگ کمیشن کا تخمینہ تھا کہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۱ء تک یعنی دس برس کی مدّت میں (جو تقریباً پہلے اور دوسرے منصوبے کی مدّت کے برابر تھی) آبادی نے اضافے کی شرح ۱۲½٪ ہوگی یعنی ۱¼٪ کا سالانہ اضافہ۔ اِس لیے توقع تھی کہ ۱۹۶۱ء تک جب ہمارا دوسرا پلان پورا ہوگا اُس وقت آبادی ۴۰,۸۰,۰۰,۰۰۰ ہوگی۔ بدقسمتی سے یہ تخمینہ غلط ثابت ہوا۔ ماہروں سے ۱¼٪ کے اضافے کا تخمینہ لگایا تھا لیکن واقعتاً ۲٪ سے زیادہ کا اضافہ ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ منصوبہ بندی کے دس برسوں میں ہندوستان کی آبادی ۲۱٪ بڑھی جب کہ قومی آمدنی میں ۳۸٪ کا اضافہ ہوا۔ صورتِ حال بڑی تشویش ناک ہے اور اِس کی سخت ضرورت ہے کہ ترقی کی بھرپور کوششوں کے ساتھ ساتھ آبادی کی بھی منصوبہ بندی کی موثر کوشش کی جائے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے ذریعے آبادی کے اضافے کی شرح کم کرنا ہمارے لیے بے حد اہم ہے۔ ماؤں کی صحت اور بچّوں کی بہتر پرورش کے لیے بھی خاندانی منصوبہ بندی ضروری ہے۔ ہندوستان

کے منصوبوں میں آبادی کی جو پالیسی اختیار کی گئی ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کو اس بنیادی مسئلے کی اہمیت کا پورا احساس ہے۔ پہلے پلان کے دوران حکومت نے سرکاری سطح پر خاندانی منصوبہ بندی شروع کی اور ان پروگراموں کی تکمیل کے لیے ۶۵ لاکھ روپے خرچ کیے۔ دوسرے پلان میں فیملی پلاننگ کے لیے ۵ کروڑ روپے فراہم کیے گیے۔ تیسرے پلان میں اس مد کے لیے ۲۷ کروڑ رکھے گئے اور چوتھے پلان میں یہ رقم بڑھا کر ۳۰۰ کروڑ کر دی گئی۔ یہ اس مقصد کے پیش نظر کیا گیا کہ ۱۹۷۳ء تک پیدائش کی شرح ۳۵ فی ہزار سے گھٹا کر ۳۲ فی ہزار پر لانا ہے۔

زراعت اور صنعت وحرفت میں مقابلہ: ایک کم ترقی یافتہ ملک میں جہاں زراعت کا غلبہ ہے اگر آبادی کے اضافے کی شرح تشویش ناک حد تک اونچی ہے تو اس کی وجہ سے نہ صرف معاشی ترقی کی رفتار سست ہوگی بلکہ دیہی آبادی کی غذائی ضروریات میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا۔ مثلاً تخمینہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی میں سالانہ اضافے کی وجہ سے ہر سال سترہ، اٹھارہ لاکھ ٹن زاید اناج کی ضرورت ہوگی۔ یہ ہندوستان کی صنعتی ترقی کے لیے واقعی بڑا خطرہ ہے کیوں کہ صنعتی ترقی کے لیے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ اناج کی فاضل پیداوار کسانوں سے لے کر اُس سے شہری مزدوروں کی غذائی ضروریات پوری کی جائیں۔ اس مسئلے کے حل کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔ اوّل تو ایسے موثر اقدام جن سے زراعتی پیداآوری بڑھے۔ دوسرے یہ کہ زراعت کی تجدید اور نئی تنظیم کے بعد دیہات کی فاضل آبادی کو غیر زراعتی پیشوں کی طرف منتقل کیا جائے۔

ایک کم ترقی یافتہ ملک میں زراعت سے دوسرے پیشوں کی طرف مزدوروں کی منتقلی کا عمل تیز ہونے کا امکان کم ہوتا ہے اور اگر آبادی میں اضافے کی شرح اونچی ہے تو یہ عمل اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ہندوستانی کسان اپنے گاؤں کے ماحول سے بے حد وابستہ ہوتے ہیں اور ان میں سے بیشتر روزگار کے لیے شہر جانا نہیں پسند کرتے۔ شہر میں عموماً اُجرت زیادہ ملتی ہے لیکن یہ بھی اُنھیں گاؤں سے باہر جانے پر نہیں اُکساتی۔ ایسی صورت میں اگر انھیں گھریلو صنعتوں، رورل ایکسٹنشن اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے کاموں میں لگایا جائے تو بہتر نتائج حاصل ہوں گے۔ یہ بات بڑی اُمید افزا ہے کہ اب ایسی اسکیمیں بنائی جا رہی ہیں جو دیہات کے ایکسٹنشن بلاکوں کو مشترک کوآپریٹیو فارمولوں سے منسلک کر دیں گی۔

بھاری صنعتیں: صنعتی نشوونما کی ماہیت ارتقائی ہوتی ہے اور اس کے لیے مناسب منصوبہ بندی ضروری ہوتی ہے تاکہ سرمائے کو ایسے راستوں پر ڈالا جائے جن سے زیادہ سے زیادہ کامیابی

کا امکان ہو۔ ایک بار جب زرعی پیداآوری بڑھ جائے اور مستحکم ادارہ جاتی تبدیلیاں واقع ہو جائیں تب لوہے کوئلے بجلی سیمنٹ اور انجینئری صنعتوں کی طرف توجہ دی جائے اور بھاری صنعتوں کا ایک جامع پروگرام بنایا جائے جس کے تحت متعلقہ صنعتیں ایک دوسرے کی پیداوار کو کھپائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی ترقیاتی منصوبے میں یہ بات بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ بھاری صنعتوں پر زور دینے سے معاشی ترقی تیزی سے عمل میں آتی ہے جو بہت ضروری ہے کیوں کہ اگر ترقی کی رفتار سست ہے تو جو تھوڑی بہت ترقی ہو گی وہ آبادی کے اضافے کی نذر ہو جائے گی۔

بھاری صنعتوں کی ترقی سے سرمائے کے لیے مناسب بنیاد تیار ہو گی جس کی وجہ سے تیز صنعتی ترقی کا عمل جاری رہ سکے گا۔ بھاری صنعتوں میں جو آلات اور مشینیں تیار ہوں گی اُن سے آگے چل کر اُن صنعتوں کو بہت فائدہ ہو گا جو روزانہ کے استعمال کی چیزیں بناتی ہیں۔ بھاری صنعتوں سے ملک کو یہ بھی فائدہ ہو گا کہ ہنگامی حالات میں انھیں ایسی اشیاء پیدا کرنے پر لگایا جا سکتا ہے جن کی ضرورت دفاع کے لیے ہوتی ہے۔

برطانوی عہد میں بنیادی صنعتوں کی طرف کافی توجہ نہیں دی گئی کیوں کہ یہ نوآبادیاتی نظام کی بنیادی پالیسی کے خلاف تھا۔ اگر اُس وقت ہندوستان میں سرمائے کا ایک معقول ڈھانچہ بن جاتا تو ملک کی صنعتی ترقی کی رفتار تیز ہو جاتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہندوستان میں برطانوی مال کی کھپت کم ہو جاتی۔ لیکن ہماری قومی حکومت کو اس بات کا احساس ہے کہ صنعتی ترقی اور ملک کے دفاع کے لیے بھاری صنعتوں کا قیام بے حد ضروری ہے۔ اسی لیے ہندوستان کے تیسرے پلان میں بنیادی صنعتوں پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔

مالیاتی پہلو: آیئے اب معاشی ترقی کے مالیاتی پہلوؤں کو دیکھیں جن کا مقابلہ ایک کم ترقی یافتہ اور کم آمدنی والے ملک کو کرنا پڑتا ہے۔ اس جائزے کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) سرمائے کی ضرورت (۲) سرمائے کے ماخذ اور (۳) توازن ادائیگی کے مسائل۔

سرمائے کی ضرورت: اب تک کے تجزیے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معاشی ترقی کے لیے ضروری سرمائے کو تین قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ اوّل تو زراعت کی نئی تنظیم اور اسے مضبوط بنانے کے لیے سرمایہ چاہیے۔ تجرباتی فارموں کے قیام پر کافی روپیہ خرچ ہو گا۔ کاشت کے نئے طریقے نکالنے اور کیمیاوی کھاد پیدا کرنے کے لیے ان فارموں کو کوآپریٹیو فارموں سے منسلک کرنا ہو گا۔

اس کے علاوہ اگر ایک جمہوری غیر کمیونسٹ سرکار نے زراعت کے میدان میں بنیادی تبدیلیاں

لانے کے لیے زمین داروں کو ختم کرنا چاہا تو انھیں مناسب معاوضہ دینے کے لیے بھی رقم کی ضرورت ہو گی۔ غرض کہ ترقی کے ابتدائی دور میں جب پیداآوری بڑھانے کی ضرورت ہوگی، حکومت کو ان کاموں پر کافی روپیہ خرچ کرنا پڑے گا۔ برطانوی عہد میں یہ مسئلہ تھا ہی نہیں کیوں کہ انگریزوں نے ہندوستانی زراعت کو جدید طرز دینے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ آزادی کے بعد پہلے پلان میں زراعت کی طرف توجہ دی گئی اور اس کے لیے ۳۵۴ کروڑ روپے رکھے گئے۔ دوسرے پلان میں زراعت، کمیونٹی ڈیولپ منٹ، کواپریٹیو ز اور آب پاشی کی چھوٹی اسکیموں پر ۵۳۰ کروڑ روپے خرچ ہوئے اور تیسرے پلان میں ان مدات کے تحت مجموعی رقم ۱۰۶۸ کروڑ رکھی گئی ہے۔

روپے کی دوسری ضرورت ان کاموں کے لیے ہوتی ہے جنھیں ہم نے سماجی سرمائے کی ضرورت کہا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہم امریکہ جیسے بڑے بڑے پل اور شاہ راہیں نہیں بنائیں گے لیکن معمولی پل، سڑکیں، بندرگاہ بنانے پر بھی کافی رقم خرچ ہوگی۔ معمولی درجے کے اسکولوں اور اسپتالوں، آب پاشی کے پروجیکٹوں اور تحقیقی مرکزوں کے قیام کے لیے بھی کافی روپیوں کی ضرورت ہوگی۔

بیشتر کم ترقی یافتہ ملکوں کی آمدنی کم ہے۔ یہاں کے زیادہ تر لوگوں کا پیشہ زراعت ہے لیکن کھیتی کے فرسودہ طریقوں اور آبادی کے بڑھتے ہوئے دباؤ کی وجہ سے فی کس پیداوار خطرناک حد تک کم ہے۔ آمدنی کا بڑا حصّہ بنیادی ضرورتوں کے پورا کرنے میں صرف ہو جاتا ہے اور بچت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ آبادی کا بہت چھوٹا حصّہ صنعت کاروں، ساہوکاروں، زمین داروں اور کاروبار کرنے والوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے یہاں کچھ بچت ہوتی ہے لیکن چوں کہ ان کی گنتی بہت کم ہے اور آبادی کے باقی حصّے میں بچت نہیں ہوتی اس لیے مجموعی بچت قومی آمدنی کا بہت چھوٹا حصّہ ہوتی ہے۔ چنانچہ کم آمدنی والے علاقوں میں بچت کی کمی کی وجہ سے سماجی سرمائے کی ضروریات کے لیے رقم فراہم کرنا مشکل ہوتا ہے۔

بیشتر ملکوں میں ٹیکس اور داخلی قرض سے کافی رقم نہ مل سکے گی۔ ایسے کم ترقی یافتہ ملکوں کو اگر سماجی سرمائے کی ضروریات پوری کرنی ہیں تو انھیں بیرونی نجی ایجنسیوں سے قرض لینا چاہیے اور انٹرنیشنل بینک جیسے اداروں سے امداد حاصل کرنی چاہیے۔ اگر یہ بھی ناکافی ہو تو تھوڑی حد تک خسارے کی مالیات پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

اگر روپے کی کمی کی وجہ سے ریل، ٹیلی فون کی ترقی، پانی اور الیکٹرک پاور کی توسیع اور دوسری بنیادی خدمات کی فراہمی ملتوی کی گئی تو معاشی ترقی کے عمل میں شروع ہی سے رکاوٹ

پیدا ہو جائے گی جو ایک کم ترقی یافتہ معیشت کے لیے بہت مُضر ہے۔ برطانوی حکمرانوں کو نہ ہندوستان کی معاشی ترقی سے دلچسپی تھی اور نہ عوام کی زیادہ سے زیادہ فلاح و بہبود اُن کا مقصد تھا۔ اس لیے ذرائع نقل و حمل کو چھوڑ کر سماجی سرمائے کی ضرورت کی طرف اُنھوں نے توجہ نہیں دی۔ اس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں کہ نقل و حمل کی ترقی میں بھی ملک کی معاشی ترقی پیش نظر نہیں تھی۔ اس کا مقصد ملک کے دور دراز علاقوں کو ایک دوسرے سے جوڑنا تھا۔ یہ حکومت کے استحکام اور موثر انتظام کے لیے ضروری تھا۔ آزادی کے بعد سے حکومت مربوط منصوبہ بندی کے ذریعے سماجی سرمائے کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کر رہی ہے جس کا بنیادی مقصد ملک کی فلاح اور ترقی ہے۔

سرمائے کی تیسری قسم وہ ہے جو قدرتی وسائل سے استفادے اور بنیادی صنعتوں کی تعمیر کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ بھاری صنعتوں میں سرمایہ کافی بڑی مقدار میں لگتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا کم ترقی یافتہ ملک کے عوام کی بچت سے یہ سرمایہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان ملکوں میں بچت کی مقدار بہت کم ہوتی ہے جس کے موثر ترین استعمال سے بھی یہ مسئلہ نہیں حل ہو سکتا۔ چنانچہ ضروری ہے کہ صنعتی ترقی کے ابتدائی زمانے میں جب بھاری صنعتیں قائم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، ان ملکوں کے باشندوں کو زیادہ پس انداز کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ لیکن بیشتر یہ ہوگا کہ معمولی ترغیبوں اور محرکات سے خاطر خواہ نتیجہ نہیں برآمد ہوگا اور انھیں دوسرے طریقوں سے بچت پر مجبور کرنا ہوگا۔

ایک کم ترقی یافتہ ملک جہاں جمہوری حکومت ہے وہاں کے عوام مرکزی اور براہ راست جبر نہیں برداشت کرسکیں گے چنانچہ معمولی، نرم [illegible] جیسے ٹیکس اور بلاواسطہ طریقوں سے کام لینا ہوگا۔ اس طرز کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بچت بہت کم ہوگی، لوگ مستقبل کی ضرورتوں کا کم خیال کر رہے ہوں گے اور معیشت میں جبری بچت [illegible] عوامی قرض کی صورت میں [illegible]

معاشی ترقی کے مالی وسائل:

کم بچت اور داخلی قرض : ہم نے دیکھا کہ کم ترقی یافتہ ملک اور کم آمدنی والے ملک میں آبادی کے بڑے حصے میں یا تو بچت ہوتی ہی نہیں یا اگر ہوتی ہے تو برائے نام۔ اقتصادی ترقی کے ساتھ زراعت کے طریقے بہتر ہوں گے اور نئی صنعتیں شروع ہوں گی جن کی وجہ سے محنت کی پیداآوری بڑھنے کے ساتھ مزدوروں کی آمدنی بڑھے گی۔ سوال یہ ہے کہ مزدور اس زائد آمدنی کو کیا کریں گے۔ آیا وہ اس روپے کو بچائیں گے یا اپنے معیارِ زندگی کو اونچا کرنے پر خرچ کردیں گے۔ جہاں تک ہندوستانی کسان کا تعلق ہے وہ تو شاید اپنی زائد آمدنی قرض ادا کرنے پر صرف کرے گا۔ ممکن ہے رسومات کی مد میں کچھ خرچ بڑھ جائے یا اپنی غذا کو زیادہ متوازن اور قوت بخش بنانے کی کوشش کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک بار تنگ دستی کی گرفت سے نکلنے کے بعد وہ محسوس کرے گا کہ معیارِ زندگی کو اونچا کرنے کے جو مواقع اس کو اب حاصل ہیں وہ پہلے کبھی نہیں حاصل تھے۔ اس احساس کی وجہ سے ممکن ہے اس کا نظریہ بدل جائے اور شروع میں اس کے مصارف بڑھ جائیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسان اپنی زائد آمدنی کو بہتر قسم کے بیج، کھاد اور کاشت کے آلات پر صرف کرتے ہوں۔ غرض کہ اس کا امکان بہت کم ہے کہ عام حالات میں کسان خود کچھ پس انداز کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسی طرح شہر کا مزدور بھی کفایت شعاری کے بجائے اپنی زائد آمدنی کو زندگی زیادہ آرام سے بسر کرنے پر صرف کرے گا۔ دوسروں کی تقلید میں وہ اس بات کی پوری طرح کوشش کرے گا کہ اس کا معیارِ زندگی اُن لوگوں کے برابر آجائے جن کی آمدنی اُس سے کچھ زیادہ ہے۔ چنانچہ صنعتی ترقی کی ابتدا میں یہاں بھی پس انداز کرنے کا امکان کم ہی ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ بچت اتنی کم ہے اگر حکومت عوام سے قرض لینا چاہے تو اس کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوگی۔

ٹیکس : لیکن ایک چھوٹا اور دولت مند طبقہ بھی ہے جس میں زیادہ تر زمین دار اور صاحب جائداد لوگ آتے ہیں۔ ترقی کے ابتدائی دور میں اس طبقے سے زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرنی ہوگی۔ حکومت کو چاہیے کہ زمینوں اور غیر منقولہ جائداد پر بھاری ٹیکس لگا کر اس طبقے کی آمدنی کو سرکاری خزانے میں لے آئے اور اسے ملک کی سماجی سرمائے کی ضروریات پر صرف کرے۔ شہری زمینوں اور عمارتوں کی قیمتیں صنعتی ترقی کے دوران تیزی سے بڑھتی ہیں کیوں کہ شہروں کی توسیع اور عمارتیں تیزی سے بنتی ہیں۔ لیکن زمینی ٹیکسوں سے عموماً آمدنی کم ہوجاتی ہے

کیوں کہ زمینی اصلاحات کے پروگرام کے تحت زمین داروں کو ختم کرنے، کسانوں کو حق ملکیت دینے
اور کوآپریٹیو فارمنگ شروع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ ٹیکسوں کے لیے
شہری زمینوں، عمارتوں اور دوسری جائدادوں پر زیادہ بھروسہ کرنا چاہیے۔

ترقیاتی کاموں کے لیے سرمائے کا دوسرا داخلی ذریعہ خود حکومت ہے۔ ہماری زمینی ٹیکسوں کا اور
جائداد پر ٹیکس سے صرف اُس وقت تک کافی آمدنی ہوتی ہے جب تک زمین داری باقی رہتی
ہے لیکن زمین داری کے خاتمے کے بعد یہ آمدنی گھٹ جاتی ہے۔ اس پیچیدہ مسئلے کا حل
نکالنا ضروری ہے۔ ترقی کے ابتدائی مراحل میں جب معیشت افراطِ زر کی طرف مائل ہوتی ہے،
استحکام کے ساتھ ساتھ روپے کی فراہمی کا یقینی اور صریح طریقہ یہ ہے کہ ٹیکس زیادہ تر اُن لوگوں
پر لگائے جائیں جن کی آمدنی کے وسائل تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ ایک ترقی پزیر معیشت
میں ٹیکس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ زیادہ آمدنی والے طبقے پر ٹیکس لگایا جائے اور اُن کی
قوتِ خرید کو اس طرح ان سے لیا جائے کہ صنعتی ترقی کے محرکات کو ضرب نہ پہنچے۔ بدقسمتی سے
ہندوستان کے پہلے پلان میں ٹیکس کے بنیادی اصولوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں کی گئی اور
حکومت قومی آمدنی کا صرف ۷٪ حصہ ٹیکس کی شکل میں وصول کرنے پر قانع رہی۔ دوسرے
اور تیسرے پلان میں ٹیکسوں پر ترقیاتی مالیات کے وسیلے کی حیثیت سے زیادہ زور دیا گیا۔ ان
ٹیکسوں کو پبلک پروجیکٹوں کے لیے سرمایہ فراہم کرنے اور استحکام پیدا کرنے کے لیے استعمال
کیا جا سکتا ہے۔

خسارے کی مالیات (DEFICIT FINANCING)

اگر اندرونی قرض اور ٹیکسوں سے کافی رقم نہ فراہم ہو تو حکومت کو پبلک ورکس کے اُن
پروگراموں کو جو سماجی سرمائے کی بنیادی ضرورت پوری کرتے ہوں نئے نوٹ چھاپ کر پورا کرنا
چاہیے۔ نئے نوٹ چھاپنے کا مطلب ہے آمدنی سے زیادہ خرچ جسے عام طور سے خسارے کی
مالیات یا ڈیفیسٹ فائنانسنگ کہا جاتا ہے۔ خسارے کی مالیات میں اگر اعتدال برتا جائے
تو موجودہ حالات میں یہ ترقیاتی پروجیکٹوں اور اسکیموں کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کا اچھا ذریعہ ہے۔
اس سے قوم کے لیے سماجی سرمائے کی سہولتیں بڑھیں گی، بے روزگار لوگوں کو روزگار ملے گا اور
نجی حلقے میں سرمایہ لگنے کی ترغیب پیدا ہوگی کیوں کہ حکومت ترقیاتی پروجیکٹوں کے لیے ہر طرح کا

سامان پرائیوٹ فرموں سے خرید ے گی۔ غرض کہ اِس کا قوی امکان ہے کہ معاشی ترقی کے دوران پس ماندہ ملکوں کو ترقیاتی منصوبوں اور سماجی سرمائے کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مالیاتی خسارے کا طریقہ کام میں لانا ہوگا۔ لیکن اگر ترقیاتی عمل میں افراطِ زر بہت بڑھ گیا تو اِس طریقے کو ختم کرنا ہوگا۔ تیسرے پلان کے آخری مراحل میں ہندوستان کچھ ایسی ہی صورت سے دوچار ہے۔ اسی لیے پلاننگ کمیشن نے فیصلہ کیا ہے کہ چوتھے پلان کے دوران مالیاتی خسارے کے ذریعے وسائل نہیں فراہم کیے جائیں گے۔ لیکن پچھلے تین منصوبوں میں مالیاتی خسارے نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ پہلا پلان اگرچہ بہت بڑا نہیں تھا لیکن ۴۲۳ کروڑ کے بقدر خرچ آمدنی سے زیادہ کیا گیا۔ خیال تھا کہ دوسرے پلان کا پیمانہ چوں کہ زیادہ بڑا ہے اس لیے اس پلان کے دوران ۱۲۰۰ کروڑ کے مالیاتی خسارے کی ضرورت ہوگی۔ لیکن دوسرے پلان کے دوران واقعی خسارہ ۹۴۸ کروڑ تھا۔ یعنی توقع سے ۲۵۲ کروڑ کم۔ تیسرے پلان میں کم مالیاتی خسارہ تجویز تھا اور توقع تھی کہ اس مدت میں ۵۵۰ کروڑ خسارہ رہے گا لیکن چوتھے پلان میں یہ واضح ہو گیا کہ تیسرے پلان کے دوران واقعی ۱۱۵۰ کروڑ کے بقدر رہا۔ بہرحال اُمید ہے کہ چوتھے پلان میں مجموعی طور سے ۸۵۰ کروڑ کا مالیاتی خسارہ ہوگا۔

بیرونی سرمایہ : آئیے اب بیرونی سرمائے کی طرف توجہ کریں۔ پچھلے چند برسوں میں اُن پس ماندہ ملکوں میں جہاں منافع کی زیادہ توقع تھی بیرونی سرمایہ بہت بڑی مقدار میں لگا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکن سرمائے کا بہت بڑا حصّہ لیٹن امریکی ممالک اور مشرقی وسط ایشیائی ملکوں میں پٹرول نکالنے کے کاموں میں لگا ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں مبادلہ جاتی کنٹرول نافذ ہے اور نجی کاروبار کے قومی ملکیت میں آنے کا مستقل خطرہ ہے، بیرونی سرمایہ کافی مقدار میں لگنے کا امکان کم ہے تاوقتیکہ اُس کے لیے خاص ترغیب نہ ہو یا کسی صنعتی ملک کے ساتھ ہمارا سمجھوتہ نہ ہو۔

تاہم کچھ ایسی ایجنسیاں ہیں جن سے یہ ممالک اپنی ترقی کے لیے مدد لے سکتے ہیں۔ انٹرنیشنل بینک فار کانسٹرکشن اینڈ ڈیولپمنٹ ایک ایسا ہی ادارہ ہے جو ملکوں کو ترقیاتی کاموں کے لیے قرض دیتا ہے۔ پچھلے کچھ برسوں میں اس بینک نے ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا کے دوسرے ملکوں کو کافی امداد دی ہے۔ بینک نے اِن ملکوں کے ترقیاتی پروگراموں کا باقاعدہ جائزہ لے کر معاشی ترقی کے مسائل حل کرنے میں اِن کا ہاتھ بٹایا ہے۔

حال میں انٹرنیشنل بینک نے ایک اور ادارہ قائم کیا ہے۔ یہ انٹرنیشنل فائنانس کارپوریشن ہے جس کا مقصد کم ترقی یافتہ ملکوں کے بڑے بڑے نجی کاروبار میں مالی امداد دینا ہے۔ امریکہ کا سرکاری اکسپورٹ امپورٹ بینک بھی بعض حالات میں دوسرے ملکوں کی پرائیوٹ فرموں کو قرض دیتا ہے۔ اکنامک کوآپریشن اینڈ ایڈمنسٹریشن پروگرام کے تحت امریکہ نے بہت سے کم ترقی یافتہ ملکوں کو مزید امداد دی ہے۔

توازنِ ادائیگی کا معاملہ : توازنِ ادائیگی سے ملکوں کی باہمی ادائیگیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ چنانچہ توازنِ ادائیگی میں صرف وہی ادائیگی اور وصول یابی نہیں شامل ہوتی جو اشیاء کی خرید و فروخت کا نتیجہ ہوتی ہے بلکہ اس میں وہ ادائیگی اور وصول یابی بھی شامل ہوتی ہے جو تحفوں، قرض، سود، منافع، انشورنس پریمیم، سیاحوں کے مصارف وغیرہ کی شکل میں ہوتی ہے۔ آیئے دیکھیں کہ توازنِ ادائیگی کی مشکلات کیوں پیش آتی ہیں۔

صنعتی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ سرمائے کی تشکیل تیزی سے ہو۔ سوال یہ ہے کہ سرمایہ حاصل کرنے کے اصل ذرائع کیا ہیں۔ جہاں تک مادّی سرمائے کا سوال ہے اس کا بیشتر حصّہ ملک سے ہی حاصل کرنا ہوگا۔ پتھر، لکڑی اور مزدور، ظاہر ہے کہ مقامی طور سے حاصل کرنا ہوگا۔ مشینیں، آلات اور مخصوص مہارت کے کارکن دوسرے ملکوں سے لانے ہوں گے۔ عام طور سے کم ترقی یافتہ ملکوں کو ابتدا میں توازنِ ادائیگی کی مشکلات اس لیے پیش آتی ہیں کہ بھاری مشینیں اور ماہر کارکن مقامی طور سے دست یاب نہیں ہوتے اور انھیں باہر سے حاصل کرنا ہوتا ہے۔

دوسرا مسئلہ سرمائے کی کھپت کی شرح کا ہے۔ معاشی ترقی عموماً وسیع محاذ پر واقع ہوتی ہے۔ اُڑان بھرنے کی ابتدا میں سارے محاذوں پر ترقی بہ یک وقت ظاہر ہوتی ہے۔ یہ اُس وقت خاص کر ہوتا ہے جب کم سے کم مدت میں معاشی ترقی مدِّ نظر ہوتی ہے۔ اِس لیے بیرونی سرمائے اور بیرونی ماہروں کی خدمات کو اِس معقول طریقے سے استعمال کرنا ہوتا ہے کہ ترقی کے مختلف پہلوؤں کو ضروری توجہ ملے۔ اگر دوسرے ملکوں سے زیادہ قرض لیا گیا یا مشینری اور خصوصی مہارت حاصل کی گئی تو ادائیگی کا مسئلہ ضرور پیش آئے گا۔ بیرونی سرمایہ برآمد کرنے والا کم ترقی یافتہ ملک اگر زیادہ اشیا دوسرے ملکوں کو فروخت کرسکے تو اُس کی مجموعی آمدنی بڑھ جائے گی اور اگر یہ اضافہ جاری رہا تو آگے چل کر ادائیگی اور آمدنی میں توازن قائم ہو جائے گا۔ لیکن ترقی کے ابتدائی مراحل میں جب

معیشت کے وسعت پذیر حلقے میں مقامی طور سے اشیا اور خدمات کی طلب زیادہ ہوتی ہے تب برآمدات بڑھانا اور زیادہ آمدنی کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب برآمدات نہیں بڑھائی جا سکتیں تو وصول یابی اور ادائیگی میں توازن نہیں رہے گا اور زرِ مبادلہ کی مشکلات ضرور پیش آئیں گی۔

دوسرے اور تیسرے منصوبوں کے دوران ہندوستان ایک ایسے کم ترقی یافتہ ملک کا مثالی نمونہ تھا جو ترقی اور دفاع کے اخراجات میں تیزی سے اضافے کی وجہ سے توازنِ ادائیگی کی مشکلوں میں گھرا ہوا تھا۔ دوسرے پلان کے پہلے دو برسوں میں چوں کہ حکومت نے ترقیاتی کاموں پر بہت زیادہ خرچ کیا اس لیے صرفی اشیا کی طلب بہت بڑھ گئی۔ ترقی کے کاموں میں زیادہ سرمایہ لگنے کی وجہ سے وہ وسائل جو پہلے معیشت کے دوسرے شعبوں میں لگے تھے، اب پیداواری اشیا بنانے کی طرف رجوع کرنے پڑے۔ ضروری اور پیداواری اشیا کی طلب بڑھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزید افراطِ زر کا سہارا لینا پڑا اور توازنِ ادائیگی کا دباؤ خطرناک حد تک بڑھ گیا۔ بھاری پروجیکٹوں کے لیے مشینیں اور آلات بیرونی ملکوں سے براہِ راست خریدنے پڑے اور درآمدات کی طلب بہت بڑھ گئی۔ غلے کی تنگی کی وجہ سے اناج بہت بڑی مقدار میں باہر سے منگانا پڑا جس کی وجہ سے توازنِ ادائیگی پر دباؤ اور بڑھ گیا۔ غرض کہ حوصلہ مند منصوبہ بندی اور بڑھتے ہوئے دفاعی اخراجات نے (اسی زمانے میں ہندوستان کے دو پڑوسیوں نے حملہ کیا) توازنِ ادائیگی کے بوجھ کو شدید کر دیا۔

ایک کم ترقی یافتہ ملک میں توازنِ ادائیگی کی مشکلات تو بہرحال ہوں گی خصوصاً جب کہ اس کا مقصد تیز معاشی ترقی ہو اور اس کے لیے اُس کو بیرونی سرمائے اور مہارت کی ضرورت ہو۔ چنانچہ بہتر یہ ہے کہ پیداآوری آلات اور مہارت کی درآمد کا معقول انتخاب ہو اور برآمدات کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ بہت کم ترقی یافتہ ملکوں کے لیے بڑے بڑے بل ڈوزر، بجلی کی بڑی مشینیں اور دوسری بھاری اور قیمتی مشینیں خریدنا فضول ہے۔ بہتر ہوگا کہ یہ ملک باہر سے معمولی آلات خریدیں اور بیرونی ماہروں کی خدمات سے فائدہ اُٹھائیں۔ جس کو ابھی چلنا نہ آتا ہو اُس کے لیے دوڑنا خطرے سے خالی نہیں۔ چنانچہ معاشی ترقی کی ابتدا میں ایک ملک کے لیے ضروری ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر بیرونی سرمایہ حاصل کرے اور اُس کو مناسب حدود کے اندر رکھے تاکہ توازنِ ادائیگی کے مسئلے سے بچا رہے۔

باب ۳

کم ترقی یافتہ ملکوں کے بنیادی مسائل

منظّم سکٹر اور معمولی کاروبار کے سکٹر میں مقابلہ :

پچھلے باب میں ہم نے دیکھا کہ ہندوستان جیسے کم ترقی یافتہ ملک کا معاشی نظام دو نمایاں سکٹروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے سکٹر کو منظّم یا سرمایہ وار سکٹر کہنا چاہیے۔ یہ حال کی پیداوار ہے اور مجموعی معیشت کا بہت چھوٹا حصّہ ہے۔ اس میں سرکاری یا نجی کاروبار آتے ہیں۔ اس سکٹر میں کچھ صنعتی کاروبار بھی ہوتے ہیں لیکن ان میں سے بیشتر نجی منتظمین کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ سرکاری ماڈل فارم اور نجی باغات بھی اس سکٹر میں آ سکتے ہیں۔ دوسرا یعنی غیر منظّم سکٹر معیشت کے باقی حصّے پر حاوی ہے اور منظّم سکٹر سے بہت بڑا ہے۔ یہ سکٹر نظریاتی اعتبار سے روایت پرست ہے۔ اس میں چھوٹے پیمانے پر خاندانی کاشت اور دوسری غیر منظّم معاشی سرگرمیاں آتی ہیں۔ مثلاً دوکان دار اور خوردہ فروش وغیرہ۔ اس سکٹر کی مجموعی خالص بچت برائے نام اور عام صرفی اشیا کی طلب بہت کم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ اس سکٹر کے لوگوں کی زندگی بس گزر بسر کے معیار کی ہوتی ہے، یہ لوگ دوسرے علاقوں میں جہاں روزگار کے مواقع ہوتے ہیں، نہ منتقل ہونا پسند کرتے ہیں اور نہ اُن کے پاس اس کے وسائل ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس سکٹر کے لوگ معاشی ترقی کی طرف سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

منظّم سکٹر ہی بچت کا بنیادی وسیلہ ہے کیوں کہ یہاں فی کس اُجرت اور آمدنی دوسرے سکٹر کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تھوڑی بہت منظّم صنعتیں اسی سکٹر میں ہوتی ہیں جن کے مالک کافی نفع کماتے ہیں۔ اسی اونچی فی کس آمدنی اور زیادہ منافع سے بچت وجود میں آتی ہے۔ درحقیقت زائد پیداوار یا سرپلس کا بڑا حصّہ اسی سکٹر میں پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے معاشی نشو و نما کا تیز عمل اسی سکٹر کی توسیع اور ترقی سے شروع ہوتا ہے۔

عموماً سرمایہ وار سکٹر کے پاس جدید ٹکنیکی سہولتیں بھی ہوتی ہیں اور منتظمین ان صنعتوں کی پیداآوری بڑھانے کے لیے جدید مشینری اور نئے طریقے بھی استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لیے اس سکٹر

میں سرمائے کی تشکیل کی اور فنی ترقی کی شرح کافی اونچی ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ کم ترقی یافتہ ملک کا یہ چھوٹا لیکن منظم سکٹر معاشی ترقی کی صلاحیت رکھتا ہے اور جمود کا شکار نہیں ہے۔ اس سکٹر میں ترقی ہوتی ہے لیکن ترقی سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ صرف چند اُن سرمایہ داروں کی جیب میں جاتا ہے جو اس سکٹر کو کنٹرول کرتے ہیں۔ غرض کہ معاشی ترقی کا نفع سرمایہ دار طبقے کو پہنچتا ہے۔ یہی لوگ معاشی خوش حالی کی بلندیوں تک پہنچتے ہیں اور طبقاتی سماج میں اُن کی حیثیت مستحکم ہوتی ہے۔

غیر منظم سکٹر اور مخفی بے روزگاری:

اس سکٹر کا خاص پیشہ کاشت کاری ہے۔ یہاں آبادی بڑھنے اور دوسرے پیشے نہ ہونے کی وجہ سے زمین پر آبادی کا دباؤ بے پناہ ہوتا ہے۔ لوگوں کی بہت بڑی تعداد کھیتی باڑی سے روزی حاصل کرنا چاہتی ہے۔ چھوٹے پیمانے پر اور خاندانی کھیتی کی وجہ سے یہ مسئلہ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ خاندان کے سارے افراد اُسی موروثی قطعہ زمین پر کام کرتے ہیں۔ نئے آنے والے چاہے وہ دور کے رشتہ دار ہوں یا نوزائیدہ بچے اسی زمین پر خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ کام کریں گے۔ یہ سارے افراد جو موروثی زمین پر کام کرتے ہیں خود اپنے ملازم ہوتے ہیں اور ایسے خود روزگار لوگوں کو اُن کے کام سے الگ کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن چھوٹے سے قطع زمین پر اتنے لوگوں کا ہجوم ہی ان کی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ جس طرح بہت زیادہ باورچی کھانا بہتر نہیں پکا سکتے، اسی طرح بہت سے آدمی ایک چھوٹے کھیت پر کام کر کے پیداوار نہیں بڑھا سکتے۔ فرض کیجیے ایک موروثی کھیت پر دیے ہوئے زراعتی آلات کے ساتھ سات آدمی ٹھیک سے کھیتی کر سکتے ہیں۔ لیکن خاندان میں آدمی دس ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دس آدمی اُسی کھیت پر کام کریں گے۔ لیکن تین عدد فاضل آدمیوں کے کام سے پیداوار میں شاید کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ اگر زمین زیادہ ہوتی اور جدید مشینری کا استعمال ہوتا تو ان تین آدمیوں کی وجہ سے پیداوار یقیناً بڑھتی۔ لیکن زمین محدود اور کاشت کے جدید طریقے نہ ہونے کی وجہ سے ان تین آدمیوں کی محنت پیداوار میں اضافہ نہیں کرے گی۔ گویا اس مخصوص صورت میں زائد مزدور زمین اور سرمائے کا بدل نہیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جتنے فاضل مزدور ایک کھیت پر لگائے جائیں گے اتنی ہی زیادہ قوت سے قانونِ تقلیل حاصل عمل میں آئے گا۔ زائد مزدور کاشت کی ضرورتوں کے لحاظ سے بالکل غیر ضروری اور فاضل ہیں۔ یہ پیداوار نہیں بڑھائیں گے لیکن پیداوار میں

خاندان کے دوسرے لوگوں کے ساتھ حصّہ دار ضرور ہوں گے۔ چنانچہ فی کس پیداوار نہ صرف اس لیے کم ہوتی ہے کہ زمین کم ہے اور کاشت کے طریقے فرسودہ ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ سات با حاصل مزدوروں کی پیداوار کے حصّہ دار تین بے حاصل (UN PRODUCTIVE) مزدور بھی ہوتے ہیں۔ ظاہری باکاری کا یہ مظہر جس سے کوئی زائد پیداوار نہیں وجود میں آتی مخفی بے روزگاری کہلاتی ہے۔

مختصر یہ کہ مخفی بے روزگاری کا سبب یہ ہے کہ خاندان کے وسائل، خصوصاً زمین اور زراعتی آلات خاندان کے سب افراد کو سال بھر باکار رکھنے کے لیے ناکافی ہوتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے مواقع ناپید ہوتے ہیں کہ ان فاضل آدمیوں کو بے کاری کے زمانے میں دوسرے کاموں سے لگایا جائے۔ اس کم روزگاری کی مقداری پیمائش بڑی مشکل ہے۔ مشاہدین اس کی وسعت کے تخمینے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اقوامِ متحدہ کی رپورٹ "کم ترقی یافتہ ملکوں کی ترقی کی پیمائش" میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے حصّوں اور انڈونیشیا اور فلپائن میں فاضل زراعتی آبادی ۲۰٪ سے ۲۵٪ کے درمیان ہے۔

چنانچہ مخفی بے روزگاری کی وجہ سے اس معمولی سکٹر کے بیشتر لوگوں کی فی کس آمدنی بہت کم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں بچت کیا ہو سکتی ہے۔ خوردہ فروش، دوکان دار اور دوسرے لوگ جو اس غیر منظّم معیشت میں اپنے کو مشغول رکھتے ہیں، کتنا کما سکتے ہیں۔ خصوصاً جب کہ کسان اتنے غریب ہوتے ہیں کہ کھانے اور کپڑے کے علاوہ دوسری چیزیں خریدنے کی سکت نہیں رکھتے۔ اسی لیے معیشت کے اس سکٹر کو غریب سکٹر کہنا چاہیے۔ یہ سکٹر مستقل انحطاط میں گرفتار رہے۔ جب تک اس سکٹر کو متحرک نہیں کیا جاتا اُس وقت تک دوسرے یعنی منظّم سکٹر کی توسیع ناممکن ہے۔ غریب غیر منظّم سکٹر کی اتنی بڑی آبادی کو زیادہ کمانا چاہیے، زیادہ بچانا چاہیے اور زیادہ صرف کرنا چاہیے۔ صرف تب ہی منظّم سکٹر کی صنعتی ترقی کو استحکام مل سکتا ہے۔

دو سکٹری معیشت — برطانوی ہندوستان

برطانوی عہد میں ہندوستانی معیشت کے دوہرے سکٹر تھے۔ ایک تو جدید اور منظّم سکٹر تھا جس میں یہ کاروبار آتے تھے: اناج اور خام مال کی برآمد اور بنے ہوئے مال کی درآمد، جدید بینکی نظام، نقل و حمل، کانیں، باغات اور کچھ جدید صنعتیں جن میں بیشتر کپڑے اور جوٹ کی صنعتیں تھیں۔ دوسرا روایتی اور غریب سکٹر تھا جس میں دست کاری، گھریلو صنعتیں، کاشت کاری اور

مقامی طور پر غلّے وغیرہ کا کاروبار آتے تھے۔ جدید سکٹر میں بینک اور مینیجنگ ایجنٹ سرمایہ لگاتے تھے۔ روایتی سکٹر کو سرمایہ مہاجن فراہم کرتے تھے، جنھیں دیسی بینک کہا جا سکتا ہے۔ روایتی سکٹر بیشتر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں تھا جب کہ جدید سکٹر پر انگریزوں کا تسلط تھا۔ برطانوی عہد میں ان دو سکٹروں کا عدم توازن بہت نمایاں تھا اور دونوں کی ترقی کی شرح میں فرق خطرناک حد تک بڑھ گیا تھا۔ اِس عدم توازن کو کم کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا گیا۔ آزادی کے بعد سے حکومت نے معاشی منصوبہ بندی کے ذریعے روایتی اور پس ماندہ سکٹر کو اونچا اُٹھانے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی منظم سکٹر میں بھی توسیع کا عمل تیز کرنے کے لیے اقدام کیے جا رہے ہیں۔

آزادی سے پہلے کے کچھ برسوں میں اِس روایتی سکٹر کی حالت بڑی ناگفتہ بہ تھی۔ زمین دار اور ساہوکار ظلم کرتے تھے۔ حکومت کی طرف سے نہ کوئی امداد تھی اور نہ زراعت کو از سر نو تنظیم دینے اور اس میں جان ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ اِس سکٹر کے لوگ بہت غریب اور نادار تھے۔ بیرونی تسلط کی وجہ سے عوام اتنے بے حس ہو گئے تھے کہ ان میں اُمید کی روشنی پیدا کرنا اور ان کے دلوں کو گرمانا مشکل تھا۔ دوسری طرف منظم سکٹر میں آدھے درجن کے قریب صنعتیں تھیں جو انگریز مینیجنگ ایجنٹوں نے اپنے فائدے کے لیے قائم کی تھیں۔ ان میں سے بیشتر صنعتیں کلکتے اور بمبئی میں مرکوز تھیں جن کی وجہ سے یہ علاقے بعض معاملات میں ضرورت سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ کلکتے اور بمبئی کے صوبوں کی آبادی اگرچہ ملک کی مجموعی آبادی کی چوتھائی تھی لیکن بڑی صنعتوں کے کُل مزدوروں کی ۶۶.۶۸ فیصد تعداد یہاں کام کرتی تھی (۱۹۳۸-۱۹۳۹)۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی جدید صنعتوں کی ترقی چائے، کافی اور جوٹ جیسی برطانوی باغاتی صنعتوں سے شروع ہوئی۔ ان صنعتوں میں بڑا نفع تھا جس کا ایک حصّہ برطانیہ بھیج دیا جاتا تھا اور باقی انھیں صنعتوں میں دوبارہ لگا دیا جاتا تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ برطانوی عہد میں باغات کی صنعت نے غیر معمولی ترقی کی۔ منظم سکٹر کی ناہموار ترقی کا یہی سبب تھا۔

یہ درست ہے کہ دو بڑی لڑائیوں کی وجہ سے اور کچھ صنعتوں کو حکومت کی طرف سے تحفظ ملنے کی وجہ سے کپڑے، لوہے، فولاد، شکر، سیمنٹ، کاغذ اور ماچس کی صنعتیں قائم ہوئیں اور بڑھیں لیکن سوتی کپڑے، لوہے اور فولاد کی صنعتوں کو چھوڑ کر باقی صنعتوں کی ترقی کی رفتار باغات کی صنعت کی رفتار سے یقیناً کم تھی۔ سوتی کپڑے کی صنعت کی ترقی کی یہ وجہ تھی کہ اوّل تو اِس کو بیرونی مقابلے سے تحفظ حاصل تھا اور دوسرے یہ کہ ملک کے غریب اور کم آمدنی والی آبادی میں

سستے کپڑے کی بڑی مانگ تھی۔ لوہے اور فولاد کی نمایاں ترقی کا سبب یہ تھا کہ کوئلہ اور خام لوہا آسانی سے ملتا تھا اور مکانوں، کارخانوں، پُلوں، ریلوں اور بندرگاہوں کی تعمیر کے لیے لوہے اور فولاد کی مانگ تھی۔

باغات، سوتی کپڑے، لوہے اور فولاد کی صنعتوں میں ترقی کی وجہ سے انگریز سرمایہ کاروں نے بہت منافع کمایا لیکن یہ روپیہ پس ماندہ سکٹر کی معاشی ترقی اور توسیع پر بہت کم خرچ کیا گیا۔ اسی لیے ان دونوں کے درمیان عدم توازن شدید تر ہوتا گیا اور ملک کی ترقی کی سطح برطانوی عہد میں پست رہی۔

تیز ترقی کے عمل کی ابتدا کے امکانات :

ہم نے دیکھا کہ ایک پس ماندہ کم ترقی یافتہ معیشت میں مخفی بے روزگاری غریب سکٹر کی نمایاں خصوصیت ہوتی ہے۔ چھوٹے موروثی کھیتوں کی مجموعی پیداوار سے ان لوگوں کا بھی پیٹ بھرنا پڑتا ہے جو بظاہر کام کرنے کے باوجود حقیقتاً بے کار ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ باحاصل مزدوروں کو قربانی دینی پڑتی ہے اور اپنا صَرف کم کرنا پڑتا ہے تاکہ پیداوار کا ایک حصہ خاندان کے بے حاصل افراد کو مل سکے۔ گویا باحاصل مزدور اپنی آمدنی کا ایک حصّہ بچاتے ہیں تاکہ اُس سے خاندان کے بظاہر باکار لیکن حقیقتاً بے کار افراد کو روزی مل سکے۔ پروفیسر نرکسے (NURKSE) نے باحاصل مزدوروں کی اِس بچت کو جو بے حاصل مزدوروں کے کام آتی ہے، ممکن بچت کا نام دیا ہے۔ یعنی ایسی پیداوار جو اگر بے حاصل مزدوروں پر نہ صرف ہوتی تو بچت بن سکتی تھی۔

اس ممکن بچت کے باوجود یہ غریب سکٹر جو آبادی کے بڑے حصّے پر مشتمل ہے، غربت کے اٹوٹ چکّر میں پھنسا ہوا ہے۔ لوگوں کی آمدنی کم ہونے کی وجہ سے منظّم سکٹر میں پیدا ہونے والی اشیا کی موثّر طلب کم ہوتی ہے اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ سرمائے کی تشکیل نہیں ہو پاتی اور صنعتوں کی توسیع مشکل ہو جاتی ہے۔ چوں کہ منظّم سکٹر خاطر خواہ حد تک نہیں بڑھ پاتا اِس لیے دیہات کے فاضل مزدوروں کو (جو بہ ظاہر کام سے لگے ہوئے ہیں) غیر زرعی پیشوں کی طرف منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن منظّم سکٹر کی صنعتی ترقی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ دوسرے سکٹر سے غذا اور خام مال کی رسد حاصل کی جائے۔ اُدھر آبادی کے مسلسل بڑھنے کی وجہ

بے روزگار لوگوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ محدود موروثی زمین پر نئے افراد بڑھتے جاتے ہیں اور پیداوار کی اوسط برابر گھٹتی جاتی ہے۔ اگر یہ عمل جاری رہا تو اس سکٹر کی غریبی کا ٹوٹ چکر جاری رہے گا جس کی وجہ سے معاشی ترقی میں تاخیر ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ ان بے حاصل صارفوں کو، جنھیں مخفی بے روزگار کہا گیا ہے، پیداوار بڑھانے کے کاموں میں کیسے لگایا جائے۔ یہی بات دوسری طرح یوں کہی جاسکتی ہے کہ روایتی اور غیر منظم سکٹر کی ممکن بچت کو منظم سکٹر کی توسیع پر کیوں نہ صرف کیا جائے۔ یہ سوال پہلی بار پروفیسر نرکسے نے اُٹھایا۔ چوں کہ یہ معلوم تھا کہ مخفی بے روزگار کو دیہی ماحول سے بڑا لگاؤ ہوتا ہے۔ اس لیے پروفیسر نرکسے نے تجویز کیا کہ انھیں ابتدا میں شہر کی طرف منتقل کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے کیوں کہ یہ زیادہ دن وہاں نہ ٹھہر سکیں گے۔ اس کے بجائے کرنا یہ چاہیے کہ انھیں زمین سے الگ کرکے بڑے پروجکٹوں پر لگایا جائے۔ مثلاً باندھ، سڑکوں اور نہروں کی تعمیر اور آب پاشی کے دوسرے کام۔ رہا اُن کی صرفی ضروریات کا سوال، یہ ان کے باحاصل بھائیوں کی ممکن بچت سے پوری ہونی چاہئیں۔ ان پروجکٹوں کو یا تو دیہاتوں میں ہونا چاہیے یا ان کے قریب تاکہ یہ تیز معاشی ترقی کے دوران اس سکٹر کو متحرک کرنے میں نمایاں رول ادا کرسکیں۔

بنیادی طور سے نرکسے کا یہ حل دُرست ہے۔ نرکسے نہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ اشیا جو پہلے بے حاصل مخفی بے روزگاروں کے صرف میں تھی، موثر طریقے سے کام میں لائی جائیں بلکہ انھیں باحاصل صرف کے لیے استعمال کیا جائے۔ اُن کے خیال میں مخفی بے روزگاری کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ باحاصل اور بے حاصل صرف کے درمیان پیداوار کی موثر اور نئی تقسیم ہو (باحاصل صرف سے مُراد وہ صرف ہے جو ایک مخفی بے روزگار آدمی اُس وقت کرتا ہے جب وہ کسی باحاصل پیشے کو منتقل ہوجاتا ہے اور بے حاصل صرف سے وہ صرف مُراد ہے جو وہ اُس وقت کرتا ہے جب وہ اپنے موروثی کھیت پر کام کرتا ہے) لیکن اگر ابتدا میں صرفی اشیا کی پیداوار کم رہی تو پیداوار کی اس نئی تقسیم سے بھی مخفی بے روزگاری کا مسئلہ پوری طور سے حل نہ ہوگا۔ یہ اس لیے کہ ناکافی صرفی اشیا کی دوبارہ تقسیم ان لوگوں کے صرفی مطالبات پورا نہ کرسکے گی جو پہلے مخفی بے روزگار تھے لیکن بعد میں باحاصل کاموں کی طرف منتقل ہوگئے۔

حال میں پروفیسر نرکسے کے اس نظریے کو ڈاکٹر ڈوکیل اور ڈاکٹر برہمانند نے زیادہ وضاحت سے پیش کیا ہے۔ ان دونوں نے پروفیسر نرکسے سے بھی زیادہ خوش آیند تصویر پیش کرتے ہوئے نرکسے کے

سادہ حل کے غیر واضح پہلوؤں کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ غریب سکٹر کی ممکن بچت کا زیادہ موثر استعمال ہوسکتا ہے اگر مخفی بے روزگار لوگوں کو منظم سکٹر کے بار آور پیشوں میں لگایا جائے شرط یہ ہے کہ مزدوروں کی پہلی کھیپ کے لیے صرفی اشیا کی ابتدائی رسد حاصل ہو۔ لیکن اگر صنعتی ترقی کی ابتدا میں اشیا کی پیداوار ناکافی ہوئی تو منظم سکٹر میں زیادہ مزدوروں کو کام سے لگانا مشکل ہوگا۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر مخفی بے روزگار لوگوں کی پہلی کھیپ جس کو کھیتوں سے منتقل ہونا ہے، چھوٹی ہوئی تو شاید غریبی کے چکّر سے نکلنا ممکن نہ ہو۔

آئیے اِس مسئلے کو زیادہ آسان شکل میں دیکھیں۔ اِس کے باوجود کہ غیر منظّم سکٹر میں بچت کے امکانات موجود ہوتے ہیں، منظّم سکٹر کی توسیع کا عمل شروع کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ایک مخفی بے روزگار کے مصارف اُس وقت کافی ہوتے ہیں جب وہ موروثی کھیت پر کام کرتا ہے۔ جب وہ پیدا آور مزدور بن جاتا ہے اور منظّم سکٹر میں کام کرنے لگتا ہے تو اس کے مصارف بڑھ جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہر مخفی بے روزگار جب منظّم سکٹر میں کسی بار آور کام میں منتقل ہوتا ہے تو صَرفی اشیا کی رسد میں خلا پیدا ہوجاتا ہے جو اس مزدور کے صَرف کی نئی اور پرانی سطح کے فرق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ جب یہ مزدور اپنے موروثی کھیت پر کام کرتا تھا اُس وقت صرف دو جوڑے کپڑوں اور دن میں دو بار معمولی کھانا کھاکر مطمئن ہوجاتا تھا۔ لیکن منظّم سکٹر میں منتقل ہونے کے بعد جب وہ خود پہلی بار روزی کمانے لگتا ہے تو وہ بہتر اور زیادہ مقدار میں کھانا اور کپڑے چاہتا ہے بلکہ کبھی کبھی دوسری چیزیں بھی خریدنا چاہتا ہے۔ چنانچہ جب تک صَرفی اشیاء کا خلا نہیں پُر ہوتا اُس وقت تک مخفی بے روزگار لوگوں کو منظّم سکٹر میں نہیں منتقل کیا جاسکتا۔ یہ وضاحت نرکسے کے اُس سیدھے سادے فارمولے سے یقیناً بہتر ہے کہ مخفی بے روزگار لوگوں کی منتقلی کے لیے صرف اتنی ضرورت ہے کہ پیدا آور غیر پیدا آور صَرف کے درمیان اُن صَرفی اشیا کی نئی تقسیم عمل میں آئے جو روایتی سکٹر کی ممکن بچت ہیں۔ وکیل اور برہمانند نے صرفی اشیاء کے خلا پر زور دے کر وسائل کی اُس کمی پر توجہ مرکوز کردی جو مخفی بے روزگاروں کی منتقلی کے دوران واقع ہوگی۔ اس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ پیداوار کی موثر تقسیم کے باوجود منتقلی اپنی ضروریات خود کیوں نہیں پوری کرسکتی۔

فرض کیجیے ایک مزدور کی ضرورت کے بہ قدر اشیائے صرف کا کسی طرح انتظام ہوجائے۔ اب مخفی بے روزگاروں میں سے ایک شخص کو روزگار فراہم کیا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اب تک جو اشیا اس کے صَرف میں تھیں وہ بچ رہیں گی۔ اِس مفروضے پر کہ باروزگار ہونے کے بعد مخفی بے روزگار

کا خرچ دوگنا ہو جاتا ہے، اب مخفی بے روزگاروں میں سے ایک اور آدمی کو روزگار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ شروع میں ہم اگر ایک مزدور کے لیے صرفی اشیا کا انتظام کرلیں تو نہ صرف ایک بلکہ دو مزدوروں کو روزگار سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ روزگار میں مجموعی اضافہ ابتدائی اضافے کا دوگنا ہوگا۔ ابتدائی اور مختتم روزگار کا یہ رشتہ اشیائے صرف کے "ملٹی پلائر" سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح اگر ہم ایک مزدور کے لیے اشیائے صرف مہیا کردیں تو اشیائے صرف کے اس اضافے کی وجہ سے روایتی سکٹر میں اتنی اشیائے صرف فاضل ہو جائیں گی کہ اس سکٹر سے ایک کے بجائے دو آدمیوں کو منتقل کیا جا سکے گا اور انھیں کام دیا جا سکے گا۔ یہاں اشیائے صرف "ملٹی پلائر" دو ہے جو ایک مزدور اور ایک مخفی بے روزگار کے صرف کے الٹے فرق کو مزدور کے صرف تقسیم دینے سے حاصل ہوتا ہے۔

آئیے ملٹی پلائر کے اس نظریے کو زیادہ آسان طریقے سے دیکھیں۔ فرض کیجیے کہ ایک مخفی بے روزگار پہلے اشیائے صرف کا ایک یونٹ استعمال کرتا تھا (یعنی کھانے اور کپڑے کی کم سے کم مقدار) جب یہ مزدور منظم سکٹر میں جاکر باحاصل بن جاتا ہے تو اس کو ان اشیائے دو یونٹ درکار ہوتے ہیں (یعنی کم سے کم کھانے اور کپڑے پر مشتمل ایک یونٹ جو وہ پہلے استعمال کرتا تھا اور ایک مزید یونٹ جو اس کو کارکرد مزدور بنانے میں مدد کرے) اگر شروع میں ہم اشیائے صرف دو یونٹ مہیا کرلیں تو روایتی سکٹر کے ایک مخفی بے روزگار کو منظم سکٹر میں لا سکتے ہیں۔

مزید اگر ہم یہ بھی فرض کرلیں کہ یہ مخفی بے روزگار جب اپنے کھیت کو چھوڑ کر نئے کام پر آئے گا تو اشیائے صرف کا وہ یونٹ جو وہ صرف کرتا تھا اپنے ساتھ لائے گا اور اُس کو حکام کے حوالے کردے گا کیوں کہ نئے پیشے میں اس کے لیے دو یونٹ مہیا کردیے گئے ہیں، ایسی صورت میں ہم ایک اور مخفی بے روزگار کو منظم سکٹر میں لا سکتے ہیں بشرطیکہ وہ بھی اشیائے صرف کا وہ ایک یونٹ اپنے ساتھ لائے جو مخفی بے روزگاری کی صورت میں اُس کے استعمال میں تھا۔ اب ایک یونٹ چوں کہ ہمارے پاس پہلے سے موجود ہے اور ایک یونٹ آنے والا بے روزگار خود لائے گا، ہمیں اُس کو منظم سکٹر میں لانے میں دقت نہ ہوگی۔

یہی بات اصطلاحی زبان میں یوں کہی جا سکتی ہے کہ ابتدا میں صرفی اشیا کی کافی مقدار فراہم کرنے کے بعد یہ ضروری ہوگا کہ روایتی سکٹر کی ممکن بچت کو موثر ٹیکسوں کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ صرف تب ہی مخفی بے روزگاروں کی بڑی بڑی تعداد کو منظم سکٹر میں کام سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو صرفی اشیا کا ملٹی پلائر ایک ایسا بلند تصور بن جاتا ہے جو الٰہ دین کے چراغ کی طرح غریبی کے اٹوٹ چکر کو خوش حالی کے صالح عمل میں بدل دیتا ہے۔ لیکن اگر قدرے دوسرے زاویے

سے دیکھا جائے تو اس کی ساری چمک دمک ختم ہو جاتی ہے اور یہ اس بنیادی خیال کی عام فہم صورت اختیار کر لیتا ہے کہ "ملٹی پلائر" کی ضمانت روایتی سکٹر (جس کا خاص پیشہ زراعت ہے) کے سرپلس یا فاضل پیداوار کی موثر رہائی پر منحصر ہے۔

ایک کم ترقی یافتہ ملک کی ترقی کا عمل شروع کرنے کے لیے صَرفی اشیا کے "ملٹی پلائر" کا تصور کرنے کی بجائے ہم ان ساری باتوں کو زیادہ سادہ طریقے سے پیش کر سکتے ہیں۔ عام فہم انداز میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہم ایک مخفی بے روزگاری صَرفی اشیا کی کمی پوری کر سکیں یعنی منظم سکٹر میں آنے کے بعد اُس کی زائد ضروریات کا انتظام کر سکیں تو غالباً وہ منظم سکٹر جا رہ سکتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سارے مخفی بے روزگار منظم سکٹر میں لائے جا سکتے ہیں بشرطیکہ ہر فرد کی صَرفی اشیا کی کمی پوری کی جا سکے اور خاندان کی ممکن بچت کے اس حصے کو حاصل کیا جا سکے جو پہلے بے روزگار لوگوں کے صرف میں تھا۔ اس بیان سے یہ ظاہر ہے کہ صرفی اشیا کے ملٹی پلائر کے ذریعے ترقی کا عمل شروع ہونے سے پہلے صرفی اشیا کی ابتدائی قلت کافی کم کی جائے۔ دقت یہ ہے کہ اگر کم ترقی یافتہ ملک کے محدود وسائل کو اُن صنعتوں کی ترقی میں لگایا جائے جو صرفی اشیا پیدا کرتی ہیں اور بنیادی صنعتوں کے قیام پر معقول توجہ نہ دی جائے تو آگے چل کر صَرفی اشیا کی صنعتیں بھی مشینری کی کمی کی وجہ سے مدھم پڑنے لگیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ پلاننگ کمیشن اپنے محدود وسائل کو بھاری صنعتوں کے قیام پر لگا رہا ہے تاکہ آگے چل کر صَرفی اشیا کی صنعتوں کی ترقی کا پروگرام جاری رکھا جا سکے۔ وسائل کی کمی کی وجہ سے کمیشن نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ابتدا میں چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی مدد سے صَرفی اشیا کی رسد بڑھائی جائے۔ توقع ہے کہ اُن مخفی بے روزگاروں کی صرفی ضروریات جو آب پاشی، باندھ اور سڑکیں بنانے کے کاموں میں لگائی جائیں گی۔۔ انہیں چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی بڑھتی ہوئی پیداوار سے پوری ہوں گی

اس کے علاوہ زیادہ تر چھوٹے تعمیری پروجیکٹ اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروجیکٹ جہاں اِن مخفی بے روزگاروں کو لگانے کا امکان ہے، خاندانی کھیتوں سے قریب ہیں جہاں یہ لوگ پہلے [illegible] ۔ [illegible] موروثی کھیتوں سے کم از [illegible] حاصل کر سکیں [illegible] اُن کے حصے میں آتا تھا۔ یہ نکتہ نہیں دوسری رکاوٹ [illegible]

[illegible] منظم سکٹر کی صنعتوں میں کام کرنا ہے جو ان کے کھیتوں سے بہت [illegible] ہے کہ بہت دور کام کرنے کی وجہ سے

بیشتر ایسا ہوگا کہ خاندان کے لوگ اُس کو غیر حاضر رکن تصور کرکے اس کا حصہ اس کو دینے کی بجائے اپنے اوپر صرف کرلیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ممکن بچت جو ترقی کا بنیادی وسیلہ ہے رفتہ رفتہ گھٹتی جائے گی۔ ٹیکس کے کسی کڑے نظام کے بغیر ممکن بچت کو حاصل کرنا مشکل ہے۔ لیکن ہندوستان جیسے جمہوری ملک کے دیہاتی باشندے شاید ایسے جبری طریقوں کو برداشت نہ کرسکیں۔

چنانچہ مخفی بے روزگاروں کو اُن کے موروثی کھیتوں سے بہت دور کارخانوں میں بھیجنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اسی لیے ہمارے پانچ سالہ منصوبوں میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ بیشتر مخفی بے روزگاروں کو معمولی تعمیری پروجیکٹوں، کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروجیکٹوں اور گھریلو صنعتوں میں لگایا جائے جو دیہی سکٹر کے موروثی کھیتوں سے قریب ہوں۔ اس کے علاوہ مخفی بے روزگاروں کو یہ ترغیب دینا مشکل ہوتا ہے کہ وہ اپنے مانوس ماحول کو چھوڑ کر منظم سکٹر کی زندگی سے خود کو ہم آہنگ کریں۔ ایسی صورت میں اجرت کی ترغیب بھی شاید کافی نہ ہو۔

اس مشکل کے پیشِ نظر پلاننگ کمیشن نے مخفی بے روزگار لوگوں کے مسئلے کو حقیقت پسندانہ انداز سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستان کے ماہرینِ منصوبہ بندی اُمید کرتے ہیں کہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروجیکٹ اور چھوٹے تعمیری پروجیکٹوں کو گاؤں کے اندر یا اُن سے قریب قائم کرکے اور دیہی گھریلو صنعتوں کو ترقی دے کر مخفی بے روزگاروں کو رفتہ رفتہ روزگار سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ دُرست ہے کہ یہ بہت سادہ اور معمولی حل ہے لیکن شاید اس سے بہتر ہے جو حرفی اشیا کے ملٹی پلائر کے تصور کی بنیاد ہے۔ یہ اس لیے بھی بہتر ہے کہ یہ مسئلے کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھتا ہے اور یہ تسلیم کرتا ہے کہ مخفی بے روزگاروں کی اتنی بڑی فوج کو منظم سکٹر کے دورافتادہ کاموں میں تیزی سے منتقل کرنا مشکل ہے۔

حصّہ اوّل کا ضمیمہ

معاشی ترقی کی علامتیں — تقابلی جائزہ

ٹیبل ۱ — ۱

مستقل قیمتوں کے مطابق فی کس پیداوار کا انڈکس نمبر

۱۹۵۳ = ۱۰۰

سال	ہندوستان xx	ازرائیل xx	ٹرکی xx	برما x	برطانیہ x	امریکہ	کناڈا xx §
۱۹۳۸	-	-	۷۷	-	-	۵۸	۵۵
۱۹۳۹	-	-	-	-	-	۶۲	۵۹
۱۹۴۸	۹۲	-	۷۹	۹۶	۸۸	۸۹	۸۵
۱۹۵۰	۹۲	۱۰۲	۷۸	۸۰	۹۳	۹۱	۹۱
۱۹۵۱	۹۳	۱۰۵	۸۸	۹۰	۹۷	۹۶	۹۴
۱۹۵۲	۹۶	۱۰۳	۹۳	۹۴	۹۷	۹۷	۹۹
۱۹۵۳	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰
۱۹۵۴	۱۰۱	۱۲۰	۸۸	۱۰۳	۱۰۴	۹۷	۹۴
۱۹۵۵	۱۰۲	۱۲۸	۹۲	۱۰۹	۱۰۷	۱۰۳	۱۰۰
۱۹۵۶	۱۰۵	۱۳۳	۹۶	۱۱۰	۱۰۸	۱۰۳	۱۰۵
۱۹۵۷	۱۰۶	۱۳۶	۹۸	۱۱۹	۱۱۰	۱۰۳	۱۰۱
۱۹۵۸	۱۰۸	۱۳۹	۱۰۲	۱۲۳	۱۱۳	۱۰۳	۱۰۴

x فی کس خام گھریلو پیداوار بازار کی قیمتوں کے مطابق

+ فی کس خام قومی پیداوار " " "

xx فی کس قومی آمدنی (فی کس خالص قومی پیداوار عوامل کی لاگت کے مطابق

§ ۱۹۵۰ سے پہلے اس میں نیو فاؤنڈلینڈ شامل نہیں ہے۔

ماخذ: STATISTICAL YEAR BOOK 1961. U.N

ٹیبل ۱ — ۲

صنعتوں سے حاصل ہونے والی پیداوار کا فی صد

سنہ ۱۹۴۹-۵۲ء، سنہ ۱۹۳۹ء، سنہ ۱۹۳۸ء

	۱۹۳۸	۱۹۳۹	۱۹۴۹	۱۹۵۰	۱۹۵۱	۱۹۵۲
کم آمدنی والے ملک						
مصر	–	۸.۶۰	–	۱۱.۴۰	–	–
× ہندوستان	–	–	۱۵.۶۹	۱۵.۶۳	–	–
+ برازیل	–	–	–	۲۳.۶۳	–	–
جاپان	۲۳.۶۱	–	۲۶.۴۹	۲۵.۰۷	۲۵.۰۶	۲۲.۶۸
فلپائن	–	–	۱۱.۴۶	۱۲.۶۰	۱۳.۰۵	۱۳.۶۵
تھائی لینڈ	[illegible]	–	۱۱.۶۵	۱۲.۶۷	–	–
ٹرکی	۱۱.۶۶	–	۱۱.۴۳	۱۰.۶۰	–	–
زیادہ آمدنی والے ملک						
کناڈا	۲۳.۶۰	–	۲۹.۶۳	۲۳.۶۹	۲۳.۶۹	۲۷.۶۳
×× برطانیہ	–	–	۳۵.۶۷	۳۹.۶۲	۳۶.۶۹	۳۵.۶۸
§ امریکہ	۲۲.۶۳	۲۳.۶۸	۲۹.۲۳	۸۱.۶۲	۳۲.۶۰	۳۱.۶۱

× تعمیر شامل ہے

+ کانیں اور رفاہ عامّہ کے کام شامل ہیں

×× STOCK EVALUATION ADJUSTMENT سے پہلے

§ اعداد و شمار جن پر یہ فی صد مبنی ہیں پبلک انٹرپرائز کا منافع شامل نہیں ہے۔

ماخذ: PROCESSES, PROBLEMS OF INDUSTRIALISATION IN UNDERDEVELOPED COUNTRIES 1955 U.N P. 105

برطانوی ہندوستان میں معاشی سرگرمیوں کے منتخب نشانات

ٹیبل ۱ — ۳
ہندوستان کی ایشیائی برآمد
(ملین روپے)

سال	درآمد	برآمد
۱۹۰۰-۱۹۰۱ ۱۹۰۴-۱۹۰۵	۸۳۶۶۲	۱۳۱۰۶۱
۱۹۱۰-۱۹۱۱ ۱۹۱۳-۱۹۱۴	۱۵۳۰۶۵	۲۲۸۳۶۰
۱۹۱۹-۱۹۲۰ ۱۹۲۳-۱۹۲۴	۲۵۴۰۳	۲۸۹۳۴
۱۹۳۵-۱۹۳۶ ۱۹۳۹-۱۹۴۰	۱۵۰۲۳	۱۸۰۸۶۵

SOURCE: H. VENKATA SUBBIA. THE FOREIGN TRADE OF INDIA 1900—1940

ٹیبل ۱ — ۴
ہندوستان اور سیلون میں لگا ہوا برطانوی سرمایہ ۱۹۱۰-۱۹۰۹ء

سرکاری بانڈ	£ ۱۶۹,۹۹۵,۰۰۰
ریلوے	£ ۱۳۶,۵۱۹,۰۰۰
چائے اور کافی کے باغات	£ ۱۹,۹۴۴,۰۰۰
ربڑ	£ ۴,۹۱۰,۰۰۰
کانیں	£ ۳,۵۲۱,۰۰۰
بینک	£ ۳,۴۰۰,۰۰۰
صنعت و حرفت اور تجارت	£ ۲,۶۳۶,۰۰۰
مختلف قسم کے بانڈ، ٹرام وغیرہ، تار، ٹیلی فون، گیس، پانی، بجلی اور پاور	£ ۱۹,۰۵۳,۰۰۰
میزان	£ ۳۶۵,۳۹۹,۰۰۰

ماخذ: SIR GEORGE PAISH GREAT BRITAINS'S CAPITAL INVESTMEN IN INDIVIDUAL COLONIES, FOREIGN COUNTRIES" JOURNAL OF THE ROYAL STATISTICAL SOCIETY VOL 74 1910 - 1911

ٹیبل ۱-۵

برطانوی ہندوستان کے صنعتی کاروبار

کارکنوں کی اوسط تعداد ـــ ۲۰ یا اس سے زیادہ

(۱۹۳۵)

کاروبار کی تقسیم	تعداد	کارکنوں کی تعداد	فی صد
ٹکسٹائل، خاص کر روئی اور جوٹ	۷۵۳	۸۲۶,۳۴۱	۴۴٫۹۵
کھانے اور پینے کی اشیا اور تمباکو	۲۹۵۷	۲۵۷,۵۸۳	۱۳٫۹۹
انجینئرنگ، خاص کر ریلوے ورکشاپ	۸۸۹	۲۲۰,۵۸۷	۱۱٫۹۸
روئی دھنکنے کی مشینیں اور شکنجے	۲۰۲۹	۲۱۹,۲۳۳	۱۱٫۹۱
ٹائل، اینٹیں، شیشے کے کارخانے اور آرے	۵۳۲	۸۷,۰۹۹	۴٫۷۳
کیمیاوی اشیا	۵۱۴	۶۴,۵۴۲	۳٫۵۰
معدنیات اور دھاتیں، خاص کر لوہا اور فولاد	۱۴۴	۵۸,۱۵۹	۳٫۱۶
کاغذ اور طباعت	۲۵۴	۴۵,۹۲۳	۲٫۴۹
چمڑے سے بنی چیزیں اور جوتے	۴۸	۱۰,۱۷۹	۰٫۵۵
متفرق	۲۲۲	۵۲,۲۸۵	۲٫۸۴
میزان	۹۲۹۱	۱,۸۴۰,۶۹۲	۱۰۰٫۰۰

ٹیبل ۱-۶

زمین کا استعمال (ملین ایکڑ)

مجموعی رقبہ جس کا سروے کیا گیا	۶۶۰
جو زراعت کے لیے دستیاب نہیں ہے	۱۲۱
جنگلات	۸۸
زراعت کے لیے دستیاب	۲۵۱
غیر مزروعہ	* ۱۱۲
پرتی	۵۹
سال میں ایک فصل	۲۲۲
سال میں دو فصل	۲۹

* اگر علاقے کی صفائی ہوجائے اور آب پاشی کا انتظام ہوجائے تو کھیتی کے لائق ہوسکتا ہے۔

SOURCE: ADAPTED FROM TABLES APPEARING IN STATISTICAL ABSTRACTS FOR BRITISH INDIA (1935-1936)

ٹیبل ۱ـــ ۷

برطانوی ہندوستان میں محنت کے ناکافی استعمال کا تخمینہ

سنہ ۱۹۴۰ - ۴۱ء

ہندوستانی صوبے	کسانوں میں مزدوروں کی تعداد (ملین)	مزدوروں کی تعداد فی مربع کیلومیٹر مزروعہ رقبہ	محنت کے استعمال کا فی صد
بنگال	۱۱.۶۱	۶۱	۶۰
یو-پی	۱۲۶۴	۵۳	۵۹
پنجاب	۴۶۲۵	۲۲	۵۰
بہار اور اڑیسہ	۹.۲۵	۴۹	۹۷ زیادہ سے زیادہ
بمبئی	۳.۲۱	۱۶	۸۳

ALL INDIA CONGRESS COMMITTEE AGRARIAN REFORMS SUB-COMMITTEE REPORT 1949.

حصّہ دوم

ہندوستانی معیشت اور منصوبہ بندی

باب ۴

منصوبہ بندی کے بنیادی اصول :

" دراصل ساری معاشی زندگی میں منصوبہ بندی کو دخل ہے۔ منصوبہ بنانے کے معنی ہیں مقصد کو منتخب کرنا اور اُس کے حصول کے لیے عمل کرنا۔ انتخاب معاشی سرگرمی کی جان ہے"۔ یہ الفاظ پروفیسر رابنس کے ہیں۔ اِس سے یہ ظاہر ہے کہ کوئی معاشی سرگرمی جو کسی معیّن مقصد کے لیے کی جاتی ہے اُس میں کسی نہ کسی طرح کے منصوبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ منصوبہ بندی کی عام اور وسیع تعریف ہے۔ معاشیات کے طالب علم کے لیے منصوبہ بندی کے معنی ہیں شعوری اور ارادی طور سے مرکزی کنٹرول کا عمل شروع کرنا تاکہ معیّنہ مقصد کے حصول کے لیے سماجی ڈھانچہ بدلا جائے اور قدرتی وسائل سے استفادہ کیا جائے۔ منصوبہ بنانے والوں کا بنیادی کام یہ ہے کہ منصوبے کے مقاصد حاصل کرنے کے سستے طریقے دریافت کریں۔ اُن کو اِس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ منصوبہ بند معیشت کے ہر سکٹر کی معیّنہ پیداوار تک کم سے کم خرچ کرکے پہنچا جائے۔

منصوبہ بندی کے معنی : منصوبہ بندی کیسے کی جاتی ہے اِس کا بہترین اندازہ تب ہوسکتا ہے جب ہم یہ سمجھ لیں کہ منصوبہ بنانے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو مستقبل کی خوش حالی کا نقشہ تیار کرتے ہیں اور اس کو ٹھوس شکل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ نقشہ بناتے وقت منصوبہ بنانے والوں کو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ ملک کی معاشی ترقی کی موجودہ سطح کیا ہے اور کس طرح حاصل وسائل سے مختلف پیداواری حلقوں کے مطالبات پورے کیے جائیں کہ قومی وسائل کا بہترین استعمال ہوسکے۔ اِس طرح ہم دیکھیں گے کہ منصوبہ بندی ایک شعوری اور پہلے سے سوچا سمجھا عمل ہے جو حکومت اِس لیے شروع کرتی ہے تاکہ ملک کی ممکن دولت کا تخمینہ ہوسکے اور معیّنہ طویل المدّت مقاصد کے حصول کے لیے وسائل کو بہترین طریقے سے استعمال کیا جائے۔ دوسرے لفظوں

میں معاشی منصوبہ بندی کا مقصد قومی وسائل کو پورے ملک کے بہترین مفاد میں استعمال کرنا ہے۔ یہ کیسے کیا جائے؟ اس کا انحصار ملک کے معاشی حالات، اس کی ترقی کی منزل، اس کے سماجی ڈھانچے اور اس کی طرزِ حکومت پر ہوتا ہے۔

کمیونسٹ اور جمہوری منصوبہ بندی کا مقابلہ :

منصوبہ بندی میں روس کی حیثیت رہنما کی ہے۔ روس نے سخت اور کلیتی منصوبہ بندی اختیار کی جس کو اشتراکی منصوبہ بندی کہا جاتا ہے۔ روس نے اپنی معیشت کو اشتراکی شکل دینے کی بے باک کوشش کی۔ اس عمل میں نجی کاروبار اور فری مارکٹ کا منظم طریقے سے صفایا کیا گیا۔ سویٹ ماہرینِ معاشیات بنیادی صنعتوں کی شان دار ترقی کے خواہاں تھے جس کی وجہ سے صرفی اشیا کی صنعتوں کو نظر انداز کیا گیا اور روسی عوام کو بڑی صعوبتوں اور اشیا کی قلت کا سامنا کرنا پڑا۔ چوں کہ روس روزانہ کے کاموں کو مکمل کرنے اور اپنے منصوبوں کو ہر قیمت پر پورا کرنے کی مسلسل اور بے پناہ جد و جہد میں مشغول تھا، اس لیے وہاں کی زندگی میں بڑی دُرشتی اور جمعیت بندی پیدا ہو گئی۔

اشتراکی طرز کی بے لوچ منصوبہ بندی کے برعکس ہمارے یہاں جمہوری منصوبہ بندی ہے۔ جمہوری منصوبہ بندی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ امریکہ نے ۱۹۳۰ء کے بعد کی بھیانک سرد بازاری کا مقابلہ کرنے کے لیے اور برطانیہ نے دوسری جنگِ عظیم کے بعد اپنی معیشت کو از سرِ نو تنظیم دینے کے لیے معمولی قسم کی منصوبہ بندی اختیار کی تھی۔ امریکہ اور برطانیہ میں منصوبہ بندی نے معاشی رشتوں کی شعوری ترتیبِ نو کی صورت اختیار کی جو وہاں کے اُس خود نظم اور خود کار نظام کی تکمیل کرتی تھی جس کی بنیاد آزاد مقابلہ اور نجی کاروبار تھا۔ اس قسم کی منصوبہ بندی سے عوامی بے اطمینانی اور سماجی اُلجھنیں پیدا کیے بغیر عوام کی حالت بہتر بنائی جا سکتی ہے۔ دوسری قسم کی منصوبہ بندی پہلی کے مقابلے میں زیادہ مرکزی، بھرپور اور جامع ہوتی ہے۔ یہ کمیونسٹ طرز کی بے لوچ اور جبری منصوبہ بندی اور معمولی قسم کی جمہوری اور فلاحی منصوبہ بندی کی بیچ کی راہ ہے اور شاید اُس کم ترقی یافتہ جمہوری ملک کے لیے زیادہ موزوں ہے جو معاشی ترقی کا بیڑا اٹھانا چاہتا ہے۔ اس [illegible] کرانے کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کو یہ دیکھنا ہوگا کہ قومی آمدنی میں لازمی اضافہ ہوتا رہے [illegible] اضافہ کا صرف میں نہ آنے پائے بلکہ اس کو سرمایے کی حیثیت سے لگایا جائے۔ لیکن ایک جمہوری ملک میں یہ تقریباً ناممکن ہے کہ ترقی کی خاطر صرف کو کم سے کم سطح پر رکھا جائے کیوں کہ جمہوری منصوبہ بندی میں عوام کی فلاح و بہبود کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ "لازمی ترقی" اور عوامی

بہبود کے دو متضاد مقاصد کے بیچ ایک راہ نکالنی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ہم نے یہی راہ اختیار کی ہے۔ ہندوستان کو انسانی آزادی اور وقار پر پورا اعتماد ہے اس لیے اس کے منصوبے زیادہ مرکزی اور مرتب ہونے کے باوجود بنیادی طور سے فلاح اور بہبود کی طرف ہیں۔ ہندوستان کے پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے منصوبے خوش ترتیب مرکزی منصوبہ بندی کے بہترین نمونے ہیں جن کا مقصد وسائل کا موثر استعمال ہے تاکہ ہندوستان جیسے کم ترقی یافتہ، درپس ماندہ ملک کے کروڑوں عوام کی بہبود کے لیے معیشت کو اونچا اٹھایا جائے۔ معاشی ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لیے مرکزی اور فلاحی منصوبہ بندی کو صرف اس لیے اختیار نہیں کیا گیا ہے کہ ہمارے یہاں جمہوری حکومت ہے بلکہ اس لیے کہ حکومت کے ارادی اقدام کے اثر سے اس سماجی نظام کی جڑیں خشک ہو رہی ہیں جو بیل گاڑی اور گھریلو صنعتوں کے معیار کی معاشی ترقی کے مطابق تھا۔ بہر کیف ہندوستانی معیشت میں فری مارکٹ کا اب بھی نمایاں رول ہے۔ منصوبوں سے جو معاشی نقشہ ابھر رہا ہے اس نے ایک ایسی مخلوط معیشت کو جنم دیا ہے جس میں سرکاری اور غیر سرکاری حلقے دوش بدوش چلتے ہیں۔

لازمی منصوبہ بندی اور اشاری منصوبہ بندی کا مقابلہ :

آج کل لازمی منصوبہ بندی اور اشاری منصوبہ بندی میں امتیاز کرنا ایک عام فیشن ہے۔ لازمی منصوبہ بندی میں ہدایت کی حیثیت حکم کی ہوتی ہے اور اشاری منصوبہ بندی کی ایک مثال فرانس ہے جہاں منصوبہ بندی کے شعبے کا کام تال میل پیدا کرنا ہے۔ شعبہ پلان کے صرف خدوخال ظاہر کر دیتا ہے۔ حلقہ وار تفصیلات نے چھوٹی کمیٹیاں معین کرتی ہیں۔ ان کمیٹیوں میں وہ سارے نمائندے ہوتے ہیں جنھیں فیصلوں کی تعمیل کرنی ہوتی ہے اور پلان کے نشانوں کو حاصل کرنا ہوتا ہے۔ یہاں کسی قسم کا جبر نہیں ہوتا بلکہ منصوبہ بندی ایک اشتراکی اور ہم آہنگ عمل ہوتا ہے جس کا انحصار پلاننگ کمیشن اور چھوٹی کمیٹیوں کے تعاون پر ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں لازمی منصوبہ بندی میں جبر کا شائبہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی پلاننگ کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی تعمیل کے لیے ایک با اختیار انتظامی مشینری ہوتی ہے جو چھوٹے سے چھوٹے معاشی یونٹوں کے لیے نشانے متعین کرتی ہے۔ یہ طے کرتی ہے کہ کس یونٹ میں کتنا سرمایہ لگنا ہے اور اس کی کتنی پیداوار ہوگی۔ ہندوستان کے پہلے تین منصوبوں میں لازمی منصوبہ بندی کی خصوصیات موجود تھیں۔

پس ماندہ علاقوں میں منصوبہ بندی کا طریقہ :

ہندوستان کے پانچ سالہ منصوبوں میں جو حکمتِ عملی اختیار کی گئی ہے اس کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اگر ہم کم ترقی یافتہ ملکوں کی منصوبہ بندی کے اس طریقے کا جائزہ لیں جو انھیں ترقی کا تیز عمل شروع کرنے کے لیے اپنانا چاہیے۔ کم ترقی یافتہ ملکوں کی منصوبہ بندی ایک شدید ضرورت بن جاتی ہے۔ پس ماندہ معیشتوں میں رواں آمدنی اور پیداآوری کی پست سطح بہت واضح طور سے نمایاں ہے۔ آمدنی اور پیداآوری بڑھانے کے لیے منصوبہ بندی کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ رواں ضرورتوں کو پورا کرنا ہے بلکہ اس لیے بھی کہ مستقبل میں خوش حالی اور ترقی کی منزل تک پہنچنا ہے۔

پس ماندگی کی حالت، جو ہمارا روزمرّہ کا مشاہدہ ہے، فی کس آمدنی کے توازن کے گرد متغیرین (VARIABLES) کا اُتار چڑھاؤ ظاہر کرتی ہے۔ کسی بھی معاشی حالت کے لیے ان متغیرین کی قدریں باہم مستقیم ہوتی ہیں۔ لیکن ایک کم آمدنی والی توازنی حالت جو ایک پس ماندہ ملک کو نیم جامد حالت میں رکھتی ہے، مقناطیس کا کام کرتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ متغیرین کی قدریں اُس کے قریب مرتکز ہوتی ہیں۔ خود رفتار ترقی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ترقی کے ابتدائی محرکات ایک عمل پذیر کم سے کم سائز کے ہوں (CRITICAL MINIMUM SIZE) پس ماندہ ملکوں میں طویل المدت معاشی ترقی اس لیے عمل میں نہیں آتی کیوں کہ محرکات کا سائز کم ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ پس ماندگی سے نجات کے لیے ترقیاتی مسائل سے متعلق بنیادی محرّکات کو کافی توانا ہونا چاہیے اور نئے سرمائے کا حجم عمل پذیر کم سے کم سائز سے اونچا ہونا چاہیے تاکہ آمدنی بڑھانے والی ترغیب یافتہ قوتیں آمدنی گھٹانے والے پیدا شدہ عوامل کو بے اثر کردیں۔ ایسی حالت میں پس ماندہ معیشتوں کی حکومتیں اہم رول ادا کرسکتی ہیں اور ایسے پُرعزم ترقیاتی منصوبے بنا سکتی ہیں جن کا مقصد ان محرکات کو ترقی دینا ہو جو سرمائے کے حجم کو موثر طریقے سے بڑھا سکیں۔

وہ مدّت جب معیشت کو نیم جامد حالت سے اُٹھانے کے لیے حوصلہ مند منصوبے شروع کرتے ہوتے ہیں، اُڑان بھرنے کی منزل یا ٹیک آف کا اسٹیج کہلاتا ہے۔ "ٹیک آف" کے زمانے میں ترقی کا عمل کافی تیز ہونا چاہیے۔ یہ صرف تب ممکن ہے جب زائد پیداوار یا 'سرپلس' اتنا ہو کہ سرمائے میں نمایاں فرق ہوسکے۔ اِس سے ترقی کو وہ ضروری رفتار ملے گی جس سے ایک ترقی یافتہ معیشت اِس قابل ہوگی کہ ایک نارمل اور خود رفتار معاشی ترقی کا عمل شروع کرسکے۔ چنانچہ دقتفوقتاً

سوال بہت اہم ہے۔ معیشت کو ابتدائی جمود کی حالت سے ایک خود رفتار ترقی کی مختتم سطح تک پہنچنے کے لیے "ٹیک آف" کی کتنی مدت ہونی چاہیے۔ پروفیسر راسٹاف، جنھوں نے 'ٹیک آف' کی اصطلاح کو معاشیات کے ادب میں رائج کیا، یہ مدت بیس سے پچیس سال کے درمیان بتاتے ہیں۔ اِن تخمینے میں بہت سے ان ملکوں کے ارتقا کے عمل کا لحاظ رکھا گیا ہے جو معاشی ترقی کی ؛ اونچی سطح پر پہنچ چکے ہیں۔ غرض کہ ٹیک آف کی مدت بہت اہم ہے۔ ایک نیم جامد حالت سے ٹیک آف کی منزل تک اور اُس کے آگے خود رفتار ترقی کی آخری سطح تک پہنچنے کے لیے موثر اور با ترتیب منصوبہ بندی ہونی چاہیے۔

کم ترقی یافتہ ملکوں میں صورت کچھ ایسی ہے کہ اگر سرمایہ چھوٹی چھوٹی مقدار میں لگایا گیا تو نہ یہ موثر ہوگا اور نہ معاشی ترقی کا تیز عمل شروع کرنے میں کامیاب ہوگا۔ معیشت کو نیم جامد اور نیم ساکت حالت سے اٹھانا صرف تب ممکن ہے جب بجلی، نقل وحمل اور رسل و رسائل کی ترقی پر اور بنیادی صنعتوں کی تعمیر پر کافی مقدار میں سرمایہ لگایا جائے۔ سرمائے کے اِس ابتدائی استعمال سے ہی کم ترقی یافتہ ملک میں ٹیک آف کی مدت، جو جمود اور خود کار ترقی کے درمیان کی مدت ہوتی ہے، مختصر کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ماہرینِ منصوبہ بندی کا یہ بنیادی کام ہے کہ وہ منصوبہ بندی کے ایسے طریقوں پر زور دیں جس سے بجلی، نقل وحمل اور بنیادی صنعتوں میں نمایاں ترقی ہو سکے۔ چوں کہ ایسے کاموں سے نفع فوراً نہیں حاصل ہوتا، اِس لیے نجی سرمایہ اُن کی طرف بہت کم راغب ہوتا ہے۔ ترقیاتی منصوبہ بندی کی بنیادی حکمت عملی یہ ہونی چاہیے کہ سرکار بنیادی اور بھاری صنعتوں، رسل و رسائل کی سہولتوں اور بجلی کے کارخانوں کی ترقی جلد از جلد عمل میں لائے۔

بنیادی صنعتوں کی توسیع سے نئے سرمائے کے لیے راستہ ہموار ہوگا۔ در حقیقت بنیادی صنعتوں پر زور دینے سے منصوبے کے دوران سرمایہ لگنے کی رفتار تیزی سے بڑھے گی۔ ایک ترقی پذیر معیشت کی یہی بنیادی خصوصیت ہوتی ہے اور اسی سے ٹیک آف کا مرحلہ شروع ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کم ترقی یافتہ معیشت میں ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لیے سرمایہ کافی مقدار میں اور مسلسل لگتے رہنا ضروری ہے۔ اگر منصوبہ بندی کے ابتدائی دور میں بھاری صنعتوں کی ترقی کو صنعتی پروگرام میں ترجیح دی جائے تو اِس مقصد کا حصول آسان ہو جاتا ہے۔

نقل وحمل، آب پاشی اور بجلی کی ترقی سے منڈی کا پھیلاؤ بڑھتا ہے اور نئے سرمائے کو

وسیع پیمانے پر لگنے کی ترغیب ہوتی ہے۔ چوں کہ حکومت اِن سہولتوں کی فراہمی پر کافی خرچ کرے گی اِس لیے سرمائے کی تخلیق کی شرح تیز ہوگی اور عوام کی فلاح و بہبود میں اضافہ ہوگا۔ جب تک بجلی، رسل و رسائل اور آب پاشی کی سہولتیں نہیں ترقی کرتیں معاشی نشو و نما کا تیز عمل نہیں شروع ہو سکتا اور نیم جامد معاشی حالت سے ٹیک آف کی منزل پہنچنے میں عموماً تاخیر ہوتی ہے۔

اگر ہم معاشی ترقی کے بنیادی اور فیصلہ کن عناصر کا جائزہ لیں تو بھاری صنعتوں، رسل و رسائل آب پاشی اور بجلی کی ترقی میں ریاست کے رول کی اہمیت زیادہ واضح ہو جائے گی۔ اِس کو آسان لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جمہوری قسم کی منصوبہ بندی میں معاشی ترقی کا انحصار جن باتوں پر ہوتا ہے وہ یہ ہیں: (۱) معاشی ترقی اور عوام کی فلاح و بہبود میں اضافے کے لیے سرکاری صرف کا حجم (۲) سرمائے کی تخلیق کی شرح (نئے سرمائے کی آمد) (۳) سماجی سیاسی اسباب، خصوصاً وہ جن کا تعلق عوام کے تعاون، عوامی جوش و خروش، اور سماجی ڈھانچے میں تبدیلی سے ہوتا ہے۔ اگر ہم معاشی ترقی کی شرح تیز کرنا چاہتے ہیں تو مناسب پروجیکٹوں پر سرکاری صرف کی مقدار بڑھانی ہوگی، نئے سرمائے کی آمد میں اضافہ کرنا ہوگا۔ سماجی ڈھانچے کو دُرست کرنا ہوگا اور عوامی جوش و خروش کے دروازے کھولنے ہوں گے۔ بنیادی صنعتوں میں نمایاں ترقی اور نقل، آب پاشی اور بجلی کی سہولتوں میں نمایاں توسیع سے نئے سرمائے کا بہاؤ یقیناً بڑھے گا اور سرمائے کی تخلیق کا عمل تیز ہوگا۔ سرمایہ کی تخلیق کی اونچی شرح کی وجہ سے پس ماندہ معیشت اِس قابل ہوگی کہ ٹیک آف کی منزل سے خود رفتار ترقی کی منزل تک پہنچ سکے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ کم ترقی یافتہ ملکوں میں عموماً نجی سرمایہ کار بجلی اور نقل و حمل جیسی بھاری صنعتوں میں سرمایہ لگانے سے گھبراتے ہیں۔ سرکاری صرف کم از کم ابتدائی زمانے میں بہت زیادہ ہوگا کیوں کہ ضروری سرمائے کا بڑا حصّہ حکومت کو ایک ہی وقت میں لگانا ہوگا۔ حکومت کے بڑھتے ہوئے صرف کی وجہ سے معاشی ترقی کی رفتار تیز ہوگی لیکن جمہوری ماہرین منصوبہ بندی کو صرف معاشی ترقی کی اونچی شرح کا ہی لحاظ نہیں رکھنا ہے بلکہ انھیں عوامی فلاح و بہبود کا خیال رکھتے ہوئے حاصل وسائل کو سوچ سمجھ کر سرکاری پروجیکٹوں میں تقسیم کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک کم ترقی یافتہ زراعتی ملک کو سرکاری خرچ کا ایک حصّہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور دیہی ایکسٹنشن کی طرف منتقل کرنا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے سرمائے کی تشکیل کی شرح اونچی کرنے میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ بھاری صنعتوں پر سرکاری خرچ بڑھنے کی وجہ سے بھاری مشینوں اور آلات کی رسد بڑھ جاتی ہے اور اِس طرح سرمائے کی تخلیق کی شرح اونچی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جب سرکاری

خرچ کمیونٹی ڈیولپ منٹ اور رورل اکسٹنشن کے کاموں پر ہوتا ہے تو یہ شرح گھٹ جاتی ہے۔ چنانچہ ایک جمہوری اور فلاحی قسم کی منصوبہ بندی کو ایک ایسی بیچ کی راہ نکالنی ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ معاشی ترقی بھی ہو اور عوام کی فلاح و بہبود میں بھی اضافہ ہو۔

جمہوری منصوبہ بندی میں عوامی تعاون بہت اہم رول ادا کرتا ہے۔ دیہی زندگی میں نئی جان ڈالنے اور اُسے ترقی دینے کے لیے کمیونٹی ڈیولپ منٹ اور رورل اکسٹنشن پروجکٹوں پر مناسب زور دینے کی ضرورت ہے۔ اس سے دیہی عوام میں نیا اعتماد پیدا ہوگا اور ان کے خیالات میں بلندی آئے گی جو ایک زرعی ملک کی ترقی میں مدد کرے گی۔ درحقیقت عوامی جوش و خروش اور تعاون سماجی اور سیاسی عوامل کو متحرک کر کے معاشی ترقی کی رفتار بڑھاتے ہیں۔

اب ہم کم ترقی یافتہ زراعتی ملک میں کی جانے والی جمہوری منصوبہ بندی کے بنیادی اصولوں کا خلاصہ کرسکتے ہیں۔ منصوبہ بندی کا بنیادی مقصد تیز ترقی ہونا چاہیے تاکہ ایک نیم جامد معیشت کو تیز ترقی پذیر معیشت میں بدلا جاسکے۔ بنیادی صنعتوں، نقل و حمل، آب پاشی اور بجلی کی ترقی پر سرکار کو بڑے پیمانے پر خرچ کرنا ہوگا کیوں کہ ان پر ہی صنعتی ترقی کا انحصار ہے۔ ان کی وجہ سے سرمایہ کی تخلیق کی شرح بڑھے گی اور چوں کہ سرکاری خرچ میں اضافہ ہوگا اس لیے معاشی ترقی کی رفتار بھی تیز ہوگی۔

لیکن ایک جمہوری اور مائل بہ فلاح ریاست میں ایسی ترقی سے گریز کرنا چاہیے جس کی رفتار بے حد تیز ہو اور جس میں فلاح کے بنیادی مقصد کی طرف کم توجہ ہو۔ چنانچہ سماجی اور سیاسی عوامل کو اس طرح اثرانداز کرنا ہوتا ہے کہ عوام کو یہ محسوس ہو کہ پلان سے انھیں فائدہ پہنچ رہا ہے اور اس احساس کی وجہ سے عوام کا تعاون خودبخود حاصل ہوجائے۔ ایک زراعتی معیشت میں کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروجکٹ دیہی عوام کے دلوں میں نئی اُمیدیں اور اُمنگیں پیدا کرنے میں اہم رول ادا کرسکتے ہیں۔ اس لیے منصوبہ بندی کی پالیسی یہ ہونی چاہیے کہ بیک وقت بھاری صنعتوں، نقل و حمل اور بجلی کی بھی ترقی ہو اور آب پاشی اور کمیونٹی ڈیولپ منٹ کے کام بھی فروغ پائیں۔

ہم نے اپنے پانچ سالہ منصوبوں میں یہی حکمتِ عملی اختیار کی ہے۔ ہندوستان کے دوسرے اور تیسرے پلان میں بنیادی صنعتوں کی ترقی اور نقل و حمل اور بجلی کی توسیع پر زیادہ زور دیا گیا کیوں کہ ان سے اُن دو عناصر کو تحریک ہوتی ہے جو ترقی کی شرح کا تعین کرتے ہیں۔ یہ دو عناصر ہیں: سرکاری خرچ کی مقدار اور نئے سرمائے کا بہاؤ۔ لیکن چوں کہ ہندوستانی پلان جمہوری اور فلاحی

منصوبہ بندی کے بُنیادی تجربے ہیں اِس لیے خرچ کا ایک حصّہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور دوسرے فلاحی پروجیکٹوں کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ اِس کی وجہ سے سماجی اور سیاسی عوامل کو صحیح رُخ پر چلنے میں مدد مل رہی ہے اور خود رفتار معاشی ترقی کے لیے زمین ہموار ہوتی ہے۔

معاشی ترقی کی شرح کا تعین کرنے والے عناصر کے تجزیے سے منصوبہ بندی کا بُنیادی طریقہ برآمد ہوتا ہے جس کو ماہرین منصوبہ بندی کامیابی سے صرف تب استعمال کرسکتے ہیں جب ترقی کی دو ضمنی اور ناگزیر ضرورتیں پوری ہوں۔ پہلے تو پیداآوری کے اُس ذخیرے کو موثر طریقے سے کام میں لایا جائے جو گھریلو اور دست کاری کی صنعتوں اور فاضل دیہی محنت کی شکل میں پایا جاتا ہے۔

ایک کم سرمایہ اور کم ترقی یافتہ ملک میں ترقیاتی منصوبہ بندی کے ابتدائی مراحل میں اگر بنیادی صنعتوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے تو شاید ان چھوٹے مشینی کارخانوں کو وسعت دینا ممکن نہ ہو جو روزانہ کے عام استعمال کی چیزیں بناتی ہیں لیکن ترقی پذیر معیشت میں اِن چیزوں کی طلب زیادہ ہوگی۔ اس طلب کی تسکین صرف تب ہوسکتی ہے جب بے روزگار دیہی مزدوروں کو گھریلو صنعتوں میں لگایا جائے۔ یہ صنعتیں درمیانی وقفے کو پُر کرنے کے لیے ہوں گی۔ بعد میں جب سستی بجلی ملنے لگے گی اور بھاری مشینیں کافی بننے لگیں گی تو اِن چھوٹی صنعتوں کو بدلا جاسکتا ہے۔ اُس وقت یہ تبدیلی مشکل نہ ہوگی۔

ترقیاتی منصوبہ بندی کی دوسری ضمنی ضرورت ہماری توجہ کو صنعت اور زراعت کے رشتے پر مرکوز کرتی ہے۔ تیز صنعتی ترقی کو جاری رکھنے کے لیے مکمل زراعتی تنظیم اور تیز زراعتی ترقی ضروری ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ صنعتی ترقی کی شرح کا انحصار غلّے اور خام مال کی رسد پر ہوتا ہے۔ یہ ذمہ داری زراعتی سکٹر کی ہے۔ صنعتی نشوونما کے لیے زراعتی ترقی اور ادارہ جاتی تبدیلیاں لانا ضروری ہے۔ اسی لیے پہلے پلان میں زراعت کی نئی تنظیم کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ لیکن ترقی کے امکانات بڑھانے کے لیے جو اقدام پہلے پلان میں کیے گیے ان پر دوسرے پلان کے دوران پوری طور سے عمل نہیں کیا گیا۔ اسی لیے تیسرے پلان کے ختم پر زراعتی پیداوار کی قیمتیں بہت بڑھ گئیں جس کی بنیادی وجہ زراعتی منصوبہ بندی کی خامی تھی۔ اب چوتھے پلان میں زراعتی پیداوار بڑھانے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ اِس سلسلے میں صنعتی سکٹر اچھی اور بہتر کھاد، فصلی کیڑے مارنے والی اور پودوں کو قوت دینے والی دوائیں اور جدید زراعتی آلات فراہم کرکے مدد کرسکتا ہے۔ جب تک صنعتی اور زراعتی سکٹر ایک دوسرے کی مدد نہیں کریں گے اس وقت تک تیز ترقی کی راہ میں رُکاوٹیں پڑتی رہیں گی۔

باب ۵

ہندوستان کا پہلا پانچ سالہ منصوبہ

اگرچہ منصوبہ بندی ہندوستان کی آزادی کے بعد ہی ممکن تھی لیکن منصوبہ بندی کی لگن اور معیشت کو غریبی کے دلدل سے نکالنے کے لیے کسی قسم کی منصوبہ بندی اور اجتماعی عمل پر آمدگی کئی سال پہلے سے موجود تھی۔

ہندوستانی منصوبہ بندی کی تاریخ :

سنہ ۱۹۳۴ء میں مشہور انجینئر اور مدبر ایم وشوسریا (M VISVESARYA) نے ایک کتاب شایع کی جس کا نام تھا "ہندوستان کے لیے منصوبہ بند معیشت"۔ ہندوستان میں معیشت کی نئی تنظیم کے اصول مرتب کرنے کی شاید یہ پہلی کوشش تھی۔ تین سال بعد پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں انڈین نیشنل کانگریس نے نیشنل پلاننگ کمیٹی مقرر کی۔ دوسری جنگِ عظیم ایک غیر معمولی واقعہ تھی جس کی وجہ سے کمیٹی کے کام میں رخنہ پڑا اور یہ اپنی رپورٹ کافی دیر سے یعنی سنہ ۱۹۴۸ء میں پیش کر سکی۔

سنہ ۱۹۴۳ء کے آخر میں بمبئی کے کچھ صنعت کاروں نے ایک پلان شایع کیا جس کا نام "ہندوستان کی معاشی ترقی کا ایک منصوبہ" تھا۔ اسے بامبے پلان کہا جاتا ہے۔ اس پلان کے خاص مقاصد یہ تھے کہ زراعتی پیداوار ۱۳۰٪ اور صنعتی پیداوار ۵۰۰٪ بڑھائی جائے۔ سب سے زیادہ اہمیت بنیادی صنعتوں کو دی گئی تھی۔ پندرہ برسوں میں فی کس آمدنی کو ۱۰۰٪ بڑھانا تجویز کیا گیا تھا (یعنی ۶۵ روپئے سے بڑھا کر ۱۳۰ روپئے)۔ بامبے پلان کے ساتھ ہی ایم۔ این۔ رائے کی کتاب "پیپلز پلان" شایع ہوئی۔ یہ ایک دس سالہ منصوبہ تھا جس میں ۱۵۰۰۰ کروڑ روپئے کا خرچ تجویز کیا گیا تھا۔ اس میں سب سے زیادہ زور زراعتی اور صرفی اشیا پیدا کرنے والی صنعتوں کی ترقی پر دیا گیا تھا اور بنیادی صنعتوں کو ثانوی جگہ دی گئی تھی۔

حکومت اور منصوبہ بندی :

اگست ۱۹۴۴ء میں حکومت نے منصوبہ بندی اور ترقی کا شعبہ قائم کیا۔ اس کے ممبر انچارج سر اردشیر دلال تھے جو بامبے پلان کے مصنفوں میں سے ایک تھے۔ اس شعبے نے دو منصوبے تیار کیے۔ ایک منصوبہ معیشت کو معمول پر لانے کے لیے چھوٹی مدت کا تھا اور دوسرا لمبی مدت کا جس کا مقصد معاشی ترقی اور نئی تعمیر تھا۔ مارچ ۱۹۵۰ء میں جواہر لال نہرو کی صدارت میں انڈین پلاننگ کمیشن قائم کیا گیا۔ جولائی ۱۹۵۱ء میں کمیشن نے پہلے پلان کا خاکہ پیش کر دیا۔ اس پلان کی مدت اپریل ۱۹۵۱ء سے مارچ ۱۹۵۶ء تک تھی لیکن یہ مکمل شکل میں پہلی بار دسمبر ۱۹۵۲ء، یعنی پلان کی مدت شروع ہونے کے ڈیڑھ سال بعد قوم کے سامنے آیا۔

پہلا منصوبہ ـــــ بنیادی مقاصد، خصوصیتیں اور پروگرام

مقاصد اور مجوّزہ نقشہ : پہلے پلان کا پیمانہ بہت واجبی تھا۔ یوں اُس کی تمام تر توجہ کا مرکز غذائی قلت اور ملک میں افراطِ زر کی حالت تھی۔ لیکن کئی سمتوں میں نئی معاشی اور سماجی سرگرمیاں بھی شروع کی گئیں۔ اِن سرگرمیوں سے عوام کا معیار بلند کرنے میں اور انھیں ایک بہتر اور گوناگوں زندگی کے مواقع فراہم کرنے میں مدد ملی۔ اِس پلان کا ایک اوّلین مقصد پیداآوری بڑھانا اور نابرابری کم کرنا تھا۔ پلاننگ کمیشن نے فلاحی نظریات پر مبنی ایک مخلوط معیشت تصور کی تھی۔ یہ طے پایا تھا کہ اس معیشت میں سرکاری اور غیر سرکاری سکٹر ساتھ ساتھ اور ایک نظام کے لازمی حصوں کی حیثیت سے رہیں گے۔

بنیادی خدوخال : پہلے پلان میں پبلک سکٹر کے لیے ابتداً ۲۰۶۹ کروڑ روپے تجویز کیے گیے تھے۔ بعد میں یہ رقم بڑھاکر ۲۳۷۸ کروڑ کردی گئی لیکن واقعی خرچ ابتدائی تخمینہ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ پلاننگ کمیشن کے پہلے پلان کے جائزے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے پانچ برسوں میں ۲۰۱۲ کروڑ روپیے صرف کیے گیے (لیکن اگر ۵۳-۱۹۵۲ء کے اعداد و شمار پر نظر ثانی کی جائے اور قیمتوں کے فرق کا لحاظ رکھا جائے تو پہلے پلان کا واقعی خرچ ۱۹۶۰ کروڑ کے قریب ہو جاتا ہے)۔ ۲۰۱۲ کروڑ کا خرچ بہت معمولی ہے کیوں کہ یہ ہندوستان کی قومی آمدنی کا صرف ۴٪ ہے۔ یہ معمولی انجام دہی بیشتر موجود استعداد کے پورے استعمال اور کچھ نئی پیداآوری

استعداد پیدا کرنے کا نتیجہ تھی۔ اِس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے پلان کے معمولی صرف سے کوئی بڑے کام تو نہ ہو سکے لیکن یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اِس سے دوسرے حوصلہ مند پلان کے لیے زمین ہموار ہوئی۔

خرچ کی خاص مدات : پہلے پلان کی نظرِ ثانی کے مطابق کل مجوزہ رقم ۲۳۷۸ کروڑ میں سے زراعت اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے لیے ۳۵۴ کروڑ (۱۴.۹ فی صدی) زراعت اور پاور کے لیے ۶۴۷ کروڑ (۲۷.۲ فی صدی) صنعت اور کان کنی کے لیے ۱۸۸ کروڑ (۷.۹ فی صدی)، رسل ورسائل اور نقل وحمل کے لیے ۵۷۱ کروڑ (۲۴ فی صدی)، سماجی اور فلاحی خدمات کے لیے ۵۳۲ کروڑ (۲۲.۴ فی صدی) اور متفرق مدات کے ۸۶ کروڑ (۳.۶ فی صدی) مقرر ہوئے۔

زراعتی پروگرام : پہلے پلان میں زراعت کو اہمیت دی گئی۔ زراعت پر تاکید بالکل حق بجانب تھی کیوں کہ پلان سے پہلے ملک میں اناج کی شدید قلت تھی۔ اناج اور خام مال میں خود اکتفائی کے لیے پیداوار بڑھانا ضروری تھا۔ اِس کے بغیر مستقبل میں تیز صنعتی ترقی جاری رکھنا ناممکن تھا۔ ایک ترقی پزیر معیشت جو صنعتی ترقی کے لیے کوشاں ہو اُس کے لیے ایک وسیع اور منظم زراعتی سکٹر کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے جہاں سے اناج اور خام مال کی بڑھتی ہوئی رسد جاری رہے۔

نقل وحمل، پاور اور آب پاشی : نقل وحمل، رسل ورسائل، آب پاشی اور پاور کو اہمیت دی گئی (۱۲۱۸ کروڑ روپے یعنی مجموعی خرچ کا ۵۱.۲% اِن مدات کے لیے رکھے گیے) نقل وحمل، پاور اور آب پاشی سماجی سرمائے کی ضروریات، ہوتی ہیں جن کی تشکیل ترقی کے تیز عمل کو شروع کرنے کے لیے ضروری ہے۔ درحقیقت نقل وحمل کو اِس لیے زیادہ مقدم سمجھا گیا کہ رُوس کے پہلے منصوبے کی طرح اس کی کمی کی وجہ سے تیز معاشی ترقی میں رُکاوٹ نہ پڑے۔

سماجی خدمات : پلان کے مجموعی خرچ کا ۲۲% حصہ سماجی اور فلاحی خدمات کے لیے متعین تھا کیوں کہ، تعلیم، صحت اور رہائش کی سہولتیں اور سماجی بہبودی کی دوسری اسکیموں کی تکمیل کے فلاحی ریاست کی ترقیاتی منصوبہ بندی کے لازمی اجزا میں ہندوستان فلاحی ریاست ہونے کا دعوے کرتا ہے اِس لیے اس کے ماہرین منصوبہ بندی کے لیے سماجی بہبود میں اضافے کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔

صنعتی پروگرام: پہلے پلان پر نظر ثانی سے پتہ چلتا ہے کہ بڑے پیمانے کی صنعتوں کے لیے اور کان کنی اور سائنس ریسرچ کے لیے ۱۴۹ کروڑ فراہم کیے گئے تھے جو پلان کے مجموعی خرچ کا ۵.۰۸٪ تھا ۹۴ کروڑ یعنی ۲.۴۱٪ دیہی اور چھوٹی صنعتوں کے لیے رکھے گئے تھے۔ اس طرح صنعتوں، کان کنی اور سائنسی ریسرچ کے لیے مجموعی رقم ۱۸۰ کروڑ تھی۔ لیکن جیسا پلان کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے، صرف ۱۰۰ کروڑ واقعی صرف ہوئے۔ فیکٹریاں قائم کرنے اور نئی مشینیں فراہم کرنے کی ابتدائی مشکلات کی وجہ سے صنعتوں کی مجوزہ رقم صرف نہ ہو سکی۔ اس کے علاوہ جب پلان کی آخری شکل تیار ہوئی اُس وقت پلان کی مدت کے دو برس ختم ہو چکے تھے۔ بقیہ تین برسوں میں انتظامی تاخیر اور دفتری طوالت کی وجہ سے معمولی صنعتی پروگرام بھی نہ پورا ہو سکا۔

پہلے پلان کی کامیابی (۱۹۵۱-۱۹۵۶ء)

پہلے پلان کے شروع ہوتے وقت جو حالت تھی اس کے مقابلے میں ۱۹۵۶ء کے وسط تک ہندوستان کی معاشی حالت بہت امید افزا تھی۔ قومی آمدنی (۴۹-۱۹۴۸ء کی قیمتوں کے مطابق) ۵۱-۱۹۵۰ء کی ۸۸۷۰ کروڑ سے بڑھ کر ۵۶-۱۹۵۵ء میں ۱۰۴۲۰ کروڑ ہو گئی۔ ۵۴-۱۹۵۳ء میں زراعتی پیداوار میں قابل قدر اضافے کی وجہ سے ہندوستانی معیشت کو پیچیدہ اور تنگ کرنے والے کنٹرول سے نجات دی جا سکی۔ بہ حیثیت مجموعی معیشت مضبوطی اور استحکام کی تصویر پیش کرتی تھی۔ تھوک کی قیمتوں کا انڈکس نمبر (بنیاد: اگست ۱۹۳۹ء میں ختم ہونے والا سال) مارچ ۱۹۵۱ء کے ۴۵۰ سے گھٹ کر مارچ ۱۹۵۶ء میں ۳۸۷.۴۳ ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلا پلان بڑھتی ہوئی معاشی سرگرمی اور خوش امیدی کے ساتھ ختم ہوا۔

(۱) **زراعتی ترقی:** ۵۶-۱۹۵۱ء کے دوران زراعتی پیداوار میں ۱۸ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ غلے کی پیداوار پلان کے آخری سال میں ۵ کروڑ ٹن سے بڑھ کر ۶.۵ کروڑ ٹن ہو گئی۔

پہلے منصوبے کی آب پاشی کی اسکیموں سے ۵۶-۱۹۵۵ء تک ۸۵ لاکھ ایکڑ زمین کی آب پاشی ہونے لگی۔ جہاں تک بجلی کی پیداوار کا تعلق ہے، حاصل استعداد میں پلان کی مدت میں تخمیناً ۱۱ لاکھ کیلوواٹ کا اضافہ ہوا جب کہ مجوزہ اضافہ ۱۳ لاکھ کیلوواٹ تھا۔ اس سے یہ واضح ہے کہ زراعت، بجلی اور آب پاشی کے میدان میں منصوبے کی کامیابی تشفی بخش رہی۔

(۲) **صنعتی ترقی** : صنعتی پیداوار بھی برابر بڑھتی رہی۔ پانچ سال کی مدت میں ۴۰٪ کا اضافہ ہوا۔ پلان کے آخری دو برسوں میں صنعتی سکٹر نے کافی ترقی کی۔ صنعتی پیداوار کا انڈکس (۱۹۴۶ء = ۱۰۰) جو ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۱۰۳.۷ تھا۔ ۱۹۵۵-۵۶ء میں ۱۴۸ ہوگیا اور اضافے کی یہ رفتار جاری رہی۔ سوتی کپڑے کی پیداوار پلان کے نشانے سے ۴۰ کروڑ گز زیادہ ہوئی۔ سیمنٹ کی پیداوار ۱۹۵۰-۵۱ء کے ۲۷ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۱۹۵۵-۵۶ء میں ۴۶ لاکھ ٹن ہوگئی۔ خام مال کی زیادہ رسد، موجودہ استعداد کے پورے استعمال اور نئے سرمائے کی آمد کی وجہ سے صنعتی پیداوار میں عام طور سے اضافہ ہوا۔

(۳) **نقل وحمل کی ترقی** :- پہلے پلان میں نقل وحمل اور رسل و رسائل کی مد میں ۴۹۰ کروڑ روپے رکھے گئے تھے لیکن پلان کے آخری نصف کے دوران یہ رقم بڑھا کر ۵۷۰ کروڑ کر دی گئی۔ پلان کے آخر تک رسد و رسائل اور نقل وحمل کی ترقی تشفی بخش رہی۔ اس مدت میں ۳۸۰ میل نئی ریلوے لائنیں بچھائی گئیں اور ان لائنوں میں جو توڑ دی گئی تھیں ۴۳۰ میل لمبی لائن دوبارہ ڈالی گئی۔ قومی شاہراہ کے پروگرام کے تحت خلا کو پُر کرنے کے لیے ۶۴۰ میل لمبی سڑکیں بنیں اور تینتیس بڑے پُل تعمیر کیے گئے۔ اس کے علاوہ موجودہ سڑکوں میں سے ۴۰۰۰ میل کی مرمت کی گئی۔

خرچ میں تدریجی اضافہ : ۱۹۵۲ء میں جب پلان تیار ہوا اس وقت مرکز اور صوبوں کا مجموعی خرچ ۲۰۶۹ کروڑ تجویز کیا گیا تھا۔ بعد میں پلان کو وسعت دی گئی اور مختلف تبدیلیاں کی گئیں جس کی وجہ سے پلان کا سائز ۲۳۷۸ کروڑ ہوگیا۔ اگرچہ خرچ کا نظرثانی شدہ نشانہ ۲۳۷۸ کروڑ تھا لیکن واقعی خرچ ۲۰۱۲ کروڑ سے کچھ کم تھا یعنی تخمینے سے ۱۵.۴٪ کم۔

پہلے پلان کے لیے مالی وسائل کی فراہمی (مالیاتی خسارے کے خصوصی حوالے سے)

ہمارا پہلا منصوبہ بنیادی طور سے ترقیاتی کاموں کے لیے خرچ کا منصوبہ تھا۔ چنانچہ اس میں مالیاتی منصوبہ بندی اور مجوزہ مصارف کے لیے وسائل کی فراہمی شامل تھی۔ پہلے پلان کے شروع میں جو رقم تجویز تھی اُس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ۲۰۶۹ کروڑ کی مجموعی رقم میں سے مرکزی اور صوبائی سرکاروں کو اپنے بجٹ اور قرض سے ۱۲۵۸ کروڑ فراہم کرنا ہوگا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ ان معمولی وسائل یعنی ٹیکس اور قرض کو استعمال کرنے کے بھی ۸۱۱ کروڑ کی کمی پڑے گی (۲۰۶۹ ۱۲۵۸ = ۸۱۱)۔ اس ۸۱۱ کروڑ کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ۲۹۰ کروڑ کے بہ قدر رقم خسارے کے ذریعے فراہم کرنی

ہوگی۔ (اسٹرلنگ بیلنس کی واگزاشت کے بالمقابل) لیکن اس کے بعد بھی ۵۲۱ کروڑ کی کمی باقی رہے گی جس کو بیرونی امداد اور مزید قرض یا مزید خسارے سے پورا کرنے کی توقع تھی۔

مالیات کے وسائل : جیسا ہم پہلے دیکھ چکے ہیں نظر ثانی کے بعد پلان کے خرچ کا تخمینہ ۲۳۷۸ کروڑ تھا جس کی وجہ سے وہ کمی جو ابتدا میں ۵۲۱ کروڑ تھی بڑھ کر ۸۰۳ کروڑ ہوگئی۔ پہلے چار برسوں کے حسابی اعداد و شمار اور ۵۶-۱۹۵۵ء کے تصحیح شدہ تخمینے کو لے کر پہلے پلان کی مدت کے لیے بجٹ کے مجموعی وسائل ۱۲۷۷ کروڑ تھے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بجٹ کے وسائل توقع (۱۲۵۸ کروڑ) سے قریب تھے۔ بیرونی امداد جو استعمال کی جا سکی وہ ۲۰۳ کروڑ تھی۔ یعنی پلان کی متوقع امداد سے ۵۰ کروڑ زیادہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مالیاتی خسارہ مقررہ حد ۲۹۰ کروڑ سے بڑھانا پڑا اور پلان کے دوران ۵۳۲ کروڑ کے بقدر خسارہ کرنا پڑا۔

(۱) **قرض :** پہلے پلان کے داخلی وسائل کی ایک نمایاں خصوصیت قرض کے پروگرام کی کامیابی ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ پلان بناتے وقت عوامی قرض کے امکانات زیادہ روشن نہیں تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مارکٹ اتنی کمزور تھی کہ اس کو سہارا دینے کے لیے ریزرو بینک پر کافی دباؤ تھا۔ اگلے دو برسوں میں مارکٹ کچھ سنبھلی۔ پلان کے چوتھے برس عوامی قرض کا پروگرام کافی پیمانے پر شروع ہو سکا تخمینہ یہ ہے کہ ۵ سال کی مدت میں قرض سے خالص آمدنی پلان کے نشانے کے ۱۱۵ کروڑ کے مقابلے میں ۲۰۴ کروڑ تھی۔ ۵ سال میں چھوٹی بچتوں اور قابلِ واپسی قرض (UNFUNDED DEBT) سے آمدنی متوقع ۲۷۰ کروڑ کے مقابلے میں ۳۰۴ کروڑ ہوئی۔

(۲) **ٹیکس :** پہلے پلان کی مدت میں مرکز اور صوبوں کے ٹیکس کی مجموعی آمدنی میں برائے نام اضافہ ہوا۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ٹیکس سے ۶۲۶ کروڑ کی آمدنی ہوئی۔ ۵۶-۱۹۵۵ء میں یہ آمدنی ۷۵۰ کروڑ تھی یعنی ۵۱-۱۹۵۰ء کی آمدنی سے ۱۲۵ کروڑ زیادہ۔ ہندوستان جیسے ملک کے لیے یہ آمدنی بہت مایوس کن ہے کیوں کہ یہاں ٹیکس کی وصولی کا ایک جما ہوا نظام موجود ہے جس کو ترقیاتی مالیات کی شدید ضروریات کو پورا کرنے کے لیے موثر طریقے سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر قومی آمدنی کی فی صد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ترقی حسب توقع نہیں ہوئی۔ ٹیکس سے قومی آمدنی کا ۷٪ تھی جب کہ ۵۱-۱۹۵۰ میں ۶٫۶٪ تھی۔

(۳) **خسارے کی مالیات :** مالیاتی خسارے کا طریقہ پہلے پلان کے دوران پہلی مرتبہ بہت احتیاط کے ساتھ شروع کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ خسارے کے ذریعے معاشی ترقی کے مالی وسائل کی

کی فراہمی کی اہمیت دوسرے پلان کی ابتدا کے بعد شروع ہوئی۔ ایک ترقی یافتہ معیشت میں جہاں بے استعمال وسائل اور محنت آسانی سے حاصل ہوں، وہاں مالیاتی خسارہ روزگار بڑھانے اور سرمایہ کی تخلیق کے مقاصد پورے کر سکتا ہے۔ پہلے پلان میں خسارے کی مالیات سے یہ مراد تھی کہ خسارے کا بجٹ بنا کر قومی خرچ میں براہِ راست اضافہ کیا جائے۔ اس پلان کے دوران حکومت نے اس خسارے کو یا تو جمع بیلنس میں سے رقم نکال کر یا ریزرو بینک سے سرکاری آمدنی اور خرچ کے بہ قدر قرض لے کر پورا کیا۔ پہلے پلان میں ۲۹۰ کروڑ کے بقدر خسارے کی توقع تھی۔ چوں کہ ۱۹۵۱-۵۶ء کے دوران اسٹرلنگ بیلنس سے آمدنی کا تخمینہ اس خسارے کے برابر تھا، اس لیے امید تھی کہ اس خسارے کی وجہ سے افراطِ زر نہ پیدا ہوگا۔ توقع یہ تھی کہ مالی خسارے کی یہ معتدل مقدار پلان کے مستحکم مزاج سے ہم آہنگ رہے گی۔ یہ بھی خیال تھا کہ ممکن ہے ۲۹۰ کروڑ کی زائد رقم کے علاوہ مزید مالیاتی خسارے کا سہارا لینا پڑے تاکہ اس کمی کو پورا کیا جا سکے جس کے لیے کوئی وسیلہ نہیں تجویز کیا گیا تھا۔ یہ کمی اصل تخمینے کے مطابق ۵۲۱ کروڑ اور نظرِ ثانی کے بعد ۸۰۴ کروڑ تھی۔

مالیاتی خسارے کی پالیسی نہ صرف معتدل تھی بلکہ پہلے پلان کے دوران اس پر بہت احتیاط کے ساتھ عمل کیا گیا۔ پلان کے پہلے سال میں تو کچھ رقم بچ رہی۔ اگلے تین برسوں میں معمولی خسارہ ظاہر ہوا لیکن پلان کے آخری سال میں خسارے کا حجم (۲۹۲ کروڑ) پچھلے چار برسوں کے مجموعی خسارے (۲۴۰ کروڑ) سے بڑھ گیا۔ پہلے پلان کے ریویو کے مطابق پلان کی مدت میں مجموعی خسارہ ۵۳۲ کروڑ کے قریب تھا۔

(۴) بیرونی امداد: خسارے کی مالیات سے اب بیرونی امداد کی طرف آئیے۔ پلان کے پہلے تین برسوں میں بیرونی امداد کا مجموعی استعمال ۱۲۹ کروڑ تھا۔ چوتھے سال بیرونی امداد کا واقعی استعمال ۱۶ کروڑ تھا۔ ۱۹۵۵-۵۶ء کے لیے بیرونی امداد کے اعداد و شمار ۵۸۶۲ کروڑ تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پلان کے دوران ۲۰۳۶۲ کروڑ کی بیرونی امداد استعمال ہوئی۔

پہلے پلان کا جائزہ: پہلے پلان کا مقصد ترقی کے لیے زمین ہموار کرنا تھا۔ اس کی تمام تر توجہ اناج اور خام مال کی قلت دور کرنے اور معاشی استحکام حاصل کرنے کی طرف تھی۔ اس کے زیادہ تر نشانے معتدل تھے اس لیے آسانی سے حاصل ہو گئے۔ اچھے مانسون، زرِ مبادلہ کی صحت مند صورت، پیداآوری کی فاضل استعداد اور پبلک سکٹر میں تخمینے سے کم خرچ کی وجہ سے افراطِ زر اور توازنِ ادائیگی جیسے مسائل نے زیادہ پریشان نہیں کیا۔ اس موقع پر پہلے پلان کا تنقیدی جائزہ کارآمد ہوگا۔

(۱) پلاننگ کمیشن نے پلان بنانے سے پہلے ملک کے مادی، انسانی اور مالی وسائل کا اندازہ کرنے کی پوری کوشش نہیں کی۔ بجائے اس کے کہ موجودہ وسائل کا تفصیلی اور صحیح تخمینہ کیا جاتا کمیشن نے پلان کی تکمیل کے لیے مالی وسائل کو بہت زیادہ اہمیت دی۔ یاد رکھنا چاہیے کہ مالی وسائل کافی ہونے کے بعد بھی دوسری رکاوٹیں پیدا ہوسکتی ہیں، مثلاً مخصوص وقت اور جگہ پر کسی خاص قسم کے وسائل کا دست یاب ہونا۔

(۲) پہلے منصوبے کے دوران اگرچہ مادی منصوبہ بندی کے مقابلے میں مالیاتی منصوبہ بندی کو زیادہ اہمیت دی گئی تاہم تیاری کے وقت منصوبہ بندی کا طریقہ کچھ اچھا نہیں تھا۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ پلان کی مدت میں واقعی خرچ ۲۰۱۲ کروڑ تھا جب کہ نظرثانی شدہ عمومی رقم ۲۳۷۸ کروڑ تھی۔ اس طرح مجوزہ رقم سے ۳۶۶ کروڑ خرچ ہوسکا (یعنی ۱۵٫۴ ٪)۔ خرچ کی یہ کمی مالیاتی منصوبہ بندی کی کمزوری ظاہر کرتی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ اس کی بنیادی وجہ انتظامی سخت گیری اور مادی رکاوٹیں تھیں مثلاً خام مال، آلات اور ماہر عملے کی قلت۔ لیکن کمیشن کو یہ مشکلات پہلے سے سوچ لینا چاہیے تھا اور منصوبے کو مادی پلان سے منسلک کرنا چاہیے تھا۔

(۳) چوں کہ پہلے پلان میں زراعت پر زیادہ زور تھا اس لیے بڑی صنعتیں تقریباً نظرانداز ہوگئیں۔ حتیٰ کہ چھوٹی صنعتوں کے لیے جو رقم فراہم کی گئی وہ بھی پوری نہیں خرچ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صنعت کے منظم سکٹر میں صنعتی آلات اور روزگار کی توسیع برائے نام ہوئی۔

(۴) پلان کی زراعتی منصوبہ بندی میں بھی کچھ خامیاں تھیں۔ دیہی پیداوار کونسلوں کو اس کام کے لیے موزوں سمجھا گیا کہ وہ زراعتی پیداوار کے علاقائی نشانے متعین کریں لیکن ایسی کوئی ایجنسی نہیں تھی جو یہ طے کرتی کہ ایک مخصوص علاقے میں کون سی فصلیں پیدا کی جائیں اور ان کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ حد کیا ہو۔ نہ صرف یہ کہ فصلی منصوبہ بندی نہیں تھی بلکہ فصلوں کے بیجے کا بھی زراعتی پلان میں کوئی انتظام نہیں تھا۔

ان خامیوں کے باوجود پہلا پلان قابل تعریف تھا کیونکہ یہ ترقیاتی منصوبہ بندی اور ہندوستان کی معیشت کو پس ماندگی سے نکالنے کا پہلا تجربہ تھا۔ ہندوستانی معیشت پر محرکات کا اچھا ردعمل ہوا۔ پہلے پلان نے ایک جامد اور ساکت حالت میں حرکت ہوئی۔

باب ۶

ہندوستان کا دوسرا پلان

ترقیاتی منصوبہ بندی کے لیے زمین ہموار کرنے کے بعد پہلا پلان ۳۰ مارچ ۱۹۵۶ء کو ختم ہوا اور دوسرا پلان جو پہلے پلان کے مقابلے میں زیادہ باحوصلہ تھا شروع کیا گیا۔ اس کی مدت یکم اپریل ۱۹۵۶ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۶۱ء تک تھی۔

بنیادی حکمت عملی: دوسرے پلان کی بنیادی حکمتِ عملی پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ بنیادی صنعتوں کی ترقی پر خاص طور سے زور دیا گیا تھا اور مجموعی خرچ کا ۲۰٪ ان مدات کے لیے رکھا گیا تھا۔ بڑے پیمانے کی صنعتوں، سائنسی ریسرچ اور معدنیات کے لیے پہلے پلان میں ۶۰ کروڑ روپے رکھے گئے تھے۔ دوسرے پلان میں چوں کہ ملک کے صنعتی پروگرام پر زیادہ زور تھا اس لیے ان مدات کے لیے ۶۹۰ کروڑ فراہم کیے گئے۔ دوسرے پلان میں بنیادی صنعتوں پر تاکید حق بہ جانب تھی۔

پہلے پلان میں بنیادی قلتوں کے دور ہونے کے بعد پلاننگ کمیشن کو اپنی توجہ صنعتی ترقی کی طرف مبذول کرنی ہی تھی۔ تیز معاشی ترقی کے لیے، تیز صنعتی ترقی کی بنیادی حیثیت ہے۔ صنعتی ترقی کے بغیر فاضل زراعتی آبادی کو زراعت سے منتقل کرنا ناممکن ہوتا ہے اور اگر اس منتقلی میں تاخیر ہوتی ہے تو دیہی اور شہری عوام کا معیارِ زندگی گھٹتا ہے۔ اس کے علاوہ صنعتی ترقی نہ ہونے کی صورت میں زراعتی پیداوار کی طلب اُس رفتار سے نہیں بڑھتی جس رفتار سے رسد بڑھتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوسکتا ہے کہ زراعتی پیداوار کی قیمتیں گر جائیں جس کا خراب اثر دیہی سکٹر بلکہ ساری معیشت پر پڑنا ضروری ہے۔

لیکن ہندوستان جیسے ملک میں جہاں ترقی نسبتاً دیر سے شروع ہوئی ہو، مقابلتاً کم مدت میں وہ ترقی حاصل کرلینی ہے جو پرانے ترقی یافتہ ملکوں نے کئی پشتوں میں حاصل کی۔ اس لیے دوسرے پلان میں ہم نے ایک ایسا صنعتی پروگرام شروع کرنے کا فیصلہ کیا جس سے بھاری صنعتوں کی بنیاد مضبوط ہو، پیداواری استعداد اور فنی کارکردگی بڑھے اور نئے سرمائے کا بہاؤ تیز ہو۔

سائنسی ریسرچ اور بنیادی صنعتوں کی ترقی کو اس مقصد کے حصول میں اہم رول ادا کرنا تھا۔
مگر صنعتی ترقی کو تیزی سے عمل میں آنا ہے تو ملک کو لوہے، فولاد، غیر آہنی دھاتوں، کوئلے، سیمنٹ اور بھاری کیمیاوی صنعتوں کی ترقی کو اپنا مقصد بنانا چاہیے جن سے بھاری آلات بنانے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن اگرچہ ان بنیادی صنعتوں کی ترقی سے صنعتی بنیاد مضبوط ہوتی ہے تاہم ان کی وجہ سے تھوڑے ہی سے آدمیوں کو روزگار ملتا ہے۔ بنیادی صنعتوں میں سرمایہ لگنے کی وجہ سے لوگوں کی قوتِ خرید اور صرفی اشیاء کی طلب بڑھتی ہے لیکن ان اشیاء کی رسد جلد نہیں بڑھ پاتی۔ چنانچہ ایک متوازن ترقی کے لیے ضروری ہے کہ مزدوروں کو صرفی اشیاء کی پیداوار بڑھانے کے کام میں لگایا جائے۔ یہ طے پایا تھا کہ دوسرے پلان کے دوران ان ضروری صرفی اشیاء کی رسد گھریلو اور چھوٹی صنعتوں سے حاصل کی جائے گی۔ چنانچہ دوسرے پلان میں دیہی اور چھوٹی صنعتوں کی ترقی کے لیے ۲۰۰ کروڑ رکھے گئے تھے جس میں سے صرف ۱۷۵ کروڑ واقعی خرچ ہوئے۔ اس طرح گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کی ترقی کی حیثیت ثانوی رکھی گئی اور اس کا مقصد صنعتی سکٹر کی ممکن ترقی کو تیز کرنے کی بنیادی پالیسی کو مضبوط کرنا تھا۔

ہندوستانی معیشت کے دیہی سکٹر کی غیر معمولی خصوصیات کی وجہ سے پلاننگ کمیشن نے چھوٹی اور گھریلو صنعتوں پر کافی بھروسہ کیا۔ ہماری دیہی معیشت بے استعمال محنت کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ مکمل بے روزگار لوگوں کی تعداد کم ہے۔ اس میں نقل پذیری بھی ہے اور دیہات سے کام کے دوسرے شعبوں میں منتقل کی جا سکتی ہے۔ لیکن کم روزگار لوگوں کی تعداد بہت بڑی ہے اور اس کو استعمال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان لوگوں کو مقامی طور پر کام فراہم کیا جائے کیوں کہ ان میں سے بیشتر سال کے چار پانچ مہینے بے کار رہتے ہیں اور اگر انھیں کام دیا بھی جائے تو یہ اپنے علاقے سے دور جانا نہیں پسند کریں گے۔ اسی لیے پلاننگ کمیشن نے سوچا کہ گھریلو اور چھوٹی دستکاریاں ان دونوں مسائل کو بڑی حد تک حل کر دیں گی۔ یعنی کم روزگار لوگوں کو کام بھی ملے گا اور، بہت ابتدائی زمانے میں صرفی اشیاء کی کمی بھی دور ہوگی۔

دوسرے منصوبے میں صنعت، زراعت اور نقل و حمل

(۱) صنعت :- پہلے پلان میں صنعتی سکٹر کی سست ترقی کی وجہ تیاری کی کمی اور انتظامی عملے کی قلت تھی۔ فولاد کی پیداوار کی کمی بھی پہلے پلان کے دوران بھاری صنعتوں کی ترقی میں مانع

رہی۔ اسی لیے دوسرے پلان کے مقدم کاموں کا نقشہ تیار کرتے وقت بھاری صنعتوں پر خاص زور دیا گیا۔

دوسرے صنعتی پروگرام کی نمایاں باتیں یہ تھیں : (i) لوہے اور فولاد کی پیداوار کی ترقی اور توسیع کو خاص اہمیت دی گئی ۔ یہ اس لیے کہ معیشت کی ترقی کی شرح متعین کرنے میں لوہے اور فولاد کا رول بہت اہم ہے ۔ دوسرے پلان کے دوران بھلائی، روڑکیلا اور درگاپور کے لوہے کے کارخانوں کی کافی توسیع ہوئی ۔ (ii) دوسرے پلان میں مشینیں بنانے، بھاری انجینئرنگ اور بھاری کیمیاوی صنعتوں میں کافی ترقی ہوئی ۔ بھاری صنعتوں اور مشینی آلات کی پیداوار تیز ترقی کے اس عمل کو سہارا دینے کے لیے اور اس کو جاری رکھنے کے لیے ضروری تھی جو معیشت کے صنعتی پروگرام میں مدِنظر تھی۔ (iii) دوسرے پلان کے دوران اُن صنعتوں کی استعداد بڑھانے پر زیادہ زور دیا گیا جو ضروری پیداواری اشیا بناتی تھیں جیسے سیمنٹ اور فاسفیٹی کھاد وغیرہ۔ سیمنٹ کی صنعت کی اشد ضرورت تھی کیوں کہ پلان کے دوران تعمیری کاموں کے لیے سیمنٹ کی طلب بہت زیادہ تھی۔

(۲) **زراعت** :۔ دوسرے پلان کے پہلے مسودے میں زائد پیداوار کے مندرجہ ذیل نشانے تجویز تھے : غلّہ ایک کروڑ ٹن، روئی تیرہ لاکھ گانٹھ، روغنی بیج ۱۵ لاکھ ٹن، جوٹ دس لاکھ ٹن اور گنّا جس سے ۱۳ لاکھ ٹن گڑ بن سکے ۔ آبادی میں اضافے اور صنعتی توسیع کے پیشِ نظر یہ مجوزہ نشانے نیچے اور ناکافی ثابت ہوئے۔ چنانچہ حکومت نے دوسرے پلان کے شروع ہوتے ہی نظرِ ثانی کے بعد اُن میں سے بیشتر کا نشانہ بڑھا دیا تاکہ پلان کے بڑھتے ہوئے صَرف کی وجہ سے زائد طلب پوری ہو سکے۔ اناج کی پیداوار کا نظرِ ثانی شدہ نشانہ پہلے ۸ کروڑ ٹن مقرر ہوا یعنی زائد پیداوار کا نشانہ ایک کروڑ ٹن سے بڑھا کر ایک کروڑ ۵۵ لاکھ ٹن کر دیا گیا ۔ روئی کی زائد پیداوار ۳۲ لاکھ گانٹھ، روغنی بیج ۲۷ لاکھ ٹن، جوٹ ۱۵ لاکھ گانٹھ اور گنّا بہ لحاظ گڑ ۲۰ لاکھ ٹن پیداوار طے پائی۔

(۳) **نقل و حمل** :۔ دوسرے پلان میں ریل کی ترقی کے لیے ۹۰۰ کروڑ روپے رکھے گئے تھے ۔ توقع تھی کہ ۱۵۰ کروڑ خود ریلوے کی آمدنی سے حاصل ہوں گے اور باقی ۷۵۰ کروڑ عام سرکاری آمدنی سے ۔ دوسرے پلان میں سڑکوں کی ترقی کے لیے ۲۴۶ کروڑ روپے فراہم کیے گئے۔ اس کے علاوہ مرکزی روڈ فنڈ سے ۲۵ کروڑ کی توقع تھی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے پلان میں نقل و حمل اور رسل و رسائل پر کافی توجہ دی گئی۔ علاقوں کو منسلک کرنے کے لیے اور پیداوار

کے اہم مرکزوں کو دور دراز گاؤں اور قصبوں سے جوڑنے کے لیے نقل و عمل پر تاکید ضروری تھی۔ نقل و عمل اور رسل و رسائل کی ترقی، معاشی ترقی کے عمل کی شرط ہے۔ یہ اس لیے کہ ان کی ترقی کی وجہ سے نئی منڈیاں پیدا ہوتی ہیں۔ نیا سرمایہ راغب ہوتا ہے اور ترقی کا عمل تیز ہوتا ہے۔

دوسرے پلان کے مالی وسائل (خسارے کی مالیات کے خاص حوالے سے):

اس فیصلے کے بعد کہ دوسرا پلان پہلے پلان کے مقابلے میں زیادہ حوصلہ مند اور بڑا ہوگا۔ پلاننگ کمیشن نے مالیاتی منصوبہ بندی کے مقابلے میں مادّی منصوبہ بندی پر زیادہ توجہ دی۔ ایسا لگتا ہے کہ دوسرا پلان بناتے وقت ہمارے ماہروں نے مالیات کو ثانوی درجہ دیا۔ پہلے مادی نشانے متعین کیے گئے اس کے بعد وسائل کی تلاش ہوئی۔

مالیات کے وسائل: پلاننگ کمیشن نے پبلک سکٹر کے ترقیاتی پروگرام کے لیے ۴۸۰۰ کروڑ روپے کی جو اصل اسکیم بنائی تھی وہ یہ تھی:

	کروڑ روپے
۱۔ رواں آمدنی	۸۰۰
(الف) ۱۹۵۶-۵۵ء کے ٹیکسوں کی شرح کے مطابق	۳۵۰
(ب) نئے ٹیکس	۴۵۰
۲۔ عوامی قرض	۱۲۰۰
(الف) مارکٹ قرض	۷۰۰
(ب) چھوٹی بچت	۵۰۰
۳۔ بجٹ کے دوسرے وسائل	۴۰۰
(الف) ترقیاتی کاموں میں ریلوے کا حصّہ	۱۵۰
(ب) پراویڈنٹ فنڈ اور دوسری جمع رقمیں	۲۵۰
۴۔ خارجی وسائل	۸۰۰
۵۔ خسارے کی مالیات کے ذریعے	۱۲۰۰
۶۔ خلا (جس کو دوسرے طریقوں سے داخلی وسائل بڑھا کر پُر کرنا تھا)	۴۰۰
میزان	۴۸۰۰

ان اعداد وشمار سے یہ ظاہر ہے کہ بجٹ کے وسائل، جو مرکز اور صوبوں کو ٹیکس، قرض اور دوسری
آمدنیوں کے ذریعے حاصل کرنے کی توقع تھی وہ ۲۴۰۰ کروڑ تھے۔ مزید ۱۲۰۰ کروڑ خسارے کی
مالیات کے فراہم ہوئے تھے۔ ان دو رقموں میں اگر ۸۰۰ کروڑ اور جوڑ دیے جائیں جو بیرونی ملکوں
سے حاصل ہوئے تھے تو پروگرام کی تکمیل کے لیے مجموعی وسائل ۴۴۰۰ کروڑ بنتے ہیں، یعنی پلان کے
مجوزہ خرچ سے ۴۰۰ کروڑ کم۔ کمیشن کا خیال تھا کہ اِس خلا کو اندرونی وسائل بڑھا کر پُر کیا جائے گا۔ یہ
بھی خیال تھا کہ یہ خلا پُر کرنے کا ایک ہی مکمل ذریعہ تھا یعنی ٹیکس اور پبلک سکٹر کے کاروبار سے
منافع۔

(۱) ٹیکس: ہندوستان کی منصوبہ بندی کی بنیادی حکمتِ عملی یہ تھی کہ قومی آمدنی میں جو
اضافہ ہو اُس کو بچت میں تبدیل کیا جائے اور پھر اِس بچت کو ایسے کاموں میں لگایا جائے جن سے
قومی آمدنی بڑھے۔ چنانچہ ہمارے ٹیکس کے نظام کو ایسا بنانا تھا کہ بچت کا زیادہ حصہ پلان کے لیے
حاصل کیا جا سکے۔ ترقی کے دوران صنعتی اور زراعتی دونوں سکٹروں کی بچت موثر طریقے سے حاصل
کی جانی چاہیے۔ بہ الفاظِ دیگر ٹیکسوں کو اُن لوگوں پر مرکوز ہونا تھا جن کا وسائل پر اختیار تیزی سے
بڑھ رہا تھا کیوں کہ یہی وہ لوگ تھے جن کو ترقی کے دوران ٹیکس کا دباؤ کم سے کم محسوس ہوگا۔

پلان کے خرچ کے نقشے سے بھی ٹیکس کے نظام کی ماہیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے
پلان میں چوں کہ سماجی خدمات پر کافی خرچ تھا اور بھاری صنعتوں کی ترقی کا پروگرام بھی بہت
حوصلہ مند تھا اس لیے کافی بڑے پیمانے پر افراطِ زر کے امکانات موجود تھے۔ خرچ میں اضافے
کی وجہ سے نئے روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے جس سے نچلے طبقے کی آمدنی بڑھے گی۔ خیال تھا
کہ اس کی وجہ سے سرگرمی کے مختلف میدانوں سے جتنی رسد حاصل ہوگی اُس کے مقابلے میں طلب زیادہ
ہوگی۔ تجویز یہ تھی کہ ٹیکس کی امتیازی شرح (DIFFERENTIAL TAX RATE) کے ذریعے رسد اور طلب کی
قوتوں میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اسی لیے حکومت نے دوسرے پلان
کے دوران بالواسطہ ٹیکس پر تاکید جاری رکھی اور ساتھ ہی براہِ راست ٹیکس میں ضروری ردوبدل
کیا۔ یہ درست ہے کہ بالواسطہ ٹیکس مصنوعی طریقے سے اُن اشیا کی قیمت میں مزید اضافہ کر دیتے
ہیں جن کی رسد کم ہوتی ہے۔ لیکن اگر ان پر حد سے زیادہ عمل کیا گیا تو یہ عوام سے ٹیکس وصول
نے کا آلہ بن جاتے ہیں اور اس طرح یہ جمہوری منصوبہ بندی کے نظریے کے مطابق ترقی دشمن
ن جاتے ہیں۔ دوسرے منصوبے کے دوران بالواسطہ ٹیکسوں کے علاوہ ذاتی انکم ٹیکس، کیپٹل ٹیکس،

ڈیتھ ٹیکس اور صرفی ٹیکس پر بھی کافی زور دیا گیا تاکہ فائدہ حاصل کرنے والوں پر موثر ٹیکس لگایا جاسکے، لیکن پیداوار پر اس کا اثر کم سے کم پڑے۔

براہ راست ٹیکس اس قرینے کے ہونے چاہئیں کہ ان سے نجی سکٹر میں سرمائے کی تخلیق کی تحریک ہو اور حکومت کو زائد آمدنی بھی ہو۔ ایک منصوبہ بند معیشت میں براہ راست ٹیکس کی کچھ اونچی شرح جائز ہے کیوں کہ ایسی معیشت میں حکومت کی چوکس پالسی کی وجہ سے سرمائے کو نقصان کا خطرہ کم ہوتا ہے اور منافع کی شرح اونچی یا کم از کم مستحکم ضرور ہوتی ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ دوسرے منصوبے کے دوران مجموعی صرفی خرچ (CONSUMPTION EXPENDITURE) ۱۹٪ بڑھ گیا۔ اس کے مقابلے میں قومی آمدنی میں ۲۰٪ اضافہ ہوا۔ اگر ٹیکس سے متاثر ہونے کی صلاحیت کو "یونٹی" (UNITY) مان لیا جائے تو براہ راست اور بالواسطہ ٹیکسوں کو متناسب اضافہ ظاہر کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اس میں شک ہے کہ آیا ان متناسب اضافوں کے بعد بھی ٹیکس سے آمدنی پلان کے نشانے یعنی ۱۲۰۰ کروڑ تک پہنچ سکی (۸۰۰ کروڑ ٹیکس سے متوقع آمدنی اور ۴۰۰ کروڑ خسارے کو پورا کرنے کے لیے)۔ درحقیقت پلاننگ کمیشن کے بیان کے بموجب دوسرے پلان کے دوران ٹیکس کی مجموعی آمدنی کا قومی آمدنی کے ساتھ تناسب ۷ء۶۵٪ سے بڑھ کر ۸ء۶۹٪ ہوگیا۔

(۲) قرض :۔ دوسرے پلان میں عوامی قرض کا تخمینہ ۱۲۰۰ کروڑ تھا۔ مارکٹ قرض، سوشل سیکیورٹی کانٹری بیوشن اور قومی ملکیت میں آئی ہوئی انشیورنس کمپنیوں کے فنڈ سے ۷۰۰ کروڑ ملنے کی توقع تھی۔ چھوٹی بچتوں کے تحت وصول یابی ۵۰۰ کروڑ رکھی گئی تھی۔ کمیشن نے ابھی حال میں تخمینہ لگایا ہے کہ عوامی قرض اور چھوٹی بچت سے حاصل ہونے والی رقم ۱۱۸۰ کروڑ تھی (۷۸۰ کروڑ عوامی قرض سے اور ۴۰۰ کروڑ چھوٹی بچت سے)۔ اس سے ظاہر ہے کہ چھوٹی بچت کو مجتمع کرنے کی کافی گنجائش ہے کیوں کہ خرچ میں کافی اضافے کی وجہ سے اور روزگار میں کچھ اضافے کی وجہ سے پلان کے دوران نچلے طبقے کی آمدنی بڑھے گی۔ بدقسمتی سے انتظامی دشواریوں کی وجہ سے یہ کام کامیابی کے ساتھ نہ ہو سکا۔ بہرحال دوسرے پلان کے دوران بنیادی پالسی یہ تھی کہ "ملتوی آمدنی" کا طریقہ (DIFFERED CREDIT SYSTEM) جاری کیا جائے۔ جس کے تحت نئی آمدنی کے ایک حصے کو جبراً یا سمجھا بجھا کر اور پروپیگنڈے کے ذریعے بچت میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس طرح حاصل ہونے والی آمدنی کو ترقیاتی کاموں میں لگایا جائے لیکن اس وعدے کے ساتھ کہ ایک معقول مدت کے بعد یہ آمدنی کمانے والوں کو مع سود واپس کر دی جائے گی۔

(۴) خسارے کی مالیات : دوسرے پلان میں خسارے کی مالیات کا بہت اہم رول تھا۔ توقع تھی کہ پلان کے دوران ۱۲۰۰ کروڑ روپے کے بہ قدر مالی وسائل کے خسارے کے ذریعے فراہم کرنے ہوں گے۔ اس طرح پلان کے مجموعی خرچ کا ۲۵٪ حصہ نئے نوٹ چھاپ کر فراہم ہونا تھا۔

اِس حوصلہ مند پلان کو پورا کرنے کے لیے خسارے کی مالیات کا بڑے پیمانے پر سہارا لیا گیا جو شاید اِس لیے ناگزیر تھا کہ داخلی بچت توقع سے کم تھی۔ لیکن خسارے کی مالیات کی پالیسی پر اِس طرح عمل کرنا چاہیے تھا کہ معیشت میں زائد رقم ایک یکساں رفتار سے داخل ہو۔ بدقسمتی سے دوسرے پلان کے دوران ایسا نہیں ہوا۔ جس بے ترتیب اور ناہموار طریقے سے مالیاتی خسارہ کیا گیا اُس کا اندازہ سرکاری اعداد و شمار سے کیا جا سکتا ہے۔ پلان کے پہلے تین برسوں میں مالیاتی خسارہ ۷۸۵ کروڑ تھا۔ اِس میں سے ۶۳۵ کروڑ کا خسارہ پہلے دو برسوں میں اور باقی ۱۵۰ کروڑ (۵۹-۱۹۵۸ء) میں ہوا۔ پلان کے آخری دو برسوں (۶۰-۱۹۵۹ء و ۶۱-۱۹۶۰ء) میں خسارہ ۱۶۳ کروڑ تھا۔ اِس سے ظاہر ہے کہ دوسرے پلان کے دوران مجموعی خسارہ ۹۴۸ کروڑ یعنی پلان کی متوقع مقدار سے ۲۵۲ کروڑ روپے کم ہوا۔ ایسا لگتا ہے کہ مالیاتی خسارے کے طریقے میں ناہمواری اور بے ربطی تھی جس کی وجہ سے روپے کی رسد میں اضافہ رُک رُک کر اور جھٹکے کے ساتھ واقع ہوا۔ پلان کے دوسرے سال میں افراطِ زر کی زیادتی کا یہی سبب تھا۔ پلان کے وسط میں افراطِ زر نے بہت خراب صورت اختیار کر لی۔

مالیاتی خسارے کی ناہمواری کی وجہ سے قیمتوں میں اضافے کو یا تو ٹیکس کا نظام سخت کر کے روکا جا سکتا ہے (کیونکہ ٹیکس سے جتنی زیادہ آمدنی ہوگی خسارہ اتنا ہی کم ہوگا) یا پھر قیمتوں پر کنٹرول اور راشننگ کے ذریعے۔ لیکن جب قیمتوں میں اضافہ برداشت کی حد سے بڑھ جاتا ہے تو براہِ راست کنٹرول اور ضابطے بھی کارگر نہیں ہوتے۔ ایسی غیر معمولی صورت میں مالیاتی خسارے کے طریقے کو عارضی طور سے ترک کرنا پڑتا ہے۔

دوسرے پلان کی تکمیل کا جائزہ :

پلاننگ کمیشن نے دوسرے پلان کے پبلک سکٹر کے ترقیاتی خرچ کا تخمینہ ۴۶۰۰ کروڑ لگایا تھا۔ پلان کے پہلے سال (۵۷-۱۹۵۶ء) میں واقعی خرچ ۶۴۱ کروڑ تھا۔ دوسرے اور تیسرے برسوں کا خرچ ۸۶۴ کروڑ اور ۱۰۶۴ کروڑ تھا۔ چوتھے سال کے خرچ کا تخمینہ ۱۰۹۲ کروڑ اور آخری سال کا تخمینہ ۹۴۲ کروڑ ہے۔ اس طرح واقعی خرچ (۴۶۰۰ کروڑ) اصل نشانے (۴۸۰۰ کروڑ) سے ۲۰۰ کروڑ

کم تھا۔ اس کمی کا سبب یہ نہیں تھا کہ سرگرمی کے مخصوص میدانوں میں معمولی ردوبدل کیا گیا تھا، بلکہ یہ کمی زراعت، دیہی ترقی، صنعت، کان کنی اور سوشل سروسز جیسی اہم مدات میں بھی نمایاں تھی۔ یہ درست ہے کہ ابتدا میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مثلاً نہر سویز کا ہنگامہ، اندرونی قیمتوں کا بڑھنا، ہوا دباؤ اور زر مبادلہ کے اثاثے میں تخفیف، تاہم خرچ کی یہ کمی کافی حد تک دور کی جا سکتی تھی اگر شعبہ جاتی بجٹ کے جلد باز اٹکل پچو اور بے تنظیم عمل کی بجائے پلان کے تمام سال بہ سال کاموں کی مالیاتی ضروریات کے پیش نظر مادی وسائل کا شعبہ جاتی جائزہ لیا جاتا۔ حوصلہ مند ترقیاتی منصوبہ بندی کا سب سے اہم مسئلہ انتظامی کارکردگی ہے۔ ایک اچھے، جامع اور کارکرد انتظام کے بغیر حوصلہ مند پلان کی تعمیل تقریباً ناممکن ہے۔

بہرحال یہ بات امید افزا ہے کہ لگایا جانے والا سرمایہ قومی آمدنی کی ایک نسبت کی حیثیت سے [illegible] کے ۵.۵٪ سے بڑھ کر دوسرے پلان کے دوران ۱۱٪ ہو گیا۔ لیکن قومی آمدنی میں بچت کا تناسب ۵.۰٪ سے بڑھ کر صرف ۸.۵٪ پر پہنچ سکا۔ بچت کی شرح اور سرمایہ لگنے کی شرح کے درمیان اس فرق کو مزید درآمدات سے پورا کیا گیا۔ ان درآمدات کے لیے مالی وسائل اسٹرلنگ بیلنس اور بیرونی امداد یا قرض سے حاصل کیے گئے۔ چنانچہ یہ بات واضح ہے کہ دوسرے پلان کے دوران جو زیادہ سرمایہ لگایا گیا وہ بیشتر زر مبادلہ کی محفوظ رقم اور بیرونی امداد کے استعمال کا نتیجہ تھا۔

دوسرے پلان کے کاموں کے ریویو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے پلان کے دوران بنیادی اور ثانوی پیداواروں میں ترقی کا جو میلان تھا وہ دوسرے پلان کے دوران جاری رہا۔ واقعتاً زراعتی پیداوار کا انڈکس پہلے پلان کے دوران ۲۰٪ بڑھ گیا۔

لیکن منصوبہ بندی کے پہلے دس برسوں میں صنعتی ترقی زیادہ نمایاں رہی۔ پہلے اور دوسرے [illegible] کے دوران صنعتی پیداوار کا انڈکس [illegible] بڑھا۔ اصل اضافہ شاید اور زیادہ ہوتا اگر انڈکس [illegible]

[illegible]

ہوا۔ صنعتی پیداوار کا انڈکس (۱۰۰ = ۱۹۵۰-۵۱ء) ۱۹۵۵-۵۶ء کے ۱۳۹ سے بڑھ کر ۱۹۶۰-۶۱ء میں ۱۹۴ ہوگیا۔

چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی ترقی تشفی بخش نہیں ہوئی۔ مِل کے سوت سے ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے کی پیداوار میں دائمی اضافہ اوسطاً ۸ کروڑ گز تھا اگرچہ سالانہ پیداوار کا نشانہ ۴۰ کروڑ گز تھا (پلاننگ کمیشن کے نشانے کے مطابق پانچ برسوں میں ۲۰۰ کروڑ گز) تعجب ہے کہ حکومت کی براہِ راست حمایت اور بالواسطہ امداد کے باوجود ہینڈلوم کی صنعت کامیاب نہیں ہوئی اور اس کی ترقی کی شرح مجوزہ شرح سے کم رہی۔ کچھ ماہرین منصوبہ بندی نے امبر چرخے پر بہت بھروسہ کیا تھا لیکن دوسرے پلان کے دوران یہ بات واضح ہوگئی کہ امبر چرخہ جادو کا منتر نہیں ہے جو کپڑے کی پیداوار کو اس قدر تیز کردے جس سے بارروزگار آبادی کی بڑھتی ہوئی ضرورتیں پوری ہوسکیں۔

ہماری غریب معیشت کو جو پُرحوصلہ منصوبوں کے ذریعے اپنی حالت سدھارنے کی کوشش کر رہی تھی، رسد کے دوطرفہ حملے کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا یعنی رسد کی کمی اور اس کا بے لچک ہونا۔ معیشت پر دباؤ نکتے اور رکاوٹیں پلان شروع ہونے کے وقت ہی ظاہر تھیں۔ خسارے کی مالیات جو پہلے پلان کے آخری دو برسوں میں کافی بڑھ گئی تھی، دوسرے پلان کے آخری دو برسوں میں اور بڑھی۔ پلان کے شروع میں اناج کی کمی بھی پیدا ہوگئی جس کی ایک وجہ قدرتی قلت تھی جو پلان کے معتدل نشانوں اور ناموافق موسمی حالات کا نتیجہ تھی اور دوسری وجہ مصنوعی قلت تھی جو منافع خوروں، ذخیرہ اندوزوں اور بلیک مارکٹ کرنے والوں کی سرگرمی کا نتیجہ تھی۔ اس طرح دوسرے پلان کے پہلے دو برسوں میں نہ صرف غلّے کی برآمد بڑے پیمانے پر کرنی پڑی بلکہ بھاری آلات بھی اُن پروجیکٹوں کے لیے منگانے پڑے جو پلان کی بنیاد تھے۔ شروع میں درآمدی پابندیوں کی خامیوں اور ڈھیل کی وجہ سے لوگوں کو کچھ صرفی اشیا بھی درآمد کرنے کا موقع مل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معیشت میں افراطِ زر کے نئے دور کے ساتھ برآمدات اور درآمدات کا فرق اور بڑھ گیا۔ صرفی اشیا کی پیداوار بڑھانے چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی ناکامی، نقل و حمل اور رسد میں رکاوٹوں، انتظامی خامیوں اور کمرشیل بینکوں کی نقد (جس سے سٹہ بازوں کو فوراً رقم مل سکتی تھی) میں اضافے کی وجہ سے صورتِ حال بڑی تشویش ناک ہوگئی۔ پلان کے پانچ برسوں میں قیمتوں کے عام انڈکس میں ۳۰٪ کا اضافہ ہوا۔ کھانے کی اشیا ۳۰٪، صنعتی خام مال ۳۲٪ اور مصنوعات کے انڈکس میں ۲۵٪ کا اضافہ ہوا۔ غرض کہ دوسرے پلان کی مدت میں قیمتوں کی عام سطح اوسطاً ۶٪ سالانہ بڑھی۔

دوسرا پلان اور حوصلہ کا بحران :

پہلے منصوبے پر یہ اعتراض تھا کہ یہ بہت معمولی منصوبہ تھا جس کے بنانے میں بخل سے کام لیا گیا تھا۔ اِس کے پورا ہوتے ہی ایک دوسرا پلان بنایا گیا جو ضرورت سے زیادہ حوصلہ مند تھا۔ منصوبہ بنانے والوں نے "کیا حاصل کرنا ہے" پر زیادہ زور دیا اور "کیسے حاصل کرنا ہے" اِس پر کم توجہ دی۔ انھوں نے بہت سے مسائل کو معمولی اور ثانوی سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ مثلاً زرِ مبادلہ کے وسائل کا انتظام، مختلف سکٹروں کی ترقی میں توازن قائم کرنا، نقل و حمل اور رسد کی رُکاوٹوں کو دور کرنا اور انتظامی مشینری کو بہتر بنانا۔ اپنی حوصلہ مندی کے جوش میں انھوں نے صرف پھولوں کو دیکھا اور اُن کانٹوں کو نظر انداز کر دیا جو پھولوں کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پلان کے ابتدائی مراحل میں ہندوستانی معیشت پر تناؤ اور دباؤ بڑھ گیا اور وہ مشکلوں میں پھنس گئی۔ اِسے حوصلہ کا بحران کہا جا سکتا ہے۔ معیشت کے مختلف شعبوں میں قلتیں بڑھ گئیں۔ چیزوں کی قلت کو ذخیرہ اندوزوں نے اور بھی بڑھایا۔ چیزوں کی قلت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ معیشت اُس بڑھی ہوئی طلب کا ساتھ نہیں دے پا رہی ہے جو آمدنی میں اضافے کا نتیجہ تھی اور جسے مالیاتی خسارے کی بھاری ڈوز نے اور بھی بڑھا دیا تھا۔ جس چیز نے طلب کے اِس مسلسل اضافے کو اتنا پریشان کن بنا دیا وہ داخلی پیداوار میں لچک کی کمی تھی۔

یہ سختیاں، قلتیں اور بے لوچ پن ایک ترقی پذیر معیشت کی بالڑھ کی تکلیفوں کا ضروری اظہار ہیں۔ ان کے پس منظر میں دباؤ کے دو مقامات بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک داخلی مسئلہ ہے یعنی افراطِ زر کا دباؤ اور دوسرا خارجی مسئلہ ہے یعنی توازنِ ادائیگی۔ ایک وقت تو یہ بحران خطرناک نکتے پر پہنچ گیا اور دوسرے پلان کے دوسرے سال میں ادائیگی کے توازن کا مسئلہ اتنا شدید ہو گیا کہ حکومت کو ریزرو بینک کے زرِ مبادلہ کے ذخیرے کو بہت کم کرنا پڑا اور بیرونی امداد کے لیے در بہ در گھومنا پڑا۔

دوسرے پلان کا دوبارہ جائزہ :

جس وقت سے دوسرے پلان کو مشکلیں پیش آئیں، اس کی قطع و برید کی باتیں شروع ہو گئیں۔ کاٹ چھانٹ کی باتیں کرنا آسان تھا لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اِس عمل میں بے شمار دشواریاں تھیں۔ تقریباً سارے بڑے بڑے پروجیکٹ شروع ہو چکے تھے اِس لیے یہ فیصلہ کرنا بڑا مشکل تھا کہ کس پروجیکٹ کی تکمیل میں عجلت کی جائے۔ پھر بھی کمیشن کو مجبوراً دوسرے پلان پر نظرِ ثانی کر کے نشانوں کو کم کرنا پڑا

اور دوسری تبدیلیاں کرنی پڑیں۔

نیشنل ڈیولپمنٹ کونسل نے جون ۱۹۵۸ء کو پلاننگ کمیشن کی نظرثانی کی تجویز پر غور کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ پلان کے مجموعی خرچ ۴۸۰۰ کروڑ کے اندر رہ کر پلان کے پروجیکٹوں کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ پہلے حصّے کا مجموعی خرچ ۴۵۰۰ کروڑ تھا۔ اِس میں یہ پروجیکٹ شامل تھے، پیداوار بڑھانے سے متعلق پروگرام اور پروجیکٹ، وہ پروجیکٹ جو پلان کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے تھے، وہ پروجیکٹ جو تکمیل کی بہت آگے کی منزل میں تھے یا وہ جن کو نامکمل چھوڑنا ممکن نہیں تھا۔ باقی اسکیمیں دوسرے حصّے میں آتی تھیں۔ اِن کا مجموعی خرچ ۳۰۰ کروڑ تھا۔ انھیں وسائل کی دستیابی کے مطابق چلانا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ ہمارے ماہرین نے روس کے پانچ سالہ منصوبے کے ڈھنگ پر پلان کے مجموعی خرچ کی کم سے کم حد (۴۵۰۰ کروڑ) اور زیادہ سے زیادہ حد (۴۸۰۰ کروڑ) مقرر کرنے کی کوشش کی اگرچہ یہ معلوم تھا کہ پلان کے مجموعی وسائل زیادہ سے زیادہ ۴۲۶۰ کروڑ ہوں گے اور اس طرح ۲۴۰ کروڑ کی کمی پڑے گی۔ بہ ہرحال نومبر ۱۹۵۸ء میں نیشنل ڈیولپمنٹ کونسل نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی۔ مزید وسائل کے امکانات سے ناامید ہو کر کونسل نے پلان کے مجموعی خرچ کو ۴۵۰۰ کروڑ کر دیا لیکن پلان کے ختم پر پتہ چلا کہ مجموعی خرچ ۴۶۰۰ تک پہنچ گیا۔ یعنی نظرثانی شدہ نشانے سے ۱۰۰ کروڑ زائد۔

پانچ سالہ پلان اور روزگار:

بے روزگاری کے اسباب: عام طور سے بے روزگاری کے تین سبب ہوتے ہیں۔ ایک تو بے روزگاری مؤثر طلب کی کمی کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ دوسرے بے روزگاری کے ساختی اسباب (STRUCTURAL CAUSES) ہو سکتے ہیں، خصوصاً قیمت اور لاگت کے عدم توازن کی وجہ سے، تیسرے، بھاری آلات اور دوسری چیزوں کی کمی کی وجہ سے ملک میں بڑے پیمانے پر بے روزگاری ہو سکتی ہے۔ مغرب کی ترقی یافتہ معیشتوں میں روزگار اور مؤثر طلب کا براہِ راست تعلق ہوتا ہے اور مؤثر طلب کی کمی کی وجہ سے ملک میں روزگار کی سطح نیچی ہو جاتی ہے۔ اِن ملکوں میں اُجرت (بہ شکل روپیہ) ٹھہری ہوئی یا جمی ہوئی ہوتی ہے اِس لیے مؤثر طلب کی کمی روزگار کی سطح میں تبدیلی کی شکل میں آسانی سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کے غیر منظم سکٹر میں اُجرت دو قسم کی اُجرتوں کا مرکب ہوتی ہے، یعنی منافع کی اُجرت (PROFIT WAGES) کیوں کہ زیادہ کسان خود اپنے لیے روزگار فراہم کرتے ہیں، اور ایک طرح کی اصل اُجرت (REAL WAGES) جو فصل کا وہ حصّہ ہوتی ہے جو

کسان اپنے خاندان کے لیے رکھتا ہے) یہ دوغلی قسم کی زراعتی اُجرت مغربی ملکوں کی ٹھہری ہوئی اُجرت سے زیادہ لچک دار ہوتی ہے۔ اسی لیے ہندوستان میں مؤثر طلب کی کمی سے روزگار میں ہمیشہ متناسب کمی نہیں ظاہر ہوتی۔

ہندوستانی بے روزگاری :

ہندوستان میں بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ بھاری آلات کی فراہمی کو بڑھاکر اور انتظامی ڈھانچے کو دُرست کرکے روزگار کے مواقع بڑھائے جائیں۔ ہندوستان میں مکمل روزگار (مکمل باکاری) کا مسئلہ بہت زبردست ہے۔ شہری اور دیہاتی دونوں حلقوں میں ایسے لوگوں کی تعداد کافی بڑی ہے جو یا تو بے روزگار ہیں یا سال کے چار چھ مہینے بے کار رہتے ہیں۔ بے روزگار اور کم روزگار لوگوں کی یہ فوج آبادی میں تیز اضافے کے ساتھ برابر بڑھتی ہے۔ بنیادی طور سے زراعتی ہونے کی وجہ سے ہندوستانی معیشت مختلف قسم کے دباؤ اور تناؤ کے عمل اور ردِّ عمل کا شکار رہتی ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں مثلاً محنت میں نقل پزیری کی کمی، غیر ہنر مند مزدوروں کی زیادتی جس کی وجہ سے ٹکنیکی ترقی رُکتی ہے۔ دیہی حلقے کی طرف سرمائے کا کم بہاؤ، آبادی کا دباؤ زیادہ ہونے کی وجہ سے ایسی زراعت جس سے کسی طرح روٹی مِل جائے اور دیہی صنعتوں کی ناکافی ترقی جس کی وجہ سے فاضل مزدوروں کو دوسرے کام نہیں مل پاتے۔ اِن حالات سے نہ صرف زراعتی نقشہ بگڑ جاتا ہے بلکہ ان کی وجہ سے زراعتی پیشوں میں کم روزگاری پھیلتی ہے اور روزگار کی منصوبہ بندی نازک مسئلہ بن جاتی ہے۔

روزگار اور پہلا منصوبہ : پہلا منصوبہ اُس وقت بنا جب جنگ کے بعد کی فضا نے روزگار کا مستقبل دھندلا کر رکھا تھا۔ اسی لیے پہلے پلان کے اُس باب میں جو روزگار سے متعلق تھا۔ بے روزگاری کے مسئلے اور اُس کے تدارک پر تفصیلی بحث نہیں کی گئی۔ ۱۹۵۳ء کے شروع تک روزگار کی اُمید افزا تصویر آہستہ آہستہ مٹ گئی اور پلاننگ کمیشن کو اس بھیانک حقیقت سے دوچار ہونا پڑا کہ ملک میں روزگار بڑھانے کے لیے مزید اقدام کرنے چاہئیں۔ چنانچہ پلان کے مجوزہ خرچ ۲۰۶۹ کروڑ میں ۳۰۹ کروڑ کا اضافہ کیا گیا جو اُن پروجیکٹوں پر صرف کے لیے تھا جن سے روزگار کے کافی امکانات پیدا ہوں۔

۱۹۵۳ء میں پلاننگ کمیشن نے روزگار میں اضافے کے لیے گیارہ نکاتی پروگرام شائع کیا۔ اس پروگرام کی خصوصیات یہ تھیں : (۱) روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لیے

آب پاشی اور بجلی کے پروجیکٹوں کے قریب ٹریننگ کیمپ قائم کرنا (۲) چھوٹی صنعتیں اور کاروبار شروع کرنے کے لیے افراد کو اور لوگوں کے چھوٹے چھوٹے گروپ کو مخصوص امداد دینا (۳) اُن شعبوں میں جہاں مزدوروں کی کمی ہو، تربیت کی سہولتیں بڑھانا (۴) گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کی ہمت افزائی کے لیے ایسی پالیسی پر عمل کرنا کہ حکومت امداد کے طور پر اُن کی پیداوار اپنے استعمال کے لیے خرید ے۔ (۵) گاؤں میں ایک استاد والے اوٹلٹ اسکول بڑی تعداد میں کھولنا یا ایسے اسکولوں کی ہمت افزائی کرنا (۶) نیشنل اکسٹنشن سروس کی توسیع کرنا کیوں کہ اس سے روزگار بڑھنے کے امکانات ہیں (۷) سڑکوں کو ترقی دینا (۸ گندے علاقوں کی صفائی کے پروگرام چلانا اور شہروں میں کم آمدنی والے لوگوں کے لیے مکانات کی تعمیری اسکیم کی تکمیل کرنا (۹) نجی تعمیری سرگرمیوں کی ہمت افزائی کرنا (۱۰) مہاجرین کی نوآبادیوں کو منصوبے کے تحت امداد دینا (۱۱) پہلے پلان میں مناسب ردوبدل کرنا تاکہ اُن پروگراموں کو ترجیح دی جائے جن سے روزگار کے مواقع بڑھنے کا امکان ہے۔

اس حوصلہ مند پروگرام کے اعلان کے باوجود پہلے پلان کے دوران بے روزگاری دُور کرنے کی براہِ راست کوشش برائے نام ہوئی۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ایک کم ترقی یافتہ معیشت میں روزگار کا مسئلہ ترقیاتی مسئلے کا ایک اہم پہلو ہے اور مجموعی سرمایہ لگنے کی شرح سے اُس کا گہرا تعلق ہے۔ پہلے پلان کے دوران کافی سرمایہ نہیں لگا اور سرمائے کی تخلیق سماج کی کم سے کم ضروریات سے پیچھے تھی جس کی وجہ سے گیارہ نکاتی پروگرام مشکل سے چل پایا۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ پہلے پلان نے روزگار کے جو براہِ راست مواقع پیدا کیے وہ ۴۵ لاکھ کے قریب تھے (اس میں تجارت اور کاروبار کے بالواسطہ روزگار شامل نہیں ہیں)۔ بہرحال پہلے پلان سے ہندوستانی معیشت کو اس درجہ استحکام ضرور مل گیا کہ دوسرے پلان میں حکومت روزگار اور ترقی کے مسائل کی طرف زیادہ توجہ دے سکے۔

روزگار اور دوسرا منصوبہ: پلاننگ کمیشن کے حال کے تخمینے کے مطابق دوسرا پلان روزگار کے محاذ پر نشان سے پیچھے رہا۔ جیساکہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، دوسرا پلان ۵۳ لاکھ بے روزگاروں کے بقائے سے شروع ہوا، یعنی ۵۳ لاکھ وہ لوگ تھے جنھیں پہلے پلان میں روزگار ملنا چاہیے تھا لیکن نہیں ملا تھا۔ مزید توقع یہ تھی کہ خود دوسرے پلان میں ایک کروڑ لوگوں کو روزگار دینے کی ضرورت ہوگی۔ دوسرے پلان کے سرمایہ کاری کے پروگرام کے

کے مطابق اِن ایک کروڑ لوگوں کو تو کام سے لگانا تھا لیکن پچھلے پلان کے بقایے یعنی ۵۳ لاکھ لوگوں کے روزگار کے مسئلے کو اگلے منصوبے کے لیے ملتوی کر دیا گیا تھا۔ لیکن حال کے شمار کے مطابق دوسرے پلان میں واقعی روزگار (زراعت کو چھوڑ کر) صرف ۶۵ لاکھ آدمیوں کو ملا جس کا یہ مطلب ہوا کہ بے روزگاروں کے پچھلے بقایے یعنی ۵۳ لاکھ میں ۴۰ لاکھ کا اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ تیسرے پلان کے شروع ہوتے وقت یہ بقایا تقریباً ۹۰ لاکھ ہو گیا تھا۔ یہ صورت واقعی بڑی تشویش ناک ہے لیکن اِس سے بھی زیادہ مایوس کن تصویر اُس وقت سامنے آتی ہے جب ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی بنیاد پر روزگار کے اعداد و شمار کی تصحیح کی جاتی ہے۔ کیوں کہ مردم شماری کے مطابق آبادی بڑھنے کی شرح اُس اندازے سے بہت اونچی ہے جو پلاننگ کمیشن نے پلان بناتے وقت لگایا تھا۔

اِس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں ایک طرف باروزگار لوگوں کی تعداد بڑھتی ہے اور دوسری طرف بے روزگار لوگوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ یعنی زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بے روزگاری صرف نسبتاً یعنی ملک کے مزدوروں کی مجموعی تعداد کی نسبت سے گھٹتی ہے لیکن کلیتاً یعنی متاثر تعداد کے اعتبار سے بے روزگاری بڑھتی ہے۔ جیسے جیسے ترقی عمل میں آئے گی اور زراعت تنظیم کی طرف مائل ہوگی موجودہ مخفی بے روزگاری کے چہرے سے نقاب اُٹھ جائے گی اور اِس طرح بے روزگاروں کی تعداد مجموعی طور سے بڑھے گی۔ اِس کے علاوہ حال کی مردم شماری سے آبادی کے جس ہنگامہ خیز اضافے کے اشارے ملتے ہیں اُس سے بے روزگاری کی یہ فوج اور بڑھے گی۔

روزگار اور تیسرا پلان: جب ہم تیسرے پلان کی طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو روزگار کی صورت اور بھی بھیانک اور تشویش ناک دکھائی دیتی ہے۔ کمیشن کے اندازے کے مطابق تیسرے پلان کے دوران بے روزگاروں کی تعداد ایک کروڑ ۷۰ لاکھ ہو گی۔ اس میں پچھلا ۹۰ لاکھ کا وہ بقایا جوڑ دینا چاہیے جو دوسرے پلان کے آخر میں تھا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر دوسرے پلان میں ایک کروڑ نئے لوگوں کے روزگار کا سوال تھا (اگر چہ بے روزگاروں کا شمار ایک کروڑ پچاس لاکھ تھا) تو تیسرے پلان میں بے روزگاروں کی تعداد ۲ کروڑ ۶۰ لاکھ ہونے کی توقع تھی۔ لیکن تیسرے پلان کا نشانہ صرف ایک کروڑ ۴۰ لاکھ لوگوں کو روزگار فراہم کرنا تھا جس میں سے ایک کروڑ ۵ لاکھ کو زراعت کے باہر اور ۳۵ لاکھ کو زراعت کے اندر کام ملنا تھا۔

اِس طرح چوتھا پلان شروع ہوتے وقت بے روزگاروں کی فوج میں ایک کروڑ ۴۰ لاکھ آدمی ہونے کی توقع تھی۔ ایسی صورت میں ہمارا فرض صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ چوتھے پلان میں ہم بے روزگاری کے مسئلہ پر سب سے زیادہ توجہ دیں بلکہ ہمیں کم از کم یہ کرنا ہے کہ بے روزگاری کے بقائے کو یک لخت ختم کر دیں۔

روزگار چوتھے پلان میں :

مجوّزہ چوتھے پلان کے مطابق چوتھے پلان کے دوران روزگار تلاش کرنے والوں کی تعداد ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ کی تشویشناک گنتی سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ ان میں سے ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ کا نیا اضافہ ہوگا اور باقی ایک کروڑ ۲۰ لاکھ تیسرے پلان کا بقایا۔ اس طرح چوتھے پلان میں روزگار کا اضافہ ایک کروڑ ۸۵ لاکھ سے ایک کروڑ ۹۰ لاکھ کے درمیان ہوگا۔ بہرحال یہ توقع ہے کہ صنعتی ترقی کی متوقع ساخت سے اور زراعتی پروگرام کی تیز پھلانگ سے ممکن ہے کہ موجودہ اندازے سے زیادہ روزگار کے مواقع پیدا ہو جائیں۔ زراعتی پروگرام میں صنعتی غذائی اشیا بھی شامل ہیں۔ لیکن اس موقع پر یہ جتانا ضروری ہے کہ اگر چوتھے پلان میں ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ سے لے کر ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ لوگوں کے لیے روزگار کا انتظام نہ کیا گیا تو پانچویں پلان میں یہ مسئلہ اور بھی نازک ہو جائے گا جب تقریباً ۳۰۰ لاکھ آدمی روزگار کے متلاشی ہوں گے۔

روزگار کی دو قسمیں : ہمارے منصوبوں، خصوصاً دوسرے اور تیسرے منصوبوں کے روزگار کے پہلو کو پورے طور سے سمجھنے کے لیے اُن دو قسموں کے روزگار میں فرق کرنا ضروری ہے جو ترقیاتی مصارف کی وجہ سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ پہلی قسم کا روزگار وہ ہے جس کی وجہ سے ملک کی پیداوار میں خالص اضافہ ہوتا ہے۔ ایسے روزگار کو معاشی روزگار (پیدا آور) کہا جاتا ہے۔ دوسرے قسم کا روزگار امدادی یا راحت دینے والا ہوتا ہے۔ جس سے روزگار پانے والوں کی آمدنی تو ہوتی ہے لیکن اس کی وجہ سے سماج کی خالص پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ امدادی روزگار سماجی نکتۂ نظر سے بہت مفید ہو سکتا ہے اگر یہ چھوٹے قسم کے تعمیری کاموں کے لیے ہو مثلاً سڑکیں، پل اور باندھ کی تعمیر۔ اس قسم کے تعمیری کاموں سے نہ صرف نئی آمدنی پیدا ہوتی ہے بلکہ سماج کی خالص پیداوار بڑھتی ہے اور اس طرح قوم کی سماجی معاشی بہبود میں اضافہ ہوتا ہے۔

لیکن اگر امدادی روزگار اُن گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کی توسیع کے ذریعے فراہم ہوتے ہیں

جو زیادہ لاگت سے کارخانوں کی بنی اشیا کا ناقص بدل پیدا کرتی ہیں تو اس سکٹر سے سماجی خالص پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ روزگار کا وہ اضافہ جو گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کو امداد اور مخصوص تحفظ دے کر حاصل ہوتا ہے وہ معاشی روزگار میں اضافہ نہیں تصور کیا جاسکتا۔ یہ ایک طرح کا امدادی روزگار ہے جو ان بے حاصل پر وحکیٹوں کی طرح ہے جو ترقی یافتہ معیشتیں لوگوں کو امداد دینے کے لیے شروع کرتی ہیں۔

دوسرے پلان کی روزگار کی پالیسی کا تنقیدی جائزہ:

دوسرے پلان کی بنیادی حکمت عملی سے ظاہر ہوتا ہے کہ پلاننگ کمیشن روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کرنا چاہتا تھا اور بیشتر توجہ امدادی قسم کے روزگار پر تھی۔ پروفیسر مہالنوبیس پہلے آدمی تھے جنھوں نے بھاری صنعتوں اور گھریلو صنعتوں کی ایک ساتھ ترقی پر زور دیا۔ پروفیسر مہالنوبیس نے تیز صنعتی ترقی اور بے روزگاری ختم کرنے کے جڑواں مسئلے کے حل کے لیے پلان کے مسودے میں تجویز کیا کہ پبلک سکٹر کی بھاری صنعتوں میں سرمایہ لگا کر اور تعلیم، صحت اور سوشل سروس پر خرچ کر کے قوتِ خرید میں اضافہ کیا جائے اور دوسری طرف صرفی اشیا کی بڑھتی ہوئی طلب کو پورا کرنے کے لیے ان اشیا کی رسد کا انتظام ایک منصوبے اور ضابطے کے تحت کیا جائے۔ مہالنوبیس کی یہ پالیسی دوسرے پلان کی بنیاد تھی۔ جلد ہی یہ اندازہ ہوا کہ تمام حاصل سرمایہ بھاری صنعتوں میں لگایا تو جاسکتا ہے لیکن روزگار کے کافی مواقع نہیں فراہم کرسکتا تھا۔ بھاری صنعتوں کے بعد جو تھوڑا سرمایہ بچ رہے گا وہ صرفی اشیا پیدا کرنے والی منظم صنعتوں کی توسیع کے لیے ناکافی تھا۔ چنانچہ بے روزگاری کے مسئلے کے حل کے لیے اور صرفی اشیا کی رسد بڑھانے کے لیے گھریلو اور چھوٹی صنعتوں پر بھروسہ کیا گیا۔

لیکن گھریلو صنعتیں جو فرسودہ طریقے اور فرسودہ آلات استعمال کرتی تھیں، اُن منظم صنعتوں سے مقابلہ نہیں کر پاتی تھیں جو اس طرح کی اشیا بناتی تھیں۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ گھریلو صنعتوں کو بھاری امداد دی جائے اور فیکٹری ٹائپ کی اُن صنعتوں پر پابندی عائد کی جائے جو اس قسم کی صرفی اشیا بناتی تھیں۔ اس پالیسی کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ امدادی قسم کے روزگار میں تو کچھ اضافہ ضرور ہوا لیکن صرفی اشیا کی پیداوار کافی نہیں بڑھی۔ یہ بات لمبی مدت کے نظر سے سے غیر معاشی تھی۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم پلان کے آنے والے برسوں میں گھریلو صنعتوں کی ترقی اور توسیع

کی ترقی کو بُرا سمجھتے ہیں۔ ہماری رائے ہے کہ ڈیری فارمنگ، پولٹری فارمنگ اور شہد کی مکھیاں پالنے جیسی زرعی قسم کی گھریلو صنعتیں ایک کم ترقی یافتہ معیشت کے غیر منظم سکٹر کے لیے زیادہ اہم ہیں کیوں کہ یہ بامعنی روزگار فراہم کرتی ہیں اور انھیں زراعت کے ساتھ منسلک کیا جا سکتا ہے۔ فاؤنڈری، لوہاری، الکٹروپلیٹنگ اور ملمع سازی جیسی چھوٹے پیمانے کی صنعتیں معاون صنعتیں کہی جاتی ہیں۔ وہ معیشت کو صنعتی بنانے میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ ایک ترقی پذیر معیشت میں جہاں زبردست نقل و حمل اور صنعت کی ترقی پر تاکید ہو، سروس ٹائپ کی گھریلو صنعتیں ضروری ہیں مثلاً موٹریں، بائسکل، ٹریکٹر اور دوسری مشینوں کی مرمت کے لیے ورک شاپ۔ زرعی قسم کی گھریلو صنعتیں، سروس ٹائپ کی چھوٹی صنعتیں اور چھوٹے پیمانے کی معاون صنعتیں، معاشی روزگار فراہم کرتی ہیں اور پانچ سالہ پلان میں ان کی توسیع کی ضرورت ہے۔

پہلے اور دوسرے پلان کا تقابلی جائزہ :

پہلا پلان تیز ترقی کا منصوبہ نہیں تھا۔ اس کا بنیادی مقصد اُن مسائل کو حل کرنا تھا جو جنگ اور ملک کی تقسیم کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے اور ملک کے استحکام کے لیے خطرہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب پہلا منصوبہ بنا اُس وقت ملک میں چیزوں کی عام قلت تھی۔ اس قلت میں زرعی اشیا بھی شامل تھیں۔ چنانچہ منصوبے کا مقصد معمولی روزی دینے والے زرعی سکٹر کو تقویت دینا تھا۔ اس کے لیے زرعی محاذ پر ادارہ جاتی تبدیلیاں لائی گئیں جن سے زرعی سکٹر کی پیداواری صلاحیت بڑھی۔ لیکن تیز صنعتی ترقی کے طریقوں کو پورے طور سے نہیں سمجھا جا سکا اور صنعتوں پر جو رقم خرچ کی گئی وہ پلان کے نشانے سے کم تھی۔ اس کی بنیادی وجہ انتظامی مزاحمت بھاری آلات اور ماہر عملے کی کمی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ صنعتی میدان میں پہلے پلان کا تمام تر مقصد موجودہ صنعتی استعداد کا پورا استعمال تھا۔ پلان کے آخری سال میں بے روزگاری کا مسئلہ حل کرنے کی ادھوری کوشش کی گئی لیکن گیارہ نکاتی پروگرام اور منصوبے کے اخراجات پر نظر ثانی کے باوجود زیادہ کامیابی نہیں ہوئی جس کی بنیادی وجہ روزگار کے نشانوں اور اصل وسائل کی دست یابی میں عدم مطابقت تھی۔ پہلے پلان کا سب سے نمایاں کارنامہ غذائی قلت کے مسئلے کو حل کرنا تھا۔ لیکن یہ بھی زرعی منصوبے سے زیادہ اچھے مانسون کا نتیجہ تھا۔ مالی وسائل کے میدان میں پہلے پلان کے دوران مالیاتی منصوبہ بندی کی طرف بہت احتیاط سے قدم اُٹھایا گیا، غالباً اس لیے کہ اس پلان کی توجہ استحکام کی طرف زیادہ تھی۔ ٹیکسوں کے میدان میں زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور کفایت کی کوشش ظاہر نہیں تھی۔ قرض لینے اور چھوٹی بچت کی مہموں کو تیزی سے نہیں چلایا گیا۔ بیرونی امداد کا پورا استعمال نہیں ہوا اور مالیاتی خسارے

کا پیمانہ اِس لحاظ سے کم تھا کہ اِس پلان کا مقصد معاشی ترقی کو تقویت دینا تھا۔ ان کوتاہیوں کی وجہ سے پہلا پلان صرف اِس حد تک کامیاب ہوا کہ اِس نے مستقبل کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے سازگار ماحول پیدا کیا لیکن یہ پلان وہ فیصلہ کُن تبدیلی کا عمل شروع کرنے میں ناکام رہا جو ایک جامد معیشت میں انقلاب لانے کے لیے ضروری ہے۔

پہلے پلان کے دوران زراعتی پیداوار میں نمایاں ترقی کی وجہ سے قومی آمدنی ۱۲% کے نشانے کے مقابلے میں ۱۸% بڑھی۔ دوسرا پلان پہلے کے مقابلے میں زیادہ وسیع اور کشادہ تھا لیکن مختلف مشکلات کی وجہ سے قومی آمدنی میں ۲۵% کے نشانے کے مقابلے میں صرف ۲۰% کا اضافہ ہوا۔ ۵۶-۱۹۵۱ء تک کی پانچ برس کی مدّت میں قومی آمدنی (مستقل قیمتوں پر) ۴۲% فی کس آمدنی ۲۰% فی کس صرف ۱۶% اور آبادی ۲۱% بڑھی۔

پہلے پلان میں اگر زراعت کی طرف توجہ زیادہ تھی تو دوسرے پلان میں صنعت و حرفت پر زیادہ زور دیا گیا کیونکہ خیال یہ تھا کہ غریبی کی شدید لعنت بے روزگاری، کم روزگاری اور عدم مساوات کو تیز صنعتی ترقی کے بغیر نہیں دور کیا جا سکتا۔ پہلا پلان بہت معمولی اور محتاط تھا اور شاید ان ماہرین مالیات کے دامن سے بندھا ہوا تھا جن کو تیز ترقی سے زیادہ استحکام کی فکر تھی۔ دوسرا پلان ترقیاتی منصوبہ بندی کی ایک زیادہ بڑی اور دلیرانہ کوشش تھی۔ دوسرے پلان کے پہلے مسودے میں پبلک سکٹر کے ترقیاتی خرچ کے نشانے کو دوگنا کرنے کی تجویز تھی۔ یعنی پہلے پلان کے ۲۴۰۰ کروڑ کے مقابلے میں ۴۸۰۰ کروڑ۔ صرف یہی نہیں بلکہ معیشت میں مجموعی طور سے جو سرمایہ لگنا تھا وہ بھی ۳۱۰۰ کروڑ سے بڑھا کر ۶۲۰۰ کروڑ کر دیا گیا۔

باب ۷

تیسرے پلان میں دفاع اور ترقی

تیسرے پلان کی اپنی ایک خاص اہمیت ہے۔ ابھی تیسرا پلان شروع ہوئے ڈیڑھ برس بھی نہیں ہوا تھا کہ چین نے ہندوستان پر حملہ کر دیا اور حکومت کو مجبوراً ایمرجنسی نافذ کرنی پڑی۔ اس کے بعد پلان کے آخری سال میں پاکستان سے جھڑپ ہوئی جس کی وجہ سے حکومت کو دفاع پر زیادہ خرچ کرنا پڑا۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ترقیاتی پروگرام ان حادثات سے متاثر ہوئے۔

دوسرے پلان میں جن مشکلات کا سامنا تھا وہ تیسرے پلان میں اور شدت اختیار کر گئیں۔ مثلاً تجارت کا توازن ہندوستان کے لیے برابر ناموافق ہوتا گیا۔ ۱۹۶۲ء میں چینی حملے کی وجہ سے وسائل کو بڑے پیمانے پر دفاع کی طرف منتقل کرنا پڑا۔ ۶۵-۱۹۶۴ء میں مانسون نے دوبارہ دھوکہ دیا جس کی وجہ سے فصل خراب ہوئی۔ برآمدات سے آمدنی گھٹ گئی اور قحط کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ پنجاب اور جنوبی ہند میں بادش کی کمی سے بجلی کی پیداوار کم ہوئی جس کا اثر صنعتی سرگرمی پر پڑا۔ اُجرت اور قیمتوں میں اتنا اضافہ ہوا جس کی مثال پہلے نہیں ملتی اور پھر طرّہ یہ کہ پاکستان سے لڑائی ہوئی جس کی وجہ سے اگست ۱۹۶۵ء میں امریکی امداد بند ہو گئی اور صنعتی ضروریات کی درآمد کم ہونے کی وجہ سے قلتوں کا ایک انبار لگ گیا۔ چنانچہ قوم نے فیصلہ کیا کہ ملک کی معاشی ترقی کے لیے زیادہ قربانی دینی ہے اور ان پروگراموں میں ضروری تبدیلیاں لا کر دفاعی ضروریات پوری کرنے کی طرف توجہ دینا ہے۔ تیسرے پلان کی مدت یکم اپریل ۱۹۶۱ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۶۶ء تھی۔

تیسرے پلان کے مقاصد اور اس کا حجم

تیسرے پلان کے مقاصد یہ ہیں : (۱) قومی آمدنی میں ۵٪ کا اضافہ، صرف کی شرح میں ۴٪ سالانہ کا اضافہ اور بچت کی شرح میں پلان کے ختم تک ۱۴٪ کا اضافہ (۲) اناج کی پیداوار میں خود کفیل ہونا (پیداوار کا نشانہ ۱۰۰ لاکھ ٹن) اور زراعتی پیداوار کو صنعت اور برآمد

کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے بڑھانا۔ (۳) لوہا، فولاد، کوئلے، بجلی اور کیمیاوی صنعتوں کی توسیع اور مشینیں بنانے کی استعداد کو بڑھانا تاکہ دس برس کے اندر مزید صنعتی ترقی کی ضروریات ملک کے وسائل سے پوری ہو سکیں (۴) انسانی محنت کے وسائل کو پورے طور پر استعمال کرنا اور روزگار کے مواقع بڑھانا۔ درحقیقت تیسرا پلان ۱۴۰ لاکھ لوگوں کو روزگار فراہم کرنے کا قصد رکھتا تھا (۳۵ لاکھ زراعتی حلقے میں اور ۱۰۵ لاکھ غیر زراعتی حلقے میں۔ (۵) زیادہ سے زیادہ لوگوں کو برابر کے موقعے فراہم کرنا، آمدنی اور دولت کی نابرابری کم کرنا اور معاشی قوت کی تقسیم کو زیادہ ہموار کرنا۔

ان مقاصد کے پیش نظر تیسرے پلان میں دوسرے پلان کے ۶۷۵۰ کروڑ اور پہلے پلان کے ۳۳۶۰ کروڑ کے مقابلے میں ۱۰۴۰۰ کروڑ روپے کے بہ قدر سرمایہ لگایا گیا (پبلک سکٹر میں ۶۳۰۰ کروڑ اور نجی حلقے میں ۴۱۰۰ کروڑ)۔ تیسرے پلان میں پبلک سکٹر کا مجموعی خرچ ۷۵۰۰ کروڑ تھا، جب کہ دوسرے پلان میں ۴۶۰۰ کروڑ اور پہلے پلان میں ۱۹۶۰ کروڑ تھا۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ پلان کے مجموعی خرچ کا تخمینہ ۱۱۶۰۰ کروڑ تھا (پبلک سکٹر ۷۵۰۰ کروڑ اور نجی سکٹر ۴۱۰۰ کروڑ)۔ ان مالی وسائل کے مقابلے میں پلان کے مادّی نشانوں تک پہنچنے کے لیے ضروری مجموعی خرچ ۱۲۷۰۰ کروڑ دکھلایا گیا تھا (۱۲۷۰۰ = ۴۱۰۰ + ۸۶۰۰) اور ایمرجنسی کے پیش نظر ان اعداد و شمار پر نظر ثانی کی گئی اور یہ طے پایا کہ تیسرے پلان میں دفاع اور ترقی ساتھ ساتھ چلیں۔ اس کے مطابق پلان کی مالی تبدیلی کی گئی۔ پبلک سکٹر کا مجموعی خرچ ۷۵۰۰ کروڑ سے بڑھ کر ۸۵۰۰ کروڑ ہو جانے کی توقع تھی۔ اگر اس میں نجی سکٹر کے ۴۱۰۰ کروڑ جوڑ دیے جائیں تو پلان کا نظر ثانی شدہ مجموعی خرچ ۱۲۶۰۰ کروڑ بن جاتا ہے۔ ۶۵-۱۹۶۴ء میں یہ خرچ ۲۶۳۰ ہونے کی توقع تھی۔ چنانچہ چوتھے پلان کے مسودے میں تیسرے پلان کا قرین قیاس خرچ ۸۶۳۰ کروڑ دکھلایا گیا ہے۔

منصوبہ بندی سے حاصل ہونے والے سبق (خصوصاً دوسرے اور تیسرے پلان سے)

تیسرے پلان کے شروع ہی میں چینی حملے کی وجہ سے اور پلان کے آخر میں پاکستان سے لڑائی کی وجہ سے ہمارے ماہرین منصوبہ کو اس نتیجے پر پہنچنا پڑا کہ معاشی ترقی کے منصوبے کو دفاعی استعداد بڑھانے کے پروگرام سے منسلک ہونا چاہیے۔ وسائل کی ضروری منتقلی کے لیے عوام کی طرف سے بڑی کوشش کی ضرورت تھی۔ اس لیے معیشت کے اہم شعبوں پر منصوبوں کے اثر کا جائزہ لے کر یہ معلوم کرنا مفید ہوگا کہ بچت کی شرح کو بڑھانے اور کم یاب وسائل کو ترجیحی ترقیاتی اسکیموں میں استعمال کرنے کے لیے

کس کو کتنی قربانی دینی چاہیے۔

اس کے لیے ہمیں اونچے طبقے پر منصوبائی سرمایہ کاری کے اثر کا تجزیہ کرنا ہوگا، خصوصاً دوسرے اور تیسرے پلان کے دوران۔ بظاہر منصوبائی سرمایہ کاری اور حکومت کے انتظامی اخراجات سے زیادہ فائدہ اسی اونچے طبقے کو پہنچا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیے کہ مہالنوبس کمیٹی نے جس نے فروری ۱۹۶۴ء میں اپنی رپورٹ پیش کی، یہ خیال ظاہر کیا تھا: "اس میں شک نہیں کہ ایک حد تک ہماری منصوبہ بند معیشت نے بڑے کاروبار کی ترقی میں امداد اور سہولتیں فراہم کرکے معاشی قوت کو چند ہاتھوں میں سمٹ آنے کی ہمت افزائی کی ہے۔" دوسرے اور تیسرے پلان کے بعد ہمیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ ترجیحی کاموں پر خرچ جتنا بھی زیادہ ہوگا اتنا ہی زیادہ غیر ترجیحی سر... کی تخلیق ہوگی اور اتنا ہی زیادہ ... اونچے طبقے میں صرف ہوگا۔

یہ ظاہر ہے کہ جو اشیا اونچے طبقے کی فہرست میں ہوں انھیں صرف اچھی ... قیمتی ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ امیرانہ افادیت بھی ہونی چاہیے مثلاً ریفری جریٹر، ایرکنڈیشنرز موٹریں۔ عمدہ فرنیچر، کمرہ سجانے کے کپڑے، بجلی کا سامان، ڈرائنگ روم سجانے کی چیزیں، غسل خانے میں لگنے والی چیزیں، باورچی خانے میں استعمال ہونے والے سامان اور آلات۔ اونچے طبقے کے بڑھے ہوئے خرچ کی وجہ سے مندرجہ بالا نمائشی اشیا کی صنعتوں کی طرف سرمایہ راغب ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ صنعتیں منصوبے کے ترجیحی سکٹر سے مقابلہ کرتی ہیں، اور اُن کی حریف بن کر فولاد، سیمنٹ، پاور، بیرونی زرمبادلہ اور فنی مہارت جیسے کم یاب وسائل کی طالب ہوتی ہیں۔ یہ بات مناسب نہیں ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے ترجیحی سرمائے کی تخلیق کو نقصان پہنچتا ہے اور پلان تباہ ہوجاتا ہے۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ دوسرے اور تیسرے منصوبے کے دوران کافی وسائل اُن کاموں کی طرف منتقل ہوئے جو اونچے طبقے کے فائدے کے لیے تھے۔ اس کا قوی امکان ہے کہ وسائل کی منتقلی کے اس میلان کو دولت کی تقسیم میں عدم مساوات سے بڑی مدد ملی۔ اس عدم مساوات کی وجہ سرمایہ لگانے کا وہ طریقہ تھا جس سے اونچے طبقے کو منافع اور اونچی تنخواہوں کی شکل میں بڑی آمدنی ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت اونچا طبقہ اپنی موثر طلب کی وجہ سے بازار کی قوتوں پر حاوی ہے اور ان قوتوں کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ چوتھے پلان میں سرمایہ لگانے کی رفتار اور بھی تیز ہوگی اور یہ اونچا طبقہ اور بھی زیادہ طاقت ور بنے گا۔ چنانچہ چوتھے پلان میں اس طبقے کی سرگرمیوں پر پابندی لگانے کی ضرورت ہے۔

دوسرے اور تیسرے منصوبے میں جس طرح سرمایہ لگایا گیا اور اُس کے نتیجے میں جو اثرات ظاہر

ہوئے اور جو ناکامیاں ہوئیں وہ ہمیں نہیں بھلانی چاہئیں۔ ساتھ ہی ہمیں اُن اہم باتوں کو بھی یاد رکھنا چاہیے جو ہم نے قیمتوں، آبادی اور روزگار کے محاذ پر سیکھیں۔ دوسرے پلان کے دوران قیمتوں کی سطح اوسطاً ۶% سالانہ کی شرح سے بڑھی لیکن تیسرے پلان میں قیمتیں آسمان پر چڑھ گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تیسرے پلان میں عام قیمتوں کی سطح اوسطاً ۹% سالانہ کی شرح سے بڑھی۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق دوسرے پلان کے ختم کے وقت ہندوستان کی آبادی ۴۳۹ کروڑ تھی اور توقع تھی کہ تیسرے پلان کے ختم تک ۴۹۰ کروڑ ہو جائے گی۔ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ بڑھتی ہوئی قیمتیں اور آبادی کے بے پناہ اضافے نے ہمارے معیار زندگی پر گہری ضرب لگائی جس کی وجہ سے لوگوں کا اعتماد منصوبوں پر سے اُٹھتا جا رہا ہے۔ چنانچہ یہ اشد ضروری ہے کہ چوتھے پلان کے دوران قیمتوں کو بڑھنے سے روکا جائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ چوتھے پلان کے لیے آبادی کی منصوبہ بندی کی ایک دُرست اور موثر پالسی بنائی جائے اور پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ اُس پر عمل کیا جائے۔

روزگار کے محاذ پر بھی دوسرے پلان کی کارگزاری امید افزا نہیں تھی۔ آپ کو یاد ہوگا جب دوسرا پلان شروع ہوا اس وقت روزگار میں ۵۳ لاکھ کا بقایا چلا آ رہا تھا، یعنی ۵۳ لاکھ آدمیوں کو روزگار فراہم کرنے کی ضرورت تھی۔ پلان میں صرف ایک کروڑ آدمیوں کے لیے روزگار تجویز تھا۔ اور پچھلے ۵۳ لاکھ کے بقائے کو آئندہ کے منصوبوں کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ لیکن دوسرے پلان کے پورے ہونے پر معلوم ہوا کہ صرف ۶۵ لاکھ لوگوں کو روزگار مل سکا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۵۳ لاکھ کے پچھلے بقائے میں ۳۵ لاکھ بے روزگار اور بڑھ گئے۔ بعد میں پلاننگ کمیشن کے تخمینے کے مطابق آبادی بڑھنے کی وجہ سے تیسرے پلان کے دوران روزگار تلاش کرنے والوں کی تعداد میں ۱۷ کروڑ کا اضافہ ہوا۔ اس میں اگر دوسرے پلان کے آخر کا بقایا جوڑ دیا جائے تو تیسرے پلان کے دوران بے روزگاروں کی مجموعی تعداد ۲۶ کروڑ کے لگ بھگ تھی جب کہ تیسرے پلان میں صرف ۱۴ کروڑ نئے روزگار فراہم کرنے کا نشانہ تھا۔ بد قسمتی سے اس نشانے کا صرف ۶۰% پورا ہو سکا۔ اس سب کا مطلب یہ ہے کہ چوتھے پلان میں ہمیں بہت پھرتیلے پن کے ساتھ بے روزگاری سے جنگ کرنی پڑے گی اور شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مختصر یہ کہ چوتھے پلان میں ملک کو اپنی ساری قوت بھرپور طریقے سے استعمال کرنی ہوگی۔ ہمیں منصوبہ بند کوشش کے تینوں پہلوؤں، یعنی آبادی کے کنٹرول کا پروگرام، قیمتوں کی پالسی اور روزگار کے پروگرام کو اس طرح ہم آہنگ کرنا ہوگا کہ بیک وقت ان تینوں پر عمل کیا جائے۔ درحقیقت ہمیں

یہ پتہ چلانا چاہیے کہ کون کتنی قربانی دے اور نتیجے کے مطابق پالسی بنانی چاہیے۔

تیسرے پلان میں سرمایہ کاری کا قماش

تیسرے پلان کی سرمایہ کاری کی اسکیم میں مجوزہ مقاصد کا خیال رکھا گیا تھا۔ چنانچہ مندرجہ ذیل حلقوں میں سرمایہ لگانے پر تاکید تھی: (۱) زراعت مع آب پاشی (۲) بھاری بنیادی صنعتیں مع پاور (۳) سوشل سروس کے بعض پہلو مثلاً ٹکنیکل تعلیم۔ دوسرے پلان کے مقابلے میں تیسرے پلان میں ان حلقوں پر زیادہ زور دیا گیا۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ زراعت کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور آب پاشی پر جو سرمایہ لگایا گیا وہ مجموعی خرچ کا ۲۳٪ تھا۔ تیسرے پلان میں توقع تھی کہ چھوٹی اور متوسط درجے کی صنعتوں اور بجلی پر کل خرچ کا ۲۲٪ صرف ہوگا۔ دوسری طرف نقل وحمل اور رسل ورسائل پر دوسرے پلان کے ۲۱٪ کے مقابلے میں کچھ کم یعنی ۲۰٪ خرچ تجویز تھا۔

تیسرے پلان میں زراعت

بہتر ہوگا کہ ہم پہلے اور دوسرے پلان میں زراعتی حلقے کے کاموں کا جائزہ لیں۔ زراعتی پیداوار میں اضافہ پہلے پلان کے دوران ۱۷٪ اور دوسرے میں ۱۶٪ تھا۔ ہندوستانی منصوبہ بندی کے پہلے دس برسوں میں اضافہ کی سالانہ شرح ۳ء۴۶٪ کے قریب تھی۔ جہاں تک اناج کی پیداوار کا تعلق ہے، پہلے پلان کے ساز گار موسمی حالات میں زیادہ سے زیادہ ۶ء۶۰ کروڑ ٹن غلہ پیدا ہو سکا۔ دوسرے پلان کے آخری سال ۷ء۹۶ کروڑ ٹن اناج پیدا ہوا۔

تیسرے پلان میں زراعت کی پیداوار میں اضافہ دوسرے پلان کے ۴٪ کے مقابلے میں ۶٪ تجویز تھا لیکن تیسرے پلان کے آخر میں صورت بڑی مایوس کن تھی۔ پندرہ برس کی منصوبہ بندی میں زراعتی ترقی کی سالانہ شرح صرف ۲ء۶۵٪ تھی۔ اناج کی پیداوار ۶۵-۱۹۶۴ء کے ۸ء۶۸ کروڑ ٹن سے گھٹ کر ۶۶-۱۹۶۵ء میں ۷ء۲۳ کروڑ ٹن ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ صرف موسمی حالات اور بارش کی کمی ہی نہیں تھی بلکہ اس میں زراعتی تنظیم اور منصوبہ بندی کی خامیوں کو بھی دخل تھا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ زراعت کا مسئلہ زرعی معیشت میں صرف روپیہ لگا کر نہیں حل کیا جا سکتا۔ کسانوں کو قرض کی سہولتیں فراہم کرنا تو اہم ہے ہی لیکن یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ مسئلے کا اصل حل زراعت کے بہتر طریقے اور بہتر تنظیم پر ہے۔

تیسرے پلان میں زراعتی پروگرام کے لیے ۱۲۸۰ کروڑ روپے رکھے گئے تھے۔ اِن پروگراموں میں چھوٹی بڑی آب پاشی کی اسکیمیں، سوائل کنزرویشن اور امدادِ باہمی کے پروگرام بھی شامل تھے۔ دوسرے پلان میں یہ رقم ۶۶۷ کروڑ تھی۔ ۱۲۸۰ کروڑ میں ۲۰۶ کروڑ کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور امدادِ باہمی کے لیے وقف تھے۔ زراعتی پروگراموں کے حصے میں ۲۲۶ کروڑ روپے آئے تھے۔ اِس کے علاوہ چھوٹی بڑی آب پاشی کی اسکیموں کے لیے ۶۷۷ کروڑ اور سوائل کنزرویشن کے لیے ۷۲ کروڑ روپے رکھے گئے تھے۔

معاشی ترقی کے معنی ہیں زمین کی پیداواری اہلیت، محنت کی ہنرمندی اور کارکردگی اور سرمائے کی رسد میں ترقی۔ لیکن اگر معقول تنظیم نہیں ہے تو یہ سب بے کار جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ زراعتی ترقی کے لیے تنظیم کی بنیادی حیثیت ہے۔ ہندوستان کی زراعتی ترقی کی راہ میں اصل رکاوٹ مالیاتی نہیں بلکہ معقول تنظیم کی کمی ہے۔ بہتر انتظام اور مکمل بنیادی تبدیلیاں عمل میں آنے سے جدید طریقوں اور علم کا استعمال بڑھے گا اور ہندوستان کی زراعت کو نیا نظریہ ملے گا۔

تیسرے منصوبے میں صنعتی ترقی

منصوبہ بندی کے پہلے دس برسوں میں صنعتی ترقی کے میدان میں نمایاں ترقی ہوئی۔ دوسرے پلان میں صنعتوں کے لیے نجی اور سرکاری سکٹر میں ۱۱۹۴ کروڑ سرمایہ لگانے کا تخمینہ تھا۔ سرکاری اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ نجی اور سرکاری سکٹروں میں ۱۵۴۵ کروڑ روپے لگے جو تخمینے سے ۳۵% زیادہ تھا۔

دوسرے پلان کے دوران صنعتی پیداوار کا انڈکس مجموعی اعتبار سے ۷% سالانہ بڑھا۔ درحقیقت یہ انڈکس ۱۹۵۱ء کے ۷۴ سے بڑھ کر ۱۹۶۵ء میں ۱۸۲ ہوگیا یعنی ۱۴ برسوں میں ۱۴۶% کا اضافہ ہوا۔ زرِ مبادلہ کی قلت، بچت اور سرمائے کی تخلیق کی نیچی سطح اور ٹکنیکی ماہروں اور تجربے کی کمی کو دیکھتے ہوئے دوسرے اور تیسرے پلان میں جو ترقی ہوئی وہ جدید صنعتی توسیع کی ماہیت کو ظاہر کرتی ہے۔

ہم نے دیکھا کہ تیسرے پلان کی ترقیاتی اسکیم میں زراعت کو کافی اہمیت دی گئی۔ ساتھ ہی اِس بات کا اعتراف تھا کہ ایک حد کے بعد زراعتی اور انسانی وسائل کی ترقی صنعتی ترقی پر منحصر ہوتی ہے۔ اسی لیے تیسرے پلان میں صنعتوں اور معدنیات کی ترقی کے لیے ۱۵۲۰ کروڑ روپے

سکے گئے تھے جس طرح دوسرے پلان کی صنعتی اسکیموں میں فولاد کو سب سے زیادہ فوقیت حاصل تھی، اسی طرح تیسرے پلان کے صنعتی پروجکٹوں میں بھاری مشینوں اور آلات کی صنعتوں کو سب سے اہم جگہ دی گئی تھی۔

تیسرے پلان میں خاص تاکید اُن صنعتوں کی ترقی پر تھی جن سے معیشت کو خود جاری رہنے کی صلاحیت حاصل ہو۔ مثلاً لوہا اور فولاد، مشینیں اور پیداواری اشیا بنانے والی صنعتیں۔ درحقیقت دوسرے پلان میں سب سے نمایاں ترقی مشینیں اور انجینئری سامان بنانے کے میدان میں ہوئی۔ مشینیں بنانے کے لیے فاؤنڈری اور فورج کی استعداد سب سے زیادہ ضروری ہوتی ہے۔ تیسرے پلان میں یہ استعداد پبلک سکٹر میں بڑے پیمانے پر بڑھائی گئی۔ مشینی اوزار کے میدان میں پبلک سکٹر کے موجود کارخانوں میں توسیع اور دو نئے کارخانے قائم کرنے کا انتظام کیا گیا۔ نجی سکٹر میں مشینی آلات کی پیداوار کی کافی توسیع ہوئی۔

لیکن چین اور پاکستان سے لڑائی کی وجہ سے صنعتی ترقی کے ترجیحی نقشے میں ردوبدل ضروری ہو گیا۔ سب سے زیادہ ترجیح فولاد، بنیادی دھاتوں، تیل کی سپلائی اور مشین سازی کی صنعتوں کو ملی۔ یاد رکھنا چاہیے کہ دفاعی پیداوار اور دفاعی صنعتوں کے لیے بھاری مشین سازی کی استعداد بڑھانا ضروری ہے جو معمولی قسم کی صرفی اشیا کی پیداوار کے لیے اتنی ضروری نہیں ہے۔ معیشت کے نقل وحمل جیسے شعبوں کو، فولاد اور مشین سازی کے بنیادی حلقے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے وقف کر دیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ دفاعی تیاری اور ترقیاتی پروگراموں کی تکمیل میں ایک بنیادی تعلق ہے۔ ہمارے ترقیاتی منصوبوں کی زیادہ تر توجہ جن کاموں کی طرف معلوم ہوتی ہے وہ ہیں ایک طرف تو نقل وحمل، پاور، مشینوں اور آلات کی فراہمی اور کوئلہ، فولاد اور کیمیاوی چیزوں جیسی بنیادی اشیا کی رسد میں اضافہ اور دوسری طرف تربیتی سہولتوں کی توسیع اور تکنیکی انتظام میں مضبوطی۔ یہی چیزیں ہیں جنھیں دفاعی ضروریات کے پیش نظر زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے دفاعی کوششوں کے لیے نقل وحمل، بجلی اور معدنیاتی سکٹروں کی ترقی کی رفتار تیز کرنی ضروری ہے۔

دفاعی ترقی اور ایمرجنسی

چین اور پاکستان کے حملے نے ہمیں اس نتیجے پر پہنچنے میں مدد دی کہ دفاع اور ترقی کے لیے بیک وقت وسائل کو مجتمع کرنا چاہیے۔ وسائل کا اجتماع دباؤ اور اس کے ردِعمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ دباؤ کی شدت چوں کہ بہت تھی اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں اپنی دفاعی تیاری کو زیادہ مستحکم کرنا چاہیے۔ منصوبہ بندی کے پہلے دس برسوں میں یعنی ۵۲-۱۹۵۱ء اور ۶۱-۱۹۶۰ء کے دوران ہندوستان نے دفاع پر ۴,۲۰۰ کروڑ روپے صرف کیے اور اپنی قومی آمدنی ۱,۱۲,۲۰۰ کروڑ میں سے ۱۰,۱۰۰ کروڑ سرمائے کی

صورت میں لگایا۔ چینی حملے کی وجہ سے دفاعی اخراجات تقریباً دوگنے ہو گئے یعنی ۱۹۶۲-۶۳ء کے ۴۷۳ء۴۳ سے بڑھ کر ۱۹۶۳-۶۴ء میں ۸۰۶ء۱۵ کروڑ ہو گئے۔ درحقیقت ۱۹۶۱-۶۲ء سے ۱۹۶۵-۶۶ء تک پانچ برسوں کا دفاعی بجٹ ۴۸۸۲ کروڑ تھا۔ اس مدّت میں جو روپیہ سرمائے کی حیثیت سے لگایا گیا اُس کی مقدار ۱۰۴۰۰ کروڑ اور قومی آمدنی ۵۰۸۲۸ کروڑ تھی۔ پاکستان کے حملے نے دفاعی بجٹ کو اور بھی بڑھایا اور یہ ۱۹۶۵-۶۶ء کے ۸۶۷ء۱۷ کروڑ سے بڑھ کر ۱۹۶۶-۶۷ء میں ۹۰۰ کروڑ ہو گیا۔ دفاعی تیاری کے لیے لمبی مدّت کی پالسی درکار ہوتی ہے اور لمبی مدت کی دفاعی پالسی کے لیے معقول معاشی پالسی کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔

اِس بات کی حیثیت ضرب المثل کی ہے کہ جنگ کے وسائل امن کے وسائل ہوتے ہیں۔ ہمارے معاملے میں دفاع کے وسائل ترقیاتی وسائل پر منحصر ہیں۔ چنانچہ قومی دفاع اور ترقیاتی کوششوں کو نہ صرف شانہ بہ شانہ چلنا چاہیے بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کا تابع ہونا چاہیے۔ اِس کا یہ مطلب ہے کہ ہمیں اپنے ترقیاتی منصوبوں میں ضروری ردوبدل کرنا چاہیے تاکہ ان میں اہم دفاعی ضروریات پورا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ دو متواتر حملوں کے بعد ہمیں اپنی ترقیاتی پالسی کی تشکیل پھر سے کرنی چاہیے اور دفاع پر نظر رکھتے ہوئے اہم صنعتوں کی بنیادیں مضبوط کرنا چاہیے۔ اِس کے لیے پیداواری قوت کے اہم عوامل مثلاً تیل کی سپلائی، نقل و حمل، بجلی، بنیادی ہلکی دھاتوں کی دستیابی اور اناج اور زراعتی خام مال کی رسد کو پوری اہمیت دینی چاہیے۔

ایمرجنسی میں دفاعی اخراجات اور پیداوار کی پالسی کا فیصلہ بنیادی طور سے سیاسی اور فوجی ضروریات کے تحت کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں بھی ماہرینِ معاشیات اِس طرح مدد کرسکتے ہیں کہ دفاعی پیداوار سے متعلق پالسی کے فیصلوں کی بنیاد دو خاص باتوں پر رکھیں، ایک تو امکانی خطرے کی شدّت کا پورا احساس اور دوسرے یہ واقفیت کہ اِس پیداوار کے لیے ہمیں کیا چیزیں قربان کرنی ہیں۔

آیئے اب یہ دیکھیں کہ ہمارے جیسے کم ترقی یافتہ ملک کو جو معاشی ترقی کے لیے کوشاں ہے بڑے پیمانے پر دفاعی تیاری کی کیا قیمت ادا کرنی ہوتی ہے۔ ہم یہاں مسئلے کا معروضی جائزہ لیں گے تاکہ اس کے اصل پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملے۔

سب جانتے ہیں کہ پیداواری اشیا کے برعکس دفاعی پیداوار کے بڑھنے سے معیشت کی پیداوار کی صلاحیت نہیں بڑھتی۔ یہ چیزیں اس لیے پیدا کی جاتی ہیں کہ اِن سے صارفوں کی طلب کی تسکین ہو بلکہ اِس لیے کہ اِن سے دفاعی ضروریات کی وہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں جو قوم کے تحفّظ کے لیے اشد ضروری ہیں۔ اِس کا یہ مطلب ہے کہ ایک دیے ہوئے وقت میں محدود وسائل کو استعمال کرنے

کے لیے قوم کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ دفاعی اور صرفی اشیا کی پیداوار میں سے کس میں کتنی کمی بیشی کی جائے۔ اگر وسائل پورے طور سے استعمال ہو رہے ہیں اور دفاعی پیداوار کو ترجیح حاصل ہے تو عام صرفی اشیا کی پیداوار یقیناً کم ہوگی۔ مجموعی طور پر نتیجہ یہ ہوگا کہ ضروری وسائل دفاعی پیداوار کی طرف منتقل ہو جائیں گے اور اگر عام صرفی اشیا کی طلب کو موثر طریقے سے کم نہ کیا گیا تو قیمتیں بہت بڑھ جائیں گی جس کی وجہ سے صورتِ حال بہت بگڑ جائے گی۔ اسی لیے ٹیکس کے نظام کو سخت اور موثر ہونے کی ضرورت ہے تاکہ لوگ بچت کرنے پر مجبور ہوں۔ ہندوستان میں یہ دونوں باتیں تیسرے پلان کے دوران کی گئیں تاکہ دفاعی پیداوار کو مدد ملے اور صرفی اشیا کی طلب بھی کم کی جا سکے۔ ظاہر ہے کہ ان اقدام کی وجہ سے لوگوں کو بڑی قربانیاں دینی پڑیں جو دفاعی تیاری کی قیمت تھیں۔ تیسرے پلان کے دوران قیمتیں بھی بے تحاشا بڑھیں۔

یہاں پر ایک بہت اہم سوال اٹھتا ہے جو عام طور سے نظرانداز ہو جاتا ہے یا اس پر پوری توجہ نہیں دی جاتی۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں عام طور سے وسائل کا پورا استعمال نہیں ہو پاتا سمجھا یہ جاتا ہے کہ ہم امکانی پیداوار کی بہترین سطح سے نیچے ہیں۔ وسائل کے پورے استعمال نہ ہونے کا بنیادی سبب ہمارے معاشی نظام کی نااہلی ہے۔ یہ نااہلی نتیجہ ہوتی ہے ناقص بازاری کا، قیمت اور اجرت میں لچک کی کمی کا، وسائل میں نقل پزیری کی کمی کا، کاہلی اور سستی کا، چنانچہ ہمیں چاہیے کہ ہم نااہلی کی اُن زنجیروں کو توڑ دیں جو ہمارے معاشی نظام کو جکڑے ہوئے ہیں۔ اس سے دفاعی ترقی میں بڑی مدد ملے گی اور دفاعی تیاری کی قیمت کو چکانا اور اُس کے نتائج برداشت کرنا قوم کے لیے نسبتاً آسان ہو جائے گا۔ خصوصاً اس لیے کہ اس وقت ہم واقعی لڑنے کی تیاری نہیں کر رہے ہیں بلکہ اپنے کو اس قابل بنانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اگر لڑائی ہو تو ہم اس کے لیے تیار رہیں۔

تیسرے پلان کے وسائل

ہم دیکھ چکے ہیں کہ تیسرے پلان کا مسودہ تیار ہوتے وقت پبلک سکٹر کے لیے ۵۰۰۰ کروڑ روپے کے بہ قدر وسائل حاصل کرنے کا مسئلہ تھا۔ لیکن دو مسلسل حملوں کے بعد ہم کو اندازہ ہوا کہ ہمیں ۸۰۰۰ کروڑ کی ضرورت ہوگی۔ ہم یہاں جائزے کے لیے مختصراً وہ اعداد و شمار دے رہے ہیں جو تیسرے پلان کے خرچ کے لیے ابتداً تجویز تھے۔ ساتھ ہی حال کا تخمینہ بھی دیا ہوا ہے جو مجوزہ چوتھے پلان سے لیا گیا ہے۔

تیسرے پلان کے مالی وسائل

کروڑ روپے

	مالیے کی ابتدائی اسکیم	حال کا تخمینہ
۱۔ رواں آمدنی سے بچت (ٹیکس کی ۶۱-۱۹۶۰ء کی شرح کے مطابق)	۵۵۰	-۴۷۰
۲۔ ریلوے سے امداد (کرائے کی ۶۱-۱۹۶۰ء کی شرح کے مطابق)	۱۰۰	۸۰
۳۔ پبلک سکٹر کے دوسرے کاروبار سے بچت (اشیا کی ۶۱-۱۹۶۰ء کی قیمتوں کی شرح کے مطابق)	۴۵۰	۳۹۵
۴۔ عوامی قرض (خالص)	۸۰۰	۹۱۵
۵۔ چھوٹی بچت	۶۰۰	۵۸۵
۶۔ غیر مستقل قرض	۲۶۵	۳۴۰
۷۔ کمپلسری ڈپازٹ اور اینوئٹی ڈپازٹ (خالص)*	—	۱۱۵
۸۔ اسٹیل ایکوالائیزیشن فنڈ (خالص)	۱۰۵	۳۵
۹۔ متفرق کیپٹیل آمدنیاں (خالص)	۱۷۰	۱۵۰
۱۰۔ زائد ٹیکس جن میں پبلک کاروبار کے سرپلس بڑھانے کے ذرائع شامل ہیں	۱۷۱۰	۲۸۸۰
۱۱۔ بیرونی آمدنی کے بقدر بجٹ کی آمدنی	۲۲۰۰	۲۴۵۵
۱۲۔ مالیاتی خسارے کے وسیلے سے	۵۰۰	۱۱۵۰
میزان	۷۵۰۰	۸۶۳۰

*نوٹ:۔ تیسرے پلان کی تشکیل کے بعد انھیں شامل کیا گیا۔

حوالہ: چوتھے پلان کے مسودے کا خاکہ

ماہروں کے ابتدائی تخمینے کے مطابق توقع تھی کہ تیسرے پلان میں ۱۷۱۰ کروڑ روپے کے مقدار مزید ٹیکس لگانے کی ضرورت ہوگی (مرکز ۱۱۰۰ کروڑ، صوبے ۶۱۰ کروڑ) اس کا یہ مطلب تھا کہ تیسرے پلان کے دوران ہر سال اوسطاً ۲۲۰ کروڑ کے بقدر مزید ٹیکس لگانے تھے۔ لیکن چینی حملے سے پیدا شدہ ایمرجنسی کی وجہ سے ۶۴-۱۹۶۳ء کے بجٹ میں آمدنی بڑھانے کی ایک تاریخی کوشش کی گئی اور اُس سال سے ٹیکس سے آمدنی ۲۷۶ کروڑ کے بقدر بڑھ گئی۔ ٹیکس کی آمدنی جو ۶۲-۱۹۶۱ء میں مجموعی آمدنی کی ۷.۰% تھی، ۶۴-۱۹۶۳ء میں ۸.۲% ہوگئی۔ اگلے بجٹ میں بھی بالواسطہ اور بلاواسطہ ٹیکسوں پر زور دیا گیا تاکہ دفاع اور ترقی کے لیے زیادہ روپیہ مل سکے۔

چینی حملے کے بعد یہ بھی محسوس کیا گیا کہ بچت کی شرح کافی بڑھانے کی ضرورت ہے کیوں کہ ماضی میں عوام سے قرض لینے کے رضاکارانہ طریقوں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ چنانچہ حکومت نے ۶۴-۱۹۶۳ء اور ۶۵-۱۹۶۴ء کے بجٹوں میں عوامی بچت کی لازمی تحصیل کی اسکیم جاری کی۔ کمپلسری ڈپازٹ اسکیم ۶۴-۱۹۶۳ء کے بجٹ میں شامل تھی۔ یہ ہر قسم کے انکم ٹیکس ادا کرنے والوں پر عائد ہوتی تھی۔ ۶۵-۱۹۶۴ء کے بجٹ میں یہ اسکیم ختم کردی گئی۔

لازمی بچت کے حق میں دلیلیں مضبوط ہیں۔ اوّلاً تو اس کی وجہ سے وسائل میں اضافہ ہوگا جس کی شدید ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ لوگوں میں بچت کی عادت پیدا ہوگی اور بچت کی شرح بڑھے گی۔ تیسرے یہ کہ اس کی وجہ سے قوتِ صرف کم ہوگی۔ چوتھے یہ کہ اس کی وجہ سے بچت کرنے والوں کو فائدہ ہوگا کیوں کہ اس جمع شدہ بچت سے آمدنی ہوگی اور بعد میں یہ واپس مل جائے گی۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں جب سے کینس نے اپنی کتاب "جنگ کی قیمت کیسے چکائی جائے"* شائع کی اور اُس میں ملتوی اجرت (DEFFERED PAY) کا نظریہ پیش کیا، اُسی وقت سے معاشیین اور وزرائے مالیات اس خیال سے کھیلتے رہے ہیں کہ آمدنی والوں کو لازمی بچت پر مجبور کیا جائے۔ کینس کی اسکیم جو پچھلی جنگ کے وقت پیش ہوئی تھی وہ اوسط آمدنی اور کم آمدنی والوں پر عائد ہوتی تھی لیکن ساتھ ہی اونچی آمدنی والوں پر بھی کڑے ٹیکس تجویز کیے گئے تھے۔

جہاں تک خسارے کی مالیات کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ شروع میں یہ تخمینہ تھا کہ تیسرے پلان کے پانچ برسوں میں اس کی مجموعی مقدار ۵۵۰ کروڑ ہوگی لیکن واقعتاً ۱۱۵۰ کروڑ ہوئی

---

* HOW TO PAY FOR THE WAR

خیال رہے کہ یہ بڑی مقدار پانچ برسوں میں برابر نہیں پھیلائی گئی تھی۔
غرض کہ ساری ناگوارئیوں کے باوجود مالی ضوابط کو سختی سے عائد کرنا چاہیے کیوں کہ اگر افراطِ زر پر قابو نہیں حاصل کیا گیا تو ہماری ترقیاتی کوششوں اور دفاعی تیاریوں کو نقصان پہنچنا لازمی ہے۔ ہمارے پانچ سالہ منصوبوں کی دو بنیادی شرائط ہیں، ایک تو ضروریاتِ زندگی کی معقول رسد کا انتظام اور دوسرے ترجیحی سرمائے کی ضروریات کے مطابق غیر ضروری مصارف میں کمی۔ چنانچہ ہمارے تیسرے پلان کا مالیاتی نظریہ انھیں دو بنیادی مقاصد پر مبنی تھا۔

تیسرے پلان کی کچھ خرابیاں

تیسرے پلان کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ پہلے ہم نے بڑے حوصلے کے ساتھ بہت سی پالسیاں بنائیں لیکن دفعتاً تذبذب میں پڑ گئے۔ قیمتوں کی پالسی کے بارے میں خصوصاً یہی ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ پلان کی پالسی بنانے میں اعتماد کی کمی تھی۔ اب ہم تیسرے پلان کی دو خرابیوں کی طرف اشارہ کریں گے اور اس کے بعد پلان کا آخری جائزہ لیں گے۔

(۱) زراعتی منصوبہ بندی کی دو منزلیں ہیں جو ایک دوسرے کی تابع ہیں۔ پہلی منزل یہ ہے کہ مختلف اشیا کی پیداوار کے نشانے متعین کیے جائیں اور ایسا کرتے وقت آبادی کی ضرورتیں صنعتوں اور برآمدات کی ضرورتیں اور ذخیرہ تیار کرنے کی ضرورتیں ذہن میں رکھی جائیں اور یہ بھی خیال رکھا جائے کہ ان ضرورتوں کو پورا کر سکنے کی قوم میں کتنی استعداد ہے۔ دوسری منزل کا تعلق اس تنظیم سے ہے جو ان قومی نشانوں تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔ اس منزل میں اُن کاموں کی پوری وضاحت ہوتی ہے جو پیداواری یونٹوں کو اپنی ضروریات، صلاحیتوں اور مخصوص معاشی صورتِ حال اور ماحول کے مطابق پورے کرنے ہوتے ہیں اور جو نشانوں تک پہنچنے کے لیے ضروری ہیں۔ تیسرے پلان کی زراعتی پالسی کی تشکیل کے وقت ہم اس دوسری منزل میں لڑکھڑا گئے اور تنظیم کے مسئلے سے باقاعدہ نہ نپٹ سکے۔ ایک طرف پلاننگ کمیشن نے یہ تسلیم کیا کہ تیسرے پلان کے زراعتی ترقی کے مقاصد موجودہ طریقوں سے نہیں حاصل ہو سکتے تھے اور بار بار اس بات پر زور دیا کہ تنظیم کی تفصیلی منصوبہ بندی، گاؤں، بلاک اور ضلع کی سطح پر ہونا چاہیے۔ لیکن دوسری طرف پچھلے دو پلان کے تنظیمی نظریے میں کوئی تبدیلی لائے بغیر کمیشن نے زراعت پر کثیر رقم خرچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ زیادہ افسوس کی بات یہ تھی کہ ایسا

کرنے کی وجہ بھی نہیں بتائی گئی اور نہ اس بارے میں کوئی ٹھوس ہدایت دی گئی کہ گاؤں بلاک اور ضلعے کے مقاصد پورے کرنے کے لیے کیا اقدام کیے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے میں بالکل خاموشی اختیار کی گئی چنانچہ ہمیں زرعی ترقی کے لیے ایک ایسے پروگرام سے گزرنا پڑا جو معقول تنظیم کی کمی کی وجہ سے پورا نہیں کیا جا سکا۔

(۲) ہم معاشی ترقی اس وقت تک نہیں جاری رکھ سکتے جب تک برآمدات تیزی سے نہ بڑھیں۔ ظاہر ہے کہ جو بیرونی امداد ہمیں ملتی ہے اس کو ادا کرنا پڑتا ہے اور جلد از جلد تیز رفتار ترقی کو امداد کی جگہ لینی پڑتی ہے۔ ہندوستانی منصوبہ بندی کے پہلے دس برسوں میں بین الاقوامی تجارت میں ہمارا حصہ بڑھا نہیں بلکہ ۱۹۵۰ء کے ۲ء۱ % سے گھٹ کر ۶۲-۱۹۶۱ء میں ۱ء۱۴ % ہو گیا۔ برآمدات بڑھانے کے لیے واقعی زبردست کوشش کی ضرورت ہے۔ لیکن تیسرے پلان کے مسودے میں برآمدات کی ترقی کے سلسلے میں سب سے اہم جملہ یہ ہے: "زرِ مبادلہ کی قلت کے پیشِ نظر ان صنعتوں کو واضح ترجیح دینی ہے جو برآمدی اشیا پیدا کرتی ہیں یا ان کی پیداوار اتنی فاضل ہوتی ہو کہ برآمدات کے کام آئے" یہ جذبہ بہت قابلِ قدر ہے۔ لیکن صرف جذبات بے معنی ہیں اگر ان کے مطابق پالیسی بنانے کی کوشش نہیں کی جاتی تیسرے پلان میں پلاننگ کمیشن نے کہیں بھی برآمدات کی ترقی کی کوئی واضح پالیسی یا پروگرام پیش نہیں کیا۔ تعجب یہ ہے کہ پبلک سکٹر کے کارخانوں کے لیے بھی برآمدات کا کوئی کوٹہ نہیں متعین کیا گیا۔ چنانچہ تیسرے پلان کی تکمیل سے اگرچہ ہم برآمداتی ترقی کے اہم مراحل میں داخل ہو گئے تاہم برآمدی میلان کچھ یونہی رہا۔

مختصر یہ کہ پلان کی رپورٹ اُن غیر متعلق مضامین کا مجموعہ ہے جن کے بارے میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ یہ اصل پلان میں کس طرح فٹ ہوں گے اور معلوم نہیں فٹ ہوں گے بھی یا نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ تیسرے پلان کے بیشتر اہم نشانے نامکمل رہ گئے۔ دراصل پلان کی تکمیل مجموعی طور سے تشفی بخش نہیں تھی۔

تیسرے پلان کا درمیانی مدت کا جائزہ:- وہ عوامل جو صنعت و زراعت کی ترقی میں مانع ہیں۔
تیسرے پلان کے شروع ہونے کے تین سال بعد پلاننگ کمیشن نے پلان کے درمیانی مدت کے جائزے میں یہ اعتراف کیا کہ پلان کے مجموعی مقاصد کے پیشِ نظر معاشی ترقی کی شرح سست رہی ہے۔ قومی آمدنی کے اضافے کے معاملے میں تیسرے پلان کے پہلے دو برسوں میں توقع سے کم کامیابی ہوئی۔ اس مدت میں قومی آمدنی کے اضافے کی سالانہ شرح ٪ ۲ء۵ رہی جب کہ ترقی کی متوقع شرح ۵٪ سالانہ تھی۔ اس بات کے پیشِ نظر کہ آبادی بڑھنے کی اوسط شرح بھی تقریباً ۲ء۲ ٪ سالانہ ہے، قومی

آمدنی کا سالانہ اضافہ مشکل سے آبادی کے اضافے کا ساتھ دے سکا چنانچہ فی کس آمدنی جوں کی توں رہی۔

سوال یہ ہے کہ قومی آمدنی کے اضافے میں کیا چیز مانع تھی۔ تیسرے پلان کے پہلے دو برسوں میں قومی آمدنی کے اضافے کی شرح کا تجزیہ کرتے وقت یاد رکھنا چاہیے کہ پہلے اور دوسرے منصوبوں میں نقل و حمل، بجلی اور صنعتوں کی ترقی کے باوجود قومی پیداوار کا بڑا حصہ زراعتی سکٹر سے حاصل ہوتا تھا۔ قومی آمدنی کی ترقی پر زراعت کا گہرا اثر ہے جس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ قومی پیداوار میں زراعت کا حصہ بڑا ہے بلکہ اس لیے بھی کہ معیشت کے لیے صرفی اشیا اور خام مال کی رسد بھی زراعت سے متاثر ہوتی ہے۔ ہمارے جیسے کم ترقی یافتہ ملک میں اگر زراعت کی ترقی معقول پیمانے پر نہیں ہو رہی ہے تو نہ صرف زراعتی پیداوار کم ہونے کی وجہ سے معیشت کی ترقی کی رفتار پر گہرا اثر پڑے گا بلکہ اس لیے بھی کہ دوسرے سکٹروں کی ترقی میں صرفی اشیا اور خام مال کی محدود رسد حائل ہوگی اور ان سکٹروں کی بھی ترقی کی رفتار برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

تیسرے پلان میں زراعتی پیداوار کی ترقی کی اوسط سالانہ شرح ۶ % تجویز تھی۔ اس کے مقابلے میں واقعی شرح ۱۹۶۱-۶۲ء میں ½ % رہی اور اگلے سال ۳ % گھٹ گئی۔ چنانچہ ۱۹۶۲-۶۳ء کی زراعتی پیداوار کا انڈکس دوسرے پلان کے آخری سال سے نیچا تھا۔ خود زراعتی سکٹر کے اندر مختلف منصوبوں کے رجحانات مختلف تھے۔ اناج کی پیداوار میں تیسرے پلان کے پہلے سال کے دوران کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اس سال ۷۹، لاکھ ٹن اناج پیدا ہوا جو پچھلے سال سے کچھ کم ہی تھا۔ ۱۹۶۲-۶۳ء میں پیداوار اور گھٹی اور ۷۸۳، لاکھ ٹن ہو گئی گیہوں اور چاول جو اناج کی خاص فصلیں ہیں، ان کی پیداوار ۱۹۶۲-۶۳ء میں کافی گھٹی۔ نقد فصلوں (CASH CROPS) میں گنے کی پیداوار ۱۹۶۱-۶۲ء کے مقابلے میں پلان کے پہلے دو برسوں میں کم رہی۔

زراعت کو جو دھکا لگا اس کی وجہ سے قومی آمدنی تو گھٹی ہی، صنعتی سکٹر کی کارگزاری بھی پلان کے پہلے دو برسوں میں تشفی بخش نہیں رہی۔ سالانہ ترقی کی متوقع شرح ۱۱ % کے مقابلے میں پلان کے پہلے اور دوسرے برسوں میں واقعی ترقی ۷ % اور ۷.۹ % رہی۔ یہ درست ہے کہ دوسرے پلان کی طرح تیسرے پلان میں بھی زیادہ زور پیداواری اشیا اور درمیانی بنیادی اشیا پیدا کرنے والی صنعتوں پر دیا گیا۔ چنانچہ ان ضروری صنعتوں کی ترقی کی شرح عام صنعتی پیداوار کے انڈکس سے اونچی تھی۔ لیکن ان میں سے بیشتر صنعتیں پلان کے پہلے دو برسوں میں پچھڑی رہیں۔ درمیانی مدت کے جائزے سے تیسرے پلان کی خامیوں اور ترقی کے خدوخال ظاہر تھے۔

اس میں ان بنیادی دشواریوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا جو معیشت کو درپیش تھیں۔ اب جب کہ تیسرا پلان اپنی مدت پوری کرچکا ہے اور اس کے بعد سے تین برس ہم نے معیشت کو مستحکم کرنے میں لگائے ہیں یہ ضروری ہے کہ ہم تیسرے پلان کے دوران ہندوستانی معیشت کی مجموعی کارگزاری کے بارے میں رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی۔

تیسرے پلان کی کامیابی اور ناکامی کا آخری جائزہ

تیسرے پلان کو ناسازگار حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے تو ہندوستان اور چین کی لڑائی کی وجہ سے اور آخری مراحل میں ہندوستان اور پاکستان کے جھگڑے کی وجہ سے۔ چنانچہ ہندوستانی معیشت کو بہت قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ مثلاً قیمتوں کا اضافہ، غذائی قلت، زرمبادلہ کی کمی، صنعتی خام مال کی شدید قلت، کارخانوں کی استعداد کا پورا استعمال نہ ہونا اور تعمیری پروگراموں کا پچھڑا ہونا۔

کمیشن نے یہ اعتراف کیا ہے کہ تیسرا پلان ترقی کے بہت سے شعبوں میں، خصوصاً زراعت، آب پاشی، پاور، منظم صنعت اور رہائشی سہولتوں کے میدان میں متعین نشانوں سے کافی پیچھے رہا ہے۔ توقع ہے کہ تیسرے پلان کے دوران پبلک سکٹر کا خرچ ۸۶۳۰ کروڑ ہوگا۔

زراعتی سکٹر سب سے زیادہ پچھڑا رہا۔ ۶۶-۱۹۶۵ء میں اناج کی پیداوار پلان کے نشانے ۱۰ کروڑ ٹن کے مقابلے میں صرف ۷۲۳ کروڑ ٹن تھی۔ پلان کے آخری سال روغنی بیج کی پیداوار ۶۱ لاکھ ٹن تھی جب کہ پلان کے نشانے کے مطابق ۸۰ لاکھ ٹن ہونی چاہیے تھی۔ جوٹ اور روئی کی پیداوار ۴۵ لاکھ؛ ۴۷ لاکھ گانٹھ تھی جب کہ نشانہ ۶۲ لاکھ، ۷۰ لاکھ گانٹھ تھا۔

۶۶-۱۹۶۵ء میں پلان کے زراعتی پیداوار کے نشانے تک نہ پہنچنے کی بڑی وجہ اگرچہ موسم کی ناسازگاری تھی لیکن اتنی ہی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ آب پاشی کی سہولتوں، کھاد، اچھے بیج، پودوں کے لیے مقویات اور فصلی بیماریوں کی دواؤں کی فراہمی میں ہم ناکام رہے۔ زراعتی انتظام میں تال میل کی بھی کمی تھی۔ پلان کے پہلے کچھ برسوں میں قیمتوں، مال کی فروخت، زمینی اصلاحات اور تکنیکل معلومات کے استعمال کے بارے میں کوئی واضح پالیسی نہ ہونے کی وجہ سے کام میں رخنہ پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ تیسرے پلان کے دوران عوام کے صرف کا معیار نہ بڑھنے کی اور قیمتوں میں غیر معمولی اضافے کی بنیادی وجہ زراعتی محاذ پر ہماری ناکامی تھی۔

کھاد اور آب پاشی دوسرے دو میدان ہیں جہاں پلان کی ناکامی نمایاں ہے۔ پلان میں نائٹروجن

کھاد کا جو نشانہ تھا اس کا صرف نصف حاصل ہو سکا۔ پلان کے دوران آب پاشی کے بڑے اور متوسط پروجیکٹوں سے صرف ۶۰ لاکھ ایکڑ مزید رقبہ آب پاشی کے تحت آ سکا۔ اگرچہ نشانہ ۲۸ء۱ کروڑ ایکڑ تھا۔ زمین کے تحفظ کے پروگرام میں کمیاں رہیں لیکن آب پاشی کی چھوٹی اسکیمیں نشانے سے آگے رہیں۔

تیسرے پلان کے پاور پروجیکٹ کی پیداوار بھی نشانے تک نہ پہنچ سکی۔ یہ ظاہر ہوا کہ پلان کے ختم پر بجلی کی پیداوار ایک کروڑ ۲ لاکھ کیلوواٹ تھی جب کہ معیّنہ نشانے کے مطابق ایک کروڑ ۲۶ لاکھ کیلوواٹ ہونی چاہیے تھی۔ بجلی کی کمی کی وجہ سے کنووں کے ذریعے آب پاشی کی توسیع کم ہو گئی۔

منظّم صنعتوں کے میدان میں کارگزاری بہتر رہی۔ ۶۶-۱۹۶۵ء کو چھوڑ کر جب درآمدی پابندیوں کی وجہ سے خام مال کی شدید قلت تھی، صنعتی پیداوار ۷٪ اور ۸٪ سالانہ کی شرح سے بڑھی۔ واقعی اضافے یوں تھے: ۶۲-۱۹۶۱ء میں ۷٪، ۶۳-۱۹۶۲ء میں ۳ء۹٪، ۶۴-۱۹۶۳ء میں ۵ء۸٪، ۶۵-۱۹۶۴ء میں ۷٪ اور ۶۶-۱۹۶۵ء میں ۴٪۔ تاہم یہ اضافہ متوقع ۱۱٪ سے کم تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پیداواری اور بنیادی صنعتوں کی پیداوار میں اضافہ صنعتی پیداوار کے انڈکس سے کافی زیادہ تھا۔ جو صنعتیں موجودہ نشانے پر پہنچ گئیں یا آگے بڑھ گئیں، یہ تھیں: المونیم، بجلی کا سامان، سوتی کپڑے کی مشینیں، پاور سے چلنے والے پمپ، اور شکر۔ لیکن سیمنٹ، کوئلے اور خام لوہے کی پیداوار نشانے سے کم رہی۔ ۶۶-۱۹۶۵ء میں سیمنٹ کی پیداوار ۱۳ء۱ کروڑ ٹن کے نشانے کے مقابلے میں ۰۸ء۱ کروڑ ٹن تھی۔ کوئلہ ۸۶ء۹ کروڑ ٹن کے مقابلے میں ۷ کروڑ ٹن اور خام لوہا ۳ کروڑ ٹن کے مقابلے میں ۴۲ء۲ کروڑ ٹن ہوا۔

نقل و حمل اور رسل و رسائل کے میدان میں پکی سڑکیں، جہاز رانی، بڑے بندرگاہوں کی مال لادنے اور اتارنے کی استعداد، سول ہوا بازی اور ڈاک اور تار کی سہولتیں نشانے سے بڑھ گئیں۔ ریل کے ذریعے مال کی آمد و رفت اور سڑکوں کے ذریعے نقل و حمل بھی توقع کے قریب رہی۔ اس سب کا مطلب یہ ہے کہ بہ حیثیت مجموعی نقل و حمل اور رسل و رسائل میں کارگزاری تشفی بخش رہی۔

غرض کہ غیر معمولی دباؤ اور تناؤ کے باوجود ہم نے صنعت، نقل و حمل، رسل و رسائل، صحت اور تعلیم کے میدان میں کچھ اہم نشانے پورے کیے۔ زراعت، آب پاشی اور پاور میں ہماری کارگزاری تشفی بخش نہیں رہی لیکن یہ بات واضح ہے کہ خامیوں اور کامیابیوں کے باوجود تیسرے پلان کے دوران لوگوں کا رویّہ بدلا، فنّی اور انتظامی مہارت بڑھی اور وسیع محاذ پر نئے اداروں اور تنظیموں کو ترقی ہوئی۔ ان سب نے اس سماجی انقلاب کی ترقی میں مدد دی جو پہلے پلان نے شروع کیا تھا۔

باب ۸

ہندوستان کا چوتھا پلان : جائزہ

تیسرا پلان تقریباً ناکام ثابت ہوا۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ اس کی تشکیل کے وقت کامیابی کے لوازم موجود نہیں تھے، بلکہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کو ایک بالکل نئی صورت کا حال کرنا پڑا۔ یہ صورت دفاعی اخراجات کے اُن بے پناہ مطالبات کا نتیجہ تھی جو چین (۱۹۶۲) اور پاکستان (۱۹۶۵) سے جنگ کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ دو لڑائیاں، بڑھتی ہوئی قیمتیں، کمی کے علاقوں میں ضروری غذا کی رسد کا بے پناہ مسئلہ اور زرِ مبادلہ کی مایوس کن حالت، ان سب نے کم مدت کے نشانوں کے حصول کو بہت غیر یقینی بنا دیا۔ پلاننگ کمیشن کی از سرِ نو تنظیم کی گئی اور ڈاکٹر ڈی۔ آر۔ گیڈگل کو اس کا چیرمین مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر گیڈگل ملک کے بہت ممتاز اور معزز ماہرِ معاشیات تھے۔ چوتھے پلان کا نیا مسودہ ۱۸ اپریل ۱۹۶۹ء کو پارلیمنٹ میں پیش ہوا۔ اس مسودے نے پہلے مسودے کو رد کر دیا جو ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء کو پارلیمنٹ میں پیش ہوا تھا۔ یکم اپریل ۱۹۶۹ء کو چوتھا پلان باقاعدہ طور پر شروع ہوا۔

منصوبہ بندی کی دو منزلیں

ہندوستان کی ترقی کی کوشش کی کہانی دو دور میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ پہلا دور ۵۲-۱۹۵۱ء سے شروع ہوتا ہے اور ۶۲-۱۹۶۱ء میں ختم ہوتا ہے۔ تیز معاشی ترقی کے لیے منصوبہ بندی کی کوشش اس دور کی نمایاں خصوصیت تھی۔ اس دور میں مجموعی قومی آمدنی میں سرمایہ کاری کا تناسب ٪۷ء۴۶ سے بڑھ کر ٪۱۲ء۶۲ پر پہنچ گیا اور گھریلو بچت کا تناسب ٪۵ء۴۳ سے بڑھ کر ٪۹ء۰۶ ہو گیا۔ اس مدت میں قومی آمدنی ٪۳ء۴۴ سالانہ کی شرح سے بڑھی اور فی کس آمدنی اس دور کے ختم پر شروع کے مقابلے میں ٪۱۶ء۴۶ زائد تھی۔ اس دور کے آخر میں ہندوستان میں صنعتی انقلاب کی ابتدا دکھائی دینا شروع ہوئی اور ملک میں ہر طرف سرگرمی اور حرکت نظر آتی تھی۔

دوسرا دور ۱۹۶۲ء کے اواخر میں اس وقت شروع ہوا جب چین نے ہندوستان پر حملہ کر کے

ہمارے ترقیاتی پروگرام گڑبڑ کر دیے۔ ۱۹۶۲ء کے بعد کے پانچ برسوں میں ہماری معیشت میں شدید عدم توازن پیدا ہوگیا۔ پڑوسیوں کے دو حملوں کی وجہ سے جو غیر معمولی صورت پیدا ہوئی اور موسم کی ناسازگاری سے دوبار جو صدمے پہنچے، ان سب نے ہماری منصوبہ بند ترقیاتی کوششوں کو متزلزل کردیا اور ہمارے معاشی اعتماد کو سخت دھکا لگا۔ اس موقع پر اگر ہم چند اقتصادی اعداد و شمار پیش کریں تو اس سے دوسرے دور کی تلخ کہانی پر روشنی پڑے گی۔ تیسرے پلان کے دوران حقیقی قومی آمدنی ۱۴٫۴۶٪ بڑھی۔ فی کس قومی آمدنی ۱۹۶۱ء کے مقابلے میں ۱۹۶۵-۶۶ء میں ۱٪ زیادہ تھی۔ ۱۹۶۳-۶۴ء اور ۱۹۶۶-۶۷ء کے درمیان قیمتوں میں ۴۶٫۱٪ کا اضافہ ہوا۔ یہ اضافہ ۱۹۶۴-۶۵ء میں ۱۰٫۶۹٪، ۱۹۶۵-۶۶ء میں ۱۵٫۳۲٪ اور ۱۹۶۶-۶۷ء میں ۱۷٫۰۵ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اصل آمدنی کی ترقی کی رفتار بڑھنے کی بجائے گھٹ گئی۔

سالانہ منصوبوں کا درمیانی زمانہ

تیسرے اور چوتھے منصوبوں کے درمیان تین سال کا وقفہ ہوگیا۔ اس خلا کو تین سالانہ منصوبوں نے پُر کیا۔ ۱۹۶۸-۶۹ء کے سالانہ پلان کا مجموعی خرچ ۲۳۳۷ کروڑ تھا۔ اس کے مقابلے میں ۱۹۶۶-۶۷ء کے لیے ۲۲۴۶ کروڑ اور ۱۹۶۷-۶۸ء کے لیے ۲۰۸۲ کروڑ تھے۔ ۱۹۶۸-۶۹ء کے ۲۳۳۷ کروڑ میں ۳۰۰ کروڑ کی وہ رقم شامل تھی جو خسارے کا بجٹ بنا کر فراہم کرنی تھی۔

۱۹۶۸-۶۹ء کے پلان کے ختم ہوتے ہی چوتھا پلان شروع کیا گیا۔ چنانچہ اپریل ۱۹۶۶ء سے مارچ ۱۹۶۹ء تک کی درمیانی مدت کو سالانہ منصوبوں کا زمانہ کہنا چاہیے اور یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ منصوبہ بندی کی تعطیل کا زمانہ تھا۔ چوتھے پلان کو ملتوی کرنے کے یہ معنی تھے کہ فی الحال سرمایہ کاری ملتوی اور اقتصادی سرگرمی سست رہے گی۔ ۱۹۶۵-۶۶ء کے دوران سرمایہ لگانے کی شرح تیسرے پلان کے خاتمے کے زمانے کی شرح سے نیچی تھی۔ معیشت میں سردبازاری اور ترقی معکوس کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ مختصر یہ کہ معیشت میں مشکلات اور عدم تعاون کی وجہ سے سرمایہ لگانے کی رفتار تیز کردینا بالکل یونہی تھا جیسے جو تا دبانے کی صورت میں انگلی کاٹ دی جائے۔

چوتھے پلان کی "گائڈلائن": نشانے اور حجم

چوتھے پلان کے دوسرے مسودے کو ابھی حال ہی میں منظوری ملی ہے۔ یاد رہے کہ نیشنل

ڈیولپمنٹ کونسل کے سامنے جو مسودہ پیش ہوا اُس کو تمام صوبوں کی حمایت نہیں حاصل ہے۔ بہت سے سوال اُٹھائے گئے، کچھ اختلافات بھی تھے اور بعض کافی شدید۔ چنانچہ آخری مسودے میں وسائل کی فراہمی اور تاکید میں کچھ تبدیلیاں ضرور ہوں گی۔ بہرحال نیا مسودہ جو چوتھے پلان کے بنیادی خاکے کی حیثیت ضرور رکھتا ہے، صنعت کی موجودہ حالت اور فصل کی اُمید افزا صورت کا جائزہ لینے کے بعد پلاننگ کمیشن کو یقین ہے کہ چوتھے پلان کے دوران ہندوستانی معیشت ۵٫۵% کی شرح سے ترقی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ۵٫۵% سالانہ ترقی نہ بہت سست ہے نہ تیز اور اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صنعت کی فاضل استعداد اور زراعت میں نئی پیداواری استعداد کو استعمال کر کے یہ نشانہ حاصل ہو سکتا ہے

یاد رہے کہ ۱۹۶۸-۶۹ء کے سالانہ پلان کے لیے ترقی کی شرح ۵% رکھی گئی تھی۔ اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کمیشن نے بحیثیت مجموعی جو سالانہ شرح چوتھے پلان کے لیے تجویز کی ہے وہ مناسب اور حقیقت پسندانہ ہے۔ ہمارے پڑوسی پاکستان نے جس کی صنعتی بنیاد اور جس کے ترقیاتی عمل کا نظام ہم سے کم تر ہے، اس نے پچھلے پانچ برسوں میں سالانہ ترقی کی جو شرح حاصل کی ہے وہ ۵% اور ۶% کے درمیان ہے۔ سیلون، جہاں مربوط اور لازمی مرکزی منصوبہ بندی پر لچک دار اور اظہاری منصوبہ بندی کو ترجیح دی جاتی ہے، اُس نے پچھلے تین برسوں میں سالانہ ترقی کی ۵% شرح حاصل کی ہے۔ اس لیے سوا اس کے کہ مانسون برابر دھوکا دیتے رہیں ہمارے لیے ترقی کی ۵٫۵% شرح کا حصول مشکل نہ ہونا چاہیے۔

مجموعی ترقی کی شرح کا اگر حلقہ وار جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ زراعت کے لیے ۵% ترقی کی توقع کی گئی جب کہ صنعت سے یہ توقع تھی کہ چوتھے پلان کے دوران ۸% سے ۱۰% تک ترقی ہوگی۔ یاد رہے کہ ۱۹۵۹-۶۰ اور ۱۹۶۶-۶۷ء کے دوران اقتصادی سرد بازاری کی وجہ سے ترقی کی رفتار صرف ۳% اور ۴% کے درمیان رہی۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ چوتھے پلان کے نشانے تک پہنچنے کے لیے ہمیں اپنی ترقی کی حال کی شرح تین گنی کرنی پڑے گی۔ زراعت کے لیے ۵% کی ترقی بالکل مناسب ہے اگرچہ ۱۹۶۵-۶۶ء اور ۱۹۶۶-۶۷ء میں مسلسل خشک سالی کی وجہ سے ترقی کی شرح کو سخت دھکا لگا۔ زراعت کی نئی حکمتِ عملی کے اچھے نتائج ظاہر ہو چکے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اس مسئلے کا حل نکل آئے گا۔ اس لیے زراعت کی ترقی ۶% سے کچھ زیادہ شرح ہم تصور کر سکتے تھے۔ لیکن پلاننگ کمیشن نے مانسون کی بے اعتباری سے ڈر کر زراعت کی

ترقی کی شرح کا تخمینہ کرنے میں احتیاط برتی۔

کمیشن نے یہ بات واضح کردی ہے کہ چوتھے پلان کے دوران امکانی خود استادی کی منزل تک پہنچنے کا ارادہ مصمم ہے۔ اسی لیے چوتھے پلان میں بیرونی امداد پر کم بھروسہ کیا گیا ہے۔ تجویز ہے کہ ۱۹۷۱ء کے ختم تک۔ پی۔ ال ۴۸۰ کی درآمدات ختم کردی جائیں۔ درحقیقت چوتھے پلان کی یہ بنیادی حکمت عملی ہے کہ پلان کے ختم تک بیرونی امداد (مع ادائگی سود اور قرض) موجودہ امداد کی نصف کردی جائے۔ موٹا تخمینہ ہے کہ امداد کو نصف کرنے کے لیے برآمدات میں ۷٪ سالانہ کا اضافہ کرنا ضروری ہے۔ برآمدات میں ۷٪ سالانہ مجموعی اضافے کے لیے برآمدات سے آمدنی ۶۹-۱۹۶۸ء کی متوقع آمدنی ۱۳۴۰ کروڑ سے بڑھا کر ۷۴-۱۹۷۳ء تک ۱۹۰۰ کروڑ کرنا ہوگی یاد رہے کہ اب تک برآمدات کے اعتبار سے ۵۹-۱۹۵۸ء سے لے کر ۶۵-۱۹۶۴ء تک کا زمانہ بہترین رہا ہے۔ جب ترقی کی سالانہ شرح ۴٪ کرلی گئی۔ جون میں روپے کی قیمت کم کرنے کے بعد برآمدات میں کچھ تخفیف ہوئی لیکن ۱۹۶۸ء سے اس میں اضافہ ہونا شروع ہوگیا۔ بہ ہر حال چوتھے پلان کے دوران سالانہ ترقی کی شرح ۷٪ تک لانے کے لیے کافی کوشش اور مشقت کرنی پڑے گی۔

چوتھے پلان کے لیے ۲۴۳۹۸ کروڑ کا خرچ تجویز ہے۔ اس میں سے پبلک سکٹر کے مصارف ۱۴۳۹۸ کروڑ اور نجی سکٹر کی سرمایہ کاری کی مد میں ۱۰،۰۰۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ پبلک سکٹر میں ۱۲۲۵۲ کروڑ سرمائے کی حیثیت سے لگائے جائیں گے اور ۲۱۴۶ کروڑ رواں دواں اخراجات کے لیے۔ پیداوار اور اثاثے کی تخلیق کے لیے بہ حیثیت مجموعی ۲۲۲۵۲ کروڑ روپیہ لگایا جائے گا

پبلک سکٹر کے مجموعی خرچ ۱۴۳۹۸ کروڑ میں ۷۲۰۷ کروڑ مرکزی اسکیموں کے لیے ۷۲۷ کروڑ اُن اسکیموں کے لیے جنھیں مرکزی سرپرستی حاصل ہے ۶۰۶۶ صوبوں کے لیے اور ۳۹۸ کروڑ مرکزی علاقوں کے لیے ہیں۔

اگلے ٹیبل میں پبلک سکٹر کے اخراجات کی مدوار تقسیم دکھلائی گئی ہے۔

معیشت میں مجموعی طور سے ۲۲۲۵۲ کروڑ کا سرمایہ چوتھے پلان کے دوران لگے گا جس میں پبلک سکٹر کا حصہ ۱۲۲۵۲ کروڑ اور نجی سکٹر کا حصہ ۱۰،۰۰۰ کروڑ ہوگا۔ چوتھے پلان میں پبلک سکٹر کا مجموعی خرچ ۱۴۳۹۸ کروڑ ہے جب کہ تیسرے پلان میں ۸۵۷۷ کروڑ تھا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ سرمائے کے اعتبار سے اس پلان کا حجم ۲۲۲۵۲ کروڑ روپے ہوگا۔

اس ۲۲۲۵۲ کروڑ کے پلان کو اگر پانچ برسوں میں آمدنی میں ۲۸٪ کا اضافہ کرنا ہے تو سرمائے اور پیداوار کا تناسب ۱ : ۲٫۴ کا ہوگا۔ پچھلے سترہ برسوں میں ہم نے منصوبہ بندی کے میدان میں جو تجربہ حاصل کیا ہے اُس کی بنیاد پر توقع کی جاسکتی ہے کہ سرمائے اور پیداوار کا تناسب ۱ : ۴ ہوگا۔ یاد رہے کہ پچھلے پلان میں سرمائے اور پیداوار

ٹیبل الف

چوتھے پلان میں پبلک سکٹر کے مجوزہ مصارف اور تیسرے پلان
اور سالانہ منصوبوں کے مصارف

مد	تیسرا پلان	۱۹۶۶–۶۹ تخمینہ	چوتھا پلان کروڑ روپے
زراعت اور متعلقہ شعبے	۱۰۹۸۶۰	۱۱۶۶۴۹	۲۲۱۷۲۵
آب پاشی اور سیلاب کی روک تھام	۶۶۴۶۷	۴۵۰۶۱	۹۶۳۶۸
پاور	۱۲۵۲۶۲	۱۱۸۲۶۳	۲۰۵۴۶۵
گاؤں اور دیہی صنعتیں	۲۴۰۶۸	۱۴۲۶۱	۲۹۳۶۷
صنعت اور معدنیات	۱۷۲۶۶۳	۱۵۷۵۶۰	۳۰۹۸۰۹
رسل ورسائل اور نقل وحمل	۲۱۱۱۰۷	۱۲۳۹۶۱	۳۱۷۲۶۱
تعلیم	۵۸۸۶۷	۳۲۲۶۳	۸۰۱۶۹
سائنٹفک ریسرچ	۷۱۶۴	۵۱۶۱	۱۳۴۶۰
صحت	۲۲۵۶۹	۱۴۰۶۱	۴۳۷۶۵
فیملی پلاننگ	۲۴۶۹	۷۵۰۲	۳۰۰۶۰
پانی کی سپلائی، صحت اور صفائی	۱۰۵۰۷	۱۰۰۴۴	۳۳۸۶۹
مکانات، شہری اور علاقائی ترقی	۱۲۷۶۵	۹۳۴۳	۱۷۰۶۷
پس ماندہ طبقوں کی فلاح وبہبود	۹۹۶۱	۶۸۶۵	۱۳۴۶۳
سوشل ویلفیر	۱۹۶۴	۱۲۶۱	۳۷۶۲
مزدوروں کی فلاح اور کاریگروں کی تربیت	۵۵۶۸	۲۵۶۰	۳۷۶۱
دوسرے پروگرام	۱۷۵۶۰	۱۲۳۶۵	۱۸۲۶۸
میزان	۸۵۷۷۶۲*	۶۷۵۴۶۵	۱۴۳۹۷۶۶

* واقعی مصارف شاید کم ہوں۔

کا تناسب ۱: ۲۴۳، دوسرے پلان میں ۱: ۲۶۹ اور تیسرے پلان میں ۱: ۲۴۲ تھا۔ یہ تناسب مقررہ کی قیمتوں کے حساب سے نکالا گیا ہے)۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ پروجیکٹوں کے تحت زراعت اور صنعت دونوں کے سرمائے کا تناسب دوسرے اور تیسرے پلان کے مقابلے میں کم ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ کمیشن نے سرمائے اور پیداوار کا کم تناسب کیوں پسند کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کمیشن چوتھے پلان کے دوران پیداوار کی نئی استعداد زیادہ بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے بجائے کمیشن چاہتا تھا کہ زراعت اور صنعت دونوں کی موجودہ پیداواری استعداد پورے طور سے استعمال کی جائے۔ صنعت کے منظم حلقے میں فاضل پیداوار کی کافی استعداد موجود ہے۔ اس لیے پوری کوشش کرنی چاہیے کہ اس فاضل استعداد کا استعمال تیزی سے بڑھایا جائے۔ جہاں تک زراعت کا سوال ہے چوتھے پلان کے التوا سے زراعتی پروگرام نہیں رکا۔ زراعت کی نئی حکمت عملی کے مطابق، پیداوار کی نئی استعداد پیدا کرنے کا کام برابر جاری رہا۔ اگر ہم زراعتی مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں فصل کے سازگار حالات کے ساتھ اس نئی پیداواری استعداد سے پورا فائدہ اٹھانا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اناج کے ذخیرے کے لیے گوداموں کی گنجائش بڑھانی پڑے گی ورنہ جتنا فاضل اناج پیدا ہوگا وہ سب سڑ جائے گا۔ اناج کی کم سے کم قیمتیں متعین کرنی ہوں گی تاکہ اناج پیدا کرنے والوں کو پیداوار بڑھانے کی ترغیب ہو۔ جب تک یہ سب نہیں کیا جاتا تب تک مانسون چاہے جتنے بھی موافق ہوں، اناج کی پیداوار میں تیز اور مسلسل اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ چوتھے پلان کے دوران فی ایکڑ پیداوار کی تیز رفتار ترقی کو ناممکن نہ تصور کرنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بات کے کافی آثار موجود ہیں کہ ان پندرہ ضلعوں کے کسانوں نے جہاں نئی حکمتِ عملی پر تجربہ کیا جا رہا ہے، سائنسی ریسرچ کے نتیجوں کو قبول کر لیا ہے اور انھیں عمل میں لانا شروع کر دیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ زراعت میں ٹیک آف یا اس کے قریب کی منزل پر پہنچ جانے سے ہمارے کسانوں کو اس نئی پیداواری استعداد کے استعمال میں مدد ملے گی جو پچھلے چند برسوں میں حاصل کی گئی ہے۔ اس کی وجہ سے آگے چل کر ہم ترقی کی ۵٪ شرح حاصل کر پائیں گے جو چوتھے پلان میں زراعت کے لیے تجویز ہے۔

چوتھے پلان کی حکمتِ عملی

چوتھے پلان کی حکمتِ عملی پروفیسر گیڈگل کی تصنیف ہے جو پلاننگ کمیشن کے نائب صدر ہیں۔ اس لیے چوتھے پلان کی حکمتِ عملی کو گیڈگل کی حکمتِ عملی کہنا مناسب ہوگا۔ اس حکمتِ عملی کی بنیاد

زراعت کی نئی پالیسی ہے۔ صنعتوں کے لیے گیڈگل نے جو طریقہ اپنایا ہے وہ فرانس کی اظہاری منصوبہ بندی سے ملتا جلتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ آگے چل کر بہت کم کنٹرول کی ضرورت رہ جائے گی اور ہماری مخلوط معیشت فرانسیسی نمونے کی ہم آہنگ کوآپریٹو منصوبہ بندی کی شکل اختیار کرے گی۔

زراعت کی نئی پالیسی کے دو خاص پروگرام ہیں۔ اول یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ جن علاقوں میں پیداوار بڑھانے کے زیادہ امکانات ہیں ان پر تمام تر توجہ مرکوز کی جائے اور وہاں ایک جامع پروگرام کیا جائے۔ اس جامع پروگرام میں یہ باتیں شامل ہیں: زیادہ پیداوار دینے والی قسم کے بیج، فصلی بیماریوں کی روک تھام کے اقدام، پانی کے انتظام کے بہتر طریقے اور مصنوعی کھاد کا بہترین ممکن استعمال۔ دوسرا فیصلہ یہ کیا گیا کہ بیجوں کی عمدہ فصل دینے والی قسمیں صرف ان علاقوں میں استعمال کی جائیں جہاں آب پاشی کا انتظام اچھا ہے اور جہاں اب تک صرف ایک فصل اگائی جاتی تھی۔ ان علاقوں میں نئی فصل دوسری فصل کی حیثیت سے اگائی جائے۔

بہرحال گیڈگل کی حکمتِ عملی میں اصل جدت بیرونی امداد اور زرِ مبادلہ کے بارے میں نظر آتی ہے۔ گیڈگل بنیادی صنعتوں کی سرگرمی نہ روکنا چاہتے ہیں اور نہ ملتوی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان صنعتوں کی ترقی ہونی چاہیے تاکہ آگے چل کر ہماری برآمدات بڑھیں۔ چوتھے پلان کے نئے مسودے میں اس بات پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ لوہے اور فولاد میں حال کی کارگزاری سے یہ بات ظاہر ہے کہ تھوڑی سی کوشش سے برآمدات کافی بڑھائی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح انجینئری سامان، سیمنٹ اور دھات کی بنی چیزوں جیسی غیر روایتی اشیا کی برآمد میں بھی توسیع کے بہت امکانات ہیں۔ برآمدات کے میدان میں اس جدت سے ڈاکٹر گیڈگل سمجھتے ہیں کہ چوتھے پلان میں برآمدات ۷% سالانہ بڑھائی جاسکتی ہیں اور بیرونی امداد گھٹا کر نصف کی جاسکتی ہے۔

یہ بات درست ہے کہ مشرقِ قریب اور مشرقی افریقہ کے ممالک کے مقابلے میں ہمارے پاس لوہے اور کوئلے کے بہت بہتر ذخیرے ہیں۔ اس کے علاوہ ٹکنیکی مہارت میں بھی ہم ان ملکوں سے آگے ہیں۔ چنانچہ ہم لوہے، فولاد اور دوسری دھاتوں کی اشیا برآمد کرسکتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہماری قیمتیں ان مغربی ملکوں سے بہت زیادہ ہیں جن سے ہمیں مقابلہ کرنا ہے۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر گیڈگل کی پالیسی کی بنیاد زراعتی حکمتِ عملی ہے لیکن ساتھ ہی انھوں نے بھاری صنعتوں کے پروگرام کو ختم نہیں کیا ہے۔ لوہے، فولاد، سیمنٹ انجینئری سامان اور دھات کی بنی اشیا کی پیداوار داخلی استعمال کے لیے نہیں ہوگی بلکہ برآمدات سے آمدنی بڑھانے کے لیے ہوگی۔

اِس طرح بیرونی امداد پر ہمارا انحصار کم ہو جائے گا۔

ڈاکٹر وی۔ کے، آر، وی، راؤ نے اپنے حالیہ بیانات میں چوتھے پلان کی جو حکمتِ عملی پیش کی ہے اُس کا مقابلہ گیڈگل کی حکمتِ عملی سے کیا جا سکتا ہے۔ راؤ کی حکمتِ عملی جب پورے طور پر واضح ہو جائے گی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ زراعت کی نئی پالیسی کے ساتھ کچھ اور بھی پروگرام ہوں گے مثلاً چھوٹے اور اوسط درجے کے پروگرام، زمین کو بہتر بنانے کے اقدام اور بڑھتی ہوئی پیداوار کو رکھنے کے لیے گودام وغیرہ کی تعمیر۔ زراعت کو صحیح معنوں میں متحرک بنانے کے لیے ضروری ہے کہ لوہے، فولاد اور سیمنٹ کی فاضل پیداوار کو آب پاشی کے نئے پروجیکٹوں، زمین کو بہتر بنانے کے کاموں اور ذخیرہ رکھنے کی استعداد بڑھانے کے کاموں میں استعمال کیا جائے لیکن ڈاکٹر راؤ کا خیال ہے کہ برآمد کی ہوئی چیزوں کی جگہ پر دیسی چیزوں کا استعمال بڑھنے کے باوجود ایک ترقی پذیر معیشت میں برآمدات بہرحال بڑھتی ہیں۔ چنانچہ ملک کو درآمدات کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے روایتی اور غیر روایتی برآمدات میں ۴۰% سے لے کر ۵۰% تک کا اضافہ کرنا ہے۔ ڈاکٹر راؤ کا تخمینہ ہے کہ چوتھے پلان کے دوران برآمدات میں ہر سال آٹھ سے ساڑھے آٹھ فی صدی تک کا اضافہ ہونا چاہئے۔ اضافے کی یہ شرح پروفیسر گیڈگل کے تخمینے سے ۱% سے ۱½% تک زیادہ ہے۔ ڈاکٹر راؤ نے اِس بارے میں کچھ نہیں کہا کہ یہ اضافہ کیسے حاصل ہوگا۔ انھوں نے صرف بنیادی صنعتوں پر ٹیکس کم کرنے اور جہاز کے محصول میں رعایت دینے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

چوتھے پلان کے بنیادی مقاصد

چوتھے پلان کے تین بنیادی مقاصد ہیں (۱) خود اعتمادی کی طرف بڑھنا (۲) علاقائی توازن قائم کرنا تاکہ ترقی کے فائدوں کی تقسیم ہموار ہو (۳) اور ترقی کے ساتھ استحکام حاصل کرنا۔ ان تینوں میں پہلے مقصد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ خود استادی کے مقصد کا پہلے کے منصوبوں کے بنیادی مقاصد سے موازنہ کرنا چاہیے۔ پہلے پلان کا بنیادی مقصد غذائی خود اکتفائی تھا۔ دوسرے پلان کا مقصد سوشلسٹ ڈھنگ کا نظام قائم کرنا تھا اور تیسرے پلان کا مقصد ایسی معیشت تھا جو اپنے بل پر چل سکے۔ صرف پہلے پلان کا مقصد عارضی طور سے پورا ہو سکا اور وہ بھی سازگار حالات کی وجہ سے۔ دوسرے اور تیسرے منصوبوں کے مقاصد صرف سیاسی نعرے کی حیثیت

رکھتے تھے جن کا معاشی حقائق سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

خود اعتمادی کی تحریک اس مفروضے پر تھی کہ مسلسل بیرونی امداد پر مبنی ترقیاتی عمل صحت مند نہیں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ چوتھے پلان میں ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ بیرونی امداد مع سود وادائیگی قرض، موجودہ امداد کی نصف ہو جائے۔ اس کے لیے برآمدات بڑھانے اور درآمدات کم کرنے کی بھرپور کوشش کی ضرورت ہوگی۔

معاشی ترقی کے ساتھ درآمدات میں کچھ اضافے کی توقع کی جانی چاہیے، خصوصاً ضروری آلات اور خام مال کی درآمد میں۔ اس اضافے کو رد کرنے کے لیے ضروری ہے کہ درآمدات کم سے کم ہوں۔ ایک ترقی پذیر معیشت میں یہ کام بہت مشکل ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ درآمدات کے دیسی بدل کے بڑھانے اور غیر ضروری درآمدات ختم کرنے کا جامع پروگرام ہو۔

خود اعتمادی کے لیے برآمدات میں جس اضافے کی ضرورت ہے وہ غیر روایتی اشیا میں ہونا چاہیے۔ غیر روایتی اشیا مثلاً پلاسٹک اور پلاسٹک کی بنی اشیا، دوائیں اور دواؤں کے اجزا، مصنوعی ریشے اور کاغذ اور گتے کی بنی چیزیں ہماری خارجی تجارت میں داخل ہو چکی ہیں۔ توقع ہے کہ لوہا اور فولاد، انجینئری سامان اور دھات کی بنی اشیا، غیر روایتی برآمدات بڑھانے میں مدد کریں گی اور اس طرح برآمدات کے میدان میں ہماری کارگزاری بہتر ہوگی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف تمنا ہی رہے گی کیوں کہ قیمتی اور مصارف پیداوار زیادہ ہونے کی وجہ سے ہمیں ان غیر روایتی اشیا کی برآمد بڑھانے میں سخت مشکل کا سامنا کرنا ہوگا۔ مختصر یہ کہ خود اعتمادی کی منزل کی طرف بڑھنا آسان نہیں ہے جو اگرچہ اشد ضروری ہے۔

دوسرا مسئلہ ترقیاتی منصوبہ بندی کے دوران علاقائی توازن قائم کرنے کا ہے۔ پروفیسر گیڈگل نے ہمیشہ اس بات کی حمایت کی کہ منصوبہ بندی کے فوائد حتی الامکان برابر برابر تقسیم ہونے چاہئیں۔ اپنی تمام زندگی وہ اس بات کے حق میں رہے کہ ترقیاتی پروگراموں سے حاصل ہونے والے فوائد متوازن طریقے سے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں میں تقسیم ہوں۔ اُن کا کہنا ہے: "منصوبہ بندی کا ایک بنیادی مقصد یہ ہے کہ ترقیاتی کوششوں کو برابر تقسیم کیا جائے اور اُن فوائد کا کچھ نہ کچھ حصہ سماج کے غریب اور کمزور طبقے تک پہنچایا جائے۔" لیکن سوال یہ ہے کہ آیا گیڈگل کی صنعتی منصوبہ بندی کی پالیسی اور نئی زراعتی حکمت عملی کے ذریعے ایسا کرنا ممکن ہے۔

گیڈگل کی صنعتی منصوبہ بندی کی پالسی کا مقصد یہ ہے کہ ہماری مخلوط معیشت کامیابی کے ساتھ کام کرے تاکہ صنعت کاری کو زیادہ سے زیادہ اُبھرنے کا موقع ملے۔ اُن کا خیال ہے کہ کسی بھی حلقے کے کامیاب صنعت کاروں کو زیادہ مواقع ملنے چاہئیں۔ چنانچہ اُن کا کہنا ہے کہ نئے لائسنس کے لیے یہ شرط رکھی جائے کہ پہلے دیے گئے لائسنس کے تحت کسی فرم کی کارگزاری کیسی رہی ہے۔ ہندوستان میں بڑے کاروباری ادارے زیادہ تجربہ کار، اور بہتر طور پر منظم ہیں۔ اگر نئے لائسنس پچھلی کارگزاری کی بنیاد پر دیے گئے تو یقیناً اُس حلقے کی فرموں کو نئے لائسنس ملیں گے اور وہ صنعت کار پیچھے رہ جائیں گے جو اِس میدان میں پہلی بار داخل ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اِس پالسی کی وجہ سے کچھ علاقائی توازن قائم ہوسکے لیکن پرائیوٹ سکٹر کے چند یونٹوں کو جو فوقیت حاصل ہے اور ان کے ہاتھوں میں جتنی معاشی قوت مرتکز ہے اُس میں اور اضافہ ہوجائے گا۔

رہا زراعت کی نئی حکمتِ عملی کا سوال جس کے تحت ہندوستان کے اُن پندرہ ضلعوں کو مجموعی پروگرام کے تحت بہ یک وقت کچھ سہولتیں فراہم کی جائیں گی جو ملک کی منڈیوں کی اناج کی مجموعی رسد کا ایک تہائی فراہم کرتی ہیں۔ یہ بات اِس پالسی کے خلاف ہے کہ ترقی کے فوائد ملک میں برابر تقسیم ہوں۔ نئی زراعتی پالسی اگر کامیابی سے عمل میں آئی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک میں خوش حال کسانوں کا ایک ایسا طبقہ بن جائے گا جن کا معاشی درجہ اور معیارِ زندگی اُن باقی کسانوں سے بہت اونچا ہوگا جو ملک کے بقیہ حصّوں میں کسی نہ کسی طرح روزی کمائیں گے۔

آخری مقصد استحکام کے ساتھ ترقی ہے۔ یہ ایک نیا مقصد ہے کیوں کہ ہمارے منصوبے مربوط پروگراموں پر مبنی ہیں جن کے تحت ترقی کے نشانے متعین ہوتے ہیں اور کوشش کی جاتی ہے کہ معینہ منزل تک سلامت روی کے ساتھ پہنچا جائے۔ پچھلے تین برسوں میں ہم کو قیمتوں میں ۴۵% کے اضافے کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن چوتھے پلان کے نئے مسودے میں قیمتوں کو مستحکم کرنے سے متعلق کوئی ٹھوس تجویز نہیں ہے۔ یاد رہے کہ چوتھے پلان کے لیے ۸۵۰ کروڑ روپے خسارے کے بجٹ کے ذریعے فراہم ہونا ہیں۔ چوں کہ ہم پھر خسارے کی مالیات کی طرف راغب ہیں اِس لیے یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ چوتھے پلان کے دوران قیمتوں میں کتنا استحکام حاصل ہوسکے گا۔

ترقی کی ۵ء۵ % سالانہ شرح جس میں زرعی ترقی کی شرح ۵ % اور صنعتی ترقی کی شرح ۸ % سے ۱۰ % ہوگی، کوئی بہت غیرمعمولی تجویز نہیں ہے۔ لیکن قیمتوں میں استحکام لائے بغیر ترقی کی ۵ء۵ % شرح بھی تقریباً بےمعنی ہوگی۔ ہمارا منصوبہ ایک جمہوری منصوبہ ہے جس کی کامیابی کا انحصار عوام کی شرکت پر ہے۔ استحکام کے ساتھ ترقی کا یہ مطلب ہے کہ ترقی کے ساتھ فلاح و بہبود بھی ہو۔ لیکن جب قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں، استحکام صرف خواب بن کر رہ جاتا ہے اور عوام کی بہبود کے مسائل سے نپٹنا مشکل ہوجاتا ہے۔ بہرحال زراعت کی نئی حکمتِ عملی اور صنعت کی موجودہ استعداد کو پورے طور پر استعمال کرنے کی وجہ سے زرعی مسئلہ بہت جلد حل ہونے والا ہے۔ ہمیں اُمید کرنا چاہیے کہ اس کی مدد سے ہم پرانے ڈھرے سے نکل سکیں گے اور ترقی اور استحکام کی منزل کی طرف آگے بڑھ سکیں گے۔

زراعتی سکٹر: حکمتِ عملی

زراعتی سکٹر میں چوتھے پلان کے دو بنیادی مقاصد ہیں: (الف) ایسی صورتیں پیدا کرنا کہ اگلے دس برسوں میں ۵ % سالانہ کی قائم رہنے والی شرح سے پیداوار میں اضافہ ہوسکے اور (ب) ۱۹۷۱ء تک رعایتی قیمت پر اناج کی درآمد بند کردی جائے۔ چوتھے پلان کے دوران اناج کی پیداوار ۹ کروڑ ٹن سے بڑھ کر ۱۲ء۹۰ کروڑ ٹن ہونے کی توقع ہے۔ جوٹ کی پیداوار ۶۲ لاکھ گانٹھ سے بڑھ کر ۷۰ لاکھ گانٹھ، روئی ۶۰ لاکھ گانٹھ سے بڑھ کر ۸۰ لاکھ گانٹھ اور روغنی بیج کی پیداوار ۸۰ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ایک کروڑ ۵ لاکھ ٹن ہوجائے گی۔ یاد رہے کہ اناج کے نشانے حاصل کرنے کا انحصار اس پر ہے کہ عمدہ فصل دینے والے بیج اور چھوٹی بڑی آب پاشی کی اسکیموں کی مدد سے کئی فصلیں اگانے کا پروگرام کس حد تک کامیاب ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم کو پھر زراعت کے سکٹر کی نئی حکمتِ عملی کا جائزہ لینا چاہیے۔

چوتھے پلان میں اُس پالسی پر بہت بھروسہ کیا گیا ہے جس کو اناج کی پیداوار بڑھانے کی حکمتِ عملی کا نام دیا گیا ہے۔ نئی حکمتِ عملی کا انحصار اُس ۳ کروڑ ایکڑ زمین کی عمیق کاشت پر ہے جہاں بارش کافی ہوتی ہے یا آب پاشی کا وافر انتظام ہے اور جو سیلاب اور دوسری قدرتی تباہ کاریوں سے محفوظ ہے، جسے قرض، گودام اور فروخت کے لیے ترقی یافتہ ادارہ جاتی سہولتیں دست یاب ہیں۔ ان علاقوں میں عمیق کاشت کے لیے یہ بنیادی چیزیں فراہم کی جائیں گی: چاول، گیہوں، جوار اور باجرے کے عمدہ قسم کے اچھی فصل دینے والے بیج، کھاد، کیڑے مارنے والی دوائیں اور قرض۔ نئی حکمتِ عملی کا مقصد یہ ہے کہ ملک کے بہترین علاقوں کو منتخب کرکے اُن پر سب سے زیادہ توجہ دی جائے اور اچھی پیداوار کے

کے عوامل فراہم کیے جائیں تاکہ زمین، پانی اور اِن عوامل سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

صنعتی حلقہ: حکمتِ عملی اور پروگرام

پچھلے دو منصوبوں کی طرح چوتھے پلان کی صنعتی پالسی اس اصول پر مبنی ہے کہ بنیادی صنعتوں میں زیادہ سرمایہ لگاکر اُن صنعتوں کو تیزی سے ترقی دی جائے جو بھاری مشینیں وغیرہ تیار کرتی ہیں۔ صرفی اشیا کی وقتی قلت اور افراطِ زر اسی پالسی کا نتیجہ ہیں۔ لیکن زراعت کی ترقی اور اُس کے بنیادی ڈھانچے کو بہتر بنانے پر زور دینا ضروری ہے جو زراعت کے ضروری عوامل فراہم کرتی ہیں۔ ساتھ ہی دوسری بنیادی صنعتوں کی فاضل استعداد کو بھی پورے طور پر استعمال کرنے کا انتظام ہونا چاہیے۔ پالسی میں یہ تبدیلی بھاری صنعتوں کی ترقی پر مبنی ہے۔ اِس تبدیلی کی ضرورت اس لیے ہے کیوں کہ چوتھے پلان میں زراعت کو بہت زیادہ ترجیح دی جارہی ہے۔

پہلے پلان میں منظّم صنعت اور کان کنی کے لیے ۵۲۰۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ ۲۸۰۰ کروڑ پبلک سکٹر میں اور ۲۴۰۰ کروڑ نجی اور کواپریٹیو سکٹر میں۔ نجی سکٹر کے ۲۸۰۰ کروڑ میں ۲۵۰ کروڑ بھی شامل ہیں جو مالیاتی اداروں کے ذریعے پبلک سکٹر سے منتقل ہوں گے۔ چوتھے پلان میں دیہی اور چھوٹے پیمانوں کی صنعتوں کے لیے مجموعی طور سے ۲۹۵ کروڑ رکھے گئے ہیں۔ منظّم صنعتوں اور کان کنی کے لیے ۳۰۹۰ کروڑ ہوں گے کیوں کہ اس میں وہ ۲۵۰ کروڑ جو نجی اور کواپریٹیو سکٹر کو منتقل ہوتے ہیں اور باغاتی پروگراموں کی امداد کے لیے ۴۰ کروڑ، دونوں رقمیں شامل ہوں گی۔

یاد رہے کہ چوتھے پلان کے صنعتی پروگرام اور پالسی کی تشکیل اِس ضرورت کے پیشِ نظر کی گئی ہے کہ صنعتی ڈھانچے کا عدم توازن دور کیا جائے اور پیدا شدہ استعداد کا پورا استعمال ہو۔ چوتھے پلان میں سرمایہ لگانے کی پالیسی ایسی ہونی چاہیے کہ نئے سرمایہ کاروں کو اُبھرنے کا موقع ملے اور صنعت کی ملکیت اور کنٹرول چند ہاتھوں سے نکل کر زیادہ ہاتھوں میں جائے۔

تیسرے پانچ سالہ منصوبے اور تین سالانہ منصوبوں کے آٹھ برسوں میں صنعتی ترقی نمایاں طور سے ناہموار رہی ہے۔ سنہ ۶۴-۱۹۶۳ء میں صنعتی پیداوار کے اضافے میں ۹ء۵٪ کی کمی واقع ہوئی۔ سنہ ۶۶-۱۹۶۵ء میں مزید کمی آئی اور یہ گھٹ کر ۳ء۹٪ پر آگئی۔ اِس تیز تخفیف کی بنیادی وجہ سرد بازاری کے وہ رجحانات تھے جو سنہ ۶۷-۱۹۶۶ء اور سنہ ۶۸-۱۹۶۷ء کے دوران معیشت میں بالکل نمایاں تھے۔ صنعتی پیداوار میں اضافہ

بھی شروع ہو گیا ہے اور اُمید ہے کہ ۱۹۶۸-۶۹ء تک پیداوار میں ۶% کا اضافہ واقع ہو گا۔ اس سلسلے میں یاد رکھنا چاہیے کہ چوتھے پلان کے دوران صنعتی پیداوار میں ۸% سے ۱۰% کا اضافہ تصور کیا گیا ہے۔

آب پاشی اور پاور

چوتھے پلان میں آب پاشی کی تمام متوسط درجے کی اسکیموں اور اُن بڑی اسکیموں کے لیے رقم فراہم کی گئی ہے جن پر کافی کام ہو چکا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی ۶۰۴ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ ان اسکیموں کا جو حصہ چوتھے پلان میں پورا ہونے سے رہ جائے گا اُس پر پانچویں پلان میں ۹۱ کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔ متوسط درجے کی تمام اسکیمیں چوتھے پلان میں مکمل ہو جائیں گی اور اگر نہ بھی مکمل ہوئیں تو ان سے فائدہ حاصل ہونا شروع ہو جائے گا۔ یہ بھی تجویز ہے کہ چوتھے پلان کے آخری حصے میں ۶۵۰ کروڑ کی نئی اسکیمیں شروع کی جائیں۔ ان اسکیموں کے لیے چوتھے پلان میں ۹۷ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ چوتھے پلان میں ۵۷ لاکھ ہکٹر زمین کی آب پاشی کی استعداد پیدا کی جائے گی۔ آب پاشی پر ۸۵۷ کروڑ روپے صرف ہوں گے۔

چوتھے پلان میں پاور کے لیے ۲۰۸۵ کروڑ روپے تجویز کیے گئے ہیں۔ بجلی بنانے ۱۰۶۱ کروڑ روپے صرف ہوں گے۔ اس خرچ سے ۲۰۲۲ کروڑ کیلو واٹ بجلی کی استعداد حاصل ہو سکے گی۔ اس میں ۴ لاکھ کیلو واٹ کے بقدر اس کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ کچھ فرسودہ مشینیں بے کار جائیں گی۔

نقل و حمل اور رسل و رسائل

چوتھے پلان میں ان مدّات کے لیے پبلک سکٹر میں ۳۱۷۳ کروڑ روپے کے خرچ کی توقع ہے۔ اس میں سے ۲۶۵۰ کروڑ مرکزی سکٹر میں اور ۵۰۳ کروڑ صوبوں اور مرکزی علاقوں کی مد میں خرچ ہوں گے۔ رسل و رسائل کی ترقی کی مد میں ۵۲۰ کروڑ کا خرچ تجویز ہے۔ سڑکوں کی ترقی کے لیے ۸۲۹ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ ریلوے کے چوتھے پلان میں ۱۰۵۰ کروڑ روپے تجویز کیے گئے ہیں۔

پلان کے مالی وسائل

چوتھے پلان کے نئے مسودے میں ۲۷۰۹ کروڑ روپے کے مزید وسائل کی توقع ہے۔ صوبوں نے اس

ٹیبل ب
چوتھے پلان کے وسائل کا تخمینہ

مد	مرکز	ریاستیں (کروڑ روپے)	میزان
۱۔ بجٹ کے وسائل (لائف انشورنس کارپوریشن اور سرکاری کاروبار کے بازاری قرض کے علاوہ)	۶۸۶۸	۱۱۱۴	۷۹۸۲
۲۔ رواں آمدنی سے بچی ہوئی رقم (۶۹-۱۹۶۸ء کے ٹیکسوں کی شرح کے مطابق)	۲۳۵۵	(۱)۱۰۰	۲۳۵۵
۳۔ سرکاری کاروبار کی فاضل رقمیں (۶۹-۱۹۶۸ء کے کرائے اور محصول کے مطابق)	۱۱۶۵	۵۵۵	۱۷۲۰
۴۔ ریلیں	۲۶۵	—	۲۶۵
۵۔ دیگر	۹۱۰	۵۵۵	۱۴۶۵
۶۔ ریزرو بینک کا وہ منافع جو روک لیا گیا	۱۳۳	۳۲(۲)	۱۶۵
۷۔ مرکز اور صوبوں نے بازار سے جو قرض لیے	۷۵۰	۴۱۶	۱۱۶۶
۸۔ چھوٹی بچت	۲۷۴	۵۲۶	۸۰۰
۹۔ اینوئیٹی ڈپازٹ، پرائز بانڈ اور گولڈ بانڈ	(–)۱۰۴	—	(–)۱۰۴
۱۰۔ سرکاری پراویڈنٹ فنڈ	۲۲۳	۷۰۷	۹۳۰
۱۱۔ مختلف کیپیٹل آمدنیاں (خالص)	۱۹۴۲	(–)۸۱۲(۳)	۱۱۳۰(۳)
۱۲۔ لائف انشورنس کارپوریشن سے لیے گئے قرض اور سرکاری کاروبار کے بازاری قرض	—	۳۴۳	۳۴۳
۱۳۔ لائف انشورنس کارپوریشن نے جو قرض صوبوں کو دیے (مکانات اور پانی کی سپلائی کے لیے)	—	۹۶	۹۶
۱۴۔ سرکاری کاروبار کے بازاری قرض	—	۱۱۶	۱۱۶
۱۵۔ سرکاری کاروبار کو لائف انشورنس نے جو قرض دیے	—	۱۳۱	۱۳۱
۱۶۔ بیرونی امداد کے بقدر بجٹ کے وسائل (خالص)	۲۵۱۴	—	۲۵۱۴
۱۷۔ پی۔ ایل ۴۸۰ کے علاوہ	۲۱۳۴(۴)	—	۲۱۳۴(۴)
۱۸۔ " " " کی امداد	۳۸۰	—	۳۸۰
۱۹۔ بجٹ کے مجموعی وسائل (1 تا 12+16)	۹۳۸۲	۱۴۵۷	۱۰۸۳۹
۲۰۔ مزید وسائل جو جمع کیے گئے۔	(۵) ۱۶۰۰	۱۱۰۹	۲۷۰۹
۲۱۔ خسارے کی مالیات کے ذریعے	۸۵۰	—	۸۵۰
۲۲۔ مجموعی وسائل (19+20+21)	۱۱۸۳۲	۲۵۶۶	۱۴۳۹۸
۲۳۔ صوبائی منصوبوں کے لیے امداد	(–)۳۵۰۰	۳۵۰۰	—
۲۴۔ خالص وسائل — پلان کے مصارف	۸۳۳۲	۶۰۶۶	۱۴۳۹۸

۱۔ یہ تخمینہ صرف چار صوبوں پر عائد ہوتا ہے اور یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ بقیہ صوبے پلان کے علاوہ اپنی آمدنی متوازن کر لیں گے۔
۲۔ کوآپریٹیو کے ذخیرہ کیپیٹل میں شرکت کے لیے ریزرو بینک نے صوبائی حکومتوں کو قرض دیا۔
۳۔ ۱۳۰ میں ۵۰ کروڑ کی وہ رقم شامل ہے جو مقامی اداروں نے اور سرکاری کاروبار کے لیے قرض کی ادائیگی بھی شامل ہے۔
۴۔ صرف قرض کی ادائیگی۔ سود کی ادائیگی کی گنجائش رواں آمدنی کی فاضل رقم میں رکھی گئی ہے۔
۵۔ صوبوں کے خالص حصے کو لے کر۔

میں سے ۱۱۰۵ کروڑ روپے فراہم کرنے کو کہا ہے۔ مرکز کو ۱۴۰۰ کروڑ کا انتظام کرنا ہے جس میں ۴۰۰ کروڑ کی وہ رقم بھی شامل ہے جو نئے ٹیکسوں میں صوبوں کا حصّہ ہوگا۔ ٹیکس کی موجودہ سطح کے مطابق رواں آمدنی میں سے پلان کے لیے فاضل رقم مرکز سے ۲۲۵۵ کروڑ اور صوبوں سے ۱۰۰ کروڑ حاصل ہوسکے گی۔ مسودے میں کہا گیا ہے کہ صوبے اتنی رقم بھی نہ دے پائیں۔ وسائل مجتمع کرنے میں صرف ٹیکس ہی شامل نہیں ہیں بلکہ دوسری آمدنیاں بھی شامل ہیں۔ مثلاً رفاہِ عامّہ، چھوٹی بچتیں، اور فیسیں وغیرہ۔ اس باب کے آخر میں چوتھے پلان کے وسائل کے اعداد و شمار دیے گئے ہیں۔ پلان کی مدّت میں مرکز اور صوبے بازار سے جو قرض لیں گے اس کا تخمینہ ۱۱۶۶ کروڑ ہے۔ چھوٹی بچتوں سے ۸۰۰ کروڑ حاصل ہوں گے۔ بیرونی امداد کا تخمینہ ۲۵۱۴ ہے اور ۸۵۰ کروڑ خسارے کے ذریعے فراہم ہوں گے۔

آخری رائے

ہمیں اعتراف ہے کہ پہلے تین منصوبوں کے دوران بظاہر ترقی کے باوجود غریب طبقے کی زندگی کو انسانی سطح پر لانے کے سلسلے میں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ چنانچہ اگر سماجی اور معاشی ترقی کی رفتار تیز کرنے کی غرض سے چوتھا پلان کچھ بڑا بنایا گیا ہے تو ہمیں مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔ مشکلات کے پیشِ نظر چھوٹے پلان کی حمایت کرنا مستقبل کو گروی رکھنے کے مترادف ہے، جیسے اگر جوتا کاٹے تو آدمی اپنی انگلی کاٹ دے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم چھوٹے پلان کا خطرہ نہیں مول لے سکتے، خصوصاً تین برس کی سالانہ منصوبہ بندی کے بعد جس کی وجہ سے ہم نے ترقی کی رفتار بڑی حد تک کھو دی ہے۔ لیکن ۲۲۲۵۲ کروڑ کے اوسط درجے کے پلان میں معاشی ضبط و نظم کی ضرورت ہے جس میں سماج کے ہر طبقے کو شریک ہونا پڑے گا خصوصاً برسرِاقتدار لوگوں کو جنھیں سب سے زیادہ کفایت اور سختی اپنے اوپر عائد کرنی ہوگی۔ منصوبہ بندی حوصلے کا کام ہے۔ بڑی بدقسمتی ہوگی اگر پلان کی تعمیل کے لیے سماج کا ہر طبقہ، مع حکومت، قربانیاں دینے اور تکلیفیں برداشت کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔

باب ۹

ترقیاتی پروجیکٹوں کا سروے

(کمیونٹی ڈیولپمنٹ آب پاشی اور پروجیکٹوں کے مخصوص حوالے سے)

ترقیاتی منصوبہ بندی کی وجہ سے کافی بڑے محاذ پر تبدیلیاں آتی ہیں جن کی کامیابی کی شرط یہ ہے کہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ، آب پاشی اور پاور پروجیکٹوں پر مناسب توجہ دی جائے۔ ہندوستان میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروجیکٹ آزادی کے بعد شروع ہوئے۔ ان کا ابتدائی مقصد دیہات کے لوگوں کی ہمت افزائی کرنا تھا تاکہ یہ لوگ پیداوار کے سائنسی طریقے استعمال کریں۔ مشترک کوشش پر زیادہ زور دیا گیا تھا تاکہ عام لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ کمیونٹی پروجیکٹ جب شروع کیے گئے اُس وقت انھیں نئے ہندوستان کی سب سے موثر علامت سمجھا جاتا تھا جن کے ذریعے انسانی انقلاب لانے کی توقع تھی۔ لیکن پہلے پندرہ برسوں کے تجربے سے ظاہر ہوا کہ اِن سے اُن لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچ رہا ہے جو پہلے سے ہی متمول تھے اور غریبوں کو کم فائدہ پہنچتا ہے۔ کمیونٹی پروجیکٹ علاقوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سرکاری امداد اور سرکاری پیش قدمی پر زیادہ بھروسہ کیا جاتا ہے اور خود اعتمادی اور پہل کرنے کا جذبہ نہ انفرادی طور سے پایا جاتا ہے اور نہ اجتماعی طور سے۔ بہرحال جنوری [illegible]ء تک کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا کام ۲۰۹،۶۹،۶۵ گاؤں میں پھیل چکا تھا۔ اِن گاؤں کی مجموعی آبادی ۴۰ کروڑ ۳۰ لاکھ تھی۔ تیسرے پلان میں اِس پروگرام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ گاؤں، بلاک اور ضلع کی سطح پر لوکل گورنمنٹ کے جمہوری یونٹ قائم کیے گئے جو ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ اسے پنچایت راج کہا جاتا ہے جس کی بنیادی ذمہ داری اپنے علاقے کی تیز ترقی ہے۔

ترقی، آب پاشی اور بجلی کے پروجیکٹ معاشی ترقی کے تیز عمل کے لیے ضروری ہیں۔ آب پاشی اور بجلی سے زراعت کی ترقی، نئی صنعتوں کے قیام اور نقل و حمل کی توسیع میں مدد ملتی ہے۔

ان پروجیکٹوں پر جوں کہ نیا سرمایہ لگتا ہے اور ان کی وجہ سے نئی منڈیاں کھلتی ہیں اس لیے وہ علاقے جلد ترقی کرنے لگتے ہیں۔ اس سلسلے میں ملٹی پرپز ریور ویلی پروجکٹ کی خاص اہمیت ہے، مثلاً دامودر ویلی پروجکٹ سے مغربی بنگال اور بہار میں داموودھا ٹی کے پس ماندہ علاقوں کی شکل بدل رہی ہے۔ دامودر ویلی اور دوسرے ملٹی پرپز پروجکٹ کی حیثیت اُن مرکزوں کی ہے جن کے گرد نئے شہر اور نئی بستیاں قائم ہوں گی۔

کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروجکٹ

(۱) مقاصد: پندرہ برس سے زیادہ گزرے اکتوبر ۱۹۵۲ء میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا پروگرام ہندوستان میں ترقیاتی منصوبے کے تحت شروع ہوا۔ بتدریج اس کی توسیع کی گئی اور جنوری ۱۹۶۵ء تک ملک کی ساری دیہاتی آبادی اس کے تحت آگئی۔ پورا ملک ۵۲۲۸ بلاکوں میں تقسیم ہے۔ ان میں سے ۵۲۴۰ بلاکوں نے جنوری ۱۹۶۵ء تک کام شروع کر دیا تھا۔ پروگرام بہ یک وقت تعلیمی بھی ہے اور تنظیمی بھی۔ اس کا مقصد دیہات کے لوگوں میں بہتر زندگی گزارنے کا شوق پیدا کرنا ہے اور اس شوق کو پورا کرنے کے لیے خود اعتمادی کا راستہ دکھلانا ہے۔ پروگرام میں یہ بھی داخل ہے کہ اس مقصد کے پیش نظر موجودہ دیہی اداروں کو تقویت دی جائے اور جہاں ضرورت ہو نئے ادارے قائم کیے جائیں۔ کمیونٹی پروجکٹوں کو ایک ایسا عمیق اور مکمل پروگرام عمل میں لانا ہے جو دیہی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو (مثلاً زراعت، دیہی صنعتیں، تعلیم، مکانات، صحت اور تفریح وغیرہ) اور جو ایک جمہوری نظام کے تحت دیہی علاقوں کی فاضل محنت کو ترقی کے کاموں میں استعمال کر سکے۔

پروگرام کے ابتدائی دور میں معاشی ترقی کے مقابلے میں فلاحی کاموں پر زیادہ زور تھا کیونکہ یہ زیادہ مقبول تھے اور ان کی تعمیل آسان تھی۔ لیکن دن بہ دن یہ محسوس کیا جانے لگا کہ معاشی ترقی کے پروگراموں پر زیادہ زور دینا چاہیے، خاص کر زراعتی پیداوار بڑھانے اور فاضل محنت کے استعمال پر۔ پلاننگ کمیشن نے ۱۹۶۵-۶۶ء کے شروع میں اس بات پر دوبارہ زور دیا اور صوبوں کو ہدایت دی کہ بلاک اُن علاقوں میں قائم کیے جائیں جہاں گیہوں اور چاول کی فصل ہوتی ہے اور جہاں آب پاشی کی سہولتیں حاصل ہیں اور بارش کافی ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ ان بلاکوں میں ساری کوشش پیداوار بڑھانے پر مرکوز ہونی چاہیے۔ اس پروگرام کا سب سے اہم کارکن ویلیج لیول ورکر ہے۔ حال میں اس کو ہدایت دی گئی ہے کہ یہ اپنے وقت کا ۸۰٪ حصہ زراعت کے کاموں کے لیے

وقف کرے۔ زرعی پروگرام کا مقصد آب پاشی، کھاد، بہتر بیج اور نئے طریقوں کے زیادہ استعمال سے پیداوار بڑھانا اور کسانوں میں پیداوار بڑھانے کا احساس پیدا کرنا ہے۔

کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی ۱۹۶۲-۱۹۶۱ء کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مستقبل میں زراعت اور فیملی پلاننگ جیسے پروگراموں پر ملک گیر پیمانے پر زور دیا جاتا رہے گا۔ دیہی آبادی کی محنت کا استعمال فصلوں کی مقویات کی دست یابی، کنووں کی تعمیر وغیرہ سے متعلق سرگرمی تیز کردی جائے گی۔ پنچایت راج کو تقویت دی جائے گی۔ خصوصاً ضلعوں کی سطح پر۔ پنچایتوں کو اسی کے مطابق کام اور وسائل فراہم کیے جائیں گے تاکہ یہ معاشی ترقی میں اہم رول ادا کرسکیں۔

(۲) تنظیم، عمل اور بندوبست: ہندوستان میں کمیونٹی پروجکٹ، ترقیاتی منصوبہ بندی کا نیا تجربہ ہے۔ اگرچہ اس کی مختلف سفارشات، اعداد وشمار کے لحاظ سے زیادہ مرعوب کن ہیں لیکن پروگرام کی اہمیت نفسیاتی ہے۔ پلاننگ کمیشن نے پہلے پلان میں کمیونٹی ڈیولپ منٹ اور نیشنل اکسٹنشن سروس کے لیے ۹۰ کروڑ روپے رکھے تھے لیکن صرف ۴۶ کروڑ خرچ ہوئے۔ دوسرے پلان میں ان کاموں کے لیے ۲۰۰ کروڑ مقرر کیے گئے لیکن ۱۹۴ کروڑ خرچ ہوئے۔ تیسرے پلان میں ان کاموں پر ۲۹۴ کروڑ اور پنچایت پر ۲۸ کروڑ صرف کی توقع تھی۔

موٹے طور پر یہ پروجکٹ دو قسموں میں تقسیم ہیں: (الف) بنیادی پروجکٹ — ان کا تعلق کاشت کے بہتر طریقوں کے ذریعے زراعتی پیداوار بڑھانے سے ہے۔ زراعتی ترقی کے ساتھ اور بھی پروگرام ہوتے ہیں مثلاً تعلیم، صحت اور سڑکوں کی تعمیر۔ ہر بنیادی پروجکٹ تین ترقیاتی بلاکوں میں تقسیم ہے اور ہر بلاک میں ۱۰۰ گاؤں آتے ہیں۔ اوسطاً ہر پروجکٹ کے تحت دو لاکھ کی آبادی آتی ہے جو ۵۰۰ مربع میل کے رقبے میں پھیلی ہے اور جس میں قابلِ کاشت زمین کا رقبہ ۱،۵۰،۰۰۰ ایکڑ آتا ہے۔ (ب) ملے جلے پروجکٹ: یہ وہ پروجکٹ ہیں جن کا مقصد چھوٹی صنعتوں اور زراعت کی بہ یک وقت ترقی اور کسانوں کو کل وقت روزگار فراہم کرنا ہے۔

ہر پروجکٹ کے لیے ایک پروجکٹ اکزیکیوٹیو آفیسر ہے جس کا ہیڈ کوارٹر پروجکٹ سے بہت قریب ہوتا ہے۔ اُس کے تحت ہر بلاک میں ایک بلاک ڈیولپ منٹ آفسر ہوتا ہے۔ ان دو افسروں کی مدد کے لیے ۱۲ ٹکنیکل اکسپرٹ ہوتے ہیں جن کا بنیادی کام پروجکٹ کے حلقے میں گہری ترقی کے لیے مکمل پروگرام بنانا ہے لیکن ان سب میں اہم ترین آدمی ملٹی پرپز گرام سیوک یا ولیج لیول ورکر ہوتا ہے جو چار یا پانچ گاؤں کے باشندوں سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔

ہر صوبے میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے کاموں میں تال میل پیدا کرنے کے لیے مختلف پروجیکٹ ایڈوائزری کمیٹیاں ہوتی ہیں اور صوبے کی ڈیولپمنٹ کمیٹی ہوتی ہے۔ ان سب کے اوپر کمیونٹی ڈیولپمنٹ سے متعلق منسٹر ہوتا ہے۔ صوبوں میں مختلف پروجیکٹوں کی تکمیل ڈیولپمنٹ کمشنر کرتے ہوتی ہے۔

کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے پروگراموں کی تکمیل کی اکائی ڈیولپمنٹ بلاک ہوتا ہے جس میں اوسطاً ۱۰۰ گاؤں ہوتے ہیں، جس کی آبادی ۶۰ سے ۷۰ ہزار کے درمیان ہوتی ہے اور جن کا رقبہ ۱۵۰ سے ۱۷۰ میل ہوتا ہے۔ ۱۹۵۲-۵۳ء اور ۱۹۵۷-۵۸ء کے درمیان طریقہ یہ رہا ہے کہ ہر نیا بلاک نیشنل ایکسٹنشن سروس کے تحت شروع کیا جاتا ہے۔ ایک یا ڈیڑھ سال بعد ان علاقوں میں تین سال کا گہرا ترقیاتی پروگرام شروع کرنے کی توقع کی جاتی تھی۔ اس کے بعد یہ علاقے گہری ترقی کے بعد کی منزل میں داخل ہوتے تھے اور امید کی جاتی تھی کہ یہ کمیونٹی پروجیکٹ کے بجٹ سے خصوصی مدد کے بغیر اپنا کام جاری رکھ سکیں گے۔

ترقیاتی پروگرام کو ان تین منزلوں (نیشنل ایکسٹنشن سروس، کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور گہری ترقی کے بعد کی منزل) میں تقسیم کرنے کا طریقہ بلونت رائے مہتا کمیٹی کی سفارش پر بدل دیا گیا کیوں کہ پہلی اور تیسری منزل میں وسائل کی کمی اور دوسری منزل میں وسائل کی آسانی کی وجہ سے بددلی پھیلتی تھی اور ناکامی کا احساس پیدا ہوتا تھا۔ نئے انتظام کے تحت پروگرام پانچ پانچ برسوں کے دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ایک سال پری ایکسٹنشن کا ہوتا ہے جس میں زراعت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

(۳) **مالیات**: کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کے لیے وسائل کی فراہمی کے تین ذرائع ہیں: کمیونٹی پروجیکٹ ایڈمنسٹریشن، صوبوں کی حکومتیں اور امریکی حکومت کے ٹکنکل کوآپریشن مشن کی امداد۔ پہلے پلان میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور ایکسٹنشن سروس کے لیے ۹۰ کروڑ رکھے گئے تھے لیکن صرف ۴۶ کروڑ خرچ ہوئے۔ دوسرے پلان میں ۲۰۰ کروڑ رکھے گئے اور ۱۹۴ کروڑ صرف ہوئے۔ تیسرے پلان کی رقم ۲۹۴ کروڑ متعین ہوئی ہے۔

نیشنل ایکسٹنشن سروس: یہ وہ ایجنسی ہے جس کے ذریعے ہمارے پانچ سالہ منصوبے کسانوں کی معاشی اور سماجی زندگی میں انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ زیادہ اناج اُگاؤ کمیٹی نے جس کی رپورٹ ۱۹۵۲ء میں پیش ہوئی۔ اس سروس کے شروع کرنے کی سفارش کی تاکہ

سارے ملک میں ترقیاتی منصوبہ بندی کا عمل شروع ہو سکے۔ نیشنل ایکسٹنشن سروس اور کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام کا ساتھ چولی اور دامن کا ہے۔ یہ دونوں مل کر وہ ماحول تیار کرتے ہیں جس میں قومی پلان، دیہی علاقوں کی ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کا عمل شروع کر سکے۔ کم ترقی یافتہ ملکوں میں سماجی ترقی کے بغیر قابلِ ذکر معاشی ترقی لانا ممکن نہیں ہے۔ نیشنل ایکسٹنشن سروس اور کمیونٹی ڈیولپ منٹ ان ملکوں کے لیے بہت اہم ہیں کیوں کہ ان سے ایک بڑے محاذ پر سماجی اور معاشی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔

تنظیم:۔ نیشنل ایکسٹنشن سروس ۲ر اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شروع ہوئی۔ ۵۴-۱۹۵۳ء میں ایکسٹنشن سروس کا کام ۱۱۲ بلاکوں میں پھیل گیا جن میں ۱۵،۳۳۶ گاؤں تھے۔ ۵۵-۱۹۵۴ء تک بلاکوں کی تعداد ۲۴۵ ہو گئی اور ان کے تحت گاؤں کی تعداد ۳۴،۷۰۴ ہو گئی۔ ۵۶-۱۹۵۵ء میں ۲۹۵ بلاکوں میں کام شروع ہوا، جن میں ۳۳۲۲۰ گاؤں تھے۔ ۵۷-۱۹۵۶ء میں ۴۹۵ اور ۵۸-۱۹۵۷ء میں ۵۹۴ بلاکوں کا اضافہ ہوا۔ ان دو برسوں ۴۰۴ بلاک ایکسٹنشن سروس سے کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام کو منتقل ہو گئے۔ ایکسٹنشن بلاکوں کے پہلے پانچ برسوں کے کام سے اندازہ ہوتا ہے کہ سہولتیں پہنچانے کے پروگرام سے صرف چند گاؤں کو فائدہ پہنچا۔ اس محدود دائرۂ عمل میں بھی بلاک سے گاؤں کو پہنچنے والے فائدے بہت ناہموار تھے اس لیے کمیونٹی ڈیولپ منٹ کا ایک نظر ثانی شدہ پروگرام ۱۹۵۸ء کے وسط سے شروع ہوا جس کے تحت ایکسٹنشن سروس اور کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی تفریق ختم کر دی گئی۔ اس کے بجائے یہ طے پایا کہ ہر علاقہ پانچ پانچ برس کی دو منزلوں سے گزرے اور ان منزلوں سے پہلے ایک سال کا پری ایکسٹنشن پروگرام ہو۔

کمیونٹی ڈیولپ منٹ اور نیشنل ایکسٹنشن سروس کے اقتصادی نتائج

نیشنل ایکسٹنشن سروس اور کمیونٹی ڈیولپ منٹ سے توقع کی جاتی ہے کہ ان سے دیہی آبادی کی معاشی ترقی کی پوشیدہ قوتیں اُبھریں گی اور دیہاتوں میں نئی زندگی پیدا ہو گی۔ زیادہ کامیاب بلاکوں سے امید کی جاتی ہے کہ یہ ترقی اور خوش حالی کی زیادہ دل فریب تصویر پیش کریں گے۔ پہلے جہاں دور دور تک خالی زمین پڑی ہوتی تھی وہاں کھیت لہلہائیں گے اور اناج سے لدے پودے جھوم رہے ہوں گے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ایک کم ترقی یافتہ ملک میں کمیونٹی ڈیولپ منٹ کا پروگرام اس لیے شروع کیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کی ذہنیت بدلے اور اُن میں اونچے معیارِ زندگی

کی خواہش اور اسے پورا کرنے کا عزم پیدا ہو۔

ذیل میں ہم ایک کامیاب کمیونٹی ڈیویلپ منٹ پروگرام اور نیشنل ایکسٹنشن سروس کے پروگرام کے نتائج کا لب لباب پیش کرتے ہیں۔ (۱) کمیونٹی ڈیویلپ منٹ سے نہ صرف کچھ علاقوں کی منصوبہ بند ترقی ہوتی ہے بلکہ آس پاس کے گاؤں میں بھی ترقی کی قوتیں زور پکڑتی ہیں (۲) کمیونٹی ڈیویلپ منٹ پروگرام اچھی کھاد، اچھے بیج اور کاشت کے بہتر طریقوں کے ذریعے پیداوار بڑھاتا ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ آیا زراعتی پیداآوری میں اضافے کی وجہ سے زائد قابل فروخت پیداوار فراہم ہوتی ہے۔ اس کا انحصار دیہی علاقے کی آبادی کے اضافے اور ان کے صرف کے نقشے پر ہوتا ہے۔ فوری طور پر تو یہ نظر آتا ہے کہ پیداوار کا وہ حصّہ جو بازار میں آتا ہے اُس میں کوئی اضافہ نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کمیونٹی ڈیویلپ منٹ کے حفظانِ صحت کے پروگرام کی وجہ سے اموات کی شرح گھٹ جاتی ہے لیکن پیدائش کی شرح نہیں گھٹتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مجموعی آبادی بڑھ جاتی ہے۔ دیہی آبادی برابر بڑھتی رہنے کی وجہ سے اُس کی اناج کی ضرورتیں بڑھتی رہتی ہیں اور بازار میں آنے والی مقدار گھٹتی رہتی ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ ترقی کے دوران آبادی دیہات سے شہروں کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے اور دیہات کے لوگ اپنی زیادہ سے زیادہ پیداوار بیچنے پر مجبور ہوتے ہیں تاکہ دوائیاں، کھاد، کھیتی کے آلات، مٹی کا تیل اور پٹرول سے بنی چیزیں خرید سکیں۔ مندرجہ بالا تجزیے سے یہ ظاہر ہے کہ بازار میں آنے والی پیداوار کی مقدار دو مخالف قوتوں کے عمل اور ردِ عمل پر منحصر ہوتی ہے۔ ایک طرف تو حفظانِ صحت کے پروگرام کی وجہ سے اموات کی شرح میں تخفیف آبادی کو بڑھاتی ہے اور بازار میں آنے والی پیداوار گھٹاتی ہے لیکن اس کا اثر گاؤں کی آبادی کی شہروں کو منتقلی کی وجہ سے اور ترقیاتی پروگراموں کے زیرِ اثر دیہی صرف کے نقشے میں تبدیلی کی وجہ سے کم ہو جاتا ہے (۳) کمیونٹی ڈیویلپ منٹ اور نیشنل ایکسٹنشن سروس بلاک نہ صرف مکانات، اسکول، چھوٹے بند، پشتے اور گاؤں کی سڑکیں بنانے کے پروگرام براہِ راست چلاتے ہیں بلکہ گاؤں کی صنعتوں کی دوبارہ تنظیم اور پولٹری فارم اور ڈیری فارم کی توسیع کی بالواسطہ کوشش کرتے ہیں۔ اگر زراعتی قسم کی گھریلو صنعتیں اِن علاقوں میں ترقی کرتی ہیں اور انھیں زراعت سے منسلک کر دیا گیا ہے تو کسانوں کی اصل آمدنی اور معیارِ زندگی میں اضافے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔

(۴) آخر میں یاد رکھنا چاہیے کہ کمیونٹی ڈیویلپ منٹ اور نیشنل ایکسٹنشن سروس کا اہم کام مادّی ترقی سے زیادہ نفسیاتی ہے جس کی وجہ سے عوام اور حکام کے نظریے میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔

کمیونٹی ڈویلپ منٹ پروجکٹ ہندوستان جیسی کم ترقی یافتہ معیشت کے لیے بہت موزوں ہیں جہاں محنت کی افراط اور سرمائے کی قلت ہے۔ ہمارا مسئلہ صرف سرمائے کی تخلیق کا ہی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ ایسے سادہ قسم کے اہم پروجکٹ شروع کیے جائیں جن سے لوگوں کو پورا روزگار مل سکے۔ اس کام میں کمیونٹی ڈویلپ منٹ سے بڑی مدد ملتی ہے کیوں کہ یہ بہتر دیہی صحت، حفظانِ صحت، اچھی سڑکیں اور آب پاشی کی سہولتوں کی فراہمی کا کام کرتی ہیں۔ آزادی کے بعد ان پروجکٹوں کو اس لیے شروع کیا گیا تاکہ انسانی محنت کو پورے طور پر استعمال کیا جاسکے اور ملک کی نیم جامد دیہی معیشت کی تجدید ہوسکے اور اس میں دوبارہ جان ڈالی جاسکے۔ لیکن بدقسمتی سے پروجکٹوں کی تکمیل کے پہلے پانچ برسوں میں کارگزاری توقع سے کم رہی۔ اس لیے ماہرین کو کمیونٹی ڈویلپ منٹ کے پروگرام پر نظرثانی کرنی پڑی۔

کمیونٹی ڈیویلپ منٹ پروگرام کے ارتقا کا جائزہ (حال کی ایویلوایشن رپورٹ کے حوالے سے)

کمیونٹی ڈیویلپ منٹ پروگرام اکتوبر ۱۹۵۲ء میں شروع ہوا جب ۵۵ علاقوں کو گہری ترقی کے لیے منتخب کیا گیا۔ یہ علاقے ۲۷۳۸۰ گاؤں پر مشتمل تھے جن کی آبادی ایک کروڑ ۷۰ لاکھ تھی۔ پہلے پلان کے ختم تک یہ پروگرام ایک لاکھ چالیس ہزار گاؤں میں پھیل چکا تھا جو ۱۱۹۰ بلاکوں میں تقسیم تھے۔ ان کی آبادی ۸ کروڑ ۵۰ لاکھ تھی۔ دوسرے پلان میں ابتداً یہ تجویز تھی کہ مارچ ۱۹۶۱ء تک ساری دیہی آبادی کو ایکسٹنشن بلاکوں کے تحت اور ۴۰٪ کو کمیونٹی پروگرام کے بلاکوں کے تحت لے آیا جائے لیکن ۱۹۵۸ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان دونوں کا فرق ختم کردیا جائے اور کمیونٹی ڈیویلپ منٹ بلاکوں کی آخری کھیپ کو اکتوبر ۱۹۶۳ء یعنی تیسرے پلان کے دوران لیا جائے۔

پلاننگ کمیشن نے ایک پروگرام ایویلوایشن آرگنائزیشن بنایا جو کمیونٹی ڈویلپ منٹ کے تحت نہیں تھا اور جس کا کام یہ تھا کہ ان دونوں کاموں کا مسلسل جائزہ لیتا رہے۔ اس ادارے نے اب تک بارہ سالانہ رپورٹیں پیش کی ہیں جن میں ۱۹۵۲ء سے لے کر ۱۹۶۳ء تک کے کاموں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے آیئے ان پروجکٹوں کی کارگزاری کا ایک مجموعی جائزہ لیں خصوصاً چوتھی اور پانچویں رپورٹ کے نتائج کی روشنی میں۔

چوتھی ایویلوایشن رپورٹ (۱۹۵۷ء) میں کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی خامیوں کے کچھ دلچسپ پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کی تکمیل کے پہلے چار برسوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ زیادہ تر گاؤں میں کارگزاری معینہ پروگرام سے کم رہی ہے۔ اگرچہ کاشت کے بہتر طریقے بہت کافی رائج ہو گئے ہیں

لیکن بہت سے گاؤں نے، آب پاشی، زمین کی بازیافت، زمین کا تحفظ، چک بندی جیسے اقدام کی کوشش نہیں کی ہے جو زراعتی پیداوار سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ گھریلو صنعتوں اور اداروجاتی پروگرام کے میدان میں بھی (اسکول، کوآپریٹیوز اور پنچایتیں) کارگزاری مایوس کن ہے۔ پروگرام کے زیر اثر بیشتر دیہی علاقے اب بھی حکومت کی امداد اور پہل پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس مسلسل اور ٹھوس جدوجہد کو اب بھی نظر انداز کیا جارہا ہے جس کو معاشی اور سماجی ترقی کے لیے اپنی مدد آپ کے اصول پر مبنی ہونا چاہیے۔ لیکن کمیونٹی ڈیویلپمنٹ پروگرام کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس کے فائدوں کی مساوی تقسیم نہیں ہوتی ہے۔ خود بلاکوں کے اندر ان علاقوں میں فرق ہے جہاں پہنچنا آسان اور جہاں مشکل ہے۔ جہاں تک کسانوں کا تعلق ہے تعجب یہ ہے کہ متمول کسانوں کو جن کے پاس بڑی زمینیں اور وسائل ہیں، غریب کسانوں کے مقابلے میں زیادہ فائدہ پہنچ رہا ہے۔ یہ بات سماجی مساوات اور انصاف کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔

پانچویں ایویلوایشن رپورٹ (۱۹۵۸) ملک کے مختلف پروجیکٹ علاقوں کی پنچایتوں کی مالی حالت پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ صاف طور سے واضح کرتی ہے کہ پنچایتوں کی فی کس حاصل آمدنی ترقی کے اُن کاموں کے لیے قطعی ناکافی ہے جو انھیں کمیونٹی پروگرام کے گہرے ترقیاتی دور کے بعد کی منزل میں انجام دینے ہیں۔ پنچایت کے معاملے میں اگر حالت خراب ہے تو کوآپریٹیو کے معاملے میں بھی اتنی ہی بدتر ہے۔ کمیونٹی پروگرام نے قرض کے کوآپریٹیو پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا ہے۔ یہ بات بہت ہی افسوس ناک ہے کیوں کہ اب تک ہمارے ملک میں قرض کی کوآپریٹیوز دوسری امدادِ باہمی کی تنظیموں کے مقابلے میں زیادہ ترقی کرتی رہی ہیں۔ اِن حالات میں کیا یہ بات قابلِ افسوس نہ ہوگی کہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے پنچایتوں اور امدادِ باہمی کی انجمنوں پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

ان دو رپورٹوں نے جو تصویر پیش کی ہے اُس کی دو نمایاں خصوصیات ہیں۔ ایک طرف تو یقیناً دیہات کے لوگوں میں تبدیلیاں لانے کا شوق پیدا ہوا ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سرکاری ادارے، جس میں اکسٹنشن سروس بھی شامل ہے، گاؤں کے چند افراد کو چھوڑ کر باقی تمام لوگوں سے دو طرفہ رابطہ قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ جب تک یہ رابطہ بڑے گروہوں سے نہیں کیا جاتا کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا کوئی بھی پروگرام کامیاب نہیں ہوسکتا۔

اس سب کا مطلب یہ ہے کہ کمیونٹی پروگرام نے لوگوں کو معاشی اور سماجی ضرورتوں سے باخبر کردیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ زراعتی پیداوار کے طریقے بہتر ہونے کے باوجود دیہات کے لوگوں میں پہل کرنے

اوراپنی مدد آپ کرنے کی اسپرٹ پیدا نہیں ہوئی ہے۔ پروگرام کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ غریب کسانوں کے مقابلے میں متموّل کسانوں کی خوش حالی زیادہ بڑھی ہے اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ کمیونٹی پروگرام نے دیہات کے اُن لوگوں کی نمایاں خدمت کی ہے جو متموّل اور کھاتے پیتے ہیں۔ اگر دیہات کے غریب لوگوں کو فائدہ پہنچا بھی ہے تو وہ پروگرام کی ضمنی پیداوار ہے۔ یہ بات منصوبوں کے مساواتی اصولوں کے خلاف ہے۔

اصلاح کے لیے بلونت رائے مہتا کمیٹی کی سفارشات

چوں کہ حکومت کو پروجکٹوں کی کارگزاری کے بارے میں شبہ تھا اور وہ اپنی کوششوں کی اس معمولی کامیابی پر مطمئن ہو کر بیٹھنا نہیں چاہتی تھی، اس لیے دسمبر ۱۹۵۶ء میں پلاننگ کمیشن نے بلونت رائے مہتا کی صدارت میں ایک اسٹڈی ٹیم مقرر کی جس کا کام یہ تھا کہ یہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور نیشنل ایکسٹنشن سروس کی اسکیموں کا جائزہ لے اور یہ بتائے کہ کس طرح خرچ میں کفایت کی جا سکتی ہے اور ان کی کارکردگی بڑھائی جا سکتی ہے۔ اس کمیٹی یا ٹیم کی اہم سفارشات یہ تھیں:

(۱) بنیادی سفارش یہ ہے کہ ایک پنچایت سمیتی قائم کی جائے جو ضلع کی ترقیاتی سرگرمیوں کی ذمہ دار ہو۔ پنچایت سمیتی کا پنچایت راج یا جمہوری مقامی حکومتوں کی اسکیم میں بہت اہم رول ہے۔ پنچایت سمیتی اور ڈیولپمنٹ بلاک کا حلقۂ انتظام ایک ہی ہوگا (آبادی ۸۰،۰۰۰ کے اندر) اور گاؤں کی پنچایتیں اس کا براہِ راست انتخاب کریں گی۔ اسٹڈی ٹیم نے ایک سہ منزلہ تنظیم کی بھی سفارش کی ہے جو گاؤں کی پنچایت، پنچایت سمیتی اور ضلع پریشد پر مشتمل ہے۔ ان سب کو پورے ضلع میں بہ یک وقت شروع ہونا چاہیے۔ یہ غالباً اس لیے ہے کہ اسٹڈی ٹیم یہ سمجھتی ہے کہ پنچایت راج ہی کے ذریعے موثر دیہی ترقی ممکن ہے۔

(۲) اسٹڈی ٹیم کی مجوّزہ اسکیم کے تحت گرام سیوک جو موجودہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ تنظیم کا سب سے اہم کارکن ہے، اپنے حلقے کی گاؤں پنچایت یا پنچایت سمیتی کا سکریٹری بن جائے گا۔ اس کے حلقے میں ۴۰۰۰ سے زیادہ افراد نہ ہوں گے۔

(۳) کواپریٹیو تحریک کے بارے میں ٹیم نے ایک گاؤں یا چند گاؤں کے گروپ کے لیے ایک سوسائٹی کی تجویز کی ہے جو مقامی پنچایتوں کے ساتھ مل کر کام کرے گی۔ کواپریٹیو عملے کو ... ہونی چاہیے کہ وہ امداد باہمی کو صرف آسان قرض کا ایک آلۂ کار نہ سمجھے بلکہ اسے کمیونٹی ...

ایک منڈیو تصور کرے۔

(۴) ٹیم کا یہ بھی خیال ہے کہ پچھلے برسوں میں معاشی ترقی کی بجائے فلاحی سرگرمیوں کی طرف زیادہ میلان رہا ہے اور تاکید کی ہے کہ جلد از جلد معاشی ترقی کے اہم مطالبات پر توجہ کی جانی چاہیے۔ جہاں تک مختلف سرگرمیوں میں ترجیح کا سوال ہے، ٹیم کی سفارش ہے کہ پینے کے پانی کی فراہمی، زراعت، مویشیوں کی پرورش کی ترقی، امداد باہمی کی سرگرمیوں اور دیہی صنعتوں کو فوقیت حاصل ہونی چاہیے۔ اس کے بعد ہی دوسرے کام آتے ہیں۔

(۵) اسٹڈی ٹیم نے جس وقت یہ جائزہ شروع کیا اس وقت کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام ملک کے نصف دیہی علاقے میں پھیل چکا تھا اور توقع تھی کہ دوسرے پلان کے ختم تک پورے ملک میں پھیل جائے گا۔ ٹیم کا خیال ہے کہ ... ملک کی ناہموار ترقی، مالی وسائل کی کمی اور تکنیکل عملے اور نگراں اسٹاف کی کمیابی کے پیش نظر یہ ... بہت زیادہ ہے جس پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور معینہ تاریخ کو کم از کم تین سال آگے بڑھا دینا چاہیے۔ ٹیم ... یہ بھی رائے ہے کہ پروگرام کی تین منزلوں میں موجودہ تقسیم کی وجہ سے دُہرا نقصان ہے کیوں کہ پہلی اور ... سری منزل میں وسائل کم پڑتے ہیں۔ اس تفریق کو ختم کرکے اس کی جگہ چھے سال کا مسلسل پروگرام ہونا چاہیے جو رقمیں ایک سال نہ خرچ ہو سکیں انھیں معینہ حدود کے اندر دوسرے سال میں منتقل ہونا چاہیے۔

(۶) کفایت، کارکردگی اور رفتار کے بارے میں ٹیم نے سفارش کی ہے کہ اگر کسی اسکیم کو صوبے کے ... ل افسروں نے تفصیل کے ساتھ جانچ لیا ہے مرکز کو منظوری سے قبل دوبارہ تفصیلی جانچ کرنے کی ضرورت ... ہے۔ اسکیموں کے مرکزی امداد کا اہل ثابت ہونے کے موجودہ طریقوں کی وجہ سے بڑی تاخیر ہوتی ... س لیے سفارش کی گئی ہے کہ اگر مرکز میں جانچ قطعی ضروری ہے تو اس کی تفصیل میں جانے کی ... سکیم کے خاص پہلوؤں تک محدود رہنا چاہیے۔

... ری معاشی حکومتوں کے حق میں اسٹڈی ٹیم کی سفارشات پر یہ اعتراض کیا گیا کہ یہ غیر حقیقت پسندانہ ... بل عمل ہے۔ معترضین نے پنچایت سمیتیوں اور دوسرے انتخابی اداروں کی استعداد اور صلاحیت کا ... ے میں سنگین شبہات ظاہر کیے کیوں کہ ماضی میں اس قسم کے ادارے ذاتی رقابت، رشک و حسد ... ت ... دھڑے بندیوں کی وجہ سے کامیاب ثابت نہیں ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ مقامی ... و لی جادو کا ڈنڈا نہیں ہیں کہ ان سے کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی ساری خرابیاں دور ہو جائیں ... ھنا اچھا ہے کیوں کہ اس سے احساس میں تازگی پیدا ہوتی ہے اور لوگوں میں جوش و ... ہوتا ہے۔ لیکن صرف اعتماد دیہی ترقی کی راہ کی سب رکاوٹیں دور نہیں کر سکتا۔

اُس کے ساتھ ایک ایسی ایجنسی بھی ہونی چاہیے جو دیہی علاقوں کی مختلف تنظیموں اور یونٹوں میں تال میل پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

نظر ثانی شدہ کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام

اپریل ۱۹۵۸ء میں کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی مرکزی کمیٹی نے پروگرام پر نظر ثانی کی اور کچھ بنیادی تبدیلیاں منظور کیں۔ اس کے بعد جلد ہی حکومت نے اِس پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ یہ پروگرام بنیادی طور سے بلونت رائے مہتا کمیٹی کی سفارشات پر مبنی ہے۔ اس کے مطابق منصوبہ بندی اور ترقیاتی سرگرمیوں کو جلد از جلد غیر مرکزی بنانا چاہیے۔ اس نظر ثانی شدہ پروگرام کی خاص باتیں یہ ہیں:

(۱) موجودہ تین مراحل (نیشنل اکسٹنشن، کمیونٹی ڈیولپ منٹ اور گہری ترقی کے بعد کی منزل) ختم کرکے پانچ پانچ سال کے دو مراحل کر دیے جائیں۔ اِن مراحل سے پہلے ایک سال پری اکسٹنشن ہو جس میں زراعت پر زیادہ زور دیا جائے۔ موجودہ بلاک جو معمولاً سو (۱۰۰) گاؤں، ۱۵۰ میل سے ۱۷۰ میل رقبے اور ۶۰ سے ۷۰ ہزار کی آبادی پر مشتمل ہیں، انھیں بلاک کے پروگرام کی مدت کے مطابق منزلوں میں بانٹ دیا جائے۔ بلاکوں کے بجٹ میں بھی رد و بدل کیا گیا ہے۔ پہلے مرحلے کے لیے ۱۲ لاکھ، دوسرے کے لیے ۵ لاکھ اور پری اکسٹنشن کے لیے ۱۰۰۰۰ روپے مقرر کیے گئے ہیں۔

(۲) سارے بلاک لیول ورکروں کو ایک ہی جگہ تربیت دی جائے گی تاکہ ان کا نظریہ یکساں ہو۔

(۳) ترقیاتی پروگرام کو غیر مرکزی بنانے پر زور دیا گیا ہے اور بلونت رائے مہتا کمیٹی کی یہ سفارش منظور کی گئی ہے کہ بلاک اور ضلع کی سطح پر ایسے ادارے قائم کیے جائیں جن کی قانونی حیثیت ہو اور جنھیں منصوبہ بندی اور ترقی کی پوری ذمّہ داری دی جائے۔ پنچایتوں کو زیادہ اختیارات دیے جائیں۔ کیوں کہ یہی کمیونٹی پروجکٹ کی عوامی بنیاد ہوگی۔ اِس طرح پنچایت راج کمیونٹی پروجکٹ کے مسئلے کا قطعی حل بن جاتا ہے۔

(۴) پروگرام پر نظر ثانی کی وجہ سے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ کمیونٹی پروجکٹ کی جو اسکیم دوسرے پلان کے تحت منظور ہوئی تھی، اس کا اتمام تکمیل جلد کیا جائے اور دوسرے پلان کے ختم تک سارے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

کی ساری دیہی آبادی کمیونٹی پروجکٹ کے تحت آگئی تھی۔

کمیونٹی ڈیولپمنٹ ایویلوایشن مشن کی حال کی سفارشات کی روشنی میں آخری رائے

حال میں حکومتِ ہند کی درخواست پر اقوام متحدہ کے ادارے "ٹکنکل اسسٹینس ایڈمنسٹریشن" (TECHNICAL ASSISTANCE ADMINISTRATION) نے ہندوستان کی کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کی کارگزاری کی جانچ کے لیے ایک مشن بھیجا۔ اس مشن نے جب اپنا کام شروع کیا اس وقت ٹائم ٹیبل اور پروگرام کی توسیع سے متعلق بلونت رائے مہتا کمیٹی کی سفارشات پر عمل درآمد شروع ہو چکا تھا۔ مشن نے اس بات پر اطمینان ظاہر کیا کہ پورے ملک کو پروگرام کے تحت لانے کی میعاد بڑھا دی گئی ہے "اب یہ تاریخ مارچ ۱۹۶۱ء کی بجائے اکتوبر ۱۹۶۳ء کر دی گئی ہے۔ لیکن مشن کا خیال تھا۔ یہ نظر ثانی شدہ شرح بھی زیادہ تھی۔ اس خطرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مشن نے رائے ظاہر کی کہ "توسیع کی ایسی شرح جو غیر حقیقت پسندانہ اور بہت تیز ہو اس سے مشکلات میں اضافہ ہوگا۔ ہم اس فریب میں مبتلا ہوں گے کہ اتنے بڑے علاقے میں کام شروع ہو گیا ہے۔"

جہاں تک مالی وسائل کی فراہمی کا سوال ہے مشن نے کمیونٹی پروجکٹ کے بیشتر اخراجات کے لیے موجودہ گرانٹ ان ایڈ کی پالیسی پر اعتراض کیا اور کہا کہ یہ پالیسی مجموعی پلان پر اثر انداز ہوتی ہے کہ بلاک ڈیولپمنٹ آفسر کی کارکردگی ناپنے کا پیمانہ بن گیا ہے کہ کتنا روپیہ اس نے صرف کیا۔ چنانچہ مشن نے مشورہ دیا کہ سرکاری امداد اور گرانٹ دیتے وقت دو باتوں کا خیال کیا جائے۔ ایک تو یہ کہ ہر پروگرام کا مجموعی خرچ کتنا ہے اور دوسرے یہ کہ معاشی اعتبار سے اس سے کتنے فائدے کا امکان ہے۔

مشن نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ اب تک کمیونٹی پروجکٹ پر جو روپیہ لگا ہے وہ زیادہ تر رسل و رسائل کے ذرائع اور دوسری سہولتوں کی فراہمی پر خرچ ہوا ہے اور زراعت پر نسبتاً کم توجہ کی گئی ہے۔ چنانچہ مشن کا مشورہ ہے کہ اگلے کئی برسوں تک حکومت کو اپنی ساری کوشش پیداوار بڑھانے پر مرکوز رکھنی چاہیے اور اس کے لیے ولیج لیول ورکروں کی تعداد بڑھا کر اور زراعتی اکسٹنشن عملے میں توسیع کر کے ایک ایمرجنسی ٹاسک فورس قائم کی جائے۔

آخر میں مشن نے یہ بھی محسوس کیا کہ بہت سے اسباب کی بنا پر رابطے کے موجودہ راستے بند معلوم ہوتے ہیں۔ گاؤں کے لوگوں کی باتوں کو صبر و تحمل سے سننے کی صلاحیت جو اوپر کے افسروں

میں بدرجۂ اتم موجود ہے، نیچے کے کارکنوں میں مفقود ہے۔ بہت کم ایسے افسر ہیں جو گاؤں والوں کی توقعات سے واقف ہیں۔ اس لیے مشن کا خیال ہے کہ کمیونٹی پروجیکٹ کو تقویت پہنچانے کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ رابطے کی راہیں کھولی جائیں تاکہ افسروں اور معمولی کارکنوں کے درمیان آزادی سے خیالات کا تبادلہ ہوتا رہے اور خیالات کی رو اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر دوڑتی رہے۔

یہ بات دلچسپ ہے کہ پلاننگ کمیشن کی چھٹی ایویلوایشن رپورٹ (۱۹۵۹) میں بھی اسی بنیادی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں مقصد اور ان کے حصول کے بارے میں لوگوں کے ذہن صاف نہیں ہیں۔ اس ایویلوایشن رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ڈھانچے کے بالائی حصے پر جو خرچ کیا جا رہا ہے اس کی نسبت سے بنیادوں کو مضبوط کرنے کی کوشش کم کی جا رہی ہے۔ مقامی کمیٹی کا غیر سرکاری ممبر اپنا صحیح رول نہیں ادا کرتا اور افسر اس ممبر کو اختیارات اور ذمہ داری دینے پر رضامند نہیں ہیں۔ جہاں تک عام آدمیوں کا سوال ہے، انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ کمیونٹی پروجیکٹ کی ترقی کی مطلوبہ رفتار نہ ہونے کی یہی وجہ ہے۔

۱۹۵۹ء میں ۱۰ بلاکوں کا جائزہ لیا گیا۔ ان میں سے تیرہ بلاک کے لوگ کمیونٹی پروجیکٹ کو وہی فلاح و بہبود کے سرکاری پروگرام سمجھتے ہیں۔ دو بلاک ایسے تھے جو پروگرام کی افادیت کو نہیں تسلیم کرتے تھے۔ دوسرے ان کے حق میں تھے یا کوئی رائے نہیں رکھتے تھے۔ غرض کہ عوام میں فلاح و بہبود کے مسائل سے دلچسپی کم ظاہر ہوتی ہے۔ ساتویں ایویلوایشن رپورٹ (۱۹۶۰) میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ "متحدہ کوشش بہت ناکافی ہے۔ جو کوشش ہے بھی وہ عوامی سطح پر نہیں صرف سرکاری سطح پر ہے اور یہ حقیقی کامیابی سے زیادہ کامیابی کی امید پر مبنی ہے۔"

مختصر یہ کہ کمیونٹی پروجیکٹ پر سرکاری سرگرمی لمبی مدت کے غیر واضح مقاصد اور روزانہ کی ضروری مصروفیتوں میں الجھی رہی ہے۔ ادھر حال میں زراعت کی طرف کوشش بڑھی ہے لیکن توسیع کے عمل کا پورا فائدہ اس وقت تک نہیں اٹھایا جا سکتا جب تک مرکزی پالیسی اور عمل میں زیادہ تال میل نہ ہو۔

بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قوت موجود ہے لیکن فی الحال خوابیدہ ہے۔ اس کو جگا کر حرکت میں لانے کی ضرورت ہے جس سے دماغ کی کھڑکیاں کھل سکیں اور ہر سطح کے افسروں اور

کارکنوں میں گاؤں والوں کے ساتھ چلنے کی واقعی خواہش پیدا ہو تاکہ پورا عملہ اُن حالات کو سمجھنے اور بہتر بنانے پر اپنی پوری قوت صرف کرے جو سب سے نچلی سطح میں پائے جاتے ہیں۔ صرف تب ہی موجودہ پروگرام جو اب تک سرکاری پروگرام ہیں اور جن میں عوام شریک ہوتے ہیں، ایسے پروگرام میں بدلے جا سکتے ہیں جو عوام کے پروگرام ہوں اور سرکار ان میں شریک ہو۔ پنچایت راج کے علاقوں کی حالیہ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ حالت کچھ سدھری ہے۔ پنچایت راج پہلی بار ۱۹۵۹ء میں راجستھان میں شروع ہوا۔ اب (دسمبر ۱۹۶۶ء) یہ زیادہ تر صوبوں میں قائم ہو چکا ہے۔ پنچایت راج کی تمام صوبوں میں توسیع اور مسلسل کوششوں کی وجہ سے اُمید ہے کہ کمیونٹی پروجیکٹ کی طرف لوگوں کا رویہ بہتر ہوگا۔ چوتھے پلان کے مسودے کے مطابق کمیونٹی پروجیکٹ اور پنچایت راج کو زراعت اور تفصیلی پلاننگ جیسے ترجیحی کاموں کے لیے زیادہ موثر طریقے سے استعمال کیا جائے گا۔

آب پاشی اور پاور پروجیکٹ :

ہندوستان کے پانچ سالہ منصوبوں میں آب پاشی اور پاور پروجیکٹوں کو سب سے نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ۱۹۵۱ء میں ۵ء۱۵ کروڑ ایکڑ زمین میں ان پروجیکٹوں سے آب پاشی ہوتی تھی۔ یہ رقبہ ملک کی زیر کاشت زمین کا ۵۵ء۱۷٪ ہے۔ پہلے پلان میں ۸۵ لاکھ ایکڑ زمین میں سینچائی کی سہولت کا نشانہ تھا لیکن پلان کے ختم پر ۶۳ لاکھ ایکڑ زمین کی آب پاشی کی استعداد پیدا کی جا سکی اور ۴۰ لاکھ ایکڑ واقعی آب پاشی کے تحت لایا جا سکا۔ دوسرے پلان میں ۲ء۱ کروڑ ایکڑ کے مقابلے میں جائزے کے مطابق ۱ء۴۵ کروڑ ایکڑ مزید رقبے میں آب پاشی ہو سکی۔ اسی طرح تیسرے پلان میں ۲ء۶۵ کروڑ ایکڑ کا نشانہ رکھا گیا لیکن ۱۹۶۵-۶۶ء تک ۱ء۴۸ کروڑ ایکڑ کا اضافہ ہو سکا۔ چوتھے پلان میں آب پاشی کی بڑی اور چھوٹی اسکیموں کے تحت ۷ء۵۵ لاکھ ہیکٹر کی مزید استعداد پیدا کرنے کی تجویز ہے۔ اس میں ۲۴ لاکھ ہیکٹر میں چوتھے پلان کے ختم تک سینچائی ہو سکے گی۔

اِس کا یہ مطلب ہے کہ بڑی اور چھوٹی اسکیموں سے حاصل ہونے والی آب پاشی کی مجموعی استعداد ۲ء۰۸ کروڑ ہیکٹر (خام) ہوگی۔ جہاں تک پاور کی ترقی کا سوال ہے بجلی پیدا کرنے کی حاصل استعداد ۱۹۵۰-۵۱ء کی ۲۳ لاکھ کیلوواٹ سے بڑھ کر ۱۹۶۰-۶۱ء میں ۸۵ لاکھ کیلوواٹ ہو گئی۔ تیسرے پلان کے ۱ء۲۷ کیلوواٹ کے نشانے کے مقابلے میں حاصل استعداد ۱ء۰۲ کروڑ کیلوواٹ تھی۔ چوتھے پلان کے ختم تک یہ استعداد ۲ء۰۲ کروڑ کیلوواٹ ہو جائے گی۔

پانچ سالہ منصوبوں کے آب پاشی کے پروجکٹ

پہلے پلان کی آب پاشی اور پاور پروگرام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں پانچ بڑے پروجکٹ شامل تھے : (۱) مدھیہ پردیش اور راجستھان میں چمبل پروجکٹ (خرچ ۳۵ کروڑ) (۲) بہار میں کوسی پروجکٹ (خرچ ۶۰ کروڑ) (۳) اترپردیش میں ریہاند پروجکٹ (خرچ ۳۵ کروڑ) (۴) مہاراشٹر میں کوئنا پروجکٹ (خرچ ۳۸ کروڑ؛ (۵) آندھرا میں کرشنا پروجکٹ (خرچ ۲۶ کروڑ) ان پروجکٹوں کے مجموعی خرچ کا تخمینہ ۲۱۰ کروڑ تھا جس میں سے ۴۰ کروڑ روپے پہلے پلان میں رکھے گئے تھے۔

پہلے پلان کے دوران ملک بھر میں آب پاشی کے پروجکٹوں پر بڑی سرگرمی تھی۔ شروع میں ۹۷۰ کروڑ کا مجموعی خرچ آب پاشی اور پاور کے لیے تجویز تھا۔ اس میں ۶۲۰ کروڑ آب پاشی کا حصّہ تھا۔ بعد میں اس تخمینے میں اضافے ہوئے، بعض اسکیموں کی توسیع کی گئی اور بعض کے تخمینے پر نظرِ ثانی کی گئی۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے پلان میں شامل آب پاشی کے پروجکٹوں کا مجموعی خرچ ۷۲۰ کروڑ ہو گیا جس میں سے ۸۰ کروڑ پلان شروع ہونے سے پہلے خرچ ہو چکے تھے۔ خود پہلے پلان کی مدت میں آب پاشی اور پاور پر ۳۸۰ کروڑ روپے خرچ ہوئے اور بقیہ رقم دوسرے اور تیسرے منصوبوں کو منتقل کر دی گئی۔ دوسرے پلان میں ان پروجکٹوں کے لیے ۳۷۰ کروڑ کی ضرورت تھی۔ تیسرے پلان کا متوقع خرچ ۴۳۶ کروڑ تھا۔ اس طرح ۲۱۴ کروڑ کا بقیہ خرچ چوتھے پلان کے لیے رکھا گیا تھا۔

دوسرے پلان میں آب پاشی کے ۱۹۵ نئے پروجکٹ شامل تھے جو بیشتر اوسط درجے کے تھے اور جن کا مجموعی خرچ ۳۷۰ کروڑ تھا۔ توقع تھی کہ ان پروجکٹوں کی تکمیل پر ۱۴۳ کروڑ ایکڑ کی آب پاشی ہو سکے گی۔ دوسرے پلان میں آب پاشی کے بڑے پروجکٹوں پر بھی ۵ کروڑ روپے صَرف کیے گئے۔ اس طرح دوسرے پلان میں بڑے اور اوسط درجے کے آب پاشی کے پروجکٹوں پر ۳۷۵ کروڑ روپے خرچ کیے گئے۔ تیسرے پلان میں ان کے لیے ۶۵۰ کروڑ فراہم کیے گئے ہیں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ آب پاشی کے پروجکٹوں میں کام تیزی سے اور زیادہ اچھی طرح سے کیا جا سکتا ہے اگر ہر صوبے میں ریسرچ یونٹ قائم ہوں جو پروجکٹوں کے سلسلے میں ابتدائی کام کریں اور اثنائے تعمیل کے مسئلے کو تشفی بخش طریقے سے حل کریں۔ مالیاتی اور ابتدائی معلومات کے لحاظ سے قطعِ نظر ان یونٹوں کو پروجکٹوں کے اثنائے کار کے بارے میں ماہرانہ مشورہ دینا چاہیے۔ انھیں بہت

توجہ کے ساتھ ایسے عوامل کا تجزیہ مثلاً تکنیکل عملے کی دست یابی، شروع کی منزل میں دوسرے پروجکٹوں سے استفادہ، زیرِ تعمیل پروجکٹوں کے مطالبات اور صوبے کے اندر مختلف علاقوں کی ضروریات۔ وقت کی تقسیم کے مسئلے کا حل انھیں عوامل پر منحصر ہے۔

پانچ سالہ منصوبوں کے پاور پروجکٹ

پلاننگ کمیشن کا تخمینہ ہے ملک کے مختلف علاقوں سے مجموعی طور پر زیادہ سے زیادہ ۳۵ کروڑ کیلوواٹ ہائڈروالیکٹرک پاور حاصل ہونے کا امکان ہے۔ پہلے پلان کے شروع میں بجلی کے کارخانوں کی حاصل استعداد ۲۳ لاکھ کیلوواٹ تھی۔ اس میں سے ۱۷ لاکھ کیلوواٹ بجلی سرکاری اور غیر سرکاری کارخانے عام استعمال کے لیے پیدا کرتے تھے اور ۶ لاکھ کیلوواٹ صنعتی کارخانے خود اپنے استعمال کے لیے اپنے جنریٹنگ سٹ سے پیدا کرتے تھے۔ پہلے پلان کا نشانہ ۱۳ لاکھ کیلوواٹ تھا۔ جس میں ۱۱ لاکھ کیلوواٹ پبلک سکٹر کو اور دو لاکھ کیلوواٹ غیر سرکاری بجلی کمپنیوں کو بنانی تھی لیکن پہلے پلان کے ختم یعنی مارچ ۱۹۵۶ء تک پبلک سکٹر کی استعداد ۸ لاکھ کیلوواٹ اور نجی سکٹر کی دو لاکھ کیلوواٹ ہو پائی تھی۔

جب دوسرا پلان بنا تو پلاننگ کمیشن نے یہ طے کیا کہ پاور پروجکٹوں پر اس طرح کام جاری رکھا جائے کہ تیسرے پلان کے ختم تک ۷۰ لاکھ کیلوواٹ کے نشانے تک پہنچا جا سکے۔ تیسرے پلان کے شروع ہوتے ہوئے اس نشانے پر نظرِ ثانی کی گئی اور نیا نشانہ ۱۴۷ لاکھ کیلوواٹ متعین ہوا تاکہ دوسرے اور آئندہ کے پلانوں میں عام استعمال کے لیے بجلی بنانے والے کارخانوں کی حاصل استعداد میں اضافے کی شرح ٪۱۸ حاصل ہو سکے۔

تخمینہ تھا کہ دوسرے پلان کے دوران چھوٹی اور متوسط درجے کی صنعتوں کی ترقی کے لیے اور گھریلو اور تجارتی ضروریات کے لیے ۱۴ لاکھ کیلوواٹ بجلی کی مزید ضرورت ہوگی۔ اس کے علاوہ ۱۳ لاکھ کیلوواٹ کی ضرورت صنعتی ترقی کے اُن نئے پروگراموں کے لیے ہوگی جو دوسرے پلان میں شامل تھے۔ غیر متوقع ضروریات کے لیے کچھ فاضل استعداد ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ موسمی اُتار چڑھاؤ کی وجہ سے ہائڈروالکٹرک کارخانوں کے پانی کے ذخیرے میں گھٹ بڑھ ہوتی رہتی ہے۔ غرض کہ ان سب کی گنجائش رکھنے کے بعد دوسرے پلان کی مجموعی ضرورت کا تخمینہ ۳۵ لاکھ کیلوواٹ تھا۔ بعد میں پاور پروجکٹوں کے پروگرام پر نظرِ ثانی کی گئی جس کی وجہ سے ملک کے پاور اسٹیشنوں کی حاصل استعداد مارچ ۱۹۵۶ء کی ۳۴ لاکھ کیلوواٹ کے مقابلے میں مارچ ۱۹۶۱ء میں ۶۹ لاکھ کیلوواٹ ہونے کی توقع ہو گئی۔ لیکن دوسرے پلان کے دوران بجلی کے بھاری آلات کی درآمد کے لیے زرِ مبادلہ کی مشکلات

کی وجہ سے ان اسکیموں کی تعمیل میں تاخیر ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۶۱ء میں جب دوسرا پلان ختم ہوا تو بجلی بنانے کی دوسرے پلان کی ۵۸ لاکھ سے بڑھ کر تیسرے پلان کے ختم تک ۱۲۷ کروڑ کیلو واٹ ہو جائے گی۔ لیکن اب یہ معلوم ہوا کہ مجموعی استعداد صرف ۱۰۲ کروڑ کیلو واٹ تک بڑھائی جاسکی۔ اب چوتھے پلان میں اس تعداد کو بڑھاکر ۲۴۳ کروڑ کیلو واٹ کرنے کی تجویز ہے۔

پاور پروجکٹوں کے لیے مالی وسائل :

دوسرے پلان میں پاور پروجکٹوں کے لیے مجموعی خرچ کے لیے ۴۲۷ کروڑ روپے رکھے گئے تھے۔ اس رقم کی تقسیم یوں تھی : اُن اسکیموں پر جو پہلے پلان میں شروع ہوئی تھیں اور دوسرے میں جاری تھیں ۱۶۰ کروڑ روپے، اُن نئی اسکیموں پر جن سے دوسرے پلان کے دوران فائدہ حاصل ہونا شروع ہوجائے گا، ۲۴۵ کروڑ روپے، اُن نئی اسکیموں پر جن سے تیسرے پلان میں فائدہ حاصل ہونا شروع ہوگا ۲۲ کروڑ روپے، دوسرے پلان میں پاور پروجکٹوں پر مجموعی خرچ ۳۹۰ کروڑ اور پاور ڈیولپمنٹ پر ۴۴۵ کروڑ تھا۔ تیسرے پلان میں پاور ڈیولپمنٹ کے لیے ۱۰۱۲ کروڑ رکھے گئے تھے اور چوتھے پلان میں پبلک سکٹر کے پاور ڈیولپمنٹ کے لیے ۲۰۸۵ کروڑ تجویز ہیں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی کی وجہ سے اور بنیادی صنعتوں کی توسیع کی وجہ سے بجلی کی ضرورت کا نقشہ آہستہ آہستہ بدلے گا اور چوتھے پلان کے دوران صنعتوں کا بجلی کا خرچ نمایاں طور سے بڑھے گا۔

لینن نے ایک بار کہا تھا کہ بجلی کی ترقی صنعتی ترقی کی کُنجی ہے۔ روس کے پہلے اور دوسرے پلان میں پاور کی ترقی عام صنعتی ترقی کی رفتار سے تیز تھی۔ یہی وجہ تھی کہ تیسرے پلان میں روسی صنعت نے پہلے اور دوسرے پلان کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے ترقی کی۔ اس لیے یہ بات تشفی بخش ہے کہ ہمارے دوسرے اور تیسرے منصوبوں میں بجلی کی پیداوار کی ترقی پر پہلے پلان کے مقابلے میں زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان کی ترقیاتی منصوبہ بندی کے دوران بجلی کی ترقی نہ صرف بھاری اور منظم صنعتوں کے لیے ضروری ہے بلکہ چھوٹی اور کم منظم صنعتوں کے لیے بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ اس کے بغیر ان کا ایک متوازن اور خود کفیل ڈھانچہ نہیں بن سکتا۔

ملٹی پرپز پروجکٹ

یک مقصدی پروجکٹوں کے مقابلے میں کثیر المقاصد پروجکٹوں سے دریاؤں کی وادیوں کے

مادی امکانات کا زیادہ بہتر استعمال ممکن ہوتا ہے۔ ایک مکمل ملٹی پرپز پروجیکٹ کے ترقیاتی پروگرام سے مختلف قسم کے فائدے ہوتے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی خرچ بھی کم ہوتا ہے۔ ملٹی پرپز پروجیکٹوں سے حاصل ہونے والے فائدے درج ذیل ہیں:

(۱) سیلاب کی روک تھام کی وجہ سے بالواسطہ اور بلا واسطہ نقصانات نہیں ہو پاتے اور آس پاس کے علاقوں کا زیادہ عمیق استعمال ممکن ہوتا ہے۔

(۲) آب پاشی کی سہولتوں کی وجہ سے زمین کی قیمت بڑھتی ہے۔ عمیق کاشت ممکن ہوتی ہے۔ آب پاشی کے پروجیکٹوں کی تعمیر کے زمانے میں لوگوں کی آمدنی بڑھتی ہے جس کی وجہ سے معاشی سرگرمی تیز ہوتی ہے اور آس پاس کے علاقوں میں ترقی کی رفتار بڑھتی ہے۔

(۳) جہاز رانی کے میدان میں یہ فائدے ہوتے ہیں: ۱) پانی کے ذریعے نقل وحمل کی ترقی ہوتی ہے ۲) موجودہ ذرائع آمد ورفت پر دباؤ کم ہونے کی وجہ سے خطروں اور تاخیر میں کمی ہوتی ہے ۳) آس پاس کے علاقوں کی ترقی کی وجہ سے ریلوں کا بہتر استعمال ہوتا ہے۔

(۴) ہائڈرو الیکٹرک پاور سے پروجیکٹوں کے آس پاس صنعتوں کے قیام کے لیے سستی بجلی ملتی ہے، مصارف پیداوار کم ہوتے ہیں اور اس بچت کو دوسری پیداواری کاموں میں لگایا جا سکتا ہے۔ کم قیمت پر زیادہ بجلی ملنے کی وجہ سے معاشی سرگرمی تیز ہوتی ہے جو ہائڈرو الکٹرک پاور کی ترقی کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔

(۵) ان پروجیکٹوں کی وجہ سے صنعتی اور گھریلو استعمال کے لیے پانی کی رسد بڑھ جاتی ہے۔

(۶) مچھلیوں کا شکار، جانوروں کا شکار اور دوسری تفریحی سرگرمیاں بڑھتی ہیں۔ ان تفریحی مشاغل کے بڑھنے کی وجہ سے سیاحوں اور علاقوں کے باشندوں کی دلچسپی کے سامان فراہم ہوتے ہیں۔

غرضیکہ ملٹی پرپز پروجیکٹوں کے بہت سے بالواسطہ اور بلا واسطہ فائدے ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی زراعت، صنعت اور نقل وحمل کی ترقی ہوتی ہے۔ قریبی علاقوں میں سرمایہ لگنے کی وجہ سے معاشی سرگرمی بڑھتی ہے۔ اس طرح سے ملٹی پرپز پروجیکٹوں کی وجہ سے معاشی ترقی کی رفتار تیز ہوتی ہے اور قوم کی سماجی اقتصادی بہبود میں اضافہ ہوتا ہے۔

اہم ملٹی پرپز پروجیکٹ

اب ہم کچھ اہم ملٹی پرپز پروجیکٹوں کا جائزہ لیں گے اور یہ دیکھیں گے کہ ہندوستان کی منصوبہ بند ترقی

کے دوران انھوں نے کتنی ترقی کی ہے۔

(۱) **دامودر ویلی پروجکٹ :** یہ پروجکٹ وورڈوئن (VOORDOIN) کے ابتدائی میمورینڈم اور اس کے بعد عالی سطح پر جو بحث ومباحثے ہوئے اُس کا نتیجہ ہے۔ یہ بنگال اور بہار میں بوکارو ندیا سے فائدہ حاصل کرنے کا ایک کثیر المقاصد منصوبہ ہے۔ اِس کے فوری مقاصد یہ ہیں: سیلاب کی روک تھام، آب پاشی، بجلی بنانا اور اُس کی تقسیم، دریائی نقل وحمل کی ترقی تاکہ سال بھر جہازرانی ہوسکے۔ اِس پروجکٹ کے بنیادی خدوخال یہ ہیں: تلایا، کونار، میتھان اور پنچیٹ پہاڑوں میں کثیر المقاصد باندھ بنانا اور اُن کے ساتھ ہائڈرو الکٹرک اسٹیشن تعمیر کرنا (۲) بوکارو میں ایک تھرمل پاور پلانٹ تعمیر کرنا جس سے ۲۲۲۵ لاکھ کیلو واٹ بجلی بن سکے۔ (۳) ۸۰۰ میل لمبی پاور لائن بنانا (۴) درگاپور میں ایک پشتہ بنانا اور آب پاشی کے لیے ۱۵۵۰ میل لمبی نہریں تعمیر کرنا۔ اِس میں ۸۵ میل لمبی جہازرانی کے قابل نہر بھی شامل ہے جو دریائے ہگلی میں مل جائے گی۔ جس مقام پر یہ ہگلی سے ملے گی وہ کلکتے سے ۲۵ میل دور ہوگا۔

دامودر ویلی کارپوریشن، جولائی ۱۹۴۸ء میں قائم ہوا۔ یہ امریکہ کی ٹینیسی ویلی اتھارٹی' کے نمونے پر بنا ہے۔ یہ نمونہ ایک لامرکزی انتظامی تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے پلان کے ختم تک دامودر ویلی کارپوریشن اپنے پروجکٹوں پر ۱۴۶ کروڑ روپے خرچ کرچکا تھا۔ ۱۰ کروڑ دوسرے پلان کے دوران خرچ ہوئے۔ اِس پروجکٹ کی ترقی کا لب لباب یہ ہے:

۱۔ تلایا کے مقام پر باندھ اور پاور ہاؤس کی تعمیر فروری ۱۹۵۳ء میں مکمل ہوئی۔ اِس پر ۹۲۵۹ کروڑ روپے صرف ہوئے۔ بوکارو تھرمل اسٹیشن نے بھی فروری ۱۹۵۳ء سے کام شروع کردیا۔

۲۔ کونار باندھ ستمبر ۱۹۵۵ء میں مکمل ہوا۔ اِس پر ۵۷۶۹ کروڑ روپے صرف ہوئے۔ اس کا مقصد سیلاب کی روک تھام اور بوکارو پاور اسٹیشن کے لیے پانی فراہم کرنا ہے۔

۳۔ دریائے بوکارو پر میتھان باندھ اور ہائڈرو الکٹرک پاور اسٹیشن ستمبر ۱۹۵۸ء میں مکمل ہوئے۔ اِس کی مجموعی لاگت ۱۶۴۳ کروڑ ہے۔

۴۔ پنچیٹ باندھ اور پاور ہاؤس کی تعمیر نومبر ۱۹۵۲ء سے شروع ہوئی اور دسمبر ۱۹۵۹ء میں مکمل ہوئی۔ اِس کی مجموعی لاگت ۱۷۶۹۲ کروڑ ہے۔ اِس سے پہلے ستمبر ۱۹۵۹ء میں پنچیٹ کا پاور اسٹیشن چالو ہوچکا تھا۔

۵۔ درگا پور پاور ہاؤس اور بوکارو کا چوتھا یونٹ یہ دونوں نومبر ۱۹۶۰ء میں مکمل ہو کر چالو ہو گئے۔

۶۔ درگا پور بیراج ۱۹۵۵ء کے وسط میں مکمل ہوا۔ اب تک (۱۹۶۹ء تک) بائیں کنارے کی ۱۳۷ کیلو میٹر لمبی نہر کشتیاں چلانے کے قابل بنائی جا چکی ہے۔

(ii) ہیراکڈ ڈیم پروجکٹ

ہیراکڈ پروجکٹ جنوری ۱۹۴۸ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھوں شروع ہوا۔ یہ ایک ملٹی پرپز پروجکٹ ہے جو اڑیسہ میں ۱۰۰ کروڑ روپے کی لاگت سے قائم کیا گیا۔ دوسرے پلان کے ختم تک بڑا پشتہ بن کر تیار ہو گیا۔ ہیراکڈ دنیا کا سب سے بڑی لمبائی کا باندھ ہے۔ اس کے پانی کا ذخیرہ ملک کے اب تک کے ذخیروں میں سب سے بڑا ہے۔ اس پروجکٹ کا پہلا مرحلہ مارچ ۱۹۵۶ء کے ختم تک پورا ہو چکا تھا اور دوسرا مرحلہ ۱۹۶۱ء کے ختم پر مکمل ہوا۔ اس پروجکٹ کی خاص باتیں یہ ہیں: ۱) سیلاب کی روک تھام پوری اور کٹک ضلعوں کے ۸۰۰ مربع میل رقبے میں ہو سکے گی ۲) ۱۹۶۸ء کے ختم تک اس سے ۲۴۹ لاکھ کیلوواٹ بجلی ملنے لگے گی ۳) اڑیسہ کے سمبل پور اور بولان گیر ضلعوں میں ۲۶۸ لاکھ ایکڑ کی آب پاشی ہونے لگے گی۔

(iii) بھاکڑہ ننگل پروجکٹ

اس پروجکٹ سے پنجاب اور راجستھان کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ اس پروجکٹ میں یہ چیزیں شامل ہیں: ۱) ستلج ندی پر بھاکڑہ باندھ کی تعمیر ۲) ۸ میل نیچے ننگل باندھ کی تعمیر ۳) ننگل باندھ کے نیچے پاور ہاؤس کی تعمیر ۴) بھاکڑہ کی نہروں کی تعمیر ۵) کوٹلہ اور گنگول میں دو پاور اسٹیشنوں کی تعمیر۔

یہ پروجکٹ ۱۹۴۶ء میں شروع ہوا۔ ننگل باندھ اور پاور چینل جولائی ۱۹۵۴ء میں مکمل ہو گئے۔ جنوری ۱۹۵۵ء میں ننگل پاور ہاؤس کی تکمیل کے بعد اس کی مستعد صلاحیت ۴۸ ہزار کیلوواٹ تھی جو جولائی ۱۹۵۶ء میں کوٹلہ اور گنگوال پاور ہاؤس کی تکمیل کے بعد دوگنی ہو گئی۔ اب یہ پروجکٹ مکمل ہو چکا ہے۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو جواہر لال نہرو نے اسے قوم کے نام معنون کیا۔ اس پر ۱۷۵،۶ کروڑ روپے صرف ہوئے۔ بھاکڑہ ننگل پروجکٹ سے

۶۳ لاکھ ایکڑ کی آب پاشی ہوتی ہے اور ۶ لاکھ ۴ ہزار کیلوواٹ بجلی بنتی ہے۔

(۱۷) کچھ دوسرے پروجکٹ

متذکرہ بالا پروجکٹوں کے علاوہ کچھ اور بھی ملٹی پرپز پروجکٹ ہیں جنہیں ہندوستانی پلان میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ۱) بہار میں کوسی پروجکٹ۔ اس کے تین یونٹ ہیں جن کے خرچ کا مجموعی تخمینہ ۴۴.۸۶ کروڑ ہے۔ مکمل ہونے پر ان سے بہار کے پورنیا اور سہرسہ ضلعوں میں ۵۶.۰۰ لاکھ ایکڑ کی آب پاشی ہو سکے گی۔ بیراج اور ہیڈ ورک مع پل اپریل ۱۹۶۵ء میں مکمل ہو گئے اور نیپال کے بادشاہ نے اس کا افتتاح کیا۔ ۲) آندھرا کا ناگ ارجن ساگر پروجکٹ۔ کرشنا ندی پر باندھ بنانے کا کام پہلے پلان کے دوران شروع ہوا۔ ۱۹۷۱ء تک باندھ اور دریا کے دونوں طرف نہریں بنانے کا کام پورا ہو جانے کی توقع ہے۔ ۳) مدھیہ پردیش اور راجستھان کا چمبل پروجکٹ۔ چمبل پروجکٹ کا کوٹا پشتہ جس پر ۱۹۵۳-۵۴ء میں کام شروع ہوا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں پورا ہو گیا گاندھی ساگر باندھ اور پاور اسٹیشن نومبر ۱۹۶۰ء میں بننا شروع ہوا اور امید ہے کہ ۱۹۶۸ء کے ختم تک پورا ہو جائے گا۔ ۴) اتر پردیش کا ریہاند پروجکٹ۔ اس پروجکٹ پر ۱۹۵۴ء کے آخر میں امریکہ کی مدد سے کام شروع ہوا اور جنوری ۱۹۶۳ء میں پورا ہوا۔ اس پروجکٹ میں ایک باندھ اور ایک پاور ہاؤس ہے۔ پاور ہاؤس کی استعداد ۲.۶۵ لاکھ کیلوواٹ ہے جو ۳ لاکھ تک بڑھائی جا سکتی ہے۔ یہ پروجکٹ ۲۷۷۰۰ میل میں پھیلا ہوا ہے جس سے دو کروڑ پچاس لاکھ کی آبادی کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ جنوری ۱۹۶۳ء سے اس پروجکٹ نے کاروباری پیمانے پر کام کرنا شروع کر دیا۔

مختصر جائزہ

آب پاشی اور پاور پروجکٹوں پر اب تک جو کام ہوا ہے اُس کے جائزے سے یہ باتیں ظاہر ہوتی ہیں: ۱) کچھ بڑے پروجکٹوں میں، جن میں دامودر ویلی پروجکٹ بھی شامل ہے، منصوبہ بندی کا کام قسطوں میں ہوا۔ تعمیر کے دوران پروجکٹ کے پروگرام اور خاکے میں جس طرح بار بار تبدیلیاں کی گئیں اُس سے یہ بات واضح ہے۔ ۲) دامودر ویلی جیسے پروجکٹوں میں کافی روپیہ اور سامان منصوبے کی خامیوں اور انتظام کی لاپرواہی کی وجہ سے ضائع ہوا۔ ۳) بیشتر پروجکٹوں میں مشینوں اور آلات

کی خریداری میں واضح پالیسی کی کمی معلوم ہوتی ہے۔ تھوڑی تھوڑی خریداری کی وجہ سے روپیہ ضائع ہوا اور قوم کا نقصان ہوا۔ ۴) جن کنٹریکٹروں کو کام کا ٹھیکہ ملا اُنھوں نے خوب منافع کمایا۔ اس سلسلے میں یہ بات اُمید افزا ہے کہ حال میں حکومت نے نیشنل پروجکٹ کانسٹرکشن کارپوریشن بنایا ہے جو ان ٹھیکے داروں سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر رہا ہے۔

حصہ دوم کا ضمیمہ

الف - پانچ سالہ منصوبوں کے نمایاں خد و خال

ٹیبل ۲—۱

پہلے پلان کے تحت مصارف اور مدات

بڑی مدات	مجموعی رقم: کروڑ روپے	مجموعی رقم: فی صد	۱۹۵۱-۵۶ء کے بیچ رقم: کروڑ روپے	۱۹۵۱-۵۶ء کے بیچ رقم: فی صد
۱۔ زراعت اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ	۳۵۲	۱۴٫۹	۲۹۹	۱۴٫۸
۱) زراعتی پروگرام	۲۴۹	۱۰٫۵	۲۲۷	۱۱٫۳
۲) کمیونٹی پروجکٹ اور نیشنل ایکسٹنشن سروس	۹۰	۳٫۸	۵۷	۲٫۸
۳) مقامی ترقیاتی کام	۱۵	۰٫۶	۱۵	۰٫۷
۲۔ آب پاشی اور پاور	۶۴۷	۲۷٫۲	۵۸۵	۲۹٫۱
۱) ملٹی پرپز پروجکٹ	۲۵۶	۱۰٫۸	۲۴۱	۱۲٫۰
۱) آب پاشی پروجکٹ	۲۱۳	۹٫۰	۱۹۱	۹٫۵
۳) پاور پروجکٹ	۱۷۸	۷٫۴	۱۵۳	۷٫۶
۳۔ صنعتیں اور کان کنی	۱۸۸	۷٫۹	۱۰۰	۵٫۰
۱) دیہی اور چھوٹی صنعتیں	۴۹	۲٫۱	۴۴	۲٫۲
۲) بڑی صنعتیں، کان کنی اور سائنٹفک ریسرچ	۱۳۹	۵٫۸	۵۶	۲٫۸
۴۔ نقل و حمل اور رسل و رسائل	۵۷۱	۲۴٫۰	۵۳۲	۲۶٫۴
۱) ریلوے	۲۶۷	۱۱٫۲	۲۶۷	۱۳٫۳
۲) سڑک اور سڑکوں کے ذریعے نقل و حمل	۱۴۷	۶٫۲	۱۴۷	۷٫۳
۳) بندرگاہ، جہاز رانی اور دوسرے ذرائع نقل و حمل	۹۷	۴٫۱	۷۱	۳٫۵
۴) ڈاک تار، رسل و رسائل اور براڈ کاسٹنگ	۹۰	۲٫۵	۷۴	۲٫۳
۵۔ سوشل سروس	۵۳۲	۲۲٫۴	۴۲۳	۲۱٫۰
۱) تعلیم	۱۷۰	۷٫۲	۱۵۳	۷٫۶
۲) صحت	۱۳۸	۵٫۸	۱۰۱	۵٫۰
۳) رہائش	۴۹	۲٫۱	۳۵	۱٫۷
۴) مزدوروں اور پس ماندہ طبقوں کی فلاح و بہبود	۳۹	۱٫۶	۳۷	۱٫۸
۵) آبادکاری	۱۳۶	۵٫۷	۹۷	۴٫۸
متفرق	۸۶	۳٫۶	۲۰۳	۱۰٫۰
میزان	۲۳۷۸	۱۰۰٫۰	۲۰۱۳*	۱۰۰٫۰

* پانچویں سال کے اعداد و شمار نظر ثانی شدہ تخمینے پر مبنی ہیں؛ ان اعداد و شمار کی درستی کے بعد پانچ سال کا واقعی صرف ۱۹۶۰ کروڑ کے قریب ہوگا۔

SOURCE: REVIEW OF THE FIRST FIVE YEAR PLAN (MAY 1957)

ٹیبل ۲ — ۳

پہلے اور دوسرے پلان کے مصارف کی تقسیم

مدات	پہلا پلان مجموعی رقم کروڑ روپے	فی صد	دوسرا پلان مجموعی رقم کروڑ روپے	فی صد
۱۔ زراعت اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ	۳۵۴	۱۵٫۱	۵۶۸	۱۱٫۸
(الف) زراعت	۲۴۱	۱۰٫۳	۳۴۱	۷٫۱
زراعتی پروگرام	۱۹۷	۸٫۴	۱۷۰	۳٫۵
مویشیوں کی پرورش	۲۲	۰٫۹۵	۵۶	۱٫۱
جنگلات	۱	۰٫۴۳	۴۷	۱٫۰۰
مچھلیوں کی پرورش	۴	۰٫۲	۱۲	۰٫۲
امداد باہمی	۷	۰٫۳	۴۷	۱٫۰
متفرق	۱	—	۹	۰٫۲
(ب) نیشنل ایکسٹنشن اور کمیونٹی پروجیکٹ	۹۰	۳٫۸	۲۰۰	۴٫۲
(ج) دوسرے پروگرام	۲۳	۱٫۶	۲۷	۰٫۶
گاؤں پنچایت	۸	۰٫۳	۱۲	۰٫۳
مقامی ترقیاتی کام	۱۵	۰٫۶	۱۵	۰٫۳
۲۔ آب پاشی اور پاور	۶۴۷	۲۷٫۶	۹۱۳	۱۹٫۰
آب پاشی	۳۷۰	۱۵٫۹	۳۸۱	۷٫۹
پاور	۲۶۰	۱۱٫۱	۴۲۷	۸٫۹
سیلاب کی روک تھام اور دوسرے پروجیکٹ وغیرہ	۱۷	۰٫۷	۱۰۵	۲٫۲
۳۔ صنعت اور کان کنی	۱۸۸	۷٫۶	۸۹۰	۱۸٫۵
بڑی اور متوسط صنعتیں	۱۴۸	۵٫۹	۶۱۷	۱۲٫۹
معدنی ترقی	۱	—	۷۳	۱٫۵
دیہی اور چھوٹی صنعتیں	۴۹	۲٫۱	۲۰۰	۴٫۲
۴۔ نقل و حمل اور رسل و رسائل	۵۷۱	۲۴٫۲	۱۳۸۵	۲۸٫۹
ریلوے	۲۶۷	۱۱٫۴	۹۰۰	۱۸٫۸
سڑکیں	۱۳۵	۵٫۶	۲۴۶	۵٫۱
سڑکوں کے ذریعے نقل و حمل	۱۲	۰٫۵	۱۷	۰٫۴
بندرگاہ	۳۴	۱٫۴	۴۵	۰٫۹
جہاز رانی	۳۰	۱٫۲	۴۸	۱٫۰
اندرونی ملک پانی کے ذریعے نقل و حمل	—	—	۳	۰٫۱
سول ہوائی نقل و حمل	۲۴	۱٫۰	۴۳	۰٫۹
دوسرے ذرائع نقل و حمل	۳	۰٫۱	۷	۰٫۱
ڈاک اور تار	۵۰	۲٫۲	۶۳	۱٫۳
دوسرے ذرائع رسل و رسائل	۵	۰٫۲	۴	۰٫۱
براڈکاسٹنگ	۵	۰٫۲	۹	۰٫۲

ٹیبل ۲—۲

پہلے اور دوسرے پلان کے مصارف کی تقسیم

مدت	پہلا پلان مجموعی رقم (کروڑ) *	فی صد	دوسرا پلان مجموعی رقم (کروڑ)	فی صد
۵۔ سوشل سروس	۵۳۳	۲۲۶۲	۹۴۵	۱۹۷۶
تعلیم	۱۶۴	۷۶۰	۳۰۷	۶۴۳
صحت	۱۴۰	۵۸۹	۲۷۴	۵۶۷
مکانات	۴۹	۲۶	۱۲۰	۲۶۵
پس ماندہ طبقوں کی فلاح وبہبود	۳۲	۱۶۳	۹۱	۱۰۹
سوشل ویلفیر	۵	۰۲۲	۲۹	۰۶۹
محنت اور مزدوروں کی فلاح وبہبود	۷	۰۶۳	۲۹	۰۶۹
آبادکاری	۱۳۵	۵۶۷	۹۰	۱۰۹
پڑھے لکھے بے روزگاروں کے لیے مخصوص اسکیمیں	-	-	۵	۰۶۱
۶۔ متفرق	۳۶	۳۶۶	۹۹	۲۰۱
میزان	۲۳۷۸	۱۰۰	۴۸۰۰	۱۰۰

* مجموعی رقم میں پانچ سال کے دوران تطبیق شامل ہے

SOURCE: REVIEW OF THE FIRST I IVE YEAR PLAN (MAY 1957) AND SECOND FIVE YEAR PLAN REPORT (1956)

ٹیبل ۲—۳

پہلے پلان کے سکٹر کے لیے مالی وسائل

	کروڑ روپیے	فی صد
ٹیکس اور ریلوے سے آمدنی کی فاضل رقمیں	۷۵۲	۳۸
بازار سے قرض	۲۰۵	۱۰
چھوٹی بچت اور قابلِ واپسی قرض	۳۰۴	۱۶
دوسری کیپیٹل آمدنیاں	۹۱	۵
بیرونی امداد	۱۸۸	۱۰
مالیاتی خسارے کے ذریعے	۴۲۰	۲۱
میزان	۱۹۶۰	۱۰۰

ٹیبل ۲ — ۴

دوسرے پلان کے مجوزہ مصارف اور تیسرے پلان کے مادّی پروگراموں کے مدوار خرچ کا تخمینہ

ترقی کی مدات		دوسرے پلان کے مصارف کا تخمینہ (لاکھ روپے میں)	تیسرے پلان کی مادّی پروگرام کے اخراجات کا تخمینہ
۱۔ زرعی پروگرام		۲۰۹۴۴	۲۸۷۹۳
۲۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور کوآپریشن		۲۵۲۵۹	۳۰۲۵۷
۳۔ آب پاشی اور پاور		۱۰۵۴۹	۱۴۸۰۳۸
۴۔ صنعتیں اور معدنیات		۱۰۷۷۵۰	۲۱۴۹۰۰
۵۔ نقل و حمل اور رسل و رسائل		۱۳۹۹۰۵	۱۹۵۴۷۳
۶۔ سوشل سروس		۷۳۰۲۴	۱۴۱۹۳۹
۷۔ متفرق		۹۹۸۰	۱۱۰۲۷
	میزان	۴۶۰۰۰۰	۸۰۹۸۵۳ (۱)

(۱) اس میں ۲۰۰ کروڑ کا خرچ شامل ہے

SOURCE: THIRD FIVE YEAR PLAN REPORT (1961)

ٹیبل ۵-۴

دوسرے اور تیسرے پلان کی خاص مدات کے لیے وسائل کا تخمینہ کروڑ روپے

مدات		دوسرا پلان		تیسرے پلان کے مالی وسائل	
		مجموعی مصارف	فی صد	میزان	فی صد
زراعت اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ		۵۳۰	۱۱	۱۰۶۸	۱۴
بڑی اور اوسط درجے کی آب پاشی		۴۲۰	۹	۶۵۰	۹
پاور		۴۴۵	۱۰	۱۰۱۲	۱۳
دیہی اور چھوٹی صنعتیں		۱۷۵	۴	۲۶۴	۴
منظم صنعتیں اور معدنیات		۹۰۰	۲۰	۱۵۲۰	۲۰
نقل و حمل اور رسل و رسائل		۱۳۰۰	۲۸	۱۴۸۶	۲۰
سوشل سروس اور متفرق		۸۳۰	۱۸	۱۳۰۰	۱۷
	میزان	۴۶۰۰	۱۰۰	۷۵۰۰	۱۰۰

SOURCE · THIRD FIVE YEAR PLAN REPORT (1961)

ٹیبل ۲—۶

دوسرے اور تیسرے پلان کے لیے مالی وسائل

مدات	دوسرا پلان (واقعی)	تیسرا پلان (ابتدائی)
۱۔ رواں آمدنی سے فاضل رقم (مزید ٹیکسوں کے علاوہ)	(—) ۵۰	۵۵۰
۲۔ ریلوے کا حصہ (موجودہ بنیاد پر)	۱۵۰	۱۰۰
۳۔ دوسرے سرکاری کاروبار سے فاضل آمدنی (موجودہ بنیاد پر)	(ه)	۴۵۰
۴۔ عوام سے قرض (خالص)	۷۸۰ (ط)	۸۰۰
۵۔ چھوٹی بچت (خالص)	۴۰۰	۶۰۰
۶۔ پراویڈنٹ فنڈ (خالص)	۱۷۰	۲۶۵
۷۔ اسٹیل اکولائیزیشن فنڈ (خالص)	۳۸	۱۰۵
۸۔ متفرق کیپٹل آمدنیوں کی فاضل رقم	۲۲	۱۷۰
۹۔ مزید ٹیکس مع اُن اقدام کے جو سرکاری کاروبار سے آمدنی بڑھانے کے لیے کیے گئے	۱۰۵۲	۱۷۱۰
۱۰۔ بیرونی امداد کے بقدر بجٹ سے آمدنی	۱۰۹۲ (ج)	۲۲۰۰
۱۱۔ مالیاتی خسارہ	۹۴۸	۵۵۰
میزان	۴۶۰۰	۷۵۰۰

(ه) ٹیبل کے نمبر ۱ اور ۸ میں شامل (ط) پی-ال ۴۸۰ فنڈ سے لے کر جو سرمایہ اسٹیٹ بینک نے لگایا وہ شامل ہے۔
(ج) پی ال ۴۸۰ فنڈ سے لے کر جو سرمایہ ریزرو بینک نے ۱۹۶۰-۶۱ء میں مخصوص سکیوریٹیوں میں لگایا وہ شامل ہے۔

SOURCE: THIRD FIVE YEAR PLAN REPORT (1961)

ٹیبل ۲—۷

تیسرے پلان کے دوران راس المال اور مصارف

کروڑ روپے

	پبلک سکٹر: پلان کے مصارف	پبلک سکٹر: رواں مصارف	پبلک سکٹر: راس المال	نجی سکٹر: راس المال	میزان: راس المال
پہلا پلان (۵۲-۱۹۵۱ء تا ۵۶-۱۹۵۵ء)	۱۹۶۰	۴۰۰	۱۹۹۰	۱۸۰۰	۳۳۶۰
دوسرا پلان (۵۷-۱۹۵۶ء تا ۶۱-۱۹۶۰ء)	۴۶۰۰	۹۵۰	۳۶۵۰	۳۱۰۰	۶۷۵۰
تیسرا پلان (۶۲-۱۹۶۱ء تا ۶۶-۱۹۶۵ء)	۷۵۰۰	۲۰۰	۶۳۰۰	۴۱۰۰	۱۰۴۰۰
پہلے کے مقابلے میں دوسرے پلان میں اضافہ (فی صد)	۱۳۵	۱۳۸	۱۳۴	۷۲	۱۰۱
دوسرے کے مقابلے میں تیسرے پلان میں اضافہ (فی صد)	۶۳	۲۶	۷۳	۳۲	۵۴

٭ پبلک سکٹر سے منتقل ہوئی رقم کے علاوہ: ۱۔ اس میں وہ ۲۰۰ کروڑ بھی شامل ہیں جو نجی سکٹر کو وسائل فراہم کرنے کے لیے منتقل کیے گئے۔ اگر اس رقم کو نکال دیا جائے تو دوسرے اور تیسرے پلان کے راس المال کی مقدار ۶۵۳۰ کروڑ اور ۱۰۰۰۶ کروڑ ہو جائے گی۔ ۲۔ ۲۰۰ کروڑ کا نجی راس المال نہیں شامل ہے جو پبلک سکٹر سے منتقل ہوا۔ اگر یہ رقم نکال دی جائے تو نجی سکٹر کا راس المال دوسرے اور تیسرے پلان میں ۳۳۰۰ اور ۴۳۰۰ کروڑ ہوگا۔

SOURCE: THIRD FIVE YEAR PLAN (1961)

ٹیبل ۲-۹

کمیونٹی پروجیکٹ پر اخراجات اور کچھ اس کے کارنمایاں

	پہلے پلان کے دوران	دوسرے پلان کے دوران	تیسرے پلان کے دوران ۱۹۶۳ء تک کے دو سال
۱۔ مصارف			
۱) پلان کے مصارف	۹۶,۵۰,۰۰۰۰۰	۲۰۱۳,۰۰۰۰۰۰	۱۰۴۹۰۰۰۰۰۰
۲) سرکاری مصارف	۳۹۲	۱۸۹۴	۱۰۷۵
۳) عوام کی طرف سے	۵۱	۷۷۳	۱۹۹
دو اور تین کا میزان	۷۱۳	۲۹۹۷	۲۱۷۴
۲۔ پروگرام کے کارنمایاں			
زراعت			
۱) بہتر بیجوں کی تقسیم (۰۰۰ ٹن)	۱۷۰	۱۱۵۰	۹۰۵
۲) کیمیاوی کھاد "	۳۴۱	۲۵۵۹	۱۸۲۱
۳) زراعتی مظاہرے (۰۰۰ تعداد)	۱۱۳۱	۸۱۳۴	۳۲۹۲
مویشیوں کی پرورش			
۴) اچھے مویشی فراہم کیے گئے (۰۰۰ تعداد)	۱۲	۸۳	۵۰
۵) اچھے مرغ اور مرغیاں فراہم کی گئیں (۰۰۰ تعداد)	۱۹۳	۱۱۶۹	۹۹۳
دیہی اور چھوٹی صنعتیں			
۶) انجنوں کے پمپ شروع ہوئے (۰۰۰ تعداد)	NA نہیں معلوم	۲۴*	۳۵
۷) سلائی کی مشینیں تقسیم ہوئیں (")	NA نہیں معلوم	۱۳*	۱۹
صحت اور گاؤں کی صفائی			
۸) کنوؤں کی تعمیر (")	۴۰	۱۸۳	۹۸
۹) پرانے کنوؤں کی صفائی (")	۶۰	۲۶۰	۱۰۵
سوشل ایجوکیشن			
۱۰) بالغ ایجوکیشن سنٹر شروع کیے گئے (")	۴۱	۱۵۵	۹۲
۱۱) خواندہ بالغ (لاکھ)	۱۰	۴۴	۱۷
عورتوں کے پروگرام			
۱۲) [illegible] (۰۰۰)	نہیں معلوم	۵۱	۴۰
۱۳) [illegible] (")	"	۸۸۴	۷۵۱
رسل و رسائل			
۱۴) گاؤں کی سڑکیں تعمیر کی گئیں (۰۰۰ میل)	۳۳	۹۲	۴۲

* ۱۹۵۸-۵۹ء اور ۱۹۶۰-۶۱ء سے متعلق ** تیسرے پلان میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ منظور شدہ مجموعی خرچ ۳۲۱ کروڑ ۷۰ لاکھ ہے۔

SOURCE: THREE PILLARS OF DEMOCRACY (PUBLISHED BY THE MINISTRY OF COMMUNITY DEVELOPMENT AN CO-OPERATION) 1963.

ہندوستانی معیشت کے مسائل
تیسرا حصہ

قدرتی وسائل اور قومی آمدنی

باب ۱۰

ہندوستان کے قدرتی وسائل

قدرتی وسائل ملک کی امکانی دولت کے ایک اہم حصے کو ظاہر کرتے ہیں۔ اگر ملک کے لوگ اس قدرتی دولت کو ٹھیک سے استعمال کریں تو یہ ملک کی معاشی ترقی کا اہم ذریعہ بن سکتے ہیں۔ ان کا موثر استعمال صنعتی ترقی میں مدد کرتا ہے، قومی آمدنی بڑھاتا ہے اور لوگوں کا معیار زندگی اونچا کرتا ہے۔

قدرتی وسائل اور معاشی ترقی

جیسے جیسے آبادی بڑھتی ہے اور مارکٹ کی توسیع ہوتی ہے، قدرتی وسائل ترقی یافتہ معاشی تنظیم کی بنیاد بنتے ہیں، محنت کی مہارت بڑھتی ہے اور زیادہ سرمائے کی تخلیق ہوتی ہے جس کی وجہ سے صنعتوں کا قیام ممکن ہوتا ہے۔ شروع میں یہ صنعتیں دست کاری کے پیمانے پر ہوتی ہیں، بعد کو چھوٹے کارخانے قائم ہوتے ہیں مثلاً کپڑے کے کارخانے اور آخر میں بھاری مشینیں لگتی ہیں جن میں بہت سرمایہ لگتا ہے۔ ہندوستان میں قدرتی وسائل کی بہتات ہے اور صنعتی ترقی کا براہ راست انحصار ان وسائل کے استعمال پر ہے۔ پلاننگ شروع ہونے سے پہلے قدرتی وسائل کو استعمال کرنے کی کوشش بہت کم تھی چنانچہ منظم سکٹر میں چند ہی صنعتیں ترقی کر سکیں لیکن اب حوصلہ ترقیاتی منصوبہ بندی کی وجہ سے پانچ سالہ پلانوں کے تحت بھاری مشینوں کی صنعتیں ترقی کر رہی ہیں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ معاشی ترقی کے دوران فنی خیالات کی لین دین جاری رہتی ہے جس کی وجہ سے نئے افق روشن ہوتے ہیں اور قدرتی وسائل کے استعمال کے نئے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ہندوستان جیسے اُن ملکوں کے لیے بڑی نعمت ہے جو ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لیے منصوبہ بندی کو مکمل معلومات کے تبادلے سے منسلک کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان جیسے کم ترقی یافتہ ملکوں کو جن کے پاس قدرتی وسائل کا ذخیرہ ہے، معدنی ترقی کا ایک مکمل منصوبہ بنانا چاہیے۔ مطلوبہ معاشی ترقی کے تمام منصوبوں کو آگے ڈھکیلنے کے لیے یہ پروگرام انجن کا کام دے گا۔

قدرتی وسائل میں معدنیات کی ایک اہم حیثیت ہے۔ ان سے صرف دھاتیں اور ایندھن ہی نہیں ملتا بلکہ عمارتی اور کیمیاوی صنعتوں کے لیے خام مال بھی فراہم ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ تیز معاشی ترقی کا ایک اہم جزو ہیں۔ ہندوستان کے تیسرے پلان میں معدنیاتی ترقی کو اہم جگہ دی گئی ہے کیوں کہ اس سے صنعتی خام مال ملنے کی توقع ہے جس کی صنعتی ترقی کے دوران بڑی اہمیت ہے۔ ایکیفے (ECAFE) کی حالیہ رپورٹ "ایشیا اور مشرق بعید میں معدنی وسائل کی ترقی" میں معدنیات کے ترقیاتی اثرات کا بہت اچھا خلاصہ مندرجہ ذیل زاویوں سے کیا گیا ہے :

(۱) معدنیاتی صنعت کس حد تک قابلِ استعمال اشیا پیدا کرتی ہے اور ملک کی ترقی کی رفتار تیز کرتی ہے۔

(۲) معدنیاتی صنعت کس حد تک لوگوں کے لیے روزگار اور تربیت کے موقعے فراہم کرتی ہے۔

(۳) اس کی وجہ سے وہ سہولتیں کتنی پیدا ہوتی ہیں جو معدنی کانوں کے علاوہ دوسرے مقاصد اور دوسری منڈیوں کے کام آتی ہیں اور اس طرح متنوع ترقی میں مدد کرتی ہیں۔

(۴) کس حد تک ان سے قابل فروخت برآمدی اشیا فراہم ہوتی ہیں جن سے زرِ مبادلہ ملے جس سے ترقیاتی کاموں کے لیے بھاری مشینیں درآمد کرنے میں مدد ملے۔

ہندوستان کے معدنی وسائل

پہلے پلان میں معدنی ترقی کی پالیسی : پہلے پلان میں ہندوستان کے معدنی وسائل کی تلخیص یوں کی گئی ہے : کوئلہ، خام لوہا، خام مینگنیز، ابرق، سونا، المنائٹ، باکسائٹ اور تعمیری خام اشیا کی اتنی مقدار ہے جو صنعت اور معیشت کے دوسرے شعبوں کے لیے کافی ہے۔ دوسری معدنیات جن کے ذخیرے ہندوستان میں اچھے ہیں وہ ہیں کرومائٹ، ایٹمی قوت کی معدنیات، ریفریکٹری کی معدنیات، ایبریسیوز (ABRASIVES) اور صنعتوں میں کام آنے والی مختلف قسم کی مٹی۔ زیادہ اہم معدنیات

جن کی رسد کسی بھی بڑی صنعت کے لیے ناکافی ہے وہ ہیں گندھک، تانبا، جستہ، ٹین، نکل، سیسہ، زنک، گریفائٹ، کوبالٹ، پارہ اور سیّال ایندھن۔ ان کو چھوڑ کر باقی بنیادی معدنیات اور پاور کے وسائل جن کی ضرورت صنعتی ترقی کے لیے ہوتی ہے، ہندوستان کے پاس موجود ہیں اگر آبادی کی نسبت سے ان کے ذخیرے دنیا کے دوسرے معدنیاتی علاقوں سے کم ہیں۔"

ابتداً ایک کروڑ ۶ لاکھ روپے انڈین بیورو آف مائنز کی توسیع کے لیے اور جیالوجیکل سروے آف انڈیا کی مزید توسیع کے لیے رکھے گئے تھے ۱۹۵۵ء میں معدنیات کے سروے کی رفتار تیز کرنے کے لیے ۳۴ء۱ کروڑ روپیے اور فراہم کیے گئے۔ لیکن اس مجموعی رقم یعنی ۴۰ء۲ لاکھ میں سے صرف ۶۹ لاکھ پہلے پلان کے دوران خرچ ہوئے۔ یہ بات ضرور خوشی کی ہے کہ پہلے پلان کے دوران سنگھ بھوم اور وسطی راجستھان میں جیالوجیکل سروے نے دو نئی یورینیم کی کانیں دریافت کیں، یورینیم ایٹمی قوت کا بنیادی ماخذ ہے۔

پانچ سالہ پلان اور معدنیات :۔ اس بات کے پیشِ نظر کہ صنعتی ترقی معدنیاتی ترقی پر منحصر ہے، آئیے اب تک کے منصوبوں میں ان دونوں کے اخراجات کا موازنہ کریں۔ پہلے پلان کا مقصد معتدل صنعتی ترقی تھا۔ اس پلان میں معدنیات کے لیے ایک کروڑ، صنعتی ترقی کے لیے ۴۸ کروڑ روپے رکھے گئے تھے۔ دوسرے پلان کا صنعتی پروگرام زیادہ حوصلہ مند تھا۔ اس میں معدنیاتی ترقی کے ۷۳ کروڑ اور بڑی اور اوسط درجے کی صنعتوں کے لیے ۶۱۷ کروڑ فراہم کیے گئے۔ اس طرح دوسرے پلان میں صنعت اور معدنیات کی ترقی پر تاکید جاری رہی اور ان مدات پر ۵۰۰ کروڑ روپے خرچ کیے گئے

دوسرے اور تیسرے پلان کی معدنیاتی ترقی کی پالیسی

دوسرے پلان میں چوں کہ صنعتی ترقی پر زور تھا اس لیے معدنیاتی ترقی کا عملی پروگرام ضروری تھا فولاد کے ڈلوں کی پیداوار ۶۰ لاکھ ٹن کرنے کے لیے لوہے، کوئلے، چونے، ڈولومائٹ (DOLOMITE) مدر ریفریکٹری کے سامان کی پیداوار بڑھانی ضروری تھی۔ الومنیم کی صنعت بڑھنے کی وجہ سے باکسائٹ (BAUXITE) کی مانگ بڑھ گئی۔ سیمنٹ کی صنعت کی توسیع نے چونے، جپسم اور صنعتی مٹی کی طلب بڑھادی۔ پہلے پلان کے مقابلے میں دوسرے پلان کے دوران معدنیاتی تحقیقات کا کام بہت تیز ہو گیا۔ کوئلے کی پیداوار بڑھانے کے منتخب علاقوں میں کوئلے کی تفصیلی تلاش کی ضرورت تھی۔ اسی طرح لوہے اور فولاد جیسی بنیادی صنعتوں میں حکومت کی بڑھتی ہوئی شرکت کی وجہ سے معدنی

خام مال کے ذخیروں کی باقاعدہ تلاش کی ضرورت تھی۔ مثلاً خام لوہا، خام میگنیز، چونا اور ریفریکٹری سامان۔ ان ساری باتوں کے پیش نظر دوسرے پلان میں جیالوجیکل سروے اور انڈین بیورو آف مائنز کی توسیع ضروری تھی۔ تیسرے پلان میں صنعتی ترقی پر زیادہ زور تھا اس لیے معدنی ترقی اور معدنیات کی تلاش کے گہرے پروگرام کی ضرورت اور بھی شدید تھی۔ تیسرے پلان کے معدنی ترقی کے پروگرام کے لیے پبلک سکٹر میں ۴۸۰ کروڑ (اس میں دو سو (۲۰۰) کروڑ زرِ مبادلہ بھی شامل تھا) اور غیر سرکاری سکٹر میں ۶۰ کروڑ (مع ۲۰ کروڑ زرِ مبادلہ) رکھے گئے تھے۔

دوسرے اور تیسرے منصوبوں میں تیل کے وسائل اور ان کی ترقی

ہندوستان کے دوسرے پلان میں تیل کی تلاش تیز کردی گئی۔ ۱۹۵۶ء میں آئل اینڈ نیچرل گیس کمیشن قائم کیا گیا۔ اس کا مقصد ملک میں معدنی تیل کے ذخیروں کی تلاش، تیل کا نکالنا اور اسے صاف کرنا تھا۔ دوسرے پلان کے دوران تیل کے تین بڑے ذخیرے دریافت ہوئے۔ پہلا ذخیرہ کیمبے میں ستمبر ۱۹۵۸ء میں دریافت ہوا۔ دوسرا جون ۱۹۶۰ء میں انکلیشور میں اور تیسرا جنوری ۱۹۶۱ء میں رودرساگر میں۔

پٹرول سے بنی چیزوں کی مانگ برابر بڑھ رہی ہے اور تیسرے پلان کے ختم پر ۱۹۶۵ء کی ۶۲ لاکھ ۸۰ ہزار ٹن کے مقابلے میں ایک کروڑ ٹن ہوگئی تھی۔ آسام میں ڈگبوئی کے علاقے کی تھوڑی سی پیداوار کو چھوڑ کر باقی تیل دوسرے ملکوں سے درآمد کیا جاتا ہے۔ لیکن اُمید ہے کہ نہرکاٹیا اور بربرونی کے کارخانوں کی توسیع اور کویالی اور کوچین میں نئے کارخانے قائم ہوجانے کے بعد تیل کے معاملے میں ملک خودکفیل ہوجائے گا۔ کویالی کے ۲۰ لاکھ ٹن تیل صاف کرنے والے کارخانے کا سنگِ بنیاد شری جواہر لال نہرو کے ہاتھوں ۱۹۶۱ء کے وسط میں رکھا گیا۔ اس کارخانے کی تعمیر کا پہلا مرحلہ دسمبر ۱۹۶۲ء میں اور دوسرا مرحلہ جولائی ۱۹۶۵ء میں مکمل ہوا۔ آئل اینڈ نیچرل گیس کمیشن چوتھے پلان کے دوران اُمید افزا علاقوں میں تلاش اور کنووں کی کھدائی کا کام اور تیز کرے گا۔ اس پروگرام پر ۲۲۷ کروڑ روپے خرچ ہونے کا تخمینہ ہے۔ تیسرے پلان میں تیل کے لیے ۱۱۵ کروڑ رکھے گئے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ دوسرے پلان میں اس کام کے لیے ۲۶ کروڑ روپے رکھے گئے تھے۔

دوسرے پلان کے دوران حکومت نے برما آئل کمپنی کی شرکت سے آئل انڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ قائم کیا۔ اس کا مقصد اوپری آسام میں نہرکاٹیا کے میدان میں تیل نکالنا اور ۷۰۰ میل لمبی پائپ لائن بنانا تھا۔ اس خام تیل کو صاف کرنے کے لیے دو کارخانے پبلک سکٹر میں قائم کیے گئے ہیں۔ کارخانوں کی تعمیر اور پائپ لائن

ڈالنے کا کام دو مرحلوں میں کیا گیا۔ پہلے نہر کاٹیا سے کرنوں متی (گوہاٹی) تک پائپ لائن ڈالی گئی جہاں ایک کارخانہ قائم کیا گیا جس کی استعداد ۰ ۸ لاکھ ٹن ہے۔ اس کے بعد دوسرے پلان میں یہ پائپ لائن برونی تک بڑھائی گئی جہاں ۲۰ لاکھ ٹن کا ایک دوسرا کارخانہ قائم کیا گیا۔ حکومت نے نوں متی اور برونی کے تیل کی تقسیم کے لیے ایک سرکاری کمپنی قائم کی۔ نوں متی کارخانے کا افتتاح یکم جنوری ۱۹۶۲ء کو جواہرلال نہرو نے کیا اور برونی کارخانے کا افتتاح ہمایوں کبیر نے ۱۵ جنوری ۱۹۶۵ء کو کیا۔ یہ دونوں کارخانے ایک کمپنی کے تحت ہیں جس کا نام انڈین ریفائنریز لیمیٹڈ ہے۔ مارچ ۱۹۶۲ء میں ہندوستان کی خام تیل کی پہلی پائپ لائن چالو ہوگئی۔ اس پائپ لائن سے نہر کاٹیا کے تیل کے کنووں کو برونی کارخانے سے جوڑ دیا گیا۔ اس ۷۰۰ میل لمبی پائپ لائن پر ۵۰ کروڑ روپے صرف ہوئے۔

پانچ سالہ منصوبے اور جنگلاتی وسائل

جنگلاتی وسائل کی نوعیت معدنیاتی وسائل سے مختلف ہے۔ معدنیات کا ذخیرہ صرف لے سانے گھٹتا رہتا ہے، لیکن جنگلاتی وسائل دوبارہ پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دوبارہ لگانے میں ان قدرتی وسائل کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ بڑھتی ہوئی ضروریات کو پوری کرنے کے لیے جنگلات کو بڑے پیمانے پر کاٹنے کے ساتھ ساتھ دوبارہ لگاتے رہنا چاہیے تاکہ استعمال شدہ وسائل پھر سے پیدا ہوتے رہیں۔

چوں کہ جنگلاتی ترقی کے لیے لمبی مدت کا منصوبہ درکار ہے۔ اس لیے حکومت نے صوبوں کے مشورے سے قومی جنگلاتی پالیسی بنائی جس میں اور باتوں کے ساتھ ساتھ جنگلاتی ترقی کی ... کا تعین کیا گیا۔ مثلاً زمین کے امدادی اور متوازن استعمال کے لیے ایک ایسا نظام قائم ... جس میں جنگلات کو ایک مناسب مقام حاصل ہو، پہاڑی علاقوں کو نباتات سے محروم ہونے سے روکنا اور دریاؤں کے آس پاس کے علاقے سے مٹی کے بہنے کا تدارک۔ دوسری ... باتوں پر زور دیا گیا وہ یہ تھیں: عمارتی لکڑی اور دوسری جنگلاتی پیداوار کی رسد بڑھانے ... کے اقدام اور جانوروں کے چارے کے وسائل کی ترقی۔ مختصر یہ کہ قومی جنگلاتی پالیسی میں جنگلات کے تحفظ اور پیداواری پہلوؤں پر زور دیا گیا تھا اور تجویز کیا گیا تھا کہ طویل المدت مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ... زمین کا ایک تہائی حصہ جنگل کے لیے وقف رہے۔

پلان کے دوران جنگلاتی ترقی پر ۹ کروڑ روپے صرف ہوئے۔ صوبائی حکومتوں نے جنگلاتی

ترقی سے متعلق کئی اسکیموں پر عمل کیا مثلاً نئے جنگلات لگانا، جنگلات کے علاقوں میں رسل و رسائل کی سہولتیں ، ان سے متعلق انتظام کی مضبوطی اور گاؤں پر چھوٹے پیمانے پر پیڑ لگانا۔ دوسرے پلان میں اس کام کے لیے ۲۷ کروڑ روپے رکھے گئے تھے لیکن صرف ۱۹.۴۳ کروڑ خرچ ہوئے۔ تیسرے پلان میں صوبوں اور مرکزی علاقوں میں جنگلات کی ترقی کے لیے ۵۱ کروڑ رکھے گئے تھے جس میں ۶.۴۴ کروڑ کی رقم شامل تھی جو مرکزی یا مرکز کے زیر کفالت اسکیموں کے لیے تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ چوتھے پلان میں ایک جنگلاتی کمیشن مقرر کیا جائے جو ۱۹۵۲ء کی قومی پالیسی کے مطابق منصوبہ بنائے اور اس کی تعمیل کا ذمہ دار ہو۔ یہ کمیشن ہندوستان کے جنگلاتی مستقبل کے بارے میں غور کرے اور منصوبے بنائے۔ پانچ سالہ منصوبوں میں بڑی بڑی رقموں کی فراہمی کے مقابلے میں یہ زیادہ ضروری ہے۔

باب ۱۱

قومی آمدنی

قومی آمدنی کے شمار میں یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ ایک دی ہوئی مدّت میں
اتنی آمدنی کیوں ہوئی۔ اس کا مقصد صرف یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ ایک دی ہوئی مدت میں کتنی
آمدنی ہوئی اور یہ کن چیزوں پر مشتمل تھی۔ ہم قومی آمدنی کے رجحان کو تب ہی سمجھ سکتے ہیں جب ہم
کو یہ پتہ ہو کہ قومی آمدنی کتنی ہے، کن ذرائع سے حاصل ہوئی ہے اور ان ذریعوں کا مقداری رشتہ
کیا ہے۔ قومی آمدنی کے شمار میں معاشی ترقی اور بہبود کے مسائل کو بنیادی اہمیت دینی چاہیے۔
قومی آمدنی کے تخمینے سے یہ پتہ چلنا چاہیے کہ جس مدّت کے اعداد و شمار پیش نظر ہیں اُس مدّت
میں معاشی ترقی کے کیا رجحانات رہے ہیں اور ملک کی معاشی بہبود میں کیا فرق پیدا ہوا ہے۔
یہ نکتہ ہندوستان جیسے کم ترقی یافتہ ملک کے لیے زیادہ اہم ہے جس نے قومی آمدنی بڑھانے
اور معیارِ زندگی کو بہتر کرنے کے لیے ترقیاتی منصوبہ بندی کی راہ اپنائی ہے۔ ہندوستان جیسی
ترقی کی خواہش مند معیشت میں قومی آمدنی کے شمار کا طریقہ ایسا ہونا چاہیے کہ پلاننگ
کی مدّت کے دوران قومی آمدنی کے ترتیب وار اعداد و شمار معلوم ہو سکیں جن سے یہ ظاہر
ہو کہ پلان کے دوران معاشی ترقی کی کیا شرح رہی ہے۔

کچھ عام نظریے اور طریقے جو قومی آمدنی کے شمار میں فائدہ مند ہیں

اب ہم قومی آمدنی یا قومی پیداوار کے تین نظریوں سے بحث کریں گے۔ یعنی خام پیداوار، خالص
قومی آمدنی اور تکنیکی اصطلاح میں قومی آمدنی۔ یہ تینوں نظریے سب سے پہلے امریکہ کے نیشنل بیورو
آف ریسرچ نے بنائے تھے۔ چنانچہ یہ امریکہ جیسے سرمایہ دارانہ نظام پر زیادہ عائد ہوتے ہیں۔ اگر
ان نظریوں کو ہندوستان جیسے کم ترقی یافتہ ملک کی قومی آمدنی کے شمار کے لیے استعمال کرنا ہے

تو اِن میں کچھ تبدیلی کرنا ہوگی۔ اِس تبدیلی کی ضرورت اِس لیے ہے کیوں کہ اوّل تو معتبر اعداد و شمار کی سخت کمی ہے اور دوسرے ہمارا زراعتی سکٹر ایسا ہے جس میں روپے کا استعمال کم ہے، جہاں پیدا کرنے والے پیداوار کو خود استعمال کر لیتے ہیں یا جہاں لین دین تبادلے کے ذریعے بھی ہوتا ہے اور جہاں کھیتی کا پیمانہ ایسا ہے کہ بس گزر بسر ہو جاتی ہے۔

(۱) خام قومی پیداوار کو دو طریقوں سے ناپا جا سکتا ہے۔ (الف) پیداوار کی قیمت کی حیثیت سے (ب) خام آمدنی کے حصّوں کے مجموعے کی حیثیت سے۔

(الف) خام پیداوار کو اگر اُن اشیا کی بازاری قیمت کی حیثیت سے دیکھا جائے جو ایک ملک دی ہوئی مدّت میں پیدا کرتا ہے، تو یہ ذاتی صَرف، بجی خام سرمائے (داخلی اور بیرونی) اور حکومت کی خرید کی ہوئی اشیا اور خدمات کے مجموعے کے برابر ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں خام قومی پیداوار ملک کی پیداوار کی وہ بازاری قیمت ہے جس میں سرمائے کی فرسودگی منہا نہیں کی گئی ہے (ب) خام قومی پیداوار کو اس حیثیت سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ مختلف لوگوں کو خام قومی آمدنی کے جو حصّے ملتے ہیں یہ اُن تمام حصّوں کا مجموعہ ہے۔ اِس حیثیت سے خام قومی آمدنی میں جو چیزیں شامل ہیں وہ یہ ہیں: بالواسطہ کاروباری ٹیکس، سرمائے کی فرسودگی کے الاؤنس، ملازمین کی اُجرت، کرائے اور سود سے اشخاص کی آمدنی، بلا شرکت کاروبار سے منافع اور کارپوریٹ منافع (وہ منافع جو کسی جماعت کو بحیثیت فرد حاصل ہوتا ہے)

(۲) اگر ہم خام قومی پیداوار میں سے اِن پیداواری اشیا کی قیمت کو گھٹا دیں جو بدل (REPLACEMENT) کے لیے ہوتی ہیں تو قومی پیداوار نکل آتی ہے جو صَرف اور خالص سرمائے کی مجموعی قیمت کے برابر ہوتی ہے۔ اِس طرح ایک دی ہوئی مدّت میں خالص قومی پیداوار اس خام قومی پیداوار کے برابر ہوتی ہے جس میں سے سرمائے کی فرسودگی منہا کر دی گئی ہے۔

(۳) قومی آمدنی کا شمار کرنے والے جب رواں قیمت پر قومی پیداوار نکالتے ہیں تو قومی آمدنی کی قیمت میں سے بلا واسطہ ٹیکسوں کو گھٹا دیتے ہیں اور بچے ہوئے عدد کو قومی آمدنی کہتے ہیں اِس کا مطلب یہ ہے کہ تکنیکی اعتبار سے قومی آمدنی اُس خام قومی پیداوار کے برابر ہوتی ہے جس میں سے سرمائے کی فرسودگی اور بالواسطہ کاروباری ٹیکس کو منہا کر دیا گیا ہے۔ قومی آمدنی کو تکنیکی اعتبار سے یوں بھی نکالا جا سکتا ہے کہ عاملین پیداوار کی کمائی یعنی اُجرت، سود، کرائے اور منافع کو جوڑ دیا جائے۔

ہندوستان میں قومی آمدنی کے شمار کی مشکلات

ہندوستان میں قومی آمدنی کے شمار میں دو قسم کے مسائل پیش آتے ہیں ایک تصوراتی اور دوسرا شماریاتی۔
(الف) تصوراتی مشکلات :۔ بیشتر تصوراتی مشکلات ہندوستانی معیشت کی کم ترقی یافتہ ماہیت کی وجہ سے پیش آتی ہیں۔

(۱) قومی آمدنی کے شمار کی سب سے بڑی مصیبت ہندوستانی معیشت کا وہ بڑا حلقہ ہے جو غیر منظم ہے اور جہاں سکّے کا استعمال کم ہے۔ قومی آمدنی کا شمار اس مفروضے پر کیا جاتا ہے کہ معیشت میں سکّہ رائج ہے جس کے ذریعے اشیا اور خدمات کا تبادلہ ہوتا ہے۔ جہاں تک ہندوستانی معیشت کے چھوٹے سے سرمایہ دار حلقے کا سوال ہے اس میں ترقی یافتہ سکّہ جاتی معیشت کی ساری خصوصیات موجود ہیں۔ چنانچہ قومی آمدنی کے شمار میں ان کی وجہ سے کوئی دقت نہیں ہوتی۔ یہی وہ حلقہ ہے جس میں منظم صنعتیں ہیں جن کو اگر ٹھیک سے ترقی دی جائے تو ان سے معاشی سرپلس بڑی مقدار میں پیدا ہوتا ہے۔ اس سرپلس کو معاشی ترقی اور قومی آمدنی میں مزید اضافے کے لیے دوبارہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہندوستانی معیشت کا جدید سرمایہ دار حلقہ جس میں ترقی کے امکانات ہیں۔ قومی آمدنی اور ترقی کے رجحانات دونوں کو براہِ راست ظاہر کرتا ہے۔ لیکن ہندوستانی معیشت کا بڑا غیر منظم اور زراعتی حلقہ قومی آمدنی کے شمار کو پیچیدہ اور گنجلک بنا دیتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اس بڑے غیر منظم حلقے میں ایک بے سکّے کی معیشت کی بنیادی خصوصیات نمایاں ہیں جہاں پیداوار کا بڑا حصّہ بازار میں آتا ہی نہیں اور جسے پیدا کرنے والے یا تو خود استعمال کر لیتے ہیں یا اس کے بدلے دوسری اشیا اور خدمات حاصل کر لیتے ہیں۔ دوسری مصیبت یہ ہے کہ اس حلقے میں کھیتی گزر بسر والے پیمانے پر ہوتی ہے۔ غرض کہ اس نیم جامد بڑے حلقے کی وجہ سے نہ صرف آمدنی کا تخمینہ ایک مشکل مسئلہ بن جاتا ہے بلکہ اس حلقے میں ادارہ جاتی تبدیلیاں نہ ہونے کی وجہ سے اس میں ترقی کی صلاحیت بھی بہت کم ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معتبر اعداد و شمار نہ ہونے کی وجہ سے غریب زراعتی حلقے کی پیداوار کی نہ صرف قیمت نکالنا مشکل ہے بلکہ اس کی وجہ سے طرح طرح کے اور مشکل سوالات اُٹھتے ہیں۔ خصوصاً جب کہ ہمارا مقصد قومی ترقی کا ایک ایسا تصور قائم کرنا ہے جو ترقی کے نقطۂ نظر سے سب کے لیے موزوں ہو۔ اس سلسلے میں یاد رکھنا چاہیے کہ گزر بسر والی کھیتی کی تعریف ہی یہ ہے کہ یہ فاضل پیداوار نہیں کر پاتی جس کی وجہ سے ترقیاتی سرگرمیوں کے امکانات بہت محدود ہو جاتے

ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایک ترقی پزیر معیشت کی مائل بہ ترقی قومی آمدنی کے تخمینے میں اس غریب سکٹر کی اہمیت بہت کم ہوتی ہے۔

(ii) دوسری دقت یہ ہے کہ پیدا کرنے والے خود اپنی پیداوار کی صحیح مقدار اور اس کی قیمت یقین کے ساتھ نہیں جانتے۔ مغربی ملکوں میں حسابات رکھنے کا عام دستور ہے اور معاشی اعداد و شمار بہ آسانی افراد اور کاروباری اداروں سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے قومی آمدنی ناپنے کے مغربی طریقے استعمال کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ ہندوستانی معیشت کا بڑا غیر منظم حصّہ ناخواندہ لوگوں پر مشتمل ہے جو اپنی پیداوار کی خام قیمت بھی نہیں جانتا۔ غرض کہ اِن خود روزگار کسانوں (SELF-EMPLOYED) چھوٹی پیداوار کرنے والوں اور گھریلو کاروبار کرنے والوں کی پیداوار کا اندازہ زیادہ تر قیاسی ہے۔

(iii) معاشی پیشوں میں نمایاں تفریق نہ ہونے کی وجہ سے بھی قومی آمدنی کے شمار میں بڑی دقتیں پیش آتی ہیں۔ زمین پر آبادی کے دباؤ کی وجہ سے اور پورے سال کام نہ ہونے کی وجہ سے کسانوں کو دوسرے کام کرنے پڑتے ہیں۔ بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ زراعت کے ساتھ گھریلو صنعتوں، پولٹری اور ڈیری کے بھی کام ہوتے ہیں۔ اِس کے علاوہ کسانوں کی بہت تعداد سال کے خالی زمانے میں شہروں کو چلی جاتی ہے جہاں کارخانوں میں مزدوری یا نجی ملازمت کرتی ہے۔ پیشوں کی اِس بے ترتیبی کی وجہ سے لوگوں کی پیشہ ورانہ درجہ بندی بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ پیشہ ورانہ درجہ بندی سے قومی آمدنی کے شمار میں سہولت ہوتی ہے کیوں کہ ایک صنعت کے مختلف کاموں میں جتنے آدمی لگے ہوتے ہیں ان کی آمدنی کا پتہ چلانا آسان ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں شمار کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے کیوں کہ غیر منظم زراعتی سکٹر کے لوگوں کی پیشہ ورانہ ترتیب تقریباً ناممکن ہے۔

(ب) شماریاتی مشکلات: مذکرہ بالا تصوراتی مشکلات کے علاوہ اِس سے زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ آمدنی کے تخمینے کے لیے اعداد و شمار نا پید ہیں۔

(i) زراعتی پیداوار کا خام حجم، کارخانوں کی سرگرمیاں، سرکاری آمد و خرچ، برسرِکار آبادی اور بین الاقوامی توازنِ ادائیگی میں درآمد اور برآمد کی مدّات، اِن سب سے متعلق اعداد و شمار نامکمل اور محدود ہیں۔

(ii) اعداد و شمار کی فراہمی میں تسلسل بھی نہیں ہے۔ ایگری کلچرل لیبر انکوائری کمیٹی کی تمام کوششوں کے باوجود زراعت اور متعلقہ سرگرمیوں کے بارے میں شماریاتی اطلاعات کم ملتی ہیں۔ زراعت سے متعلق آبادی کے صَرفی اخراجات (CONSUMPTION EXPENDI-TURE) اور بچت سے متعلق حالیہ مکمل اعداد و

شمار کی شدید کمی ہے۔

(iii) ہندوستان کے برصغیر میں علاقائی تنوع اتنا وسیع ہے کہ ایک علاقے کے اعداد و شمار سے دوسرے علاقے کے اعداد و شمار کی کمی نہیں پوری کی جا سکتی۔

(iv) جو اعداد و شمار ہیں بھی وہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے بارے میں مشترکہ معلومات فراہم کرتے ہیں۔ آزادی سے پہلے کے اعداد و شمار میں رد و بدل کرنا پڑتا ہے اور اس کے بعد ہی انھیں موجودہ ہندوستان کے تخمینوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں قومی آمدنی کی پیمائش (نیشنل انکم کمیٹی کی رپورٹ کے خاص حوالے سے)

(الف) پیمائش کا طریقہ : حکومتِ ہند نے پی۔ سی۔ مہالنوبس کی زیرِ صدارت جو نیشنل انکم کمیٹی اگست ۱۹۴۹ء میں بنائی تھی، اس نے فروری ۱۹۵۴ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس کمیٹی نے ضروری اعداد و شمار کی کمی پیشِ نظر ہندوستان کی قومی آمدنی کی پیمائش کے لیے دو طریقوں کو ملا دیا، یعنی پیداوار کے شمار کا طریقہ اور آمدنی کے شمار کا طریقہ۔

(i) پیداواری طریقہ یہ معلوم کرتا ہے کہ ایک دی ہوئی مدت میں خالص پیداوار کتنی ہوئی یا پیدائش کے شعبوں میں کتنی خالص قدر کا اضافہ ہوا۔ دوسرے الفاظ میں، اس طریقے کے ذریعے ہمیں وہ خالص پیداوار معلوم ہوتی ہے جو اُس خام پیداوار کے برابر ہوتی ہے جس میں سے درمیانی پیداوار اور سرمائے کی فرسودگی منہا کر دی گئی ہے۔ خام پیداوار سے مراد وہ اشیا ہیں جو فروخت کی گئیں، جو خود استعمال کی گئیں اور جو اسٹاک میں موجود ہیں۔ ہر صنعت کی خالص پیداوار معلوم کی جا سکتی ہے۔ تمام صنعتوں کی پیداوار کو اگر جوڑ دیا جائے تو خالص داخلی پیداوار نکل آئے گی۔ خالص داخلی پیداوار میں بیرونی خالص آمدنی جوڑ دینے سے قومی آمدنی ظاہر ہوتی ہے۔ زراعت، جنگلات، مویشیوں کی پرورش، شکار، ماہی گیری، کان کنی اور صنعت کی سرگرمیوں سے قدر میں جو اضافہ ہوتا ہے اُس کی پیمائش کے لیے نیشنل انکم کمیٹی نے پیداواری طریقہ استعمال کیا ہے۔

(ii) آمدنی کے ذریعے قومی آمدنی جاننے کا طریقہ یہ ہے کہ ساری آمدنیوں اور اُن ادائگیوں کو جوڑ دیا جائے جو عاملین پیداوار کو دی جاتی ہیں۔ اس طریقے کے تحت اُن تمام باشندوں کی خالص آمدنی جوڑ دیتے ہیں جو معمولاً ملک میں رہتے ہیں۔ تجارت، نقل و حمل، پبلک انتظام، پیشہ ورانہ اور عام فنون اور گھریلو خدمات سے پیدا ہونے والی خالص آمدنی کو جوڑنے کے لیے نیشنل انکم کمیٹی نے قومی

آمدنی کا طریقہ استعمال کیا۔

(ب) ہندوستان میں قومی آمدنی کے تخمینے: نیشنل انکم کمیٹی کی رپورٹ سے پہلے بھی معاشیین اور سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے ہندوستان کی قومی آمدنی کے تخمینے کی بہادرانہ کوشش کی۔ اس کے پیش رو دادا بھائی نوروجی تھے جنھوں نے بہت موٹے طریقے پر یہ تخمینہ لگایا کہ ۱۸۶۸ء میں ہندوستان کی فی کس آمدنی ۲۰ روپے تھی۔ ۱۹۱۱ء میں فنڈلے شیراز نے ۴۹ روپے تخمینہ کیا۔ سائنٹفک ڈھنگ سے بھی کوشش ڈی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ نے کی۔ اُنھوں نے تخمینہ لگایا کہ ہندوستان کی فی کس آمدنی ۱۹۳۱-۳۲ء میں ۶۵ روپے اور ۱۹۴۲-۴۳ء میں ۱۱۴ روپے تھی۔ ایسٹرن اکانومسٹ کے تخمینے کے مطابق قومی آمدنی ۱۹۴۸-۴۹ء میں ۲۱۴ روپے تھی (یہ تخمینہ انڈین یونین کے صوبوں کا تھا) دوسری طرف وزارتِ تجارت نے تخمینہ لگایا کہ ۱۹۴۷-۴۸ء میں فی کس آمدنی ۲۷۲ روپے تھی۔

نیشنل انکم کمیٹی میں پروفیسر مہالنوبس، پروفیسر گیڈگل اور ڈاکٹر راؤ شامل تھے۔ اس کمیٹی نے نیشنل انکم یونٹ کے تعاون اور پروفیسر سائمن کزنٹز جیسے غیر ملکی ماہروں کی مدد سے پہلی بار ۱۹۴۸-۴۹ء کی قومی آمدنی کا معتبر تخمینہ فراہم کیا۔ کمیٹی کی پہلی رپورٹ اپریل ۱۹۵۱ء میں پیش ہوئی جس میں ۱۹۴۸-۴۹ء کی قومی آمدنی کا تخمینہ تھا۔ آخری رپورٹ فروری ۱۹۵۴ء میں پیش کی گئی۔ اس میں ۱۹۴۸-۴۹ء کے نظر ثانی شدہ تخمینے کے ساتھ ۱۹۴۹-۵۰ء اور ۱۹۵۰-۵۱ء کے بھی تخمینے تھے۔ اس کے بعد کے تخمینے مرکزی شماریاتی ادارے کے سالانہ مقالوں میں ملتے ہیں۔

ہندوستان کی قومی آمدنی (۱۹۴۸-۴۹ء کی قیمتوں کے مطابق) کی سال بہ سال صورت یہ تھی: ۱۹۴۸-۴۹ء میں ۸۶۵۰ کروڑ، ۱۹۴۹-۵۰ء میں ۸۸۲۰ کروڑ، ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۸۸۵۰ کروڑ، ۱۹۵۱-۵۲ء میں ۹۱۰۰ کروڑ، ۱۹۵۲-۵۳ء میں ۹۴۶۰ کروڑ، ۱۹۵۳-۵۴ء میں ۱۰۰۳۰ کروڑ، ۱۹۵۴-۵۵ء میں ۱۰۲۸۰ کروڑ، ۱۹۵۵-۵۶ء میں ۱۰۴۸۰ کروڑ، ۱۹۵۶-۵۷ء میں ۱۱۰۰۰ کروڑ، ۱۹۵۷-۵۸ء میں ۱۰۸۹۰ کروڑ، ۱۹۵۸-۵۹ء میں ۱۱۶۵۰ کروڑ، ۱۹۵۹-۶۰ء میں ۱۱۸۶۰ کروڑ اور ۱۹۶۰-۶۱ء میں ۱۲۷۳۰ کروڑ۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ۱۹۶۰-۶۱ء میں ہماری قومی آمدنی ۱۹۶۰-۶۱ء کی قیمتوں کے مطابق ۱۴۳۴۳ کروڑ تھی اور فی کس آمدنی ۱۹۶۰-۶۱ء میں اس وقت کی قیمتوں کے مطابق ۳۰۹ روپے تھی۔ پہلے پلان کے دوران فی کس آمدنی (۱۹۴۸-۴۹ء کی قیمتوں کے مطابق) ۲۵۰.۳ سے بڑھ کر ۲۶۷.۸ ہو گئی۔ یعنی ٪۷.۳ کا اضافہ ہوا۔ دوسرے پلان کے پانچ برسوں میں فی کس آمدنی (۱۹۴۸-۴۹ء کی قیمتوں پر) یوں تھی: ۱۹۵۶-۵۷ء میں ۲۷۵.۴، ۱۹۵۷-۵۸ء میں ۲۶۷.۳، ۱۹۵۸-۵۹ء میں ۲۸۰.۱، ۱۹۵۹-۶۰ء میں ۲۷۹.۲، ۱۹۶۰-۶۱ء میں ۲۹۳.۴۔ مندرجہ بالا اعداد و شمار دوسرے پلان کے دوران قومی آمدنی میں ٪۱۹.۶۹ کا اضافہ ظاہر

کرتے ہیں جب کہ پہلے پلان کے دوران اضافہ ۱۸.۴٪ تھا۔ اسی کے مطابق دونوں مدتوں میں فی کس آمدنی ۳.۷٪، اور ۲.۰۴٪ بڑھی۔ ۶۵-۱۹۶۴ء میں خالص قومی پیداوار (قومی آمدنی) کا تخمینہ (۶۱-۱۹۶۰ء کی مستقل قیمتوں کے مطابق) ۱۵۱۱۹ کروڑ تھا جو پچھلے یعنی ۶۴-۱۹۶۳ء کی ۱۶۱۷۶ کروڑ کے مقابلے میں ۶.۵٪ کم تھی۔ اس سے پہلے تیسرے پلان کے پہلے چار برسوں میں ۳.۴٪، ۲.۰۱٪، ۲.۵۱٪ اور ۷.۶٪ کا ریکارڈ اضافہ ہوا تھا۔ اس طرح خالص قومی پیداوار جو ۶۱-۱۹۶۰ء میں ۱۳۲۴۳ کروڑ تھی۔ تیسرے پلان کے دوران ۶.۸٪ بڑھی۔ پلان کے ابتدائی چار برسوں کے ۵.۴٪ کے مقابلے میں، تیسرے پلان کے دوران قومی آمدنی میں اضافے کی شرح ۲.۶٪ آتی ہے۔ ۶۶-۱۹۶۵ء میں قومی آمدنی کی تخفیف کی بنیادی وجہ زراعتی حلقے کی پیداوار میں ۱۳.۶٪ کی کمی تھی (زراعتی حلقے میں زراعت، جنگلات اور ماہی گیری شامل ہیں)۔ زراعتی پیداوار میں بڑے پیمانے پر تخفیف کی وجہ سے غیر زراعتی حلقے کی خالص پیداوار میں بھی نسبتاً کم اضافہ ہوا۔ فی کس آمدنی (۶۱-۱۹۶۰ء کی قیمتوں کے مطابق) ۶۱-۱۹۶۰ء کی ۳۰۹ روپیوں سے بڑھ کر ۶۵-۱۹۶۴ء میں ۳۲۳.۸ ہو گئی جس کا مطلب یہ ہے کہ ۴.۸٪ کا اضافہ ہوا۔ لیکن ۶۶-۱۹۶۵ء میں قومی آمدنی پھر ۸٪ گھٹ کر ۳۰۸.۶ روپے ہو گئی۔

۶۷-۱۹۶۶ء کے ابتدائی تخمینے کے مطابق (۶۱-۱۹۶۰ء کی قیمتوں کے مطابق) قومی آمدنی ۱۵۲۷۲ کروڑ تھی۔ یہ پچھلے سال کے ابتدائی تخمینے ۱۵۱۱۹ کروڑ سے ۱٪ زیادہ تھی۔ ۶۷-۱۹۶۶ء کا فوری تخمینہ ۱۶۶۶۵ کروڑ تھا جو پچھلے سال کے تخمینے سے ۹.۱۱٪ زیادہ ہے۔ اس اضافے کی خاص وجہ یہ تھی کہ پچھلے دو برسوں کے بعد زراعتی حالت کچھ سنبھلی تھی۔ ۶۷-۱۹۶۶ء میں زراعت سے آمدنی ۳.۰٪ بڑھی جبکہ دوسرے حلقوں میں معمولی اضافہ ہوا۔

۶۷-۱۹۶۶ء میں فی کس آمدنی (۶۱-۱۹۶۰ء کی قیمتوں پر) ۱.۴٪ گھٹ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ فی کس آمدنی ۶۶-۱۹۶۵ء میں ۳۰۴.۹۹ روپے تھی۔ ۶۷-۱۹۶۶ء میں فی کس آمدنی ۳۴۲.۱ روپے تھی۔ یعنی پچھلے سال کے مقابلے میں ۱۲.۳٪ زیادہ۔ یاد رکھنا چاہیے کہ فی کس آمدنی ۶۱-۱۹۶۰ء اور ۶۶-۱۹۶۵ء میں یکساں تھی یعنی ۳۳۱ روپے۔ لیکن رواں قیمتوں کے مطابق فی کس آمدنی میں ۶۱-۱۹۶۰ء اور ۶۵-۱۹۶۴ء کے دوران ۵۰٪ کا اضافہ ہوا یعنی ۳۳۶.۷ روپے سے بڑھ کر ۵۰۴.۳ روپے ہو گئی۔

یاد رہے کہ دوسرے پلان میں خیال تھا کہ قومی آمدنی ۲۵٪ بڑھے گی لیکن واقعی اضافہ تقریباً ۲۰٪ ہوا۔ ہماری آبادی اب بھی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے

مطابق دوسرے پلان کے دوران آبادی کے اضافے کی شرح ۲٫۱۰٪ تھی جب کہ پلاننگ کمیشن نے صرف ۱٫۲٪ کا اضافہ فرض کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے بعد حکومت کو دوسری نیشنل انکم کمیٹی مقرر کرنی چاہیے تھی جو قومی آمدنی کے اس تخمینے کا جائزہ لیتی جو پہلی کمیٹی کی سفارشات کی بنیاد پر کیا گیا تھا اور جو قومی آمدنی کے شمار کے طریقے کو نیا رُخ دیتی۔ ہماری جیسی تیز ترقی کرتی ہوئی معیشت کے لیے قومی آمدنی کا ایک ترقی پسند تخمینہ زیادہ مفید ہے۔

نیشنل انکم ٹیکس کمیٹی کی اہم سفارشات

مرکزی شماریاتی ادارے نے ہندوستان کی فی کس آمدنی ۱۹۶۲-۶۳ء کے لیے ۳۱۷ روپے نکالی تھی (۱۹۴۸-۴۹ء کی قیمتوں پر)۔ اس آمدنی کو اگر ڈالر میں تبدیل کیا جائے (جون ۱۹۶۶ء میں روپے کی قیمت کی کمی سے پہلے)، تو ۶۶٫۶۸ ڈالر بنتی ہے۔ ہماری یہ فی کس آمدنی امریکہ کی ۲۳۴۵٫۱۴، کناڈا کی ۸۷۰ اور عراق کی ۸۵٫۵ ڈالر فی کس آمدنی کے مقابلے میں کتنی حقیر ہے۔ ۱۹۴۸-۴۹ء کے لیے نیشنل انکم کمیٹی نے فی کس آمدنی کا تخمینہ ۲۴۶٫۹ روپے لگایا ہے۔ اتنی کم فی کس آمدنی کی وجہ یہ ہے کہ ہماری آبادی کا بڑا حصہ زراعت کے حلقے میں ہے اور مشکل سے گزارا کر پاتا ہے۔ بہ ہر حال ہماری معیشت کے چھوٹے سے سرمایہ دار سکٹر کی فی کس آمدنی نسبتاً اونچی ہے۔

(ii) نیشنل انکم کمیٹی کی آخری رپورٹ (۱۹۵۲ء) سے ظاہر ہوتا ہے کہ رواں قیمتوں کے مطابق ہندوستان کی قومی آمدنی ۱۹۴۸-۴۹ء کی ۸۶۵۰ کروڑ سے بڑھ کر ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۹۵۳۰ کروڑ ہوگئی تھی۔ اس طرح تین برسوں میں قومی آمدنی نقد کی شکل میں ۸۸۰ کروڑ کے بقدر بڑھی یعنی تین برسوں میں ۱۰٫۱۵٪ کا اضافہ ہوا۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس کے پسِ پردہ چڑھتی ہوئی قیمتیں کام کر رہی تھیں۔ مذکرہ بالا تین برسوں میں تھوک کی قیمتیں (۱۹۳۹ = ۱۰۰) ۱۹۴۸-۴۹ء کی ۳۷۶٫۶۲ کے مقابلے میں ۱۹۵۰-۵۱ء میں بڑھ کر ۴۰۹٫۶۷ ہوگئیں۔ یعنی تھوک کی قیمتوں میں ۸٫۴۹٪ کا اضافہ ہوا۔ اس لیے ۱۹۴۸-۴۹ء اور ۱۹۵۰-۵۱ء کے دوران قومی آمدنی میں اصل اضافہ صرف ۱٫۲۵٪ تھا۔ (۱۰٫۱۵ - ۸٫۹۰)۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دوسرے پلان کے دوران اصل قومی آمدنی اور فی کس آمدنی میں ۲۰٫۴۴٪ اور ۸٫۶۲٪ کا اضافہ ہوا۔

(iii) ملک کے مختلف پیشوں کا قومی پیداوار میں جو تناسب ہے اُس سے بھی ہندوستانی معیشت کی ناہمواری صاف ظاہر ہوتی ہے۔ نیشنل انکم کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق زراعت

(مع مویشیوں کی پرورش) ہماری مجموعی قومی آمدنی کا نصف حصّہ ہے۔ تجارت، نقل وحمل اور رسل ورسائل کا حصّہ ۱۸٪ ہے اور صنعت وحرفت، دست کاری اور کان کنی کا حصّہ ۱۷٪۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ۱۹۴۹ء کے اعداد وشمار کے مطابق برطانیہ کی قومی آمدنی کا ۳۵٪ حصہ صنعتوں سے حاصل ہوتا تھا۔ ہندوستان کی قومی آمدنی کی صنعت وار تقسیم سے ہندوستانی معیشت کا عدم توازن ظاہر ہوتا ہے اور یہ بات واضح ہوتی ہے کہ متوازن ترقی کے ذریعے قومی آمدنی کی توسیع کے لیے ترقیاتی منصوبہ بندی کی شدید ضرورت ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ہماری حکومت نے بہت جلد حالات کی نزاکت کو محسوس کرلیا اور معیشت کی ترقی اور معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لیے پانچ سالہ منصوبے شروع کیے۔

(iv) زراعت اور تجارت کے بعد قومی آمدنی کی تخلیق میں دوسرا اہم حصہ چھوٹے صنعتی کاروبار کا ہے۔ اس حلقے کی آمدنی کا تخمینہ بڑا پیچیدہ ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کی پیداوار غیر منظم ہے اور یہ کاروبار اِدھر اُدھر بکھرا ہوا ہے (خصوصاً گھریلو قسم کا ہونے کی وجہ سے)۔ تاہم نیشنل انکم کمیٹی اپنی آخری رپورٹ میں اس نتیجے پر پہنچی کہ ۱۹۵۱ء میں ملک کی مجموعی پیداوار میں چھوٹے صنعتی کاروبار کا حصہ ۵ء۹ اور بڑے کاروبار کا حصّہ ۶ء۱۰٪ تھا۔ اِس سے ظاہر ہے کہ چھوٹے صنعتی کاروبار جن کا حصّہ بڑے صنعتی کاروبار کا ڈیڑھ گنا ہے، ملک کی معیشت میں نمایاں رول ادا کرتے ہیں۔ ہندوستان کے پانچ سالہ منصوبوں میں ان کے رول کی اہمیت کا پورا خیال رکھا گیا ہے اور اسی لیے چھوٹے کاروبار کی توسیع اور ترقی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

(v) نیشنل انکم کمیٹی کے ۱۹۴۸ء سے لے کر ۱۹۵۱ء تک کے تخمینوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ قومی پیداوار میں زراعت کا حصّہ صنعت وتجارت، نقل وحمل اور رسل ورسائل کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے بڑھا ہے۔ اُس زمانے میں کوریا کی لڑائی کی وجہ سے اناج اور نقد فصلوں کی قیمتیں بڑھیں۔ قیمتیں بڑھنے کی وجہ سے کسانوں کو پیداوار بڑھانے کی ترغیب ہوئی، اور نتیجے کے طور پر قومی پیداوار میں زراعت کا حصّہ اور بڑھا۔

(vi) نیشنل انکم کمیٹی کی پہلی رپورٹ سے ظاہر ہے کہ ہماری قومی آمدنی کا نصف سے کچھ زیادہ حصّہ کھانے کی چیزوں پر صرف ہوتا ہے۔ نیشنل سامپل سروے کی ۱۹۵۵ء کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری معیشت کے دیہی حلقے کے مجموعی صرف میں سے کھانے پر دو تہائی اور کپڑے پر ۱۰٪ خرچ ہوتا ہے۔ اس طرح ہماری قومی آمدنی کا بڑا حصّہ کھانے اور کپڑے کی نذر ہوجاتا ہے۔ چنانچہ افراطِ زر پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ ایک ترقی پذیر معیشت میں کھانے اور پہننے کی چیزوں کی رسد میں کافی لچک ہو۔

قومی آمدنی اور تناظری منصوبہ بندی
(PERSPECTIVE PLANNING)

منصوبہ بندی ایک مسلسل کام ہے اور اگر منصوبہ بنانے والے چاہتے ہیں کہ ان کے منصوبے کا اثر بعد کے ترقیاتی عمل پر بھی پڑے تو انھیں فوری ضروریات سے آگے دیکھنا پڑتا ہے۔ پہلا اور دوسرا منصوبہ تیار کرتے وقت پلاننگ کمیشن کو اس اہمیت کا پورا احساس تھا اور اس نے ترقی کا ایک لمبی مدت کا نظریہ ذہن میں رکھ کر منصوبہ بندی کی فوری ضروریات سے آگے سوچا تاکہ اندازہ ہو سکے کہ مستقبل کی ترقی پر منصوبے کے کیا ممکن اثرات ہو سکتے ہیں۔ قومی آمدنی کی توسیع کے لیے تناظری منصوبہ بندی کا مقصد پیداواری صلاحیت کے اس اضافے کی شرح کا حساب لگانا تھا جو ترقی پذیر معیشت میں نیا سرمایہ لگنے کی وجہ سے واقع ہو رہا تھا۔

موجودہ رجحانات کا مطالعہ کر کے اور یہ اندازہ کر کے کہ مستقبل میں ان رجحانات میں کیا تبدیلیاں رونما ہو سکتی ہیں، کمیشن نے ایسے اوقاتی نقشے (TIME SERIES TABLES) تیار کیے جن سے ہندوستان کی قومی آمدنی کی سال بہ سال تبدیلی ظاہر ہو۔

پہلے اور دوسرے پلان کی رپورٹ سے پچیس[۲۵] برس کے دوران قومی آمدنی کے رجحانات ظاہر ہوتے ہیں۔ مستقبل کی ایک ذہنی تصویر کی مدد سے یہ دکھلایا گیا ہے کہ مفروضوں کے مطابق کوشش اگر مسلسل جاری رہے تو ۱۹۶۷-۶۸ء تک دوگنی ہو جائے گی[۱] لیکن فی کس آمدنی دوگنی کرنے کے لیے ہمیں ۱۹۷۳-۷۴ء تک انتظار کرنا پڑے گا۔

پہلے پلان میں قومی آمدنی میں ۱۲٪ کے اضافے کی توقع کی گئی تھی۔ اس پلان کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اضافہ توقع سے زیادہ ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلے پلان کے دوران قومی آمدنی ۱۸٪ بڑھی اور ۱۹۴۸-۴۹ء کی قیمتوں کے مطابق ۱۰۸۰۰ کروڑ تھی۔ دوسرے پلان میں ۲۵٪ اضافے کی توقع کی گئی لیکن واقعی اضافہ صرف ۲۰٪ ہوا۔ ۱۹۶۰-۶۱ء میں صنعتی اور زراعتی پیداوار کی قیمتیں کافی بڑھ جانے کی وجہ سے دوسرے پلان کے ختم پر قومی آمدنی ۱۹۴۸-۴۹ء کی قیمتوں کے مطابق ۱۲۷۳۰ کروڑ تھی۔ تیسرے پلان میں قومی آمدنی میں نسبتاً معمولی اضافے کی توقع کی گئی۔ امید تھی کہ تیسرے پلان میں تقریباً ۵٪ کا اضافہ ہوگا لیکن اب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ واقعی اضافہ اس کا نصف رہا۔

اس سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ اب (یعنی جون ۱۹۶۶ء) پلاننگ اپنے

اپنے تناظری منصوبہ بندی کے شعبے کی اُن تجاویز پر غور کر رہا ہے جن کے مطابق ۱۹۷۵ء تک ۶٪ معاشی ترقی یعنی ۴۰ روپے ماہانہ فی کس آمدنی کی اُمید ہے۔ اگر ۱۹۸۵ء تک ۴۰ روپے ماہانہ کی فی کس آمدنی یقینی کرنی ہے تو ۳۰،۰۰۰ کروڑ تک پہنچنے کے لیے قومی آمدنی دوگنی کرنی پڑے گی۔ معاشی ترقی کے ۶٪ اضافے کی شرح سے ۱۹۷۵ء تک قومی آمدنی ۲۵،۰۰۰ کروڑ اور ۱۹۸۰ء تک ۳۵،۰۰۰ کروڑ ہوگی۔ اِن برسوں میں آبادی کا تخمینہ ۵۵ کروڑ ۵۰ لاکھ اور ۶۲ کروڑ ہے۔

ہماری جیسی ترقی پذیر معیشت میں صرف ان رجحانات پر توجہ کرنا کافی نہیں ہے جو قومی آمدنی اور فی کس آمدنی میں ترقی ظاہر کرتے ہیں، ہم کو آمدنی اور دولت کی اصولی تقسیم اور معاشی قوت کے مجتمع ہونے کے اُن رجحانات کو بھی دیکھنا چاہیے جو منصوبہ بندی کی وجہ سے تیزی سے بدل رہے ہیں۔ اسی لیے اکتوبر ۱۹۶۰ء میں پلاننگ کمیشن نے پروفیسر مہالنوبس کمیٹی بنائی تاکہ یہ اُن تبدیلیوں کا جائزہ لے جو منصوبہ بندی کے پہلے کے دس برسوں میں معیارِ زندگی کی سطح میں واقع ہوئی تھیں اور آمدنی اور دولت کی تقسیم کے جدید رجحانات کا مطالعہ کرے۔ مہالنوبس کمیٹی کی رپورٹ کا پہلا حصّہ فروری ۱۹۶۴ء میں پیش ہوا۔ اِس رپورٹ کی خاص باتیں اور اُن کے بارے میں ہماری رائے درج ذیل ہے۔

کمیٹی کی تحقیق کا جائزہ:

۱۔ آینگر اور مکرجی نے ایک مقالہ تیار کیا تھا، جس کو کمیٹی نے استعمال کیا، جس میں نیشنل سامپل سروے اور ریزرو بینک کے اعداد و شمار کی بنیاد پر ۱۹۵۲-۵۳ء کے دوران کنبوں کی بڑائی چھوٹائی کے لحاظ سے تقسیم اور اُن کی آمدنی کے رجحانات معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دکھلایا گیا ہے کہ سب سے اوپر کے ۱۰٪ اور سب سے نیچے کے ۲۰٪ کنبوں نے قومی آمدنی میں اپنا حصّہ بڑھایا جس کا یہ مطلب ہے کہ متوسط طبقے کی حالت نسبتاً خراب ہوئی۔

۲۔ انکم ٹیکس کے اعداد و شمار کے تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہ حیثیت گروپ ٹھیکے داروں کی حالت ۱۹۵۵-۵۹ء کے دوران بہت بہتر ہوئی۔ اِس گروپ کی آمدنی ملک کے فی بارروزگار آدمی کی آمدنی کے مقابلے میں بہت بڑھی۔ جو لوگ خود اپنے کاروبار میں لگے ہیں (صنعت، تجارت، نقل و حمل اور مالی کاروبار) انھوں نے اور تنخواہ پانے والے طبقے نے بھی (جو ٹیکس ادا کرتا ہے) اپنی آمدنی بڑھائی۔ لیکن ان کی آمدنی کے اضافے کی شرح بہ مشکل ملک کے فی بارروزگار آدمی کی آمدنی کے اضافے کی شرح کے برابر رہی۔ تعجب ہے کہ پیشہ ور لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ملک کی فی کس قومی آمدنی کے اضافے سے بہت کم رہا۔ صاحب جائداد لوگوں کی بھی آمدنی گھٹی۔ اِس سب سے شاید یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ٹیکس کی

عدم ادائیگی کا حلقہ کافی وسیع اور متنوع ہے۔

۳۔ حصصی منافعے (SHARE DIVIDE-NDS) پر انکم ٹیکس کے اعداد و شمار سے حیرت انگیز انکشاف یہ ہوتا ہے کہ سب سے اوپر کے ۵٪ کنبوں کو جب منافع کی آمدنی کے لحاظ سے ترتیب دیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اُن کی ذاتی دولت کا ۵۰٪ حصہ شیئرز کی شکل میں ہے۔ ۵۵-۱۹۵۴ء میں تمام انکم ٹیکس ادا کرنے والے کنبوں کی شیئرز کے منافع سے آمدنی کا ۵۵٪ حصہ اوپر کے دس فی صدی کنبوں کے حصے میں آتا تھا جب کہ نچلے دس فی صدی کا حصہ صرف ۲٪ تھا۔ ۶۰-۱۹۵۹ء میں اوپر کے ۱۰٪ اور نیچے کے ۱۰٪ کے حصے ۵۲٪ اور ۲۵٪ تھے۔ چوں کہ ہندوستان میں ٹیکس نہ ادا کرنے کی وبا عام ہے اِس لیے اِن تخمینوں کو کم تصور کرنا چاہیے۔ اِس لیے یہ بات ظاہر ہے کہ جہاں تک شیئرز اور اسٹاک کی ملکیت کا سوال ہے، معاشی قوت کے اجتماع میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا ہے۔

۴۔ شہری زمینوں کی ملکیت بھی بہت واضح طور سے اجتماع کی طرف مائل ہے۔ ۵۴-۱۹۵۳ء میں اوپری ۵٪ شہری کنبوں کے پاس کنبوں کی مجموعی زمین کا ۲۵٪ حصہ تھا۔ اگر اُس زمین کو بھی اُس میں شامل کرلیا جائے جو ان کے عمل درآمد میں تھی تو ان کے زیرِ اثر زمین ۵۷٪ ہوجاتی ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اوپر کے ۲۰٪ شہری کنبے ۹۳٪ زمین کے مالک تھے اور عملاً ساری زمین اُن کے عمل درآمد میں تھی۔ نچلے ۲۰٪ کے پاس نہ کوئی اپنی زمین تھی اور نہ کوئی زمین اُن کے عمل درآمد میں تھی۔

۵۔ چنانچہ کمیٹی اِس نتیجے پر پہنچی کہ دس برس کی منصوبہ بندی کے بعد بھی اور اونچی آمدنی والوں پر بھاری ٹیکسوں کے باوجود شہری آمدنی اجتماع کی طرف بڑھ رہی ہے۔ کمیٹی کو یقین ہے کہ اِس معاشی اجتماع کی وجہ سے صرف تقسیم کی ترکیبی ناہمواری نہیں بلکہ معاشی ترقی کی کمی ہے۔ معاشی اجتماع کی دوسری وجہ ٹیکس سے لوگوں کی بچنے کی کوشش ہے۔ اگر یہ تجزیہ دُرست ہے تو ہمارے پانچ سالہ منصوبوں میں سماجی ترقی کے لیے جو حکمتِ عملی اختیار کی گئی ہے اُس پر دوبارہ غور کرنے کی ضرورت ہوگی۔

ایک مختصر جائزہ:

مہالنوبس رپورٹ ایک عجیب و غریب مقالہ ہے۔ اِس میں اِس بات کا صاف اعتراف کیا گیا ہے کہ منصوبہ بندی کے پہلے دس برسوں میں آمدنی کی تقسیم کے سوال کے براہِ راست مطالعے کے لیے اعداد و شمار نہیں حاصل تھے۔ اس کے باوجود کمیٹی بالواسطہ شواہد اور مقالوں کے مطالعے کی بنیاد پر اسی نتیجے پر پہنچی جو عام طور سے یقین کیا جاتا ہے یعنی کہ آمدنی کی تقسیم کی نابرابری بڑھی ہے، خصوصاً شہری حلقے میں اور یہ کہ پہلے دو منصوبوں نے معاشی قوت کے اِس اجتماع میں مدد کی ہے۔

مہالنوبس کمیٹی کی رپورٹ کے ایک سال بعد نیشنل کونسل آف اپلائڈ ریسرچ نے ۱۹۶۲-۶۳ء کے
کنبہ وار سامپل سروے کی بنیاد پر یہ اعلان کیا کہ ہندوستان میں گیارہ برس کی منصوبہ بندی کے
بعد آمدنی کے اجتماع کا رویہ بدستور رہا ہے، بلکہ یہ اجتماع امریکہ اور برطانیہ جیسے ترقی یافتہ سرمایہ دار
ممالک سے بھی زیادہ رہا ہے۔ یہ بات بڑی قابل توجہ ہے کہ آزادی کے پندرہ برس بعد بھی کل کنبوں
کا ایک فی صدی حصہ کل آمدنی کے ۱۵٪ کا مالک ہے جب کہ نچلے ۵۰٪ کے پاس کل آمدنی کا صرف
۲۲٪ آتا ہے۔ نیشنل کونسل آف اپلائڈ اکنامک ریسرچ کے مطابق ۱۵٪ کنبوں کی آمدنی کل
آمدنی کی صرف ۴٪ تھی جب اوپری ۲.۵٪ کا کنبوں کا حصہ ۱۸٪ تھا۔

اس سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ منصوباتی تجربے کے پہلے دس برسوں میں دولت مند طبقے کی کافی
توسیع ہوئی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں ترقیاتی منصوبوں سے سب سے زیادہ فائدہ پہنچا ہے۔ اس
لیے آنے والے برسوں میں زیادہ تر قربانی کرنے کی درخواست اسی طبقے سے کرنی چاہیے۔ اس طبقے کی
سرگرمیوں کی وجہ سے نہ صرف دولت اور معاشی قوت کا اجتماع بڑھا ہے بلکہ تعیشات پر ان کے بے تحاشا
خرچ کی وجہ سے اُن وسائل پر طلب کا دباؤ بہت بڑھ گیا ہے جو کم یاب اور ضروری ہیں۔ مثلاً
فولاد، سیمنٹ، بجلی، بیرونی زرِ مبادلہ۔ اس کی وجہ سے ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل میں رکاوٹیں پڑتی
ہیں۔ مختصر یہ کہ ہندوستان کی منصوبہ بندی کے پہلے دس برسوں میں غیر ضروری سمتوں میں وسائل کی
کی منتقلی کا رجحان بڑھا ہے اور اس سے دولت مند طبقے کو فائدہ پہنچا ہے۔ اس رجحان کو تقسیم کی اُس
نابرابری سے بڑی مدد ملی ہے جو منصوبوں کے تحت سرمایہ لگانے کا نتیجہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ چوتھے
پلان میں ترقی کی رفتار تیز ہونے کے ساتھ یہ طبقہ اور بھی طاقت ور ہو گا۔ چنانچہ اس طبقے کی سرگرمیوں
پر پابندی عائد کرنے کی ضرورت ہے۔

UNITED NATIONS : DEVELOPMENT OF MINERAL RESOURCES IN ASIA AND THE FAR EAST. BANGKOK 1953.

GOVERNMENT OF INDIA : MINISTRY OF FINANCE FINAL REPORT OF THE NATIONAL INCOME COMMITTEE. DELHI, APRIL 1951.

GOVERNMENT OF INDIA : MINISTRY OF FINANCE, FINAL REPORT OF THE NATIONAL INCOME COMMITTEE, DELHI, FEBRUARY 1954.

UNITED NATIONS : ECONOMIC EMPLOYMENT COMMISSION. FOREST RESOURCES AND THEIR UTILIZATION NEW YORK 1950.

UNITED NATIONS : POST-WAR DEVELOPMENT OF MINERAL RESOURCES IN ASIA AND THE FAR EAST. NEW YORK 1951

BROWN, COGGON J. AND DEY, A.K. INDIA'S MINERAL WEALTH. (3RD Edn) BOMBAY : OXFORD UNIVERSITY PRESS, 1955.

GOVERNMENT OF INDIA : CENTRAL STATISTICAL ORGANIZATION ESTIMATES OF NATIONAL INCOME, 1948–49 TO 1956 NEW DELHI MARCH 1958.

GOVERNMENT OF INDIA : CENTRAL STATISTICAL ORGANIZATION ESTIMATE OF NATIONAL INCOME. 1948–49 TO 1962–63, NEW DELHI FEBRUARY 1964.

GOVERNMENT OF INDIA : CENTRAL STATISTICAL ORGANIZATION ESTIMATE OF NATIONAL INCOME 1948–49 TO 1963–64, NEW DELHI MARCH 1965.

GOVERNMENT OF INDIA : PLANNING COMMISSION REPORT BY COMMITTEE ON DISTRIBUTION OF INCOME AND LEVELS OF LIVING (PART I.) NEW DELHI, FEBRUARY, 1964.

تیسرے حصے کا ضمیمہ

ہندوستان کی قومی آمدنی کے رجحانات

ٹیبل ۳—۱

خالص قومی پیداوار کی رفتار

۱۹۴۸-۴۹ کی قیمتوں کے مطابق فی کس خالص پیداوار	رواں قیمتوں پر فی کس خالص پیداوار	۱۹۴۸-۴۹ کی قیمتوں پر خالص قومی پیداوار	رواں قیمتوں پر خالص قومی پیداوار (۱۰ کروڑ روپے)	
۲۴۷٫۵	۲۶۴٫۵	۸۸٫۵	۹۵٫۳	۱۹۵۰-۵۱
۲۵۰٫۳	۲۷۳٫۲	۹۱٫۰	۹۹٫۷	۱۹۵۱-۵۲
۲۵۸٫۷	۲۴۵٫۴	۹۴٫۶	۹۸٫۲	۱۹۵۲-۵۳
۲۶۴٫۲	۲۷۸٫۱	۱۰۰٫۳	۱۰۴٫۸	۱۹۵۳-۵۴
۲۶۷٫۸	۲۵۰٫۳	۱۰۲٫۸	۹۶٫۱	۱۹۵۴-۵۵
۲۶۷٫۸	۲۵۵٫۰	۱۰۴٫۸	۹۹٫۸	۱۹۵۵-۵۶
۲۷۵٫۹	۲۸۳٫۲	۱۱۰٫۰	۱۱۳٫۱	۱۹۵۶-۵۷
۲۶۷٫۳	۲۷۹٫۱	۱۰۸٫۹	۱۱۳٫۹	۱۹۵۷-۵۸
۲۸۰٫۱	۳۰۳٫۰	۱۱۶٫۵	۱۲۶٫۰	۱۹۵۸-۵۹
۲۷۲٫۲	۳۰۳٫۸	۱۱۸٫۹	۱۲۹٫۵	۱۹۵۹-۶۰
۲۹۳٫۲	۳۳۵٫۷	۱۲۷٫۳	۱۴۱٫۴	۱۹۶۰-۶۱
۲۹۳٫۲	۳۳۳٫۹	۱۳۰٫۹	۱۴۸٫۰	۱۹۶۱-۶۲
۲۹۳٫۴	۳۳۹٫۴	۱۳۳٫۷	۱۵۳٫۰	۱۹۶۲-۶۳
۳۰۱٫۱	۳۷۰٫۹	۱۳۹٫۷	۱۷۲٫۰	۱۹۶۳-۶۴
۳۱۶٫۰	۴۲۲٫۷	۱۵۰٫۵	۲۰۰٫۰	۱۹۶۴-۶۵*

* ابتدائی

SOURCE : ESTIMATES OF NATIONAL INCOME 1948–49 TO 1964 – 65 (ISSUED BY CENTRAL STATISTICAL ORGANIZATION) MARCH 1965

ٹیبل ۳ — ۲

تناظری منصوبہ بندی کے تحت آمدنی، راس المال اور آبادی کا ارتقا

۱۹۵۱-۵۶ —— ۱۹۶۱-۷۶*

مد	پہلا پلان ۱۹۵۱-۵۶	دوسرا پلان ۱۹۵۶-۶۱	تیسرا پلان ۱۹۶۱-۶۶	چوتھا پلان ۱۹۶۶-۷۱	پانچواں پلان ۱۹۷۱-۷۶
۱	۲	۳	۴	۵	۶
۱۔ مدت کے ختم پر قومی آمدنی (کروڑ)	۱۰۸۰۰	۱۳۴۸۰	۱۷۲۶۰	۲۱۶۸۰	۲۷۲۷۰
۲۔ مجموعی سرمایہ کاری (کروڑ روپیہ)	۳۱۰۰	۶۲۰۰	۹۹۰۰	۱۴۸۰۰	۲۰۷۰۰
۳۔ سرمایہ کاری قومی آمدنی کی فی صدی کی حیثیت سے	۷.۳	۱۰.۷	۱۳.۷	۱۶.۰	۱۷.۰
۴۔ مدت کے ختم پر آبادی (کروڑ)	۳۸.۴	۴۰.۸	۴۳.۴	۴۶.۵	۵۰.۰
۵۔ راس المال اور پیداوار کے تناسب میں اضافہ	۱.۸:۱	۲.۳:۱	۲.۶:۱	۳.۴:۱	۳.۷:۱
۶۔ مدت کے ختم پر فی کس آمدنی (روپے)	۲۸۱	۳۳۱	۳۹۷	۴۶۶	۵۴۶

* ۱۹۵۲-۵۳ء کی قیمتوں کے مطابق

SOURCE: SECOND FIVE YEAR PLAN REPORT (1956)

چوتھا حصّہ

زراعت اور آبادی

باب ۱۲

آبادی

ہندوستان میں یہ کتنا بوکھلا دینے والا منظر ہے کہ ایک طرف آبادی کا بہت بڑا حصّہ بہت ہی پست معیارِ زندگی پر گزر بسر کر رہا ہے اور دوسری طرف آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ آبادی کے شمار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۲۱ء تک آبادی بڑھنے کی رفتار دھیمی اور ناہموار تھی لیکن ۱۹۲۱ء کے بعد سے اضافے کی شرح مسلسل بڑھتی رہی ہے۔ اِس کی ایک تشریح تو ہندوستان کی پیدائش اور اموات کی پچھلی شرح کے تجزیے سے ملتی ہے جس کے مطابق ۱۹۲۱ء سے ۱۹۵۱ء تک کے تیس برسوں میں اموات کی شرح ۱۹۲۱ء کے مقابلے میں بہت کم رہی ہے لیکن پیدائش کی شرح ویسی کی ویسی ہی رہی ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری سے یہ ظاہر ہے کہ ۱۹۵۱ء کے مقابلے میں ہندوستان کی آبادی ۲۱.۶۴ % بڑھی اور اضافے کی اوسط سالانہ شرح ۱.۹۶ % رہی۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۱ء تک ۱۹۴۱-۵۱ء کے مقابلے میں اضافے کی شرح ۶۱ % زیادہ تھی۔ پچھلے دس برسوں میں طبّی امداد، صفائی اور صحتِ عامّہ کے پروگراموں کی وجہ سے اموات کی شرح بہت گھٹ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اِس سے پہلے کے دس برسوں کے مقابلے میں آبادی کے اضافے کی شرح بڑھ گئی۔

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی آبادی ۴۳ کروڑ ۹۰ لاکھ ہے۔ ایک آدمی کی کم سے کم غذا یعنی ۲۴۰۰ کیلری کے حساب سے ہم صرف ۳۰ کروڑ آدمیوں کا پیٹ بھر سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ باقی ۱۳.۹ کروڑ آدمی یا تو فاقے کر رہے ہیں یا اُس سطح سے بالکل قریب ہیں۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے تخمینے کے مطابق توقع ہے کہ ۱۹۸۱ء تک ہندوستان کی آبادی ۵۵ کروڑ ہو جائے گی۔ یہ تصویر بڑی مایوس کُن ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان کے پانچ سالہ منصوبے آبادی کے اضافے اور غذا کی فراہمی میں توازن پیدا کرنے کے لیے کیا ارادہ رکھتے ہیں۔ پانچ سالہ پلان ہماری آبادی کے مسئلے کو

دو رُخ سے عمل کر رہے ہیں۔ منصوبہ بندی کے ذریعے ہم بہ یک وقت آبادی بڑھنے کی شرح کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور معاشی ترقی کی وہ شرح حاصل کر رہے ہیں جس سے آبادی اور وسائل کا بہتر تناسب قائم ہو۔ پانچ سالہ منصوبوں کے تحت ہم زراعت کی توسیع اور تجدید کے ذریعے نہ صرف غذا کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں بلکہ عام وسائلی امکانات سے پورا استفادہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ ہمارے عوام کو بہتر معیار زندگی حاصل کرنے کا موقع ملے۔

ہندوستانی معیشت کی کم ترقی یافتہ ماہیت کی وجہ سے معاشی ارتقا میں بہت سی رُکاوٹیں حائل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی سب سے زبردست مسئلہ ہے۔ آبادی کی منصوبہ بندی کا عمل بہت سست ہوتا ہے اور ہندوستان جیسے کم ترقی یافتہ ملک میں جہاں کی بیشتر آبادی ناخواندہ ہے، اس کے نتائج بہت معمولی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پانچ سالہ منصوبوں کی آبادی پر قابو پانے اور خاندانی منصوبہ بندی کی کوشش کے باوجود مسئلہ جیسے کا تیسا ہے۔ اس کے حل کے لیے زیادہ کوشش اور اجتماعی عمل کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کے لیے آبادی کی محتاط منصوبہ بندی شدید ضروری ہے ورنہ آبادی کا اضافہ معاشی ترقی کو ہڑپ کر جائے گا۔

آبادی اور زراعت :

ہندوستان کی اوسط آمدنی مشکل سے اتنی ہے کہ آبادی کے دو تہائی حصے کا پیٹ بھرا جاسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی غربت بے پناہ ہے خصوصاً دیہات میں۔ اس تشویش ناک صورتِ حال کا بنیادی سبب زراعت اور صنعت کا عدم توازن ہے۔ پہلے پلان کے شروع میں ہندوستان کی ۷۰٪ آبادی کھیتی سے گزر اوقات کر رہی تھی اور تقریباً ۸۵٪ آبادی بالواسطہ یا بلاواسطہ طور سے زمین سے متعلق تھی۔ صرف ایک فی صدی آدمی منظم صنعتوں سے اور ۸ ۸ چھوٹے پیمانے کی گھریلو صنعتوں اور دست کاری سے اپنی روزی حاصل کرتے تھے۔ اس کے بعد سے یہ عدم توازن ترقیاتی منصوبہ بندی کے ذریعے آہستہ آہستہ کم کیا جا رہا ہے۔ پہلے پلان میں زراعت کی نئی تنظیم کا مقصد زیر کاشت علاقے کی توسیع سے زیادہ یہ تھا کہ کاشت کے بہتر طریقوں کے استعمال سے فی کس پیداوار بڑھائی جائے۔ دوسرے پلان کی تمام تر توجہ بڑے پیمانے پر صنعتوں کا قیام تھا تاکہ دیہی علاقوں پر آدمیوں کا دباؤ کم ہو اور ترقی کا عمل تیز ہونے کی وجہ سے عوام کی حالت بہتر ہو۔ تیسرے پلان میں ترقی اور دفاع کی ضرورتوں کے پیشِ نظر صنعتی پروگرام پر تاکید بدستور رہی۔

آبادی کا اضافہ اور غذا کی فراہمی

پیدائش کی بڑھتی شرح اور اموات کی گھٹتی ہوئی شرح کے دور سے گزرتا ہوا ہندوستان دنیا میں

آبادی کے شدید ترین دباؤ کا علاقہ ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری سے ظاہر ہے کہ آبادی چوں کہ بڑھ رہی ہے اور یہ ۴۶ آبادی کو اُس کے سدباب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اِس لیے ۱۹۸۰ء تک آبادی ۵۵ کروڑ ہو جائے گی۔ اِس بات کے پیشِ نظر کہ آبادی کے رجحانات میں تبدیلی کا اثر دو تین پشتوں کے بعد ظاہر ہوتا ہے اور اتنی ہی مدت اولاد پیدا کرنے کے رویے کو بدلنے میں لگتی ہے۔ ڈاکٹر چندر شیکھر نے حال میں تخمینہ لگایا ہے کہ اضافے کی موجودہ شرح کے مطابق ۱۹۹۰ء تک آبادی ۱۰۰ کروڑ کی تشویش ناک تعداد کو چھو سکتی ہے۔

آبادی کے اضافے کا تعین دو چیزوں سے ہوتا ہے، پیدائش کی شرح اور اموات کی شرح۔ پچھلے چند برسوں میں ان شرحوں میں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں جو اِن اہم حالات کا نتیجہ ہیں جو آبادیاتی (DEMOGRAPHIC) سماجی اور معاشی عوامل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے چند برسوں میں اموات کی شرح بہت تیزی سے گھٹی ہے جب کہ پیدائش کی شرح میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں واقع ہوئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آبادی کے اضافے کی شرح تیزی سے بڑھی ہے۔ اِسی لیے دوسرے پلان کے دوران آبادی میں اضافہ پہلے پلان کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ اِس سلسلے میں پرنسٹن یونی ورسٹی کے پروفیسر کول (COALE) اور ہوور (HOOVER) کے مشاہدات دلچسپ ہیں۔ ان کے مطابق ۱۹۵۶-۶۱ء کے درمیان اموات کی خام شرح ۱۹۵۱-۵۶ء کی مدت کے مقابلے میں پانچ فی ہزار کم تھی۔ اِس بنیاد پر توقع تھی کہ دوسرے پلان کے دوران آبادی ٪۲ء۲ سالانہ یا ۸۰ لاکھ سالانہ بڑھے گی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نیشنل سامپل سروے آرگنائزیشن کے مطابق بھی دوسرے پلان کے دوران پیدائش کی اوسط شرح ۴۰ فی ہزار اور اموات کی اوسط شرح ۲۲ فی ہزار تھی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا مدت میں آبادی کے اضافے کی شرح ٪۱ء۸ سالانہ تھی۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی آبادی ۴۳ء۹ کروڑ تھی یعنی ۱۹۵۱ء کے اعداد و شمار کے مقابلے میں ٪۲۱ء۴ زائد۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ پچھلے دس برس میں ہمارے اضافے کی شرح ٪۲ء۱۶ سالانہ تھی۔

دوسری طرف پلاننگ کمیشن نے پہلے پلان کی تشکیل کے وقت یہ فرض کیا کہ ۱۹۵۱-۶۱ء کے درمیان دس برسوں میں آبادی ٪۱۲ء۵ یعنی اوسطاً ٪۱ء۲۵ سالانہ کی شرح سے بڑھے گی۔ بہ الفاظِ دیگر کمیشن کو یہ توقع تھی کہ آبادی میں ۵۰ لاکھ سالانہ کا اضافہ ہوگا۔ لیکن اب یہ بات ظاہر ہے کہ پلاننگ کمیشن کا تخمینہ بہت ہی کم تھا، کیوں کہ ۱۹۵۱-۶۱ء میں آبادی کے اضافے کی شرح ٪۲ سے کچھ زیادہ تھی جو ۱۹۶۱ء کی مردم شماری سے بہت صاف واضح ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اِن نئے پیدا ہونے والوں کا پیٹ کیسے بھرا جائے۔ یہ درست ہے کہ ہر شخص ایک مُنہ کے ساتھ دو ہاتھ بھی لے کر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی منھ اپنا کام شروع کر دیتا ہے جب کہ ہاتھوں کو کسی مفید کام کے قابل ہونے میں پندرہ، سولہ برس لگ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ

نیز صنعتی توسیع کے لیے ترقیاتی منصوبہ بندی کے زیرِ اثر دیہاتوں سے شہروں کی طرف انتقالِ آبادی کی رفتار بڑھتی رہتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ چوتھے اور اُس کے بعد کے منصوبوں کے دوران شہری آبادی کی اناج کی طلب مزید بڑھنے کے قوی امکانات ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہندستان کی آبادی کا بڑا حصہ افلاس کے سبب قوت بخش غذا سے محروم ہے اور اسی لیے اناج کی طلب کی لچک کم ترقی یافتہ دیہی علاقوں میں بالخصوص زیادہ ہے۔ پانچ سالہ منصوبوں کے دوران آبادی کے اضافے اور اناج کی رسد کے باہمی رشتے پر اس کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہندستان کی ترقیاتی منصوبہ بندی میں کھانے کی رسد اور آبادی کے اضافے میں توازن کیسے قائم کیا جائے۔

مسئلے کے حل کے بنیادی طریقے معلوم ہیں۔ پہلا طریقہ زراعت کی توسیع اور اُسے نیا رُخ دینے سے متعلق ہے جس کا اصل مقصد اناج کی رسد بڑھانا ہے۔ دوسرے طریقے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو فیملی پلاننگ پر آمادہ کر کے کھانے کی طلب کم کیجیے۔ پہلے پلان میں زیادہ توجہ پہلے طریقے کو دی گئی۔ اس پلان میں زراعتی ترقی کے لیے ۳۴۱ کروڑ روپے خرچ کیے گئے اور سازگار موسمی حالات کی مدد سے اناج کی پیداوار ۱ء۱ کروڑ ٹن بڑھ گئی۔ اس طرح پہلے پلان میں اناج کی کمی پر وقتی طور پر قابو پالیا گیا۔ اس پلان میں چوں کہ دوسرے طریقے کی طرف کم توجہ تھی اس لیے خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام پر صرف ۷۰ لاکھ روپے خرچ کیے گئے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ اناج کی پیداوار اور آبادی کی ترقی میں ہم آہنگی تب ہی پیدا ہو سکتی ہے جب اناج اور آبادی دونوں محاذوں پر بہ یک وقت موثر اقدام کیے جائیں اور اناج کی رسد بڑھانے کی کوشش کے ساتھ ضبطِ آبادی کی جامع پالیسی وضع کی جائے۔ ناخواندہ عوام میں بڑے پیمانے پر خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک پر کافی رقم خرچ کرنے کی ضرورت ہوگی۔ لیکن یہ خرچ بے مصرف نہیں ہے کیوں کہ آخر میں اس سے وہی نتیجہ برآمد ہوگا جو اناج کی پیداوار بڑھانے کے لیے زائد خرچ سے ہوگا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ دوسرے پلان میں اس بات کی اہمیت محسوس کی گئی اور خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کے لیے ۳ کروڑ روپے خرچ کیے گئے۔ دوسرے پلان میں خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیموں کی تعمیل کے لیے ۵۴۹ شہری اور ۱۱۰۰ دیہی کلینک قائم کیے گئے۔ تیسرے پلان میں بھی خاندانی منصوبہ بندی پر خرچ بڑھنے کا رجحان قائم رہا اور توقع تھی کہ ان پروگراموں پر ۲۷ کروڑ روپے صرف ہوں گے۔ پیدائش کی شرح کو جلد از جلد ۳۹ فی ہزار سے گھٹا کر گھٹتے گھٹتے ۲۵ فی ہزار پر لانے کے بنیادی مقصد کے پیشِ نظر چوتھے پلان میں تیسرے پلان کے ۲۷ کروڑ کے مقابلے میں ۳۰۰ کروڑ ان پروگراموں کے لیے

تجویز کیے گئے۔

آبادی اور معاشی ترقی :

پانچ سالہ منصوبوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ ترقیاتی منصوبہ بندی کے ارتقا کے ساتھ ہندوستان اپنے قدرتی وسائل اور ماحول کو موثر طریقے سے استعمال کرتا رہے گا۔ سوال یہ ہے کہ آبادی کے اضافے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اوّل تو صحت عامہ کے بہتر اقدام کے ساتھ اموات کی شرح غالباً گھٹے گی۔ دوسرے یہ کہ ترقی کے دوران آمدنی بڑھنے کے ساتھ ممکن ہے کہ آبادی بھی بڑھے تاوقتیکہ لوگوں کے شوق اور عزائم میں ایسی تبدیلی نہ واقع ہو جو اس اثر کو رد کر دے۔ اگر ایسا ہوا تو آبادی بڑھے گی۔ ایسا نہ بھی ہوا تو بھی کافی عرصے تک پیدائش کی شرح قائم رہے گی۔ کیوں کہ پرانے رسم و رواج اور دستور کو بدلنا اور روایات میں جکڑے ہوئے عوام میں خاندانی منصوبہ بندی کا پیغام موثر طریقے سے پھیلانا بڑا مشکل ہے۔ چنانچہ غالباً یا تو پیدائش کی شرح بڑھے گی یا قائم رہے گی اور اموات کی شرح گھٹے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ترقیاتی منصوبہ بندی کے دوران مستقبل قریب میں بھی آبادی بڑھتی رہے گی۔ ہندوستان کی آبادی کے مسئلے کا بنیادی حل یہ ہے کہ حوصلہ مند منصوبہ بندی کے ذریعے صنعتی ترقی کی رفتار تیز کی جائے۔ تیز معاشی ترقی کے ساتھ ملک اس قابل ہوگا کہ تشویش ناک حد تک پست معیارِ زندگی سے نجات پائے اور آبادی کے اضافے پر قابو حاصل ہو۔ دوسرے ملکوں میں یہی ہوا ہے۔ صرف اسی صورت میں خاندانی منصوبہ بندی کے لیے حالات سازگار ہوں گے۔

اب ہم عبوری دور میں آبادی کے اُتار چڑھاؤ کے اصولوں کا سرسری خاکہ خلاصے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس سے معاشی ترقی کے عمل میں آبادی کا اہم رول زیادہ اچھی طرح سے سمجھا جا سکتا ہے۔ معاشی ترقی کی منزل میں آنے سے قبل ایک کم آمدنی والے زراعتی سماج کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ پیدائش اور اموات دونوں کی شرح اونچی ہوتی ہے۔ پیدائش کی شرح نسبتاً تھمی ہوئی ہوتی ہے اور اموات کی شرح حیثیت کی اونچ نیچ کے مطابق کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ جب معاشی ترقی شروع ہوتی ہے تو اموات کی شرح گرنا شروع ہوتی ہے۔ اموات کی شرح میں تخفیف کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں مثلاً پابندی سے غذا کا ملنا، معاشی ترقی اور سرکاری انتظام کی دُرستی کے ساتھ ملک میں نظم و نسق کا بہتر ہونا وغیرہ۔ لیکن تخفیف کا زیادہ اہم سبب یہ ہوتا ہے کہ معاشی ترقی کے براہِ راست نتیجے کے طور پر صحت و صفائی کے بارے میں لوگوں کی معلومات زیادہ ہوتی ہیں۔ اموات کی شرح میں کمی کے مقابلے میں پیدائش کی شرح کم ہونے میں وقت لگتا ہے کیوں کہ روایات میں جکڑے ہوئے پس ماندہ سماج میں عموماً اس کے حق میں تو سب ہوتے ہیں کہ تکلیفیں اور بیماریاں دُور کی جائیں لیکن خاندان کے

چھوٹے ہونے کی ضرورت اور خاندانی منصوبہ بندی کے اقدام کے بارے میں ایسا اتفاق رائے نہیں ہوتا۔ پہلے اور دوسرے منصوبوں کے دوران ہمارے ساتھ بالکل یہی ہوا، یعنی پیدائش کی شرح تقریباً قائم رہی اور اموات کی شرح تخفیف کی طرف مائل رہی۔ جیسے جیسے صنعتیں قائم ہوتی ہیں اور معاشی ترقی جاری رہتی ہے شہریانے (URBANIZATION) کا رجحان بڑھتا رہتا ہے اور بچے جو دیہی سماج میں اثاثے کی حیثیت رکھتے ہیں، شہری ماحول میں اثاثے سے زیادہ بوجھ بننے لگتے ہیں۔ رفتہ رفتہ رسم و رواج کے بندھن کمزور پڑنے لگتے ہیں اور آخر میں پیدائش کی شرح گرنا شروع ہوتی ہے۔ اب پیدائش اور اموات کی شرح ایک دوسرے کے تقریباً متوازی تخفیف کا راستہ اختیار کرتی ہیں جس میں پیدائش کی شرح پیچھے رہتی ہے۔ آگے چل کر جب اموات کی شرح میں مزید کمی مشکل ہوجاتی ہے تو پیدائش کی شرح اس کے برابر پہنچنے لگتی ہے۔ جلد ہی دونوں شرحیں برابر ہوجاتی ہیں اور اضافے کی زیادہ تدریجی رفتار پھر سے قائم ہوجاتی ہے۔

ہندوستان کی آبادی کے نمایاں پہلو

(۱) جسامت (SIZE): ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے وقت ہندوستان کی آبادی ۴۳۹ء۳ کروڑ تھی۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ ۱۹۵۱ء کی ۳۶۱ء۱ کروڑ کے مقابلے میں پچھلے دس برسوں میں ۲۱ء۶۴ % کا اضافہ ہوا۔ اس طرح ۱۹۶۱ء میں ہندوستان کی آبادی دنیا کی مجموعی آبادی کا آٹھواں حصہ تھی۔ جسامت کے لحاظ سے اب بھی چین کے بعد ہندوستان کا نمبر ہے۔ ۱۹۵۳ء میں چین کی آبادی کا تخمینہ ۵۸۲ء۵ کروڑ تھا۔

(۲) گنجانی (DENSITY) ملک کے سب علاقوں میں آبادی کی گنجانی یکساں نہیں ہے۔ مغربی بنگال اور کیرل جیسے صوبوں میں رقبے کو دیکھتے ہوئے آبادی بہت زیادہ ہے جب کہ مدھیہ پردیش اور راجستھان جیسے صوبوں میں بہت کم ہے۔ جموں اور کشمیر کو چھوڑ کر باقی ہندوستان کی گنجانی یعنی فی مربع میل آدمیوں کی تعداد ۱۹۶۱ء میں ۳۷۰ تھی جب کہ ۱۹۵۱ء میں ۲۸۷ تھی۔ یہ گنجانی امریکہ کے ۵۶ فی مربع میل کے مقابلے میں بہت زیادہ اور جاپان کی ۵۸۱ کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

(۳) آبادی بہ لحاظِ عمر: ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ۴۱ء۴۳ % آبادی ایک سے چودہ برس تک کی عمر کے خانے میں تھی۔ ۵۰ء۱۵ % لوگ ۱۵ سے ۵۵ برس کے

خانے میں تھے۔ ملک کی کارگزار آبادی اسی خانے لوگوں پر مشتمل تھی۔ ۱٫۵۴ % وہ لوگ تھے جو ۵۵ سال سے اوپر تھے۔

(۴) جنسی تناسب: کل ہند جنسی تناسب، یعنی فی ہزار مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد ۱۹۰۱ء کے ۹۷۲ کے مقابلے میں ۱۹۶۱ء میں ۹۴۱ تھا۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۱ء کے درمیان آسام اور بہار میں جنسی تناسب تقریباً قائم رہا لیکن پنجاب اور مغربی بنگال میں یہ تناسب کچھ تیز ہوا۔ کیرل اور اڑیسہ میں جنسی تناسب اونچا تھا جب کہ آسام، پنجاب اور بنگال میں نیچا تھا۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۳۶٫۱۱ کروڑ کی مجموعی آبادی میں مردوں کی تعداد ۱۸٫۶۴ کروڑ یعنی ۵۱٫۶۴ % تھی۔ اسی طرح ۱۹۵۱ء میں مردوں کی تعداد عورتوں سے ۱٫۱۹ کروڑ زیادہ تھی۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری سے بھی یہی رجحان ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے مطابق ۴۳٫۹۰ کروڑ کی مجموعی آبادی میں ۲۲٫۶۵ کروڑ مرد اور ۲۱٫۲۴ کروڑ عورتیں تھیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۹۶۱ء میں مردوں کی تعداد عورتوں سے ۱٫۴۴ کروڑ زیادہ تھی۔ بیواؤں کی دوبارہ شادی پر پابندی کے ساتھ عورتوں کی مجموعی تعداد ایک اہم سماجی مسئلہ ہے۔

(۵) اوسط عمر: ۱۹۵۶-۶۱ء کے دوران ہندوستان میں اوسط عمر کا تخمینہ ۴۱٫۶۲ تھا (عورتوں کے لیے ۴۰٫۹۶ اور مردوں کے لیے ۴۲٫۰۴ سال)۔ اس اوسط کا مقابلہ جب ہم امریکہ کی اوسط عمر سے کرتے ہیں تو صورتِ حال بڑی تشویش ناک نظر آتی ہے۔ امریکہ میں مردوں کی اوسط عمر ۶۵ سال اور عورتوں کی عمر ۷۰ سال ہے۔ بہر حال منصوبوں کے تحت صحت عامہ کی بہتری اور صفائی کے اقدام کی وجہ سے جینے کی اوسط بہ تدریج بڑھ رہی ہے۔ چوتھے پلان کے مطابق ۱۹۶۸-۶۹ء میں پیدائش کے وقت عمر کی متوقع اوسط ۵۰ سال ہے۔

(۶) اضافے کی شرح: ۱۹۶۱ء میں مردم شماری کے مطابق ۱۹۵۱ء اور ۱۹۶۱ء کے درمیان ہندوستان کی آبادی ۷٫۸۱ کروڑ بڑھی۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ پچھلے دس برسوں میں ۲۱٫۴۹ % رہی، یعنی سالانہ اضافہ ۲٫۱۴ % ہوا۔ دوسرے پلان کی رپورٹ کے خاکے میں ۱۹۵۱-۶۱ء کے دس برسوں میں ۱۲٫۶۵ % اضافے کی شرح متوقع تھی۔ اس کے بعد کے دس برسوں میں یعنی ۱۹۶۱-۷۱ء کے لیے ۱۳٫۰۳ % اور ۱۹۷۱-۸۱ء کے لیے ۱۴ % شرح فرض کی گئی تھی۔ اس تخمینے کے مطابق توقع تھی کہ آبادی ۱۹۶۰-۶۱ء میں ۴۰٫۸۰ کروڑ، ۱۹۶۵-۶۶ء میں ۴۳٫۴۶ کروڑ، ۱۹۷۰-۷۱ء میں ۴۶٫۵۶ کروڑ اور ۱۹۷۵-۷۶ء میں، یعنی پانچویں پلان کے ختم پر ۴۹٫۶۹ کروڑ یا ۵۰ کروڑ کے قریب ہوگی لیکن مردم شماری کے اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ پچھلی دہائی کے دوران آبادی میں اضافے کی شرح توقع سے بہت

زیادہ تھی یعنی ۱۲.۶۵٪ کے مقابلے میں ۲۱.۶۴٪۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ سالانہ اضافے کی شرح ۲.۱۶٪ تھی۔ چوتھے پلان کے مسودے کے مطابق ۷۱-۱۹۶۶ء کے دوران آبادی میں اضافے کی شرح کا تخمینہ ۲.۴۳٪ سالانہ تھا۔ ۷۶-۱۹۷۱ء کے دوران اس شرح کے مزید بڑھنے اور ۲.۵٪ ہو جانے کی توقع ہے۔

(۷) پیدائش اور اموات کی شرح: ۱۹۵۱ء اور ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار پر مبنی مطالعوں کے مطابق ۶۱-۱۹۵۱ء کی دہائی میں پیدائش کی تعداد اوسطاً ۴۲ فی ہزار اور اموات کی تعداد ۲۳ فی ہزار سالانہ تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آبادی کے اضافے کی قدرتی شرح اوسطاً ۱۹ فی ہزار سالانہ تھی۔ چوتھے پلان کے مسودے کے مطابق ۶۶-۱۹۶۱ء کے دوران پیدائش کی شرح ۴۰ فی ہزار سالانہ تھی اور اموات کی شرح ۱۷ فی ہزار سالانہ۔ جیسا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ ترقیاتی منصوبہ بندی کے دوران اموات کی شرح بتدریج کم کی جا رہی ہے لیکن پیدائش کی شرح میں اس کے مطابق کمی نہیں ہو رہی ہے۔ اس طرح آبادی کے اضافے کی قدرتی شرح تیزی سے بڑھ رہی ہے اور ہم آبادی کے دھماکے کے دور سے گزر رہے ہیں۔

(۸) دیہی اور شہری آبادی کا مقابلہ:

جدید شہری رجحان: ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی ۱۸٪ آبادی شہری حلقے سے متعلق تھی۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ آبادی کا بڑا حصہ یعنی ۸۲٪ دیہاتوں میں رہتا تھا۔ ۶۱-۱۹۵۱ء کے درمیان شہروں کی تعداد میں ۲۷ کا اضافہ ہوا (۱۹۵۱ء میں ۴۸ شہر تھے۔ ۱۹۶۱ء میں پچھتر ہو گئے) اور شہری آبادی ۳۴.۳٪ بڑھی۔ (۱۹۴۱ء میں ۱۴٪ تھی، ۱۹۵۱ء میں ۱۷.۳٪ ہو گئی)۔ ۱۹۵۱ء تک شہروں کی مختلف تعریفیں تھیں۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں میونسپلٹی، کنٹونمنٹ، نوٹی فائڈ ایریا اور دوسرے ایسے علاقوں کو جو کسی تسلیم شدہ سول انتظام کے تحت تھے، شہر شمار کیا گیا۔ باقی علاقوں شہر تسلیم کرنے کے لیے تین کسوٹیاں مقرر کی گئیں: (۱) آبادی ۵۰۰۰ سے کم نہ ہو (۲) گنجانی ۱۰۰۰ آدمی فی مربع میل سے کم نہ ہو (۳) مردوں کی تعداد کی کم از کم تین چوتھائی آبادی غیر زراعتی پیشوں میں لگی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نمایاں دیہی خدوخال کے بہت سے علاقے جو شاید پہلے شہروں میں گنے جاتے تھے، اب اس زمرے سے نکل گئے۔ ۴۳.۹۰ کروڑ کی مجموعی آبادی میں سے ۳۶ کروڑ یعنی ۸۲٪ دیہی آبادی تھی (۱۹۵۱ء میں دیہی آبادی ۸۲.۷٪ تھی) ۱۹۶۱ء کے دیہی اور شہری آبادی کے تناسب میں بہ مقابلہ ۱۹۵۱ء کے کوئی نمایاں فرق نہیں آیا۔ چوتھے

پلان اور اُس کے بعد کے منصوبوں میں صنعتوں پر زیادہ زور ہونے کی وجہ سے شہروں کی طرف لوگوں کی ہجرت، خصوصًا مردوں کی زیادہ بڑھنے کا امکان ہے۔ اِس لیے شہروں کی توسیع کے باقاعدہ پروگرام کی شدید ضرورت ہے جس کے تحت نواحی علاقوں کی ترقی اور نئے علاقوں میں شہروں کی تعمیر پر پوری توجہ دی جائے۔

کیا ہندوستان کثیر الآباد ہے۔ کثیر الآبادی کا مسئلہ اور پانچ سالہ پلان:

ہمارے عوام کی بے پناہ غربت، غیر معمولی اونچی پیدائش کی شرح، غذا کی قلت اور اُس کے ساتھ قحط یہ سب عمومًا ہندوستان کی کثیر الآبادی کی علامتیں سمجھی جاتی ہیں۔ کثیر الآبادی کے دعوے کے حق میں ہندوستانی معاشئین بہت سی بلا واسطہ شہادتیں پیش کرتے ہیں۔ ثابت کیا جاتا ہے کہ پچھلے چالیس برسوں میں آبادی کے اضافے کی شرح زیر کاشت علاقے میں اضافے کی شرح سے اونچی رہی ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ زمین پر آبادی کا دباؤ بہت بڑھ گیا ہے اور ہماری معیشت کے زراعتی اور غریب حلقے کا معیارِ زندگی بہت پست ہو گیا ہے۔

اگر ہم اِس مسئلے کی اور زیادہ گہرائی میں جائیں تو دیکھیں گے کہ مالتھس (MALTHUS) کے اصول کے روایتی معنوں میں ہندوستان کثیر الآباد ملک کی کچھ خصوصیات رکھتا ہے۔ مالتھس کے مطابق کثیر الآباد ہونے کی ایک پہچان یہ ہے کہ آبادی کے اضافے کی شرح غذا میں اضافے کی شرح سے بہت نمایاں طور پر زائد ہے۔ حاصل اعداد و شمار سے یہ بالکل واضح ہے کہ آبادی کے اضافے اور زیر کاشت علاقے کی توسیع میں عدم توازن بہت نمایاں ہے۔ ظاہر ہے کہ زیر کاشت علاقے ہی سے غذا حاصل ہوتی ہے۔ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۵۱ء کے درمیان آبادی ۵۰٪ بڑھی جب کہ زیر کاشت علاقے میں صرف ۸٪ کا اضافہ ہوا۔ اِن چالیس برسوں میں زمین کی پیداآوری بڑھانے کے لیے کھیتی کے طریقوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ملک کے بہت سے علاقوں میں اناج کی شدید قلت اور تقریبًا قحط جیسی حالت ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے ابتدائی زمانے میں بنگال میں جو قحط پڑا اُس سے آبادی کے اضافے اور اناج کی رسد میں عدم مطابقت نمایاں طور سے واضح ہے۔

ہندوستان کی کثیر الآبادی کے مسئلے کی ماہیت کو زیادہ اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر ہم دو سکٹری معیشت کے تجزیے پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔ چھوٹے منظم سرمایہ دار سکٹر میں فی کس آمدنی اونچی ہونے کی وجہ سے لوگوں کی قوتِ خرید زیادہ ہے۔ اِس قوتِ خرید کا بڑا حصّہ کھانے پینے کی چیزوں پر صرف ہوتا ہے۔ صنعتی ترقی کے دوران سرمایہ دار سکٹر کی توسیع سے اناج کی طلب بڑھ جائے گی جسے

پورا کرنے کی ذمہ داری معیشت کے اُس سکٹر پر ہے جہاں کھیتی گزر بسر کرنے کے پیمانے پر ہوتی ہے۔ خود اِس سکٹر کے اندر آبادی اور اناج کی رسد کا عدم توازن بہت زیادہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کثیر الآبادی کی علامتیں اِس زرعی سکٹر میں ہی زیادہ نمایاں ہیں۔ اِس لیے اگر ہمیں کثیر الآبادی کا مسئلہ حل کرنا ہے تو معیشت کے اِس گزر بسر کرنے والے سکٹر میں انقلاب لانا ہوگا۔

فیملی پلاننگ کے پیغام کو گزر بسر کرنے والے سکٹر کے ہر گھر تک پہنچانا ہوگا جہاں ناخواندہ عوام رہتے ہیں۔ گرام سیوک کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام کا محور ہے۔ اُس کو اِس کام کی تربیت دی جاسکتی ہے۔ فیملی پلاننگ کے ملک گیر پروپگنڈے کے ساتھ ہمیں زمین کی پیداوار بڑھانے اور فاضل زراعتی آبادی کو دوسرے مفید کاموں میں لگانے کی موثر کوشش کرنی چاہیے۔ ہندوستان کی کثیر الآبادی کے مسئلے کو معیشت کے زراعتی گزر بسر کرنے والے سکٹر کی نیم جامد ماہیت کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے۔ فرسودہ طریقوں اور عوام کے بے دردانہ رویّے کی وجہ سے اُس سکٹر کے بیشتر قدرتی وسائل کا پورا استعمال نہ ہوسکا۔ چنانچہ یہ تخمینہ کہ اس سکٹر سے کتنی آبادی کو روزی مل سکتی ہے بہت کم نکلتا ہے اس لیے یہ ثابت کرنا آسان ہے کہ یہ سکٹر جس میں ملک کی بیشتر آبادی رہتی ہے بہت کثیر الآباد ہے۔ اِس سکٹر کی آبادی کے تجزیے سے یہ عام نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی متوازن تعداد سے تشویش ناک حد تک آگئی ہے۔

ایک ساکت اور نیم جامد ماحول میں تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی واقعی خطرناک ہے۔ برطانوی عہد میں تو یہ اور بھی زیادہ خطرناک نظر آتی تھی کیوں کہ اُس عہد میں نہ تو چھوٹے سے سرمایہ دار سکٹر کو بڑھانے کی کوشش کی گئی اور نہ گزر بسر کرنے والے بڑے سکٹر کو متحرک کرنے کی کوشش کی گئی جس میں ہندوستان کے کروڑوں لوگوں کی معاشی ترقی کو تیز کرنے کے لیے کام میں لایا جاتا۔ پانچ سالہ منصوبہ شروع کرنے کے بعد پہلی بار ملک اِس حالت میں ہے کہ کثیر الآبادی کے مسئلے کی جڑ کو زد میں لاسکے۔ پہلے پلان کے دوران زراعت کی تنظیم کی گئی۔ دوسرے پلان میں صنعتی ترقی کا حوصلہ مند پروگرام شروع کیا گیا۔ تیسرے پلان میں زراعتی تنظیم اور صنعتی ترقی دونوں کی بہ یک وقت کوشش کی گئی۔ ترقیاتی منصوبہ بندی کے ذریعے ہماری حکومت ملکی وسائل کی زیادہ کارآمد اور بہتر استعمال کی کوشش کر رہی ہے۔ وسائل کے بہتر استعمال سے قومی پیداوار بڑھتی ہے اور زیادہ لوگوں کی کفالت کی جاسکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں وسائل کے موثر اور منصوبے کے تحت استعمال سے متوازن آبادی کی ایک نئی تعداد سامنے آتی ہے جو توازن کی پُرانی تعداد سے کافی

اونچی ہے۔

لیکن ہندوستان میں مسئلہ صرف یہ نہیں ہے کہ آبادی خطرناک حد تک زیادہ ہے بلکہ یہ بھی کہ ہر دس برس میں اس آبادی میں بہ حیثیت مجموعی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۵۱-۱۹۴۱ء کے دوران آبادی میں ۴.۴ کروڑ کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۶۱-۱۹۵۱ء کے دوران آبادی ۸.۰۷ کروڑ بڑھی۔ موجودہ آبادی یوں ہی کیا کم تھی، اُس پر اتنا بڑا اضافہ اپنے اندر مسئلے کو مشکل تر بنانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ صنعتی تنظیم نو اور صنعتی ترقی سے یہ مسئلہ پورے طور پر حل نہیں ہو سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ زراعتی اور صنعتی ترقی کے اقدام کے ساتھ ساتھ فیملی پلاننگ کے پروگرام کی موثر تعمیل کی کوشش ملک گیر پیمانے پر کی جائے۔

پانچ سالہ منصوبہ اور فیملی پلاننگ :

پہلے پلان کے دوران پہلا موقع تھا جب فیملی پلاننگ کی کوشش سرکاری سطح پر شروع ہوئی فیملی پلاننگ کے پیغام کو دور دور تک پہنچانے کے مقصد کے پیش نظر ۶۵ لاکھ کی رقم کم تھی جو پہلے پلان میں فراہم کی گئی تھی۔ بہرحال پہلے پلان کے دوران مسئلے کے مختلف پہلوؤں کے مطالعے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کے علاوہ ایک درجن کے قریب پائلٹ سنٹر کھولے گئے جن کا مقصد یہ تھا کہ فیملی پلاننگ کے ارادی طریقوں کو مقبول بنایا جائے اور خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق عوام کی خواہش کی تحقیق کی جائے۔

دوسرے پلان میں آبادی کی منصوبہ بندی پر زیادہ نمایاں طریقے سے زور لگایا جاتا رہا۔ اس پلان کے دوران فیملی پلاننگ کے مرکزی بورڈ نے مشورے اور خدمات کی فراہمی کا فرض انجام دیا اور عملے کی تربیت کے لیے اور طبی امداد کے لیے کافی تعداد میں مراکز قائم کیے۔ مرکزی بورڈ نے آبادی کے رجحانات کی تحقیق کے سلسلے میں بھی ہر ممکن مدد کی۔ بورڈ کو توقع تھی کہ دوسرے پلان کے دوران بڑے شہروں اور قصبوں میں اتنے کافی کلینک کھل جائیں گے کہ ہر ۵۰ ہزار کی آبادی پر ایک کلینک کا اوسط ہو جائے۔ جہاں تک چھوٹے قصبوں اور دیہی علاقوں کا تعلق ہے اُمید تھی کہ بنیادی طبی مراکز کی شرکت میں رفتہ رفتہ یہاں کلینک کھولے جائیں گے۔ دوسرے پلان میں فیملی پلاننگ پر ۳ کروڑ روپے خرچ کیے گئے۔ اس مدت میں ۵۴۹ شہری اور ۱۱۰۰ دیہی کلینک کھولے گئے۔ تیسرے پلان میں فیملی پلاننگ کے پروگرام پر ۲۷ کروڑ خرچ کی توقع تھی۔ چوتھے پلان میں ۳۰۰ کروڑ روپے تجویز ہیں[*]۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کا معاشی مستقبل آبادی

---

* حقیقت یہ ہے کہ چوتھے پلان میں فیملی پلاننگ کو سب سے زیادہ ترجیح دی گئی۔ ۳۰۰ کروڑ کی مجموعی رقم میں سے ۲۲۵ کروڑ شہری اور دیہی مراکز کے لیے (STERILIZATION) کے معاوضے کی مد میں اور باقی ۷۵ کروڑ تربیت، تحقیق، تشہیر، تنظیم، رسد اور جائزے کے لیے رکھے گئے۔ توقع ہے کہ تضییع حمل کا قانون نرم کر دیا جائے گا اور اس کا مقصد خاندانی منصوبہ بندی اور صحت عامہ کی بہتری ہوگا۔ حمل ضائع کرنے کی اجازت صرف اُس صورت میں ہوگی کہ اس سے ماں کی صحت پر خراب اثر نہ پڑے۔

کو محدود رکھنے کے ملک گیر پروگرام کی فوری اور موثر تعمیل پر منحصر ہے۔ درحقیقت منصوبوں کی کامیابی کے لیے قومی پیمانے پر فیملی پلاننگ کی شدید ضرورت ہے۔

ہندوستان کے لیے آبادی کی پالیسی :

معاشی ترقی کے دوران آبادی کی منصوبہ بندی کو سب سے اہم رول ادا کرنا ہے۔ یہ اس لیے کہ معاشی ترقی کا مقصد ملک کے عوام کی خوش حالی ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ معاشی ترقی منصوبے کے تحت عمل میں آئے تو عام ترقی سے پہلے ہمیں آبادی کی منصوبہ بندی کی طرف توجہ دینی ہوگی۔ ہمیں صرف یہی نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ موجودہ آبادی کتنی ہے بلکہ یہ بھی کہ موجودہ آبادی میں کس شرح سے اضافہ ہو رہا ہے۔ معاشی ترقی کی شرح اور منصوبوں کے دوران وسائل کے استعمال کی رفتار ان دونوں کو آبادی کے اضافے کی شرح کے ساتھ متوازن ہونا چاہیے۔ ترقیاتی منصوبہ بندی کے ایک اچھے نظام کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ موجودہ آبادی کا موثر استعمال ہو اور اس کو پیداوار اور روزگار سے لگایا جائے بلکہ منصوبہ بندی کو نئے آنے والوں کے اُمنڈتے ہوئے طوفان کا مسئلہ بھی حل کرنا ہے۔

اس وقت ہندوستان کو جس چیز کی شدید ضرورت ہے وہ ہے آبادی سے متعلق ایک جمہوری اور واضح پالیسی تاکہ موجودہ آبادی میں مزید اضافے پر قابو پایا جاسکے۔ اگر آبادی کے اُمنڈتے ہوئے طوفان کو روکا نہ گیا تو پانچ سالہ منصوبوں سے پیدا ہونے والی معاشی ترقی کی شرح مدھم پڑ جائے گی۔ یہ اس لیے کہ معاشی ترقی سے جو کچھ فائدہ ہوگا وہ بیشتر نئے آنے والوں کی نذر ہو جائے گا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ تیسرے پلان کی طرح چوتھے پلان کو بھی آبادی کے دھماکے کے دور سے گزرنا ہوگا جس کی یہ خصوصیت ہے کہ اموات کی شرح کم ہوتی ہے لیکن اس کے مطابق پیدائش کی شرح کم نہیں ہوتی۔ تجربہ بتلاتا ہے کہ صحتِ عامہ کے بہتر اقدام کی وجہ سے ہمیشہ معاشی ترقی کا اثر سب سے پہلے اموات کی شرح پر پڑتا ہے۔ آبادی کی شرح میں کمی کچھ مدت بعد واقع ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمارا خیال ہے کہ ماہرینِ منصوبہ بندی کو پلان کے دوران آبادی کے دھماکے کا ممکن خطرہ خاص طور سے ذہن میں رکھنا چاہیے۔ آبادی کو قابو میں رکھنے کی پالیسی زیادہ تر فیملی پلاننگ کے پروگرام پر مشتمل ہے۔ اس میں دھماکے کے دوران پیدا ہونے والے مسائل سے موثر طریقے سے نپٹنے کے عناصر کم ہیں۔

ہندوستان کو آبادی کو قابو میں رکھنے کی ایک موثر پالیسی کی ضرورت ہے جو ہر محاذ پر کثیر الآبادی کے خلاف ایک منصوبے کے تحت حملہ آور ہوسکے۔ آبادی کے دھماکے کے دوران جب بے روزگاری کا مسئلہ ہمارے اوپر مسلط ہے۔ آبادی پر قابو پانے کے پروگرام کو ہمارے منصوبوں میں اوّلیت کا درجہ حاصل

ہونا چاہیے ۔ ہمیں فوراً ایک قومی پالسی بنانی چاہیے، ملک بھر میں اس پالسی کا اعلان کرنا چاہیے اور چوتھے پلان کے دوران اس کی تعمیل کرنی چاہیے۔ اِس قومی پالسی کی تشکیل میں درج ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

(۱) منصوبہ بندی موجودہ آبادی اور مستقبل کی آبادی دونوں کے لیے کی جائے تاکہ منصوبے کے دوران معاشی ترقی کی رفتار تیز ہو سکے اور اِس ترقی کے فائدے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکیں۔

(۲) اموات کی شرح پر قابو پانے کے لیے صحت عامّہ اور حفظانِ صحت کے اقدام کے علاوہ قومی پیمانے پر ایک منظّم پروگرام شروع کرنا چاہیے جس کے تحت آبادی کے اضافے کی تعداد پر قابو پایا جا سکے۔

(۳) ہندوستان جیسے کم ترقی یافتہ ملک میں جہاں آبادی بہت زیادہ ہے اور اضافے کے امکانات بہت ہیں، معاشی ترقی کے دوران صرف آبادی کے لیے ایک الگ پلاننگ کمیشن کی شدید ضرورت ہے جو ماہرینِ آبادی، ماہرینِ سماجیات اور ماہرینِ معاشیات پر مشتمل ہو۔ اس کمیشن کا کام یہ ہونا چاہیے کہ یہ آبادی پر قابو پانے کی پالسی بنائے اور اُس کی تعمیل کے طریقے نکالے۔

(۴) فیملی پلاننگ کو کمیونٹی پروجکٹ سے منسلک ہونا چاہیے اور لوگوں کو اِس بات کا یقین دلانا چاہیے کہ فیملی پلاننگ کے ساتھ ترقیاتی منصوبوں کی کامیابی دس گنی ہو جاتی ہے۔ لوگوں میں یہ احساس بھی پیدا کرنا چاہیے کہ فیملی پلاننگ کے معنی ہیں ایک چھوٹا خاندان جو منصوبہ بند معیشت کے ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۵) حکومت کو دیہی علاقوں میں زیادہ سے زیادہ کلینک قائم کرنے کے لیے اور زیادہ رقم خرچ کرنی چاہیے۔ چار گاؤں پر ایک کلینک کا اوسط ہونا چاہیے۔

(۶) ہندوستان جیسے ملک کے دیہی علاقوں میں بالغوں کی تعلیم پھیلانا ضروری ہے کیوں کہ اس سے لوگوں کا نظریہ وسیع ہوتا ہے اور منصوبہ بند معاشی ترقی کے دوران ارادی فیملی پلاننگ کی ضرورت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

باب ۱۴

زرعی پیداوار اور سرکاری پالیسی

غذائی مسئلے کے خاص حوالے سے

اِس کے باوجود کہ ہندوستان کی ۷۰٪ آبادی زراعت میں مصروف ہے، ملک کی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے اناج دوسرے ملکوں سے منگانا پڑتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ مزروعہ زمین پر آبادی کے دباؤ، متواتر خشک سالی، مانسون کی بے اعتباری اور فصلی بیماریوں کی وجہ سے زرعی پیداوار بہت کم ہے۔ قحط کا خطرہ برابر لاحق رہتا ہے اور شاید ہی کوئی ایسا سال ہوتا ہو جب اناج کی قلت کا سامنا نہ کرنا پڑتا ہو۔ ۱۹۵۰ء میں اناج کی کمی ۲۰ لاکھ ٹن تھی۔ چنانچہ پہلے پلان کے دوران اناج میں خودکفیل ہونے کی کوشش کی گئی۔ پلان کے تحت زراعت کی تنظیم اور سازگار موسمی حالات کی وجہ سے پہلے پلان کے دوران اناج کی پیداوار میں ۱۱ کروڑ ٹن کا اضافہ کیا گیا جس کی وجہ سے غذائی محاذ پر تقریباً خود اکتفائی حاصل ہو گئی اور پلان کے آخری مراحل میں راشننگ اور کنٹرول ختم کر دیے گئے لیکن یہ صورت زیادہ دن قائم نہ رہی۔ موسم کے دیوتا پھر روٹھ گئے۔ مانسون دھوکہ دینے لگے اناج کی درآمد نے اپنے کریہہ چہرے سے نقاب پھر سرکا دی۔ کھانے کی چیزوں کی قیمتیں پھر چڑھنے لگیں۔ دوسرے پلان کے زرعی نشانے بہت کم ثابت ہوئے اور اُن پر نظرِ ثانی کرنی پڑی۔ ۱۹۵۷ء میں ملک کے بڑے حصے میں خشک سالی کی وجہ سے اناج کی پیداوار ۱۰٪ کم ہوئی۔ ۱۹۵۸ء میں فصل کافی بہتر ہوئی اور ۷٫۵۵ کروڑ ٹن اناج پیدا ہوا جو ۱۹۵۷ء کی پیداوار سے ۲۰٪ زیادہ تھا۔ اگلے سال یعنی ۱۹۵۹-۶۰ء میں موسم کی خرابی کی وجہ سے فصل پھر کم ہوئی اور ۷٫۶۹ کروڑ ٹن اناج پیدا ہوا۔ لیکن ۱۹۶۰-۶۱ء میں حالات پھر بہتر ہوئے اور ۸٫۲۰ کروڑ ٹن اناج پیدا ہوا۔

تیسرے پلان کے درمیانی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۶۱-۶۲ء کے دوران اناج کی پیداوار میں مجموعی طور سے کوئی اضافہ نہیں ہوا اور پچھلے سال یعنی دوسرے پلان کے آخری سال کی طرح ۸٫۲۰ کروڑ ٹن

اناج پیدا ہوا۔ تیسرے پلان کے دوسرے سال حالت اور خراب ہوئی۔ ۱۹۶۲-۶۳ء اور ۱۹۶۳-۶۴ء کے دوران پیداوار جو ۱۹۶۱-۶۲ء اور ۱۹۶۲-۶۳ء میں ۸ کروڑ ٹن تھی ۱۹۶۳-۶۴ء میں ۸٫۶۹ کروڑ ٹن ہو گئی تھی لیکن ۱۹۶۵-۶۶ء میں گھٹ کر ۷٫۲۲ کروڑ ٹن پر آگئی۔ ۱۹۶۶-۶۷ء میں تھوڑا سا اضافہ ہوا اور اس سال مجموعی پیداوار ۷٫۴۴۲ کروڑ ٹن ہوئی۔ یکے بعد دیگرے دو برسوں تک خشک سالی اور بارش کی کمی کی وجہ سے زراعتی صورت بڑی مایوس کن ہو گئی۔ زراعتی پیداوار میں ترقی کی متوقع شرح ۶٪ کے مقابلے میں تیسرے پلان کے دوران واقعی ترقی صرف ۲٪ ہوئی۔ ہندوستانی زراعت کی یہ نیم جامد حالت یقیناً تشویش کا باعث ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ موسم کی ناسازگاری کے ساتھ ساتھ ادارہ جاتی اور ساختی خامیاں زراعت کی ترقی میں شدید رکاوٹ پیدا کر رہی ہیں۔

یہ بات بڑی اُمید افزا ہے کہ اب حالات کچھ بہتر ہوئے ہیں۔ ۱۹۶۷-۶۸ء میں اناج کی پیداوار ۹٫۵۶ کروڑ ٹن ہوئی۔ اچھے موسم کے علاوہ پیداوار بڑھنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ کسانوں پر زراعتی پیداوار کے نئے طریقوں کا اچھا اثر پڑا ہے۔ لیکن اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ موسم کی خرابی کی صورت میں بھی یہ ردِ عمل برقرار رہے گا۔

ہندوستانی زراعت کے بنیادی مسائل

ہندوستان کے زراعتی مسئلے کے دو پہلو ہیں: (۱) ہندوستان کے مختلف صوبوں میں زراعتی حالات اور معمولات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ زمین کی حالت، موسمی عناصر اور فصلوں کی ترتیب میں اختلاف کی وجہ سے زراعتی پیداآوری میں فرق ہے اگرچہ ملک بھر میں زراعت کے طریقے تقریباً یکساں ہیں۔ زراعتی حالات اور دستور میں فرق کی وجہ سے ہندوستانی زراعت کو مسلسل مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ برطانوی عہد میں سرکاری سطح پر اس کی کوشش نہیں کی گئی کہ باقاعدہ منصوبے کے تحت اِن مشکلات کو حل کیا جائے۔ منصوبہ بندی کے آغاز کے ساتھ حکومت نے ہندوستانی زراعت میں انقلاب لانے اور اُن رُکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش شروع کی جو زراعتی ترقی میں حائل تھیں۔

(۲) جب ہم ہندوستانی زراعت کا مقابلہ دوسرے ملکوں سے کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ فی ایکڑ اور فصل کے اعتبار سے پیداآوری بہت ہی کم ہے۔ اس کی کئی وجہ ہیں:

(۱) کسان چوں کہ کیمیاوی کھاد نہیں خرید سکتے اور کھیتوں کی مسلسل کاشت کے ذریعے اُن سے زیادہ سے زیادہ نچوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے اس لیے زرخیزی گھٹ گئی ہے۔

(ii) دوہری فصلوں اور فصلوں کی موثر ترتیب پر کاربند نہ ہونے کی وجہ سے زراعتی پیداوار تیزی سے گھٹتی ہے۔

(iii) ہندوستانی زراعت پر مانسون کی بے اعتباری اور آب پاشی کا باقاعدہ نظام نہ ہونے کا بہت خراب اثر پڑا ہے۔

(iv) انتشارِ اراضی (FRAGMENTATION OF LAND) کی وجہ سے کھیت بہت چھوٹے ہیں اور چھترے ہوئے ہیں۔ چھوٹے اور منتشر کھیتوں کا مطلب ہے کم پیداآوری۔ وسائل کی بربادی اور قرض داری۔

(v) ہندوستان کے کسان بے حد مقروض ہیں۔ گاؤں کا مہاجن ان کی ضروریات کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور ان کی کمائی کا بیشتر حصّہ سود ادا کرنے میں نکل جاتا ہے۔ اُن کی مالی حالت اتنی تباہ ہے کہ یہ اپنی کاشت کو بہتر کرنے کی طرف توجّہ بھی نہیں دے سکتے بلکہ اکثر اپنی زمین مہاجن کو فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ غرض کہ ہمارے کسانوں کی تباہ حالی اور ہندوستانی زراعت کی پسماندگی کا سبب دیہی بینکوں اور دیہی قرضوں کی سہولتوں کی کمی ہے۔

(vi) نقل و حمل اور گوداموں کی مناسب سہولتیں نہ ہونے، پیداوار کی قسم وار تقسیم اور معیاری اوزان کی کمی اور دلّالوں کی وجہ سے کسانوں کی حالت اور بھی بدتر ہو گئی۔ نتیجہ یہ تھا کہ بُرے زمانے میں کسان بہت مقروض ہو جاتا اور اچھے زمانے میں حالات کی بہتری سے اُس کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا۔ منافع کا زیادہ حصّہ دلّال کھا جاتے اور خود کسان کے پاس مشکل سے گزر بسر بھر کا بچ رہتا۔

(vii) زمین کے حقِ ملکیت اور لگان داری کے کڑے اور جابر قوانین (مثلاً زمین داری) کی وجہ سے زمین دار دولت مند ہوتے جاتے اور اسامی کسانوں کی غریبی بڑھتی جاتی۔ بیشتر ایسا ہوتا کہ کسانوں کی خالص آمدنی کا صرف پانچواں حصّہ اُن کے کام آتا اور باقی پیداوار زمین کے اُن مالکوں کو ملتا جو خود کام نہیں کرتے تھے۔ اِس طرح غیر حاضر زمین داری اور آسامیوں کی معاشی غلامی بھی زراعت کی پس ماندگی اور پیداآوری کی کمی کی ذمّہ دار تھی۔

تدارک: کسانوں کی آمدنی بڑھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ہماری زراعت سرمائے کے لیے ترستی ہے۔ اگر ہمیں زراعت کو مستحکم بنانا ہے تو مروّجہ دستور اور طریقوں میں تبدیلیاں لانی ہوں گی اور ایسی صورتیں نکالنی ہوں گی کہ مانسون کے غیر یقینی ہونے کی وجہ سے ہماری زراعت کی بے اعتباری دور ہو۔ مروّجہ دستور کی تبدیلیوں کو حقِ ملکیت اور لگان داری کے قوانین پر مرتکز ہونا چاہیے۔ کسانوں

کو ملکیت کا حق دینے کے ساتھ مشینی کھیتی اور کوآپریٹیو فارمنگ بھی شاید مسئلے کا موثر حل ثابت ہو۔ مروّجہ دستور میں تبدیلیوں کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ غیر حاضر زمین داروں کو اونچے لگان سے جو آمدنی ہوتی ہے اُس کو بالکل ختم کیا جائے۔ دیہی قرض کی تنظیم اور گوداموں کی سہولت سے کسانوں کو رفتہ رفتہ مہاجنوں اور دلالوں سے نجات مل جائے گی اور اس طرح ادارہ جاتی تبدیلیوں کی بنیاد مضبوط ہوگی۔ کھیتی کے طریقوں میں بھی انقلاب لانا چاہیے۔ کھیتی کے بہتر طریقے شروع کرنے سے پہلے چک بندی ہونی ضروری ہے۔ زراعت کے بہتر طریقوں سے فی کس پیداوار میں اضافہ ہوگا اور کسانوں کی خاصی بڑی تعداد فاضل ہو جائے گی جس کے لیے دوسرے غیر زراعتی روزگار کے مواقع فراہم کرنے ہوں گے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ زراعت کی ترقی کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں انھیں انفرادی اور تھوڑی تھوڑی منصوبہ بندی سے نہیں دور کیا جا سکتا۔ زراعت کو تقویت پہنچانے پھر سے تنظیم دینے اور اس کو نئی سمت دینے کے لیے مربوط مرکزی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ جس کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ زراعتی ترقی اور صنعتی توسیع دونوں ایک ساتھ عمل میں آئیں۔ زمین کی چک بندی اور بڑے پیمانے کی مشینی فارمنگ صرف اسی وقت ممکن ہیں جب معیشت کے غیر زراعتی سکٹر کی اتنی کافی توسیع ہو جائے کہ دیہی حلقے کی فاضل آبادی کو اُس میں کھپایا جا سکے۔ قومی حکومت کو اس مسئلے کی اہمیت کا پورا احساس ہے اسی لیے اُس نے منصوبہ بندی مربوط طریقے سے شروع کی ہے۔

حکومت کی پالیسی اور زراعتی منصوبہ بندی

برطانوی پالیسی: ایک عرصے تک برطانوی پالیسی زراعت کی طرف بالکل بے توجہی کی رہی۔ ۱۹۳۷ء میں صوبائی خود مختاری کے ساتھ صوبوں کی حکومتوں نے پہلی بار زراعتی ترقی میں دلچسپی لینی شروع کی لیکن کوئی باقاعدہ زراعتی منصوبہ نہ ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ صوبائی حکومتوں کی زیادہ تر توجہ لگان داری کے قوانین کی اصلاح اور دیہی قرض داری کم کرنے کی طرف رہی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جب اناج کی درآمد بالکل بند ہو گئی۔ تب ہندوستانی زراعت کی شدید کمزوریاں ظاہر ہوئیں۔

اناج کی شدید قلت کا مقابلہ کرنے کے لیے حکومت نے ۱۹۴۳ء میں "زیادہ اناج اُگاؤ" تحریک شروع کی۔ یہ تحریک صرف جزوی طور پر کامیاب ہوئی اور غذا کی رسد میں جو کمی پیدا ہو گئی تھی وہ

اس سے پوری نہ ہوسکی۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے آخری مراحل میں بڑے شہروں اور قحط زدہ علاقوں میں کنٹرول اور راشننگ کا بہت نمایاں رول رہا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد کھانے کی قلت شدت اختیار کرگئی کیوں کہ مغربی پنجاب اور سندھ کا فاضل اناج پیدا کرنے والا علاقہ پاکستان میں چلا گیا۔

قومی حکومت کی پالیسی: ۱۹۴۹ء میں ہندوستانی حکومت نے غذا میں خود کفالت کی ایک مکمل مہم شروع کی جس کا مقصد ملک میں زیادہ سے زیادہ اناج پیدا کرنا اور اناج کی درآمدات کو کم کرنا تھا۔ اس مہم نے اُس زراعتی منصوبہ بندی کے لیے زمین ہموار کی جو اپریل ۱۹۵۱ء میں پہلے پلان کے ساتھ شروع ہوئی۔

پہلے پلان کا زراعتی پروگرام: پہلے پلان میں زراعتی پیداوار کے پروگرام کو سب سے زیادہ ترجیح دی گئی اور اُن کے لیے ۳۴۱ کروڑ روپے فراہم کیے گئے۔ اس پلان کے دوران زراعتی اصلاحات اور کمیونٹی پروجکٹ پر خاص تاکید تھی۔ چاول کے بعض اہم علاقوں میں جاپانی طریقہ کاشت کامیابی کے ساتھ رائج کیا گیا۔ کثیر المقاصد ندی گھاٹی کی ترقی کے کئی پروگرام بہت جوش و خروش کے ساتھ شروع کیے گئے۔ زمینوں کی بازیابی کے پروگرام کو بھی پلان میں اہم جگہ دی گئی۔ زمینوں کے تحفظ پر بھی خاص توجہ دی گئی اور اس کام پر ۲ کروڑ روپے صرف کیے گئے۔ ان تمام اقدام کا نتیجہ یہ نکلا کہ زراعتی پیداوار پہلے پلان کے دوران ۱۷% بڑھ گئی اور ملک میں ۱۰۰۱ کروڑ ٹن زائد اناج پیدا ہوا۔

یاد رہے کہ پہلا منصوبہ زراعتی منصوبہ بندی کی پہلی کوشش تھی۔ پہلے پلان کی تشکیل کے وقت دیہی قرض کی کوئی جامع اسکیم تیار نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آراضیات اور دیہی قرض سے متعلق کوئی مربوط پالیسی پہلے پلان کے زراعتی پروگرام میں شامل نہ ہوسکی۔ منصوبہ بنانے والے پہلا پلان بناتے وقت کوآپریٹیو فارمنگ کی تحریک کی خوبیوں سے بہت متاثر تھے۔ اس لیے اُنھوں نے اس تحریک کو تقویت دینے کے لیے کوآپریٹیو ریسرچ مینجمنٹ اسکیم بنائی لیکن اس پلان کے دوران کوآپریٹیو فارمنگ کی تحریک کو زیادہ کامیابی نہیں ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ مالک کسانوں کی اوسط درجے کی آراضیات کو امداد باہمی کی بنیاد پر یک جا کرنے کی کوئی خاص کوشش سرکاری سطح پر نہیں کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زراعت میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی سرکاری کوششوں کے باوجود آراضیات کا اوسط سائز چھوٹا رہا۔

دوسرے اور تیسرے پلان کے زراعتی پروگرام : دوسرے پلان میں زراعتی ترقی کے مقابلے میں صنعتی ترقی پر زیادہ زور دیا گیا۔ چنانچہ زراعتی پروگرام کے لیے صرف ۶.۷ ۲ کروڑ روپے رکھے گئے اگرچہ پلان کا مجموعی خرچ ۴۶۰۰ کروڑ تھا۔ دوسرے پلان کے دو برسوں یعنی ۵۶-۱۹۵۵ء اور ۶۰-۱۹۵۹ء میں حالات سازگار نہیں رہے اور زراعتی پیداوار میں مجموعی اضافہ صرف ۲۹% ہوا۔ اگرچہ زراعتی پیداوار کے اضافے کا نشانہ ۱.۵۵ کروڑ ٹن تھا لیکن واقعی اضافہ ۱.۴۳ کروڑ ٹن ہوا، یعنی مجموعی پیداوار ۶.۹۰ کروڑ سے بڑھ کر ۸.۲۰ کروڑ ٹن ہوگئی۔ توقع تھی کہ تیسرے پلان کے ختم پر یعنی ۶۶-۱۹۶۵ء میں پیداوار ۱۰ کروڑ ٹن ہو جائے گی۔

تیسرے پلان میں زراعتی پروگرام کے لیے (جس میں چھوٹی بڑی آب پاشی کی اسکیمیں، زمین کا تحفظ اور کوآپریٹیوز شامل تھیں) ۱۲۸۰ کروڑ رکھے گئے تھے جب کہ دوسرے پلان میں ان مدات کی مجموعی رقم ۶۶۷ کروڑ تھی۔ لیکن زراعتی ترقی کے لحاظ پر تیسرے پلان میں کارگزاری کچھ اچھی نہیں رہی: زرا اوسط سالانہ اضافے کی متوقع شرح ۶% کے مقابلے میں واقعی اضافے کی شرح ۲% سالانہ رہی۔ تیسرے پلان کے آخری سال مجموعی پیداوار ۷.۲۰ کروڑ ٹن تھی اگرچہ اس سے پہلے کے سال پیداوار ۸.۹ کروڑ ٹن کی ریکارڈ سطح پر پہنچ گئی تھی۔

چوتھے پلان میں زراعتی پروگرام کے لیے ۱۸۹۲ کروڑ رکھے گئے۔ اِس میں چھوٹی بڑی آب پاشی کی اسکیمیں، زمین کے تحفظ کے اقدام اور امدادِ باہمی شامل ہیں۔ چوتھے پلان میں اناج کی مجموعی پیداوار میں ۳.۱ کروڑ ٹن کے اضافے کی توقع ہے۔ یہ بھی امید ہے کہ چوتھے پلان کے ختم تک اناج کی پیداوار ۱۲.۹ کروڑ ٹن تک پہنچ جائے گی۔

زراعتی منصوبہ بنانے والوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستانی منصوبہ بندی کے پندرہ برسوں میں بنیادی تبدیلیاں جیسی ہونی چاہئیں، نہیں ہوئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زراعتی منصوبے کا ایک جامع اصولی ڈھانچہ موجود ہونے کے باوجود اس پر عمل نہ ہو سکا۔ زراعتی منصوبہ بندی میں اِس بات کی اشد ضرورت ہے کہ سماجی ڈھانچے کو ایک ایسے بنیادی ڈھانچے میں بدلا جائے جس سے زراعتی پیداوار نمایاں طریقے سے بڑھ سکے۔ اِس کے لیے بے حد ضروری ہے کہ مکمل تنظیم کی کوشش کی جائے۔ لوگوں میں مل کر کام کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے اور ایسے اقدام کیے جائیں جن سے اُن کے نتائج پر نگاہ رکھی جا سکے۔ پہلے پلان کی حیثیت صرف تجربے کی تھی۔ دوسرے اور تیسرے پلان میں حالات کچھ زیادہ نہیں سدھرے۔ اِن دونوں منصوبوں کے زراعتی پروگرام میں

مکمل رابطے اور امتزاج کی کمی تھی۔ زراعتی محاذ پر تیسرے پلان کی کارگزاری مایوس کن ہی حقیقت یہ ہے کہ تیسرے پلان کے آخر میں زراعتی پیداوار کا انڈکس دوسرے پلان کے آخری سال سے نیچا تھا۔ حکومت کو زراعتی تنظیم کے مسئلے کی شدت کو محسوس کرنا چاہیے اور ایک ایسی زراعتی پالیسی وضع کرنا چاہیے جس کا مقصد ایسی بنیادی تبدیلیاں لانا ہو جو دیہی حلقے کو حرکت میں لا سکیں اور وہ زراعتی انقلاب جو ابھی شروع ہوا ہے، جاری رہ سکے۔

غذا کا مسئلہ اور پہلے پلان میں غذائی پالیسی

آزادی سے پہلے کی غذائی پالیسی: ۱۹۴۲ء میں مرکزی وزارتِ خوراک کے قیام کے بعد غذائی قلت کی طرف حکومت متوجہ ہوئی۔ ۱۹۴۳ء میں بنگال کے تباہ کن قحط نے حکومت کو متحرک کر دیا اور خوراک کے محاذ پر دو طرفہ لیکن ساکا حملہ شروع ہوا۔ لیکن جامع اور مربوط منصوبہ بندی کے ذریعے ہندوستانی زراعت کی از سرِ نو تنظیم کی جو کوشش ہونی چاہیے تھی وہ نہیں کی گئی۔ غذا کی قلت کو دور کرنے کی لمبی مدت کی پالیسی فوڈ گرین پالیسی کمیٹی (FOOD GRAIN POLICY) کی سفارشات پر مبنی تھی اور فوری علاج کے لیے راشننگ اور کنٹرول شروع کیے گئے۔

(الف) طویل المدت پالیسی کی حیثیت سے "زیادہ اناج اگاؤ" مہم:
۱۹۴۳ء کی کرشنما چاری کمیٹی (فوڈ گرین پالیسی کمیٹی) کی رپورٹ سے متاثر ہو کر صوبائی حکومت نے "زیادہ اناج اگاؤ" مہم شروع کی جس کے مقاصد یہ تھے: (۱) پرتی زمینوں اور نئی زمینوں کو زیر کاشت لایا جائے (۲) بہتر کھاد اور اچھے بیجوں کا استعمال بڑھایا جائے (۳) آب پاشی کی سہولتیں بہتر کی جائیں۔ برطانوی عہد میں مرکزی حکومت نے اس مہم کے سلسلے میں ۱۶ کروڑ روپے امداد اور قرض کی صورت میں دیے لیکن مہم کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں برآمد ہوا کیوں کہ اس مہم کے ساتھ زراعتی ترقی اور تنظیم کی کوئی مربوط اسکیم نہیں تھی۔ ناکامی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ کمیونٹی پروجیکٹ اور اکسٹنشن سروس جیسی کوئی مناسب ایجنسی نہیں تھی جو مہم کے پیغام کو کسانوں تک پہنچاتی۔

(ب) عارضی تدبیر کی حیثیت سے اناج کا کنٹرول: بنگال کے قحط کے بعد لارڈ ویول کی حکومت نے غلّے پر کنٹرول کے سلسلے میں ٹھوس اقدام کیے۔ برطانوی عہد میں جو اقدام کیے گئے ان کا تعلق کنٹرول کے قواعد و ضوابط، گاؤں سے اناج کی وصولی، قانونی راشننگ کے ذریعے اناج کی تقسیم، قیمتوں کی نگرانی اور اناج ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے پر پابندی سے تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اگست ۱۹۴۷ء میں جب انگریز رخصت ہوئے تو راشننگ شہروں اور قصبوں کے ۱۵½ کروڑ لوگوں کو اپنے حلقے میں لے چکی تھی، بلکہ کچھ دیہی علاقے بھی اس کی زد میں آچکے تھے۔ منافع خوری، چور بازاری اور رشوت پھیل چکی تھی جس کی وجہ سے حالات مایوس کن حد تک تشویش ناک ہو چکے تھے۔

آزادی کے بعد سے غذائی پالیسی: آزادی کے بعد سے حکومت نے تدریجی کنٹرول کی پالیسی اختیار کی اور ساتھ ہی "زیادہ اناج اُگاؤ" تحریک اور خود اکتفائی کی مہم کو بھی نئی سمت دی۔ اس پورے مسئلے سے نپٹنے کے لیے پانچ سالہ منصوبے شروع کیے گئے جن کا مقصد زراعت کو تقویت پہنچانا اور اسے از سرِ نو تنظیم دینا تھا۔

(الف) اناج کے کنٹرول کی پالیسی: آزادی کے فوراً بعد دسمبر ۱۹۴۷ء میں مہاتما گاندھی کے مشورے کے مطابق حکومت نے کنٹرول ختم کرنے کا تجربہ کیا۔ یہ فیصلہ دانش مندانہ نہیں تھا اور اس میں عجلت سے کام لیا گیا تھا۔ چنانچہ قیمتوں کے چڑھنے کے ساتھ دوبارہ کنٹرول شروع کرنا پڑا۔ بہرحال خود کفالت کی مہم کی کامیابی اور پہلے پلان کے اناج کا نشانہ حاصل ہو جانے کے ساتھ ۱۹۵۲ء کے وسط تک حکومت کو کنٹرول ختم کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کا موقع مل گیا اور ۱۰ جولائی ۱۹۵۴ء تک راشننگ اور کنٹرول کو بالکل ختم کر دیا گیا۔

(ب) "زیادہ اناج اُگاؤ" مہم اور خود اکتفائی کی کوشش:

آزادی کے بعد زیادہ اناج پیدا کرنے کی مہم کو نئی سمت دی گئی اور اس کو پہلے پلان کے کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور زراعتی پروگرام سے منسلک کر دیا گیا۔ یہ مہم ۱۹۵۲ء کی دوسری فوڈ گرین پالیسی کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں تیار کی گئی تھی۔ اس کمیٹی کو ٹھاکر داس کمیٹی بھی کہا جاتا ہے۔ اس مہم میں عمیق طریقۂ کاشت پر بھروسہ کیا گیا اور ہر صوبے کے لیے سال بہ سال اضافے کے واضح نشانے مقرر کرنے کے سلسلے میں مؤثر اقدام کیے گئے۔ پہلا پلان شروع ہونے سے پہلے اُس وقت کے وزیرِ خوراک شری کے۔ ایم منشی نے خود کفالت کی مہم کا افتتاح کیا۔ اس مہم کے تحت آب پاشی کی سہولتوں کی توسیع، بیماریوں اور کیڑوں سے فصلوں کی حفاظت اور فصلوں کے مقابلوں کا اہتمام کیا گیا۔ اس مہم کے تحت ۱۹۴۹-۵۰ء اور ۱۹۵۰-۵۱ء کے دو برسوں کے لیے اناج کی زائد پیداوار کا نشانہ ۴۲ لاکھ ٹن مقرر کیا گیا جس میں سے صرف ۲۵٪ حاصل ہو سکا۔

(ج) خوراک اور پہلا پلان: پہلے پلان میں چوں کہ زراعتی تنظیم اور ترقی پر زیادہ تاکید تھی

اِس لیے زراعت اور کمیونٹی پروجکٹ کے لیے ۰ء۵۳ کروڑ روپے رکھے گئے تھے۔ اِس مدت کے لیے زائد اناج کا نشانہ ۱۰۰ لاکھ ٹن مقرر کیا گیا تاکہ ملک ۱۸ء۳ آونس فی کس کے مطابق خود کفیل ہو سکے۔ مکمل مدت کی منصوبہ بندی اور متواتر بروقت مانسون نے معجزہ دکھلایا اور پہلے پلان کے دوران اناج کی پیداوار نشانے سے زیادہ ہوئی۔ پلان سے پہلے کی پیداوار ۵ء۴۹ کروڑ ٹن تھی جو پلان کے آخری سال بڑھ کر ۶ء۹ کروڑ ٹن ہو گئی چنانچہ غلے کی درآمد بھی ۱۹۵۱ء کے ۴۷ لاکھ ٹن سے گھٹ کر ۱۹۵۵ء میں صرف ۰ء۷ لاکھ ٹن رہ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غذا کے محاذ پر فتح پالی گئی ہے اور ہندوستانی معیشت کو پچھلے دس برسوں کے پیچیدہ اور تھکا دینے والے کنٹرول سے نجات مل جائے گی۔

ہندوستان جیسی ترقی پذیر معیشت میں اناج کی اہمیت :

ہندوستان جیسی معیشت میں جہاں زراعت غالب ہے اور صنعتی ترقی کے منصوبہ بند عمل کے زیرِ اثر بدل رہا ہے، حاصل اناج کی قسم اور مقدار کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ صنعتی ترقی اور شہر بانے کی شرح کا انحصار بازار میں آنے والے فاضل اناج کی رسد کی شرح پر ہے۔ ایک ترقی پذیر معیشت کو جس کا صنعتی حلقہ بڑھ رہا ہو، اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ بڑھتی ہوئی کارگزار آبادی کے لیے اناج کی پیداوار بلحاظ قسم اور مقدار بڑھائی جائے۔ جب حوصلہ مند منصوبہ بندی کے تحت صنعتیں قائم ہوتی ہیں تو عموماً معیشت کے مختلف حلقوں میں عدم توازن کا رجحان پیدا ہوتا ہے کیوں کہ زیادہ توجہ بنیادی اور بھاری صنعتوں میں سرمایہ لگانے کی طرف ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روزمرہ کے استعمال کی ضروری اشیا کی کمی اور اناج کی شدید قلت ہو جاتی ہے۔ اِس لیے ضروری ہوتا ہے کہ اناج کی رسد میں برابر اضافہ ہوتا رہے۔

ہندوستان میں اناج کی اِس بنیادی قلت کے ساتھ آبادی کا بڑھتا ہوا دباؤ غذائی مسئلے کو اور بھی اہم بنا دیتا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں ہندوستان کی آبادی ۳۶ء۱ کروڑ تھی جو ۱۹۶۱ء میں ۴۳ء۹ کروڑ ہو گئی۔ دس برسوں میں ۷ء۸ کروڑ کا یہ اضافہ جرمنی یا برطانیہ کی آبادی سے زیادہ تھا۔ سوچیے کہ ہندوستانی معیشت پر آبادی کا دباؤ کتنا سخت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی ہمیں "ایلس اِن ونڈرلینڈ" کی رڈکوئن کی طرح تیز تر دوڑنے پر مجبور کرتی ہے اور پھر پتہ چلتا ہے کہ ہم جہاں پہلے تھے وہیں اب بھی ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۶۰-۶۱ء میں آبادی ۴۲ء۴ کروڑ تھی، اور اناج کی پیداوار ۸ء۲ کروڑ۔ اس کے علاوہ ۳۰ لاکھ ٹن اناج برآمد کیا گیا۔ اِس طرح اناج کی مجموعی رسد تقریباً ۸ء۵ کروڑ تھی۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اناج کی فی کس رسد ۱۶ء۱ آونس تھی جب کہ ماہرین

غذا کی سفارش کے مطابق ۲۵ آؤنس ہونی چاہیے تھی۔ اس طرح اناج کا اوسطاً فی کس خرچ ۵ٹن سالانہ تھا جب کہ غذائی ضروریات کے مطابق ۶ٹن ہونا چاہیے تھا۔ تیسرے پلان کی ابتدا کے وقت پلاننگ کمیشن نے تخمینہ لگایا کہ ہندوستان کی آبادی ۶۰٪ حصے کی آمدنی اوسطاً قومی فی کس ماہانہ آمدنی کے ۲۵ روپیوں سے بہت کم تھی جب کہ ماہرین غذا نے یہ بات پورے طور پر ثابت کر دی ہے کہ صحت کے کم سے کم معیار کے لیے ایک شخص کو ۳۵ روپے ماہانہ پانا ضروری ہے۔ ڈی کیسٹرو (J.D. CASTRO) نے اپنی کتاب "جاگرفی آف ہنگر" (GEOGRAPHY OF HUNGER) میں یہ کہا ہے کہ بچے پیدا کرنے کے میلان کا بھوک سے براہ راست تعلق ہے۔ بھوک کا سرچشمہ وہ خامیاں ہیں جو کافی اور مقوی غذا کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں بھوک کی افراط ہوتی ہے وہاں آبادی کی منصوبہ بندی بڑی مشکل ہوتی ہے تاوقتیکہ اناج کی پیداوار میں مقداری اضافہ نہ ہو اور اس کی قسم نہ بہتر ہو۔ ہندوستان جیسے غلامی ملک میں جہاں منصوبے کے تحت ترقی کا کام ہو رہا ہے، کوشش کرنا چاہیے کہ بھوک ختم کی جائے۔ اسی لیے زیادہ اور بہتر قسم کا اناج پیدا کرنا ضروری ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ ہمارے ملک میں صرف کی سطح اونچی ہونے کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ آبادی برابر بڑھتی جا رہی ہے بلکہ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ پانچ سالہ منصوبوں میں سرمایہ لگنے کی وجہ سے ملک کی فی کس آمدنی بڑھ رہی ہے۔ آبادی کا بڑا حصہ اپنے افلاس کی وجہ سے اچھی غذا سے محروم ہے، اس لیے غذا کی طلب میں لچک بہت زیادہ ہے خصوصاً دیہی علاقوں میں۔ جیسے جیسے ترقی ہوتی ہے اور لوگوں کی آمدنی بڑھتی ہے ویسے ویسے اناج پر زیادہ خرچ کا میلان بڑھتا ہے۔ اسی لیے اس کی شدید ضرورت ہے کہ اناج کی پیداوار میں اضافے کے فوری اقدام کیے جائیں۔

مختصر یہ کہ ہندوستان جیسی ترقی پذیر معیشت میں اناج کی پیداوار پر سب سے زیادہ توجہ دینا چاہیے اور اس کے لیے عملاً بیج، کھاد، سینچائی کی سہولتیں، بھاری مشینیں اور دوسرے وسائل فراہم کرنے چاہئیں۔ اس سب کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ ہماری منصوبہ بند ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ اناج ہے اور ہماری سب سے بڑی خامی اناج کی کمی ہے۔ چوں کہ ہماری آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اس لیے غالباً یہ قلت تب تک ختم ہوگی جب تک ہم زراعت میں بنیادی تبدیلیاں اور اناج کی پیداوار میں انقلاب نہیں لاتے۔

دوسرے اور تیسرے پلان میں غذا کا مسئلہ اور غذائی پالیسی:

دوسرے اور تیسرے پلان میں اناج کے نشانے: پہلے پلان کے دوران غذا کے محاذ پر نمایاں کامیابی

سے متاثر ہو کر دوسرے پلان میں اناج کا نشانہ متعین کرنے میں انکسار سے کام لیا گیا اگرچہ دوسرا پلان زیادہ بڑا اور حوصلہ مند تھا۔ پلاننگ کمیشن نے پہلے پلان کے ۶۰ لاکھ ٹن کے مقابلے میں دوسرے پلان کے لیے زائد اناج کا نشانہ ایک کروڑ ٹن مقرر کیا۔

مئی ۱۹۵۶ء میں نیشنل ڈیولپمنٹ کونسل کی میٹنگ میں دوسرے پلان کے زراعتی نشانے پر بحث کے دوران ان کے کافی ہونے کے بارے میں شبہات ظاہر کیے گئے۔ چنانچہ پلاننگ کمیشن نے اناج کی پیداوار کا نشانہ بڑھانے کے سلسلے میں صوبوں سے مشورہ کیا جس کے نتیجے کے طور پر زائد پیداوار کا نشانہ بڑھا کر ۱ء۵۵ کروڑ ٹن کر دیا گیا۔ اگرچہ ابتدا میں غذائی بحران کا سامنا کرنا پڑا لیکن مجموعی طور سے دوسرے پلان کے دوران ۱ء۵۵ کروڑ ٹن زائد اناج کے مقابلے میں ۱ء۰۰ کروڑ ٹن زائد اناج پیدا ہوا۔ تیسرے پلان کا نشانہ ۱۰ کروڑ ٹن تھا۔ لیکن پلان کے آخری سال ۷ء۲ کروڑ ٹن اناج پیدا ہوا۔ اگرچہ پچھلے دو برسوں میں پیداوار زیادہ ہوئی تھی۔ ۱۹۶۳-۶۴ء کے ۸ کروڑ ٹن سے بڑھ کر ۱۹۶۴-۶۵ء میں پیداوار ۸ء۹ کروڑ ٹن ہو گئی۔ لیکن ۱۹۶۵-۶۶ء میں حالت پھر بگڑ گئی اور پیداوار گھٹ کر ۷ء۲ کروڑ ٹن ہو گئی۔

غذا کی قلت کے اسباب: غذا کی موجودہ قلت اور اناج کی قیمتیں تیزی سے چڑھنے کی کئی وجہیں تھیں۔ مثلاً تیسرے پلان میں بڑے پیمانے پر سرمایہ لگنے کی وجہ سے طلب میں اضافہ، ناسازگار موسمی حالات کی وجہ سے اناج کی پیداوار کے اضافے میں کمی اور ایک نیم آزاد مارکٹ میں اناج پیدا کرنے والوں اور فروخت کرنے والوں میں ذخیرہ اندوزی کا میلان۔ اس میں سے آخر الذکر کی تشریح کی ضرورت ہے۔ منصوبوں کے اصلاحِ اراضی، قرض کی سہولتوں میں توسیع اور عام زراعتی ترقی کے اقدام کی وجہ سے اضیات کا رقبہ بڑھ گیا ہے۔ ان زمینوں کی پیداوار جو پہلے کروڑوں کسانوں کو ملتی تھی اب تھوڑے سے وہ لوگ ہتھیا لیتے تھے جن کی حیثیت بچولوں کی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ مارکٹ میں آنے والی زراعتی پیداوار کا بڑا حصہ اُن دولت مند کاشتکاروں کا ہوتا ہے جنھیں جدید اصلاحِ اراضی اور قرض کی سہولتوں سے فائدہ پہنچا ہے اور جن کے پاس ذخیرہ کرنے کی استعداد اور سکت ہے۔ اگرچہ اناج پیدا کرنے والے طبقے کی ترتیب میں تبدیلی آئی ہے اور اناج پیدا کرنے والوں کی اناج روکنے کی استعداد بڑھ گئی ہے لیکن جہاں تک اشیا کو ذخیرہ کرنے کا سوال ہے تاجروں کی اہمیت اب بھی پہلی ہی جیسی ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں سوکھا پڑنے اور قحط کی سی حالت ہونے کی وجہ سے قیمتیں بڑھنے کی طرف مائل ہوتی ہیں اور قیمتوں میں مزید اضافے کی توقع کے ساتھ تاجروں کو ذخیرہ کرنے کی رغبت بڑھتی ہے۔

آئیے اس تجزیے کے بعد اب یہ دیکھیں کہ فوڈ گرین انکوائری کمیٹی ۱۹۵۷ء کن نتائج پر پہنچی تھی۔

بازار میں آنے والی فاضل پیداوار کی مقدار میں کمی اور غذائی بحران کی تین وجہیں اس کمیٹی نے پیش کی ہیں:
(۱) پیدا کرنے والے خود پہلے سے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ (۲) قیمتیں بڑھنے کی توقع میں یہ لوگ زیادہ عرصے تک اناج روکنے پر مائل ہوتے ہیں۔ (۳) پیدا کرنے والوں کی نقد روپے کی ضرورت قیمتیں زیادہ ہونے کی وجہ سے تھوڑی پیداوار بیچ کر پوری ہو جاتی ہے۔ تیسری وجہ دوسری ہی کا ایک حصہ ہے۔ یہ دونوں وجہیں بہ حیثیت مجموعی وہ مطلب رکھتی ہیں جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی اناج ذخیرہ کرنے کا میلان۔ معتبر اعداد و شمار نہ ہونے کی وجہ سے کمیٹی کی اس رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ کسانوں کا اناج کا صرف اتنا بڑھ گیا ہے کہ اُس کا اثر بازار میں آنے والی فاضل پیداوار پر پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کمیٹی کی یہ بات عام مفروضے کی حیثیت سے نہیں تسلیم کی جا سکتی اگرچہ اُن چند کسانوں کے لیے ٹھیک ہو سکتی ہے جو حاشیے پر ہیں۔

تدارک : اکتوبر ۱۹۶۵ء میں باجرے کی فصل کم ہونے کی وجہ سے ملک کی غذائی حالت تشویش ناک ہونا شروع ہوئی۔ مانگ کا دباؤ بڑھنے کی وجہ سے گیہوں کی قیمت میں بھی اضافے کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ جنوری ۱۹۶۶ء میں ریزرو بینک نے بینکوں کو ہدایت دی کہ وہ دھان اور چاول کی ضمانت پر قرض دینے کا حاشیہ بڑھا دیں اور ان کی ضمانت پر نئے قرض ۵۰ ہزار روپیوں سے زیادہ نہ دیں۔ اس کے علاوہ اناج کی ممکن پیداوار کی ضمانت پر قرض دینے کی پابندیاں بھی سخت کر دی گئیں۔ ریزرو بینک نے ۱۰ جون ۱۹۶۶ء کو اہم ترین ہدایت جاری کی جس کے تحت ہر بینک کے لیے یہ لازمی ہو گیا کہ ہر قسم کے اناج کی ۴۰٪ سے کم ضمانت پر قرض نہ دیا جائے۔ اس کے علاوہ بینکوں پر یہ شرط پہلی بار عائد کی گئی کہ فوراً فوراً کوئی بینک چاول اور دھان کی ضمانت پر پچھلے سال کے اس زمانے کی قرض سے ۶۶٪ سے زیادہ اور باقی اناج کی ضمانت پر سال گزشتہ سے ۷۵٪ سے زیادہ قرض نہیں دے گا۔ قرض کی ان کڑی شرائط کے باوجود اناج کی قیمتوں میں، خصوصاً دھان اور چاول کی قیمتوں میں کوئی خاص کمی نہیں آئی۔

فوری طور پر حکومت نے دو اقدام کیے۔ منتخب علاقوں میں اناج کے بیوپاریوں پر پابندی عائد کرنے کے لیے لائسنس کا قاعدہ شروع کیا گیا اور قلت کے علاقوں میں اناج کی تقسیم کے لیے فیئر پرائس شاپ کھولی گئیں۔ حکومت نے جون ۱۹۶۶ء میں اشوک مہتہ کی صدارت میں ایک با اختیار کمیٹی مقرر کی تاکہ یہ غذائی صورت حال کا جائزہ لے اور اس سلسلے میں ضروری سفارشات کرے۔ اس کمیٹی کی بنیادی سفارش یہ تھی کہ فوڈ گرین اسٹیبلائزیشن آرگنائزیشن (FOOD GRAIN-STABILIZATION ORGANIZATION)

کے نام سے ایک مناسب تنظیم کی جائے جو اناج کی قیمتوں میں استحکام لانے کے
لیے موثر کارروائی کرے۔ کمیٹی نے یہ بھی رائے دی کہ اناج کی تقسیم فیئر پرائس شاپ یا کوآپریٹیو سوسائٹیوں
اور تاجروں کی تنظیموں کے توسط سے عمل میں آئے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ فوری اقدام جن کی تمام تر توجہ
رسد کی طرف ہے اُس بنیادی مسئلے کو نہیں حل کر سکتے جو روز بہ روز شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ دراصل
زمینی اصلاحات، قرض اور زرعی ترقی کی ایسی مخلوط پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت ہے جس کے
تحت پیداوار بڑھائی جا سکے۔ لمبی مدت کی ایسی تدابیر کرنی چاہئیں جن سے زرعی پیداوار پر
بڑے پیداکاروں کی گرفت کم ہو۔ ملکیت اراضی کے حدود متعین کرنے اور جلد از جلد اُس کی تعمیل کی
طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسا کرنے سے پیداکاروں کو ذخیرہ کرنے کی رغبت کم ہو گی۔ اناج میں
سٹہ بازی کو بالکل ممنوع قرار دینا ضروری ہے کیوں کہ تاجروں اور بڑے پیداکاروں کی ذخیرہ
کرنے کی رغبت سٹے کی خرید و فروخت سے بہت متاثر ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا باتوں کے علاوہ اس بات کی اہمیت بھی کم نہیں ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں
جہاں کھیتی کا دارومدار مانسون کے رحم و کرم پر ہے فصلوں کا بیمہ قطعی ضروری ہے۔ موسمی حالات
کی وجہ سے کسانوں کو جو نقصان پہنچتے ہیں ان کے ازالے کی بہترین صورت فصلوں کا بیمہ ہے جس
کے ذریعے یہ نقصان اُن سارے کسانوں پر پھیلایا جا سکتا ہے جن کو کم و بیش اسی خطرے کا سامنا
کرنا پڑتا ہے۔ فصلوں کے بیمے کا عام مقصد منفرد کسانوں کو سیلاب، قحط، آتش زدگی، بے وقت بارش
اور فصلی بیماریوں سے ہونے والے نقصانات سے محفوظ رکھنا ہے۔ اس طرح ایک معینہ پریمیم دے کر
کسان ان نقصانات کے معاوضے کی یقین دہانی حاصل کر سکتے ہیں۔ ترقیاتی منصوبہ بندی کے دوران
فصلوں کے بیمے کی موثر تعمیل اناج کا ذخیرہ بنانے اور قیمتوں کو استحکام دینے میں مفید ثابت ہو گی۔

بہت اچھی بات ہے کہ فصل کے بیمے کی اسکیم چوتھے پلان میں شامل کر لی گئی ہے۔ ابتداً اس پر
عمل درآمد پنجاب میں ہو گا اور پھر اس تجربے کی روشنی میں یہ اسکیم دوسرے صوبوں میں شروع
کی جائے گی بشرطے کہ وہ اس کے خواہش مند ہوئے۔ پنجاب گورنمنٹ کی بیمے کی اسکیم پلاننگ کمیشن
نے اگست سنہ ۶۵ء میں منظور کی۔ اس اسکیم پر ۱۲ء۱۰ کروڑ روپے صرف ہوں گے اور اس کے تحت
دو اناج کی فصلیں یعنی گیہوں اور چنا اور دو تجارتی فصلیں روئی اور گنا آئیں گی۔ اسکیم تین
برسوں پر پھیلائی گئی ہے۔ سب سے پہلے چھ ضلعوں میں اس کے چھ مراکز قائم ہوں گے اور ہر مرکز کا
رقبہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاک کے برابر ہو گا۔ تین سال بعد اس اسکیم کا جائزہ لیا جائے گا اور اگر

تشفی بخش ثابت ہوئی تو اسے دوسرے ضلعوں میں شروع کیا جائے گا۔ جن علاقوں میں یہ اسکیم شروع کی جائے گی وہاں یہ سب کے لیے لازمی ہوگی تاکہ سب اس میں شریک ہوں۔ پریمیم لگان کے ساتھ وصول کیا جائے گا۔ یہ اسکیم سارے نقصانات کی ذمہ داری لے گی۔ مثلاً سیلاب، اولے، ٹڈی، خشک سالی، فصلی کیڑے اور وہ تمام نقصانات جو کسان کے اختیار سے باہر ہیں۔ لیکن معاوضے کے حق دار صرف اس صورت میں ہوں گے جب نقصان فصل کے ۲۵٪ سے زیادہ ہو اور مجموعی معاوضہ کسی حالت میں بھی فصل کے نقصان کے ۵۰٪ سے زیادہ نہ ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ چوتھے پلان میں پنجاب کے تجربے کے بعد فصل کی اس اسکیم کو آئندہ منصوبوں میں زیادہ وسیع پیمانے پر دوسرے علاقوں میں بھی شروع کیا جائے گا۔

دوسرے پلان کے دوران اناج کی قیمتوں میں اضافے کے اسباب کا جائزہ :

فوڈ انکوائری کمیٹی (۱۹۵۷ء) کا کہنا ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اناج کی قیمت بڑھنے کی وجہ طلب میں عام اضافہ ہے۔ طلب میں اس اضافے کی وجہ وہ سرکاری اور غیر سرکاری مصارف ہیں جو پچھلے چند برسوں میں خسارے بجٹ اور قرض کے ذریعے پورے کیے گئے ہیں۔ عام افراطِ زر کی یہ قوتیں مختلف عوامل کے ذریعے اناج کی رسد پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ عوام کی قوت خرید میں مسلسل اضافے کی وجہ سے بہت سے لوگ نے اناج کے صرف کی مقدار اور قسم بدلی ہے۔ مثلاً بہت سے لوگ جو پہلے شکر قند اور ٹاپیوکا (TAPIOCA) جیسی جڑیں کھا کر گزارا کرتے تھے، اب باجرا اور موٹے چاول خرید رہے ہیں اور جو لوگ پہلے باجرا اور موٹے چاول استعمال کرتے تھے اب گیہوں اور چاول استعمال کر رہے ہیں۔ طلب پر جو دوسری چیز اثر انداز ہوئی وہ تھی ذخیرہ کرنے کی قوت میں تبدیلی ۱۹۵۵ء تک صرف تاجر اناج ذخیرہ کرتے تھے لیکن ۵۶-۱۹۵۵ء میں ایک اہم تبدیلی یہ پیدا ہوئی کہ متوسط درجے کے کسانوں نے اناج روکنا شروع کیا جو ذخیرہ اندوزی کا کافی بڑا حصہ تھا۔

رسد کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے کمیٹی نے بتایا کہ ۱۹۵۵ء میں باجرے کی پیداوار میں ۳۰ لاکھ ٹن کی کمی کی وجہ سے قیمتیں بڑھنا شروع ہوئیں اور چاول اور گیہوں پر دباؤ بڑھ گیا۔ موسم کی خرابی اور مانسون کی بے ربطی نے حالت اور بھی سنگین کر دی۔ یاد رہے کہ اناج کی قیمت میں اضافے کے لیے جب حالات موزوں ہوتے ہیں تو پہلے پیداوار میں کمی آتی ہے اور پھر بازار میں اناج کی آمد سست پڑتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قیمتیں چڑھنا شروع ہوتی ہیں۔ اناج کی قیمتوں کے بارے میں ہمارا حال کا تجربہ اس بات کی صداقت کی تصدیق کرتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ۱۹۶۵ء کے وسط سے قیمتوں میں جو اضافہ ہوا وہ اناج کی طلب اور رسد پر اثر انداز ہونے والے عناصر، مالی اور دوسرے عوامل کے عمل کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ قیمتوں میں حال میں جو اضافہ ہوا ہے اُس کی تشریح کے لیے صرف طلب اور رسد کے عدم توازن پر توجہ دینا کافی نہیں ہے بلکہ اس معاملے کی تہہ میں جانے کی ضرورت ہے اور اس بنیادی خامی کے اسباب کے تجزیے کی ضرورت ہے جو ہماری معیشت میں پانچ سالہ منصوبوں کے دوران غیر متوازن ترقی کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔

اناج کی قیمتیں متعین کرنے کے سلسلے میں مہتا کمیٹی کے اقدام؟

مہتا کمیٹی (۱۹۵۷ء) نے اناج کی قیمتوں کو مستحکم کرنے کے لیے ایک ادارہ قائم کرنے کی سفارش کی ہے جس کو فوڈ اسٹیبلائزیشن آرگنائزیشن (FOOD STABILIZATION ORGANISATION) کا نام دیا ہے۔ یہ ایک بڑا تجارتی ادارہ ہوگا جس کا بنیادی مقصد بفر اسٹاک قائم کرکے اناج کی قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ کو روکنا ہوگا۔ مثلاً اگر قیمتیں گر رہی ہیں تو اناج خریدنا اور اگر بڑھ رہی ہیں تو فروخت کرنا۔ کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ اس آرگنائزیشن کے علاوہ حکومت پرائس اسٹیبلائزیشن بورڈ (PRICE STABILIZATION BOARD) بھی قائم کرے جو قیمتوں کو مستحکم کرنے کی عام پالیسی بنائے اور وقتاً فوقتاً اُس کی تعمیل کے پروگرام تیار کرے۔ فوڈ اسٹیبلائزیشن آرگنائزیشن کو وقتاً فوقتاً قیمتوں کے وہ حدود مقرر کرنے ہوں گے جن کے اندر وہ خرید و فروخت کرے گا۔ یہ قیمتیں اُن حدود کے اندر ہوں گی جو پرائس اسٹیبلائزیشن بورڈ کی سفارش پر حکومت متعین کرے گی۔ لیکن اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ اس بورڈ کی صحیح حیثیت کیا ہوگی۔ غالباً یہ بورڈ دفتری سطح پر نہ ہوگا بلکہ وزارت کی سطح پر ہوگا جہاں پالیسی کی تشکیل ہوتی ہے۔

یہ نہ بھولنا چاہیے کہ قیمتوں کے استحکام کا دار و مدار اناج کی پیداوار کے استحکام پر ہے جو بڑی حد تک قیمت کے اس رشتے پر منحصر ہے جو غذائی اور تجارتی فصلوں کے درمیان ہوتا ہے۔ چنانچہ ملک کو جس چیز کی شدید ضرورت ہے وہ قیمتوں کا ایک گٹھا ہوا ڈھانچہ ہے جس کے ذریعے غذائی اور تجارتی فصلوں کی قیمتوں کا تناسب قائم رکھنے کی کوشش کی جائے۔ ایگری کلچرل پرائسز کمیشن (AGRICULTURAL PRICES COMMISSION) نے فروری ۱۹۶۵ء سے کام کرنا شروع کیا اور اس مسئلے سے نپٹنے کی برابر کوشش کر رہا ہے۔ یہ کمیشن قیمتوں سے متعلق ایک مناسب پالیسی کی تشکیل میں حکومت کی مدد کر رہا ہے۔

فوڈ گرینز انکوائری کمیٹی ۱۹۵۷ء کی سفارشوں کا جائزہ :

حکومت نے شری اشوک مہتہ کی زیرِ صدارت یہ کمیٹی جولائی ۱۹۵۷ء میں قائم کی اور اُس نے اپنی رپورٹ نومبر ۱۹۵۷ء میں پیش کر دی۔ یہ رپورٹ بہت مفید اعداد و شمار فراہم کرتی ہے۔ اس میں اُن عوامل کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے جن کی وجہ سے دوسرے پلان کی ابتدا سے اناج کی قیمتیں بڑھی ہیں۔ لیکن کمیٹی کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچی اور اس کی سفارشات فرسودہ قیموں پر مبنی ہیں اور ان میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ (۱) کمیٹی نے اناج کی قیمتوں کے استحکام کو غذائی پالیسی کا بنیادی مقصد بنایا ہے۔ اس نے ایک بہت با اختیار بورڈ بنانے کی سفارش کی ہے جس کا نام پرائس اسٹیبلائزیشن بورڈ ہوگا۔ یہ بورڈ عام قیمتوں کے استحکام سے متعلق پالیسی اور پروگرام بنائے گا۔ اس نے ایک اور مناسب تنظیم کے قیام کی سفارش کی ہے جس کا نام فوڈ گرین اسٹیبلائزیشن آرگنائزیشن ہوگا جو بورڈ کی تشکیل کردہ پالیسی کے اُس حصے کی تعمیل کرے گا جس کا خاص تعلق اناج کی خرید فروخت سے ہوگا۔ ہماری جیسی معیشت میں جہاں تجارت آزاد ہے اگر اناج کی رسد میں ذرا بھی تخفیف ہوتی ہے تو تاجروں کو زیادہ منافع کمانے کا لالچ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک ایسی تنظیم ہونا ضروری ہے جو سٹہ بازی اور ذخیرہ اندوزی کے عناصر کو بے اثر کر سکے۔

(۲) کمیٹی نے ایک مرکزی غذائی مشاورتی کونسل بنانے کی سفارش کی ہے جس میں غیر سرکاری لوگ ہوں اور جو وزارتِ خوراک اور پرائس اسٹیبلائزیشن بورڈ کی مدد کرے۔ اسی طرح ایک اور تنظیم قیمتوں کی تفتیش کے لیے ہو جو تمام ضروری اعداد و شمار جمع کرے۔ اس کا نام پرائس انٹیلی جینس ڈیویژن ہو اور اس کا سربراہ کوئی سینیئر افسر ہو جو پرائس اسٹیبلائزیشن بورڈ کے سکریٹری کے فرائض بھی انجام دے۔ یہ بورڈ غذائی مشاورتی کونسل اور پرائس انٹیلی جینس ڈیویژن کی مدد سے قیمتوں پر نگرانی رکھے اور وقتاً فوقتاً فوری اقدام کی سفارش کرے۔ بہر حال ہمیں اتنی متعدد تنظیموں کی افادیت میں شبہ ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ اگر گاڑی میں بہت سے پہیے لگا دیے گئے تو ایک مسئلہ ان میں تال میل کا ہوگا جس کا اثر اس کی کارگزاری پر پڑے گا۔

(۳) فوڈ اسٹیبلائزیشن آرگنائزیشن کے اہم ترین کاموں میں ایک اہم کام صرف ذخیرہ ہی نہیں بلکہ کافی بڑا ذخیرہ بنانا ہے۔ اس سلسلے میں کمیٹی کا خیال ہے کہ آئندہ برسوں میں ہر سال ۲۰ سے ۳۰ لاکھ ٹن اناج درآمد کرنے کی ضرورت ہوگی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ

کہ کمیٹی شیخ چلی کی طرح ہوائی قلعے تعمیر کرتی ہے اور بیرونی زرِ مبادلہ کی مشکلات کے پیشِ نظر اناج کی درآمد کی پالسی کے نتائج پر غور کرنے سے گریز کرتی ہے۔

(۴) اناج کی پیداوار بڑھانے کی مختلف اسکیموں پر کمیٹی نے غور کیا ہے۔ مثلاً آب پاشی کی چھوٹی بڑی اسکیمیں، اچھے بیج اور کیمیاوی کھاد کی تقسیم، زمینوں کی بازیابی وغیرہ۔ اس نے بہت سی سفارشیں بھی کی ہیں مثلاً یہ کہ جو رقمیں آب پاشی کی بڑی اسکیموں کے لیے رکھی گئی تھیں اور نہیں صرف ہو پائی تھیں انھیں آب پاشی کی چھوٹی اسکیموں کے لیے مخصوص کر دیا جائے، ایک جیسے علاقوں میں شرحیں ایک جیسی ہوں، بیج پیدا کرنے والے فارموں کی تعداد بڑھائی جائے اور کیمیاوی کھاد کی پیداوار پر زیادہ زور دیا جائے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس سلسلے میں کمیٹی کا رویہ علمی بلکہ کتابی ہے۔ کمیٹی نے کوئی نئی راہ نہیں نکالی ہے اور اس کی بیشتر سفارشات سے ایسے سب لوگ واقف ہیں جنھیں غذائی مسئلے کے اُن پہلوؤں سے واقفیت ہے جن کا تعلق اناج کی پیداوار اور رسد سے ہے۔

زمانۂ حال کا غذائی بحران —— اسباب کا جائزہ اور اصلاح کے طریقے:

۶۲-۱۹۶۱ء اور ۶۳-۱۹۶۲ء کے درمیان ہندوستان میں اناج کی پیداوار تقریباً ۸ کروڑ ٹن پر قائم رہی۔ لیکن ۶۵-۱۹۶۴ء ایک غیر معمولی سال تھا جب پیداوار ۸.۹۰ کروڑ ٹن تک پہنچ گئی۔ اگلے سال یعنی تیسرے پلان کے آخری سال، پیداوار پھر گھٹی اور ۷.۲۳ کروڑ ٹن پر آگئی اس کی وجہ سے قیمتیں ایک دم چڑھ گئیں اور غذائی صورت حال بڑی نازک ہو گئی۔ اگلے سال پھر بارش کم ہوئی اور پیداوار میں صرف ۲۰ لاکھ ٹن کا برائے نام اضافہ ہوا۔ لیکن اس کے بعد کچھ حالت بہتر ہوئی۔ ۶۸-۱۹۶۷ء میں موسم کچھ اچھا رہا جس کی وجہ سے ۹.۵۶ کروڑ ٹن سے کچھ زیادہ اناج پیدا ہوا۔

معاشی اصطلاح میں غذائی بحران کے معنی ہیں رسد کے مقابلے میں طلب کی زیادتی۔ پچھلے چند برسوں میں آبادی بڑھنے اور نیا سرمایہ لگنے کی وجہ سے آمدنیاں بڑھی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مانگ برابر بڑھتی رہی ہے۔ آبادی اور آمدنی کے اضافے کو دھیان میں رکھ کر پلاننگ کمیشن نے حساب لگایا ہے کہ ۷۱-۱۹۷۰ء تک اناج کی مانگ میں ۳.۴۵٪ کا سالانہ اضافہ ہوگا، یعنی ۶۱-۱۹۶۰ء کے ۷.۴۴ کروڑ ٹن سے بڑھ کر ۱۰.۰۳ کروڑ ٹن مانگ ہو جائے گی۔

جب ہم رسد پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ۶۲-۱۹۶۱ء سے ۶۳-۱۹۶۲ء تک پیداوار کی سطح ۶۱-۱۹۶۰ء

کے برابر رہی بلکہ قدرے کم رہی۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۴ء تک اناج کی پیداوار ۸ کروڑ ٹن سالانہ رہی اور ۱۹۶۵ء میں اس سے بھی ۱۰ لاکھ ٹن کم ہوئی۔ چارہ، بیج اور ضائع شدہ مقدار کو چھوڑ کر موثر رسد مع درآمدات ۷۵ کروڑ اور ۷۶ کروڑ ٹن کے درمیان رہی۔ صرف ۱۹۶۶ء میں رسد ۶۰ لاکھ ٹن کم رہی۔ اس بنیادی کمی اور منافع خوروں اور ذخیرہ اندوزوں کی پیدا کی ہوئی مصنوعی قلت کی وجہ سے ہمیں ۱۹۶۵ء میں پہلی بار اور ۱۹۶۶ء میں دوسری بار غذائی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ اس موقع پر طویل المدت اور قلیل المدت اسباب میں فرق کرنا اور مسئلے کا تفصیلی جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس لیے آئیے پہلے طویل المدت اسباب کو لیں جنھوں نے مذکورۂ بالا بحران کے لیے دو موقعوں پر زمین ہموار کی۔

(۱) پانچ سالہ منصوبوں کے تحت دفاع اور ترقیاتی کاموں پر روز افزوں صرف کی وجہ سے لوگوں کی آمدنی برابر بڑھتی رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اناج کی طلب مسلسل بڑھی ہے۔

(۲) اناج کی طلب میں اضافے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ آبادی میں ۲٪ سالانہ کا اضافہ ہوتا رہا ہے اور لوگ معمولی قسم کے اناج پر اچھے قسم کے اناج کو ترجیح دینے لگے ہیں۔

(۳) صنعتی ترقی اور دیہاتوں سے شہروں کی طرف آبادی کی منتقلی کی وجہ سے اس بات کی ضرورت رہی ہے کہ بازار میں آنے والی فاضل مقدار برابر بڑھتی رہے لیکن زراعتی منصوبہ بندی اور بنیادی تبدیلیوں کی کمی کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا۔

(۴) زراعتی محاذ پر موثر اور بھرپور عمل نہ ہونے کی وجہ سے تیسرے پلان کے چار برسوں میں پیداوار کی سطح ۱۹۶۱ء کے برابر یا اُس سے کم رہی ہے۔

اب آئیے اُن قلیل المدت اسباب کا جائزہ لیں جن کی وجہ سے بحران آیا:

(۱) جب طویل المدت عناصر کی وجہ سے قیمتیں بڑھیں اور آگے چل کر مزید اضافے کی توقع ہوئی تو بے ایمان تاجروں نے اناج کی شکل میں اثاثہ رکھنے کی غرض سے اناج کی ترسیل نیا جاکردی اور جن رستوں سے اناج بازار میں آتا تھا وہ راستے تنگ ہونے لگے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ قلت طویل المدت عناصر نے پیدا کی تھی لیکن بہ ہی ... تاجروں ... نے ذخیرہ اندوزی [illegible]

[illegible]

[illegible]

بدل گیا۔ چاول کی پیداوار اگرچہ ۱۱٪ بڑھی لیکن بازار میں چاول کی آمد ۱۴٪ گھٹ گئی۔ اسی طرح گیہوں کی پیداوار پچھلے سال کے مقابلے میں اگرچہ صرف ۰.۲٪ گھٹی لیکن بازار میں گیہوں کی آمد ۲۰٪ کم ہو گئی۔ ہمارے خیال میں اس غیر معمولی رویّے کی ذمہ دار حکومت کی پالیسی کی خامی ہے۔ بازاروں میں بڑا اضطراب تھا، پھر ماری، صوبائی سرکاری قیمتیں اور اناج کے لانے لے جانے پر سخت پابندیاں تاجروں اور کسانوں کے درمیان حسب معمول لین دین میں مانع رہیں۔ اس کی وجہ سے رسد اور طلب کی بنیادی خامی اور بھی شدید ہو گئی اور آخر بحران آ ہی گیا۔

(۳) خوشحال کسانوں نے یا تو تاجروں کے ساتھ سازش کر کے یا خود ذخیرہ کر کے حقیقی قلت کے ساتھ مصنوعی قلت بھی پیدا کر دی۔ یاد رہے کہ ہمارے کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے پروگراموں اور قرضوں کی سہولتوں نے انہیں لوگوں کو براہ راست اور بالواسطہ فائدہ پہنچایا ہے۔ اب ان لوگوں میں غلہ کو روکنے کی استعداد زیادہ ہے۔ چنانچہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اگر بحران کے وقت میں ذخیرہ اندوزی کی رغبت ہوئی۔ غرض کہ بحران کی بنیادی وجہ ملک میں اناج کی کمی اور حقیقی کمی تھی جس کو بے ایمان تاجروں انہوں نے متمول کسانوں سے مل کر مصنوعی قلت پیدا کر کے اور بھی سنگین کر دیا۔

یاد رکھنا چاہیے کہ قیمتوں میں اضافہ بحران کی علامت ہے۔ قیمتیں صرف تب ہی کم کی جا سکتی ہیں جب طلب کم کی جائے اور رسد بڑھائی جائے۔ طلب کو کم کرنے کا سب سے موثر اور براہ راست طریقہ راشننگ ہے۔ لیکن ہندوستان انتظامی حالت اتنی ناقص اور انحطاط پذیر ہے کہ یہ بڑے شہروں اور کمی کے مخصوص علاقوں میں موثر اور مکمل راشننگ کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہے۔ چنانچہ کیرل اور مغربی بنگال کی شدید کمی والی ریاستوں کو چھوڑ کر باقی علاقوں میں دو قسم کے بازاروں کا سامنا تھا، ایک خوردہ فروشی کا عام بازار اور پھر پرائس مارکیٹ جہاں چیزیں مناسب قیمت پر ملتی تھیں۔ جہاں تک شدید کمی والے علاقوں کا سوال تھا وہاں قانونی راشننگ نافذ کرنے کے علاوہ کوئی صورت نہیں تھی۔ اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اگرچہ اناج کے زون قائم کرنے، راشننگ نافذ کرنے، بڑے شہروں کے گرد گھیرا ڈالنے اور تھوک فروشوں پر لائسنس نافذ کرنے جیسے [illegible] بنیادی [illegible]

[illegible] جائے۔

[illegible]

(۱)۔ اناج کی قلت کی صورت راشننگ عائد کیے بغیر اناج ہر شخص کے لیے سستا نہیں مل سکتا۔ لیکن ہم نے قانونی راشننگ صرف اُن علاقوں میں نافذ کی جہاں اناج کی شدید قلت تھی۔ باقی علاقوں میں دو بازاری نظام قائم رہا یعنی بازار اور فیئر پرائس مارکٹ۔

(۲)۔ جب تک پیداوار موثر طلب سے کم رہے گی، اناج کی درآمد کی لعنت سے نجات ملنا ناممکن ہے۔ ۱۹۶۶ء میں ۸۰ لاکھ ٹن اناج درآمد کیا گیا۔ امریکہ اور دوسرے ملکوں سے معاہدے کے تحت صرف گیہوں درآمد کرنا کافی نہ ہوگا۔ چاول کو بھی اس معاہدے میں شامل کرنا ضروری ہے۔ بندرگاہوں پر درآمد کیا ہوا مال اُتارنے کی سہولتیں ایمرجنسی کے طور پر بڑھانی ہوں گی۔

(۳) کسانوں کو رغبت دلانے کے لیے قیمتوں کی امدادی پالسی ضروری ہے تاکہ دیہاتوں سے شہروں کی طرف اناج کی رسد جاری رہے۔ ۱۹۶۳-۶۴ء، ۱۹۶۵-۶۶ء میں کسانوں کا جو رویہ تھا اُس سے یہ بات ظاہر ہے کہ شہروں میں اناج صرف اُسی وقت آئے گا جب کسانوں کو معقول قیمت کا یقین ہو۔ اسی لیے قیمتوں کی معقول امدادی پالسی کی ضرورت ہے۔ ایک مائل بہ ترقی بنیادی قیمت اتنی ہونی چاہیے جو ایک کارکرد اور جدید طریقے استعمال کرنے والے کسان کے مصارفِ کاشت کے برابر ہو اور کچھ جوکھم کی بھی گنجائش رکھتی ہو۔ فوڈ کارپوریشن جو ابھی حال میں قائم ہوا ہے اُس کو تیار رہنا چاہیے کہ جتنا بھی مال اس کم سے کم بنیادی قیمت پر بیچنے کے لیے بازار میں آئے وہ سب خرید لے۔ اس کے علاوہ منتخب مقامات اور وقت پر جو اناج ابتدائی بازار کی قیمتوں پر ملے اُس کو بھی خریدنے پر آمادہ رہے۔ اِس سلسلے میں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قیمتوں کی امدادی پالسی کے پروگرام میں ایگریکلچرل پرائز کمیشن جو ابھی حال میں قائم ہوا ہے، بہت اہم رول ادا کر رہا ہے۔ قیمتوں کا تعین اُس کمیشن کا معمول بن گیا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کمیشن نے اپنی پہلی رپورٹ ۱۹۶۵ء کے وسط میں شائع کی۔ اِس رپورٹ کا نام "پرائس پالسی فار خریف سیریلز ۱۹۶۵-۶۶ء" ہے۔

(۴) پسندیدہ قیمتوں کو نافذ کرنے کے لیے حکومت کو بڑا کافی بفر اسٹاک بنانا ہوگا۔ اِس کے لیے گودام کی سہولت فراہم کرنا ضروری ہوگا۔ ۱۹۶۶ء تک ۲۰ لاکھ ٹن اناج کا ذخیرہ یا بفر اسٹاک بنانے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ چوتھے پلان کے دوران اس اسٹاک کو بڑھا کر ۵۰ لاکھ ٹن کرنے کا قصد ہے۔ فوڈ کارپوریشن جو حال میں قائم ہوا ہے اِس اسٹاک کے بنانے میں روز بہ روز زیادہ رول ادا کرے گا۔ توقع ہے کہ کارپوریشن بنیادی طور سے صوبائی خریداری، ذخیرہ، نقل و حرکت، تقسیم اور اناج کی فروخت کا کام انجام دے گا۔

(۵) عملی نکتۂ نظر سے اناج کی سرکاری تجارت کافی بڑے پیمانے پر ضروری ہے۔ اگر قیمتوں کو

قابو میں رکھنا ہے۔ آگے چل کر قومی پیمانے پر سرکاری تجارت کی ضرورت ہوگی لیکن تجارت کے اُن عام
ذریعوں میں دخل نہیں دینا چاہیے جو دور دراز علاقوں کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ آزاد منڈی میں
سرکاری تجارت صرف تب کامیاب ہو سکتی ہے جب اناج کا کافی ذخیرہ ہو۔ اگر اناج کی سب سے
بڑی خریدار سرکار ہے تو آزاد منڈی پر اُس کی کارروائیوں کا گہرا اثر پڑے گا۔ کارپوریشن کو ابتدائی
بازار میں ابتدائی قیمت پر خرید کرنا چاہیے اور مزید خریداری بازار کی قیمتوں پر کرنی چاہیے۔ کارپوریشن
کو اناج کی درآمد کا انتظام کرنا چاہیے۔ اس کو فیئر پرائس کے نظام کی بھی نشو و نما کرنی چاہیے۔ درحقیقت
کارپوریشن کو تھوک کے منتخب بازاروں میں وقتاً فوقتاً کافی اسٹاک نکالتے رہنا چاہیے تاکہ تھوک
کی قیمتیں ایک مناسب حد سے آگے نہ بڑھنے پائیں۔ گوداموں اور ذخیرے کی معقول سہولتوں کی فراہمی سرکاری
تجارت کی پالیسی کا ضروری جز ہونا چاہیے اور ان سہولتوں کو زیادہ بہتر کرنا چاہیے۔

غلّے کی سرکاری تجارت:

ہمارے ملک میں بچولیوں کے ہاتھوں اناج کی قیمت میں جس طرح تبدیلی ہوتی ہے اور سماج دشمن
عناصر کی سرگرمیوں کی وجہ سے اناج کی آمد میں جس طرح رخنہ اندازی ہوتی ہے وہ بہت بڑا مسئلہ
ہے جسے اگر فوراً حل نہ کیا گیا تو ملک کی معاشی ترقی کی جڑیں ہل جائیں گی۔ ۱۹۵۷ء کی فوڈ گرینز انکوائری
کمیٹی نے معاملے کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ مجوزہ فوڈ گرینز اسٹیبلائزیشن
آرگنائزیشن کو رفتہ رفتہ تھوک کی قیمتوں کے بڑے حصے کو اپنے اختیار میں لے لینا چاہیے اور
حکومت کو یہ پالیسی بنانا چاہیے کہ آگے چل کر اناج کی تھوک تجارت ایک منصوبے کے تحت مکمل
طور سے سماجی حلقے میں لے لی جائے۔ ۱۹۶۳-۶۴ء کی اناج کی قلت کے بعد حکومت نے جزوی طور سے
فوڈ کارپوریشن کے ذریعے خریدنا شروع کر دیا تو اس کا اثر کھلے بازار پر پڑے گا۔ کارپوریشن
ایک خود مختار ادارہ ہے جو تجارتی سطح پر کام کرتا ہے۔ کارپوریشن نے ۱۰۰ کروڑ کے سرمائے سے
جو کام شروع کیا تھا۔ ۱۹۶۵-۶۶ء میں کارپوریشن نے ۱۵۰ کروڑ کی خریداری کی تھی جو ۱۹۶۶-۶۷ء میں بڑھ کر
۲۰۰ کروڑ تک پہنچ گئی۔ اسی طرح اناج کی فروخت ۱۹۶۵-۶۶ء کے ۱۳۰ کروڑ سے بڑھ کر ۱۹۶۶-۶۷ء میں
۲۷۵ کروڑ ہو گئی۔ ۱۹۶۶-۶۷ء میں کارپوریشن کو ۳ کروڑ کا منافع ہوا جب کہ ۱۹۶۵-۶۶ء میں ۲۰ لاکھ کا منافع
ہوا تھا۔ مختصر یہ کہ فوڈ کارپوریشن بڑے پیمانے پر اناج کی سرکاری تجارت کی پہلی منظم کوشش ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اناج جیسی ضروری شے کی سرکاری تجارت کا براہ راست اثر ضروریات زندگی
کی قیمتوں پر پڑے گا۔ ایک معیشت میں جس میں جزوی طور سے سرکاری تسلط ہے، وہاں پیداوار

کے محرک کے طور پر قیمتوں میں تھوڑی کمی بیشی جائز ہے لیکن قیمتوں کو تاجروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا کردہ خوب نفع کمائیں، نہ تاجروں کو اس کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ معاشی ترقی کے دوران وہ مارکٹ پر حد سے زیادہ اختیار حاصل کرلیں۔ حکومت نے اناج کی سرکاری تجارت کا فیصلہ اپریل ۱۹۵۹ء میں کیا لیکن اس سلسلے میں ٹھوس قدم ۱۹۶۳-۶۴ء کی غذائی قلت کے بعد اٹھائے گئے۔

اب ہم ۱۹۵۹ء کی سرکاری تجارت کی پالسی کی خاص باتوں کو بیان کریں گے۔

(۱) شروع میں سرکاری تجارت صرف چاول اور گیہوں تک محدود رکھی جائے۔

(۲) اگرچہ سرکاری تجارت کے تحت تھوک فروشوں کو خوردہ فروشوں کے ہاتھ معینہ قیمت پر اناج فروخت کرنے کی اجازت ہے لیکن مستقل قیمتیں نہیں مقرر کی جاتیں۔ یہ بات صوبائی حکومتوں پر چھوڑ دی گئی کہ اگر وہ رسد میں کمی رہنے کے بغیر اس کی تعمیل کرسکتی ہوں تو مستقل قیمتیں متعین کریں۔

(۳) اسکیم کے دو حصے ہیں، ایک عارضی اور دوسرا مستقل۔

الف ۔ عارضی اسکیم کے تحت تھوک فروشوں کو لائسنس یافتہ تاجروں کی حیثیت سے اس کی اجازت ہوگی کہ ایک معینہ کم سے کم قیمت پر کسانوں سے اناج خرید سکیں۔ حکومت کو حق ہوگا کہ تمام یا کچھ اسٹاک مقررہ قیمت پر تاجروں سے خرید لے۔ تاجروں کو اختیار ہوگا کہ باقی اسٹاک خوردہ فروشوں کے ہاتھ قیمتوں کے معینہ حدود کے اندر رہ کر بیچ سکیں۔ عارضی اسکیم کے دوران حکومت بازار میں آنے والی تمام فاضل پیداوار شہری اور نیم شہری علاقوں کے باشندوں کے لیے فوراً نہیں خریدے گی بلکہ رفتہ رفتہ اپنی خریداری بڑھائے گی تاکہ مارکٹ پر اُس کا اختیار بڑھتا رہے یہاں تک کہ سرکاری تجارت مکمل طور سے نافذ ہوجائے۔

ب ۔ سرکاری تجارت کی مستقل اسکیم میں گاؤں کی سطح پر فاضل اناج کی تحصیل کوآپریٹیوز کے ذریعے کی جائے گی۔ اس کے بعد یہ اناج مارکٹنگ کوآپریٹیوز اور چوٹی کی مارکٹنگ سوسائٹیوں کے ذریعے آخری تقسیم کے لیے خوردہ فروشوں اور کنزیومرز کوآپریٹیوز تک پہنچے گا۔ کوشش کی جائے گی کہ مستقل اسکیم کی اس منزل تک جلد از جلد پہنچا جائے اور درمیانی زمانے میں جیسے جیسے کوآپریٹیوز ترقی کرتی جائیں اناج کی تھوک تجارت میں اُن کا دخل برابر بڑھتا جائے۔

(۴) حکومت ایک ایسی ایجنسی قائم کرے گی جو خواہش مند کسانوں سے براہ راست خرید کرے گی تاکہ انھیں معینہ کم سے کم قیمت ملنے کا یقین رہے۔ یہ ادارہ دام کے دام خرید و فروخت کے اصول پر کام کرے گا۔

اب جبکہ ہم نے اناج کی سرکاری تجارت کے اپنے فیصلے کو عمل میں لانے کے لیے فوڈ کارپوریشن قائم کر لیا ہے، مناسب ہوگا کہ اس کی موافقت اور مخالفت میں جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں انھیں مختصراً بیان کر دیں۔ کہا جاتا ہے کہ اناج کی سرکاری تجارت ضروریاتِ زندگی کی قیمتوں پر نگرانی کی طرف پہلا قدم ہوگا۔ اس کے ذریعے تاجروں کی اُن کارستانیوں کا انسداد ہو سکے گا جو یہ منافع کمانے کے لیے قیمتوں کے معاملے میں کرتے رہتے ہیں۔ وہ اسباب دور ہوں گے جن کی وجہ سے ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری ہوتی ہے۔ تقسیم کے دوران چور بازاری کا انسداد ہوگا اور سب سے اہم بات یہ کہ اس سے منصوبہ بند معاشی ترقی میں مدد ملے گی۔ دوسری طرف یہ نہ بھولنا چاہیے کہ بنیادی مسئلہ اناج کی ناکافی رسد، ذخیرہ رکھنے کی ناکافی سہولتیں اور بازار اور تجارت سے متعلق تجربہ کار عملے کی کمی ہے۔ چنانچہ سرکاری تجارت کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ فوڈ کارپوریشن کا عملہ ایماندار اور تجربہ کار ہو۔ شروع میں یہ صوبوں کی سطح پر خرید و فروخت اور ذخیرہ بنانے کا کام کرے۔ کسانوں کی مارکٹنگ کوآپریٹیوز کی ہمت افزائی کی جائے کہ یہ کارپوریشن کی موثر ایجنسی بنیں۔ گودام اور ذخیرہ رکھنے کی سہولتیں اشد ضروری ہیں کیوں ان کے بغیر سرکاری تجارت کا نظام چلنا ناممکن ہے۔ آخر میں زراعتی پیداوار کو موجودہ نیم جامد حالت سے نکالنے کے لیے کوئی بنیادی علاج ضروری ہے تاکہ اناج کی رسد کافی بڑھائی جا سکے۔

زراعتی پیداوار کی نیم جامد حالت ـــــ تشخیص اور بنیادی علاج

ہندوستان کی غذائی صورت یہ ہے کہ اسے مسلسل قلتوں کا سامنا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ تیسرے پلان میں زراعتی حلقے کی کارگزاری اچھی نہیں رہی، خصوصاً اناج کی پیداوار کے معاملے میں۔ غذائی پیداوار کی صورت تیسرے پلان میں یہ رہی کہ پانچ برسوں میں سے چار برس پیداوار کی سطح ۱۹۶۰-۶۱ء کی سطح سے نیچے رہی۔ اناج کی مجموعی پیداوار جو ۱۹۶۲-۶۳ء اور ۱۹۶۳-۶۴ء میں ۸ کروڑ ٹن تھی ۱۹۶۴-۶۵ء میں بڑھ کر ۸ء۹ کروڑ ٹن ہو گئی۔ اگلے سال یعنی ۱۹۶۵-۶۶ء میں جو پلان کا آخری سال تھا، پیداوار پھر گھٹی اور ۷ء۲ کروڑ ٹن پر آ گئی۔

پیداوار کی اس جامد حالت کی بنیادی ذمہ داری برسرِ اقتدار پارٹی پر ہے جو ہندوستانی زراعت کو متحرک کرنے میں ناکام رہی اور ایسی بنیادی تبدیلیاں نہ لا سکی جو بہتر انتظامی ڈھانچے پر مبنی ہوں اور جن کے ذریعے زراعت میں نئی روح پھونکی جا سکے۔ حال میں حکومت نے زراعتی فارموں کے انتظام کا

مطالعہ کیا۔ رپورٹ سے ظاہر ہوا کہ چوٹی کے کسان جن کی تعداد کسانوں کی مجموعی تعداد کی ۱۰٪ کے قریب ہے۔ کل قابل کاشت زمین کے ۵٫۶٪ حصّے کے مالک یا مختار ہیں۔ ملک کی مجموعی قومی آمدنی میں ان کا حصّہ ...۶ کروڑ ہے۔ غرض کہ حکومت کی زرعی اصلاح کی معمولی کوشش کے باوجود زمینوں کی تقسیم کی نابرابری نمایاں ہے اور بے زمین کسانوں کی بہت بڑی تعداد متموّل کسانوں کے سہارے گزارا کرتی ہے۔ یہی ۱۰٪ چوٹی کے کسان زراعت پر حاوی ہیں۔ یہی لوگ بڑے تاجر، ساہوکار اور پنچایت کے لیڈر ہیں۔ چنانچہ یہ قدرتی بات ہے کہ زمینوں کی تقسیم جتنی ہی ناہموار ہوگی چھوٹے کسانوں کی محتاجی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ اس کے علاوہ غریب کسانوں میں تعلیم کی کمی اس بات کی ضمانت ہے کہ ان میں اتنی اہمیت نہ ہوگی کہ یہ اپنے کو منظم کرسکیں۔ چنانچہ یہ بہ آسانی دولت مند کسانوں کے پنجے میں پھنس جاتے ہیں جو اپنے سیاسی اور معاشی مقاصد کے لیے ان سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

یہ دس فی صدی چوٹی کے کسان اپنا بیشتر وقت غیر زراعتی سرگرمیوں میں صرف کرتے ہیں اور گاؤں کی سیاست کے بہت شائق ہوتے ہیں اسی لیے انھیں پیداوار بڑھانے سے کوئی خاص دل چسپی نہیں ہوتی۔ انھیں تو بس زراعت سے ایک مستقل آمدنی ہونی چاہیے۔ مختصر یہ کہ انھیں دیہات کے ووٹروں کو اپنے قابو میں رکھنے کی زیادہ فکر رہتی ہے اور اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ محنت اور زمین کا حاصل یعنی پیداوار زیادہ سے زیادہ بڑھائی جائے۔ چوں کہ دیہات کے زیادہ تر ووٹ ان کے اختیار میں ہوتے ہیں اس لیے برسر اقتدار پارٹی انھیں ناخوش کرنے کی جرأت نہیں کرسکتی۔ لیکن کسانوں کے اس طبقے کو خوش رکھنے کی پالیسی کے نتائج بہت تباہ کن ثابت ہوئے ہیں۔ اٹھارہ سال کی منصوبہ بندی کے باوجود ہم ہندوستانی زراعت کو متحرک کرنے میں ناکام رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زراعت کی اور خصوصاً اناج کی پیداوار کی نیم جامد حالت بدستور ہے۔ چنانچہ بنیادی علاج یہ ہے کہ دیہی طبقے کی خواندگی کی سطح اونچی کی جائے تاکہ متوسط اور نچلے طبقے کے کسان جو واقعی کسان ہیں، انھیں عمل پر اُکسایا جاسکے اور متموّل کسانوں کے چنگل سے آزاد کرایا جاسکے۔

بدقسمتی سے پلاننگ کمیشن نے عارضی علاج کو زیادہ اہمیت دی جس میں زیادہ فصل دینے والے بیج اور کیمیاوی کھاد پر زیادہ زور ہے۔ چوتھے پلان میں زراعت کو جمود سے نکالنے کے لیے دو تدبیروں میں سے ایک یہ ہے کہ ۴۱ء۲ کروڑ ہکٹر زمین کو زیادہ پیداوار دینے والے

بیجوں کے استعمال، اور عمیق کاشت کے تحت لایا جائے۔ دوسرا اصلاح یہ ہے کہ کیمیاوی کھاد، خصوصاً نائٹروجن والی کھاد کی رسد بڑھائی جائے۔ درحقیقت کھاد کی پیداوار بڑھانے کے لیے حکومت بیرونی سرمائے، قیمتوں کے تعین میں اور کھاد کی تقسیم میں رعایتیں دینے پر رضامند ہوگئی ہے۔ یہ اس لیے ضروری ہوگیا کیونکہ صرف اچھے بیج کے پروگرام کے سلسلے میں ۲۴ لاکر ڈر ٹن کیمیاوی کھاد کی ضرورت ہوگی۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اچھے بیج کا پروگرام جو کھاد کی نئی پالیسی سے منسلک ہے، صرف عارضی حل ہے۔ بنیادی حل وہی ہے کہ جو فی کے متمول کسانوں کا اثر کم کیا جائے۔

باب ۱۴

زرعتی خرید و فروخت اور دیہی قرض

ہندوستانی زراعت کی تجدید اور تنظیم اس وقت تک نا ممکن ہے جب تک دیہی مالیات اور زراعتی خرید و فروخت کے مسائل موثر طریقے سے حل نہیں ہوتے۔ ۱۹۵۱ء کی آل انڈیا کریڈٹ سروے کی رپورٹ میں پہلی بار زراعتی خرید و فروخت اور دیہی قرض کے مسئلے کا تفصیلی جائزہ لیا گیا اور یہ سفارش کی گئی کہ ان مسائل کے موثر حل کے لیے دیہی علاقوں کی مارکٹنگ سوسائٹیوں اور قرض کی سوسائٹیوں میں پورا تال میل ہونا چاہیے۔ اس رپورٹ سے متاثر ہو کر حکومت نے زیادہ سے زیادہ کسانوں کو قرض کی سہولت فراہم کرنے کا فیصلہ کیا۔ بیشتر کریڈٹ سوسائٹیاں متوقع فصل کی بنیاد پر قرض دیتی ہیں۔ چنانچہ ضروری ہے کہ کریڈٹ سوسائٹیوں کے ساتھ ساتھ مارکٹنگ سوسائٹیاں بھی قائم کی جائیں اور جب کسانوں کو قرض دیا جائے تو ساتھ یہ تحریری معاہدہ بھی ہو کہ قرض کی مدد سے جو فصل پیدا ہوگی وہ کٹنے کے بعد قریب ترین مارکٹنگ سوسائٹی کو لے جائی جائے گی۔ مارکٹنگ سوسائٹیاں بھی جمع شدہ فصل کی ضمانت پر قرض دے سکتی ہیں۔

ہندوستان میں زراعتی خرید و فروخت کے مسائل :

رورل کریڈٹ کمیٹی کی اس اہم سفارش کی روشنی میں زراعتی خرید و فروخت کے بنیادی مسائل کا جائزہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے : (۱) زراعتی پیداوار کا کافی بڑا حصہ کسان گاؤں ہی میں کم قیمت پر بیچ دیتے ہیں اور یہ منظم منڈی تک نہیں پہنچ پاتا۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ آڑھتیے بہت ہیں جو گاؤں گاؤں گھوم کر اناج خرید لیتے ہیں۔ بعض اوقات کسان گاؤں کے مہاجن کے اتنے مقروض ہوتے ہیں کہ ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہوتی کہ اپنی پیداوار کا بیشتر حصہ مہاجن تاجروں کے ہاتھ سستے داموں بیچ دیں۔ (۲) پیداوار کی قسم میں یکسانیت نہ ہونے کی وجہ سے بھی منظم منڈی میں براہ راست فروخت میں دقت ہوتی ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے ۱۹۳۷ء میں اناج کی قسم کی درجہ بندی اور نشان دہی کے لیے

ایگری کلچرل پروڈیوس ایکٹ (AGRICULTURAL PRODUCE ACT) پاس کیا گیا اور سرکاری تصدیق یافتہ اشیاء پر "ایگ مارک" کا نشان ثبت کیا جانے لگا۔ (۳) رسل و رسائل اور نقل و حمل کی ناکافی سہولتوں کی وجہ سے فصل کم قیمت پر گاؤں ہی میں بیچنا پڑتی ہے (۴) فصل غیر معمولی سستے داموں بکنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ کولڈ اسٹوریج کی سہولتیں کم ہیں اور کوئی ایسی ایجنسی نہیں ہے جو کسانوں کو بازار کی قیمتوں سے مطلع کرتی رہے۔ (۵) چند کسان جو آڑھتیوں اور دلالوں کی گرفت سے آزاد ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اپنی پیداوار منظم بازاروں میں لے جاتے ہیں تو وہ وہاں کی سازشوں اور فریب کاریوں کے شکار ہو جاتے ہیں جہاں ایک معیاری وزن کے بجائے کثرت اوزان ہوتی ہے اور بے چارہ جاہل کسان انھیں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ (۶) گوداموں کی کمی کی وجہ سے بھی کسان مجبور ہوتے ہیں کہ فصل کٹتے ہی بیچ دیں جب کہ قیمتیں بہت کم ہوتی ہیں۔

زراعتی خرید و فروخت کے مسائل کے حل کے سلسلے میں سرکاری پالیسی:

برطانوی عہد میں رائل کمیشن آن ایگری کلچر (۱۹۲۸ء) نے صوبوں اور مرکز میں خرید و فروخت کا ادارہ قائم کرنے کی سفارش کی تھی لیکن حکومت نے ۱۹۳۴ء میں ایگری کلچرل مارکٹنگ ایڈوائزر کا تقرر کیا۔ ۱۹۳۵ء میں ڈائرکٹریٹ آف مارکٹنگ اینڈ انسپکشن قائم کیا گیا۔ ساتھ ہی مرکز اور صوبوں میں خرید و فروخت کے ادارے قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان اداروں کا تعلق تحقیق، ترقی اور درجہ بندی کے مسائل سے تھا لیکن یہ اوسط درجے کے کسان کی مشکلات دور کرنے میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔

آزادی کے بعد حکومت نے آل انڈیا رورل کریڈٹ سروے کی رپورٹ سے متاثر ہو کر اس کام کو آگے بڑھانے کے اقدام شروع کیے جو برطانوی حکمرانوں نے شروع کیا تھا۔ یہ کام زراعتی خرید و فروخت اور اس کو دیہی قرض کی پالیسی سے منسلک کرنے سے متعلق تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ آزادی کے بعد سے ڈائرکٹریٹ آف مارکٹنگ اینڈ انسپکشن نے اپنی سرگرمیوں کا میدان کافی بڑھا دیا ہے اور بازار اور خرید و فروخت کے معمولات کو منضبط کرنے کی طرف زیادہ توجہ دینی شروع کر دی ہے۔ ملک کے ۵۰۰۱ بازاروں میں سے ۱۸۱۰ ضابطے کے تحت لے آئے گئے ہیں۔ یاد رہے کہ ایک منضبط بازار جس کا انتظام ایسی کمیٹی کے تحت ہوتا ہے جس میں اناج پیدا کرنے والوں، تاجروں، کوآپریٹیوز اور مقامی اداروں کے نمایندے ہوتے ہیں، عام بھلائی کا باعث ہوتا ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں زراعتی خرید و فروخت کے طریقے اتنے خراب اور افسوس ناک ہیں،

منضبط بازار اشد ضروری ہیں۔ ہندوستان کے منصوبوں پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت کو زراعتی خرید و فروخت کے مسائل کے موثر اور فوری حل کی بڑی فکر ہے۔

پہلا پلان شروع ہونے سے قبل سات صوبوں کی مجلس قانون ساز میں ایگری کلچرل پروڈیوس ایکٹ پاس ہو چکا تھا اور اس کی تکمیل کے لیے قدم اٹھائے جا چکے تھے۔ پہلے پلان کے دوران تین اور صوبوں نے بھی ایسے ہی قانون منظور کیے۔ اس طرح منضبط منڈیوں کی تعداد ۲۸۶ سے بڑھ کر ۴۷۱ ہو گئی۔ اس پلان میں زور دیا گیا کہ ایگری کلچرل پروڈیوس ایکٹ جو ۱۹۳۷ء میں پاس ہوا تھا، اس کا دائرۂ عمل بڑھایا جائے۔ یہ اس لیے ضروری تھا کیوں کہ ماضی میں درجہ بندی کا کام صرف گھی اور تیل تک محدود تھا۔ پہلے پلان میں اس پر بھی تاکید تھی کہ قسم اور اصلیت کی جانچ کے لیے لیبوریٹریاں قائم کی جائیں۔ اس کام کی ابتدا ہو چکی ہے اور ناگپور میں مرکزی تجربہ گاہ اور آٹھ علاقائی تجربہ گاہیں قائم ہو چکی ہیں۔

پہلے پلان کے دوران سنٹرل ایگری کلچرل آرگنائزیشن نے چالیس اہم اشیا کی خرید و فروخت کے بارے میں تحقیقات کی اور رپورٹیں شائع کیں۔ پہلے پلان کے دوران ایک اور اہم کام یہ ہوا کہ ۱۹۵۲ء کا فارورڈ کنٹریکٹ ایکٹ بنا اور اگلے برس فارورڈ مارکٹس کمیشن قائم کیا گیا۔ یہ کمیشن منظور شدہ فارورڈ ٹریڈنگ ایسوسی ایشن کے حسابات کی جانچ کرتا ہے اور مختلف مارکٹوں کے کاموں کی نگرانی کرتا ہے۔ پہلے پلان کے دوران منضبط منڈیوں کی تعداد ۴۷۰ تھی جو دوسرے پلان میں بڑھ کر ۷۳۰ ہو گئی۔ تیسرے پلان میں بقیہ منڈیوں میں سے بیشتر اس اسکیم کے تحت لے آئی گئیں۔ تیسرے پلان کے دوران ایگری کلچرل پروڈیوس ایکٹ کی بھی توسیع ہوئی۔

دوسرے پلان کے زراعتی خرید و فروخت کے پروگرام میں منڈی میں آنے والی فاضل پیداوار کے بیوپار کے لیے کوآپریٹیو ایجنسیوں پر خاص تاکید کی گئی۔ اس پلان کے پہلے چار برسوں میں ۱۷۴۳ مارکٹنگ سوسائٹیاں قائم کی گئیں اور انھیں ۲۸ء۵ کروڑ روپے کی بہ مقدار امداد دی گئی۔ ریزرو بینک کے زراعتی قرض کے شعبے نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ منصوبوں کے دوران کی بڑی سوسائٹیوں سے پہلے مارکٹنگ سوسائٹیاں قائم کرنی ہوں گی تاکہ قرض لینے والوں سے یہ معاہدہ کیا جا سکے کہ ان کی پیداوار ایک مخصوص مارکٹنگ سوسائٹی کو فروخت کی جائے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ دو مقصدی کوآپریٹیو سوسائٹی جو خرید و فروخت اور قرض دونوں کام انجام دے انتظامی اخراجات کے لحاظ سے سستی پڑے گی اور دو الگ الگ سوسائٹیوں کے مقابلے میں کم خرچ ہوگی۔ مارکٹنگ اور کریڈٹ سوسائٹیوں کا اتحاد مستقبل کی کثیر المقاصد کوآپریٹیو سوسائٹیوں کے قیام کی طرف ایک اہم قدم ہوگا۔ توقع ہے کہ چوتھے پلان کے دوران

کوآپریٹیو ایجنسیاں بازار میں آنے والی فاضل پیداوار کا ۲۵% اپنے ہاتھ میں لے لیں گی۔ باقی مال دوسری مارکٹنگ ایجنسیاں خریدتی رہیں گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوآپریٹیو مارکٹنگ ایجنسیوں پر حکومت کے زور دینے کے باوجود ان کی ترقی کی شرح نسبتاً سست رہے گی کیوں کہ ابتدا میں بہت سے انتظامی اور مالی مسائل حل کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۹۵۶ء میں پارلیمنٹ نے ایگری کلچرل پروڈیوس کارپوریشن ایکٹ منظور کر کے مرکز اور صوبوں ویئر ہاؤسنگ کارپوریشنوں کا جال بچھانے کا کام شروع کر دیا۔ ان کارپوریشنوں کی کارگزاری کی نگرانی کے لیے ایک بااختیار نیشنل کوآپریٹیو ڈیولپمنٹ اینڈ ویئر ہاؤسنگ بورڈ تھا اور ان کی مالی امداد کے لیے ۸۰ کروڑ روپے گئے تھے۔ ۱۹۶۲ء میں ایگری کلچرل پروڈیوس کارپوریشن ایکٹ ۱۹۵۶ء کی جگہ نیشنل کوآپریٹیو ڈیولپمنٹ کارپوریشن ایکٹ ۱۹۶۲ء اور ویئر ہاؤسنگ کارپوریشن ایکٹ ۱۹۶۲ء نے لے لی۔ ویئر ہاؤسنگ کارپوریشن ایکٹ مارچ ۱۹۶۳ء سے نافذ ہوا جب اس ایکٹ کے تحت مرکزی ویئر ہاؤسنگ کارپوریشن قائم ہوا۔ یہ دونوں ایکٹ دیہی قرض، سائنٹفک ڈھنگ سے ذخیرہ رکھنے کی سہولتوں قیمتوں کے استحکام اور بازار کے بارے میں خبر رسانی کی اُن ملی جلی اسکیموں پر مشتمل ہیں جن کا مقصد کوآپریٹیو اداروں کی کوششوں میں اُن کی مدد کرنا ہے۔ دوسرے پلان کے ختم پر ۴۰ مرکزی گودام تھے جن میں ۹۷،۲۲۳ ٹن غلّہ رکھا جا سکتا تھا۔ تیسرے پلان میں مرکزی اور صوبائی گوداموں کی استعداد دوسرے پلان کی ۳٫۲۵ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۱۴ لاکھ ٹن ہو گئی۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تیسرے پلان کا نشانہ ۱۲ لاکھ ٹن تھا۔ غرض کہ ۲۰ مرکزی گوداموں کا نشانہ پورا کر لیا گیا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ منصوبوں کا زراعتی مارکٹنگ کا پروگرام زیادہ کامیاب ہوگا اگر مندرجہ ذیل اقدام کیے جائیں: (۱) مارکٹنگ کوآپریٹیوز کو کریڈٹ سے منسلک کر دیا جائے (۲) مخلوط دو مقصدی کوآپریٹیو سوسائٹیاں کنزیومر کوآپریٹیوز سے براہِ راست لین دین کریں۔ ترقی زیادہ ہوگی اگر کوآپریٹیو مارکٹنگ گوداموں کی تعمیر اور قرض کے اداروں کو کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور ایکسٹنشن سروس کے ترقیاتی پروگرام سے منسلک کر دیا جائے۔ بہتر نتائج برآمد ہوں گے اگر لائسنس یافتہ گودام فاضل پیداوار کے علاقوں اور بھاری قلت کے علاقوں یعنی دونوں جگہوں پر قائم کیے جائیں۔ غرض کہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بیشتر صوبوں کے خرید و فروخت کے طریقوں میں بہت خامیاں ہیں اور انھیں بہتر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ کسانوں کو بھروسہ ہو کہ ان کے ساتھ برابری کا برتاؤ ہوگا اور بکری کی قیمت کا زیادہ حصّہ انھیں ملے گا۔

دیہی قرض کے مسائل (۱۹۵۱-۵۲ء اور ۱۹۶۱-۶۲ء کے سروے کے نتائج کا موازنہ):

۱۹۵۱-۵۲ء کے رورل کریڈٹ سروے رپورٹ کے مطابق ۷۵۰ کروڑ روپے دیہی قرض کی ضروریات کا تخمینہ تھا۔ پیشہ ور قرض دینے والے اور گاؤں کے مہاجن ۷۰٪ دیہی قرض فراہم کرتے ہیں۔ دیہی قرض میں کوآپریٹیو اداروں اور کمرشل بینکوں کا حصہ ۳٪ اور ۱٪ ہے۔ دس برس بعد ریزرو بینک نے ایک اور سروے کیا جس کو آل انڈیا رورل کریڈٹ اینڈ انوسٹمنٹ سروے ۱۹۶۱-۶۲ء کہا جاتا ہے۔ اس سروے کی رپورٹ کے مطابق کسانوں میں فی کنبہ واجب الوصول قرض اوسطاً ۴۳۰ روپے آتا تھا۔ ۳۰ جون ۱۹۶۲ء کو تمام دیہی کنبوں کا مجموعی نقد قرض ۲،۰۸۹ کروڑ تھا۔ اس میں سے ۲۳۸۰ کروڑ (۸۵۶۳٪) قرض اُن کسانوں پر تھا جو کنبوں کی مجموعی تعداد کے ۷۵٪ تھے۔ ملک کے اُن دیہی کنبوں کا تناسب جو گاؤں کے مہاجنوں کے قرض دار تھے ۱۱٪ اور جو کوآپریٹیوز کے قرض دار تھے ۱۰٪ تھا چنانچہ دیہی قرض کا نمایاں پہلو اُن مہاجنوں کی سرگرمیاں ہیں جو کسانوں کی نہ ختم ہونے والی غربت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کسان نئے قرض یا تو پرانے قرض ادا کرنے کے لیے لیتے ہیں یا شادی بیاہ اور مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لیے۔ چوں کہ قرض لی ہوئی رقم پیداآور کاموں پر نہیں صرف ہوتی ہے اس لیے اس کا امکان بہت کم ہوتا ہے کہ کبھی پورا قرض ادا ہو سکے۔ ساتھ ہی قرض لینے والوں کی مجبوری سود کی شرح اور بھی بڑھا دیتی ہے کیوں کہ قرض حاصل کرنے کی کوئی دوسری صورت نہیں ہوتی۔ ہندوستان کی اس مخصوص صورت میں مہاجنوں کو اس کا موقع تو نہیں ملتا کہ سود در سود کے ذریعے بڑی دولت جمع کریں لیکن چوں کہ کسانوں کی زندگی پر مہاجنوں کی پوری گرفت ہوتی ہے اس لیے یہ لوگ مختلف صورتوں میں مالی فائدہ اُٹھاتے ہیں مثلاً بہت سستے داموں ان کی فصل خرید لیتے ہیں، زمینیں اُن کے اختیار میں ہوتی ہیں اور کسانوں کی نقل و حرکت پر اُن کی نگرانی ہوتی ہے۔

اس موقعے پر ایک تیکھی فرانسیسی کہاوت کا ذکر بیجا نہ ہوگا۔ جس میں کہا جاتا ہے کہ "کسانوں کو قرض سے ویسا ہی سہارا ملتا ہے جیسے پھانسی پانے والوں کو پھانسی کے رسّے سے"۔ برطانوی عہد کے بیشتر حصے میں ہندوستان میں یہی صورت تھی۔ اِن مایوس کن حالات میں قرض کا مطلب تھا مصائب یا کوئی ناگہانی آفت۔ قرض لینے کا مقصد یہ کبھی نہیں ہوتا کہ کمانے کی استعداد بڑھائی جائے۔ برطانوی عہد میں مسٹر ایم۔ ال۔ ڈارلنگ نے ایک تحقیق کی تھی۔ اُس کے مطابق پنجاب میں جو نسبتاً پیداآور علاقہ تھا، صرف ۵٪ قرض زمین کو بہتر بنانے کے لیے دیا گیا تھا۔ قرض کے اِس بھاری بوجھ کی وجہ سے کسان پیداوار بڑھانے کے طریقے نہیں اپنا سکتا تھا۔ قرض کسانوں کو سنگ دل بناتا تھا اور اُس کی کارکردگی اور پہل کرنے کی جرأت کو ختم کرتا تھا۔ یہ سارا ایک الٹوش چکر تھا جس کی وجہ سے زراعت ایک جامد حالت میں پڑی ہوئی تھی اور ترقی و خوش حالی سے محروم تھی۔

دیہی قرض کے مسئلے سے نپٹنے کے لیے سرکاری اقدام

آزادی سے قبل کی پالیسی: انیسویں صدی کی آخری چوتھائی سے دیہی قرض کی صورت تشویش ناک ہوتی جا رہی تھی۔ جس وقت سے عظیم بحران شروع ہوا اُس وقت سے معیشت کے مفلوک الحال طبقے کی قرض داری نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ قرض دار کسانوں کے مصائب کم کرنے کی غرض سے برطانوی حکمرانوں نے انسدادی اقدام کیے جو بیشتر امدادی تھے اور جن کا مقصد بحران کے دوران اور اُس کے بعد کی حالت کو سنبھالنا تھا۔ پنجاب لینڈ ایلی نیشن ایکٹ ۱۹۰۱ (PUNJAB LAND ALLINATION ACT, 1910) جیسے انسدادی اقدام کا مقصد زمینوں کی منتقلی کو روکنا تھا۔ لیکن ان کی تعمیل سختی سے کبھی نہیں کی گئی جس کی وجہ سے کسانوں کو مہاجنوں کے چنگل سے چھڑانا مشکل تھا۔ پہلے تو ان اقدام کا مقصد مصالحت کے ذریعے قرضوں کو چکانا تھا۔ جب اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تو بعض صوبوں میں قرض کی لازمی کمی کا طریقہ اپنایا گیا۔ یہ طریقہ مدراس میں بہت کامیاب ہوا جہاں مدراس ایگری کلچرسٹ ریلیف ایکٹ ۱۹۳۸ء کے تحت ۵ کروڑ کے مجموعی قرض کو گھٹا کر ۲٫۶۵ کروڑ کر دیا گیا۔ پنجاب، مدراس اور بنگال جیسے صوبوں میں مہاجنوں اور قرض دینے والوں کو لازمی لائسنس دینے کے قوانین بنے اور سود کی زیادہ سے زیادہ شرح متعین کی گئی جس پر قرض لیا اور دیا جا سکتا تھا۔

انسدادی اور امدادی طریقے مسئلے کی طرف اوپری سطح کو چھو سکے اور اس کا صرف عارضی حل ثابت ہوئے۔ بہرحال کچھ ان اقدام کی وجہ سے اور کچھ دوسری جنگ عظیم کے دوران زرعی قیمتیں چڑھنے کی وجہ سے برطانوی عہد کے اواخر میں دیہی قرض کی مقدار کافی کم ہو گئی۔

آزادی کے بعد کی پالیسی: آزادی کے بعد قومی حکومت نے محسوس کیا کہ قبل اس کے کہ زرعی تنظیم اور ترقی ایک منصوبے کے تحت شروع کی جائے، دیہی قرض کے مسئلے کی پوری تحقیق ضروری ہے چنانچہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ریزرو بینک کی نامزد کی ہوئی کمیٹی نے سارے ملک کے دیہی قرض کا جائزہ لیا۔ اس کمیٹی نے سروے کے وقت دیہی قرض کی حالت کا خلاصہ یوں کیا ہے: "موجودہ زراعتی قرض کی نہ مقدار صحیح ہے اور نہ قسم اور نہ اس سے صحیح ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ ضرورت کو اگر معیار بنایا جائے تو یہ صحیح لوگوں تک پہنچتا بھی نہیں ہے" (اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرض دینے والے کی حیثیت کو نہ دیکھا جائے) دیہی قرض کی اس تشویش ناک صورت کے تدارک کے لیے کمیٹی آن ڈائرکشن نے دیہی قرض کا ایک مضبوط اور جامع نظام قائم کرنے کی سفارشات کیں۔ اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کوآپریٹو قرض کی ترقی اس

کمیٹی کی سفارشات کے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

ریزرو بینک اور دیہی قرض: دیہی قرض سے نپٹنے کی سرکاری کوششوں کی کہانی نامکمل رہے گی اگر دیہی مالیات کے سلسلے میں ریزرو بینک کا ذکر نہ کیا جائے۔ خصوصاً ۱۹۳۵ء سے جب سے ریزرو بینک کو مرکزی بینک بنایا گیا۔ ریزرو بینک میں زراعتی قرض کا ایک الگ شعبہ ہے۔ جس کے کام یہ ہیں: (۱) زراعتی قرض سے متعلق تمام معاملات کے مطالعے کے لیے ماہر عملہ رکھنا (۲) مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو صوبائی کوآپریٹو بینکوں اور دوسری تنظیموں کو خصوصی مشورے دینا (۳) صوبائی کوآپریٹو بینک اور قرض کی دوسری مناسب ایجنسیوں کے ذریعے فصلوں کی نقل و حمل اور دوسرے زراعتی کاموں کے لیے مالی وسائل فراہم کرنا۔

بینکوں کے ایک دوست، رہنما اور فلاسفر کی حیثیت سے ریزرو بینک کے فرائض بربنائے عہدہ ہیں۔ جو اس کو کسی بھی دوسرے مرکزی بینک کی طرح انجام دینے ہوتے ہیں۔

ریزرو بینک دیہی قرض کے لیے اسی طرح وسائل فراہم کرتا ہے جیسے دوسرے بینک کرتے ہیں۔ پرائمری سوسائٹی کا ایک رکن اپنی سوسائٹی سے قرض لیتا ہے۔ پرائمری سوسائٹی سنٹرل فائنانس ایجنسی سے قرض لیتی ہے۔ سنٹرل کوآپریٹو بینک اسٹیٹ کوآپریٹو بینک سے قرض لیتا ہے۔ تینوں سطحوں پر مالیات کے بالائی ادارے سے قرض کی درخواست صرف تب کی جاتی ہے جب ذاتی وسائل اور قرض لیے ہوئے وسائل پورے طور پر استعمال ہو چکے ہوں۔ جب بالائی بینک کو قرض کی توسیع کے لیے نقد رقم کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اُن کاغذات کو ریزرو بینک کے سامنے پیش کر کے سہولت حاصل کر لیتا ہے جن کے ذریعے پرائمری سوسائٹیوں نے سنٹرل کوآپریٹو بینک سے قرض لیا تھا اور جن کو بالائی بینک نے قبول کیا تھا۔ تین منصوبوں کے دوران ریزرو بینک نے کوآپریٹو تحریک کی ترقی میں بہت اہم پارٹ ادا کیا ہے۔ اس نے مالی اداروں کو وسائل اور تربیت کی سہولتیں فراہم کی ہیں۔ کوآپریٹو بینکوں کے حصّوں میں شرکت کے لیے صوبوں کو قرض دیا ہے اور کوآپریٹو بینکوں کو پیشگی ادائیگی کی سہولت فراہم کی ہے۔ چنانچہ اس کی قرض دی ہوئی رقم جو ۵۶-۱۹۵۵ء میں ۲۸ کروڑ تھی، بڑھ کر ۶۶-۱۹۶۵ء میں ۱۹۴ کروڑ ہو گئی۔

آزادی سے قبل اگرچہ آل انڈیا رورل کریڈٹ جیسی تفصیلی اور جُزرس کوئی تحقیق نہیں کی گئی تاہم ریزرو بینک کی جانب سے سرڈارلنگ نے بڑے اقتصادی بحران کے دوران جو تفتیش کی وہ قابل ذکر ہے۔ یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیے کہ دیہی قرض کے میدان میں امدادِ باہمی کے رول کے بارے میں

ڈارلنگ کی سفارشات اور حال کی رورل کریڈٹ کمیٹی کی سفارشات ایک جیسی ہیں۔ رورل کریڈٹ کمیٹی کا کہنا ہے کہ دیہی قرض کے معاملے میں امداد باہمی کی تحریک ناکام رہی ہے لیکن اس کو کامیاب ہونا چاہیے تھی۔ دیہی قرض کے مسئلے کے حل کے لیے ساری شرائط نے ساتھ امداد باہمی کی [illegible] لی ہے تھا۔ ۲۰ برس پہلے سر میلکم ڈارلنگ نے بھی یہی کہا تھا کہ ہندوستان کی زرعی مالیات کو منظم کرنے کا بہترین ذریعہ کوآپریٹیو تحریک ہے جس کو حکومت کی سرپرستی اور اعانت حاصل ہو۔

ڈارلنگ کی سفارشات سے متاثر ہو کر ریزرو بینک کے زرعی قرض کے شعبے نے کوآپریٹیو تحریک سے قریبی تعلق قائم رکھا اور صوبائی کوآپریٹیو بینکوں کو ماہرانہ مشورے اور مالی امداد [illegible] کا کام جاری رکھا۔ اس نے برائے نام سود پر قرض دیا اور تکنیکی [illegible] کی سہولتیں فراہم کیں۔

حال میں ریزرو بینک ایکٹ ۱۹۳۴ء کی مناسب ترمیم کے ذریعے دیہی علاقوں کو بینک کی وسیع تر سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ ان ترمیمات کی خاص باتیں یہ ہیں:

(۱) بینک کی شرح میں حال کے متواتر اضافے کے باوجود دیہی قرض کے لیے سود کی شرح بینک کی عام شرح سے ڈیڑھ دو فی صدی کم رہی ہے۔ ۶۵-۱۹۶۴ء میں بینک کی شرح دو بار بڑھائی گئی، ایک بار ۲۶ ستمبر ۱۹۶۴ء کو ۴½% سے ۵% کی گئی اور پھر دوبارہ ۱۷ فروری ۱۹۶۵ء کو ۵% سے بڑھا کر ۶% کی گئی۔ مارچ ۱۹۶۸ء میں بینک کی شرح ۶% سے گھٹا کر ۵% کر دی گئی لیکن اس کے باوجود دیہی قرض کی شرح ۱½% اب بھی کم ہے۔ (۲) رقموں کی ترسیل کی بھی شرح کم کر دی گئی ہے۔ (۳) فصلوں کی نقل و حمل کے اخراجات کے سلسلے میں جاری کیے گئے ایکسچینج بلوں اور پرامسری نوٹوں کے واجب الادا ہونے کی مدت ۹ مہینے سے بڑھا کر ۱۵ مہینے کر دی گئی ہے۔ مندرجہ بالا سہولتوں کے علاوہ ۱۹۵۴ء سے ریزرو بینک متوسط مدت کے قرض بھی صوبائی کوآپریٹیو بینکوں کو فراہم کر رہا ہے۔ جہاں تک طویل المدت قرض کا سوال ہے، ۱۹۴۹ء میں قومی ملکیت میں آنے کے بعد سے ریزرو بینک بالواسطہ طریقے سے اُن دستاویزوں اور زمینوں کے رہن ناموں کو خریدتا ہے جن کی صوبائی حکومتیں ضامن ہوتی ہیں۔

ان کاموں کے علاوہ ریزرو بینک دیہی مالیات سے متعلق باضابطہ تحقیق اور سروے کا کام کرتا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ریزرو بینک نے ایک ملک گیر سروے کیا جس کا نام آل انڈیا رورل کریڈٹ اینڈ انوسٹمنٹ سروے ہے۔ اس سروے کے اہم نتائج ۱۹۶۵ء کے آخری نصف میں ریزرو بینک کے بلیٹین میں شائع

کیے گئے۔ اِس سے دس برس پہلے ۵۲-۱۹۵۱ء میں دیہی قرض سے متعلق ایک اور سروے اے۔ ڈی گوروالا نے ریزرو بینک آل انڈیا رورل کریڈٹ کمیٹی ۵۲-۱۹۵۱ء کی سفارشات کے مطابق دیہی قرض سے متعلق سالانہ سروے کرتا رہا ہے۔ رورل کریڈٹ کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں ریزرو بینک نے دیہی قرض سے متعلق جامع پالسی بنائی ہے۔

یاد رہے کہ دیہی قرض کے مسئلے کے موثر حل کے لیے فصلوں کے بیمے کی ایک جامع اسکیم بہت ضروری ہے جو قرض کی کوآپریٹو سوسائٹیوں کی ترقی اور توسیع سے منسلک ہو۔ فصلوں کے بیمے سے پیداوار کی قیمتوں کو سہارا دینے کا ایک خودکار پروگرام عمل میں آتا ہے جو ایک طرح کی ضمانت ہوتا ہے کہ فصل کی خرابی کی صورت میں کسان کو نیا قرض نہیں لینا پڑے گا۔ ریاستی نیشنل کراپ انشیورنس اسکیم کا انتظام بہ آسانی اسٹیٹ بینک کی دیہی شاخوں کے سپرد کیا جاسکتا ہے (اسٹیٹ بینک جو قومی ملکیت میں آنے سے پہلے امپیریل بینک تھا۔ مقامی کوآپریٹوز سے درخواست کی جاسکتی ہے کہ کمیشن پر انشیورنس پالیسیاں فروخت کرنے میں رورل بینکوں کی مدد کریں۔ برطانوی عہد میں فصلوں کے بیمے کی ایک ناکام کوشش ۱۹۴۳ء میں دیوار (DEWAR) ریاست میں کی گئی۔ اِس کے بعد سے کوئی باقاعدہ کوشش بڑے پیمانے پر نہیں کی گئی اگرچہ پلاننگ کمیشن نے پنجاب گورنمنٹ کی بیمے کی اسکیم منظور کرلی ہے جو فی الحال ۵۰۰ گاؤں پر مشتمل چھے مراکز میں شروع کی جارہی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ریزرو بینک کے دیہی قرض کے شعبے کو فصل کے بیمے کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ اِس شعبے کو مسئلے کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں تحقیق کرنا چاہیے اور ایک نیشنل کراپ انشیورنس اسکیم تیار کرنی چاہیے جو دیہی قرض کے منصوبے سے منسلک ہو۔

۵۲-۱۹۵۱ء کا آل انڈیا رورل کریڈٹ سروے اور دیہی قرض کی نئی اسکیم

۵۲-۱۹۵۱ء کے دوران ریزرو بینک نے ہندوستان کے قرض کا باقاعدہ سروے شروع کیا جو ملک کے ۷۵ ضلعوں کے ۶۰۰ گاؤں پر مشتمل تھا۔ ہدایتی کمیٹی کے صدر مسٹر اے۔ ڈی گوروالا تھے۔ اور ڈی۔ آر گیڈگل اُس کے رکن تھے۔ اِس کمیٹی کی رپورٹ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔

(۱) سروے کے اہم نتائج : (الف) مجموعی دیہی قرض کا ۹۳% حصہ نجی قرض کی ایجنسیاں فراہم کرتی ہیں، مثلاً مہاجن، تاجر، زمین دار اور عزیز دار۔ درحقیقت مجموعی قرض میں مہاجن کا حصہ ۷۰% تھا۔ (ب) قرض کے باضابطہ اداروں کی کارگزاری توقع سے کم تھی۔ مجموعی دیہی قرض میں سرکاری ایجنسیوں

کا حصہ ۳۴ء۳ ٪، کوآپریٹیو سوسائٹیوں کا حصہ ۳ء۱ ٪ اور کمرشیل بینکوں کا حصہ ۹ء ٪ تھا۔ (ج) سروے سے حیرت کی یہ بات ظاہر ہوئی کہ کوآپریٹیو سوسائٹیوں کے دیے ہوئے قرض کا بڑا حصہ بڑے کسانوں کو جاتا تھا جب کہ بقیہ ۷۰ ٪ چھوٹے اور متوسط درجے کے کسانوں کے حصے میں بہت حقیر رقم آتی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ دیہی علاقوں میں قرض کے لیے زمین کی ضمانت کا سوال اُٹھتا تھا جس کے لیے ملکیت ضروری تھی۔ (د) قرض کا ۳۲ ٪ حصہ کھیتوں میں سرمایہ لگانے کے لیے لیا جاتا تھا ۱۵ ٪ کھیتی کے روزمرہ اخراجات کے لیے، ۴۷ ٪ خاندانی ضروریات کے لیے اور بقیہ اُن کاروباری اخراجات کے لیے جن کا تعلق کھیتی سے نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرض کا تقریباً نصف حصہ ایسے کاموں پر صرف ہوتا تھا جو پیداآور نہیں تھے اور ایک تہائی سے کم زراعت کی بہتری یعنی پیداآور کاموں پر خرچ ہوتا تھا۔ (ہ) جہاں تک کسانوں کے ضمانت دینے کا سوال ہے، سروے کیے گئے خاندانوں میں سے ۵۰ ٪ اپنی غیر منقولہ جائداد کی ضمانت دینے پر آمادہ تھے، ۲۵ ٪ لوگ ذاتی ضمانت دینے پر تیار تھے۔ اور بقیہ لوگوں نے یہ نہیں ظاہر کیا کہ وہ کس قسم کی ضمانت دے سکتے ہیں۔ (ز) واجب الوصول قرض کا فی خاندان اوسط ۲۹ روپے سے لے کر ۱۲۰۰ روپے تک تھا۔ ۵۲-۱۹۵۱ء میں کسانوں کے خاندان کا قرض داری کا اوسط ۲۱۰ روپے تھا۔

رورل کریڈٹ سروے کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ موجودہ اور دستور کے جس نظام میں کوآپریٹیوز کو قائم کرنا تھا وہ امداد باہمی کی تحریک کے لیے ناسازگار نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس تحریک کو بھی ایجنسیوں کے مقابلے بلکہ مخالفت کا سامنا تھا۔ چنانچہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ کوآپریٹیو سوسائٹیوں نے کم سے کم مخالفت کا راستہ اختیار کیا اور قرض اُن لوگوں کو دیا جن کے پاس کافی ملکیت تھی۔ ہندوستان میں کوآپریٹیو کی تحریک کی حیثیت اُس پودے جیسی تھی جو جڑ نہیں پکڑ پاتا تھا اور جس کو سیدھا رکھنے کے لیے حکومت اُس کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے تھی۔ کوآپریٹیوز کے مقابلے میں بھی اداروں کی گرفت زیادہ مضبوط تھی اور اُنھوں نے پورے دیہی ہندوستان کو جکڑ رکھا تھا۔ کوآپریٹیو تحریک کی ناکامیوں کے باوجود کمیٹی نے سفارش کی کہ قرض کی ایک جامع اسکیم عمل میں لائی جائے جس کی اوّلین شرط یہ ہو کہ اس کی بنیاد کوآپریٹیوز پر ہو اور حکومت اس کی مدد کرے۔ کمیٹی کی رائے تھی کہ ایک موثر پروگرام صرف تب ہی ممکن تھا جب حکومت اور کوآپریٹیو سوسائٹیاں مل کر کام کریں اور وہ دیہی ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کریں جو بے حد ضروری ہیں۔

دیہی قرض کی جامع اسکیم اِن باتوں پر مبنی تھی: (۱) پرائمری سوسائٹیوں اور اونچی کوآپریٹیو ایجنسیوں کی پالیسی کو نئی سمت دی جائے تاکہ یہ فصل پر قرض دینے کی اسکیم کی تعمیل کر سکیں جس کے تحت ہر وہ کسان جس کے پاس فروخت کے لیے کچھ بھی پیداوار ہو وہ ان سوسائٹیوں کا ممبر بن سکے اور متوقع فصل پر مبنی اپنی ادائیگی کی استعداد کے بقدر قرض لے سکے۔ (۲) حکومت اِن کوآپریٹیوز کے کاموں میں شریک ہو تاکہ (الف) چھوٹے اور بڑے کسانوں کی پہنچ کوآپریٹیو سوسائٹیوں تک برابر ہو، (ب) کوآپریٹیو سوسائٹیاں چند خوش قسمت لوگوں کی جاگیر بن کر نہ رہ جائیں (ج) تاجروں اور مہاجنوں کی یہ کوشش کہ زرِ وخت کرنے میں اور قابل فروخت بنانے میں کوآپریٹیو تحریک کا دخل زیادہ نہ ہونے پائے، موثر طریقے سے رد کی جا سکے۔ (د) پرائمری سوسائٹیوں کے پاس خود اتنے وسائل ہوں کہ وہ اونچی سوسائٹیوں سے کافی رقم قرض لے سکیں (ہ) ضلعوں کی مرکزی مالیاتی ایجنسیاں اپنی تحویل میں امانتوں کی رقم بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کریں تاکہ فصل پر قرض دینے کی اسکیم کی تعمیل میں مدد ملے۔

(۳) بُنیادی سفارشات: دیہی قرض کی مکمل اسکیم۔

(الف) کریڈٹ کوآپریٹیوز کو مارکٹنگ سوسائٹیوں سے منسلک کیا جائے۔

کمیٹی کی رائے تھی کہ مہاجن، جو ۷۰% دیہی قرض فراہم کرتا ہے، اُس کی اجارہ داری زرعی قرض کے میدان میں نہیں قائم رہنی چاہیے۔ اِس کا یہ مطلب تھا کہ جب تک مقابلے کی کوئی دوسری ایجنسی نہیں شروع کی جاتی اُس وقت تک انسدادی قوانین کے باوجود مہاجن ٹھاٹھ کے ساتھ چلتے رہیں گے اور قومی ترقی کی راہ میں رخنے ڈالتے رہیں گے۔ اِس کا حل یہ تھا کہ حکومت براہِ راست قرض فراہم کرے۔ لیکن رورل کریڈٹ کمیٹی کا خیال تھا کہ سرکاری ایجنسی انتظامی تاخیر کا شکار رہے گی اس لیے دیہی قرض کی ضروریات سے نپٹنے کے لیے مناسب نہ ہوگی۔ چنانچہ ماضی کی ناکامیوں کے باوجود کمیٹی نے دیہی قرض کے میدان میں کوآپریٹیوز کے رول پر پھر تاکید کی۔

ماضی میں کوآپریٹیو تحریک کو نئی سمت صرف تب ہی دی جا سکتی ہے اور تقویت تب ہی پہنچائی جا سکتی ہے جب [illegible] تحریک کی ہر سطح پر حکومت شریک ہو۔ یعنی پرائمری سوسائٹیوں سے لے کر [illegible] فروخت کی سہولتوں کی فراہمی اور فصل [illegible] سوسائٹیوں [illegible] مارکٹنگ سوسائٹیوں [illegible]

[illegible] سوسائٹی کے [illegible]

[illegible]

قرض کی ادائیگی میں آسانی ہو۔ یہ تال میل بہت ضروری ہے کیوں اس سے چھوٹے اور متوسط کسانوں کو زمین کی ضمانت پر قرض ملنا ممکن ہوگا۔ کسانوں کو موجودہ فصل کی بنیاد پر بھی کوآپریٹیو سوسائٹیاں قرض دے سکتی ہیں بشرطیکہ وہ اپنی فصل مارکٹنگ سوسائٹی کے ہاتھ فروخت کرنے کا معاہدہ کریں۔

(ب) گوداموں کا پروگرام:

کریڈٹ کوآپریٹیو ایجنسیوں کی توسیع کے ساتھ گوداموں کے ایک بڑے پروگرام کی بھی سخت ضرورت ہے۔ اس سے کسانوں کو اس کا موقع ملے گا کہ فصل کٹتے ہی اُس کو فروخت کرنے کی بجائے اُس وقت فروخت کرے جب قیمت مناسب ہو۔ گوداموں کے قیام سے کوآپریٹیو مارکٹنگ سوسائٹی کو بھی کام کرنے میں سہولت ہوگی۔ کمیٹی نے نیشنل کوآپریٹیو ڈیولپمنٹ اینڈ ویر ہاؤسنگ بورڈ قائم کرنے کی سفارش کی جو ایک نیشنل کوآپریٹیو ڈیولپمنٹ فنڈ قائم کرے جس سے صوبوں کو بھی مدت کے قرض دیے جائیں تاکہ وہ کوآپریٹیو مارکٹنگ اور پراسسنگ (PROCESSING) سوسائٹیوں کے شیئر خرید سکیں۔ کمیٹی نے صوبائی گودام کمپنیاں اور کل ہند گودام کارپوریشن بھی قائم کرنے کی سفارش کی۔ کمیٹی کا خیال تھا کہ اگر قرض کی وسیع سہولتیں فراہم کی جائیں اور بہتر اور بڑی کوآپریٹیو سوسائٹیاں قائم کی جائیں جو صرف دیہی قرض ہی نہ دیں بلکہ فروخت کی سہولتیں بھی دیں اور حکومت کی طرف سے گوداموں کا پروگرام شروع کیا جائے تو مستقبل میں امداد باہمی کی تحریک کامیاب ہوسکتی ہے۔

(ج) اسٹیٹ بینک: دیہی قرض کی اسکیم میں اسٹیٹ بینک کی اہمیت

رورل کریڈٹ کمیٹی کا تخمینہ ہے کہ پیداوار کی تیز رفتار کے پیش نظر ہندوستانی کسانوں کی سالانہ قرض کی ضرورت ۷۵۰ کروڑ روپے سے زیادہ ہوگی۔ اس کے لیے کمرشیل بینکوں کے ایک اہم سکٹر میں سرکاری مالی شرکت کی ضرورت ہوگی تاکہ سرکاری قرض سے قائم کیے گئے ملک گیر ادارے (جو اسٹیٹ بینک ہوگا) دیہی اور امدادی بینکوں کی ترقی کا کام سونپا جاسکے۔ قدرتاً یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ یہ ادارہ امپیریل بینک ہی ہوسکتا ہے جس کی ایک مخصوص منفرد اور نیم سرکاری حیثیت ہے۔ امپیریل بینک کو بدل کر اسٹیٹ بینک بناتے وقت اس بات پر نگاہ رکھنی چاہیے کہ دیہاتوں میں اس کی شاخیں پہلے سے زیادہ تعداد میں کھولی جائیں تاکہ کوآپریٹیو بینکوں اور سوسائٹیوں کو جمع کرنے کی تیز اور سستی سہولتیں مل سکیں اور دیہی بچت کا کافی حصہ اکٹھا کیا جاسکے۔

(د) تین مخصوص قسم کے فنڈ کا قیام

کمیٹی نے تین مخصوص فنڈ قائم کرنے کی سفارش کی۔ دو مخصوص فنڈ ریزرو بینک کے تحت اور

ایک وزارتِ زراعت کے تحت۔ (۱) طویل المدت کاموں کے لیے نیشنل ایگری کلچرل کریڈٹ فنڈ ۵ کروڑ روپے سے شروع ہوگا اور اس ابتدائی رقم کے علاوہ اس فنڈ کو ہر سال ۵ کروڑ روپے ملتے رہیں گے۔ ریزرو بینک اس رقم سے لمبی مدت کے قرضے اُن صوبائی حکومتوں کو دے گا جو کوآپریٹو بینکوں، مارٹگیج بینکوں اور قرض کی سوسائٹیوں کے شیئر خریدنے پر آمادہ ہوں گی۔ یہ قرض پانچ سال سے کم مدت کے لیے نہ ہوگا (۲) دوسرا فنڈ استحکام کے لیے ہوگا۔ اس فنڈ کا نام نیشنل کریڈٹ اسٹیبلائزیشن فنڈ (NATIONAL CREDIT STABILIZATION BANK) ہوگا۔ اس فنڈ کو ہر سال ایک کروڑ روپیہ دیا جائے گا۔ اس سے کوآپریٹو بینکوں کو درمیانی مدت کے قرض دیے جائیں گے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب قحط اور خشک سالی کی وجہ سے وہ ریزرو بینک سے لیے ہوئے قلیل المدت قرض کی ادائیگی نہ کرسکتے ہوں۔ (۳) تیسرا فنڈ امداد اور ضمانت کے لیے ہوگا۔ اس کا نام نیشنل ایگری کلچرل کریڈٹ رلیف اینڈ گارنٹی فنڈ (NATIONAL AGRICULTURAL RELIEF AND GUARANTEE FUND) ہوگا، اس کو بھی ہر سال ایک کروڑ دیا جائے گا اور یہ وزارت زراعت کے تحت ہوگا۔ اس فنڈ سے کوآپریٹو کریڈٹ اداروں کو مدد دی جائے گی۔ یہ امداد صوبائی حکومتوں کے توسط سے دی جائے گی اور اس کا مقصد یہ ہوگا کہ شدید قحط کی صورت میں جو قرضے ناقابل وصول ہوں انھیں قلم زد (WRITE OFF) کردیا جائے۔ یہ تین فنڈ دیہی مالیات کے اس نئے پروگرام کے بنیادی ستون ہیں جو امداد باہمی کے تحت شروع ہوگا۔ ان سے دیہی مالیات کے انتظام کو کافی تقویت پہنچے گی، خصوصاً غیر معمولی حالات میں۔

(۴) اس مربوط اسکیم کے لیے عملہ:

دیہی قرض کی ایسی مربوط اسکیم کے لیے ضروری ہے کہ کوآپریٹو ڈپارٹمنٹ، مالیاتی کوآپریٹو بینک، قرض کی سوسائٹیاں اور مارکٹنگ سوسائٹیاں جو عملہ رکھیں وہ کافی تربیت یافتہ ہو۔ کمیٹی کی رائے تھی کہ کوآپریٹو ٹریننگ کی مرکزی کمیٹی کو ریزرو بینک اور حکومت سے زیادہ رقم ملنی چاہیے تاکہ یہ تربیتی سہولتوں کو وسعت دے سکے۔ کمیٹی کو یہ بھی توقع تھی کہ دیہی مالیات کی اس نئی اسکیم کی تکمیل کی ضرورت کے پیش نظر مفید ہوگا کہ نئے قسم کے عملے کو تربیت دی جائے جو نہ فنی اعتبار سے مستند ہو بلکہ دیہی مسائل کی طرف اس کا رویہ بھی ہمدردانہ ہو۔

سفارشات کا جائزہ:

سترہ برسوں میں جب سے دیہی قرض کا سروے شروع ہوا اُس کی عملی سفارشات کو جوش و خروش کے ساتھ پہلے منظور کیا اور پھر دفعتاً انھیں پس پشت ڈال دیا۔ پالیسی سے قطع نظر، سروے کی رپورٹ

بذاتِ خود ایک سائنٹفک دستاویز ہے۔ ابھی حال میں چوں کہ ریزرو بینک نے ایک اور سروے مکمل کیا ہے اس لیے ایک مختصر جائزہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، سروے کا نام آل انڈیا رورل ڈیٹ اینڈ انوسٹمنٹ سروے ۱۹۶۱-۶۲ء ہے۔ اسی سروے کے نتیجے کے طور پر پتہ چلا کہ ہندوستان کے ۲۴۸ کروڑ دیہی کنبوں کا فی کنبہ قرض ۳۰۴.۶ روپے ہے اور یہ کہ قرض کے عام پروگراموں کے مقابلے میں پیکج کریڈٹ پروگرام (یعنی ایک چھوٹے حلقے میں قرض کی مختلف سہولتیں مرتکز کرنا) کی کامیابی کے امکانات زیادہ ہیں۔ جہاں تک حکومت کا سوال ہے، یہ ایک کل ہند زراعتی کمیشن مقرر کرنے پر غور کر رہی ہے۔ اس کمیشن کے حدود میں دیہی قرض بھی بخوبی شامل کیا جا سکتا ہے۔

اب ہم ہدایتی کمیٹی کی اہم سفارشات کا جائزہ لیں گے کیوں کہ آگے چل کر ہمیں دیہی قرض کی مربوط اسکیم کی کارگزاری کی روشنی میں اس کی دوبارہ جانچ کرنی ہے۔

(الف) امدادِ باہمی کی ایسی تحریک جس میں حکومت شریک ہو اور جو ترقی کے پروگرام سے بندھی ہوئی ہو یقیناً ایک بہتر اصولی حل ہے لیکن ڈر یہ ہے کہ بیشتر کم ترقی یافتہ ملکوں میں، جن میں ہندوستان بھی شامل ہے، حکومت کا مدد دینے کا طریقہ یہ ہے کہ انتظام زیادہ ہوتا ہے اور مالی امداد کم دی جاتی ہے۔ یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ دیہی قرض کی تنظیم مربوط ہونے کے باوجود پورے طور پر کامیاب ہو گی تاوقتیکہ پرانے قرض کا مسئلہ نہ حل ہو۔

(ب) پچھڑے ہوئے زراعتی حلقے کی اصلاح اور صنعتی حلقے کی توسیع کے لیے منصوبہ بند ترقی کے دوران یہ ضروری ہے کہ زراعت کی بنیادوں کو مضبوط کیا جائے۔ تیز صنعتی ترقی کے لیے ایک ایسا زراعتی نظام قوت بخش ہوتا ہے جس کی از سرِ نو تنظیم کی گئی ہو اور جسے نئی سمت دی گئی ہو۔ چنانچہ دیہی مالیات کی نئی تنظیم کا مقصد کسانوں کی معاشی خوش حالی کے لیے صرف قرض کی سہولت فراہم کرنا نہ ہونا چاہیے بلکہ یہ بھی کہ بہتر معاشی حالت کی وجہ سے جو بچت ہو اسے زیادہ سے زیادہ اکٹھا کیا جائے۔

(ج) یہ بات دل چسپ ہے کہ دیہی کوآپریٹیوز اور امپیریل بینک کی دیہی شاخوں کی توسیع کے ذریعے ادارہ جاتی مالیات پر رورل کریڈٹ سروے کمیٹی کی تاکید کے برخلاف چیسٹر سی۔ ڈیویز (CHESTER C. DEVIES) کی یہ رائے تھی کہ ہندوستان کے دیہی قرض کے نجی ادارے بے حد اہم ہیں۔ پلاننگ کمیشن نے ۱۹۵۵ء میں مسٹر ڈیویز سے دیہی قرض کے مسائل کی تحقیق کی درخواست کی تھی۔ مسٹر ڈیویز نے کوئی ایسی اسکیم تیار کرنے کی کوشش نہیں کی جس کے تحت مہاجنوں کو نئی مالیات کے حلقے میں لے آیا جائے۔ اس کے برعکس انھوں نے قرض کے نجی وسائل کی تقسیم کے لیے ذاتی اور ایک طرح کے غیر رسمی ادارے کی تشکیل کے امکانات پر زور دیا۔ مسٹر ڈیویز

کا خیال تھا کہ اِس نئے طرز کے نجی مالیاتی ادارے کی کامیابی کے لیے سرکار کا پورا اشتراک ضروری ہے۔ ہماری رائے ہے کہ ہندوستان کے دیہی قرض کی دوبارہ تنظیم کے لیے نجی ایجنسیوں اور قرض کی ادارہ جاتی ایجنسیوں کو ایک لڑی میں پرونا بہت ضروری ہے۔ بہترین نتائج تب ہی برآمد ہوسکتے ہیں جب حکومت کے زیرِ کفالت کوآپریٹیو بینکوں اور سوسائٹیوں کے کام میں گردی کی دوکانوں جیسی نجی قرض کی ایجنسیوں سے مدد لی جائے جیساکہ انڈونیشیا میں ہوتا ہے یا جاپان میں جہاں باہمی قرض کے بینک ہیں لیکن حکومت کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ ان گردی کی دوکانوں اور باہمی قرض کے بینکوں کی نگرانی کرے۔ انھیں منضبط کرے اور ان کی مدد کرے۔

دیہی قرض کی نئی تنظیم کی مکمل اسکیم جو ہدایت کمیٹی (COMMITTEE OF DIRECTION) نے تجویز کی ہے اِس میں اور دیہی قرض کی فراہمی میں اسٹیٹ بینک اور کوآپریٹیو بینکوں کا رول بہت اہم ہے۔ اسٹیٹ بینک ترسیل کی سہولتیں فراہم کرے گا اور کوآپریٹیو بینک اور کریڈٹ سوسائٹیاں کسانوں کو آسان شرائط پر قرض فراہم کریں گی۔ اِس ملی جلی اسکیم میں کمرشل بینکوں کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ جہاں تک کمرشل بینکوں کا سوال ہے، یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ بڑے کمرشل بینکوں کی بیشتر شاخیں ضلعوں اور شہروں میں ہیں چنانچہ کسانوں سے ان کا رابطہ مشکل ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ چھوٹے کمرشل بینکوں کا ایک مربوط اور مالی اعتبار سے مضبوط نظام جس کی شاخیں، دیہی علاقوں میں ہوں، دیہی قرض کی فراہمی کے سلسلے میں مفید کام انجام دے سکتا ہے۔ لیکن ان چھوٹے بینکوں کو ریزرو بینک کی براہِ راست نگرانی کی ضرورت ہوگی تاکہ یہ ضابطے کے تحت کام کریں۔ بہتر صورت یہ ہے کہ ان موجودہ کمرشل بینکوں کی مربوط تنظیم کو اسٹیٹ بینک سے منسلک کر دیا جائے جس کی شاخیں دیہی علاقوں میں ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو ان بینکوں کی دیہی شاخوں کو اسٹیٹ بینک رفتہ رفتہ اپنے اختیار میں لے سکتا ہے۔

سفارشات کی تعمیل :

حکومت نے رورل کریڈٹ سروے رپورٹ کی سفارشات پر سنجیدگی سے غور کیا اور ان کی تعمیل کے سلسلے میں مندرجہ ذیل اقدام کیے۔

(۱) امپیریل بینک کو قومی ملکیت میں لاکر اسٹیٹ بینک آف انڈیا قائم کیا جس نے یکم جولائی ۱۹۵۵ء سے کام کرنا شروع کر دیا۔ اپنے پانچ برس کے قیام میں اسٹیٹ بینک کو ۴۰۰ دیہی شاخیں کھولنے کا کام تفویض کیا گیا۔ خوشی کی بات ہے کہ متعینہ تاریخ یعنی یکم جولائی ۱۹۶۰ء سے چند روز پہلے ہی اسٹیٹ بینک نے یہ کام پورا کر لیا۔

(۲) کوآپریٹیو بینکوں اور حکومت کے درمیان اشتراک پیدا کرنے کے لیے ریزرو بینک آف انڈیا

ایکٹ کی ترمیم کی گئی جس کے تحت نیشنل ایگری کلچرل کریڈٹ فنڈ قائم کیا گیا۔ ۱۹۵۶ء میں ریزرو بینک نے اس فنڈ میں ۱۵ کروڑ روپے دیے اور اس کے بعد سے ہر سال ۵ کروڑ روپے دیتا ہے۔

(۳) رورل کریڈٹ سروے کی سفارشات کے مطابق حکومت ایک مرکزی گودام کارپوریشن قائم کر چکی ہے بیشتر صوبوں میں بھی گودام کارپوریشن قائم ہو چکے ہیں۔ یہ کارپوریشن نیشنل کوآپریٹو ڈیولپمنٹ اینڈ ویر ہاؤسنگ بورڈ کے زیر نگرانی کام کرتا ہے جو یکم ستمبر ۱۹۵۶ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کارپوریشن نے پہلے پلان کے ختم تک چالیس بڑے گودام مختلف مراکز میں قائم کیے۔ ان گوداموں کی رسید کی حیثیت ہنڈی کی ہوتی ہے جس کی ضمانت پر بینک قرض دیتے ہیں۔

(۴) ۱۹۵۳ء میں حکومت اور ریزرو بینک نے مل کر کوآپریٹو عملے کی تربیت کے لیے سنٹرل کمیٹی فار کوآپریٹو ٹریننگ قائم کی۔ یہ کمیٹی پونا میں کوآپریٹو کالج قائم کر چکی ہے جہاں کوآپریٹو محکموں کے لیے اونچے افسروں کی ٹریننگ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تربیت کے ۵ علاقائی مراکز بھی قائم کیے گئے ہیں۔ یہ مراکز پونا، رانچی، میرٹھ، مدراس اور اندور میں ہیں اور یہ بیچ کے درجے کے عملے کی تربیت کا کام کرتے ہیں۔

رورل کریڈٹ کی اسکیم کا دوبارہ جائزہ:

یک دیہی کوآپریٹو (ONE VILLAGE CO-OPERATIVE) کی تجویز:

دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی دو مکتب خیال ہیں جو کوآپریٹو تحریک کی تقویت اور تنظیم نو کے دو مختلف طریقوں کے حامی ہیں۔ پرانے مکتب خیال کا کہنا ہے کہ دیہی علاقوں کے مختلف گروہوں کے مفاد کے ٹکراؤ کا بہترین علاج تعلیم اور کوآپریٹو تحریک ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے اور یہ تحریک مجنوں کی آزادی اور امداد باہمی کے اصول پر مبنی ہونی چاہیے۔ چنانچہ یہ مکتب خیال کوآپریٹو تحریک میں سرکاری شرکت کے خلاف ہے۔ اس مکتب خیال کے کچھ لوگ چھوٹی کوآپریٹو سوسائٹیوں کے حامی ہیں۔ خصوصاً ایک گاؤں میں ایک کوآپریٹو کے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ امداد باہمی کے اصول کی بہتر تشفی اسی طرح ہو سکتی ہے۔ دوسرے جدید مکتب خیال کا کہنا ہے کہ دیہی معیشت کے اندرونی تضاد کا حل تب ہی ممکن ہے جب کوآپریٹو تحریک کو سرکاری شرکت سے تقویت حاصل ہو اور حکومت موثر طریقے سے تب ہی کام کر سکتی ہے جب بڑی سوسائٹیاں بلکہ کئی گاؤں پر مشتمل سوسائٹیاں قائم کی جائیں ۱۹۵۸ء کے درمیان کوآپریٹو تحریک سے متعلق حکومت کی نئی پالیسی اس جدید مکتب خیال کے نظریات پر مبنی رہی ہے۔ ہدایت کمیٹی نے سرکاری شرکت کی پوری حمایت کی ہے جو دیہی قرض کی مکمل اسکیم کے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندوستان کی کوآپریٹو تحریک کے بہت سے لوگوں نے سرکاری امداد کو

کوآپریٹیو تحریک میں نئی جان ڈالنے کی پہلی شرط قرار دیا ہے اور اُس پر تاکید کی ہے۔

اِس موقع پر ریزرو بینک کے رورل کریڈٹ سروے ۵۶-۱۹۵۵ء کی رپورٹ کے کچھ اہم نکات کی طرف توجہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس سروے نے جو شواہد جمع کیے ہیں اُن سے ظاہر ہے کہ کثیر المقاصد کوآپریٹیو سوسائٹیاں تنظیم اور مالیات کے میدان میں بہتر ثابت ہوئی ہیں۔ عام طور سے ایسی کوآپریٹیوز جو کئی گاؤں پر مشتمل ہوتی ہیں زیادہ مالی وسائل رکھتی ہیں اور مالی اعتبار سے اس قابل ہوتی ہیں کہ تربیت یافتہ کل وقتی سکریٹری مقرر کرسکیں جس سے تنظیمی مسائل کے حل میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

اگرچہ ۵۶-۱۹۵۵ء کی سروے رپورٹ میں جدید مکتبِ خیال کی بڑی سوسائٹیوں کی حمایت کی گئی ہے خصوصًا مالی منفعت کے پیشِ نظر، تاہم اپنی تحقیقات کے مطابق سرکاری شرکت سے کچھ زیادہ امید وابستہ نہیں کی گئی ہے۔ جہاں تک سرمائے کے شیئر میں سرکاری شرکت کا تعلق ہے فالواپ (Follow up) سروے کے دوران معلوم ہوا کہ بیشتر ضلعوں میں نہ تو معینہ نشانے پورے ہوئے تھے اور نہ مقررہ رقم معقول طریقے سے خرچ کی گئی تھی۔ جہاں تک انتظام میں سرکاری شرکت کا سوال ہے پتہ چلا کہ صوبے کی سرکاروں کے کوآپریٹیو شعبوں نے اِس سلسلے میں جو اقدام کیے وہ ناکافی تھے۔

۱۹۵۸ء سے لوگوں کی رائے، خصوصًا اونچے سرکاری حلقے کی رائے، جدید نظریے سے ہٹ کر پُرانے مکتبِ خیال کی طرف راغب ہونا شروع ہوئی۔ حکومت کا خیال تھا کہ آل انڈیا رورل کریڈٹ سروے کمیٹی نے کوآپریٹیو کے میدان میں سرکاری شرکت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سرکاری افسروں کے ذریعے اسکیموں کی تعمیل کی وجہ سے لوگ سرکاری امداد پر زیادہ بھروسہ کرنے لگے اور خود اعتمادی اور اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی طرح اس میدان میں بھی سرکاری شرکت کا مطلب یہ تھا کہ دیہات کے لوگ ہر کام کے لیے سرکار کی طرف دیکھتے جس کی وجہ سے معمولی افسروں کو افسری جتانے اور دفتری حدود سے زیادہ اپنا اثر ڈالنے کا موقع ملتا تھا۔ چنانچہ حکومت نے پورے مسئلے پر دوبارہ غور کیا اور کوآپریٹیو تحریک کو افسروں کے اثر سے نکالنے کے لیے پُرانے مکتبِ خیال کے اصول پر چلنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۵۸ء کے دوران چھوٹی کوآپریٹیوز، خصوصًا ایک گاؤں کی ایک کوآپریٹیو، کو ملک بھر میں پھیلانے کی تجویز کی اونچی سطح پر خاص کر کابینہ کی سطح پر زوردار تائید حاصل رہی۔ لیکن نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ یہ کس حد تک قابلِ عمل ہیں اور اِن پر کتنا روپیہ خرچ ہوگا۔ اور نہ تقابلی مطالعے کے ذریعے یہ اندازہ کرنے کی کوشش کی گئی کہ ایک گاؤں کی ایک سوسائٹی اور کئی گاؤں کی ایک سوسائٹی کے کیا مسائل اور کیا امکانات ہیں۔ یہ کام بہت ضروری تھا کیوں کہ دیہی قرض کی تقسیم

کے میدان میں کئی گاؤں پر مشتمل سوسائٹیوں کی کارگزاری بہت اچھی تھی اور خود حکومت کو اعتراف تھا کہ قرض دینے کی مقدار اور وصول یابی کئی گنا بڑھ گئی۔ اپریل ۱۹۵۸ء میں نیشنل ڈیولپمنٹ کونسل نے تجویز کے اچھے برے پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ دو قسم کی کوآپریٹیو سوسائٹیاں ہونی چاہئیں۔ چھوٹی سوسائٹیاں جو پورے گاؤں کے لیے ہوں اور بڑی سوسائٹیاں جو متعدد گاؤں کے لیے ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ چوں کہ گاؤں پر مبنی مشترکہ کھیتی کی تجویز تھی اور ایک دیہی سوسائٹیاں اور قرض کی سوسائٹیاں اس کا لازمی جزو سمجھی جاتی تھیں اس لیے ان کے حق میں وکالت کامیاب رہی۔

اس میں شک نہیں کہ کوآپریٹیو تحریک میں بہت سے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس تحریک کو اگر سرکار چلاتی ہے تو یہ کوآپریٹیو تحریک نہیں رہے گی کیوں کہ اس تحریک کا ایک لازمی جزو جمہوریت اور خود اعتمادی ہے۔ یہ درست ہے کہ سرکار کی طرف سے بہت زیادہ افسری اور دخل اندازی یقیناً مضر ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر قسم کی سرکاری امداد کو ٹھکرا دیا جائے۔ حکومت کی سرپرستی اور حکومت کی دخل اندازی میں فرق کرنا چاہیے۔ ایک دیہی اور چھوٹی قرض کی سوسائٹیوں کو بھی ابتدائی مرحل میں کسی نہ کسی قسم کی سرکاری سرپرستی کی ضرورت ہوگی۔

بہرحال جب تک کوآپریٹیو تحریک میں مالی وسائل اور تربیت یافتہ عملے کی قلت ہے تھوڑی بہت سرکاری سرپرستی شاید ضروری ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں سب سے اچھا طریقہ یہ ہوگا کہ متوسط درجے کی کوآپریٹیوز پر زور دیا جائے جو باہمی امداد کے جذبے پر مبنی ہوں اور دو تین گاؤں پر مشتمل ہوں اور انھیں حکومت کی سرپرستی حاصل ہو۔ یہ نہ صرف کوآپریٹیو قرض کی دوبارہ تنظیم کے لیے ضروری ہے بلکہ اس لیے بھی کہ اس سے وہ نیا ماحول پیدا ہوگا جس میں یہ سوسائٹیاں کمزور اور مظلوم طبقے کے کسانوں کے فائدے کے لیے زیادہ اچھی طرح کام کرسکیں۔

زراعتی پیداوار بڑھانے کے لیے اچھے بیج، کھاد اور کیڑے مارنے والی دواؤں کے استعمال پر زور دیے جانے کی وجہ سے اور زراعتی ترقی کے پروگراموں کی وجہ سے دیہی قرض کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے، خاص کر آب پاشی کے پروجیکٹوں کے علاقے میں۔ اس کے علاوہ آل انڈیا رورل کریڈٹ سروے کو سترہ برس ہو چکے ہیں اور دس برس سے زیادہ سے اس کی سفارشات زیر تعمیل ہیں اس لیے یہ مناسب بھی ہے اور ضروری بھی کہ اس مسئلے کا دوبارہ جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ منظور شدہ سفارشات کے کیا نتیجے برآمد ہوئے ہیں۔ آئندہ کی کیا ضروریات ہیں اور ان کو پورا کرنے کے لیے کن اقدام کی ضرورت ہے۔ چنانچہ جون ۱۹۶۶ء میں ریزرو بینک کے گورنر نے آل انڈیا رورل کریڈٹ ریویو کمیٹی

مقرر کی تاکہ یہ پانچویں پلان کے پیش نظر دیہی قرض کا جائزہ لے اور اس بات کو خاص طور پر دھیان میں رکھے کہ چوتھے پلان میں زراعتی پیداوار کے عمیق پروگرام کی کیا ضروریات ہیں۔ کمیٹی نے حال میں کچھ عارضی سفارشات کی ہیں، مثلاً چھوٹے کسانوں کی ترقی کی ایجنسی کا قیام اور دیہاتوں میں بجلی پہنچانے کے لیے ایک کارپوریشن کا قیام۔ یہ ایجنسی سرمایہ لگانے اور پیداواری سرگرمیوں کے ایسے مثالی پروگرام بنائے گی جو مختلف حالات کے چھوٹے کسانوں کے لیے ہوں گے۔ بجلی کو تیزی سے پھیلانے کے لیے بہت بڑی رقم خرچ کرنے کی ضرورت ہے جو فی الحال سرکاری الکٹریسٹی بورڈوں کے بس سے باہر ہے۔ چنانچہ کمیٹی نے رورل الکٹریفیکیشن کارپوریشن مع ایک فنڈ قائم کرنے کی سفارش کی ہے۔ اس فنڈ کا مرکزی حصہ مرکزی حکومت فراہم کرے گی۔ آخر میں کمیٹی نے ایگری کلچرل ری فائنانس کارپوریشن کو ترقی کی ترغیب اور تحریک کا اہم رول تفویض کیا ہے جس کی اہمیت روز بہ روز بڑھتی رہے گی۔

باب ۱۵

زمینی اصلاحات اور پالیسی

خاتمۂ زمین داری کے حوالے سے

ہمارے ملک میں زمینی رشتوں کا ڈھانچہ قانونی، معاشی اور سماجی رشتوں کا ایک ایسا مرکب ہے جو افسردگی اور دل شکستگی پیدا کرتا ہے اور ہماری زراعت کو نیم جامد حالت میں رکھتا ہے۔ ہندوستان کی معاشی پس ماندگی کا یہی سب سے بڑا سبب ہے۔ اسی لیے ہندوستانی معیشت کی ترقی اور تنظیم میں زمینی اصلاحات کی خاص اہمیت ہے۔ یہ اس منصوبہ بند زرعی انقلاب کے لیے مناسب سماجی، معاشی بنیاد اور اساسی ڈھانچہ فراہم کرتی ہیں جو تیز صنعتی ترقی کی پہلی شرط ہے۔ چنانچہ حکومت نے ہندوستان کی زرعی معیشت کی تنظیم اور بنیادی تبدیلیوں کے لیے زمینی اصلاحات پر بہت زور دیا ہے۔

منصوبہ بند ترقی کے نکتۂ نگاہ سے زمینی اصلاحات کے اہم نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ان کا بیرا اور راست اثر یہ ہوتا ہے کہ آمدنی کی دوبارہ تقسیم زیادہ مساوی طریقے سے ہوتی ہے۔ قوتِ خرید چند لوگوں کے ہاتھ سے بہت سے لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہونے کی وجہ سے طلب کے عناصر بدلتے ہیں اور بہتر طریقوں سے بنی ہوئی چیزوں کی مانگ بڑھتی ہے اور اس کے مطابق معیشت کی ترقی کے بہتر امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن زرعی آمدنی کی اس طرح دوبارہ تقسیم کی وجہ سے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بازار میں آنے والی فاضل زراعتی پیداوار کی مقدار گھٹ جائے جس کی وجہ سے ترقی کا عمل دھیما پڑ سکتا ہے دوسری طرف ملکیتِ اراضی کی طرف سے اطمینان ہونے کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسان زیادہ سرمایہ لگائیں اور زیادہ محنت کریں اور اس طرح پیداوار میں اضافہ ہو۔ غرض کہ ان نتائج کے مجموعی اثر کی صحیح پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی۔ خیال یہی ہے کہ پیداوار کے اضافے پر اس کا اثر اچھا پڑے گا۔

نظامِ اراضی کے رائج طریقے:

ہندوستان میں حقیقت اراضی کے تین طریقے ہیں:

(۱) رعیت واڑی طریقہ: اس نظام کے تحت رجسٹرڈ کاشت کار اراضی کا مالک ہوتا ہے

اور اس کو اُس وقت تک بے دخل نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ حکومت کو براہِ راست لگان ادا کرتا رہتا ہے۔ رعیت یا کسان کی حیثیت مالک کسانوں کی ہوتی ہے۔ اگرچہ بیشتر کسانوں کے پاس بہت چھوٹے کھیت ہوتے ہیں۔ یہ نظام اراضی بمبئی، مدھیہ پردیش اور مدراس میں رائج ہے۔ اِس نظام کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ مال گزاری کا تعین بندوبست کے افسر من مانی طریقے سے وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے چھوٹے کسانوں کو خشک سالی اور مانسون کی بے ربطی کی صورت میں بڑا نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔

(۲) محل واڑی طریقہ: رعیت واڑی طریقے کے مالک کسانوں کے برعکس محل واڑی طریقے میں مال گزاری کی ادائیگی کی ذمہ داری نہ صرف فرداً فرداً گاؤں کی اراضی یا محال کے شرکا کی ہوتی ہے بلکہ قانوناً گاؤں کی پوری برادری کی بھی ہوتی ہے۔ شرکا خود کسان اور مالکان اراضی ہوتے ہیں لیکن مال گزاری کی ادائیگی سارے شرکا اجتماعی طور سے کرتے ہیں۔ یہ طریقہ پنجاب، مدھیہ پردیش اور اُتر پردیش کے آگرہ ڈویژن میں رائج ہے۔ محل واڑی طریقے میں چونکہ کسان مالک ہوتے ہیں اور اُن کی اراضی کا رقبہ بھی اوسط درجے کا ہوتا ہے اِس لیے یہ طریقہ آسانی سے کوآپریٹیو فارمنگ میں بدلے جانے کے لیے بہت موزوں ہے۔

(۳) زمین داری طریقہ:- یہ طریقہ مغربی بنگال، بہار، آندھرا اور اُتر پردیش اور مدھیہ پردیش کے کچھ حصّوں میں رائج ہے۔ اِس طریقے کے تحت زمین دار زمین کا مطلق مالک ہوتا تھا۔ مال گزاری کی ادائیگی کی ذمہ داری زمین دار کی تھی۔ مال گزاری لارڈ کارنوالس کے استمراری بندوبست کے تحت ایک بار ہمیشہ کے لیے متعین کر دی گئی تھی لیکن چند مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جہاں استمراری بندوبست کی مال گزاری ہر چالیس برس بعد دوبارہ متعین کی جاتی تھی۔

یہ نظام غیر حاضر زمین داری کی بدترین شکل تھی جو اسامی کسانوں کی روزافزوں بدحالی کی بیشتر ذمہ دار تھی۔

زمین داری کا خاتمہ

زمینداری نظام کے تحت بیشتر زمین دار صرف مال گزاری وصول کرتے تھے اور اسامیوں کی زمین کی پیداآوری بڑھانے کے لیے کوئی اقدام نہیں کرتے تھے۔ آبادی کے اضافے کے ساتھ کاشت میں توسیع ہوئی اور قابلِ کاشت زمین کی مانگ بڑھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زمین داروں کی لگان کی آمدنی برابر بڑھتی رہی جس کی وجہ سے زمین داروں اور اسامیوں کے درمیان بچولوں اور ماتحت زمین داروں

کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ اِس سب کا مطلب یہ تھا کہ کسان لگان کی شکل میں جو زبردست رقم ادا کرتے تھے وہ ریاست، زمین دار اور درمیانی لوگوں میں بٹتی تھی۔ زمین دار دولت مند ہوتے رہے درمیانی لوگ مزے کرتے رہے اور ریاست اپنی آمدنی میں جائز منافع سے محروم رہی۔ اُدھر کسان فاقہ کشی کی زندگی گزارتے رہے۔

اِن شدید بُرائیوں کی وجہ سے اِس طریقے کو ختم کرنے کے لیے اُن صوبوں میں قوانین بنائے گئے جو زمین داری کے شکار تھے۔ اِن قوانین کے تحت حکومت نے زمین داروں کا حقِّ ملکیت معاوضہ دے کر لے لیا اور قانونی آسامیوں یا بالائی لگان داروں کو براہِ راست ریاست سے متعلق کر دیا۔ حکومت کا تخمینہ تھا کہ خاتمۂ زمین داری سے متاثر علاقے کا رقبہ ۱۷۳ ایکڑ ہوگا۔ اور معاوضے کی رقم تقریباً ۵۰۰ کروڑ روپے ہوگی۔ مارچ ۱۹۵۶ء تک مدھیہ پردیش، پنجاب، آسام، گجرات، مدراس، مہاراشٹر، راجستھان، آندھرا، اُتر پردیش، مغربی بنگال اور کیرل میں زمین داری ختم کی جا چکی تھی۔

ذیل میں مختلف صوبوں کے قوانین کی خاص باتیں دی جاتی ہیں۔ تشریح کے لیے مغربی بنگال اسٹیٹ اکویزیشن ایکٹ (Estates Acquisition Act) ۱۹۵۳ء کی متعلقہ دفعات دی گئی ہیں۔

(الف) درمیانی لوگوں کے حقوق ختم کیے گئے اور انھیں معاوضہ دیا گیا۔ بیشتر معاوضے کی رقم زمین داروں کی خالص آمدنی کے کچھ گُنے کے برابر رکھی گئی ہے۔ آمدنی جیسے جیسے بڑھتی جاتی ہے، معاوضے کے گُنے کم ہوتے جاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ معاوضے کی شرح کم ہوتی جاتی ہے۔ مغربی بنگال میں معاوضے کی شرح مندرجہ ذیل تھی۔

خالص آمدنی	معاوضے کی شرح
پہلے ۵۰۰ تک	۲۰ گُنا
اگلے ۵۰۰ تک	۱۸ گُنا
اگلے ۱۰۰۰ تک	۱۷ گُنا
اگلے ۲۰۰۰ تک	۱۲ گُنا
اگلے ۱۰۰۰۰ تک	۱۰ گُنا
اگلے ۱۵۰۰۰ تک	۶ گُنا
اگلے ۸۰۰۰۰ تک	۳ گُنا

(ب) معاوضے کا کچھ حصّہ نقد ادا کیا گیا اور کچھ بانڈ کی شکل میں۔ چھوٹے زمینداروں کو عموماً نقد ادائیگی کی گئی۔ مغربی بنگال میں ۵۰۰ تک کی آمدنی تک پورا معاوضہ ادا کر دیا گیا۔ آمدنی کے باقی حصے کے لیے کچھ نقد ادا کیا گیا اور بقیہ سرکاری بانڈ کی شکل میں۔

(ج) زمین داروں کو خود کاشت کرنے کے لیے زمین رکھنے کی اجازت ہے لیکن بیشتر ایسی زمینوں کی حد متعین کر دی گئی ہے۔ مغربی بنگال میں کوئی فرد ۲۵ ایکڑ زراعتی زمین اور ۲۰ ایکڑ غیر زراعتی زمین سے زیادہ نہیں رکھ سکتا۔

(۵) زمین داری کے خاتمے کے بعد حکومت کو لگان کی ادائیگی کی ذمہ داری براہِ راست کسان کی ہے۔ کسان سالانہ لگان کے مقرر کئے ادا کر کے اپنی اراضی کی ملکیت حاصل کر سکتا ہے۔ مغربی بنگال کے اکوزیشن ایکٹ کا سب سے بجات بخش پہلو یہی ہے۔ اِس سے کسان کے دل میں اُمید اور اعتماد کی روشنی پیدا ہوتی ہے اور اُسے اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ جو لگان وہ ادا کرتا ہے وہ زمین داروں کی جیب میں نہیں جائے گا بلکہ اُن خدمات کی شکل میں اُسے واپس مل جائے گا جو حکومت فراہم کرتی ہے۔

خاتمۂ زمین داری کے اثرات

آئیے اب خاتمۂ زمین داری کے اثرات کا جائزہ لیں۔ اِس سے ہمیں یہ اندازہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ ہماری ترقی پذیر معیشت پر زمینی اصلاحات کا کیا اثر پڑا۔

(۱) خاتمۂ زمین داری سے خود بہ خود زراعتی پیداوار میں اضافے کی تحریک نہیں ہو سکی۔ انتشارِ اراضی اور چھوٹے چھوٹے حصّوں میں زمین تقسیم ہونے کی وجہ سے اور زراعت کے فرسودہ طریقوں کی وجہ سے دشواریاں اتنی شدید ہیں کہ جب تک زراعت کے پورے نظام کی تنظیم دوبارہ نہیں کی جاتی اور اُس کو تقویت نہیں پہنچائی جاتی اُس وقت تک کسی نمایاں نتیجے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ خاتمۂ زمین داری کے ساتھ پورے زرعی نظام کو بدلنے کی ضرورت ہے اور زراعتی ڈھانچے میں رفتہ رفتہ رضاکارانہ بڑے پیمانے کی کوآپریٹیو فارمنگ کو جگہ دینے کی ضرورت ہے۔

(۲) خاتمۂ زمین داری کے بعد سرکار لگان کے واحد وصول کرنے والے کی حیثیت سے زمین کی چک بندی کے اقدام کر سکتی ہے۔ ایسا کرنے سے بڑے پیمانے کی کوآپریٹیو فارمنگ شروع کرنا آسان ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حکومت کو وصول ہونے والے لگان کا بڑا حصّہ دیہی علاقوں کی

ترقیاتی اسکیموں اور اُن کی فلاح پر صَرف کیا جائے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ایک زراعتی اور جمہوری ملک میں کوئی بھی زمینی اصلاح ترقی پسند اور مناسب نہیں تصور کی جاسکتی اگر وہ کسانوں کی فلاح اور بہبود کو نظر انداز کرتی ہے۔

(۴) خاتمۂ زمین داری سے کسانوں کی طلب خود بہ خود بڑھے گی اس لیے اس کا امکان ہے کہ انھیں معاشی اُجرت مل سکے۔ دوسری طرف بہت سے لوگ جو لگان کی وصول یابی کے کام میں لگے ہوئے تھے وہ بے روزگار ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس کی ضرورت ہوگی کہ ان بے روزگار لوگوں کو روزگار فراہم کیا جائے اور زراعتی مزدوروں کو معاشی اجرت دی جائے۔ ان لوگوں کو گاؤں کے قریب بھاری سرو حبٹوں پر مفید روزگار سے لگایا جاسکتا ہے۔

معاوضے کی نقد ادائیگی کی وجہ سے افراطِ زر میں اضافہ ہوگا۔ جن حکومتوں نے یہ قوانین بنائے ہیں انھیں اس مسئلے کا اندازہ ہے اسی لیے معاوضے کا صرف تھوڑا حصہ نقد ادا کیا گیا ہے اور باقی بانڈ کی شکل میں۔ حکومت کے زیرِ سرپرستی ایک لون ایجنسی یا فائنانس کارپوریشن قائم کیا جاسکتا ہے جو بے معاش زمین داروں سے بانڈ لے کر انھیں مالی امداد فراہم کرسکتا ہے تاکہ یہ لوگ چھوٹی موٹی صنعتیں شروع کرسکیں۔

مختصر یہ کہ اگرچہ خاتمۂ زمین داری کے قوانین میں کچھ خامیاں ضرور ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی اس تبدیلی کو انقلابی کہا جاسکتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ جن علاقوں میں زمین داری ختم کی جاچکی ہے وہاں ملکیت بہت مساوی ہے اور زمین دارانہ استحصال کی بعض خرابیوں سے وہ علاقے پاک ہیں۔

ماضی کے قوانینِ اراضی :

ہمارے جیسے کم ترقی یافتہ ملک میں جہاں زمین پر آبادی کا دباؤ بے حد ہے، زمین داروں کی استحصالی سرگرمیاں عام ہیں، وہاں اراضیاتی اصلاحات سے کسانوں کی مصیبتیں دور کرنے اور اُن کے ساتھ سماجی انصاف کرنے میں مدد ملے گی۔ آزادی سے قبل کے قوانینِ اراضی چار زمروں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔

(۱) **ملکیت کی ضمانت** :۔ پنجاب، ہماچل پردیش اور مدھیہ پردیش میں برطانوی عہد میں کسانوں کے ملکیت کے حق کے تحفظ کے لیے قوانین بنائے گئے تھے۔ اِن قوانین کے تحت اسامیوں کو اُس وقت تک بے دخل نہیں کیا جاسکتا جب تک وہ پابندی سے لگان ادا کرتے ہیں۔ ملکیت کی ضمانت

بذاتِ خود ایک طرح کی محرّک تھی۔ کسانوں نے زمین کو بہتر بنانے میں زیادہ دلچسپی لینی شروع کی اور اس سے مستقبل کی زمینی اصلاحات کے قوانین کے لیے زمین ہموار ہوئی (۲) مناسب لگان: پنجاب، حیدرآباد اور راجستھان سے زمین داروں کو ادا کیے جانے والے لگان کی زیادہ سے زیادہ حد متعین کرنے کے لیے قوانین بنائے۔ ان قوانین کی وجہ سے زمین داروں کی استحصالی کارروائیاں کچھ کم ہوئیں۔ مناسب لگان کے قوانین کی تعمیل سے کسانوں کی حالت بہتر ہوئی اور وہ اس قابل ہوئے کہ زراعت کو بہتر بنانے کے لیے تھوڑا بہت سرمایہ لگا سکیں۔ (۳) کسانوں کو اُن کی زیرِ کاشت زمین کی ملکیت حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرنے سے متعلق قوانین: بمبئی، پنجاب، دہلی، راجستھان، اُتر پردیش اور حیدرآباد نے ایسے قوانین بنائے جن کے تحت کسان اُن زمینوں کو خرید سکتے تھے جو اُن کے زیرِ کاشت تھیں۔ اُن محنتی کسانوں کو زمین کا مالک بننے کے لیے حقِ خریداری دینے کے قوانین بنائے گئے جو کسی زمین پر بارہ برس سے مسلسل کاشت کر رہے تھے۔ لیکن ان قوانین کا اثر پیداوار کی استعداد پر پڑا کیوں کہ کسانوں کو حقِ ملکیت خریدنے کے لیے قرض لینے کی ترغیب ہوئی۔ ان قوانین سے زیادہ فائدہ ہوتا اگر ساتھ ہی کسانوں کو کم سود پر قرض کی سہولتیں فراہم کی گئی ہوتیں (۴) مستقل اصلاحات عمل میں لانے کا معاوضہ: کچھ صوبوں میں ایسے قوانین بنائے گئے جن کے تحت کسانوں کو کھیتوں کو بہتر بنانے کا معاوضہ دیا جا سکے۔ ان قوانین کی وجہ سے اور ملکیتِ اراضی کے تحفظ کی وجہ سے کسانوں کو اپنی زمین کو بہتر کرنے کی کچھ ترغیب ہوئی لیکن زراعت میں اساسی تبدیلیاں نہ ہونے کی وجہ سے کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

پانچ سالہ منصوبوں کے تحت قوانینِ اراضی

پانچ سالہ منصوبوں میں جن قوانینِ آراضی کی سفارش کی گئی ہے اُن کے بنیادی مقاصد یہ تھے:
(۱) لگان کو ضابطے کے تحت لا کر کم کرنا (۲) آسامیوں کو حقِ ملکیت کا زیادہ تحفظ فراہم کرنا (۳) جہاں مالکانِ آراضی کے پاس ذاتی کاشت کے لیے زمین ہے وہاں آسامیوں کو پٹے کی زمین خریدنے کی اجازت دینا۔ تیسرے پلان کے ختم تک حقِ ملکیت سے متعلق قوانین پندرہ صوبوں اور سارے مرکزی علاقوں میں نافذ کیے جا چکے تھے۔

ان قوانین کے نفاذ سے پہلے لگان کی عام شرح خام پیداوار کی ۵۰٪ تھی اور کسانوں کو تقریباً سارے اخراجاتِ کاشت برداشت کرنے پڑتے تھے۔ پہلے پلان میں لگان کی موجودہ شرح خام پیداوار کی ایک تہائی یا ایک چوتھائی تھی جس کا انحصار اس پر تھا کہ زمین زیرِ آب پاشی ہے یا نہیں۔ بہار، غیر طرے

قانونِ اراضی کے تحت لگان کی بالائی حد خام پیداوار کی ۱/۲ مقرر کی گئی ہیں آندھرا پردیش اور مدراس کے حالیہ قوانین کے تحت لگان کی شرح ۳۰٪ ۴۰ اور ۵۰ فیصد تک رکھی جاسکتی ہے۔ بعض صوبوں نے پلاننگ کمیشن کی سفارشات کو نظر انداز کر کے ایسے قوانین بنائے جو مالکانِ اراضی کے موافق ہیں۔ یہ غالباً اس لیے کیا گیا کہ ان صوبوں کی سرکاروں کو خطرہ تھا کہ اگر پلاننگ کمیشن کی سفارش پر عمل کیا گیا تو رعیت واڑی علاقے کے مالکانِ اراضی نقصان میں رہیں گے۔ یہ لوگ اپنی زمینوں کو پٹے پر اُٹھا کر خاصی آمدنی کرتے ہیں اور ملک کی سماجی اور سیاسی زندگی میں کافی بااثر ہیں۔ لیکن ایک مایوس کن پہلو یہ ہے کہ بیشتر صوبوں میں عام طور سے قانونِ اراضی کے بنیادی دفعات کی تعمیل نہیں کی گئی۔

پہلے اور دوسرے منصوبوں میں زمینی اصلاحات کے اقدام

(الف) پہلے پلان میں زمینی اصلاحات کی پالیسی: پہلے پلان کی زمینی اصلاحات کی پالیسی کی تشکیل میں درمیانی لوگوں کو ختم کرنے، لگان داری کی بنیادی اصلاحات کے لیے قوانین بنانے اور ذاتی کاشت پر مبنی کاشتکاری ملکیت دوبارہ رائج کرنے پر خاصی تاکید تھی۔ پہلے پلان کی زراعتی تنظیم کے پروگرام میں لگان کو منضبط کرنے اور چک بندی سے متعلق مسائل کو بھی اہمیت دی گئی۔

تقریباً سارے صوبوں میں درمیانی لوگوں کو ختم کرنے کے معاملے میں کافی ترقی ہوئی۔ لگان داری کے قوانین میں بنیادی اصلاحات عمل میں لائی گئیں اور بیشتر صوبوں میں پرانے قوانین میں کافی ردوبدل کیا گیا تاکہ انھیں موجودہ حالات کے مطابق بنایا جائے۔ اُتر پردیش اور دلّی میں کاشتکاروں کو حقِ ملکیت کی پوری ضمانت دی گئی۔ بمبئی، پنجاب اور راجستھان کے کسانوں کو حقِ ملکیت کی محدود ضمانت حاصل ہوگئی۔

لیکن جیسا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے پہلے پلان کے دوران لگان کو ضابطے کے تحت لانے کے سلسلے میں کارگزاری ناہموار رہی۔ صرف چند صوبوں نے لگان کم کیا اور بیشتر صوبوں میں لگان کی زیادہ سے زیادہ حد پلان کی سفارش کردہ حد سے اونچی رکھی گئی۔ اسی طرح چک بندی کے کام میں بھی پلان کے دوران کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔

(ب) دوسرے پلان میں زمینی اصلاحات کی تجاویز: دوسرے پلان کی رپورٹ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ زمینی اصلاحات کا قطعی اور آخری مقصد کوآپریٹیو دیہی انتظام کی تخلیق ہے۔ کوآپریٹیو دیہی انتظام کا خیال پہلے پلان سے شروع ہوا تھا لیکن ابتدائی مشکلات کی وجہ سے زیادہ کامیابی حاصل نہیں

ہوئی۔

کوآپریٹیو دیہی انتظام کے نظریے کو پورے طور سے سمجھنے کے لیے تین باتوں پر خاص طور سے توجہ دینے کی ضرورت ہے :

(۱) کوآپریٹیو دیہی انتظام میں یہ بات پہلے فرض کرلی جاتی ہے کہ زمینوں کی ملکیت کاشت کاروں کو حاصل ہے (۲) انتظام کی اکائی اور عمل کی اکائی میں فرق کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ پورا گاؤں انتظام کی اکائی ہونے کے باوجود یہ ممکن ہے کہ کئی سال تک کسانوں کے کھیت عمل کی اکائی میں رہیں (۳) کوآپریٹیو دیہی انتظام کی منزل پر پہنچ جانے کے بعد زمین والے کسان اور بے زمین کسانوں کے فرق کی اہمیت کم ہوجائے گی۔ گاؤں کی برادری کے زراعتی، تجارتی اور دیہی صنعتی تمام مجموعی وسائل اس لیے استعمال ہوں گے کہ کوآپریٹیو سرگرمیوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو اور زیادہ سے زیادہ روزگار کے مواقع گاؤں کے اندر اور گاؤں کے باہر حاصل ہوں۔ غرض کہ بنیادی طور سے ایک ایسا ملا جلا سماجی، معاشی ڈھانچہ ذہن میں ہے جس میں زراعتی پیداوار، دیہی صنعتیں، اشیا کو قابل استعمال بنانے والی صنعتیں، مارکٹنگ اور دیہی تجارت یہ سب کوآپریٹیو بنیاد پر منظم ہوں گی۔

دوسرے پلان کی رپورٹ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کوآپریٹیو دیہی نظام تک پہنچنے کے درمیانی مراحل میں اراضی کا انتظام تین مختلف طریقوں سے ہوگا۔ پہلے تو منفرد کسان ہوں گے جو اپنی ذاتی زمینوں پر کاشت کریں گے۔ دوسرے پرانے کسانوں کی ٹولی ہوگی جو رضاکارانہ طور سے اپنے کھیت یک جا کرکے ایک کوآپریٹیو بنالیں گے۔ تیسرے کچھ ایسی زمین ہوگی جو پوری گاؤں کی برادری کی ہوگی۔ اس طرح یہ ظاہر ہے کہ ہر گاؤں میں زمینی انتظام کے تحت ایک حلقہ منفرد کسانوں کا ہوگا، دوسرا رضاکارانہ کوآپریٹیو کا اور تیسرا پوری برادری کا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے پلان کی زمینی پالسی کے تین واضح پہلو ہوں گے۔ سب سے پہلے تاکید کاشت کاری ملکیت پر ہے جس کے تحت ہر کسان اپنی زمین کا مالک رہے گا۔ دوسرے یہ کہ انتظام کا قطعی مقصد یہ ہوگا کہ انتظام مجموعی طور سے پورے گاؤں کی برادری کے سپرد کیا جائے۔ تیسرے جہاں تک عمل کا سوال ہے یا تو منفرد کھیتی ہوگی یا کوآپریٹیو فارمنگ۔ پلاننگ کمیشن کو زمین کی ملکیت اور کھیتی کے طریقے کے بارے میں زیادہ واضح پالسی اپنانی چاہیے تھی۔ کمیشن کو مبہم خیالات ظاہر کرنے کے بجائے اس بات کا صاف اعلان کرنا چاہیے تھا کہ کوآپریٹیو ڈیولپمنٹ [illegible] سماجی معاشی [illegible] تک [illegible] جب تک ان کی سمجھ

وضاحت نہ کی جائے۔ مختصر یہ کہ دوسرے پلان کی زمینی پالیسی نہایت بے تکی اور بے ربط تھی۔ غالباً اُس کی تشکیل عجلت میں اور چھوٹے حصّوں میں کی گئی تھی۔

دوسرے پلان کے آخری مسودے میں بھی ملکیت اراضی کی حد مقرر کرنے کے مسئلے کا تشفی بخش حل نکالنے کی کوشش نہیں کی گئی اگرچہ یہ بات تسلیم کی گئی کہ زمینی اصلاح کی بنیادی پالیسی کی پہلی شرط زمین کی دوبارہ تقسیم ہے جو ملکیت کی مقررہ حد پر مبنی ہو بجائے اس کے کہ مقررہ حد کی صاف صاف وضاحت کی جاتی، صرف یہ سفارش کی گئی کہ " زیادہ آسانی اس میں ہے کہ ہر صوبہ مختلف علاقوں کی حالت مٹی کی قسم اور آب پاشی کی سہولتوں وغیرہ کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کرے کہ زمین کا کتنا رقبہ ایک کنبے کی ملکیت قرار دیا جا سکتا ہے۔" یاد رکھنا چاہیے کہ دوسرے پلان کے پہلے مسودے میں اقتصادیات دانوں کے پینل کی سفارشات پر مبنی تھا، زمین کی ملکیت کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کرنے اور کنبے کی اراضی کا رقبہ متعین کرنے کے مسئلے پر زیادہ ٹھوس طریقے سے غور کیا گیا تھا۔ اس مسودے میں کنبے کی اراضی کا رقبہ متعین کرنے کی بنیاد ۱۲۰۰ روپے سالانہ کی خالص آمدنی (خاندان والوں کی محنت کے معاوضے سمیت) کی سفارش کی گئی تھی۔

پلان کے آخری مسودے میں نہ ملکیت کی حد مقرر کی گئی اور نہ کنبے کی اراضی کی واضح تعریف کی گئی۔ اگرچہ پلاننگ کمیشن نے یہ بات کہی کہ یہ حد کنبے کی اراضی کی تین گنی ہونی چاہیے۔ لیکن یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ لینڈ ریفارمس پینل کی سیلنگز کمیٹی ابتدائی مسودے کی اس تجویز کے حق میں تھی کہ آمدنی کے مطابق ملکیت اراضی کی حد مقرر کی جائے۔ کمیٹی نے اس بات پر زور دیا کہ سیلنگ کے فارمولے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ انفرادی ملکیت کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کی جائے اس لیے مستقل رقبے کے مقابلے میں آمدنی کو معیار بنانے کا طریقہ زیادہ منصفانہ تھا۔ بہرحال بیشتر صوبوں نے مستقل رقبے کو ہی معیار مانا ہے۔ یہ بات تشفی بخش ہے کہ بیشتر صوبوں میں ملکیتِ اراضی کی حد کے قوانین بن گئے ہیں اور کئی صوبوں میں ان کا نفاذ ہو چکا ہے۔ جموں اور کشمیر میں جہاں تعمیل ہو چکی ہے ۴ لاکھ ایکڑ رقبہ حاصل کر کے تقسیم کیا گیا۔ مغربی بنگال میں ۷ء۹۶ لاکھ ایکڑ رقبے کو فاضل قرار دیا گیا۔ اس میں سے ۷ء۲۳۵ لاکھ ایکڑ حکومت اپنے قبضے میں لے چکی ہے جسے تا انتظام مستقل عارضی طور پر اُن لوگوں کو دیا جا رہا ہے جو ادھیا پر کھیتی کرتے ہیں یا جن کے پاس کھیت نہیں ہیں۔ بہار، گجرات، مدھیہ پردیش، مدراس، آسام، اُتر پردیش، آندھرا، راجستھان، دہلی، ہماچل پردیش اور تری پورا کے کچھ علاقوں میں سیلنگ سے متعلق قوانین نافذ کیے جا چکے ہیں۔ کیرل، میسور اور اڑیسہ میں کچھ دفعات

میں ترمیمیں کی گئی ہیں تاکہ نفاذ سے قبل کچھ خامیاں دور کی جا سکیں۔

اِن ساری باتوں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پنج سالہ منصوبے میں اراضی کی ملکیت کی زیادہ سے زیادہ حد متعین کرنے کی سفارش کے باوجود مشکل سے کسی صوبے نے پلان کے دوران سفارشات کی تعمیل کے لیے قوانین بنائے۔ ۱۹۵۵ء میں چوتھے کانسٹی ٹیوشن امنڈمنٹ بل منظور ہو جانے کے بعد ملکیت کی حد مقرر کرنے کے سلسلے میں جو دستوری مشکلات تھیں وہ دور ہو گئیں۔ چنانچہ ۱۹۵۹ء میں کانگریس پارٹی کے ناگپور ریزولیوشن میں یہ اعلان کیا گیا کہ ۱۹۵۹ء کے آخر تک سارے صوبوں کو ملکیت کی حد مقرر کرنے سے متعلق قوانین پاس کر دینا چاہئیں اور فاضل زمینیں پنچایتوں کو دے دینا چاہئیں۔ اس زمین کا انتظام کوآپریٹیو کے ذریعے کیا جائے جو بے زمین مزدوروں پر مشتمل ہو۔ اِس کے بعد اُن صوبوں نے جہاں اب تک یہ قانون نہیں بنے تھے، جلدی جلدی دوسرے پلان کے ختم تک ملکیت کی حد متعین کرنے کے قوانین بنا لیے گئے، دوسرے پلان کے دوران ۱۵ صوبوں میں یہ قوانین منظور کیے جا چکے تھے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ جن صوبوں میں یہ قوانین بن گئے ہیں، وہاں بھی ان کی تعمیل یا تو نہیں ہوئی اور اگر ہوئی تو اس میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے بڑی مشکل صوبوں کو یہ پیش آئی کہ چونکہ بل بننے سے قبل ہی اس کی کافی تشہیر ہو گئی اس لیے لوگوں کو اس کا موقع مل گیا کہ اپنی آراضیات چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیں یا انھیں فروخت کر دیں۔ چنانچہ ہماری رائے ہے کہ مجوزہ بل کی اشاعت کے بعد زمینوں کی تقسیم اور فروخت ممنوع قرار دے دینی چاہیے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ملکیت کی حد متعین کرنے کے قانون کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ فاضل آراضیات کو بے زمین اور زمین کے بھوکے کسانوں میں تقسیم کر دینے سے زراعتی پیداوار کو بہت فائدہ پہنچے گا اور دیہی آمدنی کافی بڑھ جائے گی۔ ملکیت اراضی کی معقول حد پر مبنی وسیع اور مساوی تقسیم آراضی سے ہماری معیشت کے دیہی حلقے میں جمہوری سوشلزم کے حصول کے لیے راستہ صاف ہوگا اور ہماری نئی کسانی جمہوریت میں چھوٹے کسانوں کے پس ماندہ طبقے کو یقیناً بحال ہونے کا موقع ملے گا۔ سیلنگ کی وجہ سے زمین کی ملکیت میں زیادہ مساوات آئے گی جس سے چک بندی میں آسانی ہوگی۔ کوآپریٹیو فارمنگ کے لیے راستہ کھلے گا اور پیداوار میں اضافہ ہوگا۔

نئی زراعتی پالیسی: ناگپور ریزولیوشن اور زمینی اصلاحات

دوسرے پلان کی زراعتی پالیسی کی تشکیل چھوٹے ٹکڑوں میں کی گئی تھی۔ برسرِ اقتدار

پارٹی نے بہت جلد یہ محسوس کرلیا کہ زمینی پالیسی میں نہ صرف ربط اور امتزاج کی کمی ہے بلکہ سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں وہ محرکی عناصر ناپید ہیں جو دیہی زندگی کو نئی شکل دینے کے لیے ضروری ہیں۔ یہ بہت بڑی خامی تھی کیوں کہ ہم سب جانتے ہیں کہ جب تک دیہی حلقے کو پورے طور سے متحرک نہیں کیا جاتا شہری حلقے کی توسیع اور صنعتی ترقی کی رفتار میں رکاوٹیں بڑی طرح حائل رہیں گی۔ ہمارے جیسے کم ترقی یافتہ ملک میں صنعتی ترقی کے دوران مربوط زمینی پالیسی کی ضرورت ہوتی ہے۔ خاص کر یہ ہے تاکہ برآمدات اور صنعتی ترقی کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اناج کی فاضل اور بازار میں آنے والی پیداوار اور زراعتی خام مال کی پیداوار میں اضافہ ہو سکے۔ کانگریس نے ۱۹۵۹ء میں اپنے ناگپور سشن میں اس بنیادی مسئلے سے اپنی گہری دلچسپی اور زمینی پالیسی کو نیا رُخ دینے پر آمادگی ظاہر کی۔

ناگپور ریزولیوشن پر مبنی نئی زراعتی پالیسی میں کوآپریٹیو کو ہمارے پانچ سالہ منصوبوں میں سنگِ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ زمینی اصلاح کا نیا نقشہ پنچایتی جوائنٹ کوآپریٹیو فارم پر مبنی ہے۔ جس کے شروع ہونے سے پہلے سروس کوآپریٹیو کا جال بچھا دیا جائے گا۔ یہ سروس کوآپریٹیوز خالص رقمی تنظیمیں ہوں گی جو خاص کر اچھے بیج، کھاد اور زراعتی اوزار کی فراہمی اور کاشت کاروں کو سائنٹفک صلاح و مشورہ دینے کے لیے استعمال ہوں گی۔ سروس کوآپریٹیوز قرض کی فراہمی اور فصل کی فروخت کا بھی انتظام کریں گی۔ صوبائی سرکاروں کو ۱۹۵۹ء کے ختم تک ملکیت اراضی کی حد مقرر کرنے سے متعلق قانون بنانے تھے۔ فاضل اراضی کا انتظام ایسی کوآپریٹیوز کے سپرد ہونا ہے جو صرف اُن کسانوں تک محدود ہوں گی جن کے پاس زمین نہیں ہے یا ہے تو مقررہ حد سے کم ہے۔ ان تمام کاموں کا مقصد یہ ہوگا کہ جلد از جلد ایک گاؤں کی ایک کوآپریٹیو سوسائٹی کے اصول پر بہت سی کوآپریٹیوز سارے ملک میں قائم کی جائیں۔

ذیل میں ہم ناگپور ریزولیوشن کی زراعتی تنظیم کی اہم باتیں دیتے ہیں:

(۱) گاؤں کی تنظیم گاؤں کی پنچایت اور گاؤں کی کوآپریٹیو پر مبنی ہونی چاہیے۔ جنھیں کافی اختیارات اور کافی وسائل حاصل ہونے چاہئیں تاکہ یہ اپنے معینہ فرائض انجام دے سکیں۔ گاؤں کے تمام مستقل باشندوں کو ویلج کوآپریٹیو کا رُکن بننے کا اختیار حاصل ہوگا چاہے وہ زمین کے مالک ہوں یا نہ ہوں۔ یہ کوآپریٹیوز کاشت کے بہتر اور ترقی یافتہ طریقوں کے استعمال اور گھریلو صنعتوں کی ہمت افزائی کے ذریعے اپنے ممبروں کی فلاح اور بہبود کو ترقی دے گی۔ قرض کی سہولتوں کو فراہم کرنے اور دوسری خدمات کے علاوہ ویلج کوآپریٹیو کسانوں کی زرعی پیداوار کو اکٹھا کرنے اور فروخت

کرنے کا انتظام کرے گی، اور غلہ رکھنے کے لیے گودام کی سہولت بہم پہنچائے گی۔

(۲) مستقبل کا زراعتی نظام کوآپریٹیو فارمنگ پر مبنی ہوگا جس کے تحت ساری زمین مشترک کاشت کے لیے یک جا کرلی جائے گی۔ کسانوں کی ملکیت اراضی برقرار رہے گی اور خالص پیداوار میں انھیں ان کی زمین کے تناسب سے حصہ ملے گا۔ اس کے علاوہ جو لوگ فارموں پر کام کریں گے انھیں اس کا معاوضہ ملے گا چاہے زمین اُن کی ہو یا نہ ہو۔

(۳) جوائنٹ فارمنگ شروع ہونے سے قبل ابتدائی اقدام کے طور پر سارے ملک میں سروس کوآپریٹیوز قائم کردی جائیں گی۔ یہ مرحلہ تین سال کے اندر پورا کرلیا جائے گا۔ اس مدت کے دوران بھی اگر کسان رضامند ہوں تو مشترک کاشت شروع کی جاسکتی ہے۔

(۴) اصلاحات کے بارے میں تذبذب دور کرنے اور کسانوں کو مضبوط کرنے کے لیے حال اور مستقبل دونوں کے لیے ملکیت اراضی کی متعین ہونا چاہیے اور اسے عمل میں لانے کے لیے اور زمین داری ختم کرنے کے لیے قانون بنانے کا کام تمام صوبوں میں ۱۹۵۹ء کے ختم تک پورا ہو جانا چاہیے۔ ساری فاضل زمین پنچایتوں کو سونپ دینا چاہیے اور اس کا انتظام گاؤں کی پنچایتوں کے ذریعے ہونا چاہیے۔

(۵) فصل بوئی جانے سے قبل کھڑی فصلوں کی کم سے کم قیمت متعین ہونی چاہیے اور ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ جب ضرورت ہو تو فصل براہ راست خرید لی جائے۔

(۶) غلے کی تھوک تجارت میں اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن کی شرکت کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے اور مناسب وقت پر اس کو شروع کیا جانا چاہیے۔

(۷) ہر ممکن کوشش ہونی چاہیے کہ خالی اور بے کار زمینوں کو زیر کاشت لایا جائے۔ مرکزی حکومت کو ایک کمیٹی مقرر کرنا چاہیے جو اس زمین کے استعمال کے مناسب طریقے نکالے۔

ہندوستان کی زمینی پالسی کے تین جز ہونے چاہئیں۔ پہلے تو پالسی یہ ہونی چاہیے کہ کسانوں کی معاشی، معاشرتی اور سماجی حالت بہتر کی جائے۔ دوسرے یہ پالسی ایسی ہونی چاہیے جس سے دیہی حلقے کو متحرک کیا جاسکے تاکہ قابلِ فروخت اناج اور زراعتی خام مال کی رسد میں اضافہ ہوسکے۔ تیسرے یہ کہ ہماری بیش قیمت جمہوری اور اس کی لاینفک انسانی حریت کو قربان نہ کرنا چاہیے بلکہ اُس کا تحفظ ہونا چاہیے۔ ان تین مقاصد کے ہم وقت اور جمہوری نظام کے تحت حصول کے لیے کوآپریٹیوز ہی ایک تنہا حل معلوم ہوتی ہیں۔

اچھے بیج اور کھاد اور زراعتی آلات کی فراہمی کے لیے رضا کارانہ رکنیت پر مبنی سروس کوآپریٹیوز

کی تجویز یقیناً قابلِ تعریف ہے لیکن ہمارے جیسے کم ترقی یافتہ ملک میں جہاں لوگ روایات کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں سروس کوآپریٹیوز کے مرحلے سے جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ کی منزل میں آنا کافی مشکل کام ہوگا۔ لوگوں کو جھنجھوڑنے، عمل پر آمادہ کرنے اور سماجی، ذہنی اور تعلیمی حیثیت سے اس قابل بنانے میں کہ ان کا نظریہ وسیع ہو اور یہ نئے تجربات کی اہمیت کو سمجھ سکیں، کافی وقت لگے گا۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم جوائنٹ فارمنگ کے مخالف ہیں لیکن ہمارا یہ خیال ضرور ہے کہ یہ سلسلے کام بتدریج اور باضابطہ طریقے سے کرنے چاہئیں۔ کانگریسی لیڈروں کے ساتھ جو دقت ہے وہ یہ کہ وہ بہت بے صبر ہو گئے ہیں اور ہندوستانی زراعت کی گتھیوں کو کسی جادو کے فارمولے کے ذریعے فوراً حل کرنا چاہتے ہیں۔ بدقسمتی سے جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ جادو کا ایسا فارمولا نہیں ہے۔ کوآپریٹیو فارمنگ کوئی آسان اور خودکار نظام نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑی تیاری، نگرانی، سرمائے اور ممتاز لیڈرشپ کی ضرورت ہے۔ بنیادی مسئلہ یہ ہوگا کہ ان کسانوں کو مشترک کاشت شروع کرنے اور اس پر جمے رہنے پر آمادہ کیا جائے۔ جن کی ملکیتِ اراضی اور تعلیم مساوی نہیں ہے ہندوستان میں اگر پنچایتوں کو یہ اہم کام انجام دینا ہے تو ان کے پاس ایسا عملہ ہونا چاہیے جو فنی اور تعلیمی اعتبار سے موزوں ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے جانکار لوگ فوراً تو نہیں تیار کیے جا سکتے اور ان کے دستیاب ہونے میں وقت لگے گا۔

باب ۱۶

کواپریٹیو فارمنگ اور کواپریٹیو تحریک

نظامِ اراضی میں بنیادی تبدیلیوں اور زمین داری کے خاتمے کی وجہ سے اس کی جگہ پر فارمنگ کے کسی دوسرے نظام کی ضرورت ہوگی۔ اجتماعی فارمنگ کا طریقہ جس کے تحت وسائل کی ملکیت مشترک ہو لیکن کاشت انفرادی ہو، شاید جمہوریت کے لیے موزوں نہ ہو۔ مشرقی ممالک کے تجربے سے یہ ظاہر ہوگیا ہے کہ اجتماعی فارمنگ سے نہ مزدوروں میں کوئی خاص اضافہ ہوتا ہے اور نہ فی ایکڑ پیداوار اور آمدنی میں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری معاشی پس ماندگی کا سب سے بڑا سبب ہمارے زمینی رشتوں کا نظام ہے جس کی سرشت میں مایوسی اور پژمردگی داخل ہے اور جس نے کم روزگاری کے توازن کی غیر معمولی پست سطح پر ہندوستانی زراعت کو ڈال رکھا ہے۔ ان حالات کا علاج صرف یہ ہے کہ سیلنگ کی بنیاد پر فوراً زمین کی دوبارہ تقسیم ہو اور غیر زراعتی روزگار کے مواقع بڑے پیمانے پر فراہم ہوں۔ آراضیات کی موثر تقسیم نو سے ہندوستانی زراعت میں اساسی تبدیلیاں لانے کے لیے زمین ہموار ہوگی۔ اس تقسیم نو کے ساتھ ساتھ اگر کافی وسائل چھوٹے کسانوں تک پہنچائے جاسکیں صرف تب ہی ہم کوآپریٹیو فارمنگ کے مسئلے سے ٹھیک سے نپٹ سکتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں سماجی جمہوریت کے تحت جس قسم کی کوآپریٹیو فارمنگ ہے وہ اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب متوسط درجے کے کسان ہوں اور کوآپریٹیوز کو سرکاری سرپرستی حاصل ہونے کے باوجود اُن کے کام میں سرکاری مداخلت نہ ہو۔

جمہوری قسم کی کوآپریٹیو فارمنگ کی خصوصیات یہ ہیں: (ا) زمین کی ملکیت منفرد کسانوں کی ہوتی ہے (ب) ساری آراضی منفرد یونٹوں میں منظم ہوتی ہے (ج) ممبروں کو کام کا معاوضہ ملتا ہے۔ (د) انتظام مشترک ہوتا ہے (ہ) خالص منافع کا ایک حصہ ریزرو فنڈ بنانے کے لیے نکال دیا جاتا ہے اور باقی منافع ممبروں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔ کوآپریٹیو فارمنگ کے سرمائے کے لیے جو رقم درکار ہوتی ہے وہ ممبر فراہم کرسکتے ہیں۔ ایک معقول مدت کے بعد یہ رقم انھیں مع سود

بالاقساط واپس مل جاتی ہے۔ ابتدائی مراحل میں سرکاری سرپرستی سے کوآپریٹیو فارمنگ سوسائٹیوں کو یقیناً تقویت ملتی ہے۔

کوآپریٹیو فارمنگ سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کاشت کا رقبہ بڑا ہوتا ہے، انتظام مشترک ہوتا ہے اور حق ملکیت انفرادی ہوتا ہے۔ منفرد کھیتوں کے کاموں اور جوکھم کو مشترک کر دینے کی وجہ سے فنی معلومات اور مہارت کا استعمال آسان ہو جاتا ہے۔ گہری جتائی کی جاسکتی ہے، فصلوں کی ترتیب میں ہیر پھیر کیا جاسکتا ہے، نئے قسم کے بیج کا استعمال ہوسکتا ہے، زمین کے تحفظ اور پانی کی کفایت کے اقدام کیے جاسکتے ہیں اور کھیتی کے طریقوں میں جلد تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ کاشت کا رقبہ بڑا ہونے کی وجہ سے بھاری مشینیں اور آلات استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً ٹریکٹر اور ایسی مشینیں جو پیداوار کو قابل استعمال بناتی ہیں۔ مشترک انتظام کی وجہ سے کفایت کے ساتھ اچھے جانور رکھے جاسکتے ہیں۔ ذخیرے کا بہتر انتظام ہوسکتا ہے، اور فروخت کی معقول سہولتیں فراہم کی جاسکتی ہیں۔ پیداوار بڑھانے کی رغبت بھی کم نہیں ہوتی کیوں کہ ممبروں کو حق ملکیت حاصل رہتا ہے اور انھیں کام کا معاوضہ بھی ملتا ہے اور منافع کا حصہ بھی۔

ہندستان میں کوآپریٹیو فارمنگ کا ارتقا (پہلے اور دوسرے منصوبوں کے مخصوص حوالے)

آزادی کے فوراً بعد کوآپریٹیو فارمنگ کی پہلی منظم اور مرتب کوشش اتر پردیش کے جھانسی ضلع میں کی گئی۔ اس کے بعد سے یوپی کے دوسرے ضلعوں، بمبئی، پنجاب اور دہلی میں کوآپریٹیو فارم قائم کیے گئے۔ یوپی کے ترائی کے علاقے میں کوآپریٹیو فارموں کے ذریعے بڑے رقبوں کی بازیافت کی گئی ہے۔ صوبہ بمبئی میں بھی کوآپریٹیو فارم سوسائٹیوں نے بے کار سرکاری زمین اور پرتی زمینوں کی بازیابی کے بعد انھیں قابل کاشت بنایا اور اُن پر کاشت کی۔ پنجاب میں زمین کی بازیابی کے علاوہ کوآپریٹیو فارمنگ سوسائٹیوں نے زراعت میں بھاری مشینوں کے استعمال پر بڑی رقمیں صرف کیں۔

یکم جنوری ۱۹۵۲ء کو بمبئی میں پہلی انڈین کوآپریٹیو کانگریس نے تجویز منظور کی کہ "مرکز اور صوبوں کو چاہیے کہ جہاں جہاں کوآپریٹیو سوسائٹیوں کا قیام ممکن ہو اور اُن کی ضرورت ہو وہاں اُن کے قیام کے لیے سرگرمی کے ساتھ موثر قدم اُٹھائے جائیں۔" اس تجویز سے متاثر ہو کر مرکزی حکومت نے ستمبر ۱۹۵۳ء میں صوبوں کے وزرائے زراعت و امداد باہمی کی ایک کانفرنس بلائی۔

ہندوستان کا پلاننگ کمیشن اس بات سے متفق ہے کہ کوآپریٹیو فارمنگ کی ترقی جلد از جلد ہونی چاہیے۔ پہلے پلان میں کئی ایسی تجویزیں تھیں جن کا مقصد یہ تھا کہ چھوٹے کسانوں کی امداد اور ہمت افزائی کی جائے کہ یہ رضاکارانہ طور پر متحد ہوں اور کوآپریٹیو فارمنگ سوسائٹیاں قائم کریں۔ ہندوستانی حالات کے لیے کوآپریٹیو فارمنگ کے متناسب طریقے نکالنے کے لیے زرعی تجربات کی سفارش کی گئی۔ صوبوں سے درخواست کی گئی کہ وہ کوآپریٹیو فارمنگ کے تدریجی پروگرام بنائیں لیکن بدقسمتی سے پہلے پلان کے دوران اس سلسلے میں کوئی خاص اقدام نہیں کیے گئے۔ بہت سے لوگ کوآپریٹیو فارمنگ سوسائٹیاں قائم کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی عملی مشکلات کے سلسلے میں انھیں ضروری ہدایات نہیں مل سکیں۔ دوسرے پلان کے دوران مقصد یہ تھا کہ کوآپریٹیو فارمنگ کی بنیاد رکھی جائے تاکہ تیسرے پلان کے ختم تک زیر کاشت زمین کا کافی حصہ کوآپریٹیو فارمنگ کے تحت آجائے۔ تیسرے پلان میں امداد باہمی کی ترقی کے لیے ۸۰ کروڑ روپے رکھے گئے جب کہ دوسرے پلان میں اس مد پر اخراجات کا تخمینہ ۳۴ کروڑ تھا۔ چوتھے پلان کے ختم تک توقع ہے کہ کوآپریٹیوز کا حلقۂ عمل اتنا وسیع ہوجائے گا کہ ۹۵ کروڑ روپے کی کھاد، ۵۰ کروڑ کے بیج اور ۵۰ کروڑ کی کیڑے مارنے والی دوائیں اور ۱۵ کروڑ کے آلات استعمال کریں گی۔ جون ۱۹۶۸ء کے ختم تک ۵۲۵۴ کوآپریٹیو فارمنگ سوسائٹیاں قائم کی جاچکی تھیں جن کا رقبہ ۳،۰۰،۶۲۸۹ ایکڑ تھا۔ کوآپریٹیو فارمنگ کے کاموں کا جائزہ لینے کے لیے حال میں کمیٹی آف ڈائرکشن قائم کی گئی ہے جس نے تجویز کیا ہے کہ چوتھے پلان میں اُن علاقوں میں مہمین طریقۂ کار استعمال کرنا چاہیے جہاں امداد باہمی کی تحریک کامیاب رہی ہے یا کامیاب ہونے کے امکانات ہیں۔

جنوری ۱۹۵۹ء میں کانگریس پارٹی نے اپنے ناگ پور سشن میں جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ پر مبنی زرعی اصلاحات کی جلد از جلد تکمیل کا فیصلہ کیا۔ اس وقت سے امداد باہمی کے محاذ پر سرگرمی کافی بڑھ گئی ہے۔ کوآپریٹیو فارمنگ کے میدان میں حکومت نے حال میں جو اقدام کیے ہیں اُن میں سے ایک اہم قدم مرکز اور صوبوں میں نیشنل کوآپریٹیو فارمنگ ایڈوائزری بورڈوں کا قیام ہے جن کا مقصد کوآپریٹیو فارمنگ کی ترقی اور ۳۱۰ پائلٹ پروجیکٹوں کی رضاکارانہ تنظیم کی ہمت افزائی ہے۔ درحقیقت تیسرے پلان کے دوران حکومت نے پوری کوشش کی کہ ایسے منتخب کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاکوں میں جہاں پنچایت راج کے ادارے قائم ہیں اور کوآپریٹیوز نے ترقی کی ہے۔ ہر ضلع میں ایک ہی شرح سے ۳۱۸ پائلٹ پروجیکٹوں کی تنظیم میں امداد دی جائے۔ ہر پائلٹ پروجیکٹ کم از کم دس کوآپریٹیو فارمنگ سوسائٹیوں پر مشتمل ہوگا جس کا مقصد یہ ہوگا کہ کوآپریٹیو فارمنگ کی افادیت کا مظاہرہ کیا جائے تاکہ ان کے سہارے تحریک کو مزید ترقی دی جاسکے۔

لیکن مایوس کن بات یہ ہے کہ کوآپریٹیو فارمنگ سوسائٹیوں کے بارے میں پلاننگ کمیشن نے جو رپورٹ

دوسرے پلان کے دوران شائع کی وہ بڑی مایوس کن ہے۔ ان میں سے بیشتر کوآپریٹیو سوسائٹیاں اُن پٹے داروں
نے قائم کی تھیں جو خود کاشت نہیں کرتے تھے اور جنھوں نے زمینی اصلاحات کے نتائج سے بچنے کے لیے یہ راہ
نکالی تھی۔ چنانچہ یہ امداد باہمی کے ضروری اصولوں کی پابندی سے عاری تھیں۔ بیشتر ممبرین فارم پر کام
نہیں کرتے تھے اور اگر کرتے بھی تھے تو صرف انتظام اور نگرانی کے کام۔ جس کی وجہ سے اُجرت پر مزدور رکھنے
پڑتے تھے۔

بڑی چھوٹی کوآپریٹیو سوسائٹیوں کے کاموں کی حالیہ رپورٹ بھی کم ہمت شکن نہیں ہے۔ اس رپورٹ
میں پلاننگ کمیشن کے پروگرام ایویلویشن آرگنائزیشن نے بہت سی بدعنوانیوں کی طرف اشارہ کیا ہے
جو چھوٹی بڑی دونوں کوآپریٹیو سوسائٹیوں میں عام ہیں۔ نتیجہ ایسا ہے کہ بڑی سوسائٹیوں کی حالت چھوٹی سے
بدتر ہے۔ مہاجن اور زمیندار بڑی سوسائٹیوں کی کمیٹیوں پر حاوی ہیں اور انھیں عوام کی ترقی کے ادارے
نہیں بننے دیتے۔

کوآپریٹیوز کے کاموں کی رپورٹوں سے صاف ظاہر ہے کہ متمول طبقے نے جس میں بیشتر غیر حاضر پٹہ دار
ہیں، اس طبقے کے مقابلے میں زیادہ فائدہ اٹھایا ہے جو معاشی اعتبار سے پس ماندہ ہے اور چھوٹے کسانوں
پر مشتمل ہے۔ اس لیے ہم اس بات کے حق میں ہیں کہ اگر چھوٹے کسانوں کی معاشی حالت بہتر کرنا ہے تو پہلی
شرط یہ ہے کہ زمین کی موثر طریقے سے ازسرِنو تقسیم کی جائے۔ چھوٹا کسان ہماری کسانی جمہوریت کے کھمبے کی
حیثیت رکھتا ہے جسے اگر موقع دیا جائے تو یقیناً وہ کوآپریٹیو فارمنگ کو کامیاب بنانے کی پوری
کوشش کرے گا۔

کوآپریٹیو فارمنگ کے موضوع پر حال کے ایک کتابچے میں ڈاکٹر آٹو شیلر (Dr. OTTO SCHILLER) نے
کوآپریٹیوز کا جو نظریہ پیش کیا ہے اُس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ڈاکٹر شیلر اس بات کے حامی ہیں کہ
انفرادی کھیتی ہو اور کھیت چھوٹے ہوں لیکن جہاں تک رسد، فروخت، منصوبہ بندی اور سرمایہ لگانے کا
سوال ہے، یہ کام کوآپریٹیوز کے تحت ہونے چاہئیں۔ اُن کا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے چھوٹی اراضیات
کو مدغم کیے بغیر بڑے پیمانے کی کھیتی کے فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ درحقیقت ڈاکٹر شیلر کوآپریٹیو کا
ایک نیا نظام تجویز کرتے ہیں جس کو انھوں نے "بہتر انفرادی کاشت کی کوآپریٹیو سوسائٹی" کا نام دیا ہے۔
اس اسکیم کا بنیادی خیال یہ ہے کہ چھوٹے کسانوں کے کھیتوں کو مدغم کیے بغیر یا کسانوں کی ذاتی ملکیت،
ذاتی پیش قدمی اور زمین سے ذاتی تعلق ختم کیے بغیر پیداواری کاشت کے عمل کو کوآپریٹیوز کے تحت
لایا جا سکتا ہے۔ موجودہ حالات میں ڈاکٹر شیلر کی تجاویز ہماری زمین کے موثر استعمال کے مسئلے کا

بہتر پہل میں، خصوصاً اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ ہمارے کسانوں کی اکثریت بڑی قدامت پرست ہے اور اتنی سماجی، ذہنی اور تعلیمی قابلیت اُس کے پاس نہیں ہے کہ وہ کوآپریٹیو فارمنگ کے نئے تجربے سے متعلق کانگریس کے ناگپور ریزولیوشن کی تجاویز کو پوری طور سے سمجھ سکے۔ آگے چل کر جب دیہات کے لوگ واقعی جاگ جائیں گے اور عمل پر آمادہ ہو جائیں گے تو ہم ڈاکٹر شیلر کی اسکیم میں ردو بدل کر سکتے ہیں۔ اِس طرح ہم دھیرے دھیرے جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ کی منزل تک پہنچ جائیں گے۔

جوائنٹ کوآپریٹیو فارم: مسائل اور امکانات

کانگریس کے ۱۹۵۹ء کے ناگپور سیشن میں نئی زمینی اصلاحات کے تسلیم کیے جانے کے بعد سے جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ کے مسائل اور امکانات پر بحث شروع ہوئی۔ کانگریس کے اراکین دھیرے دھیرے اُن کے زرعی پروگرام کی قطعی تکمیل کے لیے ایک پُرجوش ماحول پیدا کر رہے ہیں جس میں جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ کو مرکزی جگہ دی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس جوائنٹ کوآپریٹیو فارم پر مبنی پنچایتوں کے حق میں ہے اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے پروگرام کو نئی شکل دے کر اُس سے منسلک کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔

زراعتی محاذ پر خصوصاً اساسی تبدیلیاں لانے میں ہماری کارگزاری جو ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہے۔ اسی لیے ہمارے لیڈر کسی ایسے فوری علاج کے لیے پریشان ہیں جو جادو کا کام کرے۔ بدقسمتی سے جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ کوئی ایسی دوا نہیں ہے جس سے ہماری قدامت پرست سوسائٹی میں کوئی فوری نتیجے برآمد ہو سکیں۔ یہ کام آہستہ آہستہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے ذریعے بہت جلد اور بہت سے نتائج برآمد ہونا ممکن نہیں ہے۔

اِس سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ ہم ایک پس ماندہ زرعی معیشت میں جو جمہوریت کے اصول اپنانا چاہتی ہے، جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ کی اہمیت کو کم کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی پس ماندہ معیشت میں جہاں زراعتی پیداوار، فنی معلومات اور مالی وسائل کا معیار بہت پست ہے۔ انفرادی کوشش کے مقابلے میں کوآپریٹیو کے ذریعے زیادہ تیزی سے پیداوار بڑھانے کی تحریک کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ اس کے لیے زبردست نفسیاتی رکاوٹوں کو دور کرنا ہوگا اور اس کی تنظیم کے لیے مؤثر طریقہ نکالنا ہوگا۔ کوآپریٹیو فارم کے مشکل ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ ضابطے کی پابندی کرائی جائے اور لوگ دیانت کے ساتھ کام کریں۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب ان میں غیر معمولی ہم آہنگی ہو اور دونوں کا ایک مشترک مقصد ہو جسے لوگ دل سے پسند کرتے ہوں۔

خود کسانوں کی نظر میں کوآپریٹیو فارمنگ کا سب سے زیادہ کشش رکھنے والا پہلو مشینوں کا استعمال ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مشینوں کے استعمال سے پیداوار بڑھے گی لیکن ساتھ ہی کام کرنے والوں کی بہت بڑی تعداد بے روزگار ہو جائے گی جن کو اس وقت تک کسی بامقصد کام سے نہیں لگایا جا سکتا جب تک دیہی علاقے کی جذب کرنے کی صلاحیت کو پورے طور سے استعمال نہ کیا جائے اور اس کے لیے سخت قسم کی مالی پالیسی نہ اختیار کی جائے۔ روس میں اس مقصد کے حصول کے لیے جبر کیا گیا، بڑی قربانیاں دی گئیں اور ساتھ ہی صنعتوں کی ترقی کی رفتار تیز کی گئی۔ لیکن ہندوستان جمہوری اصولوں کا قائل ہے اور ابھی اس منزل پر نہیں پہنچا ہے جہاں بڑے پیمانے پر زراعت کی منتقلی قابل قبول ہو۔ جس طرح دوسری صنعتوں میں ہاتھ کے کام کو مصنوعی طریقے سے باقی رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ اس کا ثبوت ہے۔

دوسرے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مزدوروں کو ادھر سے ادھر کیے بغیر بھی اگر کوآپریٹیو فارمنگ کی توسیع کی کوشش کی گئی تو بھی ہندوستان کے گاؤں کا روایتی رشتہ بگڑ جائے گا۔ خاندانی ذمہ داری کی روایت کمزور پڑ جائے گی اور افراد کے ذہنوں میں اہمیتوں کی ایک مختلف ترتیب پیدا ہو جائے گی۔ ان سب کے لیے جن بڑے پیمانے پر سماجی خدمات کی ضرورت ہوگی اُن کا فراہم کرنا فی الحال ہندوستان کے بس سے باہر ہے۔

مسئلے کے مالیاتی پہلو پر بہت کم بحث کی جاتی ہے۔ عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ زراعت کو سرمائے کی جتنی شدید ضرورت ہے اُس کو فراہم کرنے کا کافی موقع جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ کے نظام کے تحت حاصل ہوگا۔ جب تک کوآپریٹیو فارم چند ہیں اور تجرباتی حیثیت سے ان کی قدر کی جاتی ہے تب تک ایک کم سرمایہ اور کم ترقی یافتہ ملک بھی ان پر کافی بڑی رقم صرف کر سکتا ہے اور یہ رقم مفید طریقے سے صرف ہوتی ہے۔ لیکن جب ہر گاؤں میں کوآپریٹیو فارمنگ ہوگی، جیسا کہ کانگریس نے ناگپور سیشن میں منظور کیا ہے، تو شاید اتنے بڑے پیمانے پر سرمائے کی فراہمی ناممکن ہوگی، خصوصاً اس لیے کہ زراعتی آلات بنانے کے لیے جن مشینوں کی ضرورت ہوگی وہ زیادہ تر باہر سے منگانی پڑیں گی جس کے لیے محدود زر مبادلہ میں ایک خاص ترجیح حاصل کرنے کا سوال پیدا ہوگا۔

اس سے قبل کہ ہم کوآپریٹیو فارمنگ کے سلسلے میں دوسرے ملکوں کے تجربات کی طرف متوجہ ہوں اور کسی عام نتیجے پر پہنچیں، آئیے پہلے اُس مباحثے کے خاص پہلوؤں کا خلاصہ کر لیں جو کسانوں کے لیے مستقل بنیاد پر کوآپریٹیو فارمنگ کرنے کے سوال سے متعلق ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں زمینوں کو یکجا کرنے کا

فائدہ یہ ہے کہ انتشارِ اراضی سے نجات ملتی ہے، مشینوں کا استعمال ممکن ہوتا ہے، فصلوں کی حفاظت آسان ہوتی ہے اور محنت کی تخصیص ایک حد تک عمل میں آسکتی ہے۔ لیکن دوسری طرف مسئلہ یہ ہے کہ کسان اپنی زمین دینے سے ہچکچاتے ہیں کیوں کہ زمین ہی اُن کا اثاثہ ہوتی ہے اور اسی پر اُن کی سماجی حیثیت کا انحصار ہوتا ہے۔ دوسری مشکلات یہ ہیں کہ کام میں ضابطے کی پابندی کرانا مشکل ہوتا ہے، نئے خیالات اور نئے آلات کی تشہیر کے موثر ذرائع کم ہوتے ہیں اور روایتی طریقوں سے جو کام کیے جاتے ہیں اُنھیں جانچنے کا کوئی صحیح پیمانہ نہیں ہوتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ فلاں شخص سُست اور کاہل ہے اُس کے خلاف آسانی سے کارروائی نہیں کی جاسکتی اور اِس طرح ایک کاہل آدمی باقی ساتھیوں کے کام کی رفتار سُست کر دیتا ہے۔ مزید براں انتظامی ضابطے، فنی معلومات اور حسابات رکھنے کے پیچیدہ نظام کی ضرورت ہوتی ہے جس کی ضرورت پہلے نہیں تھی۔

چوں کہ ہم ایک جمہوری نظام کے تحت کوآپریٹیو فارمنگ کے امکانات پر سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں اِس لیے اِسرائیل کے تجربوں سے سبق لینا مفید ہوگا۔ اِسرائیل کی کوآپریٹیو فارمنگ کی تاریخ ہمارے لیے اِس لیے باعثِ دل چسپی ہے کہ یہی ایک کم ترقی یافتہ جمہوری ملک ہے جس کو اِس میدان میں کچھ کامیابی ہوئی ہے۔ ہم میں سے جو لوگ جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ کو بہت آسان اور تمام مسائل کا حل تصور کرتے ہیں اُن کے لیے اِسرائیلی تجربوں کے دو پہلو بہت سبق آموز ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ شروع میں اسرائیل میں سخت اور بے لوچ قسم کی کوآپریٹیوز جنھیں کبوز کہتے ہیں، قائم کی گئی تھیں جن سے لوگوں کی دل چسپی جلد ہی ختم ہوگئی اور ان کی جگہ پر موشاز نام کی زیادہ آزاد اور لچک دار کوآپریٹیوز شروع کرنی پڑیں۔ دوسری بات یہ کہ اسرائیل میں کوآپریٹیو فارموں کے ممبر روایتی کسان نہیں تھے بلکہ زیادہ تر شہری لوگ تھے اور ان میں سے بیشتر کا معیارِ تعلیم کافی اونچا تھا۔ کوآپریٹیو فارمنگ کے میدان میں اسرائیل کی کامیابی کی وجہ غالباً یہی ہے۔ بدقسمتی سے ہم ہندوستانی اِس سے محروم ہیں اور کوآپریٹیو فارمنگ سے متعلق انتظامی دشواریوں سے گزرنے میں ہمیں اسرائیل سے زیادہ وقت لگے گا۔

یاد رکھنا چاہیے کہ جہاں تک اسرائیلی کوآپریٹیوز کا تعلق ہے، ان کے ممبروں کا ذاتی سرمایہ برائے نام ہوتا ہے یا ہوتا ہی نہیں۔ ابتدائی وسائل مختلف قسم کے زیانسٹ فنڈ سے بطور قرض فراہم کیا جاتا ہے۔ دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ کوآپریٹیوز میں شامل ہونے والے تمام نئے لوگ چاہے وہ اسرائیل میں [illegible] ہوئے ہوں یا دوسرے ملکوں سے آئے ہوں، انھیں مختلف قسم کی نوجوان تحریکوں سے متعلق طویل تربیت

منسلک ہے جس کی نوعیت زراعتی ہونے کے ساتھ سماجی اور اخلاقی بھی ہوتی ہے۔ درحقیقت موجودہ کوآپریٹیوز میں سے زیادہ تر کے ساتھ یوتھ کلب منسلک ہوتے ہیں جہاں نوجوان ممبروں کو پوری ٹریننگ دی جاتی ہے۔ نوجوان تحریکیں اور یوتھ کیمپوں کی سرگرمیاں کوآپریٹیو تحریک کی جان ہیں۔ جن کے ذریعے امداد باہمی کی تحریک کا پیغام عوام تک پہنچتا ہے۔ شاید ہم اسرائیل کی کوآپریٹیو تحریک کے ان پہلوؤں سے کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

اسرائیل میں جس طرح سخت اور کڑی تنظیم والی کوآپریٹیو بستیوں کی جگہ زیادہ ڈھیلے ڈھالے قسم کی کوآپریٹیوز قائم کرنی پڑیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمہوریت پسند کسان کڑی پابندیوں میں کام کرنا نہیں پسند کرتے بلکہ آزادی چاہتے ہیں کہ وہ جس طرح مناسب سمجھیں کام انجام دیں۔ ہم میں سے اُن لوگوں کے لیے یہ نکتہ خصوصاً اہم ہے جو یہ توقع کرتے ہیں کہ جہاں ایک بار جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ کی گاڑی چل پڑی تو دیہی منصوبہ بندی کے بہت شاندار نتائج برآمد ہوں گے۔ ہم میں بہت سی کمیاں ہیں مثلاً ہمارے دیہی سماج کا ڈھانچہ کمزور ہے۔ اس میں ہم رنگی نہیں ہے۔ ہماری پنچایتیں نااہل ہیں اور اس تحریک میں جو بنیادی طور سے عوامی ہے، لوگوں کی سربراہی کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ کو نظم و ضبط دینے میں ہماری کوتاہیاں سدِّراہ ثابت ہوں گی اور ظاہر ہے کہ تنظیمی ضابطے کے بغیر دیہی منصوبہ بندی کے پسندیدہ مقاصد کا حصول مشکل ہے۔

اسرائیلی کوآپریٹیو فارمنگ کے اس جائزے کے بعد آئیے اب میکسیکو کی کوآپریٹیو فارمنگ کے تجربے پر ایک نظر ڈالیں۔ میکسیکو کی کوآپریٹیوز کے بارے میں نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بالکل از خود وجود میں آئیں اور نہ یہ کہ انہیں سرکار نے زبردستی عائد کیا۔ یہ درمیانی راہ ہمارے لیے اہم ہے کیوں کہ یہ ہمارے اُن نظریوں سے ملتی جلتی ہے جو ہم نے حال میں جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ سے متعلق قائم کیے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان اور میکسیکو دونوں ہی ملکوں میں کوآپریٹیو فارمنگ کے تجربے کو ایسے عوام سے سابقہ ہے جن کا فنی اور عام تعلیمی معیار بہت پست ہے اور جن کے دلوں سے خود اعتمادی اور پہل کرنے کی صلاحیت کو پشتوں کی غریبی اور نیم غلامی نے ختم کر دیا ہے۔ بہرحال میکسیکو کے تجربے سے ہمیں ایک کارآمد سبق یہ ملتا ہے کہ صرف کوآپریٹیو ملکیت قائم کر دینے سے بلکہ کوآپریٹیو فارمنگ بھی شروع کر دینے سے پیداوار میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ماہرین کی مستقل نگرانی حاصل ہو اور حکومت کافی بڑے پیمانے پر مالی امداد اور خدمات برابر فراہم کرتی رہے۔

میکسیکو کی کوآپریٹیو تحریک سے متعلق کوئی قطعی رائے دینا شاید ابھی قبل از وقت ہے۔ تاہم اب تک

جو نتائج برآمد ہوئے ہیں اُن کی بنیاد پر تھوڑی بہت رائے بہ آسانی قائم کی جاسکتی ہے۔ میکسیکو میں کوآپریٹیو فارم کو ایجی ڈو (Ejido) کہتے ہیں۔ اِن فارموں کی کارکردگی یکساں نہیں ہے۔ کسی کا معیار بلند ہے کسی کا پست۔ اس کا دارومدار فورمین کی ذہانت اور اُس کے اعلیٰ کردار پر ہوتا ہے کیوں کہ یہی لوگ کاشت سے متعلق سارے عمل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ میکسیکو کے تجربے سے یہ بات واضح ہے کہ دراصل مسئلہ فورمین کے کام کے لیے اہل آدمی کا انتخاب ہوتا ہے جو ایسے ملک میں بڑا مشکل کام ہوتا ہے جہاں فنی اور عام تعلیمی معیار پست ہو۔ اِس سلسلے میں ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروجیکٹوں کا تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ اِس کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ گرام سیوک کے کام کے لیے مناسب آدمی نہیں ملتے۔ کم ترقی یافتہ ملکوں کے باشندوں کی خصوصیات کے پیش نظر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، ہاں یہ بات ضرور حیرت کی ہے کہ ہم جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ کے پیچیدہ انتظامی مسائل کے حل کے لیے سرپنچوں پر زیادہ بھروسہ کر رہے ہیں۔

میکسیکو کے تجربے سے یہ بات واضح ہے کہ کوآپریٹیو فارمنگ کے کاموں میں لوگوں سے ضابطے کی پابندی کرانا مشکل ترین کام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میکسیکو کے کوآپریٹیو فارموں میں پیداوار گھٹنے کا سبب عموماً تنظیمی ضابطے کی کمی ہے۔ اِن کوآپریٹیو فارموں پر کام کا ایک ضابطہ تو ہوتا ہے لیکن سختی سے اس پر عمل نہیں ہو پاتا اور عام طور سے اس بارے میں اتفاق ہے کہ بیشتر مزدوروں کی پیداآوری اُن دنوں کے مقابلے میں گھٹی ہے جب کھیت ذاتی ملکیت تھے۔ میکسیکو کی لیگ آف سوشلسٹ ایگرونومسٹ نے، جسے کسی طرح مخالف گواہ نہیں تصور کیا جاسکتا، یہ تخمینہ لگایا ہے کہ ۱۹۴۳ء میں محنت کی پیداآوری ۲۲٪ گھٹی ہے۔ ہندوستان میں بھی کچھ ایسا ہی نتیجہ برآمد ہوگا اگر ہم نے بنیادی تنظیمی ضابطے کے مسائل کا حل نکالے بغیر جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ کے شروع کرنے میں عجلت سے کام لیا۔

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوآپریٹیو فارمنگ معاشی ترقی کے عمل کو آگے بڑھانے میں مدد کر سکتی ہے کیوں کہ کوآپریٹیوز کے ذریعے فاضل وسائل کو یکجا کرنے میں آسانی ہوتی ہے اور پھر ان وسائل کو سرمائے کی شکل میں دوبارہ لگانے اور شہری صرف کے لیے اناج کی کافی رسد بھی جاری رکھنے کے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ لیکن میکسیکو کا تجربہ یہ بتلاتا ہے کہ اگرچہ منفرد ذاتی فارموں کے مقابلے میں منظم کوآپریٹیو فارموں کی پیداوار کو حاصل کر کے یکجا کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے لیکن اس کا بہت امکان ہوتا ہے کہ فاضل پیداوار کی مجموعی مقدار گھٹ جائے کیوں کہ انتظامی ضابطے کی

کمی کی وجہ سے محنت کی پیداآوری کم ہو جاتی ہے۔ اور دیہی معیارِ زندگی اونچا ہونے کی وجہ سے خود کسانوں کا صَرف بڑھ جاتا ہے۔ میکسیکو کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ معاشی ترقی کے شروع میں قابلِ فروخت فاضل پیداوار کے نمایاں طور سے بڑھنے کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ ان باتوں پر ہمیں دھیان دینا چاہیے۔ یہ توقع نہ کرنا چاہیے کہ جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ ہندوستان کے غذائی مسائل کا کوئی جادوئی حل نکال سکتی ہے۔

مختصر یہ کہ کوآپریٹیو فارمنگ کی تنظیم کی اپنی خوبیاں ضرور ہیں لیکن لوگوں سے ضابطے کی پابندی کرانا اور سوجھ بوجھ کے ساتھ ان سے کام کرانا مشکل ترین مسئلہ ہے۔ خصوصاً ایک جمہوری نظام میں۔ اسرائیل کا تجربہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جو لوگ جمہوری طرزِ زندگی کے عادی ہوتے ہیں وہ ضابطے کی سختی نہیں پسند کرتے اور خود اپنے ڈھنگ سے کام کرنا چاہتے ہیں۔ میکسیکو کے تجربے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دیہی زندگی میں غیر معمولی لیڈرشپ کی کتنی کمی ہے اور فنی تعلیم اور عام تعلیم کا معیار کتنا پست ہے۔ ہندستان میں بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ تنظیمی ضابطے کا مرحلہ بڑا مشکل ہے جس کا پار کرنا بڑا کٹھن ہے۔

تنظیمی ضابطے اور موثر لیڈرشپ کے بغیر کوآپریٹیوز کے مزدوروں کی پیداآوری بڑھانا تقریباً ناممکن ہے اور جب تک محنت کی پیداآوری نہیں بڑھتی اس وقت تک غذائی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں ہم میکسیکو کے تجربے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہندوستان کے مجوزہ کوآپریٹیو فارموں کو میکسیکو ہی جیسے مسائل سے دوچار ہونے کی توقع ہے اور آخر میں ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ کسانوں کو ایک معقول سماجی، ذہنی اور تعلیمی سطح پر لائے بغیر کوآپریٹیو فارمنگ کی اچھی سے اچھی اسکیم سے بھی کوئی خاص نتائج برآمد ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ کی تجویز میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ اصل مسئلہ ہمارے روایت پرست عوام کا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے پاس کوئی ایسا آلۂ کار نہیں ہے جس کے ذریعے ہم انھیں جھنجھوڑ کر عمل پر آمادہ کر سکیں۔ اس لیے ہمیں آہستہ آہستہ قدم اٹھانا چاہیے اور اس وقت تک صبر کے ساتھ انتظار کرنا چاہیے جب تک کوئی موثر آلۂ کار نہ حاصل ہو جس سے انھیں عمل پر اُکسایا جا سکے۔

ہندوستان میں کوآپریٹیو تحریک

ہمارے منصوبوں کے دوران کوآپریٹیو فارمنگ کی کامیابی کے کیا امکانات ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہندوستان کی کوآپریٹیو تحریک کی تاریخ پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ ۱۹۰۴ء میں ہندستان

کی کوآپریٹیو تحریک کا جشنِ زرّیں منایا گیا۔ اب سے پینسٹھ سال پہلے جب ۱۹۰۴ء کے ایکٹ کے تحت کوآپریٹیو تحریک شروع ہوئی اُس وقت کوآپریٹیو سوسائٹیوں کا عمل قرض تک محدود تھا۔ اس کے بعد تحریک کا دائرۂ عمل کافی وسیع ہوا۔ یہاں تک کہ اب معاشی زندگی کے ہر پہلو میں اس کا دخل ہے۔

(الف) دوسری جنگِ عظیم سے پہلے کی نمایاں خصوصیات :

۱۹۰۴ء کے ایکٹ میں کئی خامیاں تھیں جن میں مندرجہ ذیل بہت اہم تھیں : (۱) اس ایکٹ کی ماہیت بہت محدود تھی جس کی وجہ سے قرض کے علاوہ دوسرے کاموں کے لیے کوآپریٹیو سوسائٹیاں نہیں قائم کی جا سکتی تھیں۔

(۲) رقم کی فراہمی اور نگرانی کے لیے کوئی مرکزی ادارہ نہیں تھا (۳) شہری اور دیہی سوسائٹیوں کے درمیان بہت سختی سے حدِ فاصل قائم کی گئی تھی۔

۱۹۱۲ء کے کوآپریٹیو سوسائٹیز ایکٹ نے اس خامی کو دور کیا اور ہندوستان میں پہلی بار قرض کی سوسائٹیاں بنانے کی اجازت ملی۔ ۱۹۱۵ء میں امدادِ باہمی سے متعلق میک لگان (MACLAGAN) کمیٹی کی رپورٹ کی اشاعت ہندوستان کی کوآپریٹیو تحریک کے سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کمیٹی کی سفارش کے مطابق ۱۹۱۹ء میں مانٹ فورڈ (MONT FORD) اصلاحات عمل میں آئیں جن کے تحت امدادِ باہمی کا شعبہ مرکز سے منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں بمبئی صوبے کی سرکار نے ایک الگ کوآپریٹیو سوسائٹیز ایکٹ پاس کیا جس کے بعد دوسرے صوبوں نے بھی ایسے ہی ایکٹ پاس کیے۔

۱۹۲۹ء کی کساد بازاری سے کوآپریٹیو تحریک کو سخت دھکا پہنچا۔ زراعتی پیداوار کی قیمتیں تیزی سے گریں اور کسان قرض کے بوجھ سے اتنے دبے تھے کہ انھیں امدادِ باہمی کی تحریک سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔

۱۹۳۵ء میں ریزرو بینک آف انڈیا کے نئے شعبے' ایگری کلچرل کریڈٹ ڈیپارٹمنٹ نے ملٹی پرپز سوسائٹیوں کی اہمیت پر زور دیا۔ اسی دوران صوبوں میں عوامی حکومتیں برسرِ اقتدار آئیں جنھوں نے تحریک کو دوبارہ زندہ کیا۔

(ب) دوسری جنگِ عظیم کے دوران

جنگ کے دوران چوں کہ زراعتی پیداوار کی قیمتیں کافی بڑھیں اس لیے کوآپریٹیو تحریک کو زور پکڑنے کا موقع ملا۔ کسانوں کی مالی حالت چوں کہ بہتر تھی اس لیے وہ ترقی کی طرف مائل تھے اور انھوں نے تحریک میں دلچسپی لی۔ دورانِ جنگ غیر قرض کی کوآپریٹیو سوسائٹیوں نے حیرت انگیز

ترقی کی۔ قرض کی سوسائٹیوں کی بھی تعداد بڑھی لیکن ان کے اضافے کی شرح دوسری سوسائٹیوں کے مقابلے میں کم تھی۔ غیر قرض کی سوسائٹیوں میں کنزیومر کوآپریٹیو سوسائٹیوں نے سب سے نمایاں ترقی کی جس کی وجہ یہ تھی کہ ضروری اشیا کی سخت قلت تھی اور ان کی تقسیم کے لیے ان سوسائٹیوں پر بھروسہ کرتی تھی۔ جنگ کے دوران کوآپریٹیو تحریک کی توسیع اور ترقی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۶ء تک ملک کی ۱۲٪ آبادی اس تحریک کے تحت آگئی تھی جب کہ ۱۹۳۹ء تک یہ صرف ۸٪ آبادی تک محدود تھی۔ اس زمانے میں ایک اور اہم بات یہ ہوئی کہ ۱۹۴۵ء میں حکومت ہند نے کوآپریٹیو پلاننگ کمیٹی مقرر کی جس نے سفارش کی کہ بنیادی سوسائٹیوں کو ملٹی پرپز سوسائٹیوں میں بدل دیا جائے اور کوشش کی جائے کہ دس برس کے اندر ملک کے ۵۰٪ گاؤں اور ۳۰٪ آبادی پر منظم سوسائٹیوں کا تسلط قائم ہو جائے۔

(ج) جنگ کے بعد کی مدت

۱۹۴۷ء میں قومی حکومت نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد تحریک کو مضبوط بنانے اور اسے وسعت دینے کے اقدام کیے۔ پانچ سالہ منصوبوں کے دوران کوآپریٹیو تحریک کو ترقیاتی منصوبہ بندی میں بنیادی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ پلاننگ کمیشن نہ صرف یہ چاہتا ہے کہ امداد باہمی کو دیہی ترقی اور تنظیم نو کا ذریعہ بنایا جائے بلکہ جیسا دوسرے اور تیسرے منصوبوں سے ظاہر ہے کہ چھوٹے پیمانے کی اور گھریلو صنعتوں میں بھی امداد باہمی کو بہت اہم رول ادا کرنا ہے۔ پہلے دو منصوبوں کے دوران قرض کی بنیادی سوسائٹیوں کی تعداد ایک لاکھ ۵ ہزار سے بڑھ کر دو لاکھ تیرہ ہزار ہو گئی اور ان کے ممبروں کی تعداد ۴۴ لاکھ سے بڑھ کر ۱۴۴ لاکھ تک پہنچ گئی۔ اس مدت میں ان سوسائٹیوں نے جو قرض دیے ان کی مجموعی رقم ۲۲ کروڑ سے بڑھ کر ۲۰۰ کروڑ ہو گئی۔ یہ دیکھ کر بڑی ہمت بڑھتی ہے کہ جب تیسرا منصوبہ شروع ہوا اس وقت تمام قسم کی کوآپریٹیو سوسائٹیوں کی تعداد ۱۸ ہزار سے بڑھ کر ۳۳۲ ہزار ہو چکی تھی۔ جنوری ۱۹۵۹ء کے بعد سے جب کانگریس نے اپنے ناگپور سیشن میں زراعتی تنظیم کے نئے نقشے کا اعلان کیا، کوآپریٹیو تحریک نے ہمارے دیہی ترقی کے پروگرام میں بنیادی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ تیسرے پلان کے پروگرام میں ۵۲ ہزار پرائمری سوسائٹیوں کو مضبوط بنانا شامل کیا گیا تھا لیکن اس سلسلے میں تشفی بخش کام نہیں ہوا۔

منصوبہ بندی سے قبل کے دور میں قرض کی سوسائٹیوں کی ناکامی کے اسباب:

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہندوستان میں کوآپریٹیو تحریک کا ابتدائی مقصد دیہی قرض کی سہولتیں

فراہم کرتا تھا۔ خیال تھا کہ چونکہ تجارتی بینک اپنے حصہ داروں کو اونچا منافع دینے کی فکر میں رہتے ہیں اس لیے یہ سستے دیہی قرض کی ایجنسی بننے کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ لوگوں کو ساہوکاروں سے نجات دلانے کے لیے ضروری تھا کہ کوئی ایسی ایجنسی قائم ہو جو ان ساہوکاروں کا نہ صرف مقابلہ کر سکے بلکہ رفتہ رفتہ انہیں ختم کر سکے۔ اس مقصد کے لیے کوآپریٹو کریڈٹ سوسائٹیاں بہترین ایجنسی تھیں کیونکہ ان کا مقصد منافع کمانا نہیں تھا بلکہ ایک قیمتی خدمت انجام دینا تھا۔ لیکن کوآپریٹو تحریک شروع ہونے کے ۶۲ سال بعد بھی کوآپریٹو کریڈٹ سوسائٹیوں کی تعداد جون ۱۹۶۶ء کو ۱۹۱۵۰۴ تھی جن کے ممبروں کی مجموعی تعداد ۲ کروڑ ۶۱ لاکھ تھی۔ ان کوآپریٹو سوسائٹیوں نے ۱۹۶۵-۶۶ء کے دوران جو قرض دیے ان کی مجموعی رقم ۳ کروڑ ۴۱ لاکھ ۵۰ ہزار تھی۔ یہ صورت کچھ تشفی بخش نہیں ہے خصوصاً اس بات کے پیش نظر کہ ۱۹۶۱-۶۲ء کے ریزرو بینک کے سروے کے مطابق ہندوستان کے ۷ کروڑ ۴۰ لاکھ خاندانوں کی اوسط قرض داری ۴۰۶ روپے تھی جس کا یہ مطلب ہے کہ دیہات کے رہنے والوں پر قرض کا مجموعی بار ۳۰۰۰ کروڑ سے زیادہ تھا۔

دیہی قرض کے میدان میں اس تحریک کی ناکامی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کے کسانوں کی آمدنی اتنی قلیل تھی اور مانسون پر اس کا اس قدر انحصار تھا کہ وہ فصلوں میں بھی روپیہ نہیں جمع کر پاتے تھے اور نہ ممبری کی فیس ادا کر پاتے تھے۔ اس کے علاوہ کسانوں پر ساہوکار کا تسلط قائم رہنے کا سبب یہ تھا کہ کسان کو پرانا قرض ادا کرنا ہوتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کی کامیابی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کسانوں کی پچھلی قرض داری تھی۔

قرض کے میدان میں کوآپریٹو تحریک کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ تحریک کے دائرۂ عمل کو وسعت دی جائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ کسانوں کی زندگی کے تمام پہلو اس کے تحت آتے ہوں۔ اس مقصد کے لیے ملٹی پرپز کوآپریٹو سوسائٹیاں بہترین ہوتی ہیں۔ دیہی زندگی کی از سر نو تشکیل صرف اسی وقت ممکن ہے جب قرض کو پیداوار اور ان کی فروخت سے منسلک کر دیا جائے۔ ملٹی پرپز کوآپریٹو سوسائٹیاں قرض کا مسئلہ حل کرنے کے ساتھ ساتھ پیداوار اور اس کی فروخت کے مسائل سے بھی نپٹتی ہیں۔ اس لیے دیہی معیشت کو نیا موڑ دینے کے لیے بہترین ذریعہ بن سکتی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اگلے چند برسوں میں جو سروس کوآپریٹیوز قائم کی جائے گی وہ مثالی ملٹی پرپز سوسائٹیاں ہوں گی جو قرض کے ساتھ پیداوار اور اس کی فروخت کے مسائل کو بھی موثر طریقے سے حل کریں گی۔

سروس کوآپریٹیوز کی طرف قدم

ایک طرح دیکھا جائے تو ساری کوآپریٹیو سوسائٹیاں اپنے ممبروں کو خدمات فراہم کرتی ہیں لیکن پیداواری کوآپریٹیوز اور سروس کوآپریٹیوز میں فرق ہے۔ پیداواری کوآپریٹیوز، جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ سوسائٹیوں کی طرح پیداواری کاموں کو ایک اجتماعی عمل کی حیثیت سے انجام دیتی ہیں۔ سروس کوآپریٹیوز میں کاشت کا کام منفرد انجام دیتے ہیں اور مخصوص خدمات کوآپریٹیوز فراہم کرتی ہیں۔

اگرچہ ہمارے ملک میں بہت سی ملٹی پرپز سوسائٹیوں اور دیہی قرض سوسائٹیوں نے اپنے ممبروں کو خدمات اور اشیا فراہم کرنے کی کوشش کی لیکن بعد میں حالات نے انہیں اپنا دائرۂ عمل قرض تک محدود رکھنے پر مجبور کر دیا۔ دوسری طرف سروس کوآپریٹیوز سے توقع کی جاتی ہے کہ یہ گاؤں کی سطح پر معاشی ترقی کی پوری ذمہ داری لیں گی اور زراعتی پیداوار بڑھانے کے لیے جن چیزوں کی بھی ضرورت ہوگی وہ فراہم کریں گی۔ مقصد یہ ہے کہ ہر کاشتکار خاندان کی نمائندگی سروس کوآپریٹیو میں ہو اور ہر ایک کو قرض اور وہ دوسری ضروری سہولتیں فراہم ہوں جو زراعتی پیداوار بڑھانے کے پروگرام کی تکمیل کے لیے ضروری ہیں۔

دوسرے کاموں کے ساتھ سروس کوآپریٹیوز کا یہ بھی کام ہے کہ پیداواری پروگرام میں کسانوں کے ساتھ پورا تعاون کرتے ہوئے انہیں قرض فراہم کریں، مصنوعی کھاد، بیج، ہل اور کیڑے مارنے والی دواؤں کا انتظام کریں، ممبروں کی فاضل پیداوار اکٹھا کر کے قریب ترین مارکٹنگ سوسائٹی کے ذریعے اس کی فروخت کا انتظام کریں اور ممبروں کے طلب کرنے پر انہیں صرفی اشیا فراہم کریں۔ سروس کوآپریٹیوز یہ بھی کر سکتی ہیں کہ کسی ترقی پسند کسان کو منتخب کر لیں اور سرکاری فارموں سے حاصل کیے ہوئے اچھے بیجوں کو پیدا کرنے میں اس کی مدد کریں۔ یہ سوسائٹیاں کھاد تیار کرنے کے کاموں کی تنظیم بھی کر سکتی ہیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ یہ سوسائٹیاں دوسری مخصوص خدمات انجام دیں، یہ ضروری ہے کہ یہ اپنا کم سے کم بنیادی مقصد پورا کریں یعنی ہدایتی اور توسیعی خدمات کی انجام دہی۔

سروس کوآپریٹیوز کو مرکزی کوآپریٹیو بینک، قریب ترین مارکٹنگ سوسائٹی اور نگراں یونین سے ملحق ہونا چاہیے۔ شیئر کے سرمائے کو سال بہ سال بڑھتے رہنا چاہیے۔ اس کے لیے شیئر کیپٹل کی جزوی ادائیگی اور شیئر کیپٹل کی مد میں نئی رقموں کی وصول یابی کی ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ ممبروں کو اس بات کی ترغیب دینی چاہیے کہ ہر سال فصل کٹنے کے بعد وہ ایک یا دو شیئر خریدیں۔ اگرچہ سروس کوآپریٹیو کے تمام اعلیٰ اختیارات سوسائٹی کی جنرل باڈی کے ممبروں کو بہ حیثیت مجموعی حاصل ہونے چاہئیں لیکن انتظامی اختیارات جنرل باڈی کے منتخب کردہ چار پانچ ممبروں پر مشتمل مجلس منتظمہ کے سپرد ہونے چاہئیں۔

مجلس منتظمہ کے ہر رکن کو سوسائٹی کے کم از کم کسی ایک مخصوص کام کی نگرانی کا ذمہ دار ہونا چاہیے۔ اب تک ہمارے ملک میں کوآپریٹو تحریک کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مالیاتی اور انتظامی مسائل رہے ہیں اس لیے یہ اشد ضروری ہے کہ دیہی پس منظر میں ان مسائل سے بڑی احتیاط کے ساتھ نپٹنا چاہیے۔

نیشنل ڈیولپمنٹ کونسل نے نومبر ۱۹۵۸ء میں ریزولیوشن پاس کر کے سرکاری کوآپریٹوز قائم کرنے کی پُرزور تائید کی جس نے آگے چل کر کانگریس کے زمینی اصلاحات سے متعلق ناگ پور ریزولیوشن کے ایک ستون کی صورت اختیار کر لی۔ نیشنل ڈیولپمنٹ کونسل نے تجویز کیا کہ ہر گاؤں کی اپنی سروس کوآپریٹو ہونی چاہیے۔ اگر گاؤں بہت چھوٹے ہوں تو ایک سے زیادہ گاؤں کو مل کر ایک مشترک سروس کوآپریٹو بنا لینی چاہیے لیکن ان کی مجموعی آمدنی ایک ہزار سے زیادہ نہ ہو۔

دوسرے منصوبے کے آخری سال کے ختم تک ۳۲۸۹۵ سروس کوآپیٹوز قائم کی جا چکی تھیں۔ یہ سوسائٹیاں اس پروگرام کے تحت قائم کی گئی تھیں جن کا مقصد نئی سوسائٹیاں قائم کرنا اور گاؤں کی موجودہ سوسائٹیوں کی دوبارہ تنظیم کرنا تھا۔ تیسرے پلان کا نشانہ یہ تھا کہ ملک بھر میں ۳۰۰۰۰ نئی سروس کوآپریٹوز قائم کی جائیں۔ یہ اُن ۷۵۰۰۰ موجودہ سوسائٹیوں کے علاوہ تھیں جن کی دوبارہ تنظیم کرنی تھی اور سروس کوآپریٹوز کی حیثیت سے اِن میں نئی جان ڈالنی تھی۔ توقع تھی کہ اِن نئی اور موجودہ سوسائٹیوں کے دائرۂ عمل میں ملک کے تقریباً سارے گاؤں آجائیں گے اور اِس طرح ملک کی آبادی کا ۲/۳ حصّہ ان کے تحت آجائے گا۔

سروس کوآپریٹوز کا پروگرام بنیادی طور سے ڈاکٹر آٹو شلر (DR. OTTO SCHILLER) کے خیالات پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر شلر ہی پہلے آدمی تھے جنھوں نے اِس بات پر زور دیا کہ منصوبہ بندی، سرمایہ کاری، رسد اور فروخت کوآپریٹو طریقے سے ہونا چاہیے۔ لیکن ڈاکٹر شلر واضح طور سے منفرد کھیتی کے حق میں تھے اِس لیے وہ اِس بات کو نہ تصور کر سکے کہ سروس کوآپریٹوز کو مشترک کوآپریٹو فارمنگ کی منزل تک پہنچنے کا وسیلہ بنایا جا سکتا ہے۔ مشترک کوآپریٹو فارم سے منسلک ہوئے بغیر بھی سروس کوآپریٹو کا نظریہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دیہی آبادی کے سلسلے میں سروس کوآپریٹوز سے بڑی توقعات وابستہ ہیں لیکن اِس مقصد کے لیے جو پروگرام بنایا جائے اُس کو اِس بات پر مبنی ہونا چاہیے کہ ملک کی انتظامی اور مالیاتی تنظیم کی زیرِ عمل قوتوں کو نیا رُخ دینا ہے۔ اِس کا یقیناً یہ مطلب ہے کہ اِس کے لیے دیہی ضمیر، دیہی عزائم اور دیہی سمت کا اتصال ضروری ہے۔

باب ۱۷

دیہی مزدور اور کاشت میں مشینوں کا استعمال

ہندوستان کے دیہی مسائل پر کوئی بحث اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک ہندوستان کے دیہی مزدور کا مخصوص مطالعہ نہ کیا جائے۔ منصوبہ بندی سے پہلے کے دور میں اگرچہ صنعتی مزدوروں کے مفاد کے تقاضے، اقدام کیے گئے لیکن زراعتی مزدوروں کی طرف اور ان کی معاشی حالت سدھارنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ چنانچہ ہندوستانی زراعتی مزدوروں کی روزمرہ کی زندگی سے بیک وقت روزگار کی کمی، ترقی کی کمی اور آبادی کی زیادتی ظاہر ہوتی ہے۔ اِن کی اُجرت غیر معمولی حد تک کم ہے۔ جن حالات میں انھیں کام کرنا پڑتا ہے وہ اُن کے لیے بہت بڑا بوجھ ہیں اور روزگار جو انھیں ملتا ہے اُس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

۵۱-۱۹۵۰ء کے پہلے اور ۵۶-۱۹۵۵ء کے دوسرے ایگری کلچرل لیبر انکوائری کی تحقیق کا تجزیہ:

آزادی کے بعد سے حکومت نے زراعتی مزدوروں کے مسائل کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ ہندوستان کے منصوبائی تجربوں کے پہلے دس برسوں میں زراعتی مزدوروں سے متعلق دو تحقیقات کی گئیں۔ ۵۱-۱۹۵۰ء اور ۵۶-۱۹۵۵ء دونوں تحقیقات روزگار اور محنت کی وزارت نے کیں۔ ان تحقیقات میں سنٹرل اسٹیٹسٹیکل آرگنائزیشن، نیشنل سامپل سروے اور انڈین اسٹیٹسٹیکل آرگنائزیشن نے بھی شرکت کی۔ ذیل میں ان دونوں تحقیقات کے نتائج کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

(۱) دوسری انکوائری کے مطابق ۵۶-۱۹۵۵ء میں مزدور کنبوں کی مجموعی تعداد ۱٫۶۳ کروڑ تھی۔ جبکہ ۵۱-۱۹۵۰ء کی انکوائری کے مطابق یہ تعداد ۱٫۷۹ کروڑ تھی۔ تعداد کی یہ کمی غالباً کنبے کی تعریف میں فرق کی وجہ سے ہے۔ ان ۱٫۶۳ کنبوں میں سے ۵۷٪ بالکل بے زمین تھے۔ ۸۳٪ ایسے کنبے تھے جن کے پاس مستقل روزگار نہیں تھا بلکہ وقتاً فوقتاً کام ملتا رہتا تھا۔ ۱۷٪ ایسے کنبے تھے جو

ایک معینہ مدت کے لیے ٹھیکے پر کام کرتے تھے۔ دوسری لیبر انکوائری نے اُن کنبوں کو دیہی مزدور کنبے قرار دیا جن کی آمدنی کا بڑا حصہ زراعتی کاموں کی اُجرت سے حاصل ہوتا تھا۔

(۲) ۱۹۵۰-۵۱ء اور ۱۹۵۶-۵۷ء کے دوران منسلک مزدوروں (ATTACHED LABOURERS) کا تناسب ۱٪ سے بڑھ کر ۲۶.۶۶٪ ہو گیا۔ اور باتوں کے علاوہ اس اضافے کی ایک وجہ یہ تھی کہ زمین دا[illegible]ں، جاگیرداروں نے ذاتی زمینوں پر خود کاشت کرنی شروع کی۔ ان میں سے بہتوں نے لگان داری کے قوانین کے مطابق ایسے مزدوروں کی مدد سے کھیتی شروع کی جنھیں اُجرت پر مستقل رکھ لیا گیا تھا۔

(۳) ۱۹۵۶-۵۷ء میں زراعتی مزدوروں کی تعداد کا تخمینہ ۳۳۰ لاکھ تھا جس میں سے ۱۸۰ لاکھ مرد تھے، ۱۲۰ لاکھ عورتیں تھیں اور ۳۰ لاکھ بچے تھے۔ ۱۹۵۰-۵۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق مردوں، عورتوں اور بچوں کی تعداد ۳۵۰ لاکھ، ۱۹۰ لاکھ اور ۲۰ لاکھ تھی۔ ایسے بالغ مرد جن کے پاس مستقل کام نہیں تھا اُنھیں ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۲۰۰ دن اور ۱۹۵۶-۵۷ء میں ۱۹۷ دن کام ملا۔ انھوں نے ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۷۵ دن اور ۱۹۵۶-۵۷ء میں ۴۰ دن اپنا ذاتی کام کیا۔ اِس قبیل کی بالغ مزدور عورتوں کو ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۱۳۴ دن اور ۱۹۵۶-۵۷ء میں ۱۴۱ دن کام ملا۔ جہاں تک بچوں کا تعلق ہے اُن کے کام کے دن ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۱۶۵ تھے جو ۱۹۵۶-۵۷ء میں بڑھ کر ۲۰۴ ہو گئے۔ غیر مستقل مزدور ۱۹۵۶-۵۷ء میں ۱۲۸ روز بے روزگار رہے جب کہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۹۰ دن بے روزگار رہے تھے۔ اِس موقع پر یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ زراعت میں اُجرتی مزدوروں کی گنجائش بہت محدود ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ زمین پر آبادکاری کا دباؤ برابر بڑھ رہا ہے۔ کھیت روز بہ روز چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہوتے جا رہے ہیں، لوگ زیادہ تر اپنے کنبے کے لوگوں سے کام لیتے ہیں اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کے کھیت پر کام کر دیتے ہیں۔

(۴) بالغ مزدوروں کی روزانہ اُجرت کی اوسط شرح ایک روپیہ ۹ پیسے سے گھٹ کر ۱۹۵۶ء میں ۹۶ پیسے ہو گئی۔ جو اُجرت اناج کی شکل میں ادا کی گئی اُس کی قیمت کا تخمینہ ۱۹۵۶ء کی تھوک قیمتوں کے مطابق کیا گیا جب کہ ۱۹۵۰ء میں یہ تخمینہ اُس وقت کی ہٹیکل قیمتوں کے مطابق کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں اُجرت کا ۳۱٪ حصہ اور ۱۹۵۶ء میں ۴۰٪ حصہ اناج کی شکل میں ادا کیا گیا۔ اُجرت کی مجموعی رقم کا تخمینہ ۱۹۵۶ء میں ۵۲۰ کروڑ ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۵۰۰ کروڑ روپے کیا گیا ہے۔ ۱۹۵۰-۵۱ء اور ۱۹۵۶-۵۷ء کے زراعتی اُجرت کے ڈھانچے کے تقابلی جائزے سے موٹے طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زراعتی مزدوروں کی اُجرت عام

طور سے گھٹی ہے۔ اُجرت کو بالکل اناج کی شکل میں یا کچھ اناج اور کچھ نقد کی شکل میں ادا کرنے کا رجحان بڑھا ہے۔ زراعتی مزدور خاندان کے روزگار کا اُجرت پر انحصار دن بدن بڑھا ہے۔ مرد و عورتوں کی اُجرت کا فرق زیادہ ہوا ہے۔ ہل جوتنے، فصل کاٹنے اور پودوں کو ایک جگہ سے نکال کر دوسری جگہ لگانے کی اُجرت عام طور سے غیر زراعتی اُجرت سے زیادہ تھی لیکن ۵۷-۱۹۵۶ء میں صورت بالکل اس کی اُلٹی تھی۔ دیکھا یہ گیا کہ ۵۱-۱۹۵۰ء کے مقابلے میں یافتہ روزگار اور اُجرت دونوں گھٹے تھے یا اگر روزگار بڑھا تھا تو اُجرت گھٹی تھی۔ درحقیقت دوسری لیبر انکوائری اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ ۵۱-۱۹۵۰ء اور ۵۷-۱۹۵۶ء کے دوران زراعتی مزدور خاندانوں کی مجموعی آمدنی ۱۱% گھٹی تھی۔

(۵) ۵۱-۱۹۵۰ء اور ۵۷-۱۹۵۶ء میں زراعتی مزدور کنبے کی اوسط سالانہ آمدنی ۴۴۷ روپے اور ۴۳۷ روپے تھی۔ ۵۷-۱۹۵۶ء گھٹ کر ۹۹٫۴۴ روپے ہوگئی۔ اس مدت میں کنبوں کے افراد کی اوسط تعداد ۴۳۴ سے بڑھ کر ۴۴۴ ہو گئی۔

۵۷-۱۹۵۶ء میں فی کس قومی آمدنی ۲۹۷٫۵ روپے تھی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ زراعتی مزدور کنبوں کی فی کس آمدنی قومی آمدنی کی صرف ۳۴% تھی۔ ۵۷-۱۹۵۶ء میں فی کنبہ آمدنی ۴۳۷ روپے تھی جبکہ صرف کی اوسط ۶۱۷ روپے تھی۔ اس طرح آمدنی سے ۱۸۰ روپے زیادہ صرف تھا جو غالباً پچھلی بچت، ذخیرے کی فروخت، قرض اور دوسری بیرونی سے پورا کیا گیا ہوگا۔

(۶) دوسری انکوائری کی رپورٹ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ زراعتی مزدور خصوصاً وہ جو بے زمین ہیں، پس ماندہ ذاتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ دیہی سماج میں اُن کی سماجی معاشی حیثیت کا بیشتر انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اُن کا تعلق کس ذات سے ہے، اُس علاقے میں ادارہ جاتی بندشیں کتنی کڑی ہیں مثلاً لگان داری کے قوانین، اِن کے آبائی پیشے کیا ہیں، صاحبِ زمین طبقے کی معاشی حیثیت کیا ہے، اُس علاقے میں اُگائی جانے والی فصلیں کون سی ہیں، اور دیہی صنعتوں میں زائد روزگار ملنے کے کیا مواقع ہیں۔ پس ماندہ ہونے کی وجہ سے انھیں سماجی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور دوسرے لوگ اُن کی پس ماندہ حیثیت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اُن کی زندگی کا معیار بہت پست ہوتا ہے اور اُن کی آمدنی بہت کم اور غیر یقینی ہوتی ہے کیوں کہ اِس آمدنی کا انحصار اُن چھوٹے اور بنیادی کاشت کاروں پر ہوتا ہے جن کی خود آمدنی بس گزربسر بھر کی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ آمدنی زندگی بسر کرنے کے لیے ناکافی ہوتی ہے۔ زراعتی مزدوروں کی حالت بہتر بنانے کے لیے جو اقدام کیے گئے ہیں رپورٹ میں ان کا بھی ذکر ہے۔ یہ اقدام درج ذیل ہیں: زمینی اصلاحات، قرض دینے اور قرض کا بوجھ کم کرنے سے متعلق

قوانین، بیگار کو روکنے کے اقدام، زراعت میں کم سے کم اُجرت کا تعین، تعلیم، صحت اور مکان جیسے فلاحی اقدام، بے زمین مزدوروں کو بسانے کے لیے زمینوں کی بازیافت اور بھو دان اور گرام دان، کواپریٹیو فارمنگ اور دیہی صنعتوں کی ترقی۔

دونوں اگریکلچرل انکوائریوں کا مختصر جائزہ

یوں تو یہ دونوں تحقیقات قابلِ تعریف ہیں کیوں کہ یہ ہمیں اہم اعداد و شمار فراہم کرتی ہیں جن کی بنیاد پر زراعتی مزدوروں کی دوبارہ تنظیم اور اُن کی بہتری کی آئندہ پالسی بنائی جا سکتی ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ دونوں تحقیقات کچھ عجلت میں کی گئیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک سال کے اندر ملک کے لاکھوں گاؤں کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کی جا سکے۔ اور فرض کیجیے کہ یہ معجزہ دو دورجوں کی رینڈم سامپلنگ کے شماریاتی طریقے سے ممکن بھی ہو جائے تو یہ بہتر ہے کہ سامپل کے ممکن ذریعے اور اُس کے طریقے میں نان سامپلنگ غلطیوں کا جو امکان ہے اُس کا اعتراف کیا جائے۔ بہتر ہوتا اگر اِن رپورٹوں نے ملک کے سامنے عام رجحانات کا ایک سرسری خاکہ پیش کیا ہوتا۔ اِس کے بجائے رپورٹوں میں وسیع نتائج اخذ کیے گئے ہیں جن کی بنیاد وہ اعداد و شمار ہیں جن پر قطعی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ یہ اعداد و شمار بہت عجلت میں حاصل کیے گئے ہیں۔

پہلی انکوائری کی غلطیوں کو تو خیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ پہلی کوشش تھی لیکن دوسری انکوائری میں انھیں غلطیوں کو دُہرانے کا کیا جواز ہے اور پھر یہ کہنا کہ کچھ شرائط کے ساتھ دونوں انکوائریوں کے اعداد و شمار کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور بھی غلط ہے۔ دونوں کے نتائج کے تقابل کا جواز اِس لیے نہیں ہے کہ دونوں کے تصوّرات اور اُن میں کی گئی تعریفیں مختلف ہیں۔ اِس کے علاوہ اِس مدت میں تھوک اور ریٹیل قیمتوں میں جو تبدیلیاں واقع ہوئیں اُنھیں نظر انداز کیا گیا ہے۔ دوسری رپورٹ کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کسی ملک میں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ دو زمانوں میں ہونے والی جنس کی شکل میں آمدنی کی قیمت کے تخمینے کے لیے دو مختلف قسم کی قیمتوں کو استعمال کیا جائے اور پھر ان کے ذریعے دونوں زمانوں میں مزدوروں کی حالت کا موازنہ کیا جائے۔

دوسری انکوائری کے اہم نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ زراعتی مزدور کُنبے کی مجموعی آمدنی ۵۱-۱۹۵۰ء اور ۵۷-۱۹۵۶ء کے دوران ۱۱٪ گھٹی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آمدنی گھٹنے کا سبب یہ ہے کہ اُجرتی مزدوروں کی جگہ خود کسان اور اُس کے خاندان نے لے لی۔

کھیتوں کا اوسط رقبہ چھوٹا ہو جانے کی وجہ سے (۵۱-۱۹۵۰ء کے ۷ء ۵ ایکڑ کے مقابلے میں ۵۶-۱۹۵۵ء میں یہ رقبہ ۵ء ۵ ایکڑ ہو گیا) اب کسان اور اس کے خاندان کے لوگ خود بہ آسانی اپنے کھیتوں پر کام کر سکتے تھے اور اجرت پر مزدور رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ حال کی زمینی اصلاحات میں اراضی کا سائز مقرر کرنے کے لیے ذاتی کاشت کو معیار بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان باتوں نے مل کر اجرتی مزدوروں کی مانگ کم کر دی ہے اور اسی وجہ سے ان مزدوروں کی آمدنی گھٹی ہے۔

زراعتی مزدوروں کی بحالی کے لیے کچھ تجاویز (دوسرے اور تیسرے منصوبے کے حوالے)

۱۹۵۰ء کی اگریرین کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ زرعی اصلاحات کی اسکیم میں بھی زراعتی مزدوروں کے مسئلے کو نظر انداز کرنا ملک کے زراعتی نظام میں ایک کھلے ہوئے زخم کو یونہی چھوڑ دینے کے مترادف ہے۔ آزادی کے بعد سے سرکاری اور غیر سرکاری ایجنسیوں اور دیہی مزدوروں کی حالت سدھارنے میں دلچسپی رکھنے والے افراد نے مناسب طریقوں سے اس سلسلے میں کوشش کی ہے۔

(الف) ۱۹۴۸ء کا مینیمم ویج ایکٹ اور زراعتی مزدور:

پہلی اور دوسری لیبر انکوائری نے جو اعداد و شمار جمع کیے ہیں ان سے صوبائی حکومتیں زرعی مزدوروں کے روزگار، آمدنی اور ضروریاتِ زندگی کی قیمت سے متعلق براہ راست معلومات بہ آسانی حاصل کر سکتی ہیں۔ اس سے انھیں زراعتی مزدوروں کی کم سے کم اُجرت کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ ۱۹۴۸ء کے ایکٹ کے تحت اب تک (یعنی جولائی ۱۹۶۰ء) مدراس اور مہاراشٹر کے علاوہ سارے صوبوں اور مرکزی علاقوں میں زراعتی مزدوروں کی کم سے کم اُجرت متعین کی جا چکی ہے۔ مدراس اور مہاراشٹر کے مخصوص علاقوں میں بھی یہ تعین عمل میں آچکا ہے۔

(ب) نئے ہندوستان کے دستور میں ہر قسم کے جبر اور غلامی کو جرم قرار دیا گیا ہے۔ ہماری قومی حکومت نے ہر پیشے میں جبر اور غلامی کو ختم کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے اور پس ماندہ طبقوں کی ترقی کے لیے موثر اقدام کر رہی ہے۔ قابل کاشت بے کار زمینوں کی بازیافت کی جا رہی ہے۔ آب پاشی کی سہولتیں بڑھائی جا رہی ہیں۔ اراضی کی ملکیت کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کی جا رہی ہے۔ لگان داری کا نظام دوبارہ مرتب کیا جا رہا ہے، دیہی گھریلو صنعتیں قائم کی جا رہی ہیں اور دیہی تعمیر کے سادہ قسم کے کام شروع کیے جا رہے ہیں تاکہ زراعتی مزدوروں کو پورے وقت کام مل سکے اور ان کی حالت سدھر سکے۔ اُمید ہے کہ نئے دستور اور زراعتی تنظیم کے نئے نقشے کی وجہ سے مزدوروں کی نیم غلامی رفتہ رفتہ ختم

ہو جائے گی اور اُن کی ناگفتہ بہ حالت نمایاں طور سے سُدھر جائے گی۔

(ج) دوسرا اور تیسرا منصوبہ اور زرعی مزدور

دوسرے منصوبے میں زراعتی مزدوروں کی طرف خاص توجہ دی گئی جس کی وجہ یہ تھی کہ پلاننگ کمیشن کا یہ خیال تھا کہ جب تک زراعتی مزدوروں کو بحال نہیں کیا جاتا اور انھیں مناسب پیشوں میں نہیں لگایا جاتا اُس وقت تک ترقیاتی منصوبہ بندی کے ذریعے معاشی ترقی کی رفتار تیز کرنے کا پروگرام کامیاب نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ دوسرے پلان میں ان کی تکلیفیں دور کرنے کے چار طریقے تجویز کیے گئے۔ پہلی تجویز یہ تھی کہ زراعتی پیداوار اور اچھے مویشیوں کی تعداد بڑھانے کے اقدام کیے جائیں۔ دوسرے یہ کہ دیہی صنعتوں کو بڑھایا جائے اور پیداوار کی صفائی وغیرہ کا کام پھیلایا جائے تاکہ خود دیہی معیشت میں زیادہ روزگار کی گنجائش ہو سکے۔ تیسرے یہ کہ زمینوں کی دوبارہ تقسیم اور سہولتوں کی توسیع کے ذریعے پس ماندہ عوام کی سماجی حیثیت، اُن کی کارکردگی اور پہل کرنے کی صلاحیت کو بہتر بنایا جائے۔ چوتھے یہ کہ دیہی معیشت کے قیمتی کاموں پر خرچ ہونے والی رقم کا کافی حصّہ زراعتی مزدوروں کی حالت سدھارنے پر صَرف کیا جائے۔

تیسرے پلان میں دیہی معیشت کی ترقی کے لیے زیادہ سرمایہ لگانے کا انتظام کیا گیا۔ سرکاری حلقے میں زراعت، کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور آب پاشی پر ۰۰ ۱۷ کروڑ روپے خرچ کیے جانے کی توقع تھی اور اُمید تھی کہ زراعتی پیداوار تقریباً ۳۰٪ بڑھ جائے گی۔ دو کروڑ ایکڑ کی آب پاشی ہونے لگے گی اور ایک کروڑ دس لاکھ ایکڑ زمینی تحفظ کے تحت آجائیں گی۔ ۲۶۴ کروڑ دیہی اور چھوٹی صنعتوں کے پروگرام کے لیے رکھے گئے۔ چھوٹی صنعتیں اور انڈسٹریل اسٹیٹ دیہی علاقوں کے لیے تھیں۔ اُمید تھی کہ تیسرے پلان کے دوران اِن پروگراموں کی تکمیل سے زراعتی مزدوروں کی حالت بہتر ہوگی۔ تیسرے پلان میں باقی منصوبوں میں بے زمین مزدوروں کو بسانے کے لیے ۸ کروڑ روپے فراہم کیے گئے۔ اِس کے علاوہ مرکز کے انھیں اسکیموں کے لیے ۸ کروڑ روپے رکھے گئے۔ زراعتی محنت سے متعلق سنٹرل ایڈوائزری کمیٹی کا خیال ہے کہ چوتھے پلان میں ۸ لاکھ خاندانوں کو ۲۰ لاکھ ایکڑ زمین پر بسانے کی کوشش کرنا چاہیے۔

(د) بھودان تحریک اور بے زمین مزدوروں کے لیے بھومی دان

بھودان تحریک جسے آچاریہ ونوبا بھاوے نے ۱۹۵۱ء میں بہت چھوٹے پیمانے پر شروع کیا تھا۔ کافی بڑھ چکی ہے اور تقریباً ۱۲ لاکھ ایکڑ زمین مختلف صوبوں میں لوگوں میں تقسیم کی جا چکی ہے۔ اِس تحریک کا نعرہ یہ ہے کہ زمین کسی فرد کی نہیں پورے سماج کی ہے۔ پہلا قدم یہ ہے کہ زمین داروں کو اس بات پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی زمین کا چھٹا حصّہ سماج کو دان کر دیں۔ مارچ ۱۹۶۶ء تک ۴۲ لاکھ ایکڑ دان

کیے جا چکے تھے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ایک غیر سرکاری تحریک ہے جس کو سرکار کی بالواسطہ حمایت حاصل ہے۔ بھودان تحریک زراعت کو دوبارہ تنظیم دینے کا گاندھی جی کا طریقہ ہے۔ لوگوں کے سماجی ضمیر اور انصاف کے جذبے کو جگا کر اس تحریک نے زمین داروں سے زمینیں حاصل کی ہیں جنھیں بے زمین مزدوروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ زمینوں کی تقسیم خاندانوں کی ضرورت کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں آچاریہ ونوبا بھاوے نے ۵ کروڑ ایکڑ زمین اکٹھا کرنے کے ارادے سے اپنی پیدل یاترا شروع کی۔ اپنے مشن میں انھیں خاصی کامیابی ہوئی ہے۔ ۱۹۵۲ء سے بھومی دان کے بجائے گرام دان پر زور دیا گیا ہے جس کے تحت پورے گاؤں دان کیے جاتے ہیں۔ اس کے پیچھے بھی خیال وہی ہے۔ یعنی ساری زمین پورے گاؤں کی سماجی ملکیت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کوآپریٹیو ریع تحریک کے لیے ان گرام دان گاؤں کی خاصی اہمیت ہے۔

اس تحریک پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں ہر اس شخص کو زمین فراہم کرنے پر اصرار ہے جو زمین کا طالب ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زمین چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ جائے گی جس کی وجہ سے پیداوار گھٹے گی۔ دیہی علاقوں سے شہری علاقوں میں آنے والے قابل فروخت فاضل اناج کی مقدار گھٹے گی۔ اس کے علاوہ تحریک کے سربراہ رضاکار دان کی فضا پیدا کرنے میں اس قدر مصروف ہیں کہ وہ زمین پانے والوں کی بحالی کے کام کی طرف توجہ نہیں دے سکتے جس کے لیے ضرورت ہے کہ لوگوں کے لیے قرض، کھیتی کے جانور اور دوسرے آلات فراہم کرنے کا انتظام کیا جائے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ زیادہ زمین پانے والے پہلے بے زمین تھے اس لیے کھیتی کے آلات وغیرہ ان کے پاس نہیں ہیں۔

بھودان تحریک اپنی اخلاقی خوبیوں اور ونوبا جی کی شخصیت کی وجہ سے اپنی ابتدائی کامیابی کے باوجود بہار سے نظامِ آراضی کی تمام خرابیاں دور نہیں کر سکتی۔ ابتدائی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں زمینداروں کے سر پر خاتمۂ زمینداری کی تلوار لٹک رہی تھی اس لیے انھیں زمین دان کرنے پر بہ آسانی رضامند کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ تحریک کو پھیلنے میں دیر لگی کیوں کہ پیدل یاترا میں بہت وقت لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں جس متحرک ترقیاتی منصوبہ بندی کا آغاز ہوا ہے اس کے ساتھ بھودان تحریک میل نہیں کھاتی لیکن اس کو بالکل نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تحریک بذاتِ خود زمینی اصلاحات کے پیچیدہ مسائل نہیں حل کر سکتی لیکن اس سے حکومت کی نئی زمینی پالیسی کو مدد ضرور ملے گی۔ بھودان تحریک کو جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ کے لیے زمین ہموار کرنے کے واسطے استعمال کرنا چاہیے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ گاندھی جی کے بھودان کے نظریے کو کس طرح کاشت کی اُن ضروری تکنیکی تبدیلیوں سے ہم آہنگ کیا جائے جو زراعتی پیداوار بڑھانے کے لیے ضروری ہیں۔

ہندوستانی زراعت میں ٹکنیکی تبدیلیاں۔کھیتی میں مشینوں کا استعمال

ہندوستان کی آبادی برابر بڑھ رہی ہے اور قابلِ کاشت زمین کا رقبہ محدود ہے۔ اِس لیے ضروری ہے کہ ہندوستانی زراعت کی پیداوار کافی بڑھائی جائے۔ پیداآوری بڑھانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ٹکنیکی تبدیلیاں رائج کی جائیں جن سے قابلِ کاشت بے کار زمینوں کی بازیافت کے علاوہ آب پاشی کی سہولتیں بڑھائی جاسکیں اور بہتر کھاد، بیج اور آلات کا استعمال ہوسکے۔ زراعت میں ٹکنیکی تبدیلیاں معیشت کے دوسرے حلقوں میں عام ترقی کے ساتھ بہ یک وقت رائج ہونی چاہئیں تاکہ روزگار کے مواقع نہ صرف بے روزگار اور کم روزگار لوگوں کے لیے فراہم ہوں بلکہ اُن لوگوں کے لیے بھی جو کھیتی میں مشینوں کے استعمال کی وجہ سے بے کار ہوں گے۔

ہندوستانی زراعت میں مشینوں کے استعمال کی گنجائش

ہندوستان میں زرِمبادلہ کی دقتوں کے پیشِ نظر زراعت میں مشینوں کا استعمال بہت بڑے پیمانے پر مشکل ہے۔ اِس کے علاوہ مشینوں کی وجہ سے بے کاری بڑھے گی۔ تاوقتیکہ زیرِکاشت علاقے میں نمایاں اضافہ ہو اور صنعتی حلقے کی تیزی سے ترقی ہو۔ یہ دُرست ہے کہ ترقیاتی منصوبہ بندی کی وجہ سے آگے چل کر معیشت کا غیرزراعتی حلقہ بڑھے گا اور اس طرح بے روزگار اور کم روزگار لوگوں کے لیے روزگار کے مواقع فراہم ہوں گے۔ لیکن کم مدّت میں اتنی بڑی تعداد کو روزگار دینا بہت مشکل ہوگا۔ زراعتی حلقے میں ۵۰٪ مزدور اتفاقی مزدوروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بے روزگاری خطرناک صورت اختیار کرچکی ہے ایسی حالت میں اگر مشینوں کے استعمال سے اور لوگ بے کار ہوئے تو انھیں روزگار سے لگانے کی سرکار کی تمام مخلصانہ کوششوں کے باوجود ان سب کو کھپانا تقریباً ناممکن ہوجائے گا۔ غرض کہ اگر ہندوستان میں مغربی طرز کی مشینی کھیتی شروع کی گئی تو اس کا پورا امکان ہے کہ ملک میں کم ازکم ابتدائی مراحل میں بے روزگاری اور کم روزگاری بڑھے گی۔

یہ بھی یاد رہے کہ کھیتی کی بڑی اور پیچیدہ مشینیں ابھی دیسی صنعتوں کے بس کی نہیں ہیں۔ انھیں باہر سے منگانا ہوگا، جو زرِمبادلہ کی مشکلات کے پیشِ نظر مشکل ہے۔ ملک میں آگے چل کر مشینیں اور اُن کے سانچے بنانے کی صنعت ترقی کرجائے گی اُس وقت ہندوستانی کھیتی میں مشینوں کا استعمال ممکن ہوگا۔

ہندوستان کے ساتھ دوسری دقت یہ ہے کہ کھیت بہت چھوٹے ہیں جب کہ ٹریکٹر اور دوسری بڑی مشینوں کے لیے رقبہ بڑا ہونا ضروری ہے۔ آگے چل کر جوائنٹ کوآپریٹیو فارمنگ شروع ہونے سے شاید یہ مسئلہ حل ہو اور کھیتی میں مشینوں کا استعمال ممکن ہو۔ اُس وقت بھی مشینوں کی خریداری کے لیے جتنی رقم کی ضرورت ہوگی وہ چھوٹے فارموں کے بس سے باہر ہے تا وقتیکہ حکومت یا اُس کی کسی ایجنسی سے مالی امداد نہ حاصل ہو۔ مشینی کاشت کے راستے میں دوسری دقت، کسانوں کی جہالت اور غریبی ہے۔ ہندوستانی کسانوں میں سے بیشتر نہ پیچیدہ مشینوں کو سمجھتے ہیں اور خریدنے کے لیے ان کے پاس پیسے ہیں۔

چنانچہ فی الحال ہندوستانی کاشت میں بھاری مشینوں کا استعمال شروع کرنا مناسب نہ ہوگا بلکہ ٹکنیکی تبدیلیاں چھوٹی اور سادہ مشینوں، آبپاشی کی سہولتوں، بےکار زمینوں کی بازیابی، اچھے بیج اور کھاد کی مختلف قسموں کے استعمال اور کھیتی کے نئے طریقوں کے استعمال تک محدود رکھنا چاہیے۔ گہری کاشت کے ان طریقوں میں سے ایک، چاول کی کاشت کا جاپانی طریقہ ہے۔ یہ طریقہ پودوں کو ایک جگہ سے نکال کر دوسری جگہ جمانے اور ان کے لیے مناسب زمینیں تیار کرنے کا مسئلہ بڑی اچھی طرح حل کرتا ہے۔ اس میں اچھے قسم کی کھاد اور بیج کے استعمال پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ جاپانی طریقے میں مزدوروں کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے یہ ہندوستان کے لیے بہت موزوں ہے جہاں چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں کسان چاول کی کاشت کرتے ہیں۔ پہلے اور دوسرے منصوبوں کے دوران جاپانی طریقے کے بہت اچھے نتیجے نکلے۔ چنانچہ تیسرے پلان میں اس کو جاری رکھا گیا اور مزید علاقوں میں شروع کیا گیا۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ زراعتی پیداوار بڑھانے کی موجودہ حکمتِ عملی کا دارومدار زیادہ فصل اُگانے والے پروگرام پر ہے۔ جس کے مطابق ۵ء۳۴ کروڑ ایکڑ زمین گہری کاشت اور زیادہ فصل دینے والے بیجوں کے تحت لانا ہے۔ امید ہے کہ ۱۹۷۱ء تک ۳۴ کروڑ ایکڑ اُس کے تحت آجائیں گے۔ اس پروگرام کے لیے مرتکز کھاد (CONCENTRATED) اور نائٹروجن والے فرٹی لائزر کا زیادہ استعمال کیا جائے گا۔

پانچ سالہ منصوبوں میں مجوّزہ ٹکنیکی تبدیلیاں

پانچ سالہ منصوبوں کے تحت جو ترقیاتی منصوبہ بندی شروع کی گئی ہے اُس سے زراعت کے طریقوں میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں لانے کی توقع ہے: (۱) کیمیاوی اور بہتر قسم کی کھاد کا زیادہ سے زیادہ استعمال

(۲) آب پاشی کی سہولتوں کی کافی توسیع (۳) بہتر بیجوں کی زیادہ فراہمی (۴) دیہی علاقوں میں ماہروں اور جانکار لوگوں کا اضافہ جو اُن سروس یونٹوں سے متعلق ہوں گے جو ملک بھر میں قائم کی جائیں گی۔ (۵) اِن یونٹوں کے ذریعے ہلکے ٹریکٹر اور دوسری کارآمد مشینوں کی فراہمی۔ یہ سروس یونٹ ٹھیکے پر کام انجام دیں گے۔

ایسا لگتا ہے کہ پلاننگ کمیشن کی عام پالیسی جو منصوبوں کے زراعتی پروگرام میں تجویز ہے، یہ ہے کہ بھاری ٹریکٹر اور دوسری بڑی مشینوں کا استعمال فی الحال ملتوی رکھا جائے اور یہ کوشش نہ کی جائے کہ آنکھ جھپکتے ہندوستانی زراعت کی شکل بدل دی جائے۔ ابھی فی الحال کمیشن کی یہ تجویز ہے کہ ہندوستان کی زراعتی پیداوار میں اضافہ اُن موثر طریقوں سے کیا جائے جو بظاہر بہت نفع بخش نہیں ہیں مثلاً چھوٹی مشینوں کا استعمال، چھوٹی موٹی ٹکنیکی جدتیں اور اختراع، آب پاشی کی سہولتوں کی توسیع اور اچھے قسم کے بیج اور کھاد کی فراہمی اور جاپانی طریقے سے گہری کاشت کے طریقوں یا زیادہ فصل دینے والے بیجوں کے پروگرام کا رواج۔

مختصر یہ کہ بے زمین اور کم روزگار زراعتی مزدوروں کی بحالی کے مسائل اور زراعت میں مشینوں کے استعمال کے مسائل اُس وقت حل ہوں گے جب ہندوستانی زراعت کا بنیادی تنظیمی ڈھانچہ بدل جائے گا اور زراعتی حلقے میں تیزی سے توسیع ہونے لگے گی جس سے بے کار ہونے والے لوگوں کو کام سے لگایا جاسکے۔

ٹیبل ۴—۳

۱۹۶۱–۷۶ء کی آبادی کا تخمینہ (کروڑ)

تخمینے کا ماخذ	۱۹۶۱	۱۹۷۱	۱۹۷۶
سنسس آف انڈیا، ۱۹۵۱، پارٹ ۱-A، رپورٹ *	۴۰٫۸۴	۴۶٫۲۴	—
پلاننگ کمیشن، دوسرا پانچ سالہ منصوبہ	۴۰٫۸۱	۴۵٫۱۹	۴۹٫۲۴
پاپولیشن ریسرچ کا دفتر			
(الف) بارآوری میں ۵۰٪ تک تخفیف ۱۹۵۶–۸۱ء کے دوران	۴۲٫۰۲	۴۹٫۶۹	۵۳٫۶۱
(ب) بارآوری میں کوئی تبدیلی نہیں	۴۲٫۰۴	۵۳٫۶۴	۶۰٫۸۱
سنٹرل اسٹیٹسٹیکل آرگنائزیشن کا تخمینہ (۱۹۵۹)	۴۳٫۶۱	۵۲٫۶۸	۵۷٫۶۸
سنسس آف انڈیا، ۱۹۶۱ (عارضی تخمینہ)	۴۳٫۶۸	۵۵٫۶۵	۶۲٫۶۵

* ۱۹۵۱ء کے خفیف اختلاف کے لحاظ سے اعداد و شمار میں مطابقت پیدا کی گئی - یہ بالائی حدوں کے تخمینے ہیں جو ۱۹۴۱–۵۱ء کی ترقی کی شرح پر مبنی ہیں۔

SOURCE: A. J. COALE AND E. M. HOOVER, POPULATION GROWTH AND ECONOMIC DEVELOPMENT IN LOW-INCOME COUNTRIES AND (2) THIRD FIVE YEAR PLAN REPORT (1961)

ٹیبل ۴—۴

خاص فصلوں کی پیداوار (۱۹۵۰–۵۱ء سے ۱۹۶۰–۶۱ء تک)

فصل	پیداوار	۵۰-۵۱	۵۵-۵۶	۶۰-۶۱
اناج	لاکھ ٹن	۵۲۸٫۰	۶۹۲٫۰	۸۲۰٫۰
روغنی بیج	"	۵۱٫۰	۵۶٫۰	۷۱٫۰
گنا (گڑ)	"	۵۶٫۰	۶۰٫۰	[illegible]
روئی	لاکھ گانٹھ	۲۹٫۰	۴۰٫۰۲	۵۱٫۰
جوٹ	"	۳۳٫۰	۴۲٫۰	۴۰٫۰

SOURCE: THIRD FIVE YEAR PLAN REPORT (1961)

ٹیبل ۴—۷

مجموعی آبادی میں زراعتی مزدوروں کا تناسب

سنسس کے حلقے	گنجانی	مجموعی آبادی میں دیہی آبادی کا تناسب	مجموعی دیہی آبادی میں دیہی مزدوروں کا تناسب		
			میزان	زمین والے	بے زمین
کل ہند †	۳۱۲	۸۸٫۷	۳۰٫۴	۱۵٫۲	۱۵٫۲
شمالی ہند	۵۵۷	۸۶٫۳	۱۴٫۳	۵٫۷	۸٫۶
اتر پردیش	۵۵۷	۸۶٫۳	۱۴٫۳	۵٫۷	۸٫۶
مشرقی ہند	۳۳۴	۹۰٫۰	۳۲٫۷	۱۹٫۰	۱۳٫۷
آسام	۱۰۹	۹۵٫۰	۱۰٫۷	۹٫۷	۳٫۰
بہار	۵۷۲	۹۳٫۱	۳۹٫۹	۲۵٫۶	۱۴٫۳
اڑیسہ	۲۴۴	۹۵٫۹	۴۳٫۰	۲۸٫۸	۱۴٫۲
مغربی بنگال	۸۰۶	۷۵٫۰	۲۳٫۸	۱۰٫۵	۱۳٫۳
جنوبی ہند	۴۵۰	۸۰٫۰	۵۰٫۱	۲۷٫۳	۲۲٫۸
مدراس	۴۴۹	۸۰٫۰	۵۳٫۰	۳۰٫۳	۲۳٫۰
میسور	۳۰۸	۷۶٫۰	۴۲٫۰	۲۷٫۳	۱۴٫۷
ٹراونکور کوچن	۱۰۱۵	۸۴٫۰	۳۸٫۵	۲۰٫۸	۱۸٫۷
مغربی ہند	۲۷۲	۹۵٫۰	۲۰٫۳	۸٫۸	۱۱٫۹
بمبئی	۳۲۳	۹۹٫۰	۲۰٫۳	۹٫۵	۱۰٫۸
سوراشٹر	۱۹۳	۹۹٫۳	۲۰٫۰	۲٫۲	۱۷٫۸
وسطی ہند	۱۸۱	۸۰٫۰	۳۶٫۷	۱۴٫۶	۲۲٫۱
مدھیہ پردیش	۱۹۳	۸۹٫۵	۴۰٫۱	۱۴٫۸	۲۵٫۳
مدھیہ بھارت	۱۷۱	۸۱٫۶	۱۹٫۹	۷٫۵	۱۲٫۴
حیدرآباد	۲۲۶	۸۱٫۰	۴۳٫۱	۱۹٫۵	۲۳٫۶
شمالی مغربی ہند	۱۲۲	۸۰٫۰	۹٫۲	۲٫۱	۷٫۱
راجستھان	۱۱۷	۸۳٫۰	۹٫۳	۳٫۸	۵٫۵
پنجاب	۳۳۸	۸۱٫۰	۱۰٫۱	۱٫۶	۸٫۵
پیپسو	۳۴۷	۸۱٫۰	۱۳٫۳	۰٫۶	۱۲٫۷
کشمیر	۵۲۲	۸۹٫۰	۳٫۳	۲٫۷	۰٫۷

† جموں کشمیر شامل ہے۔

SOURCE : (1) FIRST AGRICULTURAL LABOUR ENQUIRY REPORT (1950-51)
(2) SECOND AGRICULTURAL LABOUR ENQUIRY REPORT (1956–57)

ٹیبل ۴–۸
پرائمری ایگریکلچرل کریڈٹ سوسائٹیوں کی ترقی – پہلا اور دوسرا منصوبہ

زمانہ	سوسائٹیوں کی تعداد	ممبروں کی تعداد (لاکھ)	تشکیل دیئے گئے قرض (کروڑ)
پہلا پلان			
۱۹۵۰-۵۱	۱۰۴۹۹۸	۱۰۰	۲۲.۹۰
۱۹۵۵-۵۶	۱۵۹۹۳۹	۷۸	۴۹.۶۰
دوسرا پلان			
۱۹۵۶-۵۷	۱۶۱۵۱۰	۹۱	۶۷.۳۳
۱۹۵۷-۵۸	۱۶۶۵۴۳	۱۰۲	۹۶.۲۱
۱۹۵۸-۵۹	۱۸۲۹۰۵	۱۱۹	۱۲۵.۷۵
۱۹۵۹-۶۰	۲۰۳۱۷۲	۱۴۴	۱۶۹.۰۱
۱۹۶۰-۶۱	۲۱۰۰۰۰	۱۷۰	۲۰۳.۴۰

SOURCE: THIRD FIVE YEAR PLAN. (۱۹۶۱)

ٹیبل ۴–۹
کوآپریٹیو سوسائٹیوں کی تعداد، ممبروں کی تعداد اور چالو سرمایہ

	۱۹۵۰-۵۱	۱۹۶۱-۶۲	۱۹۶۵-۶۶*
سوسائٹیوں کی تعداد	۱۸۵۶۳۰	۳۳۱۸۴۱	۳۴۴۳۴۶۲
پرائمری سوسائٹیوں کے اراکین کی تعداد	۱۳۷۹۱۹۸۶	۲۶۸۳۵۹۱۹	۵۰۰۹۲۰۰۱
چالو سرمایہ (لاکھ روپے) **	۳۰۹۳۴	۱۵۳۴۷۸	۲۷۹۳۹۹
(الف) شیئر کا سرمایہ	۴۹۸۰	۲۵۹۹۹	۴۵۰۴۳
(ب) ریزرو اور دوسرے فنڈ	۴۳۵۱	۱۰۹۱۰	۱۹۰۵۷
(ج) قرض			
۱۔ مرکزی مالیاتی ایجنسیوں سے	۹۹۷۷	۴۷۹۷۰	۱۰۰۰۷۰
۲۔ سرکار سے	۱۴۱۲	۹۹۰۹	۱۴۹۹۴
۳۔ دوسرے ذرائع سے	۹۷۴	۱۰۷۳۰	۲۰۰۱۷
(د) امانتیں			
۱۔ مرکزی سوسائٹیوں کی	۴۷۹	۳۸۰۹	۹۴۳۴۴ (۱ تا ۳ کا مجموعہ)
۲۔ پرائمری سوسائٹیوں کی	۱۵۸۶	۹۷۳۷	
۳۔ افراد اور دوسرے ذرائع کی	۹۹۴۴	۲۲۳۸۷	
(ہ) مارکٹنگ سوسائٹیوں کے پاس امانتیں	–	۳۹۹	۹۹۷
(و) لینڈ مارگیج بینکوں کے ڈبنچرز	۷۹۱	۴۷۷۴	۱۷۸۳۸

* عارضی ** جنرل انشیورنس سوسائٹیوں کے اعداد و شمار شامل نہیں ہیں

SOURCE: (1) INDIAN CO-OPERATIVE UNION
(2) AGRICULTURAL CREDIT DEPARTMENT, RESERVE BANK OF INDIA.

حصّہ ۵

صنعت اور محنت

باب ۱۸

صنعتی انتظام (منیجنگ ایجنسی سسٹم کے خصوصی حوالے سے)

آزادی کے بعد سے حکومت ملک کی کم ترقی یافتہ معیشت کو ترقی دینے اور صنعت و حرفت کو بڑھانے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے۔ چونکہ مقصد صنعتی ترقی کی رفتار تیز کرنا ہے اس لیے صنعتی انتظام کا مسئلہ اور بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ پہلی اپریل ۱۹۵۶ء جب سے انڈین کمپنیز ایکٹ عمل میں آیا، منیجنگ ایجنسی سسٹم پر مختلف قسم کی پابندیاں اور قواعد عائد ہیں۔ آخر کار دسمبر ۱۹۶۷ء میں حکومت نے منیجنگ ایجنسی سسٹم کو بہت جلد بالکل ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ مئی ۱۹۶۹ء کے وسط میں لوک سبھا نے کمپنیز امنڈمنٹ بل پاس کر دیا جس کے تحت اپریل ۱۹۷۰ء سے منیجنگ ایجنسی سسٹم ختم ہونا تھا۔

منیجنگ ایجنٹ کے کام

منیجنگ ایجنسی ایک ساجھے کی فرم یا لمیٹڈ کمپنی ہوتی ہے جو مختلف النّوع اور غیر متعلق قسم کے کاروبار کرتی ہے، مثلاً کانیں، باغات، کارخانے، بینک، جہاز رانی، فروخت کی بلا شرکت ایجنسیاں اور سرمایہ کاری کے ٹرسٹ، منیجنگ ایجنٹ سرمایہ فراہم کرنے والے، انتظام کرنے والے اور کاروبار کو ترقی دینے والے کا رول ادا کرتے ہیں۔ چوں کہ ہمارے ملک میں مغربی قسم کے اشو ہاؤس نہیں تھے اس لیے یہ منیجنگ ایجنٹ نئے کاروبار کو ترقی دینے کے لیے ان کے شیئر جاری کرتے تھے اور وقتی طور سے یہ شیئر اپنے پاس رکھتے تھے تاکہ نئے کاروباری کو اپنے کو جمانے کا اور ابتدائی مشکلات پر قابو پانے کا موقع مل سکے۔

آزادی سے قبل کے دور میں انڈسٹریل فائنانس کارپوریشن تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے ہندوستان کے کمرشیل بینک امپیریل بینک کے نقش قدم پر چلتے تھے اور کسی صنعتی ادارے کو قرض

دینے کے لیے دو دستخط مانگتے تھے، ایک متعلقہ کمپنی کے دستخط اور دوسرے منیجنگ ایجنٹ کے دستخط جو مزید تحفظ کے لیے تھے۔ ایسی صورت میں منیجنگ ایجنٹ کا رول سرمایہ فراہم کرنے والے کی حیثیت سے بہت اہم ہوگیا۔ منیجنگ ایجنٹوں کے ذمّے اُن کمپنیوں کا انتظام بھی ہوتا تھا جو ان کے کنٹرول میں ہوتی تھیں۔ چوں کہ یہ زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی کوشش میں رہتے تھے اس لیے انھیں پیداوار کی قسم بہتر کرنے کی فکر نہیں رہتی تھی۔

منیجنگ ایجنسی سسٹم کی خرابیاں

اس نظام میں ہر طرف سے اتنی خرابیاں سرایت کر گئیں کہ ان کی وجہ سے پرائیوٹ سکٹر کے صنعتی نظام میں شدید مشکلات پیدا ہوگئیں۔ پہلی خرابی تو یہ ہوئی کہ انتظامی اور مالی کنٹرول کا مرکز ایک ہونے کی وجہ سے منیجنگ ایجنٹوں کے ہاتھوں میں بے پناہ قوت مجتمع ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے زیر اہتمام کمپنیوں کا انتظام نہایت جابرانہ ہوگیا اور ان کی کارکردگی گھٹ گئی۔ کمزور اور مضبوط فرموں پر منیجنگ ایجنسیوں کا اختیار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ سب کا سرمایہ ایک دوسرے سے پھنسا رہے لیکن مالی اعتبار سے مضبوط فرموں کا روپیہ کمزور فرموں کو منتقل کرنا بہت خطرناک بات تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اگر کمزور فرم بیٹھ جاتی تو مضبوط فرم کو بھی سخت دھکا پہنچتا تھا کیوں کہ ایک ہی ایجنسی کے انتظام میں ہونے کی وجہ سے ایک کا سرمایہ دوسری میں لگا رہتا تھا۔ تیسری خرابی یہ تھی کہ منیجنگ ایجنسی سسٹم ہندوستانی صنعت میں قوّتِ عمل، کارکردگی اور خوش انتظامی کی کمی کا نتیجہ بھی تھا اور سبب بھی۔ چوتھے یہ کہ منیجنگ ایجنٹ کسی صنعت کو سرمایہ فراہم کرنے کے بعد مختلف کمیشنوں کی صورت میں زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنے پر تُلے رہتے تھے اور یہ قیمت کمپنی کو بہرحال ادا کرنی ہوتی تھی چاہے اُسے منافع ہو رہا ہو یا نہ ہو رہا ہو۔

۱۹۵۶ء کے کمپنی قانون سے پہلے کی اصلاح

(الف) ۱۹۳۶ء میں کمپنیز ایکٹ میں ترمیم:

منیجنگ ایجنسی سسٹم پر مندرجہ ذیل پابندیاں عائد کرنے کے لیے ۱۹۱۳ء کے کمپنیز ایکٹ میں ترمیم کی گئی۔

(۱) کوئی بھی منیجنگ ایجنٹ اپنے عہدے پر بیس سال سے زیادہ نہیں رہے گا لیکن مخصوص حالات میں عہدے کی مدّت از سرِ نو بڑھائی جا سکتی تھی۔

(۲) زیر اہتمام کمپنی کے ایک تہائی سے زیادہ ڈائرکٹر منیجنگ ایجنٹ نامزد نہیں کر سکتا تھا۔

(۳) ایک کمپنی کا سرمایہ اُسی ایجنٹ کے زیرِ اہتمام دوسری کمپنی کی ترقی میں نہیں لگایا جا سکتا تھا۔
(۴) کمپنی کے ڈائرکٹروں کی باقاعدہ اجازت کے بعد ہی منیجنگ ایجنٹ کو زائد منافع یا کمیشن دیا جا سکتا تھا۔

۱۹۳۶ء کی یہ ترمیمیں کبھی بھی سختی سے نافذ نہیں کی گئیں کیوں کہ برطانوی حکمران منیجنگ ایجنٹوں کے مفاد کے تحفظ کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ چنانچہ آزادی کے بعد بہت سے حلقوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ اس نظام کو ختم کیا جائے لیکن ایجنٹوں کا کہنا تھا کہ اگر انھیں ختم کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی گئی تو نجی سکٹر کی پیداوار اور سرمائے کی تشکیل پر تباہ کن اثر پڑے گا۔

(ب) بھابا کمیٹی اور ۱۹۵۱ء کا ترمیمی ایکٹ

منیجنگ ایجنسی کی جامع اصلاح کی ضرورت کے پیشِ نظر حکومت نے ۱۹۵۰ء میں بھابا کمپنی لا کمیٹی مقرر کی تاکہ یہ پرانے کمپنی قانون میں ایسی مناسب تبدیلیوں کی سفارش کرے جن سے منیجنگ ایجنسی سسٹم سے منسوب خرابیاں اور بدعنوانیاں دور کی جا سکیں۔ اس کمیٹی کی رپورٹ مارچ ۱۹۵۲ء میں شائع کی گئی۔ اسی دوران ۱۹۵۱ء کا ترمیمی ایکٹ پاس ہو چکا تھا جس سے اُن سماج دشمن عناصر کی کافی روک تھام ہو گئی تھی جو منیجنگ ایجنٹوں کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور کمپنی کے شیئروں کو مختلف طریقوں سے ہتھیا لیتے تھے۔ ۱۹۵۱ء کی ترمیم کے مطابق یہ قرار پایا تھا کہ منیجنگ ایجنسیوں میں ساری تبدیلیاں مرکزی حکومت کی اجازت کے بعد ہی عمل میں لائی جا سکتی تھیں۔ اِن تبدیلیوں میں پہلا تقرر اور بعد کی توسیع بھی شامل تھی۔ مسٹر بھابا کی صدارت میں ۱۹۵۱ء میں ایک اڈوائزری کمیشن مقرر کیا گیا جس کا یہ کام تھا کہ منیجنگ ایجنٹوں پر نگرانی اور کنٹرول رکھنے کے لیے حکومت کی مدد کرے۔

انڈین کمپنیز بل جس کا مسودہ بھابا کمیٹی کی سفارشات کے مطابق تیار کیا گیا تھا، ستمبر ۱۹۵۳ء میں وزیر مالیات نے پیش کیا۔ ۱۹۵۶ء کے شروع میں یہ بل منظور ہو گیا۔ اسے ۱۹۵۶ء کا کمپنیز ایکٹ کہا جاتا ہے۔ اپریل ۱۹۵۶ء سے یہ ایکٹ نافذ ہو گیا۔

۱۹۵۶ء کے کمپنی لا اور منیجنگ ایجنسی سسٹم کی خاص باتیں:

۱۹۵۶ء کے ایکٹ نے نئی دفعات نافذ کیں جن کی تعمیل سے کمپنیوں کی بدعنوانیاں، اقربا پروری اور دوسری خرابیاں کم ہو جائیں گی اور اُن کی کارکردگی، ساکھ اور انتظامی دیانت کا یقین ہو جائے گا۔ نئے ایکٹ کے تحت حکومت کو اختیار ہے کہ ۱۹۶۰ء کے بعد اگر چاہے تو منیجنگ ایجنسیوں کو ختم کرنے کے سلسلے میں قطعی فیصلہ کر سکتی ہے۔ منیجنگ ایجنسی سسٹم کی اصلاح کے بارے میں اس ایکٹ کی اہم دفعات ذیل میں درج ہیں:

(۱) منیجنگ ایجنسی سسٹم ختم کرنے کا سوال

مرکزی حکومت کو اختیار ہے کہ ایک معینہ تاریخ کے تین سال بعد یا ۱۵ اگست ۱۹۷۰ء کے بعد بعض قسم کی صنعتوں یا کاروبار کے بارے میں اعلان کر دے کہ یہ منیجنگ ایجنسی کے زیرِ اہتمام نہیں رہیں گے۔ لیکن حکومت کو اس اعلان سے پہلے ایک کمیٹی مقرر کرنی ہوگی جو اس مسئلے پر غور کرے گی اور حکومت کو اس بارے میں صلاح دے گی۔ مرکزی حکومت میں ایک نیا انتظامی یونٹ قائم کر دیا گیا ہے جسے کمپنی لا ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ کہا جاتا ہے۔ اس شعبے میں ایک سکریٹری اور ایک جوائنٹ سکریٹری کے علاوہ انڈر سکریٹری بھی ہیں جو مختلف پہلوؤں کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس ایکٹ کے تحت ایک ایڈوائزری کمیشن بھی مقرر کیا گیا ہے جو منیجنگ ایجنسی سسٹم پر موجودہ پابندیوں اور مستقبل میں انھیں ختم کرنے کے بارے میں حکومت کو مشورہ دینے کے لیے ہے۔

(۲) تقرر : ایک کمپنی کے منیجنگ ایجنٹ کے تقرر یا دوبارہ تقرر کو پہلے خود کمپنی کو اپنی جنرل میٹنگ میں منظور کرنا چاہیے اور اس کے بعد حکومت کو منظور کرنا چاہیے۔ منیجنگ ایجنٹوں کا پہلا تقرر بیس برس سے زیادہ کے لیے اور دوسرا تقرر دس برس سے زیادہ کے لیے نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) تقرر کی شرائط : کوئی شخص بہ یک وقت دس کمپنی سے زیادہ کا ایجنٹ نہیں ہو سکتا لیکن جو لوگ پہلے سے زیادہ کمپنیوں کے ممبر چلے آ رہے ہیں انھیں ۱۵ اگست ۱۹۶۰ء تک کا وقت دیا جائے گا کہ وہ اپنے معاملات درست کر لیں۔ ہر منیجنگ ایجنٹ کا تقرر ۱۵ اگست ۱۹۶۰ء کو ختم ہو جائے گا تاوقتیکہ اُس کا تقرر ۱۹۵۶ء کے ایکٹ کے تحت نئی مدت کے لیے دوبارہ نہ ہو جائے۔

(۴) ایجنٹوں کی برطرفی : دیوالیے اور سزا یافتہ ایجنٹوں کو اپنے عہدے پر فائز رہنے کی اجازت نہ ہوگی۔ جعل سازی اور دھوکہ بازی یا بدانتظامی اور غفلت کی صورت میں کوئی کمپنی ریزولیوشن پاس کر کے منیجنگ ایجنٹ کو اُس کے عہدے سے برطرف کر سکتی ہے۔

(۵) معاوضہ : کمپنی کو بہ یک وقت منیجنگ ایجنٹ، سکریٹری اور خازن رکھنے کی اجازت ہوگی۔ معاوضے کے طور پر منیجنگ ایجنٹ کو خالص منافع کا ۱۰٪ تک لینے کی اجازت ہوگی۔ سکریٹری اور خازن ۷½٪، اور منیجر ۵٪ تک لے سکتے ہیں۔ سالانہ منافع کے ۱۰٪ سے زیادہ کوئی بھی رقم مزید معاوضہ تصور کی جائے گی۔ اس قسم کی ادائیگی منیجنگ ایجنٹ کو صرف اُس صورت میں ہو سکتی ہے جب ایک خاص ریزولیوشن کے ذریعے متعلقہ کمیٹی اسے منظور کرے اور مرکزی حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو۔

(۶) دھوکہ بازی کو روکنے کے لیے منیجنگ ایجنٹ کے اختیارات پر پابندی: منیجنگ ایجنٹ اپنے اختیارات کو بورڈ آف ڈائرکٹرز کی نگرانی اور کنٹرول کے تحت استعمال کرے گا۔ اس کو ۱۹۵۶ء کے ایکٹ کی دفعات کی بھی پابندی کرنی پڑے گی۔ ایک ہی ایجنسی کے زیرِ اہتمام کمپنیوں کو ایک دوسرے کو قرض دینے اور ایک ہی گروپ کے اندر دوسری کمپنی کے شیئر خریدنے اور منیجنگ ایجنٹ کے ایسے کاروبار میں شرکت کرنے پر جو اُس کے زیرِ اہتمام کمپنی کے کاروبار سے مقابلہ کر رہا ہو بندشیں عائد کی گئی ہیں۔ اُن میں سے بیشتر بندشیں ۱۹۳۶ء کے ترمیمی ایکٹ میں موجود ہیں لیکن ان کی تعمیل کبھی نہیں کی گئی۔ ۱۹۵۶ء کا ایکٹ اِن بندشوں کو زیادہ سخت کرنے کے لیے تھا۔ درحقیقت ۱۹۵۶ء کے ایکٹ نے اعلان کیا کہ جو ایجنٹ ان پابندیوں کی خلاف ورزی کریں گے انھیں سخت سزا دی جائے گی۔

۱۹۵۶ء کے ایکٹ کی اصلاحات کا جائزہ

۱۹۵۶ء کے ایکٹ نے جو اصلاحات نافذ کیں وہ بالکل مکمل تو نہیں تھیں لیکن تعریف کے قابل ضرور تھیں۔ کوشش یہ کی گئی تھی کہ جابر اور نااہل انتظام کو ختم کیا جائے اور ریاستی ضابطوں کے ذریعے طاقت کے اُس اجتماع پر ضرب لگائی جائے جو نجی انتظام کے تحت صنعتی حلقے میں پایا جاتا ہے۔ ۱۹۵۶ء کے ایکٹ کے تحت مرکزی حکومت کے کمپنی لا ایڈمنسٹریشن کے شعبے کو ایجنسی سسٹم کو منضبط کرنے اور ان پر قابو رکھنے کے وسیع اختیارات حاصل تھے۔ ذیل میں ہم ۱۹۵۶ء کے ایکٹ کے متعلق اپنے مشاہدات پیش کرتے ہیں۔

(۱) ایکٹ میں سکریٹری اور خازن کے تقرر کی جو گنجائش رکھی گئی ہے اُس کا مطلب یہ ہوگا کہ منیجنگ ایجنسی سسٹم کے خاتمے کے بعد پُرانے منیجنگ ایجنٹ سکریٹری اور خازن کی صورت اختیار کرلیں گے اور کمپنیوں پر اپنی گرفت بدستور قائم رکھیں گے۔

(۲) بے لگام مقابلے (LAISSEZ FAIRE) کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے اب سے تقریباً ۴۴ برس پہلے لارڈ کینیز نے کہا تھا کہ اہم بات حکومت کے لیے یہ نہیں ہے کہ وہ وہی باتیں کرے جو دوسرے پہلے کر رہے ہیں یا کچھ ان سے بہتر یا بدتر طریقے سے انجام دے بلکہ اہم وہ کرنا ہے جو بالکل نہیں کیا جا رہا ہے۔ لارڈ کینیز کے اس بیان کو لے کر ہندوستان کے کچھ منیجنگ ایجنٹوں اور ان کے حامیوں نے منیجنگ ایجنسی سسٹم کی وکالت کرنی شروع کی۔ لیکن یہ بالکل مضحکہ خیز بات ہے کیوں کہ کینیز نے جب یہ بات کہی تھی اُس وقت اُن کے پیش نظر برطانیہ اور جرمنی جیسے بالغ سرمایہ دار ممالک تھے جہاں منیجنگ ایجنٹوں کا وجود نہیں تھا اور جہاں نجی صنعت کار عموماً وہ بدعنوانیاں اور جعل سازیاں

ہیں کرتے تھے جو ہندوستان کے مینجنگ ایجنٹوں میں پائی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ کینز نے ایک ایسے آزاد کاروباری نظام کے حوالے سے یہ بات کہی تھی جس میں مرکزی معاشی منصوبہ بندی یکسر مفقود تھی۔ آج کے ہندوستان کی صورت بالکل مختلف ہے۔ معیشت کی ترقی کے لیے ریاست نے ترقیاتی منصوبہ بندی شروع کر رکھی ہے۔ جمہوری نظام میں ترقیاتی منصوبہ بندی کا عمل تب ہی کامیاب ہو سکتا ہے جب پرائیویٹ اور پبلک سکٹر دونوں ہی ایمان داری سے اپنے فرائض انجام دیں۔

کمپنیز امنڈمنٹ ایکٹ ۱۹۶۰ء، پٹیل کمیٹی رپورٹ ۱۹۶۵ء اور ایجنسی سسٹم کے خاتمے کا سوال:

۱۹۵۶ء کا کمپنیز ایکٹ شروع ہی سے کمپنی کے منتظموں، شیئر ہولڈروں، وکیلوں اور محاسبوں کے اعتراضات کا نشانہ بن گیا چنانچہ حکومت نے اس کے نفاذ کے تقریباً ایک سال بعد دشوانا تھ شاستری کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی تاکہ یہ پورے مسئلے پر غور کرے اور ایسی ترمیمات کی سفارش کرے جن سے عملی دشواریاں مسودے کی خامیاں اور ابہام دور ہو سکیں۔ شاستری کمیٹی کی سفارشات کی بنیاد پر کمپنیز امنڈمنٹ بل ۱۹۵۹ء میں پارلیمنٹ میں پیش ہوا اور دسمبر ۱۹۶۰ء میں ایکٹ بن گیا۔

۱۹۶۰ء کے ایکٹ کی ترمیمات تین قسموں میں آتی ہیں (الف) ایسی ترمیمات جو ۱۹۵۶ء کے ایکٹ کی عملی دشواریاں دور کرنے کے لیے ضروری سمجھی گئیں (ب) وہ ترمیمات جو مسودے کی خامیاں اور ابہام دور کرنے کے لیے تھیں (ج) وہ ترمیمات جو ۱۹۵۶ء کے ایکٹ کے مقاصد کو بہتر طریقے سے پورا کرنے کے لیے اور بعض کمیاں دور کرنے کے لیے تھیں۔

آئیے مینجنگ ایجنسی سے متعلق ۱۹۶۰ء کے ایکٹ کی قراردادوں کا تفصیلی جائزہ لیں۔ (۱) جب ۱۹۵۶ء کے ایکٹ کے مطابق مینجنگ ایجنٹوں کے لیے اُن کے زیرِ اہتمام کمپنیوں کے شیئر خریدنا اور فروخت کرنا ممنوع قرار پایا تو کچھ ایجنٹوں نے استعفا دے دیا اور وہ انھیں کمپنیوں کے مینجنگ ڈائرکٹر بن گئے اور اپنے حق میں شیئروں کی خرید و فروخت دوبارہ شروع کر دی۔ اس بدعنوانی کے انسداد کے لیے ۱۹۶۰ء کے امنڈمنٹ ایکٹ نے حکومت کو اختیار دیا کہ وہ ان صنعتوں اور اشیا کا اعلان کر دے جن کی خرید و فروخت کے ایجنٹ بعض مخصوص حالات کے علاوہ، حکومت کی منظوری سے مقرر ہوں گے۔ (۲) ۱۹۶۰ء کے ایکٹ میں شیئروں کو آڑ میں رکھنے اور ایک کمپنی کے سرمائے کو دوسری کمپنی میں لگانے یا قرض دینے سے روکنے کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔ ایک ہی انتظامی گروپ کے باہر سرمایہ لگانے کے لیے (بہ استثنائے چند اور معینہ حدود کے اندر) حکومت کی منظوری ضروری ہوگی۔ (۳) ایک دوسری قرارداد کا مقصد مینجنگ ایجنٹوں کے معاوضے کی زیادہ کڑی تعریف اور وضاحت

کرتا ہے۔ کسی مینجنگ ایجنسی کے شرکا یا ڈائرکٹر یا مینجنگ ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنے والے کسی پرائیویٹ کمپنی کے ممبر کو معاوضے کی شکل میں جو کچھ ادا ہوگا وہ مینجنگ ایجنٹ کے معاوضے میں شامل کیا جائے گا۔ ایک کمپنی اور اُس کے مینجنگ ایجنٹ یا اُس کے پارٹنر کے درمیان کسی خدمت کا کوئی معاہدہ اُس وقت تک جائز نہ ہوگا جب تک کمپنی ایک مخصوص ریزولیوشن کے ذریعے اُسے منظور نہ کرے اور حکومت کی بھی رضامندی نہ حاصل ہو۔ (۴) آخر میں ۱۹۶۰ء کا امنڈمنٹ ایکٹ مینجنگ ایجنٹوں کے تقرر کے سلسلے میں کئی باتوں کی وضاحت کرتا ہے۔ ترمیم کے مطابق اس شخص کو مینجنگ ایجنٹ تصور کیا جائے گا جو مینجنگ ایجنسی کے تحت کسی پبلک کمپنی کے دس فی صدی شیئر یا پرائیویٹ کمپنی کے ۲۵% شیئر اپنے پاس رکھتا ہے۔ جو لوگ مینجنگ ایجنسی کمپنیوں سے متعلق ہیں انھیں فوراً اپنی حیثیت پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور اس بات کی طرف سے اطمینان کر لینا چاہیے کہ وہ دس کمپنیوں سے زیادہ کے مینجنگ ایجنٹ نہیں قرار پاتے ہیں۔

مہالنوبس کمیٹی رپورٹ اور معاشی طاقت کے اجتماع کے موضوع پر ڈاکٹر ہزاری کی ایکسپرٹ رپورٹ میں مینجنگ ایجنسی سسٹم کو بعض صنعتی میدانوں سے ختم کرنے کی تجاویز پر ہر پہلو سے غور کیا گیا۔ یہ واضح رہے کہ مئی ۱۹۶۹ء کے وسط میں لوک سبھا نے کمپنیز امنڈمنٹ بل پاس کر دیا جس کے مطابق اپریل ۱۹۷۰ء سے مینجنگ ایجنسی سسٹم ختم ہونا ہے۔

اس سے قبل اکتوبر ۱۹۵۹ء میں حکومت نے مینجنگ ایجنٹوں اور سکریٹریوں کے معاوضے کا درجہ بدرجہ گھٹنے والا ایک پیمانہ مقرر کر دیا۔ یہ معاوضہ کمپنی لا ایڈوائزری کمیشن کے مشورے سے طے کیا گیا۔ اس کے مطابق پہلے دس لاکھ خالص منافع پر ۱۰% سے لے کر ایک کروڑ پر ۴% مقرر ہوا۔ اسی طرح سکریٹری اور خازن کے لیے پہلے دس لاکھ تک ۷½% اور ایک کروڑ تک پر ۳% مقرر ہوا۔

ساتھ ہی حکومت نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ جب کوئی کمپنی مینجنگ ایجنٹ، سکریٹری یا خازن پہلی بار مقرر کرے تو اُس کے تقرر کی مدت دس دس برس ہونی چاہیے اور دوبار تقرر کی مدت پانچ پانچ برس ہونی چاہیے۔ یاد رہے کہ ۱۹۵۶ء کی ترمیم کے مطابق پہلے تقرر کی مدت ۱۵ برس اور دوبارہ تقرر کی مدت دس برس رکھی گئی تھی۔

اس موقع پر یہ ذکر کر دینا مناسب ہوگا کہ مینجنگ ایجنسی انکوائری کمیٹی کی رپورٹ مئی ۱۹۶۶ء میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں پیش ہوئی۔ حکومت ہند کے چیف اکنامک ایڈوائزر آئی۔ جی پٹیل کی صدارت میں ۴ جنوری ۱۹۶۵ء کو انکوائری کمیٹی مقرر کی گئی۔ پٹیل کمیٹی نے حکومت سے سفارش کی کہ یوں تو مینجنگ ایجنسی کے نظام کو ختم کرنا ہی ہے لیکن موجودہ معاشی حالات میں اس پالیسی پر عمل

کرنے میں احتیاط برتنی چاہیے۔ کمیٹی شکر، سوتی کپڑے اور سیمنٹ کی صنعتوں میں اس نظام کو ختم کرنے کے حق میں تھی لیکن جوٹ اور کاغذ کی صنعتوں میں ایسا کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ شکر، سوتی کپڑے، اور سیمنٹ کی صنعتوں میں بھی کمیٹی کا کہنا تھا کہ اس نظام کو دوسرے نظام میں بدلنے کے لیے مناسب مہلت دینی چاہیے۔

ستمبر ١٩٦٦ء میں حکومت نے سیمنٹ، سوتی کپڑے، جوٹ، کاغذ اور شکر کی صنعتوں میں مینیجنگ ایجنسی سسٹم ختم کرنے کے فیصلے کا اعلان کر دیا۔ اس کے لیے تین سال کی مدت معین کی گئی۔ ہتھیل کمیٹی کی سفارش کردہ تین صنعتوں کے بجائے پانچ صنعتوں سے مینیجنگ ایجنسی ختم کرنے کا فیصلہ کرنے میں سیاسی لحاظ کو زیادہ دخل تھا۔ حکومت کا خیال تھا کہ اس کو معاشی طاقت کے اجتماع کی طرف اپنے رویے کو واضح طور سے ظاہر کرنا تھا۔

دسمبر ١٩٦٨ء میں حکومت نے اس نظام کو بالکل ختم کرنے کا دلیرانہ فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ مئی ١٩٦٩ء میں لوک سبھا نے کمپنیز امنڈمنٹ بل منظور کر دیا جس کی رو سے اپریل ١٩٧٠ء سے اس نظام کو ختم کر دیا گیا۔

اس موقع پر یہ ذکر کر دینا چاہیے کہ مینیجنگ ایجنسی سسٹم کا تنہا موثر بدل یہ ہے کہ انتظام کل وقتی ڈائرکٹروں کے ہاتھ میں ہو یا مینیجروں کے ہاتھوں میں جو بورڈ آف ڈائرکٹرز کی عام نگرانی میں کام کریں۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں انتظام کی یہی صورت ہے۔ ہندوستان میں پبلک سکٹر کی کمپنیوں، بینکوں اور بیمہ کمپنیوں کے انتظام کے لیے یہی طریقہ اپنایا گیا ہے۔

اب جب کہ مینیجنگ ایجنسی سسٹم کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے، یہ ضروری ہے کہ حکومت اس کے خاتمے کی مقررہ تاریخ پر قائم رہے اور اپریل ١٩٧٠ء تک اسے ختم کر دے۔ اس سسٹم کے خاتمے سے انتظام کی جو لامرکزیت پیدا ہوگی اُس کی وجہ سے انتظامی کارکردگی بہتر ہوگی اور پورے صنعتی نظام کی بنیاد کشادہ ہوگی۔ اس کی وجہ سے نوجوانوں کی دبی ہوئی صلاحیت کو اُبھرنے کا موقع فراہم ہوگا۔

مناپلیز انکوائری کمیشن کی رپورٹ کا جائزہ

حکومت نے مئی ١٩٦٤ء میں کے۔ سی داس گپتا کی صدارت میں مناپلیز انکوائری کمیشن مقرر کیا۔ کمیشن نے دسمبر ١٩٦٥ء میں اپنی رپورٹ پیش کی اور یہ سفارش کی کہ اجارہ دارانہ ہتھکنڈوں اور بدعنوانیوں کے انسداد کے لیے ایک مستقل قانونی ادارہ قائم کیا جائے۔

کمیشن سے کہا گیا تھا کہ وہ اس بات کی چھان بین کرے کہ زراعت کو چھوڑ کر معیشت کے دوسرے اہم شعبوں میں معاشی طاقت کس حد تک چند ہاتھوں میں مرتکز ہے اور معیشت پر اس کے کیا اثرات ہیں۔ کمیشن کو ایسے قانونی اور دوسرے اقدام بھی تجویز کرنے تھے جو اپنی چھان بین کے نتیجے کے طور پر وہ ضروری سمجھے، خصوصاً ایسے نئے قوانین جن کے ذریعے مفادِ عامہ کا تحفظ ہو سکے۔ کمیشن کو ان قوانین کی تعمیل کے طریقے اور ذرائع بھی تجویز کرنے تھے۔ چنانچہ کمیشن سے توقع تھی کہ وہ نیم منصوبہ بند ملی جلی معیشت کے کچھ بنیادی مسائل پر اپنی فہم و فراست سے اثر انداز ہوگا۔ بدقسمتی سے کمیشن یہ اہم فرض انجام دینے میں ناکام رہا۔ اس کے بجائے کمیشن کو حالات سے مجبور ہو کر ایسے قوانین بنانے میں لگ جانا پڑا جن کے ذریعے صرف اجارہ دارانہ ہتھکنڈوں سے نپٹا جا سکے۔ لیکن جہاں تک معاشی طاقت کے ارتکاز کا مسئلہ ہے اس پر ضرب لگانے کے لیے یہ ناکافی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ رپورٹ میں معاشی طاقت کے اجتماع کے بنیادی اسباب کا اور اس اجتماع کی شدت کا کوئی سنجیدہ اور باقاعدہ تجزیہ نہیں ہے۔ اس کے بجائے کمیشن اس اجتماع کے بڑھنے کو ایک امرِ مسلّم تصور کرتا ہے۔ تعجب ہے کہ کمیشن اپنی رائے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس اجتماع سے ملک کی معاشی بہبودی میں مدد ملتی ہے۔ چنانچہ کمیشن کا کام بہت آسان تھا، اُس کو خود اجتماع پر ضرب نہیں لگانا تھا بلکہ اُن طریقوں سے نپٹنا تھا جو منصفانہ تقسیم کے لیے خطرہ تھے۔

کمیشن نے ایک بل کا مسودہ تیار کیا جس میں اجارہ دارانہ بدعنوانیوں کے انسداد کے لیے ایک مستقل قانونی ادارے کے کام اور اختیارات متعین کیے گئے تھے۔ مجوزہ قانونی ادارے کو اختیار حاصل تھا کہ حکومت کی شکایت پر یا اگر کوئی متعلقہ ڈائرکٹر آف انوسٹی گیشن کسی معاملے کو اس کے پاس بھیجے تو یہ انکوائری بٹھا سکتا ہے۔ یہ ڈائرکٹر آف انوسٹی گیشن عوام کی شکایتیں سننے اور اُن پر غور کرنے کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔ عدالتی جانچ کے بعد یہ قانونی ادارہ اگر ضروری سمجھے تو حکم جاری کر سکتا ہے اور متعلقہ پارٹی کو منع کر سکتا ہے کہ وہ اس فعل یا دستور کو بند کر دیں جس کے بارے میں شکایت کی گئی تھی۔ اس حکم کی حیثیت آخری حکم کی ہوگی جس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی جا سکتی تھی۔

مجوزہ قانونی ادارے کے اختیارات میں سے ایک اختیار یہ بھی ہوگا کہ یہ وقتاً فوقتاً کسی بھی صنعتی ادارے کے ڈھانچے کی جانچ کر سکتا ہے اور اُسے بہتر بنانے کے طریقے تجویز کر سکتا ہے تاکہ دقیانوسی پن نہ پیدا ہو۔ اُس کو یہ بھی اختیار ہوگا کہ اگر کوئی بڑا کاروبار جس کو کسی مخصوص میدان میں پہلے سے غلبہ حاصل ہے کسی دوسرے کاروبار سے اختلاط چاہتا ہے یا اُس میں مدغم ہونا چاہتا ہے تو

یا ادارہ اس کی منظوری دے۔ اگر کوئی شخص پہلے ہی سے کسی بڑے کاروبار کا ڈائریکٹر ہے تو وہ اس ادارے کی منظوری سے ہی اُسی لائن کے کسی دوسرے کاروباری ادارے کا ڈائریکٹر مقرر ہو سکتا ہے۔ یہ ادارہ بڑی کمپنیوں سے ان کے سالانہ آمدو خرچ کا حساب لے گا تاکہ غلبہ حاصل کرنے والی کمپنیوں پر نگاہ رکھ سکے۔ کمیشن کا خیال ہے کہ ان اختیارات کی وجہ سے یہ قانونی ادارہ بڑے کاروباروں کی نگرانی کر سکے گا اور اگر کہیں اسے طاقت کا ارتکاز دکھائی دیتا ہے یا اجارہ داری کی وجہ سے پیداوار پر پابندی یا روک ہے تو یہ ضروری کارروائی کر سکتا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں حکومت نے ایک مستقل قانونی کمیشن قائم کرنے کا اعلان کر دیا جس کا نام مناپلیز اینڈ رسٹرکٹڈ ٹریڈ پریکٹسز کمیشن (MONOPOLIES AND RESTRICTED TRADE PRACTICES COMMISSION) ہے اور جس کو رخنہ انداز تجارتی کارروائیوں کی تحقیق کرنے کا اختیار ہے۔ یہ اعلان لوک سبھا میں ایک ریزولیوشن کی صورت میں کیا گیا اور اس طرح مناپلیز کمیشن کی بنیادی سفارش کی تعمیل ہو گئی۔ یہ بھی بتلایا گیا کہ جہاں تک معاشی طاقت کے بے جا ارتکاز کا تعلق ہے یہ ادارہ اُس کے مختلف پہلوؤں مثلاً موجودہ صنعتی اداروں کا پھیلاؤ، کاروبار کا تنوع، اختلاط اور متعلقہ معاملات کے بارے میں حکومت کو مشورہ دے سکے گا۔ آخری فیصلہ حکومت کرے گی۔

ہمارا خیال ہے کہ اس مستقل ادارے کے قیام سے بھی معاملات زیادہ نہیں سدھریں گے۔ یہ بات یقینی ہے کہ عدالتی اداروں کے دباؤ سے معاشرے کی اخلاقی حالت نہیں بہتر ہو گی جب تک سیاسی اور مالی بازی بہت اونچی ہے۔ اور روپیہ اتنا وافر ہے کہ یہ بازی آسانی سے کھیلی جا سکتی ہے۔ ہندوستان میں معاشی طاقت کے ارتکاز کا مسئلہ بڑا کٹھن ہے جس سے حکومت کو ایک سوچی سمجھی عام معاشی پالیسی اور موثر انتظام کی مشینری کے ذریعے سنجیدگی سے نپٹنا ہو گا۔

یہ بات بھی کم اہم نہیں ہے کہ کمیشن نے مینیجنگ ایجنسی کو ختم کرنے کے سوال کو بہت سرسری انداز سے لیا۔ اُس نے اس نظام کو ختم کرنے کی کوئی سفارش شاید اس لیے نہیں کی کہ وہ اسے نظام طاقت کے ارتکاز کی برکتوں میں سے ایک برکت سمجھتا ہے۔ اس موقع پر یہ دُہرانا ضروری ہے کہ کمیشن کی یہ قطعی رائے تھی کہ اس ارتکاز نے ملک کی بہبودی میں مدد کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کمیشن یہ سمجھتا ہے کہ مینیجنگ ایجنسی کے خاتمے سے طاقت کے ارتکاز پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا کیوں کہ اس نظام کی جگہ گروپ مینجمنٹ کا کوئی دوسرا انتظام لے لے گا۔ چنانچہ اس سلسلے میں قدم اُٹھاتے وقت صرف معاشی طاقت کے ارتکاز ہی کو نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ صنعتی ترقی پر اس کے اثرات کو بھی دیکھنا ہے۔ کمیشن کا خیال ہے

کہ یہ مسئلہ اُس کی تحقیق کی حد سے باہر ہے اِس لیے وہ اِس مسئلے پر خاموش ہے۔
۱۹۶۹ء کا مناپلیز بل جلد ہی ایکٹ بن جائے گا جو بڑے کاروباری گروہوں کے تنوع اور توسیع پر قابو رکھنے کے لیے حکومت کو وسیع اختیارات دیتا ہے۔ حکومت کو اختیار ہوگا کہ مفادِ عامّہ کے پیشِ نظر وہ ضروری سمجھے تو بڑے گروہوں کو توڑنے اور چھوٹے آزاد اداروں میں تقسیم ہونے کا حکم دے سکتی ہے۔
ہماری معیشت مخلوط معیشت ہے۔ اس کی بنیاد ساجھے دار سرمایہ داری پر ہے جسے ملک کی برسرِ اقتدار پارٹی نجی سکٹر میں طاقت کے ارتکاز، ملکیت اور اختیارات پر موثر بندشوں کے ذریعے جمہوری سوشلزم میں بدلنے کی توقع رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی قسم کا جمہوری سوشلزم تب ہی کامیاب ہوسکتی ہے جب پبلک اور پرائیویٹ سکٹر، دونوں اپنے فرائض ایمان داری اور مستعدی سے انجام دیں۔ اسی لیے نجی سکٹر کے صنعتی انتظام کو نیا رُخ دینے اور دوبارہ تنظیم دینے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی سرکاری حلقے کے کاروبار کو ٹھیک سے چلانا ضروری ہے۔

پبلک سکٹر کے کاروبار کا انتظام۔ خودمختاری کا سوال

چوں کہ ہمارا مقصد سوشلسٹ طرز کا سماج قائم کرنا ہے اِس لیے ریاست کی ذمّہ داری پانچ سالہ منصوبوں کے دوران معاشی سرگرمی کے وسیع تر میدان تک پھیل گئی ہے۔ صنعت، تجارت اور نقل و حمل کے میدان میں سرکاری کاروبار نمایاں رول ادا کر رہا ہے۔ اُس کی وجہ سے پبلک سکٹر کے انتظام کے اہم مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ سرکاری سرمایہ کاری کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ پیداوار میں قابلیت اور کارکردگی پیدا ہو یعنی صحیح قسم کی اشیا اور خدمات کم سے کم لاگت سے پیدا کی جائیں یہ مقصد تب ہی پورا ہوسکتا ہے جب سرکاری کاروبار کا انتظام بالکل بے داغ ہو۔
حال میں لائف انشیورنس کارپوریشن کے انتظام کے سلسلے میں جو مباحثہ چھڑا ہے اُس نے پبلک کارپوریشنوں کی خودمختاری کے سوال کو بہت نمایاں حیثیت دے دی ہے۔ ۱۹۵۹ء کی سمینار، رپورٹ جسے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن نے شائع کیا ہے،' اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سمینار کے سب شرکا اِس بات پر متفق تھے کہ خودمختار کارپوریشن کا پارلیمنٹ کو جواب دِہ ہونا نہ صرف اچھا بلکہ ضروری ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ پارلیمنٹ سرکاری کاروبار میں شیئر ہولڈر یعنی ٹیکس ادا کرنے والوں کی نمایندگی کرتی ہے۔ اِس لیے کمپنی کے معاہدے میں اُسے شیئر ہولڈروں کی جماعت کی حیثیت سے کام کرنا چاہیے۔ ہمارا بھی خیال ہے کہ خودمختاری مطلق نہیں ہوسکتی اور

پارلیمنٹ کو جواب دہ ہونا ضروری ہے۔ چاہے اُس کاروبار کی حیثیت کارپوریشن کی ہو یا کمپنی کی یا سرکاری شعبے کی۔ ہمارا خیال ہے کہ پارلیمنٹ کو پبلک اکاؤنٹس کمیٹی قسم کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے ذریعے نگرانی کے اختیار کو استعمال کرنا چاہیے اور اس کام کے لیے ماہروں کی امداد حاصل کرنی چاہیے۔ یاد رہے کہ کارکردگی کی میعادی جانچ اور تحقیق کے ذریعے مخصوص غلطیوں کو تو نہیں روکا جا سکتا لیکن اس کی یقین دہانی ضرور ہو سکتی ہے کہ غلطی دوبارہ نہ ہو اور غلطی کرنے والے کو متنبہ کیا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ دلیل ہندوستان پر زیادہ قابلِ اطلاق ہے کیوں کہ پبلک کارپوریشن میں عوام کا روپیہ لگتا ہے اس لیے پارلیمنٹ کو نگرانی کرنی چاہیے کہ اس کا غلط استعمال نہ ہو۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے کارپوریشن کو زیادہ تر سرمایہ سرکاری خزانے سے ملتا ہے۔

خودمختاری کے معاملے میں ایسا لگتا ہے کہ اس موضوع پر اگر ہمیں کوئی قیمت ہے تو ڈاکٹر پال ایپل بی نے جو کچھ کہا ہے اُس کی حیثیت حرفِ آخر کی ہے۔ اُنھوں نے حکومت ہند کے صنعتی اور تجارتی اداروں کے انتظام کے بارے میں اپنی رپورٹ میں لکھا ہے " اس میں شبہ نہیں کہ صحیح خودمختاری کا نہ کوئی سوال ہے اور نہ کسی باخبر اور جان کار آدمی نے سنجیدگی سے ایسا تجویز کیا ہے۔ جمہوری نظام میں حکومت ہر اہم معاملے میں نہ صرف دخل دے سکتی ہے بلکہ اسے دخل دینا چاہیے۔ خودمختاری کی حمایت کا مقصد صرف اس ضرورت کو اُجاگر کرنا ہے کہ ذمہ دار آلاتِ حکومت کو نفس کُشی کی تعلیم کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی دخل اندازی کو واقعی اہم معاملات تک محدود رکھیں۔" اس سب سے یہ واضح ہے کہ ابتدائی مراحل میں جب طاقت کے بے جا استعمال کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں، خودمختاری مناسب ہے۔ بعد میں اگر پورا ماحول بنیادی طور سے بہتر ہو جاتا ہے تو اس مسئلے پر پھر سے غور کیا جا سکتا ہے۔

سرکاری کاروباری اداروں کے انتظام کے بارے میں ماہرین کے خیالات

(الف) ۱۹۵۱ء کی گوروالا کی سفارشات؛ سرکاری کاروباری اداروں کے موثر انتظام کے طریقے تجویز کرنے کے لیے پلاننگ کمیشن نے ۱۹۵۱ء میں اے۔ ڈی گوروالا کو متعین کیا۔ ان کی رپورٹ کے اہم مشاہدات درج ذیل ہیں:

(۱) سرکاری صنعتی اداروں کے لیے خوداختیاری بہترین حل ہے۔ بعض مخصوص صورتوں میں انتظام کسی بھی ایجنسی کو ٹھیکے پر سونپا جا سکتا ہے یا کسی معمولی سرکاری مشینری کو شعبہ جاتی بنیاد پر سپرد کیا جا سکتا ہے۔ خودمختاری کی صورت میں عوامی ملکیت، عوام کو جواب دہی اور عوامی مقاصد کے لیے موثر نظام کا اتصال

ضرور ہونا چاہیے۔

(۲) بجٹ کی منظوری کے وقت پارلیمنٹ کو خودمختار اداروں کے کاموں کے ہر پہلو پر بحث کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ پارلیمنٹ کے سامنے سالانہ رپورٹ اور حسابات پیش ہونے چاہئیں لیکن ادارے کے عام روزانہ کے انتظامی معاملات پارلیمنٹ کے حدود سے باہر ہونے چاہئیں۔

(۳) خودمختار بورڈ کے صدر اور اراکین کا تقرر وزیر متعلقہ کو کرنا چاہیے لیکن اگر خودمختاری کو ٹھیک سے عمل میں آنا ہے تو تقرر کے بعد وزیر کی نگرانی کے اختیارات سختی سے محدود ہونے چاہئیں۔ لیکن وزیر کو یہ اختیار ہمیشہ حاصل ہونا چاہیے کہ وہ قومی مفاد کے معاملات میں عام ہدایات دے سکتا ہے۔ توسیع کے لیے نیا سرمایہ لگانے کے لیے وزیر کی منظوری ضروری ہونی چاہیے۔ چاہے یہ رقم ادارے کے محفوظ فنڈ سے بھی فراہم کی جارہی ہو۔

(۴) آب پاشی، ہائڈرو الکٹرک پروجکٹ، ریور ویلی اسکیم یا براڈ کاسٹنگ سروس یا سرکاری نقل و عمل جیسے کام سرکاری کاموں کی توسیع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو ادارے یہ کام انجام دیں ان کے لیے پبلک کارپوریشن ضروری ہے۔ جوائنٹ اسٹاک کمپنی کے قسم کا انتظام اُن سرکاری کاروبار کے لیے ہونا چاہیے جو صنعت اور فروخت کے لیے قائم کیے جائیں۔

(۵) پبلک اداروں کے گورننگ بورڈ یا بورڈ آف ڈائرکٹرز میں وزیروں اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو نہ ہونا چاہیے۔ ان بورڈوں کی تشکیل ایسی ہونی چاہیے کہ ان پبلک اداروں کو ہدایت دینے کا کام مناسب اور موثر طریقے سے انجام پا سکے۔

(۶) بورڈ آف ڈائرکٹرز دو قسم کے ہوسکتے ہیں: (الف) پالیسی بورڈ اور (ب) عملی بورڈ۔ پبلک کارپوریشن اور جوائنٹ اسٹاک کمپنی قسم کے لیے پالیسی بورڈ بہتر ہوگا۔

(ب) پروفیسر گال برتھ کے خیالات:

ڈاکٹر گورروالا اور پروفیسر گال برتھ کے مشاہدات کا موازنہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ڈاکٹر گال برتھ امریکہ کے مشہور ماہر معاشیات ہیں جو سرکاری اداروں کی خودمختاری کے سوال کا مخصوص مطالعہ کرنے کے لیے ۱۹۵۶ء میں ہندوستان آئے تھے۔ اگر گورروالا سرکاری اداروں کے لیے محدود خودمختاری اور پارلیمانی نگرانی کے حامی تھے تو ڈاکٹر گال برتھ ان اداروں کی مکمل خودمختاری کے حق میں تھے اور پارلیمانی نگرانی کے خلاف تھے۔ انھوں نے کہا "مصارف عامہ پر خزانے کی رعایت کی پرچھائیں پبلک اداروں پر بھی پڑتی ہے۔ حکومت کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ آیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ پبلک ادارے کے کاموں کی

تفصیل کے بارے میں پارلیمانی سوالات کا دائرہ محدود رکھا جائے۔

پبلک سکٹر کے کاروبار کے انتظام کے بارے میں کرشنا مینن کمیٹی کی سفارشات کا جائزہ :

۱۹۵۹ء کے وسط میں کانگریس پارلیمانی پارٹی کی ایک سب کمیٹی نے جس کا نام کرشنا مینن کمیٹی تھا اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کی۔ یہ کمیٹی سرکاری کارپوریشنوں اور کمپنیوں کے مسائل پر غور کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ اس کو یہ بھی تجویز کرنا تھا کہ کس طرح پارلیمنٹ ان اداروں کے روزانہ کے کاموں میں دخل دیے بغیر ان کی نگرانی کرے۔ اس کمیٹی نے ان اداروں کے انتظام کے بہت سے پہلوؤں پر دور رس سفارشات کیں، مثلاً انتظامی بورڈوں کی صدارت اور ڈائرکٹری۔ عملے کا انتخاب، تقررات، ترقی، ترغیب، تربیت اور تحقیق، وزیروں، وزارت اور اداروں کی انتظامیہ کا رشتہ، صنعتی تعلقات، مزدوروں کی شرکت اور ان کی فلاح، مالیاتی طریقے اور نگرانی، ٹیکس، قیمت مقرر کرنے کی پالیسی اور جواب دہی جس میں پارلیمنٹ کو جواب دہ ہونا شامل ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مرارجی ڈیسائی کی سربراہی میں کابینہ کی ایک سب کمیٹی نے مینن کمیٹی کی رپورٹ پر غور کیا اور اعلان کیا کہ اس کی سفارشات عام طور سے حکومت کے لیے قابلِ قبول ہیں۔

جہاں تک پبلک کاروبار پر سرکاری کنٹرول کا تعلق ہے مینن کمیٹی کے مطابق اس کا حل یہ ہے کہ پارلیمنٹ کی ایک تیسری کمیٹی مقرر کی جائے۔ یہ کمیٹی موجودہ اسٹیمیٹ (ESTIMATES COMMITTEE) کمیٹی اور پبلک اکاونٹس کمیٹی جیسی ہوگی۔ لیکن کمیٹی کا کہنا ہے کہ یہ کمیٹی جس کا نام اسٹینڈنگ پارلیمنٹری کمیٹی ہوگا، اس کا کام نہ تو غلطیاں نکالنا ہوگا اور نہ اس کی حیثیت سپر بورڈ کی ہوگی۔ لیکن ساتھ ہی اس کے فیصلوں پر اور پارلیمانی روایات کے مطابق اس کے اظہار خیالات پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ دسمبر ۱۹۵۹ء میں صنعتی پبلک کاروبار کے موضوع پر یو۔ این کا ایک دس روزہ سمینار دلی میں ہوا تھا۔ اس سمینار کے خیالات اور کمیٹی کی سفارشات کا موازنہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اس سمینار کے تمام ڈیلی گیٹ اس بات پر عام طور سے متفق تھے کہ پبلک کاروبار پر سرکاری کنٹرول ضروری تھا لیکن اسے روزانہ کے معاملات میں دخل اندازی کی صورت نہیں اختیار کرنا چاہیے بلکہ ان معاملات میں عام ہدایات دینے تک محدود رکھنا چاہیے مثلاً ترقیاتی پروگرام، سرمایہ لگانا، عملے کا نظام اور پالیسی کے دوسرے سوالات جن کا صاف تعلق قومی مفاد سے ہو۔ پارلیمنٹ کے ممبروں کو پبلک کاروبار کے کاموں سے مطلع رکھنے کے لیے سمینار نے تجویز کیا کہ جہاں ہیں کے مخصوص پارلیمانی کمیشن مقرر کیے جائیں جو ان اداروں کا جائزہ لیتے رہیں۔

مینن کمیٹی نے یہ بھی تجویز کیا ہے کہ پبلک کاروبار کے انتظامی بورڈ کی چونکہ آخری ذمہ داری ہے

اِس لیے اُس کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ بورڈ کے فیصلوں کو رد کر سکے اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ کمپنی کا مفاد کسی بات میں ہے تو بورڈ سے مشورہ کیے بغیر اپنی صواب دید سے کام لے سکے۔ اِس کی وجہ سے یقیناً ایک طرح کا من مانا پن پیدا ہو جائے گا جس کا بعض اوقات یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ انتظامی بورڈوں کی خود مختاری بالکل ختم ہو جائے اور یہ چیرمین اور اُس کے ذریعے وزیر کے ہاتھ میں ایک آلہ بن کر رہ جائیں۔

یہ بات ہمیں چیرمین اور وزیر کے تعلقات کے اہم مسئلے کی طرف براہِ راست لاتی ہے۔ اِس سلسلے میں مینن کمیٹی کا نظریہ عملی اور حقیقت پسندانہ ہے۔ اِس کا کہنا ہے کہ "اُن مواقع کی فہرست دینا نہ ممکن ہے اور نہ مناسب کہ کب وزیر کو خاص ہدایات جاری کرنی چاہئیں اور کب نہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسی ہدایات جاری کی جاتی ہیں تو اِس کا مطلب ہے کہ وزیران ہدایات کی وسیع تر ذمہ داری اپنے اوپر لے رہا ہے۔ ہر حالت میں پارلیمنٹ کے سامنے اُس کی ذمہ داری اپنی جگہ پر ہے اور ہدایت کی آڑ میں وہ اپنی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتا۔" کمیٹی کا کہنا ہے کہ اِن باتوں کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وزیر اِن اداروں کے روزانہ کے معاملات میں یا اُس کی اندرونی منصوبہ بندی کی عام پالسی میں عام طور سے دخل دے۔ غالباً کمیٹی کا مقصد یہ ہے کہ سفارشات کا یہ حصہ دخل اندازی کی عام اجازت کے لیے نہیں ہے بلکہ خود مختاری کی ماہیت ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ لیکن عملاً مینن کمیٹی کی اِس سفارش کی تعمیل سے سرکاری کاروباری اداروں کی خود مختاری وزارتی اور پارلیمانی نگرانی کے تحت محدود ہو جائے گی۔ جہاں تک کنٹرول اور دخل اندازی کا سوال ہے گوروالا کی سفارشات کے مقابلے میں حالیہ تجویز ایک قدم آگے ہے۔ گوروالا نے بہت نرمی کے ساتھ محدود خود مختاری کی حمایت کی تھی جب کہ مینن کمیٹی کا رجحان وزارتی دخل اندازی اور پارلیمانی کنٹرول دونوں کی طرف ہے۔ بہ الفاظِ دیگر گوروالا کی سفارشات کے مقابلے میں مینن کمیٹی کی سفارشات سرکاری کاروبار کی خود مختاری کو زیادہ محدود کرتی ہے۔

باب ۱۹

ریاست اور صنعتوں کا رشتہ اور بیرونی سرمائے سے متعلق پالیسی

اس دلیل میں بڑی جان ہے کہ اگر پرائیویٹ سیکٹر کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے تو وہ بنیادی صنعتوں اور عام فائدے کے کاروبار میں اتنا سرمایہ نہ لگائیں گے جتنا حکومت لگائے گی۔ قدرتاً کم ترقی یافتہ ملک میں صنعتی ترقی کا کام حکومت ہی کو شروع کرنا ہوتا ہے۔ سرکاری مداخلت اور ضابطوں کے ذریعے تیز صنعتی ترقی کی جاپان کی مثال بہت اچھی ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں برطانوی عہد میں حکومت نے صنعتوں کی عام ترقی اور جدید منظم سیکٹر کی توسیع کی کوئی کوشش نہیں کی۔ آزادی کے بعد سے حکومت نے ایک جامع صنعتی پالیسی شروع کی ہے جس کی صنعتی ترقیاتی منصوبہ بندی میں بنیادی حیثیت ہے۔

آزادی کے بعد کی صنعتی پالیسی

ہندوستان کے وسائل اور صنعتی امکانات کا تفصیلی جائزہ لینے کے لیے اگرچہ ۱۹۱۶ء میں انڈین انڈسٹریل کمیشن مقرر ہوا تھا لیکن حکومت نے کوئی مثبت اور منظم پالیسی مرتب کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران برطانوی حکومت کو ہندوستان میں صنعتی توسیع، تحقیق اور تربیت کی ضرورت کا احساس ہوا۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء میں حکومت نے بورڈ آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ قائم کیا۔ برطانوی عہد کے آخر میں پلاننگ اور ری کانسٹرکشن کا شعبہ کھولا گیا اور صنعتی ترقی کا پروگرام بنانے کی ایک بے جان کوشش کی گئی۔ آزادی سے قبل کے ہندوستان میں تیز صنعتی ترقی کا کوئی امکان ہی نہیں تھا کیوں کہ یہ برطانوی مفاد کے خلاف تھا۔ اس کے علاوہ ترقیاتی منصوبہ بندی کے ہمہ گیر عمل کے بغیر تیز صنعتی ترقی تقریباً ناممکن تھی۔

آزادی کے بعد کی صنعتی پالیسی:

۱۹۴۸ء کی صنعتی پالیسی: آزادی کے سال بھر کے اندر ہی ۶ اپریل ۱۹۴۸ء کو حکومت نے ایک جامع صنعتی پالیسی کا اعلان کیا جس میں سرکاری اور نجی کاروبار کے حلقوں کی نشان دہی کرنے کی کوشش

کی گئی تھی۔ اور صنعتوں کو مضبوط کرنے اور اُن پر کنٹرول رکھنے کی سرکاری پالیسی کے خدوخال ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔ ذیل میں ہم اس پالیسی کی خاص باتوں کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) موٹے طور پر صنعتیں چار قسموں میں تقسیم کی گئی ہیں۔

(الف) دفاعی اور فوجی اہمیت کی صنعتیں جن میں اسلحہ گولا بارود بنانے والی صنعتیں شامل ہیں؛ ایٹمی قوت کی پیدائش اور اُس پر کنٹرول اور ریل کے ذریعے نقل و حمل، یہ سب کلیتاً سرکاری حلقے میں ہوں گی (ب) بنیادی صنعتیں ــ لوہا، فولاد، کوئلہ، ہوائی جہاز اور پانی کے جہاز۔ یہ صنعتیں سرکاری کنٹرول کے حلقے میں ہوں گی۔ نئی بنیادی صنعتیں سرکاری ملکیت ہوں گی اور انھیں سرکار چلائے گی۔ وہ بنیادی صنعتیں جو نجی کاروبار میں ہیں دس برس تک یونہی رہیں گی۔ اِس مدّت کے بعد ان کے قومی ملکیت میں لانے کے بارے میں فیصلہ ہوگا۔ (ج) بیس عدد دوسری اہم صنعتیں۔ جن میں بھاری کیمیائی صنعتیں، شکر، سوتی اور اُونی کپڑے، سیمنٹ، کاغذ، نمک اور مشینی اوزار شامل ہیں۔ نجی حلقے میں رہیں گی لیکن سرکاری ضابطے اور نگرانی کے تحت ہوں گی۔ اس حلقے کے لیے قومی ملکیت میں لائے جانے کا خطرہ نہیں ہے۔ (د) باقی صنعتیں نجی حلقے میں ہوں گی لیکن عام سرکاری نگرانی کے تحت رہیں گی۔

(۲) قومی معیشت میں چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کو نمایاں رول ادا کرنا ہے۔ جہاں تک ممکن ہوگا انھیں کوآپریٹو لائن پر ترقی دی جائے گی اور یہ بڑے پیمانے کی صنعتوں سے مربوط ہوں گی۔

(۳) اچھے صنعتی تعلقات سے صنعتی پیداوار کی رفتار تیز ہوتی ہے چنانچہ حکومت اس بات کی یقین دہانی کرے گی کہ مزدوروں کو منافع کا حصّہ ملے اور اُنھیں اُن تمام معاملات میں شریک کیا جائے جن کا تعلق صنعتی پیداوار سے ہے۔ صنعتی علاقوں میں رہائشی مکانات بنانے کی اسکیموں میں سرکار براہِ راست اور بالواسطہ مدد کرے گی۔ سرمایہ لگانے والوں کو مناسب معاوضے کی یقین دہانی ہوگی۔

۱۹۴۸ء کی پالیسی کا تجزیہ

۱۹۴۸ء کی پالیسی ایسے ماحول میں تشکیل ہوئی جب معاشی منصوبہ بندی چھوٹے حصّوں میں ہو رہی تھی اور اِس بات کی شدید کوشش تھی کہ نجی صنعتی کاروبار کو جلد قومی ملکیت میں لایا جائے۔ غیر پختہ معاشی استدلال نے حکومت کو بنیادی صنعتوں کو قومیانے کی دھمکی دینے پر آمادہ کیا۔ دس سال بعد قومیانے کے خطرے نے سرمایہ داروں کو بدحواس کر دیا۔ نجی سکٹر میں سرمائے کی تشکیل سست پڑ گئی اور بنیادی صنعتوں میں نئی مشینوں اور آلات کا لگنا اور ان کی توسیع ملتوی ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ صنعتی پالیسی کے اعلان کے دو برس کے اندر حکومت کو صاف طور سے یہ واضح کرنا کہ دس برس بعد بھی

موجودہ بنیادی صنعتوں کے سارے یونٹوں کو قومی ملکیت بنانا شاید ممکن نہ ہو۔

۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی کی بنیادی خامی، صنعتی پالیسی کے اعلان کی خامیوں کی وجہ سے اتنی نہیں تھی جتنی پالیسی اور ترقیاتی منصوبہ بندی کے عام طریقے میں تال میل نہ ہونے کی وجہ سے تھی۔ صنعتی پالیسی کی تشکیل کے وقت حکومت ترقیاتی منصوبہ بندی کی ماہیت، اس کے حدود اور طریقوں کے بارے میں کسی قطعی فیصلے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی سے یہ تو معلوم ہو۔ یہ ظاہر ہو گیا کہ صنعتوں کی طرف حکومت کا کیا رویہ ہوگا لیکن حکومت کے صنعتی پروگرام اور معاشی ترقی سے اس کا تعلق موثر اور واضح طریقے سے سامنے نہیں آیا۔

بہرحال ۱۹۵۶ء کی پالیسی کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس کے ذریعے کھلی اور منضبط معیشت کے لیے زمین ہموار کرنے کی پُر خلوص کوشش کی گئی جس میں نجی اور سرکاری کاروبار کے حلقے واضح طور سے متعین کیے گئے ہیں۔ ہمارے پانچ سالہ منصوبوں کے صنعتی پروگرام کی تشکیل میں مخلوط معیشت کی ہی بنیاد پر کی گئی ہے۔

پانچ سالہ پلان اور ۱۹۵۱ء کا انڈسٹریز ڈیولپمنٹ اینڈ ریگولیشن ایکٹ

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ پہلے پلان میں زراعت اور آب پاشی کو ترجیح دی گئی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صنعت کو بالکل نظرانداز کیا گیا۔ پہلے پلان میں صنعت اور کان کنی کے لیے ۱۷۹ کروڑ خرچ کا اندازہ کیا گیا تھا جس میں سے ۱۰۰ کروڑ واقعی صرف ہوئے۔ پہلے پلان کے دوران حکومت کی صنعتی پالیسی کو پلان کے صنعتی نشانوں سے مربوط کیا گیا۔

ترقیاتی منصوبہ بندی کے دوران نجی صنعت کی منضبط توسیع کے لیے ۱۹۵۱ء کا انڈسٹریز ایکٹ پاس کیا گیا۔ ۸ رمئی ۱۹۵۲ء کو اس ایکٹ کا نفاذ ہوا۔ مئی ۱۹۵۳ء میں اس کی ترمیم ہوئی تاکہ اس کے حدود میں توسیع ہو سکے یکم اپریل ۱۹۵۳ء سے ۴۵ صنعتیں اس کے دائرۂ عمل میں لے آئی گئیں۔ ۱۹۵۱ء کے ایکٹ کی خاص دفعات یہ ہیں:

(۱) یہ ایکٹ پرائیویٹ کاروبار کو منضبط کرنے اور اس پر کنٹرول رکھنے کے لیے حکومت کو مزید اختیارات دیتا ہے۔ حکومت کو اختیار ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً نجی کاروبار کے کاموں کی چھان بین کر سکے۔ کام تشفی بخش نہ ہونے کی صورت میں حکومت کسی انڈسٹریل یونٹ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔

(۲) موجودہ صنعتی کاروباروں کو رجسٹر ہونا ہے اور نئے کاروبار سرکار سے لائسنس حاصل کرے

کے بعد شروع ہو سکتے ہیں۔ لائسنس دینے کے طریقے سے فائدہ یہ ہوگا کہ حکومت شرائط عائد کر سکے گی کہ یہ کاروبار کہاں شروع ہو اور اُس کا کم سے کم سائز کیا ہو۔ اس سے نجی سکٹر میں صنعتوں کی ترقی منصوبے کے مطابق ہو سکے گی۔

(۱) صنعتوں کے لیے سنٹرل ایڈوائزری کونسل قائم ہوگی جو صنعتوں کے مسائل اور رجسٹریشن اور لائسنسنگ کے خصوصی مسائل پر غور کر سکے گی۔ ہر اہم صنعتی گروپ کے لیے ایک ترقیاتی کونسل بنائی جائے گی۔ اس کونسل میں آجروں، مزدوروں اور ماہروں کی نمائندگی ہوگی۔ کونسل پیداآوری، خدمت کی قسم اور انتظام کو بہتر کرنے کے مشورے دے گی اور پانچ سالہ منصوبوں میں نجی صنعتی نشانوں کو پورا کرنے کی بالواسطہ کوشش کرے گی۔

۱۹۵۱ء کے ایکٹ کا جائزہ

۱۹۵۲ء سے سنٹرل ایڈوائزری کونسل، لائسنسنگ کمیٹی اور کئی ترقیاتی کونسلیں کام کر رہی ہیں۔ ابھی چند دنوں پہلے تک مرکزی مشاورتی کونسل کا جلسہ وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا تھا جس میں صنعتی ترقی کی رفتار تیز کرنے کے سلسلے میں صرف بحث ہوتی تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر مشاورتی کونسل کے بجائے صنعتوں کے لیے ایک کنٹرول بورڈ قائم کر دیا جاتا تو شاید بہتر نتائج برآمد ہوتے اور نجی سکٹر میں صنعتی ترقی کی رفتار تیز ہو جاتی۔

لائسنسنگ کمیٹی کے قیام کے ساتھ ہی اس میں ضابطہ پرستی اور بے جا پاسداری داخل ہو گئی۔ سنٹرل ایڈوائزری کونسل کو لائسنسنگ کمیٹی کے طریقۂ کار کی چھان بین کرنے کے لیے مخصوص افسروں یا ایک مخصوص کمیٹی کا تقرر کرنا چاہیے۔ رجسٹریشن اور لائسنسنگ کا جائزہ لیتے وقت مرکزی مشاورتی کونسل کو تفصیل کے ساتھ یہ دیکھنا چاہیے کہ کن بنیادوں پر لائسنس دیے گئے یا کن بنیادوں پر لائسنس دینے سے انکار کیا گیا۔

ترقیاتی کونسل کا کام ٹھیک چل رہا ہے اور اُن کی وجہ سے پیداوار اور انتظام کے میدان میں بڑی مدد ملی ہے۔ ہماری رائے ہے کہ زراعتی منصوبے میں دیہی ترقیاتی کونسلوں کو صنعتی منصوبہ بندی کے ستون کا کام انجام دینا چاہیے۔

دوسرا پانچ سالہ منصوبہ اور ۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی

سوشلسٹ طرز کے سماج کو قومی مقصد بنانے کی وجہ سے اور دوسرے پلان میں تیز صنعتی پروگرام

کی وجہ سے ضروری تھا کہ منصوبہ بند ترقی کے تحت ایک مثبت اور واضح پالیسی بنائی جائے۔ دوسرے پلان میں چوں کہ بھاری صنعتوں کی ترقی پر مخصوص زور تھا اس لیے صنعتی ترقی اور کان کنی کی مد میں ۸۹۰ کروڑ کے خرچ کا اندازہ کیا گیا۔ اس پُر عزم صنعتی پروگرام کے پیشِ نظر ۱۹۴۸ء کی صنعتی پالیسی کے ریزولوشن کو نیا رُخ دینے اور نئی شکل دینے کی فوری ضرورت تھی۔ چنانچہ دوسرے پلان کے شروع ہوتے ہی حکومت کی پالیسی کا اعلان کیا گیا۔ ذیل میں ہم اُس نئی صنعتی پالیسی کے نمایاں خدوخال پیش کرتے ہیں جس کا اعلان ۳۰ اپریل ۱۹۵۶ء کو کیا گیا۔

(۱) پہلے تو وہ صنعتیں ہیں جن کی آئندہ ترقی خالص ریاست کی ذمہ داری ہوگی۔ اس گروپ میں ۱۷ بڑی صنعتیں ہیں مثلاً اسلحہ اور گولا بارود، ایٹمی قوت، لوہا اور فولاد، کوئلہ، مرل آئل، ہوائی جہاز کی صنعت، ہوائی اور ریل کے ذریعے نقل و حمل، پانی کے جہازوں کی صنعت، ٹیلی فون اور تار اور بجلی کی پیدائش اور اُس کی تقسیم۔ درحقیقت نئی صنعتی پالیسی کے پہلے گروپ کی صنعتیں وہی ہیں جو ۱۹۴۸ء کی صنعتی پالیسی کے رزولیوشن میں بنیادی اور فوجی اہمیت کی صنعتوں کی فہرست میں تھیں۔ بنیادی اور فوجی اہمیت کی صنعتوں کا یہ اختلاط ضروری تھا کیوں کہ منصوبوں کے دوران امید کی جاتی تھی کہ ریاست اور زیادہ صنعتوں کی ترقی کی براہِ راست ذمہ داری سنبھالے گی۔ ۱۹۴۸ء کی پالیسی کے برعکس ۱۹۵۶ء کے انڈسٹریل پالیسی رزولیوشن میں پہلے گروپ کی صنعتوں کے موجودہ پرائیویٹ یونٹوں کو قومی ملکیت بنانے کی دھمکی نہیں دی گئی ہے۔ اس کی وجہ سے توقع ہے کہ موجودہ نجی صنعتیں پھیل سکیں گی اور نئے سرکاری یونٹوں کے ساتھ مل کر کام کریں گی۔

دوسری فہرست میں بارہ صنعتیں ہیں جو بتدریج قومی ملکیت میں لائی جائیں گی۔ ان کے نئے یونٹوں کے قیام میں سرکار پہل کرے گی لیکن نجی حلقے سے توقع ہے کہ وہ اس کام میں حکومت کا ہاتھ بٹائے گی۔ اس گروپ کی صنعتوں میں سے اہم یہ ہیں: المونیم، فیرو الائے (FERRO ALLOY)، اینٹی بیاٹکس، فرٹی لائزر (FERTILIZER) کیمیاوی ربڑ، کیمیکل پلپ، سڑک اور سمندری نقل و حمل۔ اس گروپ کی صنعتوں میں نجی اور سرکاری حلقوں کا تعاون نمایاں طور سے واضح ہے۔ اس گروپ کی صنعتوں کے نئے یونٹ حکومت بتدریج زیادہ قائم کرے گی لیکن نجی کاروبار کو بھی اس میدان میں خود یا حکومت کی مدد سے ترقی کرنے کا موقع ملے گا۔ اس طرح اس گروپ میں مخلوط معیشت کا نظریہ بھی مضبوطی سے قائم ہے اور دونوں حلقوں کی بہ یک وقت ترقی پر زور دیا گیا ہے۔ اس گروپ کی بیشتر صنعتیں ترقیاتی منصوبہ بندی کے لیے بنیادی اہمیت کی ہیں اس لیے

ریاست نے بجا طور پر اُن کے نئے یونٹوں کے قیام کی ذمّہ داری اپنے اوپر لی ہے، خاص کر ایسی صورت میں جب نجی کاروبار، جو زیادہ سے زیادہ نفع کمانا چاہتا ہے، اِس بوجھ کو اُٹھانے کے لیے تیار نہ ہو۔

(۳) تیسری فہرست میں باقی صنعتیں ہیں جن کی آیندہ ترقی کو نجی حلقے کی پیش قدمی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ۱۹۵۶ء کے ریزولیوشن کی تیسری فہرست کا موازنہ ۱۹۴۸ء کے ریزولیوشن کی چوتھی فہرست سے کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۸ء کے پالسی ریزولیوشن میں سرکاری امداد اور بقیہ صنعتوں کے کنٹرول اور ضابطے کے بنیادی خدوخال ظاہر کیے گئے تھے۔ لیکن ۱۹۵۶ء کے ریزولیوشن میں نہ صرف ضابطوں اور نگرانی کے معاملے میں ریاستی عمل کے خدوخال ظاہر کیے گئے ہیں بلکہ اِس کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ بقیہ صنعتوں کی مالی اور دوسری امداد کے لیے ریاست کیا انتظام کرے گی۔ منصوبہ بند معاشی ترقی کے پیشِ نظر بقیہ صنعتوں کی متوازن ترقی اور توسیع کے معاملے میں ۱۹۵۶ء کا ریزولیوشن ایک قدم آگے ہے جس میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ ریاست کو اختیار رہے گا کہ اگر وہ مفادِ عامّہ اور پلان کی کامیابی کے پیشِ نظر ضروری سمجھے تو اِن صنعتوں کے نئے یونٹ خود شروع کر سکتی ہے۔ اِس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اِس گروپ کی صنعتوں کے معاملے میں عام طور سے نجی اور سرکاری حلقوں کا تعاون پیشِ نظر ہے۔ نجی صنعتوں کی ترقی کے لیے ریاست مناسب مالیاتی پالسی اختیار کرے گی اور مالی امداد فراہم کرے گی۔ اِس کے عوض نجی سکٹر پلان کے پروگرام کی تعمیل کرے گا اور ۱۹۵۱ء کے انڈسٹریز ایکٹ کے تحت صنعتوں پر جو پابندیاں عائد کی جائیں گی اُنھیں قبول کرے گا۔

(ب) مندرجہ بالا درجوں میں صنعتوں کی تقسیم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ سختی سے الگ الگ خانوں میں رکھ دی گئی ہیں اور اُن میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ مخصوص حالات میں اِس عام اصول سے استثنا ممکن ہے اور ترقیاتی منصوبہ بندی کے دوران صنعتیں ایک خانے سے دوسرے خانے میں بھی ہو سکتی ہیں اور نجی اور سرکاری حلقوں کی صنعتیں ایک دوسرے سے منسلک کی جا سکتی ہیں۔ ۱۹۵۶ء کے ریزولیوشن کو ۱۹۴۸ء کے ریزولیوشن پر یہی فوقیت حاصل ہو سکتی ہے جو اس لوچ دار ترقیاتی منصوبہ بندی کے لیے خاص کر مفید ہے۔ جو بدلتے ہوئے حالات میں آیندہ ضروری ہو سکتی ہے۔

(ج) قومی معیشت کی ترقی میں چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کے رول کا ۱۹۵۶ء کے پالسی ریزولیوشن میں خاص طور سے ذکر ہے۔ فوری طور سے روزگار فراہم کرنے، قومی آمدنی کی زیادہ منصفانہ تقسیم اور سرمائے

ور مہارت کے بے استعمال وسائل کو حرکت میں لانے کے لیے اِن صنعتوں کی موزونیت پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔ ۱۹۵۶ء کے ریزولیوشن کا مسودہ تیار کرتے وقت حکومت نے نہ صرف اُس رول کو سراہا جو ۱۹۴۸ء کے ریزولیوشن نے چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کے لیے متعین کیا تھا بلکہ ان صنعتوں میں مقابلے کی قوت کو بڑھانے کے اقدام پر بھی متوجہ۔ حکومت چھوٹے اور بڑے پیمانے کی صنعتوں میں تال میل پیدا کرنے کا بھی مصمم ارادہ رکھتی ہے۔ چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی طرف یہ مثبت پالیسی دوسرے پلان کی بنیادی حکمتِ عملی کا نتیجہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ صرفی اشیا کی زیادہ رسد کے ساتھ تیز معاشی ترقی کے حصول کے لیے بھاری صنعتوں اور چھوٹی صنعتوں کو بہ یک وقت ترقی دی جائے۔

(د) ریاست ملک کے مختلف علاقوں کی ترقی کے تفاوت کو دور کرنے کی کوشش کرے گی اور اِس مقصد کے پیشِ نظر ملک کے پس ماندہ علاقوں میں بجلی، پانی اور نقل و حمل کی سہولتیں فراہم کرے گی۔ یہ سہولتیں رفتہ رفتہ اُن علاقوں تک پھیلائی جائیں گی جہاں بے روزگاری بڑے پیمانے پر ہے۔ ۱۹۵۶ء کی انڈسٹریل پالیسی ریزولیوشن کا یہ پہلو ہمارے منصوبوں میں مجوزہ متوازن صنعتی ترقی کا براہِ راست لازمی نتیجہ ہے۔

(ہ) ۱۹۵۶ء کے انڈسٹریل پالیسی ریزولیوشن میں یہ بات نوٹ کی گئی ہے کہ صنعتی ترقی کے پروگرام میں مناسب ٹیکنیکل اور انتظامی عملے کی تنظیم کی ضرورت ہوگی۔ اِس کی بھی ضرورت ہوگی کہ کاروباری انتظام اور صنعتی تعلقات کو منضبط کرنے کے لیے تربیتی سہولتوں کی توسیع کی جائے۔ اگر اِن مسائل سے ٹھیک سے نہ نپٹا گیا تو منصوبوں کے ترقیاتی پروگرام کی تعمیل میں بڑی دشواریاں پیدا ہوں گی۔ چنانچہ توقع ہے کہ حکومت اِن مسائل کے حل کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہوگی اور موثر قدم اُٹھائے گی

۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی کا تجزیہ

۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی ہندوستان کے ترقیاتی منصوبہ بندی کے پروگرام کا ایک اہم جزو ہے اور اِس حیثیت سے اُس کو ترقیاتی منصوبہ بندی کے اُس عمل کے رشتے سے زیادہ اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے جو ہندوستان میں پانچ سالہ منصوبوں سے شروع ہوا ہے۔ معاشی ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لیے ترقیاتی منصوبہ بندی ہندوستان جیسے پس ماندہ ملک میں صرف تب ہی کامیاب ہوسکتی ہے جب حکومت خود عمل کے میدان میں سامنے آئے اور متوازن ترقی کا عمل شروع کرنے کی ذمہ داری لے۔ ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ نیا سرمایہ برابر لگتا رہے تاکہ سرمائے کی تشکیل کی رفتار تیز ہو اور نیا سرمایہ لگنے کی رفتار بتدریج تیز تر ہوتی رہے۔ اگر ایک جمہوری نظام میں ترقیاتی منصوبہ بندی کے ذریعے یہ حاصل کرنا ہے تو اِس کا بہترین حل ایک مخلوط معیشت ہے جو پبلک اور پرائیویٹ سکٹر کے تعاون پر مبنی ہو۔ اِس کے

علاوہ پبلک سکٹر کی ترقی سے نجی سکٹر کی سرگرمیوں کو تقویت ملتی ہے مثلاً پبلک سکٹر کے فولاد اور بھاری بجلی کے کارخانوں کی وجہ سے نجی سکٹر میں مختلف ضمنی صنعتیں قائم کرنے کے مواقع پیدا ہوتے ہیں جن میں فولاد استعمال ہوتا ہے اور مشینوں کے پرزے بنتے ہیں۔ اسی لیے ۱۹۵۶ء کے پالسی کے ریزولیوشن میں ایک مخلوط اور منضبط معیشت تصور کی گئی ہے جس میں پبلک اور پرائیویٹ ادارے ترقیاتی منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ ۱۹۵۶ء کے پالسی ریزولیوشن کا سب سے تسلی بخش پہلو یہ ہے کہ اس کی وجہ سے حکومت کی صنعتی پالسی اور پلان کے ترقیاتی پروگراموں میں بہترین ہم وقتی پیدا ہوگئی ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ ۱۹۵۶ء کی صنعتی پالسی دو چیزوں کی تابع ہے، ایک طرف سوشلسٹ طرز کے سماج کا قیام جس کا مقصد مکمل روزگار اور زیادہ پیداوار ہے اور دوسری طرف ہمارے دستور کے ہدایتی اصول جن کا مقصد سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء کے پلان کا اعلان ہوتے ہی نجی سکٹر کے صنعت کاروں نے شدید احتجاج کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ حکومت کے پابندیاں عائد کرنے والے اختیارات کی مضبوطی سے اور قومیانے کی بالواسطہ دھمکیوں کی وجہ سے نجی سکٹر کے لیے کوئی محرّک نہیں رہے گا اور سرمائے کی تشکیل ٹھپ پڑ جائے گی۔ نجی صنعت کار عام طور سے گھبرا گئے اگرچہ ۱۹۵۶ء کے پالسی ریزولیوشن کا مقصد موجودہ یونٹوں کو قومیانا نہیں تھا بلکہ اُس کے برعکس اِن کی ترقی کے لیے اقدام تجویز کیے گئے تھے۔ یوں تو ریاست کسی بھی شعبے میں داخل ہوسکتی ہے لیکن یہ بات تسلیم کی گئی تھی کہ نجی سکٹر بھی منصوبہ بند ترقی کی ایک ایجنسی تھا۔ ۱۹۵۶ء کی پالسی کوئی غیر متوقع بلائے آسمانی نہیں تھی۔ یہ معاشی فلسفے اور دوسرے پلان کے حوصلہ مند صنعتی پروگرام کی تعمیل کی ایک شاخ تھی۔ نجی صنعت کاروں کو نئے حالات اور نئی حکومت سے مطابقت پیدا کرنا چاہیے۔ تابع سرمایہ داری اور مرکزی منصوبہ بندی کے اِس دور میں پابندیاں عائد کرنے کے سرکاری اختیارات بہرحال بڑھیں گے۔ ہندوستان میں یہ عمل شروع ہو چکا ہے اور آئندہ کافی مدت تک جاری رہے گا۔ اِس لیے نجی سکٹر کو اِس رول کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے جو ۱۹۵۶ء کی پالسی میں ان کے لیے متعین کیا گیا ہے اور حکومت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی حکومت کو چاہیے کہ وہ نجی حلقے کے لیے محرّک فراہم کرے اور اُن کی ہر ممکن مدد کرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی آئندہ پالسی کی تشکیل پر نجی سکٹر کی حال کی کارگزاری کا گہرا اثر پڑے گا۔ لیکن ساتھ ہی حکومت کو یاد رکھنا چاہیے کہ بہتر کارگزاری بہتر مواقع فراہم کرنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔

تیسرے پلان کے دوران صنعتی پالسی

چینی اور پاکستانی حملوں سے پیدا شدہ غیر معمولی حالات میں یہ ناگزیر ہوگیا کہ دفاعی اور ترقیاتی ضروریات

تیسرے پلان میں بہ یک وقت پوری کی جائیں۔ ایسی مشینیں بنانے کی استعداد جو فوری اور دور رسانی ضرورت کے آلات تیار کر سکیں دفاعی ترقیاتی پروگرام کے لیے زیادہ ضروری ہوتی ہے۔ اس نظریے کے مطابق یہ ضروری تھا کہ بھاری بنیادی صنعتوں کے قیام پر زور دیا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بھارت ٹکنیکل عملہ اور ڈیزائن تیار کرنے کی استعداد حاصل کی جائے تاکہ بجلی، نقل و حمل، صنعت اور معدنی پیداوار کے میدان میں معیشت میں خود ترقی کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

بہر حال تیسرے پلان کے دوران صنعتی توسیع بنیادی طور سے ۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی ریزولیوشن کے تابع رہی۔ دوسرے پلان کی طرح تیسرے پلان میں بھی پبلک اور پرائیویٹ سکٹروں کو ایک دوسرے کا مددگار یا تکملہ تصور کیا جاتا رہا۔ مثلاً نائٹروجن فرٹی لائزر کو لیجیے۔ اس میدان میں پبلک سکٹر کو پہلے ہی نمایاں حیثیت حاصل تھی لیکن سوچا جا رہا ہے کہ چوتھے پلان میں نجی سکٹر اس میدان میں پہلے سے زیادہ بڑے پیمانے پر شریک ہو اور اس طرح پبلک سکٹر کی کوششوں میں مزید اضافہ کرے۔ جہاں تک پبلک سکٹر اور پرائیویٹ سکٹر میں آئندہ ترقی کا سوال ہے، مستقبل میں ایسے پروجیکٹوں پر زور دینا ہوگا جو برآمدات میں مدد کریں اور بیرونی زرِ مبادلہ کمائیں یا درآمدات کو کم کر کے زرِ مبادلہ بچائیں۔

حکومت کی مالیاتی پالیسی

ایک کم ترقی یافتہ ملک میں صنعتوں کی ترقی ابتدائی مراحل میں مناسب مالیاتی پالیسی یا صنعتوں کو تحفظ دینے کی پالیسی کے ذریعے عمل میں آتی ہے۔ مالیاتی پالیسی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ باہر کی بنی چیزیں دیسی چیزوں کے مقابلے میں مہنگی ہوں۔ اس کے لیے یا تو بیرونی اشیا پر امپورٹ ڈیوٹی لگائی جاتی ہے یا دیسی صنعتوں کو مالی امداد دی جاتی ہے۔

امتیازی تحفظ کی پرانی پالیسی: برطانوی عہد میں ہندوستانی صنعت کی ترقی کے لیے مناسب مالیاتی پالیسی تجویز کرنے کے لیے انڈین فسکل کمیشن (۲۲-۱۹۲۱ء) مقرر کیا گیا تھا۔ اس کمیشن نے سفارش کی کہ صرف مستحق صنعتوں کو تحفظ دیا جائے۔ کمیشن ایسے امتیازی تحفظ کا حامی تھا جو شہری فارمولے پر مبنی ہو۔ وہ فارمولا یہ تھا: (الف) صنعت ایسی ہو جس کو قدرتی فوقیت حاصل ہو مثلاً خام مال کی افراط سستی پاور، مزدوروں کی کافی رسد اور بڑا مقامی بازار۔ (ب) صنعت ایسی ہو جو تحفظ کے بغیر اس طرح نہ ترقی کر سکتی ہو جو ملک کے مفاد کا تقاضا ہو (ج) صنعت ایسی ہو جو آگے چل کر تحفظ کے بغیر بیرونی مقابلے کا سامنا کر سکے۔ اس فارمولے کی شرائط اتنی کڑی تھیں کہ بیشتر نئی صنعتوں کے لیے ان کا پورا کرنا مشکل تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ اِن کڑی شرائط کے بجائے کرنا یہ چاہیے تھا کہ وقتاً فوقتاً مقرر کیے جانے والے ایڈ ہاک ٹارف بورڈوں کو خصوصی اختیارات دے دیے جاتے کہ وہ عام لچک دار قاعدوں کے مطابق کسی صنعت کو تحفظ دے سکیں۔ فسکل کمیشن کی شروع کردہ امتیازی تحفظ کی پالسی کا بنیادی عیب اس کی عمومی ماہیت میں تھا۔ پالسی کی تشکیل اس حیثیت سے نہیں کی گئی تھی کہ یہ ملک کی معاشی ترقی کا ضروری آلۂ کار ہوگی۔ وسیع ہونے کے بجائے اس کا نظریہ تنگ اور چند مخصوص صنعتوں کو بیرونی مقابلے سے بچانے کے لیے تحفظ دینے کے مسائل تک محدود تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس فارمولے کی کڑی شرائط اور انتظامی تاخیر کی وجہ سے صرف چند صنعتیں تحفظ حاصل کر سکیں۔ ان میں لوہے، فولاد، روئی، کپڑے، شکر، کاغذ پیپر پلپ اور دیاسلائی کی صنعتیں شامل ہیں۔ بہت سی مستحق بنیادی صنعتوں کے مطالبے کو ان ایڈ ہاک قسم کے ٹیرف بورڈوں نے منظور کر دیا جنھیں حکومت وقتاً فوقتاً مقرر کرتی رہتی تھی۔ غرضے کہ پہلے فسکل کمیشن کی تجویز کردہ اور ایڈ ہاک ٹارف بورڈوں کی تعمیل کردہ امتیازی تحفظ کی پالسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی صنعتوں کی ترقی ناہموار رہی۔

مالیاتی پالسی جو برطانوی عہد میں شروع کی گئی تھی، متوازن صنعتی ترقی نہیں لا سکتی تھی۔ امتیازی تحفظ کی پالسی سے بیشتر فائدہ اُن صنعتوں کو ہوا جو صَرفی اشیا تیار کرتی تھیں۔ بھاری صنعتوں کو بالکل نظر انداز کیا گیا اور اس طرح تیز اور کشادہ بنیاد پر متوازن ترقی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا:

دوسری فسکل کمیشن ۱۹۴۹ء کی سفارشات اور نئی مالیاتی پالسی

آزادی کے ساتھ قومی حکومت نے محسوس کیا کہ اس سے قبل کہ صنعتی ترقی کسی منصوبے کے تحت شروع کی جاسکے یہ ضروری تھا کہ اس امتیازی مالیاتی پالسی کو نئی شکل دی جائے جو دفاعی اور بنیادی صنعتوں کی متوازن ترقی عمل میں لانے کے لیے ناموزوں تھی۔ چنانچہ شری وی۔ کے کرشنما چاری کی صدارت میں ۱۹۴۹ء میں ایک نیا فسکل کمیشن مقرر کیا گیا جس نے ۱۹۵۰ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس کمیشن نے صنعتوں کی متوازن ترقی کے پیشِ نظر ہندوستان کی مالیاتی پالسی کو نیا رُخ دیا۔ نئی فسکل پالسی کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں:

(الف) دوسرے فسکل کمیشن کا تحفظ کا نظریہ بہت زیادہ وسیع تھا۔ اُس نے تحفظ کے اُفق کو کشادہ کیا اور پہلے فسکل کمیشن کی امتیازی تحفظ کی پالسی کے بجائے ترقیاتی تحفظ کی پالسی کی حمایت کی۔ کرشنما چاری کمیشن نے عام معاشی ترقی کے پروگرام میں بنیادی صنعتوں کے اہم رول پر زور دیا اور احتیاط

کے ساتھ ایک ایسی مالیاتی پالسی بنائی جو معمولی رد و بدل سے منصوبہ بند معاشی ترقی کی اسکیم میں آسانی سے فٹ ہوسکتی تھی۔ اِس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ صنعتی ترقی اور تحفظ کے نظریے کے بارے میں دوسرے فسکل کمیشن کا رویّہ زیادہ ترقی پسندانہ تھا اور پہلے فسکل کمیشن کی اُن خامیوں کو دور کرتا تھا جن کی وجہ سے کافی نقصان ہوا تھا اور ملک کی صنعتی ترقی ناہموار ہوگئی تھی۔

(ب) کرشنما چاری کمیشن نے تہرے فارمولے کی سختی پر اعتراض کیا اور اِس بات پر زور دیا کہ صنعتوں کو تحفظ دیتے وقت صرف قومی مفاد سامنے ہونا چاہیے۔ اِس کمیشن نے خاص طور سے کچھ عام اصول مرتب کیے جن کے مطابق ٹارف کمیشن کو کام کرنا تھا۔ وہ اصول یہ تھے:

(۱) اگر کسی صنعت کے پاس اندرونی منڈی اور مزدوروں کی رسد موجود ہے تو صرف اس بنیاد پر تحفظ دینے سے انکار نہ کرنا چاہیے کہ ملک میں خام مال کی رسد کافی نہیں ہے۔

(۲) صرف یہی نہ دیکھنا چاہیے کہ اِس صنعت کے لیے اندرونی بازار ہے بلکہ یہ بھی کہ اس کی پیداوار کے برآمد کیے جانے کے کیا امکانات ہیں۔

(۳) محفوظ صنعت سے یہ توقع نہ کرنی چاہیے کہ وہ اندرونی مارکٹ کی تمام ضروریات پوری کرے گی۔

(۴) بھاری صنعتوں کا، جنھیں زیادہ سرمائے کی ضرورت ہے، خاص لحاظ کرنا چاہیے اور جہاں تک ممکن ہو انھیں تحفّظ دینا چاہیے۔

(۵) جو صنعتیں محفوظ صنعتوں کی پیداوار استعمال کرتی ہوں انھیں تلافی کُن تحفظ دیا جاسکتا ہے۔

(۶) دورانِ تحفّظ صنعتوں پر اکسائز ڈیوٹی نہیں لادنی چاہیے۔

(۷) اگر قومی مفاد میں ضروری ہو تو زراعتی پیداوار کو بھی تحفظ دیا جاسکتا ہے لیکن تحفظ کی مدت کسی صورت میں پانچ سال سے زیادہ نہ ہونی چاہیے۔

اِن عام اصولوں کے ذریعے برطانوی عہد کی امتیازی مالیاتی پالسی کی کمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے فسکل کمیشن نے جو اصول مرتب کیے ہیں اُن سے ٹارف بورڈ کو جو ایک مستقل ادارہ ہوگا، کافی اختیارات ملتے ہیں تاکہ وہ ہر صنعت کے تحفظ کے مطالبے کا فیصلہ قومی مفاد اور ترقیاتی منصوبہ بندی کی ضروریات کے پیش نظر کرسکے۔

(ج) جس وقت کرشنما چاری کمیشن مقرر ہوا تھا اُس وقت تک اگرچہ ترقیاتی منصوبہ بندی نہیں شروع ہوئی تھی لیکن سفارشات اِس نوع کی ہیں کہ اِس سے ترقیاتی منصوبہ بندی کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ منصوبہ بند سکٹر کی صنعتوں کو تین زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے: (۱) دفاعی اور جنگی اہمیت کی

صنعتیں پہلے زمرے میں رکھی گئیں۔ اِن صنعتوں کی ترقی ہماری نئی حاصل کی ہوئی آزادی کے لیے ضروری سمجھی گئیں اس لیے اس بات پر زور دیا گیا۔ ان صنعتوں کو تحفظ دیا جائے چاہے اس کی قیمت کچھ بھی ادا کرنی پڑے۔

(۲) بنیادی اور کلیدی صنعتیں دوسرے زمرے میں رکھی گئیں۔ ٹارف کمیشن کو فیصلہ کرنا ہے کہ ان کو کس حد تک تحفظ دیا جائے اور اس کی کیا شرائط ہوں۔ کمیشن کو اِن صنعتوں کی ترقی کی وقتاً فوقتاً جانچ بھی کرتے رہنا چاہیے۔ کوئی ایسی کڑی شرطیں نہیں رکھی گئی ہیں جن سے اِن صنعتوں کو تحفظ دینے کے کمیشن کے اختیارات پر کوئی پابندی عائد ہوتی ہو۔

(۳) بقیہ صنعتیں تیسرے زمرے میں رکھی گئی ہیں۔ اِن صنعتوں کے لیے ٹارف کمیشن کو فیصلہ کرنا ہے کہ انھیں تحفظ دیا جائے یا نہیں۔ کمیشن جو بھی فیصلہ کرے گا اُس میں اِن باتوں کا خیال رکھے گا کہ اُس صنعت کو کیا معاشی قوت حاصل ہے، اس کو تحفظ دینے کی کیا قیمت ہوگی اور قومی مفاد میں اس کی کیا اہمیت ہے۔

تین زمروں میں صنعتوں کی اِس تقسیم کا مقابلہ ۱۹۵۶ء کی صنعتی پالسی کے تین زمروں سے کیا جا سکتا ہے۔ پہلے پلان کے دوران صنعتی منصوبہ بندی کے تجربات سے حکومت پر یہ بات واضح ہو گئی کہ تحفظ کے باوجود اُن بنیادی اور کلیدی صنعتوں کی تیز ترقی ممکن نہ ہو جو نجی سکٹر میں ہیں۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء کی پالسی میں کچھ بنیادی صنعتوں کو جنگی اہمیت رکھنے والی صنعتوں کے ساتھ منسلک کر دیا گیا اور ریاست کو اُن کی ترقی کا واحد ذمہ دار بنا دیا گیا۔ دوسرے دو زمروں کی صنعتیں جن میں بقیہ بنیادی صنعتیں اور باقی ماندہ دوسری صنعتیں تھیں۔ انھیں اگر قومی مفاد کے تحت ضروری سمجھا گیا تو تحفظ دیا جائے گا اور ریاست ان کی ہر ممکن مدد کرے گی بشرطے کہ یہ عائد کردہ پابندیوں کی تعمیل کریں۔

(د) کرشنما چاری کمیشن نے یہ بھی تجویز کیا کہ تحفظی ڈیوٹی سے حاصل شدہ آمدنی سے ایک ترقیاتی فنڈ قائم کیا جائے۔ اِس فنڈ میں سے ضرورت مند اور مستحق صنعتوں کو امداد دی جا سکتی ہے۔ بعض حالات میں تحفظ کے مقابلے میں مالی امداد دینا قابلِ ترجیح ہوگا۔ ہماری رائے ہے کہ دوسرے فسکل کمیشن کے تجویز کردہ ترقیاتی فنڈ کے بجائے ہر زمرے کے لیے ایک فنڈ ہونا چاہیے جس کو اِس صنعت کی ترقیاتی کونسل سے منسلک کر دینا چاہیے۔ اِس میں شک نہیں کہ اِس ذمہ داری کی وجہ سے ترقیاتی کونسل پر بوجھ بڑھ جائے گا لیکن اِس کی وجہ سے نجی کاروبار کی ترقی اور توسیع کے لیے مناسب ماحول پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔

(۱۷) دوسرے فسکل کمیشن نے ایک مستقل ٹیرف کمیشن کا قیام تجویز کیا ہے جس کی حیثیت قانونی ہوگی اور جو نئی فسکل پالیسی کی تعمیل کی ایجنسی کی حیثیت سے کام کرے گا۔ یہ صورت یقیناً اُن ایڈ ہاک بورڈوں سے بہتر ہوگی جو امتیازی تحفظ کی پالسی کی تعمیل کے لیے بنائے گئے تھے۔ ہر بار جب کوئی صنعت تحفظ کی درخواست دیتی تھی تو اُس کے لیے ایڈ ہاک بورڈ قائم کیے جاتے تھے جو فیصلہ کرنے کے بعد ختم ہو جاتے تھے۔ اِس طریقۂ کار کی وجہ سے تحفظ یافتہ صنعتوں کے کاموں کی نہ میعادی جانچ کی جا سکتی تھی اور نہ تحفظ دینے کے بعد اُس کی ترقی کے لیے مناسب اقدام کیے جا سکتے تھے۔ اِس خامی کو دور کرنے کے لیے کرشنما چاری کمیشن نے ایک مستقل ادارے کا قیام تجویز کیا جس کا کام صرف یہی نہیں تھا کہ یہ تحفظ دینے کے بارے میں فیصلہ کرے بلکہ یہ بھی کہ تحفظ یافتہ صنعتوں کے کاموں کی باقاعدہ جانچ کرتا رہے اور تحفظی ڈیوٹی میں کمی بیشی تجویز کرتا رہے۔

کرشنما چاری کمیشن نے یہ بھی تجویز کیا کہ اِس مستقل ٹیرف کمیشن کا عملہ بھی مستقل ہو اور اِس میں معاشی تحقیق کے لیے مکمل عملہ بھی شامل ہو۔

کمیشن نے یہ بھی سفارش کی کہ تحفظ سے متعلق ٹارف کمیشن جو رپورٹ دے اُس پر حکومت جلد فیصلہ کرے اور معمولاً اس فیصلے میں دو ماہ سے زیادہ نہ لگنے چاہئیں۔ دوسرے فسکل کمیشن نے جلد فیصلے پر خاص طور سے اس لیے زور دیا کہ پہلے حکومت فیصلہ کرنے میں جتنی تاخیر کرتی تھی اُس سے نئے صنعتی کاروباروں کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

یہ بات اطمینان بخش ہے کہ حکومت نے کرشنما چاری کمیشن کے نئے نظریوں اور تحفظ کے نئے اُصولوں کو پسند کیا اور کمیشن کی تقریباً ساری سفارشات منظور کیں۔ نئی فسکل پالسی کی تعمیل کے لیے حکومت نے جنوری ۵۲ء میں ایک مستقل ٹیرف کمیشن مقرر کر دیا۔ اِس کمیشن کو وسیع اختیارات دیے گئے۔ کمیشن کے پچھلے سولہ برسوں کے کام کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اِس نے اپنے معینہ فرائض کامیابی سے انجام دیے۔ اِس موقع پر یہ بھی ذکر کر دینا چاہیے کہ ٹیرف کمیشن کے کام کا جائزہ لینے کے لیے جو کمیٹی ڈی۔ کے۔ آر۔ وی راؤ کی صدارت میں بنائی گئی تھی اُس نے اپنی رپورٹ ۳۱؍ اگست ۶۸ء کو حکومت کے سامنے پیش کر دی جو زیرِ غور ہے۔

بعض صنعتیں جو جنگ کے بعد بڑھی تھیں اور جنھیں تحفظ دیا گیا تھا، انھوں نے تحفظ کے سائے میں اچھی ترقی کی۔ اِن صنعتوں کا تحفظ پانچ سے لے کر دس برس کی قلیل مدت میں ختم کر دیا گیا۔ بیشتر یہ اُس وقت کیا گیا جب اِس بات کا یقین کر لیا گیا کہ صنعتی ترقی کے بدلے ہوئے

حالات میں برآمدات پر ڈیوٹی کی موجودہ سطح دیسی پیداوار کی زائد لاگت کی دشواری کی نفی کرنے کے لیے کافی ہے۔ جن صنعتوں کو اب بھی تحفظ حاصل ہے وہ ہیں الونیم، اینٹی مونی، سوتی کپڑے، مشینری، رنگ، پسٹنوں کو جوڑ کر بنانا، پلاسٹک کے ڈھلے ہوئے بٹن اور سیری کلچر (SERICULTURE)۔ حقیقت ہے کہ موجودہ ٹیرف کے کام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ماضی کے ایڈ ہاک بورڈ سے بہت بہتر ہے۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ پچھلے گیارہ برس کے تجربے کے بعد ہندوستانی ٹیرف کمیشن ہماری مالیاتی پالیسی کو اس طرح عمل میں لائے گا کہ یہ ہماری صنعتوں کی تیز اور متوازن ترقی کا آلۂ کار بن جائے گی۔

ہندوستان کی ترقیاتی منصوبہ بندی کے دوران بیرونی سرمائے کا رول

برطانوی عہد میں کان کنی، باغات، ریلوے، نہریں اور جہاز رانی وغیرہ کی ترقی میں بیرونی سرمائے کا رول بہت بڑا رہا ہے۔ لیکن بیرونی سرمایہ کبھی بھی ملک کی ایسی معاشی ترقی میں نہیں لگا جو متوازن صنعتی پروگرام پر مبنی رہی ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی معیشت ناہموار ترقی کی شکار رہی جس کی وجہ سے معاشی ترقی میں رکاوٹ رہی۔

آزادی کے بعد معاشی ترقی کا تیز عمل شروع کرنے کی فوری ضرورت کے پیش نظر اور سرمائے کے اندرونی مسائل کی قلت کو دیکھتے ہوئے ملک کے بہت سے ماہرین معاشیات اور سیاست دانوں نے بیرونی سرمائے کی اہمیت کو محسوس کیا۔ ملک کے باخبر حلقوں نے اس بات کو بہت جلد محسوس کر لیا کہ اگر بیرونی سرمایہ کافی مقدار میں حاصل ہو تو معاشی ترقی کی ایک دی ہوئی شرح حاصل کرنے میں عوام کو نسبتاً کم قربانی دینی پڑے گی لیکن بیرونی سرمائے کی طرف سرکار کا رویہ یہ تھا کہ کسی سیاسی بندش کے بغیر اس کو قبول کرنا چاہیے اور اس طرح استعمال کرنا چاہیے کہ اس ترقیاتی منصوبہ بندی کے خلاف نہ ہو جو ملک کی معاشی ترقی کے لیے کی جا رہی ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ترقیاتی منصوبہ بندی کے ابتدائی مراحل میں مناسب قسم کے بیرونی سرمائے سے کافی فائدہ ہوگا کیونکہ دیسی کاروبار کو اس کا مقابلہ کرنا پڑے گا اور اس کی کارکردگی کی سطح بلند ہوگی۔ بھاری آلات اور تکنکل عملے کی شکل میں بیرونی امداد سے معاشی ترقی کی طرف بڑھنے میں ضرور مدد ملے گی۔ چنانچہ ہندوستان جیسی کم ترقی یافتہ معیشت میں جہاں اندرونی بچت ناکافی ہے۔ بیرونی وسائل اندرونی وسائل میں اضافہ کریں گے اور منصوبہ بند معاشی ترقی میں ممد ہوں گے۔ بیرونی

سرمائے سے متعلق حکومت کی پالیسی دو ایک دوسرے قابلِ لحاظ امور کی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ ایک طرف تو زرِمبادلہ کے بحران کی وجہ سے بیرونی سرمائے کی شدید ضرورت ہے اور دوسری طرف نئے حاصل کیے ہوئے سیاسی اقتدارِ اعلیٰ کا شدید احساس ہے جو زیادہ رعایتیں دینے کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن بیرونی سرمائے پر پابندی عائد کرنے کی شدید خواہش کے ساتھ ساتھ یہ بھی ڈر لگتا ہے کہ بیرونی سرمایہ کہیں ملک سے بالکل نہ چلا جائے۔ چنانچہ حکومت کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ بیرونی سرمائے سے متعلق ایسی پالیسی بنائے جو نہ بیرونی سرمائے کے لیے مضر ہو اور نہ ملک کے لیے۔

ہندوستان میں بیرونی سرمایہ کاری کا نقشہ

صدی کے اِس وسط میں جب کہ ترقیاتی منصوبہ بندی پورے زور پر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی معیشت کے نجی سکٹر میں نجی سرمائے کی نسبت صدی کے آغاز کی نسبت سے زیادہ ہے۔ بیرونی سرمائے سے متعلق سنہ ۱۹۱۱ء کے ہوورڈ (HOWARD) کے تخمینے کے مطابق غالباً بیرونی سرمائے کا ۳۵٪ حصہ نجی سکٹر میں لگا تھا جب کہ ۱۹۵۵ء میں ریزرو بینک کے سروے کے مطابق یہ تناسب ۵۷٪ تھا۔ ریزرو بینک کا تخمینہ ہے کہ کاروبار میں لگے بیرونی سرمائے کی (BOOK VALUE) میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۴۸ء کے ختم پر یہ سرمایہ ۲۵۵٫۶۸ کروڑ تھا جو ۱۹۶۲ء کے آخر میں ۷۳۵٫۶۵ کروڑ ہو گیا۔ اس کے بعد کے اعداد و شمار نہیں ہیں۔ چودہ برس کی نسبتاً قلیل مدت میں تقریباً ۲۰۰٪ کا اضافہ بہت نمایاں اضافہ ہے۔ بیرونی سرمائے کی اِس مجموعی مقدار یعنی ۷۳۵٫۱۵ کروڑ میں سے ۵۶۶٫۴۶ کروڑ کی رقم براہِ راست لگی تھی اور باقی ۱۶۸ کروڑ کی حیثیت (PORTFOLIO INVESTMENT) کی تھی۔

بیرونی سرمائے کا تجزیہ کرنے میں ۱۹۵۵ء میں ریزرو بینک نے پہلی بار براہِ راست لگے ہوئے سرمائے اور (PORTFOLIO INVESTMENT) میں فرق کیا۔ براہِ راست سرمایہ لگنے کا یہ مطلب تھا کہ جس کاروبار میں یہ لگا ہوگا اُس میں اُس کا کنٹرول ہوگا۔ لیکن پورٹ فولیو انوسٹمنٹ کا بیرونی سرمایہ وہ ہے جو بیرونی مارکٹ میں ہندوستانی بانڈ بیچ کر حاصل کیا گیا تھا۔ ریزرو بینک کے سروے نے یہ ظاہر کیا کہ جون ۱۹۴۸ء اور دسمبر ۱۹۵۵ء کے درمیان بیرونی سرمایہ ۱۳۲ کروڑ کے بہ قدر بڑھا۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ اِس اضافے کا ۸۵٪ (یعنی ۱۱۲ کروڑ) براہِ راست لگا ہوا سرمایہ تھا جس کے

ساتھ کنٹرول بھی تھا۔ اِس میں سے ۷۰ کروڑ بیرونی کمپنیوں اور فرموں کی شاخوں نے لگایا تھا اور باقی ۲۴ کروڑ اُن جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں میں تھا جو ہندوستان میں رجسٹر ہوئی تھیں۔

جب ہم حال کے رجحانات کی طرف توجہ کرتے ہیں تو بیرونی سرمائے کے بارے میں ریزرو بینک کے حالیہ سروے کی بنیاد پر ہمیں مندرجہ ذیل تصویر نظر آتی ہے۔ نجی سیکٹر میں مجموعی طور پر بیرونی سرمائے کی آمد ۱۹۵۸ء کے ۲۴.۷ کروڑ کے مقابلے میں ۱۹۵۹ء میں ۱۶.۴ کروڑ تھی۔ اِس تخفیف کی وجہ یہ تھی کہ (الف) اصل کی مد میں کچھ غیر معمولی ادائیگیاں کرنی پڑیں۔ لائف انشیورنس اور سونا نکالنے کی کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لانے کی وجہ سے بیرونی سرمائے کو معاوضے کی رقم ملی جسے وہ ملک سے باہر لے جایا گیا۔ اصل کی مد کی ادائیگی اسی سلسلے کی تھی۔ (ب) وہ کمپنیاں جو بیرونی کنٹرول میں تھیں ان کے منافع میں کمی ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محفوظ فنڈ میں کم روپیہ آیا۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ نجی سیکٹر میں مجموعی طور سے جو بیرونی سرمایہ لگا (اصل کی واپسی اور اثاثے کی قیمت کی تشخیص کے بعد) وہ ۱۹۶۰ء کے دوران ۴۳.۰ کروڑ کی ریکارڈ سطح پر پہنچ گیا۔ یہ ۱۹۵۹ء کے مقابلے میں تقریباً دوگنا تھا۔ ۱۹۶۰ء کی خالص آمدنی میں یہ اضافہ تقریباً سب کا سب بیرونی نجی ذریعے سے ہوا کیونکہ سرکاری ذریعے سے سرمائے کی آمد ۳۴.۵ کروڑ تھی جس میں سے بیشتر پٹرولیم کی صنعت میں لگا۔ اشیا بنانے والی صنعتوں میں بھی سرمائے میں اضافہ ہوا۔ سرکاری ذرائع سے بیرونی سرمائے کی مجموعی آمد ۲۵.۱ کروڑ تھی۔

۱۹۶۲ء کے دوران تجارتی کاروبار میں بیرونی سرمایہ لگتا رہا لیکن اِس کی شرح کچھ گھٹ گئی۔ ۱۹۶۲ء میں مجموعی طور پر سرمائے کی آمد ۳۰.۸ کروڑ تھی جو ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۱ء سے کم تھی۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۶۱ء میں اُن قرضوں کی ادائیگیاں زیادہ ہوئیں جو نجی کاروبار نے سرکاری ذرائع سے حاصل کیے تھے۔ درحقیقت ۱۹۶۱ء کے مقابلے میں ۱۹۶۲ء میں بیرونی نجی سرمائے کی آمد کچھ زیادہ ہی تھی (۲۸.۱ کروڑ کے مقابلے میں ۲۹.۷ کروڑ)۔ ۱۹۶۳-۶۴ء کی خالص آمد ۶۷.۹ کروڑ تھی جو ۱۹۶۲ء سے کافی زیادہ تھی۔ اضافے کا یہ رجحان قائم رکھا گیا اور ۱۹۶۴-۶۵ء میں خالص آمد ۷۷.۷ کروڑ ہو گئی۔

ملکوں کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ۱۹۶۰ء میں سب سے زیادہ سرمایہ برطانیہ نے لگایا۔ ۴۴.۸۷ کروڑ کی خالص آمد میں سے برطانیہ کا حصہ ۲۴.۵ کروڑ یعنی نصف سے زیادہ تھا۔ تقریباً یہ سب نجی سرمایہ تھا۔ سرکاری سرمایہ دو کروڑ سے بھی کم تھا۔ ۱۹۶۰ء میں برطانیہ سے آنے والے کُل سرمائے کا تین چوتھائی یعنی ۲۰ کروڑ پٹرولیم کی صنعت کے حصے میں آیا۔ مال بنانے والی صنعتوں میں ۱۰.۵ کروڑ روپیہ لگا۔ خاص صنعتیں یہ تھیں: کیمیاوی اور متعلقہ صنعتیں، دھات اور دھات سے بنی چیزیں، کھانے پینے کی چیزیں اور

مشینری اور مشینوں کے پرزے۔ امریکہ جو ۱۹۴۸ء میں سب سے آگے تھا ۱۹۵۵ء میں دوسرے نمبر رہا اور اس ملک سے کل آمد ۱۹۴۸ء کے ۴۳۰۴۷ کروڑ کے مقابلے میں ۱۹۵۵ء میں ۲۰۶۵ کروڑ تھی۔

۱۹۵۵ء میں بھی سرمائے کے معاملے میں برطانیہ سب سے آگے رہا۔ ۸۳ کروڑ کی خالص آمد میں سے آدھا برطانیہ سے آیا۔ اس میں نجی اور سرکاری دونوں ذرائع شامل ہیں۔ برطانوی سرمائے کی لاگت ۱۹۴۸ء میں ۲۰۶ کروڑ تھی جو ۱۹۵۳ء میں ۳۲۴ کروڑ اور ۱۹۵۵ء میں ۳۸۲۰۴ کروڑ ہو گئی۔ ۱۹۵۵ء میں جو نئے برطانوی سرمایہ لگا اس میں سے بیشتر مال بنانے والی صنعتوں میں لگا۔ ان میں یہ صنعتیں شامل ہیں: کیمیاوی صنعتیں، شکر، آلات نقل و حمل، مشینری اور بجلی کا سامان۔ حجم کے اعتبار سے امریکی سرمایہ دوسرے نمبر پر تھا۔ ۱۹۵۵ء کے آخر تک امریکی سرمایہ ۴۹۰۸۰ کروڑ تک پہنچ گیا تھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۵۵ء میں ۳ کروڑ کا اضافہ ہوا جب کہ ۱۹۵۴ء میں ۲۲۰۲۹ کروڑ کا اضافہ تھا۔

۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۷ء میں امریکہ کا نمبر اول رہا۔ ۱۹۵۸ء تک یہ حیثیت برطانیہ کی تھی۔ ۱۹۵۸ء کی ۹۰ کروڑ اور ۱۹۵۹ء کی ۹۰ کروڑ کی مجموعی آمد میں سے امریکہ کا حصہ ۳۱ کروڑ (۶۶ فی صد) اور ۵۱ کروڑ (۵۱ فی صد) تھا۔ اس میں سے بیشتر سرکاری ذرائع سے آیا تھا۔ امریکہ سے سرمائے کی آمد میں اس اضافے کے ساتھ نجی حلقے میں اس کی لاگت ۱۹۵۶ء کے آخر میں ۵۵ کروڑ ہو گئی اور ۱۹۵۹ء کے ختم پر بڑھ کر ۹۳ کروڑ ہو گئی۔ ۱۹۵۸ء میں برطانیہ سے مجموعی آمد ۳۱ کروڑ تھی لیکن ۱۹۵۹ء میں بڑھ کر ۷۲ کروڑ ہو گئی جو ایک سال کی مجموعی آمد کی ایک تہائی تھی۔ بیشتر امریکی سرمایہ سرکاری ذرائع سے آیا لیکن سارا برطانوی سرمایہ نجی ذرائع سے آیا جس کا بیشتر حصہ کاروبار میں براہ راست لگایا گیا۔

آزادی کے بعد سے بیرونی سرمائے کی طرف حکومت کی پالیسی

۱۹۴۸ء کے صنعتی پالیسی رزولیوشن نے بیرونی سرمائے پر بعض پابندیاں عائد کی تھیں۔ ان پابندیوں نے اور ۱۹۴۸ء کی صنعتی پالیسی کے ریزولیوشن میں قومیانے کا جو ذکر تھا اس کے اندیشے نے بیرونی سرمائے کو خائف کر دیا جس کا اثر سرمائے کی آمد پر پڑا۔

بیرونی سرمائے سے متعلق اپریل ۱۹۴۹ء کا وزیر اعظم کا بیان: بیرونی سرمایہ کاروں کے خدشات دور کرنے اور ملک میں سرمائے کی آمد بڑھانے کے لیے اپریل ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی میں وزیر اعظم نے ایک تین نکاتی بیان دیا جس میں بیرونی سرمایہ کاروں کے لیے اہم یقین دہانیاں ہیں: (۱) حکومت کی عام صنعتی پالیسی میں ملکی اور بیرونی سرمائے میں تفریق نہیں کی جائے گی۔ (۲) بیرونی سرمایہ کاروں کو منافع بھیجنے اور سرمایہ واپس بھیجنے کی مناسب سہولتیں دی جائیں گی

بشرطیکہ زرِ مبادلہ کی صورت نے اِس کی اجازت دی۔ (۳) بیرونی کاروبار کو قومی ملکیت میں لانے کا فوری کوئی امکان نہیں ہے اور اگر ایسا ہوا بھی تو بیرونی سرمایہ کاروں کو منصفانہ معاوضہ ادا کیا جائے گا۔

وزیرِاعظم کی اِس یقین دہانی کی وجہ سے بیرونی سرمایہ پھر ہندوستان میں لگنے لگا لیکن ہماری غیر جانب دارانہ خارجہ پالیسی کی وجہ سے امریکی سرمائے کی آمد ابتدائی مراحل میں کم رہی۔

ترقیاتی منصوبہ بندی کا پروگرام شروع کرنے اور پہلے پلان کی کامیاب تکمیل کی وجہ سے ملک میں کافی معاشی استحکام آیا اور نجی، سرکاری اور بین الاقوامی ایجنسیوں سے سرمایہ حاصل کرنے میں مدد ملی۔ پلاننگ کے ابتدائی مراحل میں حکومت نے بیرونی ذرائع سے زیادہ سے زیادہ ایکوئٹی کیپٹل (EQUITY CAPITAL) حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ سرمایہ سیاسی بندشوں سے آزاد تھا اور اس کو ہندوستانی سرمائے کے اشتراک سے اُن صنعتوں کی توسیع میں لگایا گیا جو قومی مفاد اور ترقیاتی منصوبہ بندی کی ضروریات کو پورا کرتی تھیں۔ وولٹاز، سین ریلے، برلا یونیفیلڈ، ٹاٹا آئی سی آئی ایسی مشترک صنعتوں کی مثالیں ہیں جن میں بیرونی سرمایہ ہندوستانی سرمائے کے ساتھ شریک ہوا۔

زرِمبادلہ کی قلت اور بیرونی سرمائے کی طرف ہمارا حالیہ رویہ:

دوسرے پلان کو اپنی ابتدا کے دو سال کے اندر ہی زرمبادلہ کا بحران پیش آیا اُس کی وجہ سے بیرونی سرمائے کی طرف اپنے رویے پر ہمیں نظرثانی کرنی پڑی۔ ۴ر جولائی ۱۹۵۸ء کو وزیراعظم نے اعلان کیا "ہم نے ہمیشہ بیرونی سرمائے کا خیر مقدم کیا ہے اور مستقبل میں بھی کرتے رہیں گے۔" اس کے بعد سرکاری ترجمان برابر یہ اعلان کرتے رہے کہ ہندوستان میں بیرونی سرمائے کے لیے حالات سازگار رہیں اور توسیع کا متحرک ماحول ہونے کی وجہ سے بیرونی سرمائے کو منافع کمانے کے مواقع روشن ہیں۔ ۱۹۶۱ء سے بیرونی سرمایہ کاروں کو جو ٹیکس دینا پڑتا ہے وہ صرف اُن کی ہندوستان کی آمدنی پر لگایا جاتا ہے، باقی آمدنی پر نہیں لگایا جاتا ہے۔ اِس کے علاوہ کسی بھی حساب سے دیکھا جائے بیرونی سرمائے کو ۰٫۷% سے زیادہ ٹیکس نہیں دینا پڑ رہا ہے۔ مزید یہ کہ اپریل ۱۹۶۱ء سے اگر کوئی بیرونی صنعت کار ہندوستان میں کوئی صنعت شروع کرنا چاہے تو وہ خود براہِ راست اِس کی اجازت حاصل کر سکتا ہے۔ اِس سے قبل صرف ہندوستانی سرمایہ کاروں کو اجازت نامہ مل سکتا تھا چنانچہ بیرونی سرمایہ کاروں کو کسی ہندوستانی سرمایہ دار کا تعاون حاصل کرنا ضروری تھا۔ لیکن اب بھی بیرونی سرمایہ کار کو ہندوستانی پبلک اور مالیاتی اداروں سے رقم حاصل کرنا اور ہندوستانی کمپنی قائم کرنا ضروری ہے کیوں کہ اِس کمپنی کو ہی لائسنس دیا جائے گا۔

یہ تو سب جانتے ہی ہیں کہ زرِ مبادلہ کی قلت کی صورت میں یہ بات اور بھی مفید ہوتی ہے کہ بیرونی سرمایہ برآمدات کو بڑھانے اور درآمدات کو کم کرنے کے کاموں میں لگے۔ اس وقت بیرونی سرمائے کا کافی حصہ ایسی صنعتوں کی طرف جا رہا ہے جن سے درآمدات کم ہوں گی۔ یہ بات فائدے کی ہے لیکن مختلف قسم کے بیرونی کاروبار میں انتخاب کرتے وقت جس بنیادی معاشی پہلو کو ذہن میں رکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ملک کو بیرونی سرمائے کی کیا قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے اور اس کے مقابلے میں ملک کی حقیقی پیداوار میں کتنا اضافہ ہو رہا ہے۔ اس موقعے پر یہ ذکر مناسب ہے کہ تیسرا پلان بنانے والوں نے یہ تخمینہ لگایا تھا کہ پانچ برسوں میں ۳۰۰ کروڑ روپے سے زیادہ بیرونی سرمایہ نجی سرمائے کی شکل میں آئے گا۔ واقعی جو سرمایہ آیا وہ اس کا نصف تھا۔

بیرونی نجی سرمائے کے علاوہ بیرونی امداد سرکاری گرانٹ اور بین الاقوامی ایجنسیوں سے قرض کی شکل میں آئی ہے۔ بین الاقوامی ایجنسیوں میں عالمی بینک اوّل ہے۔ دوسرے پلان میں [illegible] تک ۴۸۹۶ کروڑ بیرونی امداد منظور ہوئی جس میں سے [illegible] ۵۰ امریکہ نے دی اور عالمی بینک نے ۳۱۵ کروڑ قرض دیے۔ اس ۳۱۵ کروڑ میں سے تقریباً ایک تہائی نجی سکٹر کو قرض دیا گیا۔ اپریل ۱۹۶۱ء سے [illegible] تک کی مدت میں عالمی بینک اور متعلقہ ادارے انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ ایسوسی ایشن نے مل کر ہندوستان کو ۴۲۲ کروڑ کے بقدر مالی امداد فراہم کی۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ آخر مارچ [illegible] تک تیسرے پلان کے لیے جو بیرونی امداد منظور ہوئی یا جس کا وعدہ کیا گیا وہ ۵۰۲۸ کروڑ تھی۔ امداد کے استعمال کا جہاں تک سوال ہے [illegible] میں ۵۰۲ کروڑ اور [illegible] میں ۴۲۳ کروڑ یعنی مجموعی طور سے ۴،۵ کروڑ پلان کے پہلے دو برسوں میں استعمال کی گئی۔ تیسرے پلان کی تیاری کے وقت ۵ برسوں کے لیے بیرونی امداد ۲۲۰۰ کروڑ رکھی گئی تھی۔ تیسرے پلان کے ختم کے قریب ہندوستان اور پاکستان کی لڑائی نے بیرونی امداد کی آمد خصوصاً امریکہ سے آنے والی امداد سست کر دی۔ چنانچہ تیسرے پلان کا بیرونی امداد کا نشانہ پورا نہ ہو سکا۔ یہ بھی ذکر مناسب ہوگا کہ چوتھے پلان کے دوران پبلک سکٹر کے لیے بیرونی امداد کی مجموعی رقم ۳۰،۳ کروڑ رکھی گئی ہے۔ اس میں سے ۱۲۱۶ کروڑ کے بقدر بیرونی قرض کی ادائیگی کے بعد جو رقم باقی رہے گی وہ ۲۲۱۴ کروڑ ہوگی۔

ہماری نئی پالیسی یہ ہے کہ ہم نجی کاروبار کو منضبط کرنے کے ساتھ اُس کی مدد بھی کرنا

چاہتے ہیں۔ بیرونی اور ملکی سرمایہ کاروں کو ہماری اس نئی صنعتی پالسی اور اُن یقین دہانیوں کی جو حکومت نے حال میں بیرونی سرمائے کو دی ہیں، سمجھنا چاہیے اور اُن کی قدر کرنا چاہیے اور کوشش کرنا چاہیے کہ ملک کی عام ترقی میں اپنا پارٹ ٹھیک سے ادا کریں تاکہ جمہوری ماحول میں "ساجھے اور سرمایہ داری" کی بنیادیں مضبوط ہوں۔

باب ۲۰

صنعتی مالیات اور انڈسٹریل فائنانس کارپوریشن

تیز صنعتی ترقی میں قائم اور رواں سرمائے کی کافی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندوستان کے جوائنٹ اسٹاک بینک لمبی مدت کے لیے مالی وسائل نہیں فراہم کرنا چاہتے۔ ان کا کہنا ہے کہ اتنی لمبی مدت کے لیے وہ اپنے مالی وسائل کو نہیں پھنسا سکتے۔ سرمایہ کاری کے ٹرسٹ اور اشو ہاؤسز (ISSUE HOUSES) ہندوستان میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ چنانچہ آزادی کے بعد حکومت نے صنعتی کاروبار کو اوسط اور لمبی مدت کے قرض دینے کے لیے مالیاتی ادارے قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ انڈسٹریل فائنانس کارپوریشن کے علاوہ کئی اور ترقیاتی اور سرمایہ کاری کے کارپوریشن حکومت کی براہ راست شرکت یا اس کی ہمت افزائی سے قائم کیے گئے ہیں۔ ان مالیاتی اداروں کو یکجا کر کے انھیں ترقیاتی بینک کا نام دیا گیا ہے۔

آزادی کے فوراً بعد انڈسٹریل فائنانس کارپوریشن قائم کر کے حکومت نے سنٹرل بینکنگ انکوائری کمیٹی کی تیس برس پہلے کی ایک بنیادی سفارش کی تعمیل کر دی۔ یہ کارپوریشن اور دوسرے ترقیاتی بینک جو ہندوستان میں قائم کیے گئے ہیں ہماری صنعتی ترقی کی رفتار تیز کر رہے ہیں اور منصوبہ بند معاشی ترقی کے دوران اندرونی سرمائے کو اکٹھا کرنے میں مدد کر رہے ہیں۔

کارپوریشن کی تنظیم، اس کے فرائض اور طریقۂ کار

(الف) تنظیم: جولائی ۱۹۴۸ء میں انڈسٹریل فائنانس کارپوریشن پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے تحت قائم کیا گیا۔ اس کی حیثیت شیئر ہولڈروں کے کارپوریشن کی ہے۔ جس میں حکومت، ریزرو بینک اور کچھ مخصوص ادارے حصہ دار ہیں۔ مرکزی حکومت نے ان شیئروں کی ضمانت لی ہے۔

کارپوریشن کا مصدقہ سرمایہ (AUTHORISED CAPITAL) دس کروڑ ہے جو پانچ پانچ ہزار کے ۲ ہزار بے باق شیروں (PAID - UP CAPITALS) میں تقسیم ہے۔ ان میں سے ساڑھے سات کروڑ کے ۱۵ ہزار شیئرز جاری کیے جا چکے ہیں جنھیں مرکزی حکومت، ریزرو بینک، شیڈیولڈ بینکوں، انشورنس کمپنیوں، ہندوستان کی لائف انشورنس کارپوریشن اور دوسرے ادارہ جاتی سرمایہ کاروں نے خرید لیا ہے۔ اپنے وسائل بڑھانے کے لیے کارپوریشن بے باق سرمائے کے پانچ گنے قیمت کے بانڈ جاری کرنے کا مجاز ہے۔ یہ پبلک کی امانتیں بھی قبول کر سکتا ہے جن کی ادائیگی پانچ برس سے پہلے نہ ہوگی بانڈ اور ڈبینچرز کے اصل اور سود کی ادائیگی کی ضمانت حکومت نے لی ہے۔ ستمبر ۱۹۶۲ء میں کارپوریشن نے اپنے وسائل بڑھانے کے لیے ۶ کروڑ کے بانڈ جاری کیے جن پر ۴½ فیصد سود تھا۔ امداد کے بڑھتے ہوئے مطالبے کی وجہ سے اپنے وسائل اور بڑھانے کے لیے دسمبر ۱۹۶۵ء میں ۲ کروڑ روپے کے بانڈ نجی طور پر جاری کیے۔ ان پر ۵½ فیصد سود ہے۔ مارچ ۱۹۶۶ء کے ختم پر مجموعی طور پر ۳۰۰۳۴ کروڑ کے بانڈ جاری کیے جا چکے تھے۔

کارپوریشن کے انتظام کے لیے بارہ ڈائرکٹر ہیں۔ ان میں سے تین حکومت کے اور دو ریزرو بینک کے نامزد کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ شیڈیولڈ بینک اور انشورنس کمپنیاں ۲ نمایندے منتخب کرتی ہیں۔ مینیجنگ ڈائرکٹر مجلس انتظامیہ کا صدر ہوتا ہے۔ مجلس میں اس کے علاوہ چار اور ڈائرکٹر ہوتے ہیں۔ حال میں انڈسٹریل فائنانس کارپوریشن کی انکوائری کمیٹی کی شائع ہونے کے بعد سے کارپوریشن کا چیرمین کل وقتی افسر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ایس۔ کے باسو سابق پروفیسر انڈسٹریل فائنانس، کے مطابق کارپوریشن کے انتظام کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس کا اکنامک انٹیلی جینس سکشن اور ریسرچ ڈپارٹمنٹ نہیں ہے۔ کمیشن نے ڈاکٹر باسو کی اس بات کو پورے طور سے تسلیم کیا اور یہ بات اطمینان بخش ہے کہ کمیشن نے حال میں اکنامک ریسرچ کے شعبے کے قیام پر غور کیا ہے۔

(ب) **فرائض** : کمیشن کو مندرجہ ذیل کاروبار کی اجازت ہے :

(۱) صنعتی اداروں کے لیے ہوئے اُن قرضوں کی ضمانت دینا جو کھلے بازار میں طلب کیے گئے ہیں اور جنھیں پچیس سال کے اندر ادا ہونا ہے۔

(۲) صنعتی اداروں کو قرض اور پیشگی رقم دینا یا اُن کے ڈبینچرز کو خریدنا جن کی ادائیگی ۲۵ برس کے اندر ہونی ہے۔

(۳) صنعتی اداروں کے جاری کیے ہوئے اسٹاک، شیئرز، بانڈ یا ڈبینچرز کو انڈر رائٹ

(UNDER WRITE) کرنا بشرطیکہ کارپوریشن ایسے اسٹاک اور شیئرز وغیرہ لینے کے سات سال کے اندر انھیں نکال دے۔

کارپوریشن صرف لمبی مدت کے قرض پبلک لمیٹڈ کمپنیوں کو دے سکتا ہے۔ پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنیاں ساجھے کی کمپنیاں اور سرکاری ملکیت کے کاروباری ادارے اس کے دائرۂ عمل سے باہر ہیں۔ کارپوریشن اُن بڑے پیمانے کی صنعتوں کی مالی ضروریات کو مخصوص اہمیت دیتی ہے جو قومی اور صنعتی اہمیت کی ہیں۔ [illegible] کے ایکٹ کے تحت کارپوریشن کو اس کی اجازت نہیں تھی کہ یہ صنعتوں کو کوئی سرمایہ فراہم کرسکے۔ اراضی یا باہم جوکھم (ENTREPRENEURIAL) سرمایہ صنعت کے ابتدائی مراحل میں بہت ضروری ہوتا ہے کارپوریشن کو اس کی فراہمی کی اجازت نہ ہونے کی وجہ سے صنعتی ترقی کو شکست پڑی۔ چنانچہ ڈاکٹر ماسو نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ اگر کارپوریشن کو انڈر رائٹنگ کا بوجھ اُٹھانے کی اجازت نہیں ہے تو اس کا کوئی جواز نہیں ہے کہ کارپوریشن کو کم از کم ابتدائی مراحل میں وقتی طور پر کوئی سرمایہ فراہم کرنے کا اختیار نہ ہو۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں [illegible] کے ایکٹ کے تحت کارپوریشن کو صنعتی اداروں کے شیئرز اور ڈبنچرز براہِ راست خریدنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن یہ اجازت تھی کہ یہ صنعتی اداروں کے شیئرز، اسٹاک، بانڈ اور ڈبنچرز کو انڈر رائٹ کرسکتا ہے اور اپنے پاس سات سال تک حکومت کی اجازت کے بغیر رکھ سکتا ہے۔ اس سے زیادہ مدت کے لیے رکھنے کے واسطے حکومت کی اجازت ضروری تھی۔ اپنی انڈر رائٹنگ کی ذمہ داری پوری کرنے کے سلسلے میں کارپوریشن جو شیئرز اسٹاک بانڈز یا ڈبنچرز لے گا انھیں اپنے پاس اثاثے کی حیثیت سے رکھ سکتا ہے۔ یہ محسوس کیا گیا کہ اگر کوئی صنعتی ادارہ پبلک سے قرض لینے کے لیے اس یقین دہانی کے ساتھ جائے کہ کارپوریشن بھی اُس کے ایک حصے میں شریک ہوگی تو اس ادارے کو کارپوریشن سے قرض کی ضرورت کم ہی پڑتی اور ہوسکتا ہے کہ بالکل نہ رہے۔ چنانچہ کارپوریشن کو [illegible] کی ترمیم کے تحت اختیار دیا گیا کہ وہ کسی بھی ادارے کے شیئرز اور اسٹاک براہِ راست خرید سکتا ہے۔ انڈر رائٹنگ سے متعلق دفعات اسی طرح قائم رکھی گئیں۔

اس سے قبل [illegible] اور [illegible] میں کارپوریشن کی سرگرمیاں بڑھانے اور اُس کے وسائل میں اضافے کی غرض سے ایکٹ میں ترمیمات کی جاچکی تھیں۔ [illegible] کی ترمیم کے تحت انفرادی پیشگی رقم کی حد ۵۰ لاکھ سے بڑھاکر ایک کروڑ کردی گئی تھی اور پہلی مرتبہ جہاز رانی کی کمپنیوں کو اُن اداروں

میں شامل کیا گیا تھا جنہیں کارپوریشن مالی وسائل فراہم کر سکتی تھی۔ ۱۹۵۷ء کے ایکٹ کی وجہ سے کارپوریشن کو ۱۹۵۸ء میں عالمی بینک سے ۱۰ لاکھ ڈالر قرض لینے کے لیے سرکاری ضمانت مل سکی۔ اسی ایکٹ کے تحت کارپوریشن کو ریزرو بینک سے ۳ کروڑ تک قرض لینے کا اختیار ہے بشرطیکہ یہ قرض اٹھارہ مہینوں میں ادا ہو سکے۔ یہ ایکٹ مرکزی حکومت اور ریزرو بینک کو ان کے شیئرز پر منافع کی رقم نکالنے سے منع کرتا ہے۔ اس کے بجائے یہ رقم کارپوریشن کے ایک مخصوص ریزرو فنڈ میں اس وقت تک جمع ہوتی رہے گی جب تک یہ ۵۰ لاکھ نہ ہو جائے۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۴ء کی ترمیمات کا کیا اثر ہوا یہ قرض کے اُن اعداد و شمار سے ظاہر ہے جو ۱۹۵۲-۵۳ء سے منظور کیے گئے۔ ۱۹۵۲-۵۳ء میں کارپوریشن نے ۵،۴۲ کروڑ کا قرض منظور کیا۔ جو ۱۹۶۴-۶۵ء میں بڑھ کر ۴۳،۴ کروڑ اور ۱۹۶۷-۶۸ء میں ۷۰،۱۹ کروڑ تک پہنچ گیا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۵۷ء کے امنڈمنٹ ایکٹ کے پاس ہونے کے ۱۵ سال بعد کارپوریشن کی منظور کردہ رقم چار گنی ہو گئی۔ ۱۹۶۰ء کے امنڈمنٹ ایکٹ کے مطابق کارپوریشن نے پہلی بار صنعتی اداروں کے شیئرز اور اسٹاک براہِ راست خریدنا منظور کیا۔

اپنے بیس برس کے قیام کے دوران کارپوریشن نے ملک کی صنعتی ترقی کی رفتار تیز کرنے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ اس موقع پر یہ بھی ذکر کر دینا چاہیے کہ ۱۹۶۷-۶۸ء میں کارپوریشن نے ۸۴ صنعتی یونٹوں کو ۲۶،۷۳ کروڑ کی امداد دی جب کہ اس سے پہلے کے سال میں ۵۶ یونٹوں کو ۲۳،۵۵ کروڑ کی امداد دی تھی۔ ابتدا میں کارپوریشن صرف روپے کی شکل میں امداد دیتا تھا۔ رفتہ رفتہ اُس نے اپنے دائرۂ کار کو ملتوی ادائگیوں کی ضمانت اور بیرونی قرضوں کی ضمانت تک بڑھا دیا۔ اب اُس نے اعانتی سرگرمیاں (PROMOTIONAL ACTIVITIES) بھی شروع کر دی ہیں مثلاً پبلک کے لیے جاری کیے جانے والے ایکوئٹی اور ترجیحی شیئرز اور ڈبنچرز کی انڈر رائٹنگ اور براہِ راست خرید۔ اس طرح کارپوریشن ایک قرض دینے والا ادارہ ہونے کے ساتھ آہستہ آہستہ ترقیاتی بینک کے فرائض انجام دینے لگا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں اپنے قیام کے بعد سے کارپوریشن نے ۱۹۶۸ء کے ختم تک ۳۰۰،۶۵ کروڑ کی مالی امداد منظور کی۔

کارپوریشن کے طریقۂ کار کا تنقیدی جائزہ:

شروع شروع میں ایک صنعت کار لالہ سری رام اس کے جُز وقتی چیرمین تھے اور اس کا کام تشفی بخش نہیں تھا۔ چیرمین اگر کل وقتی ہوتا تو کارپوریشن کی کارکردگی بڑھتی اور اس کا کام بہتر ہوتا۔ کارپوریشن میں اس کے علاوہ بھی خامیاں تھیں مثلاً تکنیکی تفتیش اور معاشی تحقیق کا شعبہ

نہ ہونے کی وجہ سے کارپوریشن کی مجلس عاملہ کو قرض کی درخواستوں کی چھان بین کرنے میں دقت ہوتی تھی۔ اگر ساکھی اور تکنیکی تفتیش کا شعبہ موقع پر جاکر چھان بین کر لیتا تو کارپوریشن کے لیے جو کم کم جاتا اور قرض کی درخواست پر جلد اور غیر جانب دار فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔ کارپوریشن کے پچھلے چار برسوں کے کام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خویش پروری اور جانب داری داخل ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے قرضوں کی درخواستوں پر غیر جانب داری کے ساتھ غور لیا جاتا تھا۔ پارلیمنٹ میں اس پر جانب داری اور پاس داری کے الزامات لگائے گئے۔ پبلک کی بڑھتی ہوئی ناراضگی نے حکومت کو مسز سچیتا کرپلانی کی صدارت میں ایک انکوائری کمیٹی مقرر کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کمیٹی نے ۱۰ مئی [illegible] کو اپنی رپورٹ پیش کر دی۔

رپورٹ نے کارپوریشن کے منتظموں کو جانب داری کے الزام سے بری کر دیا لیکن یہ اشارہ کیا کہ چیکوں کی ادائیگی کچھ مناسب نہیں تھی اور آسانی سے ان سے بچا جا سکتا تھا۔ اس کمیٹی کی بنیادی سفارشات یہ تھیں:

(۱) کارپوریشن کا چیرمین آنریری اور جز وقتی ہونے کی بہ جائے باتنخواہ اور کل وقتی ہونا چاہیے۔

(۲) کارپوریشن کے بورڈ میں صنعت کاروں اور سرکاری افسروں کے علاوہ ایک ماہر معاشیات اور ایک انتظامی ماہر اور چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بھی ہونا چاہیے۔

(۳) کارپوریشن کی ہر شاخ کا مقامی صلاح کاروں کا پینل ہونا چاہیے۔

(۴) اگر کارپوریشن کا کوئی ڈائرکٹر کسی ایسے کاروبار کا ڈائرکٹر یا شیئر ہولڈر ہے جس نے قرض کی درخواست دی ہے تو اس کاروبار کو قرض منظور کرنے کے لیے بورڈ آف ڈائرکٹرز کا متفقہ فیصلہ ضروری ہے۔ یہ فیصلہ ایسے جلسے میں کیا جانا چاہیے جس میں ووٹ دینے کی اہل کل ڈائرکٹروں کی کم از کم دو تہائی تعداد موجود ہو۔

(۵) قرض کی منظوری میں جتنی دیر لگتی ہے اُس کو کم کرنا چاہیے۔

(۶) اگلے تین برسوں تک کارپوریشن کو قرض کی ۵۰ لاکھ سے اوپر کی درخواستیں حتمی منظوری کے لیے مرکزی حکومت کے پاس جانی چاہئیں۔

(۷) کارپوریشن کو زیادہ اطلاعات اور زیادہ تفصیلی سالانہ رپورٹیں شائع کرنا چاہئیں اور کارپوریشن کے بورڈ کے جلسے کبھی کبھی کلکتہ، بمبئی اور مدراس جیسے اہم مراکز میں ہونے چاہئیں۔

(۸) قرض دیتے وقت کم از کم ۵ء۰ فیصد کی گنجائش رکھنی چاہیے اور متعلقہ کاروبار کی کمانے کی استعداد کا تخمینہ کرنے میں بڑی احتیاط کرنی چاہیے۔

حکومت نے اس کمیٹی کی بیشتر سفارشات منظور کرلیں اور ۱۶ اگست ۱۹۵۵ء کو کل وقتی با تنخواہ چیرمین کا تقرر کر دیا۔ حکومت نے کارپوریشن کو یہ بھی ہدایت کی کہ اس کے چلنے کلکتے، بمبئی اور مدراس جیسے مراکز میں بھی ہوا کریں اور کارپوریشن تفصیلی شالانہ رپورٹ شائع کیا کرے۔ حکومت نے کارپوریشن کے لیے یہ لازمی قرار دیا کہ وہ اپنے ڈائرکٹروں سے درخواست کرے کہ اگر انھیں قرض کے اُمیدواروں میں سے کسی سے کسی قسم کا تعلق ہے تو وہ اس کا اعلان کردیں۔ حکومت نے یہ بھی ہدایت کی کہ قرض دیتے وقت ۵۰ ۱ کی گنجائش رکھی جائے اور اگر قرض کی درخواست ۵۰ لاکھ سے زیادہ کی ہے تو اُس کے لیے پہلے سے حکومت کی منظوری حاصل کی جائے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انکوائری کمیٹی کی تجاویز نے انڈسٹریل فائنانس کارپوریشن کو بہتر شکل دینے اور اس کے طریقۂ کار کو بہتر کرنے میں حکومت کی مدد کی۔ کارپوریشن کی بیشتر خامیاں دور ہو چکی ہیں اور اب یہ ہندوستانی کاروبار کی بیش بہا خدمت انجام دے رہا ہے۔

چھوٹی صنعتوں کے مالی مسائل اور صوبائی مالیاتی کارپوریشنوں کا رول

چھوٹی صنعتوں کے مسائل : چھوٹی صنعتوں نے ماضی میں ہماری معیشت میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ ہندوستان کی صنعتی منصوبہ بندی میں بھی انھیں کافی اہمیت دی گئی ہے۔ ان کی ترقی میں سب سے بڑی رُکاوٹ وسائل کی کمی رہی ہے۔ ان صنعتوں کی ترقی کے بہت سے منصوبے مالی مشکلات کی وجہ سے پورے نہ ہو سکے۔ عموماً چھوٹی صنعتیں منظم سکیوریٹی مارکٹ کے ذریعے لمبی مدت کے ایکوئٹی سرمائے کی ضروریات پوری نہیں کر پاتیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں بچت آہستہ آہستہ منظم کیپٹل مارکٹ کو پہنچتی ہے اور جہاں انڈر رائٹنگ کا طریقہ عام نہیں ہے، چھوٹی صنعتوں کے لیے نئے اِشو مارکٹ کے ذریعے سرمایہ حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ چنانچہ لازمی طور سے انھیں دوستوں، عزیزداروں، مقامی سرمایہ کاروں اور ساہوکاروں کے پاس سرمایہ حاصل کرنے کے لیے جانا پڑتا ہے۔

کمرشیل بینک قرض کی اہلیت کا جو اونچا معیار رکھتے ہیں اُس پر یہ چھوٹے کاروبار پورے نہیں اُترتے کیوں کہ نہ ان کے حسابات رکھنے کا طریقہ ٹھیک ہے اور نہ یہ واضح اور ہم وزن ضمانت دے پاتے ہیں۔ چنانچہ بینک ان چھوٹے کاروباروں کو ان کے رواں سرمائے کا کچھ حصہ فراہم کر پاتے ہیں۔ صرف بعض غیر معمولی صورتوں میں کمرشیل بینک اُس لون کیپٹل (LOAN CAPITAL) کا ایک حصہ دے پاتے ہیں جس کی ضرورت کاروبار کی توسیع یا آلات اور مشین بدلنے کے لیے پڑتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ چھوٹی صنعتوں کو شدید مالی مشکلات کا سامنا ہے۔ دوست، عزیز اور ساہوکار جتنا سرمایہ فراہم

کرسکتے ہیں وہ کرتے ہیں لیکن یہ مقدار اتنی قلیل ہے کہ جس سے ان کی توسیع اور ترقی اور خصوصاً بڑے بڑے
پیمانے پر پروگرام نہیں پورا کیا جا سکتا۔

صوبائی مالیاتی کارپوریشن

جب اوسط درجے کی صنعتوں کی ان مشکلات دور کرنے کے لیے حکومت ہند نے ۱۹۵۱ء میں سٹیٹ فائنانس
کارپوریشن ایکٹ پاس کیا تو اس ایکٹ کے تحت مختلف صوبوں میں ۱۵ صوبائی کارپوریشن قائم کیے گئے۔ ان
میں مدراس کا انڈسٹریل انوسٹمنٹ کارپوریشن بھی ہے۔ درحقیقت ۱۹۶۵ء تک ۱۹۶۶ء میں مدراس انوسٹمنٹ
کارپوریشن لے کر ۱۵ صوبائی کارپوریشن کام کر رہے تھے۔ مدراس کا کارپوریشن اگرچہ جوائنٹ سٹاک کمپنی
کی حیثیت سے جڑا ہے لیکن مدراس کے لیے فائنانس کارپوریشن کے فرائض انجام دیتا ہے ۱۹۶۸ء میں پنجاب
فائنانشل کارپوریشن کو دوبارہ تنظیم کے ساتھ چار آزاد یونٹوں میں تقسیم کر دیا گیا اس طرح دہلی، ہماچل پردیش،
ہریانہ اور پنجاب کارپوریشن قائم ہو گئے۔ اس وقت صوبائی کارپوریشنوں کی تعداد ۱۸ ہو گئی ہے۔

ریزرو بینک نے نہ صرف ان کارپوریشنوں کے قیام میں تعاون کیا بلکہ وہ ان میں سے ہر کارپوریشن
کے سب سے بڑے شیئر ہولڈروں میں سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ریزرو بینک کے ۵۴۰۳ کروڑ روپے ان
کارپوریشنوں میں لگے ہیں۔ ریزرو بینک کو ان کے معائنے کا اختیار حاصل ہے اور یہ ہر سال ان کارپوریشنوں
کی سالانہ کانفرنس منعقد کرتا ہے۔ ریزرو بینک کا سب سے اہم کام یہ رہا ہے کہ وہ ان کارپوریشنوں اور
بینکنگ اداروں کے درمیان تال میل پیدا کرے۔ ان بینکنگ اداروں میں اسٹیٹ بینک اور کوآپریٹیو
بینک شامل ہیں۔

یہ اٹھارہ کارپوریشن مجموعی طور سے ۴۰ کروڑ کے سرمائے کے مجاز ہیں جس میں سے ۱۹۴۷ کروڑ
بے باقی سرمایہ ہے۔ بیشتر کارپوریشنوں نے بانڈ جاری کرکے اپنے وسائل کو بڑھایا ہے۔ ۱۹۵۳ء سے
لے کر ۱۹۶۷ء تک ان کارپوریشنوں نے تقریباً ۱۶۲ کروڑ کے قرض منظور کیے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ان
اٹھارہ کارپوریشنوں نے ۱۹۶۷ء میں ۸۰۱۸ کروڑ روپے قرض دیئے جب کہ ۱۹۶۶ء میں ۲۰ کروڑ
دیے گئے تھے۔ ۱۹۶۶ء کے مقابلے میں ۱۹۶۷ء میں یہ کمی ملک کی معیشت میں سرد بازاری کی حالت کا
نتیجہ تھی۔

صوبائی کارپوریشن ان چھوٹی اور اوسط درجے کی صنعتوں کو لمبی مدت کے قرض دینے کے لیے
قائم کی گئی ہیں جو انڈسٹریل فنانس کارپوریشن کے دائرۂ عمل سے باہر ہیں۔ صوبائی کارپوریشن مرکزی
کارپوریشن کا چھوٹا ایڈیشن ہیں۔ لیکن ان میں تین بنیادی فرق ہیں پہلا فرق یہ ہے کہ مرکزی کارپوریشن

صرف پبلک لیمیٹڈ کمپنیوں کو مالی امداد دے سکتا ہے جب کہ صوبائی کارپوریشن پرائیویٹ لیمیٹڈ کمپنیوں
ساجھے کی کمپنیوں اور ذاتی کاروبار کو بھی قرض دے سکتے ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ مرکزی کارپوریشن کے
سرمائے میں صرف ریزرو بینک، مرکزی حکومت اور انشیورنس کمپنیاں اور دوسرے سرمایہ کار ادارے
شریک ہو سکتے ہیں لیکن صوبائی کارپوریشنوں کے سرمائے میں عام پبلک بھی شریک ہو سکتی ہے لیکن یہ شرکت
کل سرمائے کی ۲۵٪ سے زیادہ نہ ہونی چاہیے۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ مرکزی کارپوریشن ۲۵ سال تک
کی مدت کے لیے قرض دے سکتا ہے یا قرض کی ضمانت لے سکتا ہے لیکن صوبائی کارپوریشن کے لیے
یہ مدت صرف بیس سال ہے۔

۱۹۵۱ء کے ایکٹ کے تحت صوبائی کارپوریشن ۵ کروڑ کے نقد سرمائے کا مجاز ہے۔ مرکزی
کارپوریشن کی طرح صوبائی کارپوریشن بھی بانڈ اور ڈبنچرز جاری کرنے کے مجاز ہیں لیکن اُن کی مجموعی
رقم کارپوریشن کے بے باق سرمائے، شیئر کیپٹل اور محفوظ رقم کی پانچ گنی سے زیادہ نہ ہونی چاہیے۔
مرکز کی طرح صوبائی کارپوریشن میں بھی یہ خامی ہے کہ ٹکنیکل تفتیش اور معاشی تحقیق کے شعبے نہیں ہیں۔

ان کارپوریشنوں کی امداد دینے کی استعداد بڑھانے کی غرض سے ۱۹۵۶ء کے صوبائی فائنانس
کارپوریشن ایکٹ میں ترمیم کی گئی۔ یہ ترمیم شدہ ایکٹ کارپوریشنوں کو اختیار دیتا ہے کہ یہ صنعتی اداروں
کے شیڈیولڈ بینکوں اور کوآپریٹیو بینکوں سے لیے گئے قرض کی ضمانت لے سکتے ہیں۔ اس ایکٹ نے
پبلک لیمیٹڈ کمپنیوں، اور کوآپریٹیو سوسائٹیوں کو دیے جانے والے قرض کی حد ۱۰ لاکھ سے بڑھا کر ۲۰ لاکھ
کر دی۔ صنعتی کاروبار کی تعریف بھی وسیع کر دی گئی ہے۔ اور اس میں ہوٹل، نقل و حمل کی صنعتیں اور
انڈسٹریل اسٹیٹ بھی شامل کر دی گئی ہیں۔

اگرچہ صوبائی کارپوریشنوں کی کارگزاری کا جائزہ لینا ابھی قبل از وقت ہے تاہم ایک مختصر
جائزے سے یہ اندازہ کرنے میں مدد ملے گی کہ یہ کارپوریشن چھوٹی اور اوسط درجے کی صنعتوں کی
مالی ضرورتوں کو پورا کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ان صنعتوں
کو تین قسم کی مالی امداد کی ضرورت ہوتی ہے، ایک شروع میں کاروبار شروع کرنے کے لیے ایکوئٹی
سرمایہ، دوسرے توسیع اور مشینری وغیرہ بدلنے کے لیے مستقل سرمایہ اور تیسرے چالو اخراجات
کے لیے رواں سرمایہ۔ اب تک جو کارپوریشن قائم ہو چکے ہیں اُن میں بیشتر مستقل سرمایہ فراہم کرتے ہیں،
یہ رواں سرمایہ بہت کم اور ایکوئٹی سرمایہ بالکل فراہم نہیں کرتے ہیں۔ ایکوئٹی سرمایہ فراہم نہ کرنے کی
وجہ یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء کے ایکٹ نے ان پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ یہ ایکٹ ۱۹۴۸ء کے انڈسٹریل فائنانس

کارپوریشن کے نمونے پر تیار کیا گیا تھا۔ صوبائی کارپوریشن رواں سرمایہ اس لیے نہیں فراہم کر پاتے کیوں کہ یہ
ذہن رکھنے کی اساتی تکنیک پر ضرورت سے زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ رواں سرمائے پر مستقل سرمائے کو ترجیح
دینے کا کوئی معقول جواز نہیں ہے۔ یہ تو درست ہے کہ چھوٹی اور اوسط درجے کی صنعتوں کے لیے
مستقل سرمایہ بہت ضروری ہوتا ہے کیوں کہ اس سے یہ زمینیں، عمارات اور مشینوں جیسا اثاثہ حاصل
کرتی ہیں۔ لیکن سرمائے کی بھی ان کو اتنی ہی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ بیشتر یونٹوں کے لیے بنیادی سوال
فوری طور پر زندہ رہنے کا ہوتا ہے۔ رواں سرمائے کی سخت قلت کی وجہ سے ان کی تباہی مسلّم ہو جاتی ہے۔
بینک رواں سرمائے کا صرف ایک چھوٹا سا حصّہ فراہم کرتے ہیں کیوں کہ بیشتر صنعتی کاروبار کی ماہیت
ایسی ہوتی ہے کہ بینک نہ اُن کا خام مال اور نہ تیار شدہ مال ضمانت کے لیے قبول کر پاتے ہیں۔ فرض کہ
صوبائی کارپوریشن اگر واقعی چھوٹی صنعتوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو انھیں قرض دینے کی اپنی پالیسی پر
نظرثانی کرنا چاہیے اور مستقل سرمائے کے ساتھ رواں سرمایہ بھی فراہم کرنا چاہیے۔

صوبائی کارپوریشنوں نے چھوٹی صنعتوں کے مقابلے میں اوسط درجے کی صنعتوں کو جن میں ساختی اور
ترکیبی صنعتیں (MANUFACTURING AND PROCESSING INDUSTRIES) شامل ہیں زیادہ مالی امداد دی۔ ان کارپوریشنوں
نے مجموعی طور سے جو قرض منظور کیے ان میں کپڑے، کھانے کی چیزیں، انجینئری، کیمیائی اور دوائیں بنانے
والی صنعتوں کا غلبہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی صنعتوں کو قرض دینے میں جوکھم زیادہ ہے۔ چھوٹی
صنعتیں نہ حساب کی جانچ کے تسلیم شدہ اصولوں پر عمل کرتی ہیں اور نہ اُن کے پاس ایسا قائم اثاثہ ہوتا ہے
جس کی وہ ضمانت دے سکیں۔ لیکن اگر چھوٹی صنعتوں کو پلان میں اپنا مفید رول ادا کرنا ہے تو انھیں مالی
امداد ملنی چاہیے۔ اس لیے صوبائی کارپوریشنوں کو اپنی پالیسی پر نظرثانی کرنا چاہیے اور کچھ زیادہ جوکھم
لے کر چھوٹی صنعتوں کو اُن کی پیداوار کی ضمانت پر قرض دینا چاہیے۔ دوسری طرف چھوٹی صنعتوں
کو کوشش کرنا چاہیے کہ وہ مل کر چھوٹی کوآپریٹیوز کی صورت اختیار کرلیں اور حسابات کے جانچ کا طریقہ بہتر
کریں اور منصوبہ بندی شروع کریں۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ صوبائی کارپوریشنوں کا براہِ راست
تعلق حال میں قائم کیے گئے صنعتی ترقیاتی بینک سے ہے اور رہے گا۔ اس بینک کا مقصد ان کارپوریشنوں
کو مزید تقویت دینا ہے اور مالی وسائل کی سہولتیں دے کر اور امداد دینے کے کاموں میں شریک ہو کر
ان کی قرض دینے اور سرمایہ فراہم کرنے کی استعداد کو بڑھانا ہے۔

صوبائی کارپوریشنوں کے کاموں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کارپوریشن کا قرض بہت مہنگا پڑتا ہے۔ اس
کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے شیئر ہولڈروں کو ۳½٪ منافع دینے کی ضمانت دی ہے جس کی وجہ سے

یہ زیادہ سود لینے پر مجبور ہیں۔ سالانہ سود کی اِن کی شرح ۸ سے ۹ فی صدی تک رہتی ہے۔ قرض لینے والے کاروبار کو کچھ اور بھی خرچ کرنا پڑتا ہے مثلاً رجسٹریشن کے اخراجات اور اسٹامپ ڈیوٹی وغیرہ جو قرض کی رقم کے ۳٪ کے قریب آتے ہیں۔ اِس طرح قرض کی مجموعی قیمت گیارہ بارہ فی صدی کے درمیان آتی ہے جو چھوٹے کاروبار کے لیے بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ انھیں قرض کے لیے دوسرے دروازے کھٹکھٹانے پڑتے ہیں۔ یہ بات تشفی بخش ہے کہ پنجاب کی حکومت نے اس مسئلے کو سمجھا اور اس نے ان قرضوں کو اسٹیمپ اور رجسٹریشن ڈیوٹی سے یا تو مستثنیٰ کر دیا یا اُن کو رعایت دی۔ ہمیں اُمید ہے کہ دوسرے صوبے بھی ایسا ہی کریں گے۔

آخر میں اُن اقدام پر سرسری نظر ڈالتے چلیں جو صنعتی مالی وسائل فراہم کرنے والی ایجنسیوں میں تال میل پیدا کرنے کے لیے کیے گئے ہیں تاکہ ایک دوسرے کے حدود کا رخلط ملط نہ ہوں۔ اگست ۱۹۵۲ء کی کانفرنس میں صوبائی کارپوریشنوں کے نمایندوں کی کانفرنس میں مرکزی اور صوبائی فنانس کارپوریشنوں کے حدود کی وضاحت کی گئی۔ یہ طے پایا کہ مرکزی کارپوریشن دس لاکھ سے اُوپر کے قرض کی درخواستوں پر غور کرے گا اور اِس سے کم کی درخواستیں صوبائی کارپوریشن لیں گے۔ مرکزی حکومت اور صوبائی کارپوریشنوں کے دائرۂ عمل کی بھی نشان دہی کی گئی۔ دس سے لے کر ۵ لاکھ تک کے قرض کارپوریشن کے حدود میں ہیں اور اِس سے چھوٹے قرض حکومتیں شعبہ جاتی طور سے دیں گی۔ یہ بھی ذکر کر دینا چاہیے کہ چھوٹی صنعتوں کو سرمائے کی مشترک فراہمی کی پائلٹ اسکیم کی کامیابی کے بعد یکم جنوری ۱۹۵۹ء سے اسٹیٹ بینک کی سب شاخوں نے چھوٹی صنعتوں کو سرمایہ فراہم کرنا شروع کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب یہ بینک کے کاروبار کا معمول بن گیا ہے۔ ۱۹۵۵ء میں ۴۲ چھوٹے یونٹوں کو دس لاکھ تک قرض دینے کی ایک پائلٹ اسکیم سے شروع ہو کر دسمبر ۱۹۶۰ء میں یہ امداد ۷، ۵ ۲۴۶ کروڑ تھی۔ اِس سلسلے میں یہ بات اُمید افزا ہے کہ ریزرو بینک نے دسمبر ۱۹۶۱ء سے اسٹیٹ بینکوں اور شیڈیولڈ بینکوں کو بینک کی شرح پر قرض کی مزید سہولتیں فراہم کی ہیں تاکہ چھوٹی صنعتوں کو قرض دینے کے لیے ان کی استعداد بڑھے۔

دوسرے نئے صوبائی کارپوریشن اور ترقیاتی بینک

ترقیاتی منصوبہ بندی کے دوران یہ اندازہ ہوا کہ مرکزی اور صوبائی کارپوریشن بھی سیکٹر کی مالی ضروریات مکمل طور سے پوری نہیں کر سکتے۔ چنانچہ حکومت نے براہِ راست نیشنل ڈیولپمنٹ کارپوریشن قائم کیا اور بالواسطہ طریقے سے "انڈسٹریل کریڈٹ اینڈ انوسٹمنٹ کارپوریشن" قائم کرنے میں مدد کی جو ایک

بھی ادارہ ہے۔ حکومت نے ایک اور نیم سرکاری کارپوریشن قائم کیا جس کا نام سمال انڈسٹریز کارپوریشن
ہے، جس کا مقصد چھوٹی صنعتوں کو ترقی دینا ہے۔ جون ۱۹۵۸ء میں ری فائنانس کارپوریشن قائم کیا گیا
جس کا چیرمین ریزرو بینک کا گورنر ہے اور جس کی حیثیت ایک پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی کی ہے۔ ستمبر ۱۹۶۴ء
کے شروع میں اس ری فائنانس کارپوریشن کو نئے انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بینک میں مدغم کر دیا گیا۔ حال
میں حکومت نے دو اور مخصوص صنعتی ادارے قائم کیے ہیں۔ یونٹ ٹرسٹ اور انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بینک۔
یونٹ ٹرسٹ متعدد چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کا روپیہ اکٹھا کرتا ہے اور اس سرمائے کو مختلف سیکیورٹیوں
میں لگاتا ہے۔ انڈسٹریل بینک جس کا سرمایہ ۵ کروڑ ہے صنعتوں کو اوسط اور لمبی مدت کے لیے سرمایہ فراہم
کرتا ہے۔ بینک یہ مالی امداد براہ راست بھی دیتا ہے اور بینکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں کے ساتھ
مل کر بھی۔ چونکہ ری فائنانس کارپوریشن کا بھی مقصد یہی ہے اس لیے اسے انڈسٹریل بینک کے ساتھ
مدغم کر دیا گیا ہے۔

(ت) انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن

یہ کارپوریشن ریاست کی سرپرستی میں قائم کیا گیا ہے اور اس کا تمام سرمایہ حکومت نے فراہم کیا ہے۔
یہ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں قائم ہوا۔ اس کا مقصد صنعتوں کو مالی وسائل فراہم کرنا اور صنعتی ترقی کو بڑھاوا دینا تھا۔
کارپوریشن ایسی صنعتیں شروع کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اہم ہیں لیکن نجی سرمایہ ان سے خائف ہونے کی
وجہ سے ترقی نہیں کر پاتا۔ بعض صورتوں میں یہ کارپوریشن اس وقت تک نئے کاروباروں کا انتظام
سنبھال سکتی ہے جب تک کہ وہ اپنے پیروں پر نہ کھڑے ہوں اور منافع نہ کمانے لگیں۔ اس معاملے میں
کارپوریشن کے کام لاطینی امریکہ کے فومنٹو (FOMENTO) کارپوریشن سے ملتے ہیں۔ فومنٹو کارپوریشن
بھی حکومت کی سرپرستی میں قائم کیے گئے ہیں۔ ان کا بھی ایسے صنعتی کاروباروں کا قیام اور ترقی ہے
جن کی طرف نجی سرمایہ نہیں راغب ہوتا لیکن جو متوازن صنعتی ترقی کے لیے اہم ہیں۔

نیشنل ڈیولپمنٹ کارپوریشن ایک کروڑ روپے کے سرمائے کا مجاز ہے اور ۱۵ لاکھ کے باقاعدہ
سرمائے سے شروع کیا گیا۔ یہ ساری رقم حکومت نے فراہم کی۔ حکومت کا خیال تھا کہ ۱۵ لاکھ کے باقاعدہ
سرمایہ کافی ہوگا کیونکہ عموماً یہ کارپوریشن صنعتوں کو مالی وسائل نہیں دے گا سوائے اس کے کہ کسی
پس ماندہ علاقے میں کسی مخصوص صنعت کی ترقی کے لیے سرمایہ دینا ضروری ہو۔

نیشنل ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے کام یہ ہیں: (۱) نئی صنعتوں کو شروع کرنے، ترقی دینے اور
پیداوار کی نئی راہیں نکالنے کے پروجیکٹ بنانا اور ان کی تعمیل کرنا۔ (۲) ٹکنولوجیکل مشاورتی بیورو

(TECHNOLOGICAL CONSUL-TANCY BUREAU) کے ذریعے ٹکنیکل مشورے فراہم کرنا (۳) مخصوص صنعتوں کو بحال کرنے اور جدید بنانے کے لیے وسائل فراہم کرنا، مثلاً سوتی کپڑے، جوٹ کا سامان، مشینوں کے پرزے بنانے کی صنعتیں۔ فروری ۱۹۶۳ء سے کارپوریشن نے مذکورہ بالا صنعتوں کی تجدید اور توسیع کے لیے قرض کی درخواستیں نہیں لی ہیں۔ بہ ہر حال ۱۹۶۸ء تک ان صنعتی کاروباروں کو ۳۴ء۱۸ کروڑ روپے دیے گئے جو پہلے منظور کیے جا چکے تھے۔ اس میں سے ۳۴۲ لاکھ ۶۹-۱۹۶۸ء میں دیے گئے۔

(ب) انڈسٹریل کریڈٹ اینڈ انوسٹمنٹ کارپوریشن

۱۹۵۴ء کے شروع میں امریکہ اور عالمی بینک کے بھیجے ہوئے تین آدمیوں پر مشتمل ایک مشن نے حکومت کو مشورہ دیا کہ برطانیہ کے انڈسٹریل اینڈ کمرشیل فائنانس کارپوریشن جیسا ایک نیم سرکاری مخصوص ادارہ قائم کرنے کی فوری ضرورت ہے۔

اس مشن کی سفارش پر ایک پرائیویٹ لیمیٹڈ کمپنی جنوری ۱۹۵۵ء میں قائم کی گئی جس کا نام "انڈسٹریل کریڈٹ اینڈ انوسٹمنٹ کارپوریشن" رکھا گیا۔

اس کارپوریشن کو ۲۵ کروڑ کے سرمائے کا مجاز کیا گیا لیکن یہ ۵ کروڑ کے بے باق سرمائے سے شروع کیا گیا۔ یہ روپیہ ملکی اور بیرونی سرمایہ کاروں نے لگایا۔ اس شیئر کیپٹل کے علاوہ کارپوریشن نے امریکہ کے ٹکنیکل کوآپریشن مشن سے ۷½ کروڑ روپے حاصل کیے۔ جس کی حیثیت اس جمع رقم کی تھی جس پر سود نہیں ہوتا۔ ۱۹۵۵ء کے ختم پر عالمی بینک نے ۵ کروڑ روپے کا لمبی مدت کا قرض دیا جس کی ہندوستانی حکومت نے ضمانت لی۔ اس طرح ۱۹۵۵ء میں کارپوریشن کا ابتدائی رواں سرمایہ ۱۷½ کروڑ تھا۔ کارپوریشن کو بے باق سرمائے اور سرکاری جمع رقم کے تین گنے تک قرض لینے کا اختیار ہے۔

یہ کارپوریشن قائم کرنے کی ضرورت بنیادی طور سے اس لیے محسوس ہوئی کیوں کہ ملک میں ایک سرگرم کیپٹل مارکٹ کی کمی تھی جو نئے اسٹاک جاری کرتا۔ دس برس کے قیام میں اس کارپوریشن نے صنعت کی لمبی مدت کے قرض کی ضروریات پورا کرنے میں مدد کی ہے۔ اس کی وجہ سے نئی انتظامی استعداد پیدا ہوئی ہے اور کیپٹل مارکٹ مضبوط ہوئی ہے۔ اس کا بنیادی کام انڈر رائٹ کرنا ہے (ضمانت)۔ نئے کاروبار کو ترقی دیتے وقت یہ اس کی بھی کوشش کرتا ہے کہ انھیں ایکوئٹی سرمائے کا ایک حصہ فراہم کرے۔ اس طرح یہ ادارہ نئے صنعتی کاروبار کی نمایاں خدمت انجام دیتا ہے۔

اپنے بڑھتے ہوئے کام کے پیش نظر اس ادارے کے وسائل، خصوصاً زرمبادلہ کے وسائل میں وقتاً فوقتاً اضافہ کیا گیا ہے۔ دسمبر ۱۹۶۹ء کے ختم پر کارپوریشن کو بیرونی کرنسی کی شکل میں ۱۱۹ کروڑ

روپے ملے۔ اس میں سے ۱۳کروڑ ۱۰ لاکھ کا ڈالر کریڈٹ تھا جو عالمی بینک نے دیا۔ ۱۰کروڑ کا ڈوئش مارک کریڈٹ تھا جو مغربی جرمنی نے دیا اور ۴۵ لاکھ کا ڈالر کریڈٹ ورتھا جو امریکی ادارے یو۔ ایس ایڈ نے دیا۔ اس کے علاوہ کارپوریشن کو روپے کی شکل میں وسائل مختلف ذرائع سے ملتے رہے ہیں۔ منظور شدہ منافع جو دوبارہ لگا دیا گیا۔ قرض داروں سے وصول ہونے والی رقمیں اور انوسٹمنٹ کی فروخت سے آمدنی۔ مارچ ۱۹۶۸ء کے ختم پر کارپوریشن کے مجموعی وسائل ۱۹۵ کروڑ تھے جس میں سے ۱۴۰ کروڑ بیرونی کرنسی کے قرض کی شکل میں اور ۵۴ کروڑ روپے کی شکل میں تھے۔ اس طرح ۵۴ کروڑ میں ۵، کروڑ شیئر کیپٹل، ۲۲ کروڑ سرکاری قرض، ۱۰ کروڑ انڈسٹریل ڈویلپمنٹ بینک کا قرض اور ۶ کروڑ کے ڈبنچرز تھے۔

بیرونی زرمبادلہ کی شدید قلت کی وجہ سے کارپوریشن صنعتوں کے لیے زرمبادلہ کا اہم ذریعہ ہے۔ ۱۹۵۵ء میں اپنے قیام کے وقت سے لے کر مارچ ۱۹۶۸ء تک کارپوریشن نے ۳۰۰ کروڑ روپے کی مالی امداد منظور کی۔ اس کے علاوہ مارچ ۱۹۶۸ء تک اس نے ۲۵۰ کروڑ کی ضمانت دی۔ چودہ برسوں میں کارپوریشن نے ۴۰۶ کمپنیوں کو مالی امداد دی۔

مجموعی مالی امداد جو کارپوریشن نے منظور کی وہ ۱۹۶۶ء کے مقابلے میں ۱۹۶۷ء میں کم تھی یعنی ۲۲۹ کروڑ کے مقابلے میں ۵۶، کروڑ۔ یہ تخفیف زیادہ تر اس قرض میں ہوئی جو روپے کی شکل میں تھا۔ اس کی بنیادی وجہ اس وقت کی عام کساد بازاری تھی۔

ترقیاتی منصوبہ بندی کے دوران صنعتی ترقی کے لیے مالی وسائل فراہم کرنے کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ منصوبہ بندی اگر قومی سطح پر ضروری ہے تو پروجیکٹ کی سطح بھی ناگزیر ہے۔ انڈسٹریل کریڈٹ انوسٹمنٹ کارپوریشن کا کام یہ دیکھنا ہے کہ پروجیکٹ کی سطح پر منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔

کارپوریشن اپنے قسم کی بے مثال مہم ہے۔ یہ صرف قرض دینے والے ادارے کی حیثیت سے کام نہیں کرتا ہے جو صرف اس ضمانت کو دیکھتے ہیں جو قرض کے لیے پیش کی جاتی ہے۔ اس نے کافی بڑے پیمانے پر ضمانت لینے کا بھی کام کیا ہے اور بہت سی کمپنیوں کے شیئر کیپٹل میں سرمایہ لگایا ہے لیکن کارپوریشن کی سرگرمیوں کا نہ صرف سرمایہ کاری کی عام فضا سے گہرا تعلق ہے بلکہ سرکاری پالیسی سے بھی جو اس فضا کے بنانے میں فیصلہ کن رول ادا کرتی ہے۔

(ج) نیشنل انڈسٹریز کارپوریشن

یہ کارپوریشن فروری ۱۹۵۵ء میں قائم کیا گیا۔ اس کا مقصد فروخت کی سہولتیں اور قسطوں پر مشینیں خریدنے کی سہولت فراہم کرنا اور چھوٹی صنعتوں کو ترقی دینا تھا۔ کارپوریشن کو پرائیویٹ لیمیٹڈ کمپنی کی حیثیت سے رجسٹر کرایا گیا۔ اس کو دس لاکھ روپے سرمائے کا مجاز کیا گیا۔ ساری رقم حکومت نے فراہم کی۔ حکومت سے وقتاً فوقتاً مزید قرض کی بھی اُمید کی جاتی ہے تاکہ کارپوریشن اپنے رواں سرمائے میں اضافہ کرسکے۔

متوازن صنعتی ڈھانچے کے لیے ذیلی صنعتی یونٹوں کو ترقی دینا ضروری ہے۔ اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ کے تعاون سے کارپوریشن نے کوشش کی ہے کہ جہاں بھی ممکن ہو وہاں بڑے یونٹوں کے گرد چھوٹے یونٹ قائم کیے جائیں جو بڑی صنعت کو کل پرزے فراہم کریں۔ اُس نے بڑی صنعتوں کی ہمت افزائی کی بھی کوشش کی ہے کہ یہ اپنی ضرورت کی چیزیں چھوٹے یونٹوں سے خریدیں بشرطیکہ اِن یونٹوں کی پیداوار کی استعداد کافی ہو۔ کارپوریشن نے چلتی پھرتی دوکانوں اور تھوک کے گوداموں کے ذریعے چھوٹی صنعتوں کی پیداوار کی فروخت میں مدد کی ہے۔ بیرونی ملکوں کی نمائشوں میں منتخب چھوٹی صنعتوں کی پیداوار کو رکھا گیا ہے اور دوسرے تجارتی ذرائع سے ان کی فروخت کی ہمت افزائی کی گئی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ کارپوریشن نے سرکاری خرید کے شعبوں سے تعلق پیدا کر کے ایسا انتظام کرنے کی کوشش کی ہے کہ چھوٹے یونٹوں کو ٹھیکے مل سکیں۔

چھوٹے یونٹوں کی ترقی میں بنیادی طور سے دو چیزیں حائل رہی ہیں، ٹکنیکل مہارت اور جدید مشینوں کی کمی۔ کارپوریشن نے ۱۹۵۶ء میں ایک اسکیم شروع کی جس کے تحت چھوٹے صنعت کاروں کو جو کاروبار کر رہے ہیں یا شروع کرنے والے ہیں، نئی مشینیں اور پرزے قسط پر فراہم کیے جاتے ہیں۔ شرائط آسان رکھی گئی ہیں تاکہ چھوٹے یونٹ فائدہ اُٹھا سکیں۔ اُمیدواروں کو عام مشینوں کے لیے ۲۰٪ اور خاص مشینوں کے لیے ۲۲½ فی صدی ابتداً جمع کرنا پڑتا ہے۔ اگست ۱۹۶۶ء سے کارپوریشن نے خرید کی ہوئی مشینوں کا ۵٪ سروس چارج بھی لگا دیا ہے ۱۹۶۶-۶۷ء میں کارپوریشن نے ۲۰۸ کروڑ قیمت کی برآمد کی ہوئی مشینیں فراہم کیں۔ اس سے پچھلے سال ۲۴۴ کروڑ قیمت کی مشینیں فراہم کی گئی تھیں۔ کارپوریشن چھوٹے یونٹوں کی ساکھ قائم کرنے کے لیے اُن کی پیداوار کو معیاری بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ قسم کو معینہ معیار پر رکھنے کے لیے معائنے کا ایک

نظام قائم کیا گیا ہے۔ کارپوریشن ڈائرکٹر جنرل آف سپلائز اینڈ ڈسپوزل سے بھی گفت و شنید کرتا ہے تاکہ چھوٹی صنعتوں کو مال فراہم کرنے کے آرڈر مل سکیں۔

قسطوں پر سامان فراہم کرنے کی اسکیم و چھوٹی صنعتوں سے قریب تر لانے کے لیے اور ان کے سامان نے فروخت میں زیادہ موثر طریقے سے مدد کرنے کے لیے کارپوریشن کی سرگرمیوں کو چار ضمنی کارپوریشنوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک بمبئی، ایک مدراس، ایک کلکتہ اور ایک دہلی میں ہے۔ ضمنی کارپوریشن ۱۹۵۵ء میں قائم کیے گئے۔ یہ کارپوریشن پیداوار کی فروخت اور قسط پر مشینری کی حاصل کرنے کی سہولتوں کے علاوہ لوہے اور فولاد اور دوسرے خام مال کا اسٹاک بھی رکھتے ہیں جن کی ضرورت چھوٹی صنعتوں کو پڑتی ہے جنہیں حکومت ضمنی صنعتوں کی حیثیت سے ترقی دینا چاہتی ہے

ان ضمنی کارپوریشنوں کی مدد کے باوجود کارپوریشن اُن تمام چھوٹی صنعتوں کی ضروریات موثر طریقے سے نہیں پوری کر پاتا جو ملک کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چنانچہ مدراس، ناگالینڈ و کشمیر کے علاوہ تمام صوبوں نے اسمال انڈسٹریز کارپوریشن قائم کیے ہیں جو نیشنل کارپوریشن کے نمونے پر بنائے گئے ہیں۔

(د) ری فائنانس کارپوریشن

اگست ۱۹۵۸ء میں ہندوستان اور امریکہ کے درمیان پی۔ ال۔ ۴۸۰ کا جو معاہدہ ہوا تھا اُس کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی کہ امریکہ اس معاہدے کے تحت جو گیہوں فراہم کرے گا اُس کی فروخت کی قیمت کے بقدر روپے کی شکل میں جوابی فنڈ قائم ہوگا۔ اس فنڈ میں سے ۲۶ کروڑ روپے نجی کاروبار کو قرض دینے کے لیے الگ کر دیا جائے گا۔ یہ قرض بینکوں کے ذریعے دیا جانے گا۔ بعد میں یہ طے پایا کہ اس فنڈ کو ایک ری فائنانس کارپوریشن کے ذریعے صرف کیا جائے۔ یہ کارپوریشن جون ۱۹۵۸ء میں ایک پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی کی حیثیت سے رجسٹر ہوا تھا۔ ری فائنانس کارپوریشن نے چھ سال سے کچھ زیادہ ایک آزاد ادارے کی حیثیت سے کام کیا۔ ستمبر ۱۹۶۴ء سے اس کے سارے کام انڈسٹریز ڈیولپمنٹ بینک نے لے لیے جو حال میں قائم ہوا تھا۔ بینک نے نہ صرف ری فائنانس کی سہولتوں کو جاری رکھا بلکہ اُس نے فیصلہ کیا کہ صنعتی کاروباروں کو دی جانے والی ری فائنانس کی رقم کی مد ۵۰ لاکھ سے بڑھا کر ایک کروڑ کر دی جائے۔

اگرچہ کارپوریشن کو قائم کرنے کا فوری مقصد جوابی فنڈ کی تقسیم تھا لیکن بنیادی مقصد یہ تھا کہ اوسط درجے کی صنعتوں کی مشینوں اور آلات کی ضروریات پورا کرنے کے سلسلے میں امداد جاتی

انتظام میں جو خلا تھا اُس کو پُر کیا جائے۔ کارپوریشن کا مقصد یہ تھا کہ کمرشیل بینکوں اور دوسرے اداروں کی ہمت افزائی کی جائے تاکہ وہ اوسط مدت کے لیے مالی وسائل فراہم کرنے کی سہولتیں بڑھائیں۔ چوں کہ قدرتاً یہ نقد کو ترجیح دیتے تھے اس لیے اس کے بجائے کے طور پر ری فائنانس کی سہولتوں کا اُن سے وعدہ کیا جائے۔ اس طریقے کا فائدہ یہ ہے کہ سرکاری منظر بیچ سے نکل جاتا ہے کیوں کہ بینک قرض کی اہلیت کے اُن معمولی اور لوچ دار معیاروں کا اطلاق کرسکتے ہیں جو جوکھم لیتے وقت صرف وہ اختیار کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ۱۹۶۲ء کے ۹ کے مقابلے میں ۱۹۶۳ء میں ۲۷ مالیاتی اداروں کو ری فائنانس کی سہولتیں دی گئیں۔ سہولت پانے والوں میں نہ صرف بینک تھے بلکہ صوبائی فائنانس کارپوریشن اور مدراس انڈسٹریل انوسٹمنٹ کارپوریشن بھی تھے جنھیں ایسے وقت مدد ملی جب ان کے لیے اپنے بانڈ اور ڈبنچرز کے ذریعے پبلک سے سرمایہ طلب کرنا مشکل تھا۔

کارپوریشن ۲۵ کروڑ کے سرمائے کا مجاز ہے۔ یہ سرمایہ ایک ایک لاکھ کے ۲۵۰۰ شیئرز پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں اس کے بورڈ آف ڈائرکٹرز نے ۱۲۵۰ کروڑ کے شیئرز جاری کیے جنھیں ریزرو بینک، لائف انشیورنس کارپوریشن اور ۱۵ شیڈیولڈ بینکوں نے لیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے قیام کے وقت اس کا حاصل سرمایہ ۳۰۵۵ کروڑ تھا یعنی ۱۲۵۰ کروڑ شیئر کیپٹل اور ۲۶۵ کروڑ [illegible] کا روپیہ۔ کارپوریشن نے پیداوار بڑھانے کے مقصد سے دوبارہ قرض کی سہولتیں اُن قرضوں کے مقابلے میں دیں جو ممبر بینکوں اور مالیاتی اداروں نے صنعتی کاروبار کو دیے تھے۔ معمولاً یہ قرض انفرادی طور سے ۵۰ لاکھ سے زیادہ کے نہیں تھے اور ان کی میعاد تین سال سے کم اور سات سال سے زیادہ نہیں تھی۔ عام طور سے یہ سہولتیں صرف اُن صنعتوں کو حاصل تھیں جن کا بے باقی سرمایہ اور محفوظ فنڈ ۲۵ لاکھ سے کم اور ½۲ کروڑ سے زیادہ نہیں تھا۔ محفوظ رقم میں ٹیکسوں کی ادائیگی کے لیے اور فرسودگی کی منہائی کے لیے محفوظ رقمیں شامل تھیں۔

یہ بات اہم ہے کہ کارپوریشن نے اپنے دیے جانے والے قرضوں کو متنوع کیا ہے اور اپنے حدودِ کار میں مختلف قسم کی سرگرمیوں کو شامل کیا ہے۔ ساتھ ہی نئی صنعتوں کے قیام کے لیے ری فائنانس کی سہولتیں فراہم کی ہیں۔ [illegible] ری فائنانس [illegible] ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ ۱۹۶۳ء میں اس نے جس رقم کی منظوری دی [illegible] اُن قرضوں کو ری فائنانس کرنے کے لیے تھا جو نئی صنعتیں قائم کرنے کے لیے دیے گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرض لینے والے اداروں سے کارپوریشن کو صنعت کے لیے معیاری [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] صنعتی ترقی کے ساتھ

مطالبات زیادہ دلیری کے ساتھ پورے کرنے میں مدد ملتی ہے

(۱۰) یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا

یونٹ ٹرسٹ کی حیثیت بنیادی طور سے ایک بچولیے (Middle Man) کی ہے جو بہت چھوٹے سرمایہ لگانے والوں کے وسائل یکجا کر کے ان کی طرف سے مختلف قسم کی سکیوریٹی میں لگاتا ہے۔ یونٹ ٹرسٹ کو جو آمدنی ہوتی ہے وہ اخراجات نکالنے کے بعد یونٹ رکھنے والوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ ٹرسٹ کا سرمایہ برابر کی قیمت کے یونٹوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ جن سکیوریٹیوں میں روپیہ لگایا جاتا ہے وہ یونٹ ہولڈروں کی ملکیت ہوتی ہیں اور انھیں لگے ہوئے سرمایہ پر مناسب منافع کا حق ہوتا ہے۔ ٹرسٹ ہمیشہ اس بات پر تیار رہتا ہے کہ اگر کوئی یونٹ ہولڈر اپنے یونٹ واپس بیچنا چاہے تو وہ فوراً خرید لیتا ہے جس کی وجہ سے یونٹ ہولڈروں کو اپنا سرمایہ نقد کرنے کی بڑی سہولت ہوتی ہے۔ جن قیمتوں پر یونٹ ٹرسٹ ان یونٹوں کو بیچتا ہے اور دوبارہ خریدتا ہے اُس کا تعین اس وقت کے بازار بھاؤ سے ہوتا ہے۔

یونٹ ٹرسٹ یکم فروری ۱۹۶۴ء کو ۵ کروڑ کے سرمائے سے شروع ہوا۔ اس میں ڈھائی کروڑ ریزرو بینک، ۷۵ لاکھ لائف انشورنس کارپوریشن، ۷۵ لاکھ اسٹیٹ بینک اور اُس کی شاخوں اور ایک کروڑ شیڈیولڈ بینکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں نے لگایا۔ اس پانچ کروڑ کے ابتدائی سرمائے سے ٹرسٹ نے سکیوریٹیاں حاصل کیں جن کی بنیاد پر یونٹ جاری کیے گئے۔

ٹرسٹ کے یونٹوں کی ظاہری قیمت نہ دس روپے سے کم اور نہ سو روپے سے زیادہ ہوگی۔ ٹرسٹ جس قیمت پر یونٹ فروخت کرے گا اُس کا تعین کرتے وقت یونٹ کی ظاہری قیمت پر اعلان کردہ منافع سامنے رکھا جائے گا۔ خریداروں کے لیے یونٹوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

عام نگرانی اور ہدایت اور انتظام ایک بورڈ آف ٹرسٹیز کے سپرد ہے۔ بورڈ کی تشکیل یوں ہے: ایک چیرمین ہوتا ہے جس کو ریزرو بینک مقرر کرتا ہے۔ پانچ ٹرسٹی ریزرو بینک نامزد کرتا ہے، ایک ایک ٹرسٹی اسٹیٹ بینک اور لائف انشورنس کارپوریشن نامزد کرتے ہیں اور دو ٹرسٹی دوسرے ادارے منتخب کرتے ہیں جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔ ٹرسٹ کو اختیار ہے کہ ریزرو بینک، دوسرے بینکوں اور قرض کے دوسرے اداروں سے قرض لے سکتا ہے۔ ٹرسٹ چوں کہ یونٹ ہولڈروں کی نمائندگی کرتا ہے اس لیے انکم ٹیکس اور دوسرے ٹیکسوں سے مستثنیٰ ہے

ٹرسٹ متوسط اور کم آمدنی والوں کو موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ کسی خاص مشکل کے بغیر یونٹ کی شکل میں حاصل کر سکتے ہیں جس کی بنیادی قیمت وقت گزرنے کے ساتھ کم نہ ہوگی بلکہ بڑھے گی۔ اس موقع پر

یہ بھی ذکر کر دینا چاہیے کہ شہری علاقوں سے باہر یونٹوں کو مقبول بنانے کے لیے ٹرسٹ نے ڈاک خانے کے ساتھ ایسا انتظام کیا ہے کہ ڈاک خانے سے یونٹ خریدے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ جولائی ۱۹۶۵ء سے ۴۰۰۰ کمرشل بینکوں کے علاوہ ۱۴۰۰۰ ڈاک خانوں نے بھی یونٹ کی فروخت شروع کر دی ہے۔

ٹرسٹ یکم جنوری ۱۹۶۴ء کو قائم ہوا اور یکم جولائی ۱۹۶۴ء سے اس نے یونٹ فروخت کرنا شروع کیا۔ ابتدا میں یعنی یکم جولائی ۱۹۶۴ء سے ۱۳ اگست ۱۹۶۴ء تک یونٹوں کو ان کی ظاہری قیمت دس روپے کے حساب سے فروخت کیا گیا۔ اس کے بعد سے یونٹوں کی قیمت روزانہ متعین کی جاتی ہے۔ ۲۰ نومبر ۱۹۶۴ء سے ٹرسٹ نے فروخت اور واپس خرید کی قیمتوں کا روزانہ اعلان کرنا شروع کر دیا۔

۳۰ جون ۱۹۶۷ء تک ٹرسٹ کے رجسٹر میں درج یونٹ ہولڈروں کی مجموعی تعداد ۰۰۸۱۲ تھی اور مجموعی رقم جو انھوں نے لگائی تھی ۳۱۴۰۱۳ کروڑ تھی۔ یونٹ ٹرسٹ کی عام آمدنی ۱۹۶۶ء کے ۲ء۴ کروڑ سے بڑھ کر ۱۹۶۷ء میں ۷ء۴ کروڑ ہو گئی جس سے ظاہر ہے کہ اس کی آمدنی زیادہ ہوئی تھی۔ ۱۹۶۷ء میں ٹرسٹ نے ۲۲ء۷۰ کروڑ قیمت کے یونٹ واپس خریدے جب کہ ۱۹۶۶ء میں ۱۱ء۹۹ کروڑ کے خریدے تھے۔

ابتدا میں ٹرسٹ نے اپنا کافی سرمایہ سرکاری سکیورٹیوں کی خریداری میں لگایا تھا لیکن رفتہ رفتہ سرمایہ کاری کے بہتر مواقع ملنے پر اس نے دوسری قسم کی سکیورٹیوں کو خریدنا شروع کر دیا۔ کام شروع کرنے کے تیسرے سال کے ختم پر ٹرسٹ کا سرمایہ ان ۰۰ صنعتی کاروباروں میں لگا ہوا تھا جن کی مالی حالت اچھی تھی۔ اب تک ٹرسٹ اپنے سرمائے کو مستقل آمدنی والی اور غیر متعین آمدنیوں کی سکیورٹیوں میں متوازن طریقے سے لگانے میں کامیاب رہا ہے۔ ٹرسٹ کا بنیادی مقصد یہ رہا ہے کہ سرمائے کو اس طرح لگایا جائے کہ سرمایہ محفوظ بھی رہے اور زیادہ سے زیادہ آمدنی بھی ہو۔

مختصر یہ کہ ٹرسٹ سے توقع ہے کہ یہ چھوٹے سرمایہ کاروں کی بچت کو اکٹھا کرے گا بلکہ سرمایہ کاروں میں اعتماد پیدا کر کے سرمائے کی بنیاد کشادہ کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ٹرسٹ کے اطمینان بخش کام سے ملک کی کیپٹل مارکٹ کو تقویت پہنچے گی اور منصوبہ بند ترقی کے لیے مسلسل وسائل فراہم کرنے میں ٹرسٹ نمایاں رول ادا کرے گا۔

(و) انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بینک

صنعتوں کو مالی وسائل فراہم کرنے اور ترقی دینے کے لیے جو مخصوص ادارے قائم کیے گئے ہیں ان میں تازہ ترین انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بینک ہے۔ یہ بینک یکم جولائی ۱۹۶۴ء کو ۵۰ کروڑ کے سرمائے سے قائم کیا گیا۔ اس کا مقصد صنعتوں کو اوسط اور لمبی مدت کے لیے سرمایہ فراہم کرنا ہے۔ یہ

بینک ریزرو بینک کی ملکیت اور اسی کے زیر اہتمام ہے اور ضرورت پڑنے پر اس کا سرمایہ ۵ کروڑ سے بڑھاکر ۱۰ کروڑ کیا جاسکتا ہے۔ بینک نے یکم جولائی ۱۹۶۴ء سے دس کروڑ کے بے باقی سرمایے سے اپنا کام شروع کیا۔ ۱۹۷۲ء کے دوران اس کے باقی سرمایے کو دس کروڑ سے بڑھاکر ۳۰ کروڑ کر دیا گیا۔

بینک کے ابتدائی وسائل میں وقتاً فوقتاً اضافہ کیا جاتا رہتا ہے۔ اضافے کے ذرائع یہ ہیں: حکومت سے قرض جس میں بلا سود کا دس کروڑ روپے کا ایک قرض شامل ہے جس کو پندرہ سالانہ قسطوں میں ادا ہونا ہے۔ بانڈ اور ڈبنچرز (سرکاری ضمانت کے ساتھ) اور اس کے بیع کی فروخت۔ ایسی رقمیں جمع کرنا جنھیں ایک سال سے پہلے نہیں نکالا جاسکتا، ریزرو بینک سے قرض جس میں نیشنل انڈسٹریل کریڈٹ فنڈ سے لمبی مدت کے قرض شامل ہیں۔ نیشنل انڈسٹریل کریڈٹ فنڈ ریزرو بینک نے یکم جولائی ۱۹۶۴ء کو ۱۰ کروڑ قرض دے کر قائم کیا تھا۔ اس کے علاوہ حکومت کی شرکت سے ایک اسپیشل ڈیولپمنٹ فنڈ بنایا گیا تاکہ اس کی مدد سے انڈسٹریل بینک اُن پروجیکٹوں کو مالی وسائل فراہم کرسکے جو بھاری سرمایے کی ضرورت اور ایسی ہی دوسری وجہوں سے بینکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں سے وسائل نہ حاصل کر سکتے ہوں، لیکن جو اپنی اہمیت کی وجہ سے مخصوص امداد کے مستحق ہوں۔ انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بینک کی دو حیثیت ہیں: صنعتی کاروبار کے لیے قرض دینے والا ادارہ اور دوسرے قرض دینے والے اداروں کے لیے چوٹی کا بینک۔ انڈسٹریل بینک تین سے لے کر پچیس برس تک کے اُن قرضوں کو ری فائنانس کر سکتا ہے جو مرکزی اور صوبائی فائنانس کارپوریشن یا حکومت کے نامزد کیے ہوئے مالی ادارے نے صنعتی کاروبار کو دیے ہیں۔ اسی طرح شیڈیولڈ بینکوں اور کوآپریٹیو بینکوں کے تین سے لے کر پانچ سال کی مدت کے دیے ہوئے قرض کو ری فائنانس کرسکتا ہے۔ مرکزی اور صوبائی فائنانس کارپوریشن کے شیئرز اور بانڈ خرید سکتا ہے۔ ڈسکاؤنٹ اور ری ڈسکاؤنٹ کے ایکسچینج بل اور ہنڈیاں قبول کرسکتا ہے۔

ان کاموں کے علاوہ انڈسٹریل بینک کے فرائض اور بھی ہیں۔ صنعتی اداروں کو یہ خود مالی وسائل فراہم کرسکتا ہے۔ صنعتی اداروں نے کھلے بازار میں جو قرض لیے ہیں یا شیڈیولڈ بینکوں اور دوسری مخصوص ایجنسیوں سے جو قرض لیے ہیں اُن کی ادائیگی کی تاخیر کی صورت میں ضمانت لے سکتا ہے جو انھوں نے صنعتی اداروں کے شیئرز اور ڈبنچرز کو انڈررائٹ کرکے قبول کی ہیں۔

انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بینک کی حیثیت ریزرو بینک کے ایک ضمنی ادارے کی ہے۔ اس کے تمام ایکویٹی شیئرز ریزرو بینک کے پاس ہیں اور ریزرو بینک کا بورڈ آف ڈائرکٹرز اس کا بھی بورڈ ہے چنانچہ

سوال یہ اُٹھتا ہے کہ کہ ریزرو بینک کے بورڈ یا اُس کے گورنر پر ذمہ داریوں کا بوجھ یونہی کیا کم ہے۔ ترقیاتی کاموں اور مرکزی بینکنگ کے کاموں کی ہدایت خود بڑا کام ہے۔ کیا ایسی صورت میں یہ بورڈ اس نئے ادارے کو اتنا وقت اور اتنی توجہ دے سکے گا جس کی ضرورت ہوگی۔

یاد رکھنا چاہیے کہ یکم ستمبر ۱۹۶۴ء سے انڈسٹریل بینک نے ری فائنانس کارپوریشن کا سارا کاروبار اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اس نے کسی ادارے کو ری فائنانس کی سہولت فراہم کرنے کی حد ۵۰ لاکھ سے بڑھا کر ایک کروڑ کر دی ہے۔ اس کے علاوہ متوسط درجے کے اکسپورٹ کریڈٹ پر سے ۵۰ لاکھ کی حد ختم کر دی ہے۔ ۱۹۶۷ء کے دوران انڈسٹریل بینک کی دی ہوئی مالی امداد میں کمی واقع ہوئی جس کی وجہ بعض صنعتوں میں کساد بازاری تھی۔ یہ مجموعی رقم ۵۶۷ ۳ کروڑ تھی جو ۱۹۶۶ء کی رقم یعنی ۷، ۱۲۳ کروڑ کی تقریباً نصف تھی۔ مجموعی ادائیگی میں بھی کمی واقع ہوئی جو ۱۹۶۶ء کے ۶۲٫۲ کروڑ کے مقابلے میں ۵۰٫۲۶ کروڑ تھی۔ جولائی ۱۹۶۴ء میں اپنے قیام کے وقت سے انڈسٹریل بینک نے ۹۱٫۰۰۲ کروڑ کی امداد منظور کی اور ۴۳٫۱۷ کروڑ کی ادائیگی کی۔ ۱۹۵۸ء میں جب سے ری فائنانس کارپوریشن قائم ہوا جو ستمبر ۱۹۶۴ء میں انڈسٹریل بینک میں مدغم کر دیا گیا) ۸۰۷ امیدواروں کو ۳۳۱ کروڑ کے بقدر ری فائنانس کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ حال میں انڈسٹریل بینک نے فیصلہ کیا کہ وہ عموماً دفاعی اور برآمداتی صنعتوں، ضروری صرفی اشیا بنانے والی صنعتوں کو ترجیح دے گا جو زراعتی اور صنعتی ترقی کی بنیاد تیار کرتی ہیں۔

انڈسٹریل بینک کے کاموں میں سے ایک کام یہ بھی ہے کہ یہ چوٹی کے بینک کے فرائض انجام دے اور صنعت کو میعادی وسائل فراہم کرنے والے اداروں کے کاموں میں تال میل پیدا کرے۔ انڈسٹریل بینک کی حکمت عملی کا تقاضا ہے کہ یہ مالیاتی اداروں کو اور صنعتی کاروباروں کو ری فائنانس یا دوسرے طریقوں سے امداد فراہم کرے یا دوسرے اداروں کی شرکت میں صنعتی اداروں کی مدد قرض اور انڈر رائٹنگ کے ذریعے کرے۔ اس سلسلے میں یاد رہے کہ ری فائنانس کی اسکیم کے تحت ابتدائی قرض دینے والا متعلقہ صنعتی کاروبار کے جوکھم کی پوری ذمہ داری لیتا ہے لیکن خیال یہ ہے کہ ملک کی صنعتی ترقی اور بینکوں کی ترقی کی موجودہ منزل میں یہ ضروری ہے کہ انڈسٹریل بینک ری فائنانس کے علاوہ دوسرے اداروں کے ساتھ جوکھم میں بھی شریک ہو۔ انڈسٹریل بینک کے لیے یہ کام عملی اعتبار سے مشکل نہ ہوگا۔ تمام بینک اور اُن کی شاخیں اور صوبائی فائنانس کارپوریشن ایسے امدادی ادارے ہیں جن کے ذریعے انڈسٹریل بینک ملک کے مختلف حصّوں اور علاقوں میں اپنے کام انجام دے سکتا ہے اور اپنی امداد تقسیم کر سکتا ہے۔

اپریل ۱۹۶۸ء میں انڈسٹریل بینک نے صنعتی قرضوں اور ضمانتوں میں شرکت کی ایک نئی اسکیم شروع کی جس کا

مقصد اشتراک کو ایک نئے نظام کے تحت ترقی دینا ہے۔ جہاں تک بینکوں کا تعلق ہے اِس اسکیم کا مقصد اس براہِ راست امداد کو محدود کرنا ہے جو یہ بینک صنعتی اداروں کو دیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی مقصد ہے کہ اِن بینکوں کے ذریعے دی جانے والی امداد کے دائرے کو وسعت دی جائے اور صنعتی ترقی کی موجودہ ضرورت کے پیشِ نظر معیشت کے اور شعبوں کو اِس میں شامل کیا جائے۔ برآمداتی حلقے کی طرف قرض کا بہاؤ بڑھانے کے لیے انڈسٹریل بینک نے اگست ۱۹۷۰ء میں اوسط مدت کے قرض کو ری فائنانس کرنے کی اسکیم کو اور زیادہ نرم بنایا۔ بھاری اشیا کے سلسلے میں ایکسپورٹ کریڈٹ کی زیادہ سے زیادہ مدت ۵ سال سے بڑھا کر ۸ سال اور غیر معمولی صورتوں میں دس سال کر دی گئی۔

انڈسٹریل بینک دوسرے اداروں کی شرکت میں قرض کے ۲۵٪ تک شرکت کرتا ہے۔ غیر معمولی صورتوں میں یہ حد ۵۰٪ ہو سکتی ہے۔ اگر انڈسٹریل بینک قرض میں شرکت کرتا ہے تو شریک اداروں کو قرض کے اُس حصے کے لیے ری فائنانس کی سہولت نہیں دیتا جو ان اداروں نے دی ہے۔ شرکت کی اسکیم میں معمولاً صوبائی کارپوریشن کے ۲۰ لاکھ تک کے قرض اور دوسرے بینکوں کے ۵ لاکھ تک کے قرض آتے ہیں۔

مختصر یہ کہ آزادی کے بعد کئی مخصوص مالیاتی اداروں یا ترقیاتی بینکوں کے قیام سے صنعتی مالیات کے میدان میں بہت سے خلا پُر ہوتے جا رہے ہیں۔ اِن اداروں میں قریبی تعاون سے ہمارا صنعتی مالیات کا نظام مضبوط ہوگا اور صنعتی ترقی کی راہ پر تیز گام ہونے میں ہمیں مدد ملے گی۔

باب ۲۱

چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کا رول

(۱۹۵۵ء کی کاروے کمیٹی کی رپورٹ کے حوالے سے)

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہمارے ملک میں بہت بے روزگار ہیں اور جو روزگار سے لگے بھی ہیں وہ بھی سال کے کئی مہینے بیکار رہتے ہیں۔ چنانچہ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ایسے روزگار شروع کیے جائیں جن میں بہت زیادہ سرمائے کی ضرورت نہ ہو اور جن سے بے روزگار اور کم روزگار لوگوں کو روزگار کے مواقع مل سکیں۔ دوسرے پلان میں اس مسئلے کی اہمیت کا پورا اندازہ تھا اور یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ صرف بڑے پیمانے کی صنعتیں بے روزگار اور کم روزگار لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کو نہ لگا سکیں گی۔ منصوبہ بنانے والوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ آبادی میں برابر اضافہ ہونے کی وجہ سے یہ مسئلہ گمبھیر ہوتا جائے گا۔ چنانچہ دوسرے پلان میں یہ مقصد سامنے رکھا گیا کہ بڑے پیمانے کی صنعتوں کے ساتھ چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کو بھی ترقی دی جائے۔

ہندوستان کی معاشی ترقی کے دوران چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کے رول کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے بہتر ہوگا کہ ان صنعتوں کے بارے میں کاروے کمیٹی (۱۹۵۵ء) کی رپورٹ کی بنیادی سفارشات کا تجزیہ کیا جائے۔

کاروے کی سفارشات کی خاص باتیں

(۱) بنیادی نظریہ: کمیٹی کو یہ علم تھا کہ بیشتر بے روزگاری ان صنعتوں میں تھی جو روایتی صرفی اشیا بناتی تھیں اور مستقبل میں اس حلقے میں اور زیادہ بے روزگاری کے امکانات تھے۔ اس کی

وجہ یہ تھی کہ اس حلقے میں پیدائش کے جدید طریقوں کے رواج سے پرانے یونٹوں میں لگے ہوئے اور محنت کی حیثیت بتدریج فاضل کی ہو جاتی ہے اور ان یونٹوں کے بند ہونے کی وجہ سے وسائل کی خصوصاً محنت کی بیکاری کا مسئلہ پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ کمیٹی نے اس بات پر زور دیا کہ منصوبہ بند ترقی کے دوران دیہی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں اس ٹکنالوجکل بے روزگاری میں مزید اضافے سے احتراز کیا جائے۔ اس بنیادی نظریے کے دو ضمنی نتیجے نکلتے ہیں: ایک تو یہ کہ حکومت کی پالیسی ایسی ہونی چاہیے کہ موجودہ پیشوں میں بے روزگاری اور کم روزگاری کو کامیابی کے ساتھ روکا جا سکے اور روزگار کے نئے مواقع فراہم کیے جائیں۔ دوسرے یہ کہ ایسے اقدام کرنے چاہئیں جن سے مستقبل میں ایک ایسے لامرکزی سماج کا ڈھانچہ تیار ہو سکے جس میں معاشی ترقی کی رفتار کافی تیز ہو۔ ان دو اہم ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ روزگار کے موجودہ مواقع جاری رکھے جائیں اور نئے مواقع پیدا کیے جائیں۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ہندوستانی معیشت میں مجموعی پیداوار میں اضافہ اور توسیع ہو۔

بہرحال کمیٹی روزگار کے مقصد کو زیادہ اہمیت دیتی ہے اور مزید ٹکنالوجکل بے روزگاری سے احتراز پر مُصر ہے۔ جہاں تک دوسرے مقصد یعنی پیداوار میں اضافے کا سوال ہے، اس کو اس طرح پورا کرنا ہے کہ اس کی وجہ سے پہلے مقصد کے حصول میں کوئی رخنہ نہ پڑے۔ پیداوار بڑھانے اور اس کی استعداد بڑھانے کی پہلی شرط یہ ہے کہ طریقہ پیداوار کو بہتر کیا جائے لیکن کمیٹی کی رائے ہے کہ پیداوار کے طریقے میں ترقی کی اجازت صرف اُسی حد تک ہوگی جہاں تک روزگار پر اس کا برا اثر نہیں پڑتا۔ کمیٹی نے اس پہلو پر زور دیا کہ جہاں تک کہ موجودہ آلات کی تکنیکی ترقی یا جدید طریقے رائج کرنے کا سوال ہے ان کی ضرورت کے بارے میں کمیٹی کو پورا اتفاق ہے لیکن اس کی وجہ سے روزگار پر خراب اثر نہیں پڑنا چاہیے۔ کمیٹی نے یہ بھی واضح طور سے کہا ہے کہ پیداوار کے نسبتاً غیر معاشی طریقوں کے تحت روزگار میں اضافے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ اس کے برعکس جب نیا سرمایہ لگایا جائے گا تو حتی الامکان بہتر آلات میں لگایا جائے گا یا ایسے موجودہ آلات میں جن کو کچھ اضافہ کر کے بہتر بنایا جا سکتا ہو۔

کمیٹی کا خیال ہے کہ چونکہ بے روزگاروں اور کم روزگار لوگوں کی بہت بڑی تعداد گاؤں اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں سے تعلق رکھتی ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ انھیں راحت دینے کے لیے ایسے کاموں سے لگایا جائے جس میں انھیں روایتی تربیت ملی ہے اور جس کے آلات ان کے پاس موجود ہیں۔ اس سے صرفی اشیا کی پیداوار فوراً بڑھانے کے لیے نیا سرمایہ لگانے اور عملے کو تربیت دینے

کا مسئلہ بھی کافی حد تک حل ہو جائے گا چنانچہ بھاری اور کلیدی صنعتوں کی تعمیر کے دوران بہتر ہوگا کہ صرفی اشیا کی پیداوار کے لیے ابھی کچھ دنوں تک روایتی صنعت اور سرمائے و محنت کے موجودہ وسائل پر بھروسہ کیا جائے۔ اس لیے دوسرے پلان میں دیہی اور چھوٹی صنعتوں کو نمایاں حیثیت دی گئی ہے۔

(۲) پروگرام کی حکمت عملی: کمیٹی کی سفارش ہے کہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے دیہی اور چھوٹی صنعتوں کی ترقی اور توسیع کے ابتدائی دور میں صرفی اشیا بنانے والی بڑے پیمانے کی صنعتوں کی توسیع کی ایک حد مقرر ہونا چاہیے۔ ایسا کرنے سے صرفی اشیا کی طلب کا رُخ چھوٹی صنعتوں کی پیداوار کی طرف ہو جائے گا۔ تنظیم، فروخت اور مالیات کے میدان میں مثبت کاروائی کرنا ضروری ہے۔

لیکن رپورٹ میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ سفارشات کے اثباتی حصے کو پورا کرنے کے لیے مناسب انتظامی ڈھانچہ ضروری ہے۔ یاد رہے کہ اثباتی تدابیر کا آخری مقصد دیہی صنعتوں میں بہتر طریقے رائج کرنا ہے چنانچہ ان کی تعمیل میں تاخیر کا مطلب یہ ہوگا کہ فنی طریقوں میں تبدیلی کا عمل نسبتاً سست پڑ جائے گا۔ فی الحال ایسا لگتا ہے کہ کمیٹی کی صنعتی تدابیر کے پورے ہونے کے مواقع زیادہ بہتر ہیں لیکن پیداوار کو محدود رکھنے جیسی پابندیاں اگر عائد کی گئیں تو نااہل طریقے باقی رہیں گے اور بہتر طریقوں کا رائج کرنا مشکل ہو جائے گا۔

(۳) مثبت تدابیر: کمیٹی نے جن مثبت تدابیر کی حمایت کی ہے ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں: (الف) لامرکزی اور حتی الامکان کواپریٹیو بنیاد پر معاشی زندگی کو وفاقیت دینا (ب) پیداکاروں کو منصوبہ بند طریقے سے خام مال، آلات اور دوسری چیزیں فراہم کرنا اور ابتدا میں ان کے مال کی منظم فروخت کے لیے خرید و فروخت کی سوسائٹیاں قائم کرنا۔ سرکار کو ضمانت دے کر کواپریٹیو نظام کو ان کاموں میں مدد دینی ہوگی (ج) کواپریٹیو ڈیولپمنٹ اینڈ ویر ہاؤسنگ کارپوریشن (WARE-HOUSING CORPORATION) کے قیام کے لیے ایکٹ بناتے وقت اس کے دائرہ کار میں چھوٹی صنعتوں کے مال کی بھی فروخت شامل کی جائے (د) جہاں تک ممکن ہو طویل المدت قرض کی سہولتوں کے لیے صوبائی کارپوریشن کی ایجنسیوں سے کام لیا جائے اور اس کے لیے ہر کارپوریشن میں گھریلو صنعتوں کا ایک شعبہ قائم کیا جائے (ہ) زراعتی قرض کی طرح دیہی اور کواپریٹیو صنعتوں کو مالی وسائل فراہم کرنے کے پروگرام کی مجموعی ذمہ داری ریزرو بینک کی ہونی چاہیئے۔ اسٹیٹ بینک کو ان صنعتوں کو وسائل فراہم کرنے میں زیادہ دلچسپی لینی چاہیئے (و) ان صنعتوں کے لیے مرکز میں ایک الگ وزارت ہونی چاہیئے اور اس کے وزیر کو کابینہ میں ہونا چاہیئے۔ مرکزی حکومت کو صنعتی پالیسی میں ربط پیدا کرنے کے لیے کابینہ کی ایک کمیٹی مقرر کرنا چاہیئے۔

(۴) صنعتی سفارشات اور امتناعی تدابیر: کمیٹی نے جن امتناعی تدابیر کی سفارش کی ہے وہ چار قسموں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں: (الف) سوتی کپڑا بننے اور ہاتھ سے دھان کوٹنے کی صنعتوں کی چالو پیداوار میں توسیع پر پابندی عائد کی جائے اور ان کے دائرہ کار محفوظ کر دیئے جائیں۔ چاولوں کی ملوں کی پیداوار پر پابندی لگا کر دھان ہاتھ سے کوٹنے کی صنعت کو تحفظ دینے کا جواز ہو سکتا ہے کہ دستی صنعت میں روزگار کے امکانات ہیں جس کو کھیتی کے خالی زمانے میں روزگار دینے کے لیے وقتی طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کمیٹی کی اس سفارش سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ ملوں اور پاور لوم کی پیداوار پر ۵۰۰ کروڑ گز اور [illegible] کروڑ گز کی پابندی عائد کی جائے اور کپڑے کی مزید طلب جس کا تخمینہ دوسرے پلان کے دوران [illegible] کروڑ گز ہے، ہینڈلوم کی پیداوار بڑھا کر پوری کی جائے۔ (ب) بناسپتی اور چمڑے کی صنعت کی پیداواری استعداد کی توسیع پر پابندی کی سفارش کی گئی ہے۔ چونکہ بناسپتی کی پیداواری استعداد پچاس فی صدی اب بھی نہیں استعمال ہو پائی اس لیے کمیٹی نے سفارش کی تھی ملوں کے قیام کی اجازت نہ دی جائے، سوا ان علاقوں کے جہاں تیل پیرنے کے دوسرے طریقے قابل عمل نہیں ہیں۔ چمڑے کی صنعت کے بارے میں کمیٹی نے تجویز کیا کہ دوسرے پلان کے دوران نئے یونٹوں کی پیداواری استعداد بڑھانے کی اجازت نہ دینی چاہیے لیکن کارخانوں کی غیر استعمال شدہ استعداد پر کسی قسم کی پابندی کی ضرورت نہیں ہے (ج) کمیٹی نے سوتی کپڑے اور ہاتھ سے کوٹے چاول پر چنگی اور دوسری امتیازی ڈیوٹی کی سفارش کی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دیہی اور گھریلو صنعت کا مال دوسرے مال کے مقابلے میں سستا ہو۔

کاروے کمیٹی کی سفارشات کا جائزہ

ہم کاروے کمیٹی کے اس دعوے سے یقینی متفق ہیں کہ دیہی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں لگی ہوئی بیشتر آبادی کی آمدنی اور اُن کی زندگی کو بہتر بنانے کی کوئی بھی کوشش قوم کے لیے مفید ہوگی۔ لیکن ہمیں اس تجویز کے بارے میں شبہ ہے کہ کام دیہی کاریگروں کے دروازے تک لے جایا جائے۔ اس اصول پر چھوٹی صنعتوں کو ترقی دینے سے محنت کی حرکت پذیری گھٹ جائے گی اور بعد میں بہتر طریقے رائج کرنے میں مانع ہوگی۔

یاد رکھنا چاہیے کہ معاشی ترقی کے ہر مرحلے کے مطابق تکنیکی ترقی کی بھی ایک منزل ہوتی ہے۔ اس وقت تو بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ترقیاتی منصوبہ بندی کے ابتدائی دور میں جب ہم بھاری اور کلیدی

صنعتیں تعمیر کرنے میں مصروف ہیں، چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کو اگر پرانے طریقے پر چلنے دیا جائے تو روزگار فراہم کرنے اور صرفی اشیا کی پیداوار بڑھانے کے ہمارے مقاصد زیادہ اچھی طرح پورے ہو سکتے ہیں۔ لیکن ترقی کے ساتھ ہمیں صرفی اشیا کی صنعتوں میں بھی تکنیکی ترقی لانی ہوگی۔ آج ہمیں جس قسم کی صرفی اشیا کی ضرورت ہے کل وہ ہمارے لیے بیکار ہوں گی بہ الفاظ دیگر آج ہم جن صنعتوں کو تحفظ دیتے ہیں وہ آگے چل کر نئی تکنیکی استعداد حاصل کر کے ہی زندہ رہ سکتی ہیں۔ ایک ترقی پذیر اور توسیع پذیر معیشت میں یہ صنعتیں نئی تکنیکی استعداد تب ہی حاصل کر سکتی ہیں جب زیادہ سرمایہ لگانے کے بہتر طریقے استعمال کیے جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ترقی کے عمل کو کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آگے چل کر گھریلو صنعتوں کو مشینی یونٹوں میں تبدیل کیا جائے جو پاور سے چلتی ہیں اور بہتر تکنیک استعمال کرتی ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ امتناعی تدابیر کی صورت میں بہت زیادہ تحفظ دینے سے دیہی کاریگروں کا افق تنگ ہو جائے گا اور آگے چل کر انھیں فرسودہ طریقوں کی گرفت سے نکالنا مشکل ہوگا۔ اگر ایسا ہوا تو اس سے ترقیاتی منصوبہ بندی کا عمل یقیناً رُک جائے گا۔ ان امکانی خطرات کو کم کرنے کے لیے حکومت کو کاروے کمیٹی کی مثبت سفارشات کی تعمیل کی طرف فوراً توجہ دینا چاہیے۔

اگر ہندوستان کی منصوبہ بند ترقی میں چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کو نمایاں رول ادا کرنا ہے تو انھیں امداد اور وقتی تحفظ ملنا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی حکومت کو ترقی پسند پالیسی کے ذریعے موثر اقدام کرنے چاہئیں کہ ان صنعتوں کی اہلیت اور مستعدی کی سطح برابر اونچی ہوتی رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ترقی پذیر معیشت میں بہتر طریقوں اور زیادہ اہلیت اور مستعدی ہی کے بل پر زندہ رہا جا سکتا ہے۔ اِس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ چھوٹی صنعتوں کو یہ سمجھ کر اہمیت دینا چاہیے کہ یہ ہمارے شدید مسائل کا صرف وقتی حل ہیں اور اس مدت میں ہمیں ان یونٹوں کو جدید طریقوں پر منظم اور نئے آلات سے لیس کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے۔

چھوٹی صنعتوں کے مسائل

بیشتر چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کو مختلف قسم کے مسائل کا سامنا ہے جو ان کی کارکردگی اور ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ اِن میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ ان کے مصارف پیداوار زیادہ ہونے کا ہے۔ وقتی طور پر انھیں جو تحفظ دیا گیا ہے اُس کی وجہ سے انھوں نے اس مشکل صورت حال پر قابو پا لیا ہے جو مصارف پیداوار کی زیادتی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن انھیں زندہ رہنے کے لیے ضروری ہوگا کہ

یہ اپنی کارکردگی بڑھائیں، پیداواری استعداد میں اضافہ کریں اور اس طرح مصارف پیداوار کم کریں ۔ جاپان اور سوئٹزر لینڈ کی چھوٹی صنعتوں کے مطالعے سے ہمیں اپنی چھوٹی صنعتوں کو منظم کرنے اور نئے آلات سے لیس کرنے میں مدد ملے گی۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ جاپان کی بیشتر چھوٹی صنعتوں کی قوتِ مقابلہ بھاری صنعتوں اور چھوٹے صنعتی یونٹوں کے درمیان پیداوار اور تعاون کے مشترک پروگرام کا نتیجہ ہے۔ جاپان میں بعض صنعتوں کے مربوط پروگرام کی افضلیت ظاہر کرنے کے لیے مصارف کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ جاپان میں بعض بھاری صنعتوں کا انحصار چھوٹی صنعتوں پر بہت زیادہ ہے، مثلاً (ROLLING STOCK) کی صنعت کے مجموعی مصارف کا ۲۰ فیصد حصہ چھوٹی صنعتوں سے سامان خریدنے پر صرف کرتی ہے۔ جہاز بنانے کی صنعت ۴۳ فیصد ضروریات چھوٹی صنعتوں سے پوری کرتی ہیں۔ جاپان کے تجربے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پیداوار کے مشترک پروگرام کی بنیاد پر تعاون سے مصارف پیداوار کم ہوتے ہیں۔ یہ بات اطمینان بخش ہے کہ حکومت چھوٹے یونٹوں کو بڑی صنعتوں کی ضمنی صنعتوں کی حیثیت سے مقبول بنانے اور اس طرح مصارف پیداوار کم کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔

چھوٹی اور گھریلو صنعتیں اور دوسری خرابیوں میں بھی مبتلا ہیں، مثلاً ناقص تنظیم، تکنیکی جانکاری کی کمی، خرید و فروخت کا خراب انتظام، پیداوار کے معیار میں عدم یکسانیت، مالی وسائل کی کمی اور بنیادی خام مال اور پاور کی قلت۔ اُمید ہے کہ حال میں قائم کیے گئے اسمال اسکیل انڈسٹریز سروسز انسٹی ٹیوٹ، نیشنل اسمال انڈسٹریز کارپوریشن، صوبائی اسمال انڈسٹریز کارپوریشن اور صوبائی فائنانس کارپوریشن ان رکاوٹوں کو دور کرنے میں مدد کریں گے جو ان صنعتوں کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔

بین الاقوامی پلاننگ ٹیم (۱۹۵۴) کے تجویز کردہ تدارک

فورڈ فاؤنڈیشن کی سرپرستی میں آئی ہوئی انٹرنیشنل ٹیم نے چھوٹی صنعتوں کے مسائل کے مطالعے کے لیے ۱۹۵۴ء میں ہندوستان کا دورہ کیا اور اپنی رپورٹ پیش کی۔ ٹیم نے چھوٹی صنعتوں میں پھر سے جان ڈالنے کے لیے مندرجہ ذیل طریقے تجویز کیے:

(۱) **مخصوص اداروں کا قیام:** ٹیم نے ٹکنولوجی کے چار کثیر المقاصد ادارے قائم کرنے کی سفارش کی جو جغرافیائی اعتبار سے اس طرح قائم کیے جائیں جو ملک کے تمام حصوں کی ضرورت پوری کر سکیں۔ ٹیم نے ایک نیشنل اسکول آف ڈیزائن قائم کرنے کی بھی سفارش کی جو ڈیزائن کے تخلیقی مطالعے

کا مرکز ہو۔ اس کے علاوہ ہندوستان اور بیرونی ممالک کے خریداروں کو رسد کا ایک قابلِ اعتبار ذریعہ فراہم کرنے کے لیے ایک کنزیومرس سروس کارپوریشن اور دستکاری کے سامان اور آرٹ کی چیزوں کی برآمد کو ترقی دینے کے لیے یورپ اور شمالی امریکہ میں ایک ایک اکسپورٹ ڈیولپمنٹ آفس کھولنے کی بھی سفارش کی۔

(۲) قرض اور مالی وسائل کی فراہمی: ٹیم نے سفارش کی کہ (۱) کمرشل بینک چھوٹے کاروباروں کو قرض دینے کے زیادہ اختیارات اپنی شاخوں کو دیں (۲) کوآپریٹیو بینک چھوٹی صنعتوں کو بھی مالی امداد دیں (۳) صوبوں میں مالیاتی کارپوریشن قائم کیے جائیں جو اپنے فنڈ کا ایک حصہ چھوٹی صنعتوں کی امداد کے لیے الگ کردیں (۴) غیر منقولہ جائداد کی ضمانت پر قرض دینے کا طریقہ رائج کیا جائے کیونکہ اس سے چھوٹی صنعتوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

(۳) کوآپریٹیوز: خام مال کی خرید اور تیار مال کی فروخت کے لیے کوآپریٹیو ادارے قائم کیے جائیں لیکن حکومت نوزائیدہ بچے کی طرح ان کی پرورش سے احتراز کرے۔

(۴) مارکٹنگ اور تقسیم: مرکزی حکومت ایک خود مختار مارکٹنگ سروس کارپوریشن قائم کرے جو سروے کے ذریعے صارفوں کی طلب کا پتہ لگائے اور پیداکاروں کی ہمت افزائی کرے کہ وہ اس طلب کو پورا کریں۔ کارپوریشن سے چھوٹی صنعتوں کو بازار سے متعلق خبریں پہنچانے کا کام بھی لیا جاسکتا ہے۔ چاروں کثیر المقاصد اداروں کو خبر رسانی کے اِس کام میں نمایاں رول ادا کرنا چاہیے۔

چھوٹی صنعتوں کی تنظیم اور ترقی کے میدان میں ان سفارشات سے نئی راہیں کھلیں۔ حکومت نے ٹکنولوجی کے چار علاقائی انسٹی ٹیوٹ، ایک نیشنل اسمال اسکیل انڈسٹریز کارپوریشن اور ایک مارکٹنگ سروس آرگنائزیشن قائم کردیا۔ یہ ادارے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو منظم کرنے، انھیں تقویت دینے اور نئے آلات سے لیس کرنے میں نمایاں رول ادا کررہے ہیں۔

چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی طرف سرکاری پالیسی

(پانچ سالہ منصوبوں کے مخصوص حوالے سے)

آزادی کے بعد سے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی طرف حکومت کی پالیسی میں بہت موافق تبدیلی آئی ہے۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی نے صنعتی ترقی کے مجموعی پروگرام میں چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کو ایک نمایاں رول دیا ہے۔ پہلے پلان میں صنعتی ترقی کے لیے ۴۹ کروڑ رکھے گئے تھے۔ دوسرے پلان کی بنیادی

حکمت عملی نے ان صنعتوں کو اہم رول دیا۔ ان کی ترقی پر ۱۰۵ کروڑ روپے خرچ کیے۔ تیسرے پلان میں دیہی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی کے لیے ۲۶۴ کروڑ روپے تجویز کیے گئے لیکن پلاننگ کمیشن کے مطابق ان صنعتوں پر تیسرے پلان میں صرف ۲۲۰ کروڑ روپے واقعی صرف کیے گئے۔
چوتھے پلان میں ان صنعتوں کے لیے ۸۰۰ کروڑ تجویز کیے گئے ہیں۔ چوتھے پلان میں چھوٹے پیمانے کی صنعت کی تعریف زیادہ وسیع کر دی گئی ہے۔ کوئی بھی کاروبار جس کا قائم سرمایہ ۵ لاکھ سے زیادہ نہیں ہے' چھوٹی صنعت میں شمار ہوگا اور حکومت سے ملنے والی مختلف امداد سے استفادہ کر سکے گا۔

(الف) پہلے پلان کے دوران ترقی: چھوٹی اور دیہی صنعتوں کی ترقی اور توسیع کے لیے پہلے پلان میں دو اہم اقدام کیے گئے --- (۱) مرکزی حکومت نے ان صنعتوں کی ترقی کے لیے خاصی رقم رکھی (۲) کھادی اور دیہی صنعتوں' دستکاری کی صنعتوں' چھوٹے پیمانے کی صنعتوں' سیری کلچر (SERICULTURE) اور کوائر (COIR) کی صنعتوں کے مسائل سے نپٹنے کے لیے آل انڈیا بورڈوں کا جال بچھا دیا گیا۔ پہلے پلان کے ختم کے قریب چار علاقائی اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ مع کئی شاخوں کے قائم کیے گئے۔ ان کا مقصد چھوٹے کاروباروں کو مشورہ' امداد اور ٹکنکل سروس فراہم کرنا تھا۔ پہلے ہی پلان کے دوران چھوٹی صنعتوں کے مال کی فروخت کے لیے نیشنل اسمال اسکیل انڈسٹریز کارپوریشن بھی قائم کیا گیا۔

(ب) دوسرے پلان کے دوران بنیادی پالیسی: دوسرے پلان کے دوران حکومت ٹکنولوجیکل بے روزگاری سے بچنے کے متعلق کاروے کمیٹی کی سفارشات کی ممکن حد تک تعمیل کرنا چاہتی تھی اور اس نے کوشش کی کہ روایتی دیہی صنعتوں میں زیادہ سے زیادہ روزگار فراہم کیا جائے۔ دوسرے پلان کے دوران تمام صوبوں میں اسمال اسکیل انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ قائم کر دیے گئے۔ ان کے علاوہ دیہی چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے تعاون سے ملک کے مختلف علاقوں میں ۴۲ ایکسٹنشن سنٹر قائم کیے گئے۔ دوسرے پلان کے دوران ۷۰۰ چھوٹے کارخانوں پر مشتمل ۶۰ انڈسٹریل اسٹیٹ بھی قائم کیے گئے اگرچہ پلان میں تجویز ۱۲۰ کی تھی۔

(۲) دوسرے پلان کا صنعتی پروگرام ۱۹۵۶ء کے انڈسٹریل پالیسی ریزولیوشن پر مبنی تھا۔ اس ریزولیوشن میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ حسب ضرورت ریاست کی پالیسی یہ ہوگی کہ لامرکزی حلقے کی دیہی اور چھوٹی صنعتوں کو اتنی تقویت دی جائے کہ یہ خود کفیل ہو سکیں اور ان کی ترقی بڑے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی میں ربط قائم رہے۔ توقع تھی کہ دیہاتوں میں بجلی کی توسیع اور سستی پاور کی دستیابی سے

آئندہ ان مقاصد کے پورا کرنے میں مدد ملے گی۔ اس دوران دیہی اور چھوٹی صنعتوں کو تحفظ دینے کے لیے بڑے پیمانے کی صنعتوں کی پیداوار محدود رکھنے اور امتیازی ٹیکس یا براہِ راست امداد کی پالیسی جاری رکھی جائے گی

(ج) دوسرے پلان کے دوران ترقی: دوسرے پلان کے پانچ برسوں میں دیہی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں پر ۱۷۵ کروڑ کی مجموعی رقم صرف کی گئی ۔ ۱۲۰ انڈسٹریل اسٹیٹ کے قیام کی منظوری تھی جس میں سے ۶۰ دوسرے پلان کے دوران قائم کیے گئے اور باقی ۶۰ کو تیسرے پلان میں لیا گیا۔ چھوٹی صنعتوں کو ٹکنیکل اور مارکٹنگ سے متعلق مشورہ دینے کے لیے تمام صوبوں میں انڈسٹریل سروس انسٹی ٹیوٹ اور ۴۲ اکسٹنشن سنٹر قائم کیے گئے۔

(د) تیسرے پلان کے دوران بنیادی پالیسی: بڑی صنعتوں کے ساتھ چھوٹی صنعتوں کو بھی تیسرے پلان کے دوران ترقی دی گئی تاکہ یہ زیادہ روزگار فراہم کرسکیں اور صرفی اشیا اور بعض پیداواری اشیا کی پیداوار بڑھا سکیں۔ تیسرے پلان کے پبلک سکٹر کے پروگرام میں ان صنعتوں کے لیے ۲۶۴ کروڑ روپے رکھے گئے تھے جس میں سے ۲۴۰ کروڑ خرچ ہوسکے۔ دوسرے پلان میں ۱۷۵ کروڑ خرچ ہوئے تھے۔ دوسرے پلان کے ۱۲۰ کے مقابلے میں تیسرے پلان میں ۳۰۰ نئے انڈسٹریل اسٹیٹ قائم ہونے کی توقع تھی۔ پلاننگ کمیشن کے مطابق ۲۳۴ انڈسٹریل اسٹیٹ قائم ہوسکے۔ توقع ہے کہ چوتھے پلان میں ۲۵۰ انڈسٹریل اسٹیٹ قائم کیے جائیں گے۔ ان میں کواپریٹیو انڈسٹریل اسٹیٹ بھی شامل ہیں۔

مختصر یہ کہ چھوٹی اور گھریلو صنعتیں ہماری معیشت کا ایک اہم جز ہیں۔ یہ چھوٹے کاروبار جن میں ہماری بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور کم روزگاری کو روکنے کے امکانات ہیں، ہماری ترقیاتی منصوبہ بندی کے دوران ضمنی کاروبار کی حیثیت رکھتے ہیں اور ملک کی معیشت کے استحکام میں اہم رول ادا کررہے ہیں۔ لیکن اس متحرک دور میں اگر انھیں زندہ رہنا ہے تو بہتر طریقوں کو اپنانا ہوگا اور نئے آلات سے اپنے کو لیس کرنا ہوگا۔

باب ۲۲

بڑے پیمانے کی صنعتوں کے مسائل

(صنعت کی عقلی تنظیم کے مسائل کے مخصوص حوالے سے)

برطانوی عہد میں بھی ہماری معیشت کے جدید منظم حلقے میں کچھ بڑے پیمانے کی صنعتیں تھیں۔ ہندوستان کی ترقیاتی منصوبہ بندی کے دوران اِن صنعتوں کو بڑھایا جا رہا ہے اور نئی صنعتیں شروع کی جا رہی ہیں۔ چنانچہ بڑی صنعتوں کے اہم مسائل کا جائزہ مفید ہوگا۔

سوتی کپڑے کی صنعت

(الف) تاریخی پس منظر: یوں تو سوتی کپڑے کا پہلا کارخانہ کلکتے میں ۱۸۱۸ء میں قائم ہوگیا تھا لیکن دراصل یہ صنعت ۱۸۵۴ء میں شروع ہوئی ہے جب بمبئی میں کارخانے قائم ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں اِس صنعت کو تحفظ دینا منظور کیا گیا اور اِس تحفظ کے اکیس سال کے دوران اس نے کافی ترقی کرلی۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں تحفظ ختم کر دیا گیا۔ دوسری جنگ کے دوران یہ صنعت ا پنے عروج پر پہنچ گئی۔ جب جاپانی مال آنا بالکل بند ہوگیا اور کپڑا سپلائی کرنے کے بڑے آرڈر اتحادی فوجوں سے ملے۔ ۱۹۴۳ء میں کپڑے کی پیداوار نکتہ عروج پر پہنچ گئی اور ۴۸۵ کروڑ گز کپڑا تیار کیا گیا۔ ہندوستان کی تقسیم اور ستمبر ۱۹۴۹ء میں ہندوستانی روپے کی قیمت گھٹانے سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو تجارتی تعطل پیدا ہوا۔ اُس کی وجہ سے روئی کی رسد بہت کم ہوگئی اور بہت سے کارخانوں کو وقتی طور سے بند کرنا پڑا۔ بعد میں خام روئی کی اندرونی اور بیرونی رسد تیز کی گئی اور پیداوار کافی بڑھی۔ اس بہتر صورت حال کی وجہ سے حکومت کو جولائی ۱۹۵۳ء میں کپڑے پر سے

کنٹرول ہٹانے میں مدد ملی۔ پچھلے چند برسوں سے ہندوستان سوتی کپڑا بڑی مقدار میں جنوب ایشیائی اور وسط ایشیائی ملکوں کو برآمد کر رہا ہے۔ اِس مقصد کے لیے ایک اکسپورٹ پروموشن ارگنائزیشن قائم کر دیا گیا ہے۔

(ب) جائے وقوع میں تبدیلی: ۱۹۲۰ء تک بمبئی سوتی کپڑے کے کارخانوں کا مرکز تھا۔ اس وقت سوتی کپڑے کی صنعت کے ارتکاز کا تناسب دس تھا۔ یعنی بقیہ ملک کے دس گنے کارخانے بمبئی میں تھے۔ کسی بھی ہموار طریقے سے پھیلی ہوئی صنعت کے تعین مقام کا جزِ ضربی ایک ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بمبئی کے معاملے میں معیار سے انحراف ۹ تھا۔ پچھلے برسوں میں صنعت کے تعین مقام میں تبدیلی آئی ہے اور شمالی ہندوستان، مدراس اور میسور میں کارخانے کھُل جانے کی وجہ سے جائے وقوع میں تنوّع پیدا ہوا ہے۔ بمبئی میں صرف عمدہ قسم کے کپڑے بنتے ہیں جو ہلکے ہوتے ہیں اور جنھیں ملک کے دُور دراز حصّوں کو بھیجنے کا خرچ زیادہ نہیں آتا۔ نئے کارخانے زیادہ تر موٹے کپڑے بناتے ہیں اور مقامی ضروریات پوری کرتے ہیں۔

(ج) بنیادی مسائل: ہندوستان کی سوتی کپڑے کی صنعت کے چار بنیادی مسائل ہیں (۱) پہلا مسئلہ خام مال کی قلّت کا ہے۔ دوسرے پلان میں خام روئی کی سالانہ پیداوار کا نشانہ ۶۵۵ لاکھ گانٹھ مقرر کیا گیا تھا لیکن پلان کے پہلے سال صرف ۴۷ لاکھ گانٹھ اور آخری سال ۵۴ لاکھ گانٹھ پیداوار ہو سکی۔ تیسرے پلان کا نشانہ ۷۰ لاکھ گانٹھ تھا لیکن پلان کے چوتھے سال یعنی ۱۹۶۳-۶۴ء میں صرف ۵۴ لاکھ گانٹھ روئی پیدا ہوئی۔ آخری سال یعنی ۱۹۶۵-۶۶ء میں پیداوار اور گھٹ گئی یعنی ۴۷ لاکھ گانٹھ۔ ۱۹۶۶-۶۷ء میں بھی فصل اچھی نہیں ہوئی لیکن ۱۹۶۷-۶۸ء میں دفعتاً فصل بہت اچھی ہوئی اور پیداوار ۶۲ لاکھ گانٹھ تک پہنچ گئی مگر یہ بھی پلان کے مقررہ نشانے سے بہت پیچھے تھی۔ اِس لیے اِس میں شبہ ہے کہ ۱۹۷۰-۷۱ء تک ہم چوتھے پلان کے نشانے ۸۰ لاکھ گانٹھ تک پہنچ سکیں گے۔ مستقبل میں ہمیں لمبے ریشے کی روئی باہر سے کافی منگانی پڑے گی تاکہ سپر فائن کپڑا تیار ہو سکے جس کی طلب برابر بڑھ رہی ہے۔ اب جبکہ کپڑے کی صنعت کی ضروریات بڑھ رہی ہیں زرِ مبادلہ کی صورت اور بگڑ گئی ہے۔ مختصر یہ کہ دیسی روئی کی رسد تو کم تھی ہی، زرِ مبادلہ کی قلّت کی وجہ سے روئی درآمد کرنا اور بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ خام مال کی قلّت کے مسائل کی یہی وجہ ہے (۲) دوسرا مسئلہ پیداآوری میں تخفیف سے پیدا ہوتا ہے۔ جب پیداآوری گھٹتی ہے تو مصارفِ پیداوار بڑھ جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو منافع کم ہو جاتا ہے یا پیداوار کی قیمت میں اضافے کی وجہ سے صارفوں پر بوجھ پڑتا ہے۔ درحقیقت اس وقت صنعت کا

سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ مصارف پیداوار میں اضافے کو کیسے روکا جائے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کارخانوں میں نئی مشینیں لگائی جائیں اور اس طرح کارخانوں کی کارکردگی بڑھا کر مصارف پیداوار کم کیے جائیں۔ صنعت کی عقلی تنظیم، پیداوار کی قسم پر قابو رکھنے کے طریقوں اور وقت و حرکت کے مطالعے سے (TIME CUM MOTION STUDY) پیداآوری بڑھانے اور مصارف پیداوار کم کرنے میں مدد ملے گی لیکن اس سے کارخانوں کی نئے آلات کی ضرورت نہیں رفع ہوسکتی۔ نئی مشینیں لگا کر ہی یہ اس قابل ہوسکیں گی کہ اپنی پیداوار بڑھا سکیں اور کم قیمت پر اپنا مال بازار میں پیش کرسکیں (۳) تیسرے مسئلے کا تعلق برآمدات کی ترقی سے ہے۔ ہینڈلوم کی صنعت کو تحفظ دے کر حکومت نے مقامی مارکٹ کا بڑا حصہ اس کے لیے محفوظ کردیا اور مل کے بنے کپڑے کی برآمد بڑھانی چاہی اور تیسرے پلان میں برآمد کا نشانہ ۵۰ کروڑ گز سالانہ مقرر کیا۔ ۱۹۶۶ء میں ۴۹½ کروڑ گز مل کا بنا کپڑا برآمد کیا گیا۔ یہ مقدار ۱۹۶۳ء کے ۵۲ کروڑ ۲۰ لاکھ گز سے کم تھی۔ خود ۱۹۶۳ء کی مقدار ۱۹۵۹ء کی ۱۸ کروڑ گز سے ۲۵ فی صدی کم تھی۔ اس موقع پر یہ ذکر کردینا چاہیے کہ جون ۱۹۶۶ء میں روپے کی شرح مبادلہ کم کرنے کے بعد سوتی کپڑے کی برآمد کی ہمت افزائی کرنے کی اسکیم عملاً ختم کردی گئی۔ حکومت کا کہنا تھا کہ روپے کی شرح مبادلہ کم ہوجانے کی وجہ سے برآمد کرنے والوں کی آمدنی ۵ء۵۰ فی صدی کے بقدر بڑھ گئی اس لیے برآمدات کے لیے محرکات کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ لیکن صنعت نے جلد ہی محسوس کیا کہ روپے کی شرح مبادلہ کم ہونے کے باوجود کچھ بازاروں اور کچھ قسم کے کپڑوں میں اس کی قوتِ مسابقت کمزور تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ روپے کی شرح مبادلہ کم ہونے سے کپڑے کی صنعت کے مصارف پیداوار بڑھ گئے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ کپڑے بنانے کی مشینیں، روئی، رنگ اور کیمیاوی چیزیں ملک کو اب بھی درآمد کرنی پڑتی تھیں۔ خطرہ یہ ہے کہ مصارف پیداوار میں اضافے کی وجہ سے ملک کو سوتی کپڑے کی برآمد کو قائم رکھنا مشکل ہوجائے گا۔ پچھلے چند برسوں میں نیوزیلینڈ، مغربی جرمنی، اٹلی اور اسپین سوتی کپڑے کی برآمد کے میدان میں آگئے ہیں اور بیرونی منڈیوں میں ہمیں ان ملکوں سے سخت مقابلے کا سامنا ہوگا۔ جب تک ہم اپنے کپڑے کی قسم اور اُس کے معیار کو بہتر نہیں بناتے اور کم قیمت پر نہیں بیچتے اُس وقت تک ان ملکوں سے اور جاپان سے مقابلہ بہت مشکل ہوگا۔ جاپان کی کپڑے کی صنعت جو جنگ میں بالکل تباہ ہوگئی تھی، پورے طور پر بحال ہوگئی ہے اور نئی مشینوں سے لیس ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جنگ کے بعد سے جاپان نے جو مشینیں لگائی ہیں ان میں سے بیشتر خودکار ہیں جن کی وجہ سے جاپان اس قابل

ہوا ہے کہ قیمت اور قسم کے معاملے میں بیرونی منڈیوں میں کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرسکے۔ سُوتی کپڑے کی برآمد کے معاملے میں ہندوستان کو جاپان سے سبق لینا چاہیے۔ کارخانوں کی زیادہ استعداد، عمدہ آلات اور پیداآوری کی اُونچی سطح کی وجہ سے جاپانی صنعت مارکٹ ریسرچ اور ترقی کے مواقع سے بے حد متاثر ہوئی ہے۔ پاکستان بھی اپنی صنعت کی تعمیر کر رہا ہے اور توقع ہے کہ یہ اپنی جدید مشینوں، روئی کی وافر رسد اور سستی محنت کی وجہ سے نہ صرف اندرونی طلب کو پورا کریگا بلکہ مستقبل میں کافی مال برآمد کرسکیگا۔ چنانچہ ہمیں اپنی سوتی کپڑے کی زبوں حالی کو جلد از جلد دور کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے ملک کو ہر سال کئی کروڑ روپے زرمبادلہ ملتا ہے (۴) آخری مسئلہ کارخانوں اور مشینوں کو بدلنے کا ہے۔ اگر ہمیں مصارف پیداوار کم کرنے ہیں اور صنعت کی کارکردگی بڑھانی ہے تو یہ اشد ضروری ہے کہ ہم اپنے کارخانوں اور مشینوں کو بدل کر صنعت کی تنظیم عقلی اصول پر کریں۔ دوسری جنگ کے دوران ہم نے اپنی مشینوں سے بے حد کام لیا ہے اور پرزے وغیرہ نہ ملنے کی وجہ سے ان کی نگہداشت نہیں کرسکے ہیں اور ان کی فرسودگی کی شرح نمایاں طور سے اُونچی رہی ہے۔ بمبئی مل اونرز ایسوسی ایشن نے ۱۹۵۰ء میں تخمینہ لگایا کہ بمبئی میں ۹۰ فی صدی مشینیں ۲۵ برس پرانی تھیں۔ مسئلے کی اہمیت سے متاثر ہو کر سوتی کپڑے کی صنعت کی ورکنگ پارٹی کی ٹکنکل سب کمیٹی نے یہ رائے ظاہر کی کہ پرانے کارخانوں کی مشینیں فرسودہ ہیں اور ان کی جگہ جلد از جلد نئی مشینیں لگنی چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ ان مشینوں سے کام لینے سے مزدوروں پر زیادہ محنت پڑنے کے علاوہ مصارف پیداوار زیادہ ہونگے اور پیداوار کی قسم خراب ہوگی۔ ورکنگ پارٹی نے مزید تجویز کیا کہ صنعت کی بحالی اور نئی مشینیں لگانے کے عمل کو دس سے لے کر پندرہ سال تک پھیلا دینا چاہیے تاکہ ان کی غیر معمولی قیمت نہ ادا کرنی پڑے اور مشینیں پروگرام کے تحت وقت سے ملتی رہیں۔ یہ بھی سفارش کی گئی کہ چونکہ ضرورت کے دیکھتے صنعت کی محفوظ رقم ناکافی ہے اس لیے حکومت کو ۴ فی صدی سُود پر قرض دے کر صنعت کی مدد کرنی چاہیے۔ ۱۹۵۱ء میں ورکنگ پارٹی کی رپورٹ کے بعد سے سُوتی کپڑے کی صنعت کی عقلی تنظیم اور نئی مشینیں لگانے کے موضوع پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے لیکن اس سمت میں کوئی قابلِ ذکر ترقی نہیں ہوئی۔ مشینوں کی بحالی اور نئی مشینوں میں تبدیلی بے حد پچھڑی ہوئی ہے جس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ صنعت سے متعلق نیشنل ڈیویلپمنٹ کارپوریشن کے ورکنگ گروپ (۱۹۶۰) کے تخمینے کے مطابق ۱۹۶۶ء تک نئی مشینیں حاصل کرنے کے لیے ۱۸۰ کروڑ روپے کی ضرورت ہوگی۔ ماہرین کی اس سب کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ اس دوران بیرونی ملکوں سے ۶۰ کروڑ روپے کی مشینیں درآمد کرنی پڑیں گی لیکن کارپوریشن نے سوتی کپڑے کی صنعت کو جدید بنانے کے لیے مارچ ۱۹۶۶ء تک صرف ۱۹ کروڑ ۷۰ لاکھ کا قرض منظور کیا اور

اس میں سے صرف ۱۰ کروڑ ۴۰ لاکھ واقعی دیے گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کارخانوں کی بحالی اور مشینوں کی تبدیلی کا اتنا پچھڑا ہوا کام کیسے پورا ہوگا تاوقتیکہ حکومت صنعت کی ہمت افزائی کے بارے میں مستحکم رویہ نہ اختیار کرے جس سے ان ناگزیر اصلاحات کو عمل میں لایا جاسکے جن میں کافی تاخیر ہو چکی ہے۔

(د) جوشی کمیٹی کی سفارشات: سُوتی کپڑے کی صنعت کا جائزہ لینے اور اس کی مشکلات پر قابو پانے کے لیے ضروری اقدام تجویز کرنے کی غرض سے مئی ۱۹۵۸ء میں حکومت نے ٹکسٹائل کمشنر ڈی ۔ اے ۔ جوشی کی صدارت میں ایک اسپیشل کمیٹی مقرر کی (۱) جوشی کمیٹی نے صنعت پر محصول کی اُس تخفیف کا مطالعہ کیا جو حکومت نے ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۸ء میں کی تھی اور اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ تخفیف بہت کم تھی۔ اُس نے سفارش کی کہ یہ محصول اور کم کیا جائے ۔ جولائی ۱۹۵۸ء میں ان سفارشات کی تعمیل کردی گئی (۲) جہاں تک کارخانوں کی جدید طرز پر تنظیم کا سوال ہے، جوشی کمیٹی حکومت کے اس استدلال کے خلاف نہ جاسکی کہ صنعت کی عقلی تنظیم کی اجازت صرف اِس شرط پر دی جاسکتی ہے کہ اس کی وجہ سے بیکار ہونے والے مزدوروں کے روزگار کا کوئی دوسرا انتظام کیا جاسکے۔ کمیٹی نے اس سلسلے میں صرف اِتنا کہا کہ مشینوں کی بدلی کے ہر معاملے کو اس نظریے سے دیکھنا ہوگا کہ قومی مفاد اور صنعت کے مفاد کے کیا تقاضے ہیں۔ یہ رویہ بہت نرم ہے اور اس کی وجہ سے صنعت کو جدید شکل دینے کے کام میں تاخیر ہوگی (۳) جوشی کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی کہ تجربے کے طور پر کارخانوں کو تین ہزار خودکار رُوم لگانے کی اجازت دی جائے جن کا مقصد صرف برآمد کے لیے کپڑا بنانا ہو۔ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو حکومت نے برآمد کرنے والے کارخانوں کو اپنی ضرورت کی مشینیں برآمد کرنے کی اجازت دے دی بشرطیکہ اِس قسم کی مشینیں ملک میں نہ بنتی ہوں اور ان کی قیمت کی ادائیگی پانچ سال پر پھیلی ہوئی ہو۔ اِن خودکار رُوم کی ساری پیداوار برآمد کے لیے ہوگی۔ برآمد کرنے والی ملوں کو اس کے علاوہ بھی موجودہ برآمد کا ۵۰ فی صدی بیرونی ملکوں کو بھیجنا ہوگا۔ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ یہ سخت شرائط کیوں عائد کی گئیں جبکہ جوشی کمیٹی نے اِس سلسلے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ مشینری کی درآمد سے متعلق سرکاری پالیسی سے اس مقصد کے پورا کرنے میں کیا مدد ملے گی۔

(ہ) سرکاری پالیسی پر دوبارہ نظر: فروری ۱۹۵۶ء میں دوسرے پلان کا مسودہ جب قوم کے سامنے پیش ہوا تو یہ کہا گیا کہ مِل کے بنے دھاگے اور کپڑے کی پیداوار کے نشانے کا تعین زیرِ غور ہے۔ پلان کے آخری مسودے میں صرف اِتنا کہا گیا کہ مِل کے بنے کپڑے اور سوت کی پیداوار کا تخمینہ سنہ ۱۹۶۰-۶۱ء تک ۵۰۰ کروڑ گز ۱۹۰ کروڑ پونڈ ہے۔ دوسرے پلان میں بہت خوش اُمیدی کے ساتھ یہ توقع

کی گئی کہ جتنے اسپنڈل موجود ہیں اور جتنوں کو لائسنس دیا جا چکا ہے وہ ۱۹۵ کروڑ پونڈ دھاگہ تیار کرنے کے لیے کافی ہیں۔

۱۹۵۵-۵۶ء میں ۱۶ گز فی کس دستیابی کے مقابلے میں دوسرے پلان نے ۱۹۶۰-۶۱ء کے لیے ۱۸۴۴ گز کا نشانہ مقرر کیا۔ یہ نشانہ قانون گو رپورٹ کی سفارش اور کھادی بورڈ کے پروگرام کے مطابق تھا۔ فی کس کپڑے کی دستیابی کا نشانہ بڑھا کر ۱۸ر۴ گز کر دینے کا مطلب یہ تھا کہ ۱۹۶۰-۶۱ء تک ہمیں اندرونی صرف کے لیے ۷۵۰ کروڑ گز کی ضرورت ہوگی۔ اس میں اگر برآمد کی جانے والی مقدار یعنی ۱۰۰ کروڑ گز کو جوڑ دیا جائے تو مجموعی پیداوار کی ضرورت ۸۵۰ کروڑ تک پہنچ جانے کی توقع تھی۔ بدقسمتی سے ۱۹۵۹-۶۰ء میں روئی کی فصل خراب ہوئی جس کی وجہ سے خام روئی کی رسد گھٹ گئی۔ خام روئی کی قلت، اونچے مصارف پیداوار، بھاری ٹیکسوں اور فرسودہ مشینوں کی وجہ سے ۱۹۶۰-۶۱ء میں اندرونی مصارف کے لیے ۶۵۰ کروڑ اور برآمد کے لیے ½۵۰ کروڑ گز کپڑا بن سکا۔

تیسرے پلان میں ۱۹۶۵-۶۶ء کے لیے اندرونی صرف کا نشانہ ۸۴۵ کروڑ گز متعین کیا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ۱۹۶۵-۶۶ء کے وسط سال کی متوقع آبادی ۴۸ کروڑ ۶۰ لاکھ کے حساب سے فی کس ۱۷ر۵ گز لیکن خام روئی کی قلت اور مہنگائی، پاور کی دستیابی میں کمی، بھاری ٹیکسوں اور فرسودہ مشینوں کی وجہ سے تیسرے پلان کے دوران یہ توقعات پوری نہ ہو سکیں۔ یاد رہے کہ کپڑے کی طلب بڑھنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ صارف کی آمدنی محدود ہے اور سب سے پہلے اُس کو اپنے خاندان کے پیٹ پالنے کی فکر ہوتی ہے۔ کچھ برسوں سے زراعتی پیداوار اور پیداوار کی قیمتیں عام آدمی کے لیے ایسی ناموافق رہی ہیں کہ وہ اپنے معیار زندگی کو اونچا نہیں کر سکا ہے۔ ملک میں کپڑے کے صرف کی شرح کم رہنے کی یہی وجہ ہے۔ جیسا پہلے کہا جا چکا ہے کپڑے کی برآمد روپے کی شرح مبادلہ کم کرنے کے بعد بھی کافی بڑھائی نہیں جا سکی۔ یہی وجہ ہے کہ اِس وقت صنعت کے سامنے سوت اور کپڑے کے اُس بھاری اسٹاک کا مسئلہ ہے جو طلب کم ہونے کی وجہ سے پڑا ہوا ہے۔ کپڑے کی صنعت میں پوری استعداد کام میں نہ لانے کی بھی یہی وجہ ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حال کی سب سے اہم بات کپڑے پر جزوی کنٹرول کی اسکیم ہے جو ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۴ء سے شروع کی گئی۔ اس کے تین مقاصد ہیں، پیداوار پر کنٹرول، بہت عمدہ، عمدہ اور اوسط قسم کی دھوتیوں، ساریوں، لٹھے اور زین پر سے یکم مئی ۱۹۶۸ء سے کنٹرول ہٹا لیا گیا۔ صنعت پر کنٹرول کے دائرہ عمل میں اس تبدیلی کے باوجود عام استعمال کے کپڑوں کی بنیادی قسمیں، مثلاً

دھوتیاں، ساریاں، لٹھا اور موٹی اور اوسط درجے کی زین اب بھی موجودہ کنٹرول کے تحت تیار ہوں گا اور فروخت ہوں گے۔ اِن کپڑوں کی مِل کی قیمت پر ۲½ فی صدی کا اضافہ کر دیا گیا لیکن اس اضافے کا بار صارفوں پر نہیں ڈالا جائے گا۔ مرسی رنگ کی دھوتیاں اور ساریاں اِس اضافے سے مستثنیٰ ہوں گی۔

جوٹ کی صنعت

(الف) تاریخی پس منظر: جوٹ کی صنعت کلکتے اور اس کے قرب و جوار تک محدود تھی۔ اِس صنعت نے تحفظ کے بغیر ترقی کی جس کی وجہ یہ تھی کہ بنگال کا جوٹ آسانی سے ملتا تھا، برطانوی منیجنگ ایجنٹوں نے کافی سرمایہ فراہم کیا تھا اور کلکتے کے بندرگاہ کی سہولت حاصل تھی۔ صدی کی چوتھی دہائی میں سرد بازاری کی وجہ سے صنعت کو سخت دھکا لگا لیکن دوسری جنگ کے دوران صنعت نے نہ صرف اپنے کو سنبھال لیا بلکہ خوش حالی کی نئی بلندی تک پہنچ گئی۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ فوج اور شہری آبادی سے جوٹ کی بوریوں کے بڑے آرڈر مِل رہے تھے۔ ہندوستان کی تقسیم سے صنعت کو شدید دھکا لگا کیونکہ مشرقی بنگال سے آنے والے جوٹ میں بہت کمی آگئی اور ڈھاکہ اور نرائن گنج میں جوٹ کی نئی ملیں کھلنی شروع ہو گئیں۔ ملک میں جوٹ کی پیداوار بڑھانے کی بھرپور کوشش، میستا (MESTA) جیسے بدل کے استعمال اور پاکستان سے تجارتی معاہدے کی وجہ سے پہلے پلان کے اواخر میں صورت کچھ بہتر ہوئی۔ اسی دوران صنعت کو دو اور باتوں سے بھی فائدہ پہنچا، ایک تو غیر سرکاری طور سے پاکستانی روپے کی قیمت گھٹ گئی اور دوسرے پاکستان نے ہندوستان کو بھیجے جانے والے جوٹ پر سے امتیازی ڈیوٹی ختم کر دینے کا فیصلہ کیا جو ۱۹۵۵ء سے نافذ تھی۔

پہلے پلان کے دوران برآمدی ڈیوٹی پر برابر نظر ثانی کی جاتی رہی اور تخفیف کی جاتی رہی۔ اگست ۱۹۵۵ء کو پاکستانی روپے کی شرح مبادلہ میں کمی کے فوراً بعد برآمدی ڈیوٹی بالکل ختم کر دی گئی تاکہ روپے کی شرح مبادلہ کم کرنے سے پاکستان کی جوٹ کی صنعت کو جو فائدہ ہوا تھا اُس کا ازالہ ہو سکے۔

(ب) صنعت کے مسائل: صنعت جن مسائل سے دوچار ہے، مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) خام مال کا مسئلہ۔ یہ تقسیم کے بعد سب سے بڑا مسئلہ تھا کیونکہ جوٹ کا ۸۰ فی صدی علاقہ پاکستان میں چلا گیا تھا۔ توقع تھی کہ جوٹ کی کاشت کے علاقے میں توسیع اور خام جوٹ میں خود کفالت کی کوشش سے جوٹ کی پیداوار بڑھ جائے گی اور ۱۹۵۱ء کی ۳۳ لاکھ گانٹھ کے مقابلے میں ۱۹۵۶-۵۵ء میں ۵۴ لاکھ گانٹھ تک پہنچ جائے گی لیکن دوسرے پلان کی رپورٹ سے ظاہر ہے کہ پلان کے آخری سال ۴۲ لاکھ گانٹھ

جوٹ پیدا ہوا۔ اس میں سے بیشتر حاشیائی زمین (MARGINAL LAND) میں کاشت کیے جانے کی وجہ سے بہت ادنےٰ قسم کا تھا۔ دوسرے پلان میں جوٹ کی پیداوار کا نشانہ ۵۵ لاکھ گانٹھ مقرر کیا گیا جو ۶۱-۱۹۶۰ء تک پورا ہونے کی توقع تھی۔ ۵۹-۱۹۵۸ء میں فصل بہت اچھی ہوئی اور ۵۲ لاکھ گانٹھ جوٹ حاصل ہوا۔ ۵۹-۱۹۵۸ء میں پہلی بار ہندوستان خام جوٹ کی پیداوار میں خود کفالت کے قریب پہنچ گیا۔ ۶۰-۱۹۵۹ء میں سیلاب اور موسم کی خرابی کی وجہ سے جوٹ کی پیداوار تشفی بخش نہیں ہوئی اور گھٹ کر ۴۹ لاکھ گانٹھ پر آگئی۔ چنانچہ ۱۹۶۰ء میں جوٹ کی صنعت کو پھر بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد صورت حال بہتر ہوئی۔ سرکاری تخمینے کے مطابق ۶۴-۱۹۶۳ء میں ۵۵ لاکھ گانٹھ اور ۶۵-۱۹۶۴ء میں ۶۰ لاکھ گانٹھ خام جوٹ پیدا ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء کے درمیان تین متواتر اچھی فصلوں کی وجہ سے خام مال کی قلت کا مسئلہ عارضی طور پر دُور ہو گیا لیکن ۶۶-۱۹۶۵ء اور ۶۷-۱۹۶۶ء میں موسم کی خرابی کی وجہ سے خام جوٹ کی پیداوار نہ صرف کم ہوئی بلکہ ۶۶-۱۹۶۵ء میں پست ترین سطح یعنی ۴۵ لاکھ گانٹھ پر آگئی۔ دوسرے سال بھی صورت کچھ بہتر نہیں تھی۔ جب پیداوار ۵۰ لاکھ گانٹھ ہوئی۔ اگلے سال یعنی ۶۹-۱۹۶۸ء میں شروع میں خشک سالی اور بعد میں سیلاب آنے سے پیداوار ۶۰ لاکھ گانٹھ کے قریب ہونے کی توقع ہے۔ ۶۹-۱۹۶۸ء کی پیداوار میں کمی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جوٹ کی قیمت کم ہونے کی وجہ سے کافی زمین جوٹ سے اناج کی کاشت کی طرف منتقل ہو گئی۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ تیسرے پلان میں جوٹ اور میستا (MESTA) کی پیداوار کا نشانہ ۷۵ لاکھ گانٹھ مقرر ہوا جس میں سے ۶۲ لاکھ گانٹھ جوٹ ہے۔ چوتھے پلان کے لیے جوٹ کی پیداوار کا نشانہ ۷۴ لاکھ گانٹھ ہے۔

(۲) **کارخانوں اور آلات کو جدید بنانا** — جوٹ کی صنعت کی موجودہ مشینیں بیشتر فرسودہ ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پیداوار غیر معاشی ہے۔ کارخانوں کو جلد از جلد جدید بنانے کی ضرورت ہے کیونکہ موجودہ صورت زیادہ دن نہیں چل سکتی۔ یورپی ممالک میں جنگ کے بعد سے جوٹ کی صنعت میں توسیع ہو رہی ہے اور نئی مشینیں لگائی جا رہی ہیں۔ جنوبی افریقہ، برازیل، فلپائن اور جاپان نے بالکل نئی مشینیں لگا کر جوٹ کی صنعت شروع کر دی ہے۔ پاکستان کی مشینیں بالکل نئی ہیں، اس کے جوٹ کی قسم بہت اچھی ہے اور وہاں مزدوری بھی سستی ہے، اور وہ بیرونی منڈیوں میں ہمارے مقابلے میں آ رہا ہے۔ جب تک ہم نئی اور جدید مشینیں نہیں لگاتے اور مقابلے کی استعداد نہیں بڑھاتے ہمارے لیے پاکستان اور دوسرے ملکوں کی نئی مشینوں کے کم قیمت مال کا مقابلہ کرنا مشکل ہوگا۔ چونکہ ہماری صنعت کا انحصار بیرونی

مشینوں پر ہے اس لیے ہمیں جلد از جلد نئی مشینیں لگانا اور صنعت کو جدید بنا لینا چاہیے۔ سنہ ۱۹۵۴ء تک جوٹ ملیں نئی مشینیں لگانے کے مصارف اندرونی وسائل یا ڈبنچرز کے ذریعے سرمایہ حاصل کرکے پورے کرتی تھیں۔ اِس کے بعد کی ضرورت کے لیے ۱۹۵۴ء میں قومی ترقیاتی کارپوریشن نے اِس کام کے لیے ملوں کو قرض فراہم کرنے کا اعلان کیا۔ کارپوریشن نے مارچ سنہ ۱۹۶۶ء تک ۵ء۷ کروڑ قرض کی منظوری دے دی تھی لیکن اِس میں سے صرف ۵ء۵ کروڑ واقعی ادائیگی ہوئی۔ حال میں مرکزی حکومت نے جوٹ کی صنعت کو جدید اور متنوع بنانے کی غرض سے ۵ کروڑ روپے قرض کے لیے منظور کیے ہیں۔

(۳) اُونچی قیمتوں اور جُوٹ کے بدل نکل آنے کا مسئلہ ـــــ تقسیم کے بعد خام مال کی قیمت میں نمایاں اضافے کی وجہ سے مصارف پیداوار کافی بڑھ گئے۔ کارخانوں کو جدید بنانے اور نئی مشینیں لگانے کے پروگرام میں تاخیر کی وجہ سے مصارف پیداوار اور بھی بڑھے۔ قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے جوٹ کے بہت سے بدل نکل آئے۔ بیرونی ملکوں نے فلی پائن کے سیسل (SISAL) کے گُودے کو اور ویسٹ انڈیز کے کیناف (KENAF) کو جوٹ کے بدل کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جوٹ کی صنعت کو کھلی منڈی میں جدید ترین آلات سے لیس کاغذ کے جھولوں کی صنعت اور کپڑے کے جھولوں کی صنعت سے بھی سخت مقابلہ تھا۔ اِس کے علاوہ ایسے طریقے نکل آئے تھے۔ خصوصاً امریکہ میں جن کے ذریعے بوریوں اور جھولوں کے بغیر اشیا کی بھاری مقدار ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچائی جانے لگی۔ سنہ ۱۹۶۱ء سے جوٹ کی بنی اشیا کی قیمت ایک خاطر خواہ سطح سے اونچی نہ ہونے دینے کی غرض سے متعدد اقدام کیے گئے مثلاً جوٹ کی خرید کی آزادانہ تنظیم، جوٹ کی بنی چیزوں کی میعادی ترتیب، فارورڈ ٹریڈنگ پر پابندی اور بینکوں کو جوٹ اور جوٹ سے بنی چیزوں کی ضمانت پر قرض دینے سے ممانعت سنہ ۱۹۶۱ء کے شروع میں جوٹ اور جوٹ سے بنی چیزوں کا لائسنسنگ اینڈ کنٹرول آرڈر نافذ کیا گیا۔ سنہ ۱۹۶۱ء کی تیسری چوتھائی تک قیمتیں معمول کے قریب آنے لگیں لیکن ۱۹۶۵-۶۶ء اور ۱۹۶۶-۶۷ء میں دو سال متواتر فصل خراب ہونے کی وجہ سے خام مال کی پھر قلت ہوگئی اور قیمتیں تیزی سے بڑھنے لگیں۔ ۱۹۶۷-۶۸ء میں فصل اچھی ہوئی اور قیمتیں پھر معمول پر آگئیں۔ ۱۹۶۸-۶۹ء میں فصل پھر خراب ہوئی، خام مال کی رسد پھر گھٹ گئی اور قیمتیں پھر بڑھ گئیں۔

۱۹۵۴ء کے جوٹ اِنکوائری کمیشن کی سفارشات

جوٹ اِنکوائری کمیشن کے چیرمین کے۔ آر۔ پی۔ آئینگر تھے۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ مئی ۱۹۵۴ء

میں پیش کر دی۔ کمیشن کی اہم سفارشات یہ تھیں :

(۱) جوٹ کی صنعت کے لیے ایک ترقیاتی کونسل قائم کی جائے۔

(۲) چونکہ موجودہ استعداد استعمال نہیں ہو رہی ہے اس لیے نئی ملوں کا کھولنا ملتوی رکھا جائے۔

(۳) صنعت کو جدید بنایا جائے اور نئے آلات لگائے جائیں۔

(۴) مکمل کفالت کے بجائے نسبتی خودکفائی کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ پاکستان سے اس قسم کا جوٹ منگایا جا سکے جو ہندوستان میں کافی مقدار میں نہیں پیدا ہوتا۔

(۵) تقسیم کا علاقائی نظام قائم کیا جائے اور خام جوٹ کے لیے کم سے کم قیمت کا تعین کیا جائے۔

(۶) ٹیکس سے استثنیٰ کی شکل میں حکومت امداد دے۔

دسمبر ۱۹۵۴ء میں حکومت نے ایک ریزولیوشن کے ذریعے اعلان کیا کہ وہ کمیٹی کی اس سفارش کو منظور کرتی ہے کہ صنعت کی بے استعمال استعداد کے پیش نظر نئی ملیں لگانے کی اجازت عام طور سے نہ دی جائے۔ مقصد یہ ہونا چاہیے کہ موجودہ استعداد پورے طور پر کام میں لائی جائے۔ ایک دوسری سفارش جو حکومت نے منظور کی یہ تھی کہ مستقبل میں جوٹ کی قسم اور اس کی عمیق پیداوار کی طرف خاص توجہ دی جائے تاکہ ملک کی ضروریات کا زیادہ حصّہ اندرونی پیداوار سے پورا ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جوٹ کی عمدہ قسم اور عمیق کاشت کے پروگرام پر ہمارے پانچ سالہ منصوبوں میں بھی زور دیا گیا ہے۔

کمیشن نے یہ سفارش کی تھی کہ حکومت کا مقرر کیا ہوا جوٹ کمشنر اس بورڈ کے مشورے سے خام جوٹ کی قیمت متعین کرے جس میں مل مالکوں، تجارت کے تمام شعبوں، بینکوں اور مالیاتی اداروں اور صوبائی حکومتوں کے نمائندے شامل ہوں۔ کمیشن نے یہ بھی رائے ظاہر کی تھی کہ مستقبل قریب میں قیمتوں پر قانونی کنٹرول مناسب نہیں ہوگا۔ حکومت نے قیمتوں کے کنٹرول سے متعلق کمیشن کی سفارش سے اتفاق کیا۔ لیکن حکومت کو شبہ تھا کہ جوٹ کمشنر کی قیمتوں کے اعلان کا کوئی خاص اثر قیمتوں پر پڑے گا جو کنٹرول نہ ہونے کی صورت میں منڈی کی عام قوتوں کے تحت متعین ہوں گی چنانچہ حکومت کا خیال تھا کہ قیمتوں کے سلسلے میں مشورہ دینے کے لیے جوٹ بورڈ کی کوئی فوری ضرورت نہیں تھی۔ لیکن حکومت نے وعدہ کیا کہ آگے چل کر اس پر غور کیا جائے گا کہ آیا جوٹ بورڈ کے قیام سے صنعت کے بہت سے مسائل حل کرنے میں مدد ملے گی۔

(د) **حال کے رجحانات :** ۱۹۴۸ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک، یعنی پچھلے ۲۲ برسوں میں جوٹ کی صنعت کی کہانی ایک پُرعزم جدوجہد کی کہانی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جوٹ کی صنعت نے

بہت صبر آزما حالات میں بہت اچھے طریقے سے کام کیا۔ جب ہم پیچھے کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جوٹ کی صنعت کے لیے ۱۹۵۵ء کا سال بہت نیک فال سے شروع ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوموں (LOOMS) کو بند کر دیا گیا تھا اُن میں سے ½ ۱۲ فی صدی کو پھر کام شروع کرنے کی اجازت مل گئی۔ فروری ۱۹۵۵ء میں مزید ۵ فی صدی لوم کھول دیے گئے جن کی وجہ سے پیداوار کافی بڑھ گئی۔ لیکن متوقع طلب میں کمی ہونے کی وجہ سے اسٹاک جمع ہونا شروع ہوگیا۔ چنانچہ جولائی میں ½ ۲ فی صدی اور ستمبر میں ۵ فی صدی لوم پھر بند کر دیے گئے اور اس طرح صنعت پھر اُسی حالت پر پہنچ گئی جس پر سال کے شروع میں تھی۔ کارخانوں میں ایک ہفتے میں صرف ۴۸ گھنٹے کام ہوتا تھا اور ½ ۱۲ فی صدی لوم بند تھے۔

۱۹۵۶ء میں ملوں کو اسٹاک کی جس زیادتی کا سامنا کرنا پڑا اُس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت نے ملوں کو پیداوار بڑھانے پر مجبور کیا تھا۔ بنے ہوئے مال کی قیمتیں گر رہی تھیں اور خام مال کی قیمت اور مصارف پیداوار میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ سے ملوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ ۱۹۵۷ء بھی صنعت کے لیے کچھ اچھا سال نہیں تھا کیونکہ اس سال بھی خام مال کی قیمت بڑھتی رہی، مال کی کھپت کم رہی اور جوٹ کے مال کی پیداوار گھٹتی رہی۔ لیکن برآمدات میں کچھ اضافے کی وجہ سے اندرونی کھپت کی کمی بڑی حد تک پوری ہو گئی۔ ۱۹۵۸ء جوٹ کی صنعت کے لیے بہتر سال تھا۔ اس سال خام جوٹ کی پیداوار میں ملک خود اکتفائی کی منزل سے قریب ہوگیا۔ غیر معاشی یونٹوں کو بند کر کے اور اُن کے لوم دوسرے یونٹوں کو منتقل کر کے پیداوار کو مستعد اور کارکرد یونٹوں میں مرتکز کر دیا گیا۔

۵۹-۱۹۵۸ء کی عمدہ فصل کی وجہ سے ۱۹۵۹ء میں خام مال کی قیمت مناسب رہی۔ اندرونی مانگ کچھ بڑھی، اور امریکہ میں معاشی سرگرمی کی بحالی سے بیرونی طلب بھی کافی بڑھ گئی۔ ۱۹۵۹ء کتائی کے شعبے کو جدید بنانے کے پروگرام میں کافی ترقی ہوئی۔ مزدور نسبتاً خاموش رہے اور صنعت کی صحت کے لیے سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ بیشتر ملوں نے کئی سال بعد منافع ظاہر کیا۔ جس طرح کچھ موافق اتفاقات کی وجہ سے ۱۹۵۹ء صنعت کے لیے نیک سال تھا اسی طرح ۱۹۶۰ء میں کچھ ناموافق اتفاقات رونما ہونے سے وہ سال بہت خراب ثابت ہوا۔ نومبر ۱۹۵۹ء میں یہ اندازہ ہو گیا کہ ۵۹-۱۹۵۸ء کے مقابلے میں ۶۰-۱۹۵۹ء کی فصل بہت کم ہوگی۔ سٹے بازوں نے خام مال کی اس قلت سے فائدہ اُٹھایا اور قیمتوں کو معقول سطح سے بہت اُونچا کر دیا۔ اس کے بعد ۶۲-۱۹۶۱ء اور ۶۳-۱۹۶۲ء کے درمیان خام مال کی رسد کچھ بڑھی اور صورت کچھ بہتر ہوگئی۔ ان برسوں میں جوٹ کی صنعت کی حالت کار کافی مستحکم رہی جس کی خاص وجہ اچھے ریشے کی معقول رسد اور بیرونی طلب میں اضافہ تھا۔

لیکن اس منزل میں آکر پاکستان کی طرف سے خطرہ کافی بڑھ گیا اور درحقیقت اُس نے بوریوں کی صنعت میں حصہ بٹانا شروع کر دیا۔ چنانچہ ہماری ملوں نے بہتر قسم کا ریشہ بنانے اور پیداوار کو متنوع بنانے کا زوردار پروگرام شروع کیا تاکہ بیرونی ممالک کی بڑھتی ہوئی قسموں کی مانگ پوری کر سکے۔ اِس سلسلے میں اس کمیٹی کی سفارش کا حوالہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو سری نواس کی صدارت میں قائم ہوئی اور جس کا مقصد ہندوستان کی جوٹ کی مصنوعات کی برآمد بڑھانے کے طریقے تلاش کرنا تھا۔ اس کمیٹی نے اگست ۱۹۶۳ء میں اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کی۔ کمیٹی نے سفارش کی کہ صوبوں کے زراعتی شعبوں میں تال میل کے لیے جوٹ ترقیاتی بورڈ قائم کیا جائے۔ اِس تجویز کا مقصد یہ تھا کہ فی ایکڑ پیداوار بڑھا کر اور پیداوار کی قسم کو بہتر کر کے جوٹ کی صنعت کے لیے خام مال کی کافی رسد کی طرف سے اطمینان حاصل کیا جائے۔

۱۹۶۵-۶۶ء کی خراب فصل کی وجہ سے صنعت پھر مشکل میں پڑ گئی۔ خام مال کی شدید قلت کی وجہ سے پیداوار کو کم کرنا ناگزیر ہو گیا جس کی بہترین صورت یہی تھی کہ بہت سی ملوں کو بند کر دیا جائے۔ ۱۹۶۶-۶۷ء بھی مسلسل بحران کا سال تھا۔ خام مال کی شدید قلت کے ساتھ ساتھ برآمد کا مسئلہ بھی بہت مشکل ہو گیا جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ حکومت نے جون ۱۹۶۶ء میں روپے کی شرح مبادلہ میں کمی کرنے کے بعد اُس کے تدارک کے اقدام بروقت نہیں کیے۔ روپے کی قیمت کم کرنے کے بعد بھی برآمدات میں کمی واقع ہوئی اور ۱۹۶۵ء کی ۹۲۹۰۰۰ ٹن سے گھٹ کر ۱۹۶۶ء میں ۷،۴۶،۰۰۰ ٹن پر آگئیں۔ روپے کی قیمت میں کمی کے بعد برآمدات میں بہت خاصی کمی ہوئی۔ ۱۹۶۵ء کے مقابلے میں باہر جانے والے مال کی ضخامت ۱،۲۳،۰۰۰ ٹن یعنی ۳۱ فی صدی گھٹ گئی۔ مختصر یہ کہ برآمد کے سلسلے میں حکومت کی دی ہوئی رعایتوں کے باوجود اپریل ۱۹۶۸ء سے صورتِ حال برائے نام بہتر ہوئی۔ جوٹ کے مال کی برآمد کی صورت اس کی متقاضی ہے کہ نیا اور دلیرانہ رویّہ اختیار کیا جائے۔ پہلی ضرورت تو یہ ہے کہ جوٹ کی صنعت کی قوتِ مسابقت کو اس لائق بنایا جائے کہ یہ پاکستان سے مقابلہ کر سکے۔ دوسرے یہ کہ جب خام جوٹ کی اندرونی رسد ناکافی ہو تو پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک سے اِس کی فراہمی کا انتظام کیا جائے۔ ہندوستان کے جوٹ مل اسوسیئشن نے حال میں حکومت ہند کے سامنے تھائی لینڈ سے جوٹ منگانے کی ایک تجویز رکھی ہے۔ ملک کے لیے زرِ مبادلہ کمانے والی سب سے بڑی صنعت کی حیثیت سے اِس کو نئی ہمت اور زیادہ اعتماد کے ساتھ مستقبل کا سامنا کرنا چاہیئے اور مشکل ترین حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔

کوئلہ نکالنے کی صنعت

(الف) پیداوار کے مسائل : ۱۹۳۰ء سے ۱۹۵۵ء تک کے ۲۵ برسوں میں کوئلہ نکالنے کی صنعت نے کوئلے کی پیداوار بڑھانے میں نمایاں ترقی کی۔ ۱۹۳۰ء میں کوئلے کی پیداوار ۲۴۰ لاکھ ٹن تھی جو ۱۹۵۵ء تک ۳۸۰ لاکھ ٹن تک پہنچ گئی۔ ۱۹۶۳ء میں کوئلے کی پیداوار میں ۶۷۰ لاکھ ٹن کا اِضافہ ہوا۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء کے اعداد شمار ۶۷۱ لاکھ اور ۶۷۴ لاکھ ٹن ہیں۔

دوسرے پلان میں کوئلہ کی سالانہ پیداوار کا نشانہ ۶۰۰ لاکھ ٹن مقرر ہوا تھا جو ۱۹۶۰-۶۱ء تک پورا ہونا تھا۔ اِس میں ۴۵۰ لاکھ ٹن پرائیویٹ سکٹر کا حصہ تھا اور ۱۵۰ لاکھ ٹن پبلک سکٹر کا۔ لیکن پلان کے آخری سال (۱۹۶۰-۶۱ء) میں پیداوار ۵۵۰ لاکھ ٹن ہوئی۔ چنانچہ دوسرے پلان کا نشانہ ۵۰ لاکھ ٹن کے بقدر پورا نہ ہوسکا۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئلے کی پیداوار کی موجودہ مشکلات کی وجہ یہ ہے کہ صنعت کو بیروں سے غیر معاشی قیمت پر چلنا پڑ رہا ہے، خصوصاً اچھے قسم کے کوئلے کے معاملے میں جو مشکل حالات میں نکالا جاتا ہے۔ انڈین کول فیلڈس کمیٹی (۱۹۵۱ء) اور کوئلے کی صنعت کے لیے ورکنگ پارٹی کی رپورٹوں سے ظاہر ہے کہ اگرچہ کوئلے کی پیداوار مسلسل بڑھی ہے لیکن صنعت کی پیداواری کارکردگی پست رہی ہے۔ اِن دونوں کمیٹیوں نے جلد از جلد کوئلے نکالنے کے لیے مشینیں لگانے کی سفارش کی ہے۔

ورکنگ پارٹی نے ۱۹۵۱ء میں مندرجہ ذیل اہم سفارشات کیں :

(۱) مشینیں لگانے کی ضرورت شدید ہے کیونکہ منصوبے کے تحت اور تیزی سے پیداوار بڑھانے کا یہی ایک راستہ ہے لیکن چونکہ مشینیں صرف انھیں کارخانوں میں لگائی جاسکتی ہیں جو ہر ماہ دس ہزار ٹن سے زیادہ کوئلہ نکالتی ہیں اِس لیے چھوٹی کانوں کو ملانا پڑے گا۔ کوئلے کی صنعت کے لیے مشینیں بنانے کا کام شروع ہونا چاہیے۔

(۲) دھاتوں کی صفائی میں استعمال ہونے والے کوئلے کا تحفظ : چونکہ عمدہ قسم کے کوئلے کے ذخیرے محدود ہیں اِس لیے کول مائنز اسٹوئنگ ایکٹ (COAL MINE STOWING ACT) میں مناسب ترمیم کرنی چاہیے تاکہ عمدہ قسم کے کوئلے کا تحفظ ہوسکے۔

(۳) حلقوں کی بنیاد پر پیداوار : عقلی تنظیم، بہتر تقسیم اور کوئلے کے میدانوں سے دُور کے علاقوں کی ترقی کے لیے حلقوں کی بنیاد پر پیداوار ہونی چاہیے۔

دوسرے پلان میں کوئلے کی پیداوار میں کچھ اضافے کے باوجود کوئلے کی کانوں میں مشینیں لگانے کی رفتار پچھلے برسوں میں بہت سست رہی۔ اِس کی خاص وجہ مشینوں کی برآمد پر پابندی اور ان کی مہنگائی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ درگاپور میں بیرونی امداد سے کوئلہ نکالنے کی مشینیں بنانے کا کارخانہ قائم کیا جارہا ہے۔ ۱۹۶۳ء کے ختم تک پرائیویٹ سکٹر کی کانوں کو ۱۶ کروڑ ۹۳ لاکھ روپے کے لائسنس دیے جاچکے ہیں۔ لیکن جنوری ۱۹۶۴ء تک ۳ء۱۷ لاکھ روپے کی مشینیں آسکی تھیں۔ جہاں تک عمدہ قسم کے کوئلے کے تحفظ کا سوال ہے، اس کی پیداوار کی بالائی حد مقرر کردی گئی ہے۔ کول مائنز کنزرویشن اینڈ سیفٹی ایکٹ (۱۹۵۲ء) کے تحت اور ادنےٰ درجے کے کوئلے کی کھپت کے خیال سے سارے تھرمل پاور اسٹیشن حتیٰ الامکان ایسے بنائے گئے کہ ان میں معمولی اور زیادہ راکھ دینے والا کوئلہ استعمال ہوسکے۔

(ب) کوئلے کی قیمت اور پرائس ریویزن کمیٹی کی سفارشات: جولائی ۱۹۶۱ء میں کوئلے کی قیمت پر سے کنٹرول ہٹالیا گیا تھا۔ صنعت کی تاریخ میں یہ بہت خوشی کا موقع تھا۔ ۱۹۴۶ء-۱۹۵۹ء کے درمیان قیمتوں پر ۲۸ بار نظرثانی کی گئی۔ اِس کی مختلف وجہیں تھیں مثلاً اجرتوں میں اضافہ، پیداوار کے معینہ نشانے پر پہنچنے کے لیے مزدوروں کی ہمت افزائی اور انھیں ترغیب دینے کے سلسلے کے مصارف، پراوڈنٹ فنڈ میں آجروں کے حصّے میں اِضافہ وغیرہ۔ مئی ۱۹۶۱ء میں حکومت نے قیمتیں مقرر کرنے کی ذمہ داری کول پرائسز ریویژن کمیٹی کے سپرد کردی۔ کمیٹی کی سفارشات کی منظوری کا اعلان حکومت نے ۱۹۵۹ء کی آخری چوتھائی میں کیا۔

کمیٹی نے پہلی چار قسموں کی قیمت میں ۵۰ پیسے فی ٹن اضافے کی سفارش کی تاکہ ۵ء۷ برار روپیہ فی ٹن منافع کی گنجائش ضرور رہے۔ لگے ہوئے سرمائے کی مناسبت سے یہ منافع معقول تصور کیا گیا۔ جہاں ان دو قسموں کی قیمت کا سوال تھا جو سب سے گھٹیا تھیں، کمیٹی کی رائے تھی کہ تجربے کے طور پر موجودہ قیمتوں کو قائم قیمتیں اعلان کرنے کے بجائے اِنھیں قیمتوں کی بالائی حد مقرر کردیا جائے۔ حکومت نے سفارش کے اِس حصّے کی مکمل تعمیل کی۔

کمیٹی نے کوئلے کو ترتیب دینے (STOWING) کی ہمت افزائی کے خیال سے سفارش کی کہ اِس سلسلے کے اخراجات کے بقدر کول بورڈ مالی امداد دے۔ اِس کے لیے مزید رقم حاصل کرنے کی غرض سے کوئلے کے محصول میں ۲۵ پیسے فی ٹن اضافے کی سفارش کی۔ حکومت نے یکم ستمبر ۱۹۵۹ء سے محصول کی شرح ۲۵ پیسے فی ٹن بڑھادی۔ بعد میں حکومت نے ان کانوں کو مالی امداد دینے کی

سفارش بھی مان لی جو بعض اسباب کی بنا پر کھٹری ہوئی ہیں لیکن قومی مفاد میں انھیں جاری رکھنا ہے۔

کول پرائسز ریویژن کمیٹی کی رپورٹ بہت قیمتی دستاویز ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوئلے کے فی ٹن مصارف اُجرت نکالنے میں کمیٹی نے بڑی محنت کی ہے۔ اب تک حکومت قیمتوں کے یکساں اضافے کی پالیسی پر عمل کرتی تھی اور یہ قیمتیں قومی یا علاقائی مصارف کے اوسط پر مبنی ہوتی تھیں۔ اس سے کم صرف کولریوں کو فائدہ پہنچتا تھا لیکن زیادہ خرچ والی کولریوں کو نقصان تھا۔ مستحق کولریوں کو مخصوص کاموں کے لیے امداد دینے کی سفارش کرکے کمیٹی نے کوئلے کی قیمت سے متعلق پالیسی کو بہتر بنایا۔

اس موقع پر یہ بھی ذکر کر دینا چاہیئے کہ فولاد، کھان اور دھات کی وزارت نے اگست ۱۹۶۶ء میں ٹیرف کمیشن سے کہا کہ یہ ملک میں کوئلے کی مصارف پیداوار کی تحقیق کرے، اور صنعت کی آئندہ ضروریات اور بھاری مقدار میں کوئلہ استعمال کرنے والوں کی ضروریات کو سامنے رکھ کر قیمت کے ڈھانچے سے متعلق مناسب سفارش کرے۔ کمیشن کی رپورٹ پر دستخط کے تقریباً ساتھ ہی حکومت نے کوئلے اور سافٹ کوک پر سے کنٹرول ہٹانے کا اعلان کیا (۲۶ جولائی ۱۹۶۷ء)۔ امید ہے کہ کنٹرول ہٹ جانے کے بعد صنعت کو قیمتوں کے تعین میں ٹیرف کمیشن کی سفارشوں سے مدد ملے گی۔

(ج) دوسرے اور تیسرے پلان میں کوئلے سے متعلق پروگرام: منصوبوں میں جو بڑے بڑے کام تجویز ہیں ان میں فولاد کے چار نئے کارخانے، ٹاٹا نگر اور برن پور کے موجودہ کارخانوں کی توسیع، بہت سے تھرمل پاور اسٹیشنوں کی تعمیر اور ریلوں کی ترقی اور توسیع شامل ہیں۔ تخمینہ ہے کہ اِن پروجکٹوں اور ان کے علاوہ دوسرے پروجکٹوں کے لیے دوسرے پلان کے دوران ۱۹۵۵ء کے ۳۸۰ لاکھ ٹن کے علاوہ ۲۲۰ لاکھ ٹن کوئلے کی ضرورت ہوگی۔ امید تھی کہ ۶۰۰ لاکھ ٹن کے نشانے پر پہنچنے کے لیے پبلک اور پرائیویٹ سکٹر مل کر کوشش کریں گی لیکن دوسرے پلان کے ختم پر کوئلے کی مجموعی پیداوار ۵۵۰ لاکھ ٹن یعنی نشانے سے ۵۰ لاکھ ٹن کم تھی۔ ۶۱-۱۹۶۰ء کی ۵۵۰ لاکھ ٹن کی مجموعی پیداوار میں پبلک سکٹر کا حصہ ۱۱۰ لاکھ تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ پرائیویٹ سکٹر کا حصہ ۴۴۰ لاکھ ٹن تھا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ کوئلے کی صنعت کا بڑا حصہ پرائیویٹ کاروبار کا ہے جو ملک کی مجموعی پیداوار کا ۸۸ فی صدی کوئلہ نکالتا ہے۔ باقی ۱۲ فی صدی نیشنل کول ڈیولیپمنٹ کارپوریشن اور آندھرا پردیش کی سنگاریني کولریز نکالتی ہیں جو پبلک سکٹر میں ہیں۔

رُوئی، جُوٹ اور کوئلے کی صنعتوں میں کام کی عقلی تنظیم

محنت اور روزگار کی وزارت نے جون ۱۹۵۸ء میں آجروں کو صنعت کی عقلی اُصول پر تنظیم کے بارے میں رہنمائی کرنے کی غرض سے نمونے کا ایک معاہدہ تیار کیا۔ یہ ایک نیا قدم تھا کیونکہ صنعتوں کی عقلی تنظیم ہماری بیشتر صنعتوں کے لیے اشد ضروری ہے۔ ۱۹۵۸ء کے مجوزہ معاہدے میں محنت اور انتظام میں تعاون اور باہمی مشورے کا اہتمام ہے۔ جن سے مختلف صنعتوں کی عقلی اصول پر تنظیم میں مدد ملتی ہے۔ پھر بھی ایسا لگتا ہے کہ سرکاری نظریہ یہی ہے کہ صنعت کی عقلی اصول پر تنظیم کی اجازت اِس شرط پر دی جائے کہ اس کی وجہ سے بے روزگار ہونے والے مزدوروں کو کوئی دوسرا کام فراہم کیا جا سکے۔

عقلی اصول پر صنعت کی تنظیم کا مطلب ہے پیداوار اور تقسیم کے طریقوں کو نیا رُخ دینا اور نئی ترتیب دینا۔ اِس کا یہ بھی مطلب ہے کہ کارخانوں کی استعداد کو پورے طور پر استعمال کیا جائے، جدید مشینیں لگائی جائیں اور محنت اور خام مال کو اس طرح تنظیم دی جائے کہ پیداوار زیادہ سے زیادہ ہو اور محنت، وقت اور سامان کم سے کم ضائع ہوں۔ عقلی اصول پر تنظیم سے کارکردگی بڑھتی ہے، مصارف کم ہوتے ہیں، اندرونی پیداوار کی قیمت کم ہونے کی وجہ سے طلب بڑھتی ہے اور منڈی وسیع ہوتی ہے۔ ان فوائد کے پیشِ نظر ہماری سُوتی کپڑوں، جُوٹ اور کوئلے کی صنعتوں کو عقلی اصول پر تنظیم سے خاص طور سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

فی الحال ایسی مشینیں لگانے کی کافی مخالفت ہے جن سے محنت بچتی ہے، کیونکہ اِس کی وجہ سے بے روزگاری بڑھنے کا ڈر ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ بے روزگاری کا ڈر صرف ابتدائی مراحل میں ہے۔ آگے چل کر نئے مطالبوں اور نئی منڈیوں کی تحریک کے تحت صنعت و حرفت میں توسیع ہوگی اور روزگار کی نئی راہیں کھُلیں گی۔ وقتی اور معمولی بے روزگاری کے خوف سے ہمیں سوتی کپڑوں، جوٹ اور کوئلے کی صنعتوں کی عقلی اصول پر تنظیم میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ ان صنعتوں کی تیز ترقی کا تقاضہ ہے کہ اِن کی کارکردگی زیادہ ہو اور ان کے مصارف کم ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں ان صنعتوں کی ترقی کی پہلی شرط ہیں اور صنعت کی عقلی اصول پر تنظیم کے بغیر ان کا حصول ناممکن ہے۔

اب ہم ان صنعتوں کی عقلی اصول پر تنظیم کے مسائل سے بحث کریں گے:

(۱) سوتی کپڑے کی صنعت : ماہروں کا تخمینہ ہے کہ سوتی کپڑوں کی مشینوں کی موثر زندگی ۳۵ سال ہوتی ہے۔ ہماری بیشتر مشینیں ۱۹۲۷ء میں تحفظ حاصل ہونے کے بعد لگائی گئی تھیں چنانچہ ان میں سے بیشتر اب پرانی اور فرسودہ ہو چکی ہیں۔ ان مشینوں کو بدلنے اور ان کی جگہ جدید مشینیں لگانے کے لیے صنعت کی عقلی اصول پر تنظیم ضروری ہے۔ جولائی ۱۹۵۸ء میں جوشی کمیٹی نے سوتی کپڑے کی صنعت کے مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا کہ موجودہ مشینوں میں سے بیشتر چالیس برس پرانی ہیں اور اپنی افادیت ختم کر چکی ہیں لیکن یہ کمیٹی صرف یہ کہہ کر رہ گئی کہ صنعت کے ہر یونٹ کو صرف اُس قسم کے کپڑے بنانے چاہئیں جس کے لیے ان یونٹوں کی مشینیں موزوں ہوں۔ سوتی کپڑے کی صنعت میں اگر عقلی اصول پر تنظیم فوراً نہ شروع کی گئی تو بیرونی منڈیوں میں ہندوستانی مال کی قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کی کھپت کم ہو جائے گی۔ صنعت کو مستحکم بنانے اور بیرونی منڈیوں میں اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے عقلی اصول پر تنظیم کی فوری ضرورت ہے۔

(۲) جوٹ کی صنعت : ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ پاکستان، برازیل اور فلی پائنز نے جوٹ کارخانے قائم کیے ہیں اور اب اس قابل ہیں کہ اپنی پیداوار کم قیمت پر فروخت کر سکیں۔ اگر ہندوستانی صنعت عقلی اصول پر تنظیم کا جامع پروگرام عمل میں نہیں لاتی تو ان ملکوں سے مقابلہ بہت مشکل ہوگا جوٹ انکوائری کمیشن (۱۹۵۴ء) نے اپنی رپورٹ میں اس بات پر تاکید کی تھی کہ جوٹ کی صنعت کی عقلی اصول پر تنظیم کی فوراً ضرورت ہے تاکہ مشینوں کو بدلا جا سکے اور نئی مشینیں لگائی جا سکیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اب حکومت بھی رفتہ رفتہ یہ محسوس کر رہی ہے کہ جوٹ کی صنعت کے مستقبل کا دارومدار عقلی اصول پر اس کی تنظیم اور جدید شکل دینے پر ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ دوسرے پلان کے دوران اس سمت تھوڑی بہت ترقی ہوئی ہے۔ دوسرے پلان کے پانچ برسوں میں جوٹ کی صنعت نے بعض غیر معاشی یونٹ، جو ۲۳۸۱۲ لوم پر مشتمل تھے، بند کر دیے گئے اور یہ لوم دوسرے یونٹوں کو منتقل کر دیے گئے جس کی وجہ سے یہ یونٹ اس قابل ہو گئے کہ اپنے لوم کو دو شفٹ چلا سکیں۔ اسی زمانے میں دو لوم پر ایک آدمی لگانے کا طریقہ رائج کیا گیا جس کے تحت ۱۶۰۰۰ لوم لے آئے گئے۔ عقلی اصول پر تنظیم کے ساتھ صنعت کو جدید بنانے کے پروگرام میں بھی کافی ترقی ہوئی۔ اس کام میں نیشنل ڈیولپمنٹ کارپوریشن نے مالی امداد فراہم کر کے بہت مدد کی۔ مارچ ۱۹۶۶ء کے ختم تک کارپوریشن نے جدید مشینیں لگانے کے لیے ۵ر۷ کروڑ کا قرض منظور کیا۔ حال میں مرکزی حکومت نے نئی مشینیں لگانے اور پیداوار کو متنوع کرنے کی غرض سے صنعت کے لیے ۵ کروڑ روپے کا قرض منظور کیا۔ توقع ہے کہ

اس قرض سے ۶۰ فی صدی اسپنڈل بدلے جاسکیں گے۔ ساتھ ہی یہ بھی کوشش کی جارہی ہے کہ جوٹ ملوں کی مشینیں ملک میں بننے لگیں تاکہ زرِ مبادلہ کی بچت ہوسکے اور صنعت کو جدید بنانے اور عقلی اصول پر اُس کی تنظیم کے پروگرام کی تیزی سے تعمیل ہوسکے۔

(۳) **کوئلہ نکالنے کی صنعت** : ۱۹۵۱ء کی ورکنگ پارٹی نے صنعت کی عقلی اصول پر تنظیم اور مشینوں سے کام کرنے کے مسائل کی جانچ کی اور یہ سفارش کی کہ بڑی کولریز میں پیداواری مستعدی بڑھانے کے لیے مشینوں سے کام شروع کیا جائے اور عقلی اصول پر صنعت کی تنظیم کی جائے۔ نجی کانوں میں اگر فوراً اس پروگرام کی تعمیل کی جائے تو مصارف پیداوار کم ہوجائیں گے اور پیداواری استعداد اور کارکردگی تیزی سے بڑھ جائے گی۔ عقلی اصول پر تنظیم کی وجہ سے نئی مشینیں لگانے اور توسیع کے کام میں مدد ملے گی اور کولریز اس قابل ہوجائیں گی کہ منصوبے میں پیداوار کا مقررہ نشانہ پورا کرسکیں۔

شکر کی صنعت

(الف) **تاریخی پس منظر** : ٹیرف کمیشن نے ۱۹۳۲ء میں شکر کی صنعت کو تحفظ دینا منظور کیا۔ ۱۹۵۰ء میں یعنی ۱۸ برس بعد تحفظ واپس لے لیا گیا۔ صنعت نے غیر معمولی تیزی سے ترقی کی اور ۳۶-۱۹۳۵ء تک ملک پورے طور پر خودکفیل ہوگیا۔ لیکن اس کے بعد پیداوار کی زیادتی کی وجہ سے صنعت پر جمود طاری ہوگیا۔ ۱۹۴۲ء میں جب جاپان جنگ میں شریک ہوگیا تو اتحادی ملکوں کی طرف سے ہندوستانی شکر کی مانگ بڑھ گئی لیکن خود ملک کے اندر نقل و حمل کی دشواریوں کی وجہ سے شکر کا قحط پڑگیا۔ چنانچہ مجبوراً حکومت کو شکر پر کنٹرول عائد کرنا پڑا۔ کنٹرول، نقل و حمل کی دقتوں اور دوسری مشکلات کی وجہ سے پیداوار گھٹ گئی اور بلیک مارکٹ کی سرگرمیاں بڑھنے لگیں۔ ۱۹۵۲ء میں حکومت نے شکر پر سے کنٹرول ہٹالیا۔ کنٹرول کے ہٹتے ہی شکر کی مانگ بڑھ گئی اور شکر کے واقعی صرف میں بھی اضافہ ہوگیا۔ اِس بڑھی طلب کو پورا کرنے کے لیے حکومت کو پندرہ برس بعد پہلی بار شکر درآمد کرنی پڑی۔ بہرحال اِس کی وجہ سے شکر کی صنعت کا نقشہ بدل گیا اور کافی طویل جمود کے بعد پھر توسیع کے پروگرام تیزی سے عمل میں آنے لگے۔ ۵۴-۱۹۵۳ء میں طلب اور رسد کے خلا کو پُر کرنے کے لیے کافی بڑی مقدار میں شکر درآمد کرنی پڑی۔ لیکن ۱۹۵۵ء میں سال کے شروع ہی میں اسٹاک کافی ہونے اور گنّے کی فصل اچھی ہونے کی وجہ سے حکومت نے شکر درآمد نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ درحقیقت ۵۷-۱۹۵۶ء میں ۲۸۰۰۰ ٹن شکر برآمد کی گئی۔ بدقسمتی سے شکر کی صنعت ۵۸-۱۹۵۷ء اور ۵۹-۱۹۵۸ء کے دَوران پیداوار کے اِضافے کا

رجحان جاری نہ رکھ سکی جو ۱۹۵۳ء میں کنٹرول ہٹنے کے بعد سے پیدا ہوا تھا۔ ۵۳-۱۹۵۲ء اور ۵۶-۱۹۵۵ء کے دوران چار برسوں میں پیداوار ۱۰٫۰۱ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۲۰٫۲۶ لاکھ ٹن تک پہنچ گئی تھی۔ یعنی دوگنی ہو گئی تھی۔ اِس کے بعد ۵۷-۱۹۵۶ء اور ۵۹-۱۹۵۸ء دونوں برسوں میں پیداوار میں تخفیف ہوئی۔ خوشی کی بات ہے کہ ۶۱-۱۹۶۰ء میں صنعت ۳۰٫۲۳ لاکھ ٹن کی اُونچی سطح پر پہنچ گئی جبکہ ۶۰-۱۹۵۹ء میں پیداوار ۲۴٫۴۲ لاکھ ٹن تھی۔ اِس طرح تین لاکھ ٹن سے کچھ زیادہ شکر بنا کر صنعت دوسرے پلان کے نشانے سے آگے بڑھ گئی۔

(ب) **مقام پذیری میں تبدیلی** (CHANGE IN LOCATION): شروع میں شکر کی صنعت اُتر پردیش، بہار اور کچھ دوسرے علاقوں میں مرتکز تھی۔ ۳۵-۱۹۳۴ء میں ملک کی پیداوار میں اُتر پردیش اور بہار کا حصہ ۸۵ فی صدی تھا۔ شمالی ہند میں شکر کی صنعت کی ترقی کی وجہ یہ تھی کہ وہاں سرمایہ اور انتظام آسانی سے دستیاب تھا اور اس علاقے میں نقد فصل کی حیثیت سے گنّے کی کاشت وسیع پیمانے پر ہوئی تھی۔

پچھلے کچھ برسوں میں جنوبی ہند خصوصاً مدراس، میسور، آندھرا پردیش اور بمبئی میں شکر کے کارخانے کھلنے کا رجحان شروع ہوا ہے۔ شمال کے مقابلے میں جنوبی ہند کے کارخانوں کے مصارف پیداوار کم ہیں۔ ان کے اپنے شکر کے فارم ہیں جن کی وجہ سے رس پیڑنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اِس کے علاوہ جنوب کے گرم سیر خطّوں کی آب و ہوا میں شمال کے مقابلے میں گنّے سے ایک سے لے کر دو فی صدی تک شکر زیادہ نکلتی ہے۔ جنوبی کارخانے اپنی ضمنی پیداوار کو معاشی ڈھنگ سے استعمال کرتے ہیں۔ اِن کی مشینیں جدید ہیں اور کارخانوں کی انتظامی کارکردگی شمال سے زیادہ ہے۔ اِس لیے ہمیں حیرت نہ ہونی چاہیئے اگر مستقبل میں شکر کی مجموعی پیداوار کا فی حصہ جنوب کے کارخانوں سے آئے۔

(ج) **صنعت کے مسائل**: شکر کی صنعت کو مندرجہ ذیل مسائل درپیش ہیں:

(۱) **گنّے کی رسد کا مسئلہ** — شمالی ہند کے لیے خاص کر یہ ایک مسئلہ ہے۔ اتر پردیش اور بہار میں شکر کے کارخانے بہت قریب قریب ہیں اور ان میں شدید مقابلہ رہتا ہے۔ اس مقابلے کی وجہ سے سپلائی کا مسئلہ شدّت اختیار کر لیتا ہے اور گنّے کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ یوپی اور بہار میں شکر بننے کے زمانے کی مدّت کم ہو گئی ہے جس کی وجہ سے کسانوں کو اپنی فصل بیچنے کی عجلت ہوتی ہے اور وہ اپنی فصل کو شکر کی صنعت کی ضرورت کے مطابق نہیں پھیلا پاتے، اِس کی وجہ سے گنّے کی

قلت کا مسئلہ بہت بڑھ گیا ہے۔ دوسرے پلان کے پہلے سال شکر کی پیداوار میں کافی اضافہ ہوا جو ۱۹۵۵-۵۶ کی ۵,۹۳,۲۰,۰۰۰ ٹن سے بڑھ کر ۱۹۵۶-۵۷ میں ۶,۶۹,۹۰,۰۰۰ ٹن ہو گئی۔ لیکن پیداوار میں اضافے کا یہ رجحان ۱۹۵۷-۵۸ میں قائم نہ رہا جس کی بنیادی وجہ یوپی اور بہار میں گنّے کی فصل کی خرابی تھی۔ ۱۹۵۸-۵۹ میں گنّے کی فصل ۶۵۰ لاکھ ٹن ہوئی۔

بہرحال ۱۹۵۹-۶۰ میں گنّے کی پیداوار بڑھی اور ۷۶۳ لاکھ ٹن گنّا پیدا ہوا۔ ۱۹۶۰-۶۱ میں اور اضافہ ہوا اور پیداوار ۸۶۹ لاکھ ٹن تک پہنچ گئی۔ یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ ۱۹۵۹-۶۰ میں شکر کی پیداوار میں ۲۶ فی صدی کا اضافہ ہوا تھا اور یہ ۲۴۲ لاکھ ٹن پر پہنچ گئی تھی۔ ۱۹۶۰-۶۱ کی ۳۰ لاکھ ٹن کی پیداوار سے صنعت اب اعتماد کے ساتھ اپنے مستقبل کی طرف دیکھ سکتی ہے۔

۱۹۶۲-۶۳ اور ۱۹۶۳-۶۴ میں فصل خراب ہوئی جس کی وجہ بہار اور اُتر پردیش میں بارش کی قلت، پنجاب میں سیلاب اور دکھن میں فصلی بیماری تھی۔ اِن دونوں برسوں میں ۱۹۶۰-۶۱ اور ۱۹۶۱-۶۲ کے مقابلے میں گنّے کی پیداوار کم ہوئی۔ گنّے کی فصل کم ہونے کے علاوہ گڑ اور کھانڈسار ی کی قیمتیں غیر معمولی حد تک اونچی تھیں۔ درحقیقت ۱۹۶۲-۶۳ کی پیداوار اتنی کم ہوئی کہ ۲۱۳ لاکھ ٹن پر آ گئی۔ ۱۹۶۳ کے شروع میں شکر کی قیمت میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ قیمتوں کے اِس رجحان سے حکومت کو تشویش ہوئی اور اُس نے قیمتوں کو کم کرنے کے لیے اپریل ۱۹۶۳ سے شکر کی قیمت اور تقسیم پر کنٹرول عائد کر دیا۔

(۲) گنّے کی قیمتیں اور شکر سے متعلق حکومت کی پالیسی: شکر کی قلت سے نپٹنے کے لیے حکومت نے ۱۹۶۵-۶۶ کے واسطے شکر کی پیداوار کا نشانہ ۳۰ لاکھ ٹن مقرر کیا۔ شکر سے متعلق حکومت کی پالیسی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ گنّے کی حاصل سپلائی کو شکر کے کارخانوں اور گڑ اور کھانڈساری بنانے والوں میں منصفانہ طریقے سے تقسیم کیا جائے۔ حکومت نے محسوس کیا کہ گنّا پیدا کرنے والوں کو محرّک کی ضرورت ہے چنانچہ اُس نے گنّے کی قیمت کو سہارا دینے کے لیے ۱۰ پیسے فی من کے اضافے کی اجازت دینے کا فیصلہ کیا۔ اِس اضافے کا تعلق ۹ فی صدی یا اُس سے کم یا ۱۹۶۲-۶۳ کی گنّے کی قیمت سے نیچے کی بازیابی سے تھا۔ چنانچہ ۹ فی صدی یا اُس سے کم کی بازیابی کے لیے بنیادی قیمت ایک روپیہ ۷۵ پیسے کے بجائے ایک روپیہ ۶۲ پیسے تھی۔ اِس کے مطابق زیادہ بازیابی کے لیے زیادہ قیمت رکھی گئی۔ اِس بنیاد پر گنّے کی کم سے کم قیمتوں کا شیڈیول تیار کیا گیا اور جو قیمتیں مختلف فیکٹریوں کو ادا کرنی تھیں ان کا اعلان کر دیا گیا۔ اِس طرح پہلی بار تسلیم کیا گیا کہ گڑ اور کھانڈساری پر کنٹرول عائد

کیے بغیر صرف شکر پر کنٹرول کرنے سے خاطر خواہ نتائج نہ برآمد ہوں گے اور اس سلسلے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ پورے مسئلے سے یک جہتی کے ساتھ نپٹا جائے۔

(۳) تیسرے پلان کے ختم پر پیداوار نشانے پر پہنچتی ہے اور پھر گھٹ جاتی ہے: ۱۹۶۵-۶۶ء کے لیے ۳۰ لاکھ ٹن کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا لیکن پیداوار اس نشانے کے قریب بھی نہ پہنچ سکی اور ۲۵ لاکھ ۹۰ ہزار ٹن پر رک گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ پیداوار پچھلے سال ۲۱٫۰۲ لاکھ ٹن سے زیادہ تھی لیکن اس سے پہلے کے دو برسوں کے مقابلے میں کم تھی جب ۳۰ لاکھ اور ۲۲٫۳۰ لاکھ ٹن پیداوار ہوئی تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ ۱۹۶۴-۶۵ء میں پیداوار بلندی کے نئے نکتے پر پہنچ گئی اور ۳۲ لاکھ ۹۰ ہزار ٹن شکر پیدا ہوئی۔ اس کے اگلے سال (۱۹۶۵-۶۶ء) کی کارگزاری اور بھی شاندار تھی اور پیداوار ۳۵٫۰۵ لاکھ ٹن کے نئے رکارڈ پر پہنچ گئی۔ لیکن ۱۹۶۶-۶۷ء میں بہار اور اتر پردیش میں شدید خشک سالی کی وجہ سے گنے کی فصل کم ہوئی جس کی وجہ سے شکر کی پیداوار صرف ۲۲ لاکھ ٹن ہوئی۔ چنانچہ شکر کی سپلائی کم رہی اور حکومت کو کنٹرول جاری رکھنا پڑا۔ ۱۹۶۷-۶۸ء میں سپلائی بہتر ہوئی اور ۲۲ لاکھ ٹن کی سطح پر قائم رہی۔ چنانچہ حکومت کو جزوی کنٹرول کی پالیسی اختیار کرنی پڑی۔ بہرحال پچھلے سال یعنی ۱۹۶۸-۶۹ء میں صورت حال بہتر ہوئی اور ۳۱٫۰۶ لاکھ ٹن شکر تیار ہوئی۔ پھر بھی حکومت نے جزوی کنٹرول برقرار رکھا۔

(۴) جدیدیت (MODERNIZATION) اور تکنیکی کارکردگی: شکر کی صنعت کی ترقیاتی کونسل نے حال میں تخمینہ لگایا کہ پرانی مشینوں کو بدلنے اور کارخانوں کو جدید طرز کا بنانے پر ۶۰ کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔ لیکن بھاری ٹیکسوں اور محفوظ فنڈ نہ ہونے کی وجہ سے بیشتر کارخانے نئی مشینیں لگانے اور دوسری تبدیلیاں کرنے سے معذور ہیں۔ نیشنل ڈیولپمنٹ کارپوریشن کو چاہیے کہ سوتی کپڑے اور جوٹ کی طرح شکر کی صنعت کو بھی مالی امداد دے تاکہ ان پروگراموں کو یہ عمل میں لا سکے جن میں کافی تاخیر ہو چکی ہے۔

(۵) سین کمیشن کی رپورٹ اور شکر پر ضروری کنٹرول: شوگر انکوائری کمیشن (جس کے صدر ڈاکٹر ایس۔ آر۔ سین تھے) کی رپورٹ جس کا بہت انتظار تھا، اکتوبر ۱۹۶۵ء میں پیش کی گئی۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ سین کمیشن نے ۱۹۷۰ء تک کے لیے شکر کی برآمد کا سالانہ نشانہ ۲½ لاکھ ٹن اور اگلے ۵ برسوں میں یعنی ۱۹۷۵-۷۶ء تک دس لاکھ ٹن کا نشانہ متعین کیا۔ سین کمیشن کی اور اہم سفارشات میں یہ بھی سفارش تھی کہ ۱۹۶۷-۶۸ء سے شکر پر سے کنٹرول ہٹا لیا جائے اور اس کے لیے بفر سٹاک بنایا جائے

اور کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ قیمتوں کا تعین پہلے سے کر دیا جائے۔ مزید یہ کہ اندرونی تقسیم کی ذمہ دار فوڈ کارپوریشن ہو اور برآمدات کی ذمہ داری اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن کی ہو۔ کمیشن نے یہ بھی سفارش کی کہ صنعت کی ۳۰ لاکھ ٹن کی مزید استعداد جو اگلے دس برسوں میں پیدا کرنی ہے، اس کو نئے اور موجودہ یونٹوں میں برابر برابر تقسیم کیا جائے۔

حکومت نے شکر سے متعلق اِس پالیسی کے پسِ منظر میں اگست ۱۹۶۷ء کے وسط سے شکر کی قیمت پر سے کنٹرول جزوی طور سے ہٹانے کا اعلان کیا۔ اِس پالیسی کے تحت اکتوبر ۱۹۶۷ء اور ستمبر ۱۹۶۸ء کے درمیان ۶۰ فی صدی شکر کنٹرول کی قیمتوں پر اور باقی ۴۰ فی صدی کھلے بازار میں بکنے کی اجازت دے دی گئی۔ ستمبر ۱۹۶۸ء میں حکومت نے اعلان کیا کہ شکر کی کُل پیداوار کا ۷۰ فی صدی حصّہ کنٹرول کی قیمت پر فیئر پرائس شاپ کے ذریعے تقسیم ہوگا اور باقی ۳۰ فی صدی کھلے بازار میں بیچا جا سکتا ہے۔

(د) شکر کی صنعت پانچ سالہ منصوبے کے تحت: پہلے پلان میں ابتداً شکر کی پیداوار کا نشانہ ۱۵ لاکھ ٹن مقرر کیا گیا تھا۔ نومبر ۱۹۵۲ء میں کنٹرول ہٹنے کے بعد شکر کی مانگ ایک دم بڑھ گئی اور حکومت نے شکر کی پیداوار کے معینہ نشانے پر نظرِ ثانی کی اور اِسے بڑھا کر ۱۸ لاکھ ٹن کر دیا۔ پہلے پلان کے آخری سال صنعت نے ۱۸٫۶ لاکھ ٹن شکر تیار کی اور اس طرح معینہ نشانے سے تجاوز کر گئی۔ دوسرے پلان میں شکر کی پیداوار کا نشانہ ۲۲½ لاکھ ٹن مقرر ہوا۔ ۱۹۶۰-۶۱ء میں ۳۰ لاکھ ٹن شکر بنی جس کی وجہ سے پیداوار معینہ نشانے سے کافی آگے رہی۔ چوتھے پلان کے لیے نشانہ ۴۷ لاکھ ٹن مقرر کیا گیا ہے۔

لوہے اور فولاد کی صنعت

(الف) تاریخی پس منظر: ۱۹۰۷ء میں بہار میں سکچی کے مقام پر ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل انڈسٹریز کے قیام سے صنعت کا حقیقی آغاز ہوا۔ اِس کے بعد دو اور صنعت کار میدان میں آئے۔ ۱۹۱۹ء میں بنگال میں ہیراپور کے مقام پر اِنڈین آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی اور ۱۹۲۳ء میں بھدراوتی کے مقام پر میسور اسٹیٹ آئرن ورکس کا آغاز ہوا۔ اب میسور اسٹیٹ آئرن ورکس کا نام میسور آئرن اینڈ اسٹیل ورکس ہو گیا ہے۔ ۱۹۲۳-۲۴ء میں شدید بیرونی مقابلے نے صنعت کو تحفظ طلب کرنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۲۴ء میں صنعت کو تحفظ ملا جو ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔ اِس کے بعد سے صنعت برابر

ترقی کرتی رہی ہے۔ ۱۹۵۹ء تک فولاد کی پیداوار ۲۰ لاکھ ۴۶ ہزار ٹن تک پہنچ گئی۔ ۱۹۶۰ء میں پیداوار میں ۱۵ ہزار ٹن کی کمی واقع ہوئی۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ اُس سال ٹاٹا کارخانے کے مزدوروں میں بےچینی پھیلی رہی۔ اِس کے علاوہ دوسرے توسیعی پروگرام کی وجہ سے پیداوار میں کافی خلل پڑا۔ ۱۹۵۹ء کے ۳۱ر۷ لاکھ ٹن کے مقابلے میں ۱۹۶۰ء میں ۶ر۱۱ لاکھ ٹن لوہا اور فولاد درآمد کرنا پڑا۔ ۱۹۶۱ء کے ختم تک پبلک سکٹر میں فولاد کے تین نئے کارخانے (رورکیلا، درگاپور اور بھلائی) مکمل ہو جانے سے فولاد پیدا کرنے کی استعداد پہلے پلان کے ۱۰ لاکھ ٹن اور دوسرے پلان کے ۲۲ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۴۵ لاکھ ٹن ہوگئی۔

(ب) صنعت کے مسائل: لوہے اور فولاد کی صنعت کے سامنے مندرجہ ذیل مسائل ہیں:

(۱) فولاد کی قیمتیں، کنٹرول ہٹانے کا طریقہ اور راج کمیٹی۔ فولاد کی صنعت کافی عرصے تک تقریباً مکمل طور سے ریاستی ضابطے کے تحت تھی۔ نہ صرف قیمتوں پر کنٹرول تھا بلکہ اِس کنٹرول کو موثر بنانے کے لیے فولاد کی باقاعدہ راشننگ تھی۔ قیمتوں پر کنٹرول دو سطحوں پر تھا۔ ایک تو وہ قیمت تھی جو پیداکاروں کو ادا کی جاتی تھی اور دوسری وہ قیمت تھی جس پر مال صارفوں کے ہاتھ فروخت ہوتا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ حکومت ایک قیمت متعین کر دیتی تھی جس پر دو بڑے پیداکاروں (یعنی ٹاٹا اور انڈین آئرن) کو فولاد سپلائی کرنا ہوتا تھا۔ لیکن صارفوں کو جس قیمت پر مال دیا جاتا تھا وہ اُس سے زیادہ تھی جو پیداکاروں کو ادا کی جاتی تھی۔ دونوں قیمتوں کے فرق سے جو رقم حاصل ہوتی تھی اُس کو اسٹیل اکوالائیزیشن فنڈ میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اِس فنڈ سے فولاد کی درآمد پر امدادی رقم ادا کی جاتی، اور پیداکاروں کو تجدیدی پروگرام کے وسائل فراہم کیے جاتے۔

حکومت نے فیصلہ کیا کہ یکم مارچ ۱۹۶۴ء سے چند قسموں کو چھوڑ کر باقی تمام قسموں کے فولاد کی قیمت اور تقسیم پر سے قانونی کنٹرول ہٹا دیا جائے۔ اِس طرح فولاد کی مجموعی پیداوار کے دو تہائی حصے پر سے کنٹرول ہٹ گیا۔

یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ نئے کاروبار کے لیے اسٹیل اکوالائیزیشن فنڈ ختم کر دیا جائے اور اس سلسلے میں نہ فنڈ میں کچھ لیا جائے اور نہ فنڈ سے کچھ دیا جائے۔ لیکن پرانے کاروبار کے سلسلے میں جو رقم فنڈ میں جمع ہوئی ہے یا فنڈ سے ادا ہونی ہے وہ ہوگی۔ فنڈ سے متعلق اِس فیصلے کا یہ مطلب ہے کہ اب پیداکاروں کی قیمت اور بازار کی قیمت میں کوئی فرق نہ کیا جائے گا چاہے فولاد کی قسم کنٹرول کے تحت ہو یا کنٹرول سے آزاد ہو۔ بہ الفاظ دیگر کوئی سرچارج نہیں ہوں گے۔ یہی خاص وجہ

تھی کہ فولاد کی مختلف قسموں پر لگائے جانے والے محصول پر ۱۹۶۵ء کے بجٹ میں نظر ثانی کی گئی۔

حکومت نے ایک جوائنٹ پلانٹ کمیٹی بھی مقرر کی جس میں اہم پیداکاروں اور ریلوے کے نمائندے تھے اور جس کا چیرمین آئرن اینڈ اسٹیل کنٹرولر تھا۔ اِس کمیٹی کا بنیادی مقصد مختلف قسم کے فولاد کی پیداوار کا منصوبہ بنانا ہے۔

اپریل ۱۹۶۷ء میں حکومت نے تمام قسم کے فولاد پر سے کنٹرول ہٹا لینے کا فیصلہ کیا۔ اب فولاد کی قیمت اور اُس کی تقسیم کی ذمہ دار جوائنٹ پلانٹ کمیٹی ہے جو ستمبر ۱۹۶۴ء میں قائم کی گئی تھی۔ کنٹرول ختم کرنے کا فیصلہ راج کمیٹی کی تدریجی ڈی کنٹرول کی سفارش پر کیا گیا تھا۔ فولاد کی بہت سی قسموں پر سے کنٹرول مارچ ۱۹۶۴ء ہی میں ہٹا لیا گیا تھا اور دوسری بہت سی قسموں پر سے اُس کے بعد ہٹایا گیا۔

راج کمیٹی نے ۱۹۶۳ء میں ایک عارضی رپورٹ تیار کرلی تھی۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں مکمل رپورٹ پیش کی گئی۔ ڈاکٹر راج کی صدارت میں یہ کمیٹی ستمبر ۱۹۶۲ء میں لوہے اور فولاد پر سے کنٹرول کے سارے نظام کو جانچنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ راج کمیٹی نے کنٹرول کی ایک دُہری پالیسی تجویز کی۔ اس کے مطابق ترجیحی قسم کے فولاد پر زیادہ سخت کنٹرول عائد کرنا تھا اور باقی قسم پر سے رفتہ رفتہ کنٹرول ہٹانا تھا۔ کنٹرول کے اِس نئے نظریے کی بنیاد پر حکومت نے حال میں بہت اہم فیصلے کیے۔

راج کمیٹی کی بنیادی سفارش جسے حکومت نے بعد میں منظور کیا ایک جوائنٹ پلانٹ کمیٹی کے قیام کے متعلق تھی۔ اِس کمیٹی کو فولاد کے تمام مطالبوں کی جانچ کرنی تھی اور ان کے مطابق تمام یونٹوں کی پیداوار کو ترتیب دینا تھا۔ کمیٹی کی سفارش کے مطابق جوائنٹ پلانٹ کمیٹی فولاد کے سارے کارخانوں کے نمائندوں پر مشتمل تھی۔ زیادہ بہتر تھا کہ کارخانوں کی نمائندگی ان کے جنرل منیجر کرتے۔ اِس کمیٹی کا صدر آئرن اسٹیل کنٹرولر ہوگا۔ راج کمیٹی کا خیال تھا کہ جوائنٹ پلانٹ کمیٹی کے ذریعے مطالبوں کی جانچ اور ان کے مطابق پیداوار کی منصوبہ بندی موجودہ نظام سے زیادہ موثر اور آسان ہوگی جس کے تحت یہ کام کنٹرولر کرتا تھا۔

راج کمیٹی نے اِس سے بھی زیادہ اہم سفارش یہ کی کہ آئندہ فولاد کی قیمتوں کا تعین ٹیرف کمیشن کے بجائے جوائنٹ پلانٹ کمیٹی کرے۔ کمیٹی کی رائے تھی کہ جوائنٹ پلانٹ کمیٹی کے ذریعے قیمتوں کا تعین پیداوار کو طلب کے مطابق بنانے میں زیادہ فائدہ مند ہوگا کیونکہ اب تک ٹیرف کمیشن پچھلے مصارف پیداوار کی بنیاد پر قیمتوں کا تعین کرتا تھا جس سے صنعت کو ترغیب نہیں ہوتی تھی۔

راج کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی کہ یہ زیادہ بہتر تھا کہ فولاد کی پیداکاری (PRODUCTION PRICE) قیمت زیادہ رکھی جائے اور منافعے کے زائد حصے کو محصول لگا کر لے لیا جائے، بہ نسبت اس کے کہ پیداکاری قیمت کم رکھی جائے اور درمیانی لوگوں کو بازاری اونچی قیمتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جائے۔

راج کمیٹی نے فولاد کی غیر ترجیحی قسموں پر سے جزوی طور سے کنٹرول ہٹانے اور ترجیحی قسموں پر کنٹرول جاری رکھنے کی پرزور سفارش کی۔ کمیٹی کی رائے تھی کہ تمام دفاعی ضروریات کو سب سے زیادہ ترجیح دی جائے۔ اس کے بعد کوئلہ، فولاد، تیل، بھاری مشینیں، جہاز بنانے کے کارخانوں، نقل و حمل اور اہم سماجی ضرورتوں کو ترجیح ملنی چاہیے۔ باقی مطالبات کو غیر ترجیحی حیثیت دی جانی چاہیے۔

کمیٹی نے یہ بات واضح کر دی کہ غیر ترجیحی قسموں پر سے بھی کنٹرول مکمل طور سے ہٹایا نہیں جائے گا۔ اول تو دوہرے کنٹرول کا نفاذ اس وقت ہوگا جب پیداکار معینہ قیمت پر مال فروخت کریں گے۔ اس کے علاوہ متعدد مختلف حالتوں میں جیسے ذخیروں اور ایجنٹوں کی فراہمی کا تفصیلی انتظام اور سرکاری ملکیت یا سرکاری کنٹرول کے تحت اسٹاک یارڈ (STOCK YARD) کا قیام بھی شامل ہوگا۔ مختصر یہ کہ راج کمیٹی کی رپورٹ جس بنیادی سفارش پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ غیر ترجیحی قسم کے فولاد کی قیمت وہ ہونا چاہیے جو منڈی برداشت کر سکے۔ فولاد کے لیے اس نظریے کو تسلیم کر لینے کے بعد دوسری صنعتوں کے لیے ایک نظیر قائم ہوگی، مثلاً سیمنٹ جس پر سے کنٹرول ختم کر دیا گیا تھا۔ قیمتوں سے متعلق حکومت کی پالیسی پر اس کے دوررس اثرات پڑے۔

• خام دھات کو صاف کرنے والا کوئلہ اور فولاد کی پیداوار: خام دھات پیدا [illegible] کرنے والے کوئلے کی پیداوار ۔۔۔۱۱ لاکھ ٹن سے زیادہ ہے جبکہ لوہے اور فولاد کی صنعت تک کی [illegible] ۔۔ لاکھ ٹن ہے۔ چنانچہ [illegible] ٹن [illegible] فاضل ہوتا ہے [illegible] دوسرے منصوبے کے تحت لوہے اور فولاد کی صنعت کی ترقی [illegible] ہوئی ہے [illegible] خام دھات صاف کرنے والے کوئلے کی ضرورت ہونے سے پیدا ہوئیں۔ [illegible] کو مد نظر رکھا گیا اور [illegible] پورے لوہے کے کارخانے کے لیے عمدہ قسم [illegible] کے لیے مغربی بنگال کی حکومت نے [illegible] شدہ [illegible] کوئلے کی بھٹی کا کارخانہ

۳۔ لوہے اور فولاد کی صنعت پانچ سالہ منصوبوں کے تحت: [illegible] میں [illegible]

اسٹیل پینل نے جنگ کے بعد کے ہندوستان کی فولاد کی ضرورت کا تخمینہ ۲۰ لاکھ ٹن لگایا تھا۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں مشاورتی پلاننگ بورڈ نے صرف ۱۵ لاکھ ٹن کا تخمینہ لگایا۔ اِن تخمینوں کے وقت بھاری اور کلیدی صنعتوں کی ترقی کے لیے پرعزم ترقیاتی منصوبہ بندی ذہن میں نہیں تھی۔ چنانچہ اب یہ تخمینہ اُن تخمینوں کے مقابلے میں بہت کم معلوم ہوتے ہیں جو پلاننگ کمیشن نے لگائے تھے۔

دوسرے پلان کی تیاری کے وقت توقع تھی کہ پبلک سکٹر کے فولاد اور لوہے کے پروجکٹ ۲۰ لاکھ ٹن فولاد تیار کریں گے۔ یہ کہا گیا کہ اس نشانے کو حاصل کرنے کے لیے دوسرے پلان کے دوران روڑکیلا، بھلائی اور درگاپور میں تین کارخانے قائم کیے جائیں گے جن میں سے ہر ایک کی استعداد دس لاکھ ٹن ہوگی۔ روڑکیلا اور بھلائی میں فولاد کے ڈلوں کی پیداوار پلان کے ختم تک شروع ہوگی اور درگاپور کا کارخانہ ۱۹۶۲ء میں مکمل ہوا۔ جنوری ۱۹۶۵ء کے ایک سمجھوتے کے تحت روس کی مالی امداد سے فولاد کا چوتھا کارخانہ بوکارو، بہار میں قائم کیا جا رہا ہے جو ۱۹۷۲-۷۳ء تک مکمل ہوگا۔ اگرچہ بوکارو کے کارخانے کی ابتدائی استعداد ۱۷ لاکھ ٹن ہے لیکن اس کی گنجائش ۴۰ لاکھ اور آخری گنجائش ۴۵ لاکھ ٹن رکھی گئی ہے۔ تیسرے پلان میں لوہے اور فولاد کی استعداد کا مجموعی نشانہ ۱۰۲ لاکھ ٹن فولاد کے ڈلے اور ۱۵ لاکھ ٹن لوہے کے ڈلے مقرر کیا گیا تھا۔ اِس نشانے کو حاصل کرنے کے لیے روڑکیلا، بھلائی اور درگاپور کے کارخانوں کی استعداد کا نشانہ ۹۵ لاکھ ٹن کرنا تھا۔ فولاد کے نشانے میں نجی سکٹر کا حصہ ۳۲ لاکھ ٹن تھا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ تیسرے پلان کے ختم کے وقت ٹاٹا اور انڈین آئرن کی حاصل استعداد ۳۰ لاکھ ٹن تھی۔ تیسرے پلان میں تیار فولاد کا بھی نشانہ مقرر کیا گیا تھا اور یہ ۶۰ لاکھ ٹن تھا۔ لیکن پلاننگ کمیشن کے مطابق ۱۹۶۵-۶۶ء میں تیار فولاد کی پیداوار ۴۸ لاکھ ٹن تھی۔ اِس کمی کی وجہ کارخانوں کے توسیعی پروگرام اور بوکارو کے کارخانے کے قیام میں تاخیر تھی۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ تیسرے پلان کے ختم پر فولاد کے ڈلوں کی واقعی پیداوار ۶۵ لاکھ ٹن تھی اگرچہ نشانے کے مطابق ایک کروڑ ٹن ہونی چاہیے تھی۔ اب چوتھے پلان میں پلاننگ کمیشن ۱۱۰ لاکھ ٹن فولاد کے نشانے پر غور کر رہا ہے۔

ملک انجینیری ترقی کے موجودہ معیار کے پیشِ نظر نشانہ کچھ اونچا اور زیادہ پُرحوصلہ تھا۔ تاہم ساری مشکلات کے باوجود اس نشانے کو حاصل کرنا ہے کیونکہ اس کے بغیر صنعتی ترقی کی رفتار تیز نہیں کی جاسکتی۔ فولاد کی ۱۱۰ لاکھ ٹن کی پیداوار بھی مغربی صنعتی ممالک کی پیداوار سے بہت کم ہے۔ اِس وقت ہندوستان میں فولاد کا فی کس صرف برطانیہ کے ۸۲۰ پونڈ اور امریکہ کے ۱۲۳۰ پونڈ کے مقابلے

میں صرف ۱۰ پونڈ ہے۔ توقع ہے کہ عالمی بینک اور امریکی انجنیروں کی امداد سے ٹاٹا اور انڈین آئرن بہت تیزی سے ترقی کریں گے اور چوتھے پلان کے نشانے' یعنی ۱۱ لاکھ ٹن سالانہ کی پیداوار تک پہنچنے میں مدد کریں گے۔

مختصر یہ کہ لوہے اور فولاد کی ترقی کا پروگرام بہت بڑا اور پُر حوصلہ ہے۔ توقع ہے کہ چوتھے پلان کے دوران موجودہ کارخانوں کی توسیع اور نئے کارخانوں کے قیام سے ہم اپنی ضروریات پوری کرنے میں مدد دے گی درحقیقت پورے طور پر مکمل ہونے کے بعد روڑکیلا' بھلائی اور درگا پور کے کارخانے ۳۰ کروڑ روپے سالانہ کی قیمت کا لوہا اور فولاد پیدا کریں گے۔

چائے کی صنعت

(الف) موجودہ وسائل: ملک کے لیے بیرونی زرمبادلہ حاصل کرنے میں چائے اور جوٹ کی صنعت دونوں برابر کی شریک ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے پانچ سالہ منصوبوں میں چائے کی پیداوار کو پوری اہمیت دی گئی ہے۔ دوسرے پلان میں چائے کی پیداوار کا نشانہ ۷ کروڑ پونڈ اور برآمد کا نشانہ ۵۰ کروڑ پونڈ مقرر کیا گیا تھا۔ دوسرے پلان کے آخری سال چائے کی فصل ۷۰ کروڑ ۸۰ لاکھ پونڈ ہوئی اور ۵ر۴۷ کروڑ پونڈ چائے برآمد کی گئی۔ تیسرے پلان کے لیے پیداوار کا نشانہ ۹۰ کروڑ پونڈ اور برآمد کا نشانہ ۵۵ کروڑ پونڈ مقرر کیا گیا تھا۔ ۶۶-۱۹۶۵ء یعنی پلان کے آخری سال پیداوار ۸۰ کروڑ اور برآمد ۵۱ کروڑ پونڈ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ خوشی کی بات ہے کہ مسلسل مایوسیوں کے باوجود ۱۹۶۶ء میں صنعت نے ۸۵ کروڑ پونڈ کی رکارڈ پیداوار حاصل کی۔ اس سال ۵۱ کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ چائے برآمد کی گئی۔

صنعت کے موجودہ مسائل پر نظر ڈالنی ضروری ہے۔ پہلا مسئلہ اونچے مصارف پیداوار کا ہے۔ بڑھتی ہوئی قیمتوں اور حکومت کے زیر سرپرستی مزدوروں کی فلاح کے اقدام کی وجہ سے بنیادی اُجرت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ صنعت کو جن مشینوں کی ضرورت ہے ان کی قیمتیں کافی بڑھ گئی ہیں۔ صنعت کی بنیادی ضرورت امونیا سلفیٹ کی کھاد ہے۔ اس کی قیمت بھی پچھلے چند برسوں میں بہت بڑھ گئی ہے۔ عین اس زمانے میں جب صنعت چائے کی قیمت فروخت میں اضافہ طلب کرنے پر مجبور ہو رہی تھی' روپے کی شرح مبادلہ میں کمی کی خبر آئی۔ ۶ جون ۱۹۶۶ء کو روپے کی قیمت ۵ر۳۶ فی صدی گھٹادی گئی۔ اس کے فوراً بعد اکسپورٹ ٹیکس کریڈٹ اسکیم واپس لے لی گئی اور برآمد کی

جانے والی چائے پر ۲ روپے فی پونڈ اکسپورٹ ڈیوٹی عائد کردی گئی۔ ڈی ویلوایشن اور اکسپورٹ ڈیوٹی کی وجہ سے بہت سی عملی دشواریاں پیدا ہوگئیں، خصوصاً ان ملکوں کے ساتھ جن سے روپے میں ادائیگی کا معاہدہ تھا۔ چنانچہ روپے کی قیمت میں کمی کے بعد کافی عرصے تک روس اور یو۔اے۔آر کو برآمدات میں گڑبڑ رہی۔ نومبر ۱۹۶۶ء سے اکسپورٹ ڈیوٹی کو بالواسطہ محصول میں بدل دینے کا مطلب یہ تھا کہ برآمدات کو ترقی دی جائے لیکن محصول کے تعین میں دشواریوں کی وجہ سے مال بھیجنے میں تاخیر ہوتی تھی۔ مرارجی نے ۱۹۶۸ء کا بجٹ پیش کرتے وقت کافی اور چائے پر محصول میں اضافے کا اعلان کیا۔ لیکن چائے کی ادنیٰ قسم پر بعض علاقوں کی اعلیٰ قسموں کے مقابلے میں کم ڈیوٹی لگائی گئی۔ محصول کے اِس اضافے کو بے اثر کرنے کے لیے اکسپورٹ ڈیوٹی ۴۴ پیسے فی پونڈ کم کردی گئی — فروری ۱۹۶۹ء میں حکومت نے اکسپورٹ ڈیوٹی میں مزید تخفیف کا اعلان کیا تاکہ برآمد بڑھائی جاسکے۔ چائے کی ان قسموں پر جن کی قیمت ۸ روپے فی کیلو سے زیادہ تھی، اکسپورٹ ڈیوٹی کم کردی گئی۔ اور تمام قسموں کے لیے ۲۰ فی صدی کی یکساں بالواسطہ ڈیوٹی اور اس پر ۴۴ پیسے فی کیلو کی چھوٹ تجویز کی گئی۔ ۱۹۷۰ء کے مرکزی بجٹ میں یہ اعلان کیا گیا کہ برآمد کو مزید بڑھاوا دینے کے لیے چائے پر اکسپورٹ ڈیوٹی میں مزید کمی کی جارہی تھی اور اب ۲۰ فی صدی کے بجائے ۱۵ فی صدی بالواسطہ ڈیوٹی ہوگی جس پر ۴۴ پیسے کے بجائے ۵۵ پیسے فی کیلو چھوٹ ہوگی۔ یہ درست ہے کہ اکسپورٹ ڈیوٹی کی شرح میں کمی کی وجہ سے برآمد میں اضافے کی تحریک ہوگی لیکن صنعت کی غیر نفع بخش صورت کا مکمل حل صرف یہی ہے کہ اکسپورٹ ڈیوٹی ختم کردی جائے۔

صنعت کے اِس مطالبے پر کہ ٹی فائنانس کمیٹی (چاری کمیٹی) کی متفقہ سفارشات جلد از جلد پوری طور پر منظور کی جائیں، مندرجہ بالا پس منظر میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ٹی کمیٹی کی تجویز ہے کہ انکم ٹیکس لگاتے وقت نئے باغات کے مصارف پر ۵۰ فی صدی اور دوبارہ لگائے گئے باغات پر ۴۰ فی صدی ڈیولپمنٹ الاؤنس دیا جائے۔ کمیٹی نے ایک ٹی فائنانس کارپوریشن کے قیام کی بھی سفارش کی جو صنعت کو تمام کاموں کے لیے لمبی اور اوسط مدت کے قرض فراہم کرے۔ اِس کارپوریشن کا سرمایہ مرکزی حکومت، چائے پیدا کرنے والے صوبے اور چائے کمپنیاں فراہم کریں۔

حال میں پلاننگ انکوائری کمیشن نے تجویز کیا کہ انتظامی مصارف کم کیے جائیں اور آسام کیرج ٹیکس اور ویسٹ بنگال انٹری ٹیکس کو ختم کرکے صنعت کی مدد کی جائے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ آسام ٹیکسیشن ایکٹ ۱۹۵۴ء کو سپریم کورٹ نے ستمبر ۱۹۶۰ء میں کالعدم قرار دے دیا۔ صدر جمہوریہ کی

رضامندی سے اس ایکٹ کو پچھلی تاریخ سے دوبارہ پاس کیا گیا لیکن صرف ۱۹۷۰ - ۷۱ تک کے لئے۔ اسی درمیان آسام کی حکومت نے کیرج آف گڈس ایکٹ پاس کر دیا جس کا اطلاق زیادہ وسیع ہے۔ ویسٹ بنگال انٹری ٹیکس کی تاریخ بھی کچھ یونہی رہی اور صدر جمہوریہ کی رضامندی سے یہ غیر معینہ مدت کے لیے جاری ہے۔ چوتھا فائنانس کمیشن ان دونوں ٹیکسوں کو زیادہ قبول بنانے کے حق میں تھا۔ مئی ۱۹۷۰ء میں آسام اور بنگال کے وزیر مالیات کے جلسے میں یہ طے پایا کہ دونوں ٹیکسوں کو ختم کر دیا جائے اور ان کی جگہ مرکزی اکسائز ڈیوٹی لگا دی جائے جس کی آمدنی دونوں صوبوں میں تقسیم کر دی جایا کرے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے آسام اور بنگال کی چائے کی صنعت کو تھوڑا سا فائدہ پہنچا۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ ہماری صنعت کا سارا دار و مدار لندن آکشن پر تھا۔ یہ بات کہ لندن آکشن کی بنیاد پر چائے کی قیمتوں کا تعین پیدا کاروں اور صارفوں دونوں کے حق میں بہتر نہیں تھی۔ یہ بات تشفی بخش ہے کہ صنعت اب اس پر غور کر رہی ہے کہ چائے کی قیمتوں کا تعین لندن، کلکتہ اور کوچین کے آکشن کے اوسط کی بنیاد پر کیا جایا کرے۔ ٹی کمیٹی کی سفارش پر عمل کرتے ہوئے مرکزی حکومت نے حال میں براہ راست لندن آکشن بھیجی جانے والی چائے کی مقدار پر پابندی لگا دی ہے۔

تیسرا مسئلہ روپے کی قیمت میں ۵ء ۳۶ فی صدی کی کمی کے بعد برآمد کے امکانات کا ہے۔ بہرحال اس اقدام کے ساتھ ہی تمام قسم کی چائے پر دو روپے فی کیلوگرام ایکسپورٹ ڈیوٹی لگا دی گئی۔ یہ ڈیوٹی ادنیٰ قسم کی چائے پر بہت بوجھ بن گئی۔ سادہ اور اوسط درجے کی چائے کو بھی روپیہ کی قیمت میں کمی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور اکتوبر ۱۹۶۶ء کے ختم پر برآمد کے اعداد و شمار ۱۹۶۵ء کے مقابلے میں کم تھے۔ اچھی اور بہتر اوسط قسم کی چائے کو ضرور فائدہ پہنچا اور ان کی قیمت میں بھی اضافہ ہوا۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء کے مقابلے میں اکتوبر ۱۹۶۶ء کے ختم پر ان کی برآمد کی مقدار کافی زیادہ تھی۔ نومبر ۱۹۶۶ء میں ایکسپورٹ ڈیوٹی کا بالواسطہ نفاذ اور ساتھ ہی ۱۹۶۸-۶۹ء اور ۱۹۶۹-۷۰ء کے بجٹ میں ایکسپورٹ ڈیوٹی میں تخفیف مناسب اقدام تھے۔ لیکن ان سے بھی چائے کی صنعت کے مستقبل کے امکانات کچھ زیادہ روشن نہیں ہوئے۔

(ب) پلانٹیشن انکوائری کمیشن کی رپورٹ اور حکومت کا فیصلہ: یکم جولائی ۱۹۵۷ء کو حکومت نے اعلان کیا کہ اس نے پلانٹیشن انکوائری کمیشن (معینہ اپریل ۱۹۵۶ء) کی چائے کی صنعت سے متعلق زیادہ تر سفارشات کو منظور کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جن سفارشات کو منظور نہیں کیا گیا ان میں مینجنگ ایجنسی سسٹم کے خاتمے اور منافعے کا اعلان کرنے کے لیے ریزرو فنڈ سے رقم نکالنا ممنوع

قرار دینے کی کوششیں شامل ہیں۔ کمیشن نے اُجرتوں میں تفاوت کم کرنے اور عملے کو ہندوستانی بنانے کی ضرورت پر زور دیا تھا لیکن حکومت کا خیال تھا کہ یہ دونوں مقاصد رضاکارانہ عمل اور ٹیکسوں کے ذریعے پورے کیے جا سکتے تھے۔ حکومت نے جن سفارشات کو منظور کیا اُن میں یہ سفارشیں بھی تھیں کہ ٹی بورڈ تھوڑے تھوڑے وقفے سے چائے کے پیکٹوں کی پھٹکل قیمتوں کی جانچ کرتا رہے تاکہ چائے کی قیمت بہت زیادہ نہ ہونے پائے اور دوسری سفارش یہ کہ چھوٹے پیکٹ بنانے والی فرموں کی مشکلات کی مخصوص جانچ کی جائے۔ جہاں تک کمیشن کی اس تجویز کا سوال تھا کہ ہندوستان میں صَرف ہونے والی چائے کا ۵۰ فی صدی حصّہ ٹی بورڈ پیک کرے اور اُس کی تقسیم کا انتظام کرے اور کلکتے اور کوچین کی مارکٹ میں آکشن کروائے، حکومت کا خیال تھا کہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے ٹی بورڈ کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔

(ج) **رجحانات**: آزادی کے بعد سے حکومت مزدوروں کی فلاح میں بہت دلچسپی لے رہی ہے اور باغات کے مزدوروں کی حالت سدھارنے کی کوشش کر رہی ہے۔ جولائی ۱۹۵۸ء میں حکومت نے صنعتی تعلقات بہتر کرنے اور چائے کے باغات کے مزدوروں کی فلاح سے متعلق پلانٹیشن اِنکوائری کمیشن کی تفصیلی سفارشات منظور کرنے کا اعلان کر دیا۔

حال میں قائم کی گئی ٹی کونسل برطانیہ، امریکہ، کناڈا، مغربی جرمنی اور آئرلینڈ میں چائے کا استعمال بڑھانے کے سلسلے میں بہت اچھا کام کر رہی ہے۔ کونسل کے کام کو اور تیز کرنے کی ضرورت ہے تاکہ روپے کی قیمت میں کمی کا پورا فائدہ اُٹھایا جا سکے اور چائے کی برآمد کافی بڑھائی جا سکے۔

چوتھے پلان میں چائے کی پیداوار کا نشانہ ۱۰۰ اکروڑ پونڈ مقرر ہوا ہے۔ اِس سطح تک پیداوار لانے کے ساتھ ساتھ چائے کی قسم کو بھی بہتر رکھنا چاہیے اور بیرونی ممالک میں ہندوستان کی چائے کا خوب پروپیگنڈا ہونا چاہیے۔ دنیا کی منڈی میں اِس وقت چائے کی رسد بہت کافی ہے جس کی وجہ سے مقابلہ شدید ہے۔ درحقیقت اِس وقت دُنیا میں چائے کی رسد ضرورت سے زیادہ ہے۔ فوڈ اینڈ ایگریکلچرل ارگنائزیشن نے حال میں یہ پیشین گوئی کی ہے کہ ۱۹۷۵ء تک دُنیا میں ۱ اکروڑ کیلوگرام چائے ضرورت سے فاضل ہوگی۔ اِس لیے بہتر منصوبہ بندی، پروپیگنڈا کے نئے طریقوں، اکسپورٹ ڈیوٹی میں مزید تخفیف، بہتر قسم کی چائے کی پیداوار اور اُس کی پیکنگ اور تقسیم پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

باب ۲۳

صنعتی تعلقات، ٹریڈ یونین اور اجتماعی سودے بازی

ہندوستان جیسے ملک میں جو منصوبہ بند ترقی پر عمل کر رہا ہے اُس کے لیے اِس بات کی شدید ضرورت ہے کہ پیداوار میں اضافہ ہو، زیادہ لوگوں کو روزگار ملے اور سرمایہ لگانے کے لیے زیادہ روپیہ فراہم ہو۔ ہماری جیسی ترقی پزیر معیشت کے بدلتے ہوئے نظام میں جن مسائل پر توجہ مرکوز ہوتی ہے وہ صنعتی روابط کے مسائل ہیں۔ یہ مسائل اُجرت میں اضافے اور حالاتِ کار کی بہتری کے علاوہ قومی آمدنی کی تقسیم، پیداآوری، ٹکنکل تبدیلیوں، معاشی قوت کی تقسیم اور آمدنی کی نابرابری سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ معاشی ترقی کے دَوران ایسی معقول اور متوازن لیبر پالسی کی ضرورت ہوتی ہے جو پیداوار کے پیچیدہ مسائل اور صَرف کے مشترکہ مسائل دونوں کو یکساں طور سے اہمیت دیتی ہو۔

جو لوگ ہندوستان کے صنعتی روابط کی ساخت سے واقف ہیں وہ ان مشکلات کو بھی جانتے ہیں جو ہندوستان کے حالات کے ساتھ مخصوص ہیں۔ سوتی کپڑے، شکر، جوٹ، ریلوے، تار اور ڈاک جیسی صنعتوں کو چھوڑ کر بیشتر صنعتوں میں صنعت وار اور صوبہ وار ٹریڈ یونینیں نمایاں طور سے مفقود ہیں۔ بہت سی ایسی مثالیں ہیں جہاں ٹریڈ یونین صنعت کی ساخت کا تفصیلی مطالعہ نہیں کرتیں بلکہ صنعت کی ماہیئت کی طرف توجہ دیے بغیر رسمی مطالبات پورے کرنے کی فکر میں لگی رہتی ہیں۔ زیادہ اُجرت کے مطالبے پر اپنی قوت ضایع کرنے کی بجائے اِن کو چاہیئے کہ یہ اپنی جسامت کو بڑھائیں تاکہ مستقبل قریب میں مزدوروں کو زیادہ فائدے حاصل ہو سکیں۔

انڈسٹریل ڈِسپیوٹس ایکٹ

(الف) ۱۹۲۹ء کا اِنڈسٹریل ڈسپیوٹس ایکٹ : صنعتی اختلافات کے مسائل حل کرنے کے سلسلے میں برطانوی دَور کا سب سے اہم ایکٹ ۱۹۲۹ء کا انڈسٹریل ڈسپیوٹس ایکٹ ہے۔ اِس ایکٹ کا بنیادی مقصد صنعتی اختلافات کے تصفیے کے لیے ایک بیرونی ایڈہاک مشینری قائم کرنا تھا۔ یہ ایڈہاک مشینری کورٹ آف اِنکوائری یا مرکزی، صوبائی اور ریلوے حکام کے بنائے ہوئے مصالحتی بورڈ پر مشتمل تھی۔ اِس ایکٹ کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ کورٹ آف اِنکوائری یا مصالحتی بورڈ عارضی ہوتے تھے جس کی وجہ سے صنعت میں رونما ہونے والے روزانہ کے واقعات سے مسلسل طور سے باخبر نہیں رہتے تھے۔ درحقیقت ضرورت اِس بات کی تھی کہ صنعتی اختلافات دُور کرنے کے لیے مستقل بیرونی مشینری کے تکملے کے طور پر ایک اندرونی مشینری ہو جو شروع ہی میں گفت وشنید کے ذریعے مسائل حل کرنے کی کوشش کرے۔ ۱۹۳۴ء میں ایک ترمیمی ایکٹ کے ذریعے ۱۹۲۹ء کے ایکٹ کو مستقل کردیا گیا۔ ۱۹۳۸ء میں ایک دوسرا ترمیمی ایکٹ پاس ہوا جس میں مصالحتی افسروں کے تقرر کا اہتمام تھا۔ اِس طرح مستقل مشینری کی ضرورت صرف جزوی طور پر رفع ہوئی۔

(ب) ۱۹۴۷ء کا اِنڈسٹریل ڈسپیوٹس ایکٹ : دوسری جنگ عظیم کے آخری مراحل میں اور اُس کے فوراً بعد صنعتی بےچینی ہندوستان کے منظم سکٹر کی نمایاں خصوصیت بن گئی۔ ہڑتالوں اور کارخانوں کی دربندیوں (LOCK OUT) کو روکنے کے لیے ڈِفنس آف اِنڈیا رولز کے تحت ہنگامی قوانین پاس کیے گئے۔ جنگ ختم ہوتے ہی حکومت نے فیصلہ کیا کہ اِن ہنگامی قوانین میں سے بیشتر کو ایک مستقل قانون میں شامل کرلیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء کا انڈسٹریل ڈسپیوٹس ایکٹ پاس کیا گیا جس نے ۱۹۲۹ء کے ایکٹ کی جگہ لی۔ اِس ایکٹ کی دو خصوصیات ہیں (۱) آجروں اور مزدوروں کے کے روزانہ کے اختلافات دُور کرنے اور تعلقات بہتر کرنے کے لیے سَو یا سو سے زیادہ مزدوروں والے ہر صنعتی کاروبار میں ورکس کمیٹیاں قائم کی جاتی تھیں جو آجروں اور مزدوروں کے نمائندوں پر مشتمل ہونگی (۲) ایک یا ایک سے زیادہ ممبروں پر مشتمل اِنڈسٹریل ٹریبیونلز قائم کیے جائیں۔ ٹریبیونل کے ممبر کم ازکم ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت کے ہوں۔ کسی بھی اختلاف کو فریقین اور حکومت کی رضامندی سے ٹریبیونل کے سپرد کیا جاسکتا ہے۔

۱۹۴۷ء کے ایکٹ کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ یہ مصالحتی مشینری کو نیا رُخ دیتا ہے۔ ایکٹ کے

تحت صوبے کی حکومتیں اختیار رکھتی ہیں کہ وہ جھگڑے کے مناسب تصفیے کے لیے ثالث مقرر کر سکتی ہیں ثالث کو چودہ روز کے اندر تصفیے سے متعلق اپنی رپورٹ داخل کرنی ہوگی۔ اگر اُس کی کوشش ناکام رہی تو حکومت اس معاملے کو ثالثی بورڈ یا انڈسٹریل ٹریبونل کے سپرد کر دے گی۔ بورڈ کا ایک خود مختار اور آزاد چیرمین ہوگا اور دو یا دو سے زیادہ اُس کے ممبر ہونگے جو مساوی طور سے فریقین کی نمائندگی کریں گے۔ بورڈ کو اگر کامیابی ہوئی تو معاہدہ چھ ماہ تک اور فریقین کی رضامندی سے چھ ماہ سے زیادہ نافذ رہے گا۔

اگر بورڈ فیصلہ کرنے میں ناکام رہا تو حکومت اِس معاملے کو چھ مہینے کے اندر کورٹ آف انکوائری کے سپرد کر سکتی ہے۔ سب سے آخر میں معاملے کو فیصلے کے لیے ٹریبونل کے سپرد کیا جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے ایکٹ کے تحت حکومت کو یہ اعلان کرنا ہوتا تھا کہ فریقین معینہ مدت کے لیے ٹریبونل کے فیصلے کے پابند ہیں۔ لیکن ۱۹۵۰ء کے ایکٹ کے تحت فیصلہ شائع ہونے کے ۳۰ روز بعد خود بخود نافذ ہو جاتا ہے۔

۱۹۴۷ء کے ایکٹ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ حکومت کو اختیار ہے کہ وہ رفاہ عامّہ کی صنعتوں کے اختلافات کو مصالحت کے لیے ٹریبونل کے حوالے کر سکتی ہے۔ مناسب اور بروقت نوٹس دیے بغیر رفاہ عامّہ کی صنعتوں میں ہڑتال اور دربندی غیر قانونی تصوّر کی جائے گی۔ اِس کے علاوہ ٹریبونل کی مصالحتی کارروائی کے دَوران ہڑتال اور دربندی ممنوع ہے۔

اِس طرح لازمی مصالحت اور لازمی ثالثی کا جُزو اں نظام قائم کر کے ۱۹۴۷ء کے ایکٹ نے پہلی بار جھگڑوں کے تصفیے کی ایک مُستقل مشینری فراہم کی۔ ۱۹۵۳ء، ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۶ء کی ترمیمات نے کارخانوں اور باغات کے چھٹنی کیے ہوئے مزدوروں کو معاوضے کا حق دیا۔

نومبر ۱۹۵۶ء میں سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ اِس معاوضے کا حقدار وہ مزدور نہیں ہے جس کی خدمات کسی روزگار کے واقعی بند ہو جانے سے یا کاروبار کی ملکیت ایک سے دوسرے کو منتقل ہونے کی وجہ سے منقطع ہوئی ہے۔ اِس فیصلے کی وجہ سے مزدوروں کو بڑی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ احمد آباد، کانپور اور مغربی بنگال میں بہت سے کارخانے بند ہو گئے جن کے بے روزگار مزدوروں کو کوئی معاوضہ نہیں ملا۔ چنانچہ اپریل ۱۹۵۷ء میں حکومت نے ایک آرڈی نینس جاری کیا جس نے جون ۱۹۵۷ء سے انڈسٹریل ٹریبونل ایکٹ کی جگہ لے لی۔ اِس آرڈی نینس کے مطابق کاروبار واقعی بند ہو جانے یا تبادلۂ ملکیت کی صورت میں مزدور معاوضے کا حقدار بن گیا۔ اِس کا نفاذ دسمبر ۱۹۵۶ء سے

ہوا۔ مختصر یہ کہ ۱۹۴۷ء کے ایکٹ اور اُس میں اب تک کی ترمیمات میں جن باتوں سے متعلق اہتمام ہے۔ وہ یہ ہیں (۱) ورکس کمیٹیاں (۲) مصالحتی اور ثالثی مشینری (۳) ہڑتال اور دربندیاں (۴) چھٹنی کا معاوضہ۔ مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، یوپی، میسور، کیرل اور جموں کشمیر نے صنعتی جھگڑوں کے لیے الگ قوانین بنائے ہیں۔

(ج) ۱۹۵۰ء کا لیبر ریلے شنز بل: صنعتی روابط کو مزید بہتر بنانے کے لیے مرکزی حکومت نے ایک جامع بل پارلیمنٹ میں پیش کیا جس کو لیبر ریلے شنز بل کہتے ہیں۔ اِس بل میں ۱۹۴۷ء کے ایکٹ کی خامیوں کو دور کرنے کی اور جھگڑوں کے تصفیے کی بیرونی اور داخلی مشینری کو نئی شکل دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ بل میں صنعتی جھگڑوں کو نپٹانے کے لیے ۹ عدد حکام اور کمیٹیوں کے تقرر کی تجویز ہے ـــــــ رجسٹرنگ آفیسر، ورکس کمیٹیاں، ثالث، ثالثی بورڈ، اسٹینڈنگ ثالثی بورڈ، کمیشن آف انکوائری، لیبر کورٹس، لیبر ٹریبونل اور اپیلیٹ ٹریبونل۔ بل میں اجتماعی سودے کے سلسلے میں بھی ایک دفعہ رکھی گئی ہے اور حکومت کو اختیار دیے گئے ہیں کہ اگر مفاد عامہ میں وہ ضروری سمجھے تو دخل دے سکتی ہے اور کاروبار کی نگرانی اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔ اِس بل کے تحت غیر قانونی ہڑتالوں اور دربندیوں کے دفعات زیادہ سخت ہیں۔ بل کا دائرہ عمل وسیع ہے اور اس کے تحت وہ سارے کاروبار آتے ہیں جن میں دس آدمیوں سے زیادہ ملازم ہیں۔ اِن کے علاوہ خانگی ملازم اور دفاعی کام کرنے والے بھی اِس میں آجاتے ہیں۔

بل اپنی جامعیت کے اعتبار سے واقعی ایک بڑی دستاویز ہے لیکن اِس کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ بل کو جامع بنانے کی کوشش میں بہت سے عملی امور کی طرف غفلت برتی گئی ہے جھگڑے کے تصفیے کے لیے اتنی زیادہ ایجنسیاں ہیں کہ فیصلے تک پہنچنے میں بڑی تاخیر ہوتی ہے۔ اِس کے علاوہ حکومت کو مداخلت اور نگرانی کے وسیع اختیارات حاصل ہو گئے تھے اور ڈر تھا کہ حکومت اور اس کے کارندے اِن اختیارات کا غلط استعمال نہ کریں۔ آجروں کو مخصوص صنعتوں پر سرکاری نگرانی کی تجویز سے شدید اختلاف تھا۔

شدید مخالفت کی وجہ سے یہ بل عارضی پارلیمنٹ برخواست ہونے کے وقت واپس ہو گیا۔ ۱۹۵۲ء میں مسٹر وی۔ وی گری وزیر محنت مقرر ہوئے۔ ان کے تقرر کا اثر یہ ہوا کہ صنعتی امن قائم رکھنے کے لیے قانون سازی اور لازمی ثالثی کی طرف سے توجہ ہٹ گئی اور باہمی گفت و شنید اور اجتماعی سودے پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں نینی تال میں منعقد ہونے والی تین پارٹی لیبر

کانفرنس میں مسٹر گری نے رضاکارانہ مصالحت اور رضاکارانہ ثالثی میں اپنے اعتماد پر زور دیا۔ چنانچہ انھوں نے ایک نئے بل کا مسودہ تیار کیا جو اُن کے نظریوں کے مطابق تھا اور جو مارچ ۱۹۵۴ء میں پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ ستمبر ۱۹۵۴ء میں مسٹر گری نے استعفا دے دیا اور ان کی جگہ کھانڈو بھائی دیسائی وزیر محنت مقرر ہوئے۔ مسٹر دیسائی کے زمانے میں یہ بل کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ نئے لیبر ریلے شنز بل کے بجائے حکومت نے ضروری ترمیمات کرکے ۱۹۴۷ء کے انڈسٹریل ڈسپیوٹس ایکٹ کو نئی شکل دے دی ہے۔

صنعتی روابط کے رجحانات اور صنعتی امن کا ریزولیوشن

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے انڈسٹریل ڈسپیوٹس ایکٹ میں ورکس کمیٹیوں اور مصالحتی مشینری کی دفعات کو چھوڑ کر بنیادی طور سے زیادہ زور لازمی ثالثی پر دیا گیا تھا۔ ۱۹۵۰ء کے ایکٹ میں اپیل کے ایک ٹریبیونل کے قیام کا اہتمام کیا گیا جس کے اختیاراتِ سماعت میں تمام لیبر کورٹ، انڈسٹریل کورٹ اور انڈسٹریل ٹریبیونل ہونگے۔ اِس کے برعکس مسٹر گری کا نظریہ رضاکارانہ مصالحت اور رضاکارانہ ثالثی پر مبنی تھا اور اس کے مطابق اجتماعی سودا لازمی ثالثی سے بہت بہتر تھا۔ ۱۹۴۷ء کے ایکٹ میں حال میں جو ترمیم ہوئی ہے انڈسٹریل ڈسپیوٹس ایکٹ ۱۹۵۶ء میں اِس نظریے کو پورے طور سے تسلیم نہیں کیا گیا ہے کہ اجتماعی سودے کی ہمت افزائی کی جائے اور لازمی ثالثی کو صرف غیر معمولی حالات میں استعمال کیا جائے۔

۱۹۵۶ء کا ایکٹ پچھلے نظام کی جگہ پر ایک سہ منزلہ نظام پیش کرتا ہے۔ یہ نئی مشینری تین قسم کے نیم عدالتی اداروں پر مشتمل ہے، لیبر کورٹ، انڈسٹریل ٹریبیونل اور نیشنل ٹریبیونل۔ آخر الذکر ایک نیا ادارہ ہے جو قومی اہمیت کے معاملات کے لیے اُن صنعتی اداروں کے معاملات کے لیے ہے جو ایک سے زیادہ صوبوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ایکٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر کوئی معاملہ نیشنل ٹریبیونل کے سپرد کر دیا گیا ہے تو اُس معاملے میں کوئی لیبر کورٹ یا انڈسٹریل ٹریبیونل ثالثی نہیں کرے گا۔ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ معاملہ عدالت کے زیرِ غور ہونے کے دَوران کاریگر کے شرائط کار میں کوئی ردّ و بدل نہیں کیا جائے گا لیکن آجر اُن معاملات میں کاریگر کے خلاف جاری احکام کے مطابق کارروائی کر سکتا ہے جن کا تعلق زیرِ غور تنازع نہیں ہے۔

اِس طرح ۱۹۵۰ء کے ایکٹ میں اپیلیٹ ٹریبیونل کے ذریعے ثالثی کا جو نظام بنایا گیا تھا وہ

۱۹۵۶ء کے ایکٹ کے نافذ ہونے کے ساتھ ختم ہوگیا۔ اپیلیٹ ٹریبونل کے خاتمے کے ساتھ نئے انڈسٹریل ٹریبونل کو زیادہ ذمہ واریاں دی گئیں۔ ۱۹۵۶ء کے انڈسٹریل ڈسپیوٹس ایکٹ میں اختلافات کے فیصلہ کن تصفیے کے سلسلے میں انڈسٹریل ٹریبونل سے بڑی توقعات وابستہ کی گئی ہیں۔ لیکن بظاہر ملک میں اِس وقت اِس بات پر اتفاق رائے معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی سودے، رضاکارانہ مصالحت اور ثالثی کے ذریعے اختلافات رفع کرنے پر زیادہ بھروسہ کرنا چاہیئے اور لازمی ثالثی کے لیے کسی معاملے کو صرف اُس وقت سپرد کرنا چاہیئے جب مصالحت کی کوئی اور صورت نہ رہ گئی ہو۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ چوتھے پلان میں رضاکارانہ ثالثی پر زیادہ زور دیا جائے گا تاکہ انڈسٹریل کورٹ اور ٹریبونل کا استعمال کم سے کم ہو۔ لیکن موجودہ نظام کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اب بھی صنعت کے ایسے حلقے ہیں جہاں ٹریڈ یونینوں کو تسلیم نہیں کیا جاتا ہے اور جہاں رضاکارانہ اصُول پر پورے طریقے سے عمل نہیں جاتا۔ اِس موقع پر یہ بھی ذکر کردینا چاہیئے کہ ۱۹۵۸ء میں انڈسٹریل لیبر کانفرنس میں ضابطے کی پابندی کے اصول کی ترتیب اُس وقت ہوئی تھی جب ملک میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ یہ کوڈ آف ڈسپلن ایک اہم رضاکارانہ آلۂ کار ہے۔ اِس کا مقصد یہ ہے کہ مزدور ہڑتال کرنے سے احتراز کریں اور اختلافات کے تصفیے کے لیے موجودہ مشینری کو کام میں لائیں۔

ابھی تیسرا پلان اپنی آدھی مدت بھی نہیں پوری کر پایا تھا کہ چین نے حملہ کردیا۔ چین کے حملے سے صنعتی انقلاب میں بنیادی تبدیلی آئی۔ یہ محسوس کیا جانے لگا کہ چین کے حملے کی وجہ سے ملک میں غیر معمولی صورت حال پیدا ہوگئی ہے اور ہر سمت میں ایسے اقدام کرنے کی ضرورت ہے کہ ملک اپنے دفاع کے لیے پوری تیاری کرسکے۔ چنانچہ ۳ر نومبر ۱۹۶۲ء کو سنٹرل امپلائرز اینڈ ورکرز آرگنائزیشن کے جلسے میں یہ طے پایا کہ زیادہ سے زیادہ پیداوار کی ہر ممکن کوشش کی جائے اور مزدور تنظیمیں ہر ممکن طریقے سے تعاون کی کوشش کریں تاکہ ملک کے دفاعی اقدام کو ترقی دی جاسکے۔ سب نے مل کر ملک کی خدمت اور وفاداری کا حلف اُٹھایا۔ ۱۹۶۲ء کی جنگ بندی کے اِس ریزولیوشن میں صنعتی امن کے قیام کے لیے مندرجہ ذیل اقدام پر زور دیا گیا:

(۱) کسی بھی حالت میں اشیا اور خدمات کی پیدائش میں خلل یا سُستی نہ آنے دی جائے۔

(۲) جہاں تک مزدوروں اور آجروں کے معاشی مفاد کا سوال ہے دونوں رضاکارانہ طور سے ضبط سے کام لیں اور ملک کے مفاد میں زیادہ سے زیادہ اور یکساں قربانی پر آمادہ رہیں۔

(۳) رضاکارانہ ثالثی کو زیادہ سے زیادہ کام میں لایا جائے اور اِس مقصد کے لیے معقول

اِنتظام کیے جائیں اگر اس کے باوجود حکومت کے فیصلے کی ضرورت ہو تو اس کارروائی کو جلد از جلد پورا کیا جائے۔

(۴) ۱۹۴۷ء کے ایکٹ میں جن صنعتوں کا ذکر ہے انھیں اور پٹرول سے بنی اشیا اور کیمیاوی اشیا جیسی ضروری صنعتوں کو مفادِ عامہ کی خدمات ہونے کا اعلان کر دیا جائے۔

(۵) موقوفی، علیحدگی، چھٹنی اور مزدور سے بدلہ لینے سے متعلق ساری شکایات جو رضاکارانہ ثالثی کے ذریعے نہ دُور کی جا سکیں وہ حکمی فیصلے کے ذریعے طے کی جائیں۔ یہ کام فریقین کی رضامندی سے مصالحتی مشینری کے افسر انجام دے سکتے ہیں لیکن مزدوروں کی برطرفی اور موقوفی سے احتراز کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

(۶) مرکز اور صوبوں کے لیبر ایڈمنسٹریشن کو زیادہ مستعد اور بہتر بنایا جائے تاکہ شکایت جلد از جلد دُور کی جا سکے اور جھگڑوں کا فیصلہ فوراً ہو سکے اور پُرتپاک صنعتی روابط قائم رکھے جا سکیں۔

جنگ بندی کا یہ ریزولیوشن اور ضابطے کی پابندی کا کوڈ دونوں رضاکارانہ آتے ہیں اور اختلافات کو رضاکارانہ ثالثی کے ذریعے دُور کرنے پر زور دیتے ہیں۔ نومبر ۱۹۶۲ء میں جب صنعتی جنگ بندی کا ریزولیوشن منظور ہوا اُس وقت سے لے کر ۱۹۶۷ء کے آخر تک مرکزی حلقے کے مزدور اور آجر اپنے ۳۹۰۸ معاملات میں سے ۱۸۷ کے لیے اِس بات پر رضامند ہوئے کہ رضاکارانہ ثالثی کے ذریعے اِن کا تصفیہ ہو کیونکہ رضاکارانہ مصالحت ان کے تصفیے میں ناکام رہی تھی۔ حکومت نے ایک قومی ثالثی بورڈ بھی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

ٹریڈ یونین

مناسب ہوگا اگر اب ہم ہندوستان کی ٹریڈ یونین تحریک کی طرف متوجہ ہوں۔ ہندوستان میں ٹریڈ یونین تحریک شروع ہوئے پچاس برس سے زیادہ ہو چکے ہیں لیکن اب تک کی ترقی تشفی بخش نہیں ہے۔ چند ٹریڈ یونینیں ہیں جو مستحکم ہیں اور جن میں لوگوں کی بڑی تعداد شامل ہے۔ اِن کے لیڈر زیادہ تر سیاست داں اور سوشل ورکر ہیں جو صنعتی مزدوروں کے مسائل ٹھیک طور سے نہیں سمجھتے اور جن میں سے بیشتر کو مزدوروں کی خواہشات اور ان کی تمناؤں سے حقیقی دلچسپی نہیں ہے۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ ٹریڈ یونین کا انتظام اَیسے مستعد اور کارکرد لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو یونین کے معمولی ممبروں میں سے منتخب ہو کر اوپر آئیں۔ اِن لیڈروں کو ایسے ٹکنکل ماہروں کی امداد حاصل ہو جو قوانینِ محنت اور صنعتی روابط سے متعلق معاملات سے واقف ہوں۔

ہندوستان کی ٹریڈ یونین تحریک کی مشکلات

ہندوستان جیسے ملک میں جو غربت اور بیروزگاری میں گرفتار ہے' ٹریڈ یونین تحریک تیزی سے ترقی نہیں کر سکتی کیونکہ اِس کی راہ میں بڑی مشکلات تھیں پہلی مشکل یہ تھی کہ جہالت اور ناخواندگی کی وجہ سے مزدوروں میں جمہوری اسپرٹ کی کمی ہے۔ طویل المدت استحصال کی وجہ سے ان کی ذہنیت غلامانہ ہوگئی ہے اور ان میں ایسی بے حسی پیدا ہوگئی ہے جس سے ان کو جھنجھوڑنا بڑا مشکل ہے۔ چنانچہ اگر ان کی حالت سدھارنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اُن پر اُس کا ردِ عمل نہیں ہوتا۔

دوسری مشکل مختلف زبانوں' ذاتوں' مذہبوں' رسم و رواج اور ہندوستانی مزدوروں کی نقل پزیری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ مزدور نسل' زبان' مذہب' ذات پات اور مخصوص عادات کے لحاظ سے بٹے ہوئے ہیں اور یہ تقسیم مزدوروں کے اتحادِ عمل میں شدید طور سے مانع ہے۔ اس کے علاوہ مزدوروں کی نقل پزیری سے بھی نقصان پہنچتا ہے کیونکہ ٹریڈ یونین تحریک کی ترقی کی پہلی شرط مستحکم اور جمی ہوئی آبادی ہے۔ تیسری مشکل یہ ہے کہ افلاس' قرض اور کم اُجرت کی وجہ سے ٹریڈ یونین کا چندہ باقاعدگی سے دینے کی نہ ان میں اِستعداد ہے اور نہ خواہش ہے۔ نہ اُن کے پاس اِتنا خالی وقت ہے کہ وہ ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں۔ اِس مسئلے کا طویل المدت حل یہ ہے کہ وسیع پیمانے پر ٹریڈ یونین کی تعلیم دی جائے۔ اِس سلسلے میں مزدوروں کی تعلیم کا وہ پروگرام قابلِ ذکر ہے جو محنت اور روزگار کی وزارت نے شروع کیا ہے۔

چوتھے یہ کہ بیشتر ٹریڈ یونینوں میں کچھ بنیادی خامیاں ہیں۔ بہت سی یونینیں ہڑتال کرانے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہیں اور مزدوروں کی فلاحی سرگرمیوں میں کم دلچسپی رکھتی ہیں۔ جیسا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے ہندوستان کی ٹریڈ یونین تحریک کی بنیادی خامیوں میں سے ایک خامی یہ ہے کہ اِس کے لیڈر مزدور طبقے سے نہیں آتے ہیں۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ مزدوروں کی تعداد بہت کم ہے جس کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ ایک ہی صنعت میں کئی کئی یونینیں ہیں۔ مزدوروں کو متحد کرنے کے لیے مستحکم اور بڑی یونینیں ہونی چاہئیں۔ نعرہ یہ ہونا چاہیے کہ "ایک صنعت ایک یونین"

آخری مشکل یہ ہے کہ آجروں اور روزگار دلانے والوں کی طرف سے ٹریڈ یونینوں کی شدید مخالفت ہے۔ روزگار دلانے والے دلال اپنی بقا کے لیے مزدوروں میں نا اتفاقی پیدا کرتے ہیں

مزدور تحریک کی بیخ کنی کرتے ہیں۔ بیشتر آجر بھی ٹریڈ یونینوں کو ناپسند کرتے ہیں اور ٹریڈ یونین کے کارکنوں سے خاص کر نفرت کرتے ہیں۔ بہت سے آجر بالواسطہ اس بات کی ہمت افزائی کرتے ہیں کہ مخالف یونینیں قائم ہو جائیں تاکہ مزدوروں کے اتحاد اور یکجہتی میں خلل پڑے۔

ہندوستان میں ٹریڈ یونین کی مناسب ترقی کے لیے ضروری ہے کہ مزدور اپنے حقوق سے واقف ہوں اور اپنی طاقت پر اعتماد رکھتے ہوں۔ ٹریڈ یونینوں کو سیاست سے آزاد ہونا چاہیے اور اپنے انتظام کو بہتر کرنا چاہیے تاکہ مزدور طبقے کی حالت سدھارنے کے لیے فلاحی سرگرمیوں میں زیادہ دلچسپی لے سکیں۔ پلاننگ کمیشن کی تجویز ہے کہ کچھ شرائط پر یونینوں کو قانونی طور سے تسلیم کیا جانا چاہیے۔ یہ مناسب ہے لیکن قانوناً تسلیم کرلینے سے ٹریڈ یونین کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچے گا جب تک کہ مزدور متحد ہو کر اپنے مطالبات آجروں سے منوا سکیں۔ ہندوستان کی ٹریڈ یونین تحریک کی پہلی شرط چھوٹی یونینوں کا اتحاد اور مزدوروں کی یکجہتی ہے۔

ٹریڈ یونین سے متعلق قوانین

پہلی جنگ عظیم کے دوران مصارف زندگی بڑھنے، روسی انقلاب اور انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن کے قیام سے ہندوستان کی ٹریڈ یونین تحریک کو ۱۹۱۸ء میں ابھرنے کا موقع ملا۔ اگرچہ اس تحریک کو بہت کامیاب نہیں کہی جاسکتی تاہم یہ اپنی علاقائی، صنعتی اور شماری بنیاد کو وسعت دینے میں کامیاب رہی۔

(الف) ٹریڈ یونین ایکٹ ۱۹۲۶ء: پہلا ٹریڈ یونین ایکٹ ۱۹۲۶ء میں پاس ہوا اور ۱۹۲۷ء کو اس کا نفاذ ہوا۔ اس کے تحت ٹریڈ یونینوں کا رجسٹر کرانا اختیاری قرار دیا گیا۔ رجسٹرڈ یونینوں کے لیے سالانہ حسابات اور ممبروں کی تعداد وغیرہ داخل کرنا ضروری تھا۔ رجسٹرڈ یونینوں کو جو حقوق حاصل ہیں ان کے مطابق انھیں سول اور فوجداری عدالتی کارروائی سے کافی تحفظ ملا۔ لیکن اس کے باوجود کہ ایکٹ نے ٹریڈ یونینوں کو تسلیم کرلیا اور ان کی قانونی حیثیت سے صحت مند ٹریڈ یونین کی تنظیموں کی ہمہ گیر ترقی کا مقصد نہیں پورا ہوا۔ ... نہ تھی کہ اس سے غیر مندرج یونینوں کو کچھ حقوق اور آسانیاں نہ دے کر ... لیکن قانون کے ذریعے انھیں مندرج یونینوں کی عام جماعت میں شامل

(ب) انڈین ٹریڈ یونین ایکٹ ۱۹۴۷ء و ۱۹۶۰ء : ۱۹۴۷ء میں ۱۹۲۶ء کے ایکٹ میں ترمیم کی گئی۔ اِس ترمیم شدہ ایکٹ میں ایک دفعہ رکھی گئی جس کی رُو سے نمائندہ یونینوں کو تسلیم کرنا آجروں کے لیے لازمی قرار دیا گیا۔ اِس ایکٹ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اِس کے تحت لیبر کورٹ کا اہتمام کیا گیا ہے جو کسی ٹریڈ یونین کو تسلیم نہ کیے جانے سے متعلق شکایات کی سماعت کریں گے۔ ایکٹ میں یونینوں اور آجروں کی اُن کارروائیوں کو بھی گنایا گیا ہے جو ناجائز سمجھی جائیں گی۔ مثلاً اگر کسی یونین کے بیشتر ممبر غیر قانونی ہڑتال میں شریک ہوتے ہیں یا یونین کی اِنتظامیہ ایسی ہڑتال پر اُکساتی ہے تو یہ ناجائز کارروائی ہوگی اور سزا کے طور پر یونین کی مانیتا واپس لے لی جائے گی۔

۱۹۴۷ء کی ترمیم کی تعمیل صوبائی حکومتوں کو کرنی ہے جو ٹریڈ یونینوں کے رجسٹرار کا تقرر کریں گی۔ لیکن رجسٹرار ٹریڈ یونینوں کے کھاتے اور رجسٹر وغیرہ کا معاینہ نہیں کر سکتے جو اِس ایکٹ کی بڑی خامی سمجھی جاتی ہے۔ بہرحال جولائی ۱۹۵۹ء میں لیبر کانفرنس کے سترھویں اجلاس میں یہ طے پایا کہ رجسٹرار کو یہ اختیار دے دیا جائے۔

۱۹۶۰ء میں اِس ایکٹ میں مزید ترمیم ہوئی۔ ۱۹۶۰ء کے ترمیم شدہ ایکٹ میں ٹریڈ یونینوں کے اراکین کی رکنیت کی فیس ۲۵ پیسے مہینہ مقرر کی گئی۔

رجسٹرار یا کسی بھی با اختیار افسر کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ ایکٹ کے مطابق داخل کیے گئے حسابات سے متعلق یونین کے کھاتے، رجسٹر، سرٹیفکیٹ اور دوسرے کاغذات کا معائنہ کر سکتا ہے۔

(ج) ۱۹۵۰ء کا ٹریڈ یونین بل : ۱۹۵۰ء میں ہندوستان کی پارلیمنٹ میں ایک ٹریڈ یونین بل پیش کیا گیا جس کا مقصد دوسرے اقدامات کو مضبوط کرنا اور کچھ نئی دفعات جاری کرنا تھا۔ اِس بل کا بنیادی مقصد ٹریڈ یونین کی حیثیت کو بہتر کرنا اور صحت مند طریقے سے اُن کی ترقی میں اعانت کرنا تھا۔ بل کے مطابق ٹریڈ یونینوں کو رجسٹرڈ کرانا لازمی قرار دیا گیا لیکن سول کارکنوں کو عام ٹریڈ یونینوں کے دائرہ عمل سے باہر رکھا گیا۔ شروع میں گھریلو ملازموں کو بھی نہیں شامل کیا گیا تھا لیکن بل سے متعلق سلکٹ کمیٹی نے سفارش کی کہ گھریلو ملازموں کو اُن کارکنوں میں شامل کرنا چاہیے جو ٹریڈ یونین تحریک سے مستفید ہوتے ہیں۔ آجروں کے لیے ٹریڈ یونینوں کا تسلیم کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ کارخانوں کے منتظمین اور مزدوروں کے روابط کو بہتر کرنے کے لیے اِس بل میں آجروں اور مزدوروں دونوں پر کچھ پابندیاں عائد کی گئیں۔ آخر میں اِس بل نے باہر کے لوگوں کو

بھی ٹریڈ یونین کا رکن بننے کی اجازت دے دی جس کا مقصد یونین کی تنظیم کو زیادہ وسعت دینا تھا۔

بدقسمتی سے سنہ۱۹۵۰ء کے بل کی طرح اس بل کی بھی پارلیمنٹ میں شدید مخالفت ہوئی۔ چنانچہ حکومت نے غیر معینہ مدت کے لیے اس کو ملتوی کر دیا۔ اِس بل کے مختلف پہلوؤں پر نینی تال کی تری پارٹی کانفرنس میں ـــــ ـــــ غور کیا گیا اور کانفرنس میں جو خیالات ظاہر کیے گئے ان پر فروری سنہ۱۹۵۲ء میں صوبائی وزرائے محنت کے جلسے میں غور ہوا لیکن سنہ۱۹۵۲ء کے عام انتخابات کی وجہ سے سارا معاملہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔ اِس کے بعد سے اس کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ ایسا لگتا ہے کہ شدید اختلافات اور اعتراضات کی وجہ سے حکومت اِس بل کو پاس کرانا ضروری نہیں سمجھتی۔

ہندوستان کی ٹریڈ یونینیں۔ بہتری کی تجویز

مزدوروں کی سرگرمیوں میں تال میل پیدا کرنے کی غرض سے سنہ۱۹۲۰ء میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس قائم کی گئی۔ آگے چل کر ٹریڈ یونین کی اور بھی تنظیمیں پیدا ہوئیں۔ اس وقت مرکزی ٹریڈ یونین ادارے چار ہیں:

(۱) آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس سب سے پرانا ادارہ ہے۔ اِس پر اب کمیونسٹوں کا غلبہ ہے۔

(۲) سنہ۱۹۴۷ء میں انڈین نیشنل ٹریڈ یونین کانگریس قائم کی گئی۔ سنہ۱۹۴۸ء میں حکومت نے اِس کو ملک کے نمائندہ ترین ادارے کی حیثیت سے تسلیم کیا۔ اِس ادارے کا انڈین نیشنل کانگریس سے بہت قریبی تعلق ہے۔ اِس نے پانچ سالہ منصوبوں میں حکومت کے ساتھ پورے تعاون کا اعلان کیا ہے۔

(۳) سنہ۱۹۴۹ء میں یونائٹڈ ٹریڈ یونین کانگریس کے نام سے ایک اور ادارہ قائم ہوا۔ یہ ادارہ گروہ بند سیاست سے الگ رہنے کی کوشش کرتا ہے لیکن بائیں بازو کے اثر سے پاک نہیں ہے۔ یہ اپنے کو سرکاری دامن سے باندھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اِن چار مرکزی اداروں کے باوجود ٹریڈ یونین تحریک ہمیشہ ٹھیک راستے پر نہیں چلتی۔ اس خامیوں کی جڑ سیاسی بنیاد پر اس کی تقسیم ہے۔ یونینیں چونکہ سیاسی پارٹیوں سے قریبی تعلق رکھتی ہیں اس لیے فلاحی تعمیری سرگرمیوں کے مقابلے میں پارٹی کی سیاست کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ ہمارے ٹریڈ یونینوں کے نظریے اور ان کی تنظیم میں انقلابی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے۔ اِن میں تنظیمی مستعدی اور اتحادِ عمل پیدا کرنا چاہیے۔ ٹریڈ یونینوں کو چاہیئے کہ ٹریڈ یونین کالج کے قیام کے لیے حکومت سے امداد طلب کریں تاکہ مختلف صنعتی مراکز کے ٹریڈ یونین کارکنوں کو تربیت دی جاسکے۔ ہندوستان کی ٹریڈ یونینوں کو یہ بھی چاہیئے کہ حتی الامکان

تحریک بازی سے احتراز کریں اور ہڑتالوں اور در بندیوں کی دھمکی سے خود کو باز رکھیں۔ ٹریڈ یونین کے تمام تر مطالبات کا تعلق صرف سے ہوتا ہے اور یہ اپنی تمام قوت اور اپنا تمام وقت مزدوروں کے لیے سہولتیں حاصل کرنے، ان کی اُجرتیں بڑھانے اور اوقات کار کم کرنے پر صرف کرتی ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ ٹریڈ یونینوں کو تحریک بازی کے اُس رویّے کو ختم کرنا چاہیئے جو روایتی ہے اور جس میں تمام تر توجہ صرف کی طرف ہوتی ہے۔ اِس کے بجائے انھیں اجتماعی سودہ، اِنتظام میں مزدوروں کی شرکت، رضاکارانہ ثالثی، پیشہ وارانہ تربیت اور اُجرت کو پیداآوری سے منسلک کرنے جیسی باتوں کو لے کر چلنا چاہیے اور صرف کے بجائے پیداوار کی طرف زیادہ توجہ دینا چاہیے۔ صنعتی روابط کے میدان میں انھیں رضاکارانہ مصالحت اور اجتماعی سودے کے طریقوں کو اپنانا چاہیے اور اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اور قوت مزدوروں میں یک جہتی قائم کرنے اور فلاحی اسکیموں کی تعمیل میں صرف کرنا چاہیے۔

اجتماعی سودا

اجتماعی سودا ٹریڈ یونین تحریک کا لازمی جزو ہے۔ اِس کے تحت ٹریڈ یونینوں اور آجروں کے نمائندوں کے مابین اُجرت اور شرائط کار کے تعین کے لیے براہِ راست گفت و شنید ہوتی ہے۔ اِس کا مقصد فریقین میں اجتماعی طور سے سمجھوتہ کرنا ہوتا ہے۔ انٹرنیشنل لیبر ارگنائی زیشن کے ڈائرکٹر کی ۱۹۶۱ء کی رپورٹ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغرب کے بیشتر ترقی یافتہ ممالک میں جہاں ٹریڈ یونین تحریک بلوغیت کی منزل پر پہنچ چکی ہے، اجتماعی سمجھوتے ہی ایک معینہ مدت کے لیے فریقین کے حقوق اور فرائض کے تعین کا ذریعہ ہیں۔ غالباً ہندوستان جیسے کم ترقی یافتہ ملکوں میں لازمی ثالثی کے مقابلے میں اجتماعی سودے کے ذریعے صنعتی امن قائم کرنے میں زیادہ مدد ملے گی۔

اجتماعی سودے کی کامیابی کی شرائط

اجتماعی سودے کی کامیابی کی پہلی شرط ٹریڈ یونین کی تنظیم کی ماہیت ہے۔ اجتماعی سودے کی کامیابی کا دار و مدار ٹریڈ یونین تحریک کی مضبوطی پر ہوتا ہے۔ جیسے جیسے ٹریڈ یونین تحریک میں یک جہتی پیدا ہوتی ہے، اجتماعی سودے کے نتائج برآمد ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ مضبوط ٹریڈ یونین تنظیم اجتماعی سودے کے وقت مزدوروں کے مطالبات کو زیادہ اِتحاد کے ساتھ رکھتی ہیں۔ اِسی لیے "ایک صنعت، ایک یونین" کا نعرہ اجتماعی سودے کے لیے موزوں ترین ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اجتماعی سودے کے لیے ریاست، آجر، مزدور اور عام پبلک کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ عام پبلک کو اس طریقے کے بارے میں اپنی پسندیدگی ظاہر کرنی چاہیئے۔ حکومت کو ضروری قوانین کے ذریعے یہ یقین دہانی دینی چاہیئے کہ اجتماعی سودے کے دوران مزدوروں کو من مانے طریقے سے معزول نہیں کیا جائے گا۔ فریقین کو ایک دوسرے کی بات سمجھنے اور ایک ایسے متفقہ حل پر پہنچنے کی پُرخلوص کوشش کرنا چاہیے جو اجتماعی سمجھوتے کی بنیاد بن سکے۔ اس کے علاوہ ٹریڈ یونینوں کو مخصوص شعبے قائم کرنے چاہیئیں جو مزدوروں کے ذریعے حاصل کی گئی اندرونی اطلاعات کی مدد سے تحقیق کا کام کریں۔ تحقیق اور اندرونی اطلاعات کی چھان بین سے ٹریڈ یونینوں کے نمائندوں کو ضروری اور مفید اعداد شمار اور حقائق سے واقفیت ہوگی جن سے انھیں آجروں سے طویل گفت وشنید میں مدد ملیگی۔

اجتماعی سودے کے تحت حال کے سمجھوتے

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ۱۹۵۰ء کے لیبر ریلیشن بل میں اجتماعی سودے کا اہتمام تھا۔ تجربے کے طور پر بل میں ایک سادہ طریقہ تجویز کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ جس زمانے میں مسٹر وی۔ وی۔ گری وزیر محنت تھے لازمی ثالثی کے مقابلے میں اجتماعی سودا کرنے اور رضاکارانہ ثالثی پر زیادہ زور تھا۔ صنعتی امن کے حصول کے لیے گری نظریے کی یہی بنیاد تھی۔ چنانچہ مزدوروں کے مسائل کی طرف گری نظریے کا مطلب یہ تھا کہ لازمی ثالثی کے بجائے باہمی گفت وشنید، اجتماعی سودے اور رضاکارانہ ثالثی کے ذریعے اختلافات دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسٹر گری کے دورِ وزارت میں مزدوروں اور آجروں کے اختلافات دور کرنے کے لیے رضاکارانہ مصالحت کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ کھانڈو بھائی دلیسائی کی بھی پالیسی تقریباً وہی تھی جو مسٹر گری کی تھی۔ اس کے بعد گلزاری لال نندا وزیر محنت مقرر ہوئے۔ ان کا رویّہ زیادہ محتاط تھا۔ مسٹر نندا اس کے حق میں تھے کہ مزدوروں کا تعاون حاصل کرنے اور انھیں انتظام میں شریک کرنے کے لیے جوائنٹ کونسلیں قائم کی جائیں تاکہ مزدوروں اور آجروں کو ایک دوسرے سے قریب لایا جاسکے۔ انھیں توقع تھی کہ اس طرح لازمی ثالثی کے استعمال کے بغیر براہ راست گفت وشنید اور اجتماعی سودے کی راہ نکل آئے گی۔

حکومت کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ ثالثی اور اجتماعی سودے کا ساتھ مشکل ہے اور بیک وقت دونوں سے استفادہ ناممکن ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان میں صنعتی جمہوریت کا زرّیں دَور اُس وقت

شروع ہوگا جب منظّم مزدوروں کی جماعتیں اپنی طاقت اور اپنے اتحادِ عمل کے بل پر سودا کر سکیں گی۔ اجتماعی سودے اور رضاکارانہ مصالحت سے اِس کام میں بڑی مدد ملیگی اور اگر ہم نے ثالثی کے طریقے کو اپنایا تو اپنی منزل سے اور زیادہ دور ہو جائیں گے۔

اگرچہ باہمی گفت و شنید اور رضاکارانہ ثالثی کا گاندھی وادی طریقہ احمد آباد ٹکسٹائل مِل میں ۱۹۲۰ء میں شروع کیا گیا لیکن پہلا رسمی سمجھوتہ جولائی ۱۹۵۲ء میں احمد آباد مِل اُونرز ایسوسیئشن اور احمد آباد ٹکسٹائل لیبر ایسوسیئشن کے درمیان عمل میں آیا۔ اِس سے تقریباً چار برس پہلے ۱۹۴۸ء میں پہلا اجتماعی سمجھوتہ ٹاٹا کمپنی میں ہوا۔ یہ اِس سے بھی پہلے کی بات ہے جب آئی۔ ال۔ اُو کے چوبیسویں اجلاس میں اجتماعی سمجھوتوں سے متعلق سفارشات نمبر ۹۱ اور ۹۲ پاس کی گئیں۔ ٹاٹا کمپنی اور اُس کے مزدوروں کے مابین اس سمجھوتے کی آگے چل کر تجدید ہوئی۔ جون ۱۹۵۵ء میں احمد آباد مِل اُونرز ایسوسیئشن اور احمد آباد ٹکسٹائل ورکرز ایسوسیئشن میں مزید سمجھوتے ہوئے۔ اِن میں سے ایک سمجھوتے میں اِس کا اہتمام تھا کہ باہمی گفت و شنید کے ذریعے جھگڑے نپٹائے جائیں اور اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو ثالثی اختیار کی جائے۔ ایک دوسرا سمجھوتہ مزدوروں کو بونس دینے سے متعلق تھا۔ ایسا ہی ایک سمجھوتہ بمبئی مِل اُونرز ایسوسیئشن اور راشٹریہ مِل مزدور سنگھ کے مابین ہوا۔ جنوری ۱۹۵۶ء میں ٹاٹا آئرن کمپنی اور ٹاٹا ورکرز یونین کے مابین بھی اجتماعی سمجھوتہ ہوا۔ اجتماعی سودوں کی دوسری مثالیں بھی ہیں۔ مثلاً امپیریل ٹوبیکو کمپنی، آسام آئل کمپنی، مودی اسپننگ اینڈ ویونگ مِلز، میسور پیپر مِلز، میسور شوگر کمپنی اور انڈین الومونیم ورکس کے مینجمنٹ اور ان کے مزدوروں کے درمیان سمجھوتے ہوئے۔

اِنتظام میں مزدوروں کی شرکت

حال میں صنعت کے منتظمین اور ان کے مزدوروں کے مابین جو سمجھوتے ہوئے ہیں اُن کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ اِن سے ایک صحت مند فضا پیدا ہوئی ہے۔ حال میں ایک اور اچھا رجحان پیدا ہوا ہے۔ صنعتوں کے انتظام میں مزدوروں کی شرکت کے مسئلے پر زیادہ توجہ دی جارہی ہے۔ حکومت ہند کی یہ پالیسی ہے کہ مزدوروں کو اِنتظام میں شریک کیا جائے تاکہ انھیں یہ احساس ہو کہ وہ ایک ترقی پسند ریاست کی تعمیر میں شریک ہیں۔ اِنتظام میں مزدوروں کی شرکت سے پُرامن صنعتی روابط اور تعاون کے لیے زمین ہموار ہوگی اور صنعت کے مشترک مفاد کو ترقی ملیگی۔ ۱۹۵۶ء میں یورپ کے ممالک کے مطالعے کے لیے ایک اسٹڈی گروپ بھیجا گیا۔ اِس گروپ کی رپورٹ کی بنیاد پر انتظام میں مزدوروں

کی شرکت کے لیے ایک اسکیم تیار کی گئی جس کا مقصد یہ ہے کہ جن صنعتوں میں کم سے کم ۵۰۰ مزدور کام کرتے ہیں، ان کی مستحکم اور مضبوط یونینیں ہیں اور ان کے صنعتی تعلقات کا رکارڈ اچھا رہا ہے اُن میں جوائنٹ کونسلیں قائم کی جائیں۔ اِن کونسلوں کا مقصد یہ ہوگا کہ مزدور کی حالت بہتر کی جائے، پیداوار بڑھائی جائے، مزدوروں اور کارخانوں کے منتظمین کے مابین رابطے کی حقیقی راہ نکلے اور مزدوروں میں یہ احساس پیدا ہو کہ وہ بھی اِنتظام میں شریک ہیں۔

اِنڈین لیبر کانفرنس منعقدہ ۱۹۵۷ء نے پچاس کاروباروں میں یہ تجربہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اِن کاروباروں میں کچھ پبلک سکٹر کے بھی کاروبار شامل تھے۔ دوسرے پلان کے ختم تک ۵۰ میں سے ۳۰ نے یہ تجربہ شروع کر دیا تھا۔ لیکن جولائی ۱۹۶۷ء کے شروع سے ۱۳۲ کونسلیں واقعی کام کر رہی تھیں۔ ۸۶ پرائیویٹ سکٹر میں اور ۴۶ پبلک سکٹر میں۔ تیسرے پلان کی طرح چوتھے پلان میں بھی اِس کا اہتمام کیا گیا ہے کہ جوائنٹ کونسلوں کی اسکیم کو نئی صنعتوں اور نئے یونٹوں میں شروع کیا جائے تاکہ یہ جلد ہی صنعتی نظام میں ایک معمول کی صورت اختیار کر لے۔

۱۹۶۰ء میں ان کونسلوں کے ایک سیمنار میں یہ تسلیم کیا گیا کہ اگرچہ بعض یونٹوں میں اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں لیکن عام طور سے یہ اسکیم تشفی بخش طریقے سے نہیں چلی ہے۔ بظاہر اس کے وجوہ یہ ہیں: (۱) اِس بات پر عدم اِتفاق کہ کن معاملوں میں ان کونسلوں سے مشورہ کرنا چاہیے اور کن معاملات میں کونسلوں کو معلومات حاصل کرنے کا حق ہے (۲) اِنتظام اور مزدوروں دونوں کے لیے تربیت کی سہولتوں کی کمی (۳) یونینوں کے درمیان چشمک۔ ہماری رائے ہے کہ اِس صورت حال کا تدارک یہ ہے کہ ٹریڈ یونین کی تحریک مضبوط ہو اور ذمہ داری کے ساتھ حالات کا جائزہ لینے پر آمادہ ہو۔ اِس میں ایسے ماہرین شامل ہوں جو اس صنعت کے طریقوں اور ان کے مسائل کو سمجھتے ہوں جن کے لیے جوائنٹ کونسلیں قائم کی گئی ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ حکومت ہند نے اِنتظام میں مزدوروں کی شرکت کی اسکیم کی ترقی اور توسیع کے لیے اور متعلقہ معاملات سے نپٹنے کے لیے وزارتِ محنت میں ایک مخصوص یونٹ قائم کر دیا ہے۔ آجروں اور مزدوروں میں تعاون کے لیے ایک تری پارٹی کمیٹی ۱۹۶۱ء میں قائم کی گئی تھی۔ ۱۹۶۲ء میں حکومت نے موجودہ کونسلوں کے کاموں کا جائزہ لینے اور تجرباتی بنیاد پر نئی کونسلیں شروع کرنے کے سلسلے میں مشورہ دینے کے لیے ایک مخصوص افسر مقرر کیا۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ اِنتظام میں مزدوروں کی شرکت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک مضبوط اور مربوط یونینیں نہ ہوں جو تجربے کو کامیاب بنانے کی خواہش مند ہوں۔ اِتفاق سے ہمارے ملک میں اِسی کی کمی ہے۔

باب ۲۴

صنعتی کارکردگی، اُجرتوں کا تعیّن اور منافع میں شرکت

مزدوروں کی کارکردگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ دیے ہوئے وقت میں کتنا کام انجام دے سکتا ہے۔ بہتر معیار زندگی، بہتر غذا، بہتر رہائشی حالات، فنی اور عام تعلیم کی سہولتیں، سرکاری قوانین کے تحت فلاحی اسکیمیں، اِن سب باتوں سے مزدوروں کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہندوستانی مزدور جو غیر صحت مند اور بھینچے ہوئے ماحول میں رہتا ہے اور معمولی اُجرت پر مشین کی طرح کام کرتا ہے، ظاہر ہے اُس کی کارکردگی مغربی ملکوں کے مزدوروں کے مقابلے میں کم ہوگی۔ لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُس میں کارکرد مزدور بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اِس سلسلے میں ۱۹۴۰ء کی لیبر انوسٹیگیشن کمیٹی کا یہ کہنا تھا کہ ہندوستانی مزدور کی ناکارکردگی صرف افسانہ ہے۔ اگر ان مزدوروں کو وہی حالاتِ کار، وہی اُجرت، وہی انتظامی مستعدی اور وہی آلات حاصل ہوں جو دوسرے ملکوں کے مزدوروں کو حاصل ہیں تو یہ اُن سے کم مُستعد اور کارکرد نہیں ہیں۔

امریکہ کے گریڈی مشن نے جس نے دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ہندوستان کا دَورہ کیا اور جس نے ہندوستانی صنعتوں کی مُستعدی اور کارکردگی کے بارے میں رپورٹ پیش کی، ہندوستانی مزدوروں سے متعلق یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ حال میں بمبئی کی بعض سوتی مِل کے مزدوروں کی پیداواری کارکردگی میں اِضافہ ہوا ہے جس کی وجہ سے انفرادی پیداوار لنکاشائر کے مزدوروں کی ۸۵ فی صدی کے برابر پہنچ گئی ہے اگرچہ ہمارے کارخانوں کا ماحول اور حالاتِ کار لنکاشائر سے بہت کم تر ہیں۔ بہ ہر حال ہندوستانی مزدوروں کی کارکردگی بڑھانے کے لیے آجروں کو مل کر مزدوروں کی بہبود کے پروگرام شروع کرنے چاہئیں اور پیداوار کے سائنسی طریقے اپنانے چاہئیں۔

فیکٹری قوانین اور مزدوروں کی کارکردگی

برطانوی عہد میں مزدوروں کے تحفظ اور اُن کی امداد کے لیے ۱۸۸۱ء، ۱۸۹۱ء، ۱۹۱۱ء اور ۱۹۳۴ء میں فیکٹری ایکٹ پاس کیے گئے اور ان قوانین کے تحت فیکٹریوں میں بچوں سے کام لینا ممنوع قرار پایا اور مزدوروں کے کام کے گھنٹے متعین کیے گئے۔

۱۹۳۴ء کا فیکٹری ایکٹ جو وائل کمیشن کی سفارشات پر مبنی تھا، برطانوی عہد کا اہم ترین ایکٹ تھا۔ اِس ایکٹ کے تحت موسمی مزدوروں کے لیے روزانہ گیارہ گھنٹے اور استمراری مزدوروں کے لیے روزانہ دس گھنٹے کا کام متعین ہوا۔ فیکٹری قوانین کی تاریخ میں پہلی بار ۱۹۳۴ء کے ایکٹ نے مزدوروں کی آسانی اور آرام کے لیے کچھ اقدام تجویز کیے۔ مثلاً کارخانوں کو ٹھنڈا رکھنے کے اقدام، مزدوروں کے لیے آرام کرنے کی جگہ، عورتوں اور بچوں کے لیے مناسب کمرے وغیرہ۔ اِن اقدام سے مزدوروں کی کارکردگی میں کچھ اضافہ ہوا۔

۱۹۴۶ء کی لیبر انوسٹیگیشن کمیٹی (LABOUR INVESTIGATION COMMITTEE) نے انڈین فیکٹریز ایکٹ کی کئی خامیوں کا پتہ لگایا۔ کمیٹی نے دیکھا کہ ایکٹ کی دفعات کی تعمیل صرف بڑے کاروباری ادارے کرتے تھے اور چھوٹے کارخانے زیادہ تر ٹالتے تھے۔ کمیٹی کی رائے تھی کہ فیکٹریوں کے معائنہ بلکہ اچانک جانچ سے بھی مقصد پورا نہیں ہو سکتا کیونکہ بیشتر کارخانے یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ فیکٹری انسپکٹر کب بھیجا جانے والا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۴ء کے ایکٹ کی بنیادی دفعات کی عدم تعمیل کی وجہ یہ تھی کہ مختلف صوبوں میں معائنہ کا انتظام ناکافی تھا اور بے قاعدگی کرنے والوں کو مقامی عدالتیں بہت معمولی سزا دیتی تھیں۔

۱۹۳۴ء کے ایکٹ کی خامیوں کو دور کرنے کے لیے ۱۹۴۸ء کا فیکٹری ایکٹ پاس کیا گیا۔ اس کا یہ بھی مقصد تھا کہ ایسے اقدام کیے جائیں جن سے مزدوروں کی بہبود میں اضافہ ہو اور صنعتی مستعدی بڑھے۔ ۱۹۵۶ء میں اِس ایکٹ میں ترمیم کی گئی۔ ترمیم کا مقصد یہ تھا کہ چھٹیوں اور اُجرت کے حساب کی کچھ عملی دشواریوں کو دور کیا جائے اور عورتوں اور کم عمر کے نوجوانوں سے رات کو کام لینے سے متعلق آئی۔ ایل۔ او کی اُن سفارشات کی تعمیل کی جائے جن کی توثیق حکومت کر چکی تھی۔

ایکٹ کی خاص دفعات یہ ہیں:

(۱) یہ ایکٹ اُن تمام کاروبار پر عائد ہوتا ہے جہاں دس یا دس سے زیادہ مزدور کام

کرتے ہیں اور جہاں بجلی کی طاقت استعمال ہوتی ہے، یا اُن کاروبار پر جہاں بجلی نہیں استعمال ہوتی۔ لیکن ۲۰ یا ۲۰ سے زیادہ مزدور کام کرتے ہیں۔ موسمی اور استمراری مزدوروں کی تفریق ختم کر دی گئی۔ یہ ایکٹ جموں اور کشمیر کو چھوڑ کر باقی سارے ملک پر عائد ہوتا ہے۔

(۲) ۱۹۴۸ء کے ایکٹ کا مقصد مزدوروں کی صحت، سلامتی اور بہبود کے انتظام کے ذریعے مزدوروں کی کارکردگی بڑھانا تھا۔ صفائی، روشنی اور تازی ہوا کے انتظام کے علاوہ اس ایکٹ میں گرد اور زہریلے ابخرات کو ختم کرنا، درجہ حرارت کو کنٹرول کرنا اور ٹھنڈے پانی کی فراہمی بھی شامل ہے۔ مزدوروں کی سلامتی کے لیے جو نئے اقدام رکھے گئے ان میں نئی مشینوں کو محفوظ بنانا اور ایسا اہتمام کرنا کہ اوپر اٹھانے والی مشینوں اور کرینوں سے خطرے کے وقت بجلی خود بخود کٹ جائے، آنکھوں کی حفاظت اور پھٹنے والی زہریلی گیسوں کی احتیاطی تدابیر شامل ہیں۔ ایکٹ میں اس کا بھی اہتمام ہے کہ مزدوروں کے ہاتھ منھ دھونے کا انتظام ہو۔ جن یونٹوں میں ۲۵۰ مزدور کام کرتے ہیں وہاں کینٹین ہو۔ اگر ۵۰ عورتیں کام کرتی ہیں تو اُن کے بچوں کے لیے پرورش گاہ ہو اور ۱۵۰ یا اس سے زیادہ مزدور رکھنے والے یونٹوں میں آرام کے کمرے ہوں۔ ایکٹ کے تحت ان فیکٹریوں کو جہاں ۵۰۰ یا اس سے زائد مزدور کام کرتے ہوں ایک ویلفیر افسر مقرر کرنا ہوگا۔

[illegible] کام پر رکھے جانے والے نوجوانوں کی کم سے کم عمر ۱۴ سال مقرر کی گئی اور اوپری حد [illegible] سال کے [illegible] سال کر دی گئی۔

[illegible] ۱۹۴۸ء کے ایکٹ نے بالغ مزدوروں کے [illegible] گھنٹے [illegible] سال سے کم کے لڑکوں کے لیے [illegible] گھنٹے [illegible]

[illegible]

کے صوبائی انتظام کے علاوہ مرکزی حکومت نے ابھی حال میں ایک مشاورتی ادارہ قائم کیا ہے جس کا نام "آفس آف دی چیف ایڈوائزر، فیکٹریز" ہے۔

اِس ایکٹ نے مزدوروں کی فلاح، سلامتی اور صحت سے متعلق اہتمام کرکے ہندوستان کے فیکٹری ایکٹ کی تاریخ میں ایک اہم باب کا اِضافہ کیا۔ اِن اقدام سے مزدوروں کی کارکردگی بڑھےگی لیکن ہمارا خیال ہے کہ ایکٹ کی دفعات کی پوری تعمیل کے لیے مرکز کو ذمہ داری لینی ہوگی۔ اِس وقت فیکٹریوں کے چیف ایڈوائزر کی حیثیت صرف مشاورتی ہے۔ اِس دفتر کو بڑھانا چاہیے اور اِس میں نئے عملے کا اِضافہ کرنا چاہیے تاکہ مشاورتی کاموں کے علاوہ یہ ایکٹ دفعات کی ہموار اور مستعد تعمیل کی ذمہ داری لے سکے۔ ۱۹۴۸ء کا ایکٹ اگرچہ پچھلے ایکٹ کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے تاہم یہ غیر منضبط فیکٹریوں میں نہیں عائد ہوتا ہے مثلاً بیڑی، شیلاک اور قالین بنانے والی فیکٹریاں۔ یہ پیشے بڑے محنت طلب ہیں۔ صرف مدھیہ پردیش، مدراس، کیرل اور میسور میں اِن محنت طلب پیشوں کے مزدوروں کی حالت سدھارنے کے قوانین بنائے گئے ہیں۔ مرکزی حکومت کو اِن مزدوروں کی حالت بہتر کرنے کے لیے الگ سے قانون بنانا چاہیے جو اِن غیر منضبط کارخانوں اور ورک شاپ پر عائد ہو۔

روزگار کے دفتر اور صنعتی کارکردگی

بھرتی کے ناقص طریقوں اور دلالوں کے غلبے کی وجہ سے مزدوروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے جس کا خراب اثر اُن کی کارکردگی پر پڑتا ہے۔ بھرتی کی خامیوں کو دور کرنے کی صورت یہی ہے کہ سارے ملک میں روزگار کے دفاتر کا جال بچھا دیا جائے۔ ایک فلاحی ریاست میں حکومت کا فرض ہے کہ صنعتوں کی ترقی، زراعتی تنظیم اور پبلک ورکس پروگرام کے ذریعے روزگار کے مواقع پیدا کرے۔ روزگار کے دفاتر ہونے چاہئیں تاکہ خالی جگہوں کو پُر کرنے کے لیے ضروری قابلیت رکھنے والوں کو روزگار دیا جاسکے۔ دوسرے ملکوں میں روزگار کے دفاتر بھرتی کے معاملے میں بہت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی آزادی کے بعد سے اور ترقیاتی منصوبہ بندی شروع ہونے کے ساتھ روزگار کے دفاتر کی اہمیت رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہے۔

اِس موقع پر جاپان کے بھرتی کے دفاتر کے کاموں کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ملک کی ترقی کے دوران جاپان میں روزگار دفتروں نے نہ صرف بھرتی کی ایجنسی کا کام کیا بلکہ انھوں نے مزدوروں کے لیے تربیت کی سہولتیں فراہم کرنے اور پیشوں سے متعلق ہدایات دینے کے بھی فرائض

انجام دیے۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے یہ دفاتر اُن بے روزگار مزدوروں کو قرض دیتے تھے جو روزگار کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ گھومتے رہتے تھے۔ اِس طرح اِن دفاتر کی وجہ سے جاپانی مزدوروں کی نقل پزیری بڑھی اور (FRICTIONAL UNEMPLOYMENT) میں کمی ہوئی جس سے ملک کی صنعتی ترقی کو فائدہ پہنچا۔ ہمارے لیے مفید ہوگا اگر ہم جاپان کے نظام کا مطالعہ کریں اور اس کی اچھی باتوں کو اپنالیں تاکہ ہمارے روزگار دفتروں کا کام بہتر ہو۔

روزگار کے دفتروں سے متعلق شیوا راؤ کمیٹی کی رپورٹ

ہندوستان میں روزگار دفاتر دوسری جنگ عظیم کے دوران شروع ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں ڈائرکٹر جنرل آف ری ایمپلائے منٹ اینڈ ری سٹیلمنٹ کا تقرر ہوا اور اس کے تحت روزگار کے ۷۰ دفاتر کھل گئے۔ ۱۹۴۸ء میں آزادی کے بعد روزگار دفتروں کو نیم مستقل حیثیت دی گئی اور اِن کا دائرۂ عمل وسیع کردیا گیا۔ اپریل ۱۹۵۶ء میں روزگار دفتروں کی تعداد ۱۳۶ تھی۔ دوسرے پلان کے دوران ۱۲۰ نئے دفتر کھولنے کی تجویز تھی تاکہ اِن کی مجموعی تعداد ۲۵۶ ہو جائے۔ تیسرے پلان میں ۱۰۰ نئے دفتر کھولنے کا پروگرام تھا۔ مقصد یہ ہے کہ ہر ضلعے میں ایک دفتر قائم ہو جائے۔ دسمبر ۱۹۶۷ء تک روزگار کے دفاتر کی تعداد ۳۹۹ تک پہنچ گئی تھی۔

۱۹۵۲ء میں حکومت نے بی۔ شیوا راؤ کی صدارت میں ٹریننگ اینڈ امپلائمنٹ سروس ارگنائزیشن کمیٹی مقرر کی جس کا مقصد روزگار کی ایجنسیوں کی تنظیم اور طریقہ کار کے بارے میں جانچ کرنا تھا۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ اپریل ۱۹۵۴ء میں پیش کی۔ اِس کی اہم سفارشات یہ ہیں:

(۱) روزگار دفتر کی تنظیم کا نام نیشنل امپلائمنٹ سروس کردیا جائے اور اِس کو ایک مستقل حیثیت دے دی جائے۔ سرکاری اور نیم سرکاری جگہیں لازمی طور سے اِن دفاتر کے ذریعے پُر کی جائیں۔

(۲) روز آنہ کے اِنتظام کی ذمّہ دار صوبائی حکومتیں ہوں لیکن مرکزی حکومت ایک عام پالسی بنادے اور ان مختلف صوبوں کے دفاتر کی نگرانی اور اِن میں تال میل پیدا کریں۔

(۳) روزگار تلاش کرنے والوں سے یا اُن لوگوں سے جو اِن دفاتر سے فائدہ اٹھائیں، کوئی فیس نہ لی جائے۔

(۴) روزگار ٹکنکل اور پیشوں کی تربیت کے لیے ادارے قائم کرے۔

شیوا راؤ کمیٹی کی سفارشات کے مطابق نومبر ۱۹۵۶ء سے روزگار دفتروں کا انتظام حکومتوں کے

ـردکر دیا گیا ۔ مرکزی حکومت کی ذمہ داری پالیسی، معیار، تال میل اور ۶۰ فی صدی مصارف دینے
ـنک محدود ہے ۔ حال میں ایک قانون بنا ہے جس کے تحت نجی آجروں کو اپنے یہاں کی جگہوں کا اعلان
ـج دفاتر کے ذریعے کرنا ہوگا ۔ سنہ ۱۹۵۹ء کے امپلائمنٹ اکسچینج ایکٹ کے تحت یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ
ـ۲۵ سے زیادہ مزدور رکھنے والے آجر اپنی تمام خالی جگہوں کی اطلاع روزگار دفاتر کو کریں اور معینہ
ـ وقفے سے اپنے عملے کی تعداد کی اطلاع دفتر کو دیتے رہیں ۔ بے مہارت عام مزدور اس سے مستثنیٰ ہیں
ـیہ ایکٹ مئی سنہ ۱۹۶۰ء سے نافذ ہو گیا۔

توقع ہے کہ پانچ سالہ منصوبوں کے دوران شیوا راؤ کمیٹی کی سفارشات کی تعمیل کر دی جائے گی
ـاور اس کی وجہ سے روزگار دفتروں کا انتظام بہتر ہو جائے گا اور ان کا دائرہ کار اتنا وسیع ہو جائے گا کہ
ـنوکری دلانے والے دلال اِس میدان سے خارج ہو جائیں گے۔ ہم ایک بار پھر اس بات پر زور دیں گے کہ
ـہمارے روزگار دفتروں کو جاپانی طریقہ اپنانا چاہیئے اور کاریگروں کو قرض دینا چاہیئے تاکہ یہ اُن دور دراز
ـعلاقوں کو جا سکیں جہاں جگہیں خالی ہوں اور مخصوص قسم کے کاموں کی تربیت حاصل کر سکیں ۔ فرض
ـکیجیے کہ یہ قرض نہ بھی واپس ہو تو بھی یہ رقم ضایع نہ سمجھنا چاہیئے کیونکہ یہ مزدوروں کی کارکردگی بڑھانے
ـاور انھیں نقل پزیر بنانے پر خرچ ہوگی ۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارا پلاننگ کمیشن معاشی ترقی کے ہر
ـمرحلے پر انسانی وسائل کی منصوبہ بندی اور ہمارے پلان کے مختلف پہلوؤں میں موثر ہم آہنگی اور ہم وقتی
ـپیدا کرے ۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ انسانی وسائل اور عام معاشی منصوبے میں تال میل پیدا کرنے کا بہترین
ـذریعہ روزگاری خدمات کی منظم ایجنسیاں ہیں ۔

اُجرت کا تعین ۔ کم سے کم اُجرت، مناسب اُجرت اور ویج بورڈ کا رول

ہمارے ملک میں اُجرت کی شرح بہت پست ہے جس کی وجہ سے ہمارے مزدوروں میں کام
ـکا جذبہ نہیں ہے اور اُن کی کارکردگی بہت کم ہے ۔ یہ درست ہے کہ مزدوروں کو اگر اچھی اُجرت دی
ـجائے تو مصارفِ پیداوار بڑھ جائیں گے اور قیمتوں کا چڑھاؤ اور تیز ہو جائے گا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں
ـہے کہ ہم اُن مزدوروں کی اُجرت میں اضافے کو ملتوی رکھیں جن کی اُجرت بہت کم ہے ۔ ہندوستانی
ـصنعت کے نظامِ اُجرت کو منصفانہ طریقے سے ترتیب دینے کی ضرورت ہے تاکہ اُن مزدوروں کی حالت
ـکو ایک کم سے کم تسلیم شدہ سطح تک اُٹھایا جا سکے جو مشکل سے اپنا پیٹ بھر پاتے ہیں ۔
چھوٹی صنعتیں ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہیں ۔ ان کے مزدور غیر منظم ہیں اور استحصال کا سب سے

زیادہ خطرہ انھیں کے لیے ہے۔ کم سے کم اُجرت سے متعلق سنہ ۱۹۴۸ء کا ایکٹ اِنھیں مزدوروں کی ضرورت کے پیشِ نظر بنایا گیا ہے۔ اِس ایکٹ کے تحت درج فہرست روزگاروں میں کم سے کم اُجرت کی شرح کا تعین ہوگا اور معینہ وقفے سے اِس شرح پر نظرِ ثانی کی جاتی رہے گی۔ زراعت کے علاوہ اِن تمام روزگاروں میں کم سے کم اُجرت کی شرح متعین ہو چکی ہے۔ زراعتی مزدوروں کے لیے بھی کچھ صوبوں میں اجرت کی شرح متعین کی جا چکی ہے۔

سنہ ۱۹۳۶ء کے پیمنٹ آف ویجز ایکٹ میں بھی حسبِ ضرورت ترمیم کی جاتی رہی ہے اور اب اس کا دائرۂ عمل کافی وسیع ہو گیا ہے۔ منظم حلقے کی صنعتوں کی کم سے کم اُجرت کی شرح متعین کرنے کے سلسلے میں اگرچہ کوئی براہِ راست قانون نہیں وضع کیا گیا ہے تاہم یہ اُجرتیں سنہ ۱۹۴۷ء کے انڈسٹریل ڈسپیوٹ ایکٹ کے تحت اکثر ثالثی کا موضوع رہی ہیں۔

دوسرے پلان کے وسط میں اُجرتوں کے تعین کے سلسلے میں ایک نیا تجربہ شروع کیا گیا۔ ٹری پارٹائٹ ویج بورڈ ہماری اُجرت کی پالیسی کا ایک خاص فیچر بن گئے ہیں اور اِس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ بورڈ کی سفارشات اِتفاقِ رائے سے منظور ہوں۔ دوسرے پلان کے ختم تک ویج بورڈ کے سفارشات کی رضاکارانہ تعمیل کا طریقہ سوتی کپڑے کی صنعت، شکر اور سیمنٹ کی صنعتوں میں شروع کر دیا گیا تھا۔ مارچ سنہ ۱۹۶۱ء سے مندرجہ ذیل کے لیے بھی ویج بورڈ قائم کر دیے گئے : باغات، کوئلہ، لوہا اور فولاد، چونا، ڈول مائٹ، خام لوہے کی کانیں، اخبار نویسوں اور اخبار کے دوسرے ملازمین، بڑے بندرگاہوں میں کام کرنے والے مزدور، انجینیرنگ، بھاری کیمیاوی صنعتیں، کھاد، چمڑے کی صنعت، سڑکوں کے ذریعے نقل و حمل اور بجلی کے کارخانے۔ مختلف ویج بورڈوں کے بہت سے فیصلوں کی تعمیل مکمل یا جزوی طور سے ہو چکی ہے اور بہت سے زیرِ تعمیل ہیں۔ اِس موقع پر یہ بھی ذکر کر دینا مناسب ہے کہ نیشنل کمیشن آن لیبر کی مقررہ کمیٹی نے جس کے صدر گجیندر گڈکر تھے، ویج بورڈ کے فیصلوں کے قانونی نفاذ پر زور دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اُجرت کے تعین کی مشینری کے ارتقا میں ویج بورڈ کا طریقہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔

کم سے کم اُجرت اور اُس کے اثرات

کم سے کم اُجرت کے تعین کا مقصد اُجرت کی وہ نچلی شرح مقرر کرنا ہے جس سے کم کسی کو نہ ملنا چاہیئے۔ اِس کا یہ بھی مقصد ہے کہ اُجرتوں کے ایک ایسے مکمل نظام کے لیے زمین ہموار ہو جو قومی کم سے کم اُجرت پر مبنی ہو۔ اِس اصول کی بنیادی غایت یہ ہے کہ مزدوروں کا خون نہ چوسا جائے اور اُن

صنعتوں میں جہاں اُجرتیں بے حد کم ہیں، اِضافہ کیا جائے۔ کم اُجرت اور کم کارکردگی لازم و ملزوم ہیں کم سے کم اُجرت کی شرح کے تعین سے مزدوروں کا معیارِ زندگی بہتر اور ان کی کارکردگی میں اِضافہ ہو سکتا ہے لیکن کم سے کم اُجرت کے تعین کے وقت کچھ عملی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ کم سے کم اُجرت کس بنیاد پر متعین کی جائے۔ اُجرت اتنی ہونی چاہیے کہ مزدور اور اُس کے خاندان کو ایک معقول اور مہذب معیارِ زندگی حاصل ہو سکے۔ دوسری جنگ سے پہلے ڈاکٹر اکرائڈ نے تخمینہ لگایا تھا صرف ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے ۳۰ سے لے کر ۲۵ روپے فی کس چاہئیں۔ اِس بنیاد پر انھوں نے کم سے کم اُجرت کا ایک موٹا تخمینہ لگایا تھا۔ اب قیمتیں بہت بڑھ چکی ہیں اور ان کے مطابق تخمینے پر نظرِ ثانی کرنی ہوگی۔ خوشی کی بات ہے کہ جنوری سنہ ۶ء کی ٹری پارٹائٹ کانفرنس میں ہندوستان کے صنعتی مزدوروں کے لیے ۱۱۰ روپے ماہوار کم سے کم اُجرت کی سفارش کی گئی۔

صنعتی حلقے پر کم سے کم اُجرت کے مجموعی اثرات کا جائزہ لینا چاہیے۔ اگر صرف چند صنعتوں میں اِس کا نفاذ ہوا تو یقیناً دوسری صنعتوں کے مزدور جن کی اُجرت کم ہے، اُجرت بڑھانے کا مطالبہ کریں گے۔ بعض حالات میں ایسا بھی ہوگا کہ کم سے کم سطح سے اوپر کی اُجرتوں میں بھی اِضافے کی راہ کھُلے گی چنانچہ بہترین حل یہی ہے کہ بنیادی کم سے کم اُجرت کا اطلاق ساری صنعتوں پر ہو۔

عام حالات میں کم سے کم اُجرت کی تعمیل سے مجموعی قومی پیداوار میں مزدوروں کا حصّہ بڑھ جائیگا اور منتظمین کا منافع گھٹ جائیگا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ طلب کی تقسیم میں تبدیلی آئیگی۔ مزدوروں کو جب زیادہ اُجرت ملیگی تو وہ صَرفی اشیا زیادہ خریدینگے اور چونکہ مزدوروں میں صَرف کی رغبت زیادہ ہوتی ہے اِس لیے بڑھی ہوئی طلب کی تسکین کے لیے صَرفی اشیا پیدا کرنے کی طرف صنعت کا میلان زیادہ ہوگا۔ یہاں ایک اہم سوال اُٹھتا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے کہ کم سے کم اُجرت کی وجہ سے صَرفی اشیا کی طلب بڑھ جائیگی تو کیا ہمیں اِس کا نفاذ اس وقت کرنا چاہیے جب ہم ترقیاتی منصوبہ بندی کے ابتدائی مراحل میں ہیں اور صَرفی اشیا کے مقابلے میں پیداواری اشیا پر زیادہ زور دے رہے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اُن صنعتوں میں تو کم سے کم اُجرت کا نفاذ کر ہی دینا چاہیے جہاں اُجرتیں بے حد کم ہیں اور مزدوروں کے ساتھ بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ بعد میں جب ایسے حالات پیدا ہوں کہ ہم صَرفی اشیا کی پیدائش بڑھا سکیں تب ایک قومی کم سے کم اُجرت مقرر کریں، اِس کے استحکام کے لیے بیروزگاری کے بیمے کی اسکیمیں چلائیں اور سارے ملک میں سختی سے اِس کا نفاذ کریں۔

۱۹۴۸ء کا مینیمم ویج ایکٹ

آزادی کے بعد سہ پارٹی لیبر کانفرنس میں کم سے کم اُجرت کے مسئلے پر غور کیا گیا اور مارچ ۱۹۴۸ء میں مینیمم ویج ایکٹ پاس کر دیا گیا۔ ایکٹ کی اہم باتیں یہ ہیں:

(۱) درج فہرست روزگاروں کے لیے کم سے کم اُجرت کے تعین اور شرائطِ کار کو منضبط کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ روزگار کی فہرست میں ۱۲ قسم کے روزگار ہیں جو دو حصّوں میں تقسیم ہیں۔ کسی بھی ایسی صنعت میں کم سے کم اُجرت کا نفاذ نہیں ہوگا جس میں کام کرنے والے مزدوروں کی مجموعی تعداد ریاست بھر میں ایک ہزار سے کم ہے۔ (۱۹۵۴ء کی ترمیم کے تحت اِس شرط کو کافی نرم کر دیا گیا ہے۔)

(۲) ایکٹ کے مطابق (الف) ایک کم سے کم شرح وقت کے لحاظ سے ہوگی (ب) ایک کام کی مقدار کے لحاظ سے ہوگی (ج) ایک گارنٹیڈ ٹائم ریٹ ہوگا اور (د) ایک زائد کام کی شرح ہوگی جو مختلف طبقوں اور مختلف پیشوں کی مناسبت سے مقرر ہوگی۔ اُجرت کی کم سے کم شرح جن چیزوں پر مشتمل ہوگی وہ یہ ہیں: (۱) اُجرت کی بنیادی شرح اور مصارف زندگی کا الاؤنس یا (۲) ایک بنیادی شرح الاؤنس یا الاؤنس کے بغیر اور برائے نام قیمت پر ضروری اشیا کی فراہمی کی رعایتوں کی نقد قیمت۔ ایکٹ کے تحت اُجرت نقد کی شکل میں ادا کی جانی چاہیے لیکن حکومتوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ نقد یا اشیا کی شکل میں اُجرت ادا کر سکتی ہیں۔

(۳) متعلقہ حکومتوں کو اختیار ہے کہ وہ تفتیش کے لیے اور کم سے کم اُجرت کی شرح کے تعین میں مشورہ دینے کے لیے کمیٹیاں مقرر کر سکتی ہیں۔ کاموں میں تال میل کے لیے اور بعد میں اُجرتوں کی شرح پر نظرثانی کے لیے مشاورتی کمیٹیاں مقرر کی جائیں گی۔ ایک مرکزی مشاورتی کمیٹی ہوگی جو مرکز اور صوبوں کو مشورہ دیگی اور صوبائی مشاورتی بورڈوں میں رابطہ پیدا کریگی۔

۱۹۴۸ء کے ایکٹ کی فہرست کے حصّہ نمبر ایک کے روزگاروں کے لیے تمام صوبوں نے کم سے کم اُجرت مقرر کر دی ہے۔ اِس فہرست میں بارہ قسم کے روزگار ہیں جن میں اہم یہ ہیں: قالین بنانا، چاول اور آٹے کی ملیں، تمباکو سازی، باغات، لاکھ کی صنعت، چمڑے کی صنعت اور پبلک موٹر ٹرانسپورٹ۔ جہاں تک فہرست کے حصّہ نمبر دو کا سوال ہے، جو زراعتی کاموں سے متعلق ہے، زراعتی مزدوروں کی کم سے کم اُجرتیں مدراس اور مہاراشٹر کو چھوڑ کر باقی سارے صوبوں اور مرکزی علاقوں میں مقرر کی جا چکی ہیں۔ مدراس اور مہاراشٹر میں بھی مخصوص علاقوں میں اِن کا تعین ہو چکا ہے۔ مہاراشٹر، گجرات، پنجاب، میسور،

اڑیسہ، مغربی بنگال، دہلی، مدھیہ پردیش اور کیرل نے اِس ایکٹ کا اطلاق فہرست سے باہر کچھ صنعتوں پر بھی کر دیا ہے۔ اِس طرح فہرست کے حصہ نمبر ایک اور نمبر دو کے بیشتر روزگاروں کے لیے کم سے کم اُجرت کا تعین ۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء تک بیشتر صوبوں نے کر دیا تھا کیونکہ ۱۹۵۷ء کی ترمیم کے مطابق اس تاریخ تک تعمیل ہو جانی تھی۔ ایک مرکزی مشاورتی بورڈ قائم کیا گیا اور صوبوں میں متعدد مشاورتی عہدے دار مقرر ہوئے۔ چونکہ فہرست کے تمام روزگاروں کے لیے کم سے کم اُجرت کا تعین دسمبر ۱۹۵۹ء تک نہ ہو سکا اِس لیے ۱۹۶۱ء میں ترمیمی ایکٹ پاس ہوا جس کے تحت اُجرت کے ابتدائی تعین کے لیے وقت کی پابندی ختم کر دی گئی۔

۱۹۴۸ء کے مینیمم ویجز ایکٹ میں بہت سی منضبط اور غیر منضبط ایسی صنعتیں شامل نہیں تھیں جہاں مزدوروں سے بہت ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اِس کی وجہ ایکٹ کا دائرہ عمل محدود تھا۔ خوش قسمتی سے کچھ صوبوں کی حکومتوں نے ہمت سے کام لیا اور اِس ایکٹ سے باہر کی صنعتوں پر بھی ایکٹ کا نفاذ کر دیا۔ ایکٹ میں جوٹ، کاٹن جننگ اینڈ بیلنگ اور کوئلہ نکالنے جیسی صنعتوں میں کم سے کم اُجرت کے تعین کی ضرورت کا خاص کر ذکر ہونا چاہیئے تھا کیونکہ اِن پیشوں میں مزدوروں کے ساتھ بڑی زیادتی ہوتی ہے۔ ایکٹ میں کم سے کم اُجرت کی صحیح تعریف کے مسئلے کو بھی خوبصورتی سے ٹال دیا گیا تھا۔

ایکٹ میں جن مشاورتی بورڈوں کا ذکر ہے وہ اپنے فرائض زیادہ بہتر انجام دے سکیں گے اگر اُن کی حیثیت مستقل کر دی جائے۔ لیکن بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ زیادہ تر صوبوں میں کم سے کم اُجرت کے نفاذ کے لیے موثر مشینری نہیں ہے۔ چنانچہ ایسے عملے کے فوری تقرر کی ضرورت ہے جو مینیمم ویج کا نفاذ کرے اور صوبائی مشاورتی بورڈوں کے ساتھ مِل کر کام کرے۔ ہمیں ہر صنعت کے لیے ایک ویج بورڈ کی ضرورت ہے جو اُجرت کی شرح کا تعین اور اُس پر نظر ثانی کرے۔ ہمیں ایک قومی کم سے کم اُجرت کو اپنا نصب العین بنانا چاہیے جو آگے چل کر تمام پیشوں پر عائد ہو گی۔

معقول اُجرت کا مسئلہ اور فیر ویجز بل ۱۹۵۶ء

(FAIR WAGES BILL)

کم سے کم اُجرت کے تعین سے معقول اُجرت (FAIR WAGES) اور منافع میں شرکت کے لیے زمین ہموار ہو گی۔ اِن تینوں کا اثر یہ ہو گا کہ مالکوں اور مزدوروں کے تعلقات بہتر ہوں گے، پیدا آوری

برھیگی اور صنعتی کارکردگی میں اضافہ ہوگا۔

اِس سلسلے میں فیر ویجز کمیٹی کی سفارشات کے ذکر کی خاص طور سے ضرورت ہے۔ کمیٹی کا کہنا ہے " ہم سمجھتے ہیں کہ مینمم ویج نہ صرف زندگی بسر کرنے کے لیے فراہم کرنا چاہیے بلکہ اِس کا مقصد مزدوروں کی کارکردگی کو قائم رکھنا ہونا چاہیے یعنی صرف مینمم ویج نہیں بلکہ معقول اُجرت کا بھی اہتمام ہونا چاہیے جو مینمم ویج اور لِونگ ویج (LIVING WAGE) کے کہیں بیچ میں ہو۔" کمیٹی نے لِونگ ویج کا ایک معیار مقرر کیا جو مینمم ویج سے اونچا تھا۔ کمیٹی کی رائے تھی کہ معقول اُجرت کے تعین کے وقت غذا، کپڑے اور رہائش گاہ کی فراہمی کے علاوہ مزدور اور اُس کے خاندان کی معمولی آسائش کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے مثلاً بچوں کی تعلیم، بیماری کے سلسلے کے تحفظات اور بنیادی سماجی ضرورتوں کی تسکین۔

مینمم ویج، فیر ویج اور لِونگ ویج میں جو باہمی رشتہ ہے اُس پر ایک نظر ڈالنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مینمم ویج کا اصول اُن پیشوں کے لیے اختیار کیا جاتا ہے جہاں اُجرتیں غیر معمولی طریقے سے کم ہوتی ہیں اور اُن کے مزدوروں کے ساتھ بے حد زیادتی ہوتی ہے۔ بیشتر مینمم ویج کے قوانین لِونگ ویج کو مینمم ویج کے تعین کی بنیاد مانتے ہیں۔ لیکن خود لِونگ ویج کی تعریفیں مختلف ہیں۔ کچھ لوگ مزدوروں کی معمولی ضرورتوں کا صرف حوالہ دیتے ہیں اور کچھ ان اشیا کو گنتے ہیں جو ایک معقول زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ بہ ہر حال عام طور سے لِونگ ویج کا مطلب ایسی اُجرت ہوتا ہے جو ایک عام مزدور، جو بہ ہر حال ایک انسان ہے اور مہذّب سماج کا فرد ہے، اُس کی معمولی ضروریات کے لیے کافی ہو۔ دوسری طرف معقول اُجرت کا مطلب اُجرت کی ایسی شرح ہے جو مزدور کی کارکردگی کے تناسب سے ہو۔ یہ کارکردگی اُس کی منختم خالص پیداوار کی قیمت سے ناپی جائے۔ فیر ویج اُس اُجرت سے کم نہیں ہونا چاہیئے جو دوسرے پیشوں میں ویسا ہی کام کرنے والوں کو ملتی ہو۔ اِس طرح فیر ویج کو، جو مینمم ویج سے زیادہ اور لِونگ ویج سے کم ہوتی ہے، ایک درمیانی منزل سمجھنا چاہیے جہاں سے لِونگ ویج کی منزل تک پہنچنا ہے۔ ہندوستان جیسے کم ترقی یافتہ ملک میں لِونگ ویج کی منزل تک جلد پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ ہمیں بتدریج مینمم ویج کی سطح کو بلند کرتے رہنا چاہیئے تاکہ ہم جلد از جلد فیر ویج کی منزل تک پہنچ جائیں لیکن ہمارا طویل المدت مقصد لِونگ ویج تک پہنچنا ہونا چاہیئے۔

چنانچہ فیر ویج بل کا مسودہ تیار کیا گیا اور یہ بل ۵۰ء میں پارلیمنٹ میں پیش ہوا لیکن ۵۲ء میں انتخابات کے لیے پارلیمنٹ برخواست ہوگئی اور یہ بل لیپس ہوگیا۔ اِس بل میں فیکٹریوں اور کانوں کے مزدوروں کے لیے فیر ویجز متعین کرنے کی تجویز تھی۔ بل میں فیر ویج کی تعریف یوں کی گئی تھی " فیر ویج

ایک ایسی اُجرت ہے جو مینیمم ویج سے کچھ زیادہ اور لونگ ویج سے کچھ کم ہوتی ہے"۔ فیر ویج کم از کم مینیمم ویج کے برابر ہونی چاہیے۔ جہاں تک اِس کی اوپری سطح کا سوال ہے اِس کا انحصار صنعت کی استعداد پر ہے۔ فیر ویج کے تعین کے لیے اِس بِل میں صوبائی فیر ویجز بورڈ کے قیام کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اِن صوبائی بورڈوں کے علاوہ ہر اُس صنعت کے لیے جو منضبط کی جانے والی تھی، ایک الگ علاقائی بورڈ قائم ہونا تھا۔ بِل میں یہ بھی تجویز تھی کہ جب فیر ویجز کا معاملہ زیر غور ہو، اُس دوران ہڑتالیں اور دربندیاں ممنوع قرار دی جائیں۔

غالباً حکومت فیر ویجز بل دوبارہ پیش کرنے کا ارادہ کر رہی ہے۔ مینیمم ویج ایکٹ کو کافی نہیں سمجھا جا رہا ہے کیونکہ تمام بڑی صنعتیں اس کے تحت نہیں آتیں۔ بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ صنعت کار یہ کہہ کر اس کی سخت مخالفت کریں گے کہ اِس کی وجہ سے مصارف پیداوار بڑھ جائیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ خود مینیمم ویج ایکٹ کی تعمیل میں کونسی کم مشکلات پیش آئی ہیں، اب فیر ویجز کے مقرر کرنے کی کوشش اُس کا مذاق اڑانا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ ہمارے پانچ سالہ منصوبوں کی اُجرت کی پالیسی کا مقصد ایک ایسا نظامِ اُجرت ہے جس میں بڑھتی ہوئی حقیقی اُجرت پر زور دیا جائے۔ یہ پالیسی مزدوروں کے معقول اُجرت کے حق کو بھی تسلیم کرتی ہے لیکن ساتھ ہی اِس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ معقول اُجرت کا کوئی یکساں فارمولا بنانا مشکل ہے۔ جیسا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، دوسرے پلان کے وسط میں حکومت نے الگ الگ صنعتوں کے لیے پارٹی ویج بورڈ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ فی الحال یہ بورڈ قومی سطح پر چوبیس صنعتوں کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ ہر بورڈ کا یہ کام ہے کہ وہ اِس بات پر غور کرے کہ ترقی پذیر معیشت میں متعلقہ صنعت کی کیا ضروریات ہیں، سماجی انصاف کے کیا تقاضے ہیں اور اُجرتوں کے فرق کو اس طرح دُور کیا جائے کہ مزدوروں کو اپنی مہارت بڑھانے کی ترغیب ملے۔

ویج کمیٹیوں کے منظور کردہ فیر ویج کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سہ پارٹی ویج بورڈ بہترین مشینری ہے، صوبائی حکومتوں کے لیے اِس کا کوئی سوال نہیں ہے کہ سرکاری ملازمین اور چند مشقت زدہ پیشوں کے مزدوروں کو چھوڑ کر باقی کی اُجرت کا تعین کریں۔ اِسی لیے اور بھی حکومت کا یہ فرض ہے کہ فیر ویج کے تعین کی مشینری کا اور منافع میں شرکت کی اسکیموں کا اہتمام کرے اور مزدوروں کے معیارِ زندگی کو بہتر کرنے میں عام مدد کرے۔

منافع میں شرکت اور ہندوستانی صنعتوں کے لیے اِس کی اہمیت

منافع میں شرکت کا یہ مطلب ہے کہ آجر مزدوروں کی اُجرت کے علاوہ انھیں اپنے فاضل

منافع کا ایک حصہ بھی دیتا ہے۔ منافع میں شرکت عام طور سے آجروں اور مزدوروں کے مابین معاہدے پر مبنی ہوتی ہے اس لیے اس میں اور بونس میں فرق ہے کیونکہ بونس آجر کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے۔

منافع میں شرکت کی وجہ سے سماجی انصاف کو فروغ ہوتا ہے، سرمائے اور محنت کے مشترک مفاد کو تقویت ملتی ہے اور مزدوروں کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ منافع میں شرکت بڑی کامیاب ہوگی اگر سرمایہ دار اور مزدور دونوں معاہدے کے وقت ایک دوسرے کا اعتماد حاصل کریں۔ آجروں کو منافع کی طے شدہ شرح میں دفعتاً اور اِک طرفہ تبدیلی نہیں کرنی چاہیئے۔

آزادی کے بعد مرکزی حکومت نے ایک اِکسپرٹ کمیٹی مقرر کی جس کا نام پرافٹ شیئرنگ کمیٹی تھا۔ اِس کمیٹی نے اپنی رپورٹ ستمبر ۱۹۴۸ء میں پیش کی۔ اِس رپورٹ کی بنیادی باتیں درج ذیل ہیں:

(۱) کمیٹی نے منافع میں شرکت کے سوال پر تین زاویوں سے غور کیا (الف) پیداوار بڑھانے کی ترغیب کی حیثیت سے (ب) صنعتی امن کے حصول کی غرض سے (ج) اور انتظام میں مزدوروں کی شرکت کے ایک قدم کی حیثیت سے۔

(۲) جہاں تک اصل پر معقول منافع کا سوال ہے، کمیٹی کا خیال تھا کہ بیباق سرمائے اور کاروبار کے لیے ساری محفوظ رقم پر ۶ فی صدی منافع موجودہ حالت میں مناسب رہے گا۔

(۳) منافع میں مزدوروں کے حصے کے بارے میں کمیٹی کی رائے تھی کہ یہ کاروبار کے فاضل منافع کا ۵۰ فی صدی ہونا چاہیے۔ انفرادی طور سے مزدوروں کا حصہ پچھلے بارہ مہینے کی ان کی کمائی کے تناسب سے ہوگا۔ کمائی میں مہنگائی الاؤنس اور دوسرے بونس شامل نہیں ہوں گے۔ جن مزدوروں کا منافع کا حصہ اُن کی بنیادی اُجرت کے ۲۵ فی صدی سے زیادہ ہوگا انھیں بنیادی اُجرت کے ۲۵ فی صدی تک نقد دیا جائے گا اور باقی یا تو اُن کے پراوڈنٹ فنڈ میں یا مستقبل کی ادائیگی کی کسی اسکیم کے تحت جمع کر دیا جائے گا۔

(۴) تجربے کے طور پر کمیٹی نے چھے منظم صنعتوں میں پانچ سال کے لیے منافع میں شرکت کی اسکیم شروع کرنے کی سفارش کی۔ یہ صنعتیں یہ تھیں: سوتی کپڑا، جوٹ، فولاد، سیمنٹ اور سگرٹ بنانے کی صنعتیں۔

پرافٹ شیئرنگ کمیٹی متفقہ رپورٹ نہیں پیش کر سکی۔ مرکزی مشاورتی کونسل نے رپورٹ پر غور کیا لیکن یہ بھی اسکیم کی تکمیل کے بارے میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکی۔ دوسرے پلان میں یہ خیال ظاہر

کیا گیا کہ بونس اور منافع میں شرکت کے سوال پر مزید مطالعے کی ضرورت ہے تاکہ اس کا کوئی ایسا حل نکل سکے جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔

بونس کا مسئلہ اور بونس کمیشن ۱۹۶۴ء کی رپورٹ

آجروں اور مزدوروں کے درمیان بونس کے موضوع پر بہت اختلاف رہا ہے اور اس جھگڑے کی وجہ سے جتنے ایام کار ضائع ہوئے اتنے کسی اور جھگڑے کی وجہ سے نہیں ہوئے۔ اس قضیے کو ختم کرنے کے مقصد سے حکومت نے دسمبر ۱۹۶۱ء میں سات ممبروں پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا جس کے چیرمین مسٹر ام۔ آر۔ مہر تھے۔ اس کمیشن نے جنوری ۱۹۶۴ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ رپورٹ میں کئی اہم سوال اٹھائے گئے ہیں اور اس کے ساتھ ایک اختلافی نوٹ بھی ہے۔

بونس کے بارے میں کمیشن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ بونس کو متعلقہ کاروبار کی خوش حالی میں مزدوروں کا حصہ تصوّر کرنا چاہیے۔ اس سے ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ کم اجرت مزدوروں کی واقعی اجرت اور ضرورت پر مبنی اجرت کے درمیان خلا پُر ہوگا۔ لیکن کمیشن نے اس خیال کو نہیں تسلیم کیا کہ بونس کو اجرت کے نظام میں شامل کر دیا جائے۔ کمیشن کا کہنا ہے کہ اجرت کی شرحیں صنعت اور علاقے کی بنیاد پر متعین ہیں جبکہ منافع کسی صنعت کی ادائیگی کی استعداد سے منسلک ہے اور اس کے مطابق گھٹ بڑھ سکتا ہے۔ بونس کو اجرت سے منسلک کرنے کی تجویز اس لیے نہیں تسلیم کی گئی کیونکہ کمیشن کے خیال میں منافعے کا بونس اس بونس سے مختلف ہے جو ترغیب کے لیے دیا جاتا ہے۔ کارکردگی بڑھانے کی ترغیب ایک ایسی سوچی سمجھی پیداواری بونس کی اسکیم کے تحت عمل میں آتی ہے جس میں بہتر پیداوار، کارکردگی اور زیادہ آمدنی میں براہِ راست تعلق ہوتا ہے۔

یہ واضح طور پر بتلانے کے بعد کہ کس کمپنی کا خام منافع کیسے نکالا جائے اور فرسودگی کا حساب کیسے لگایا جائے، کمیشن نے کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ بونس کا اپنا عام فارمولا بنایا ہے جس کے نتائج ان کے خیال میں معقول اور منصفانہ ہوں گے۔

کمیشن نے بونس کا جو فارمولا تیار کیا ہے اس کے تحت اگر کسی مزدور نے ایک سال کام کیا ہے (اس میں اس کی رخصت با تنخواہ بھی شامل ہے) تو اس کو اس کی سال بھر کی کمائی کا ۴ فی صدی بونس یا ۴۰ روپے، دونوں میں جو زائد ہو، اس کا حق ہے۔ سال بھر کی کمائی میں بنیادی اجرت اور گرانی الاؤنس دونوں شامل ہیں۔ جن مزدوروں نے اس مدت سے کم کام کیا ہے انھیں اسی تناسب

سے الاؤنس کا حق ہے۔ الاؤنس کی بالائی حد کمائی کی ۲۰ فی صدی مقرّر کی گئی ہے۔ اس فارمولے سے مزدوروں کو یہ فائدہ ہے کہ کمائی سے مُراد صرف بنیادی اُجرت نہیں ہے بلکہ اِس میں مہنگائی بھتّہ بھی شامل ہے۔ لیبر اپیلیٹ ٹریبونل کے فارمولے کے مطابق بونس کے لیے صرف بنیادی اُجرت کمائی شمار ہوتی تھی۔ مزدوروں کو ایک دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ پچھلے فارمولے کے تحت بحالی کے مصارف بھی اُن مدّات میں شامل تھے جو خام منافع میں سے وضع ہونے تھے لیکن نئے فارمولے میں بحالی کے مصارف اِن مدّات سے نکال دیے گئے۔ کمیشن کا فارمولا نجی کاروبار پر بھی عائد ہوتا ہے اور اُن سرکاری کاروباروں پر بھی جن کی پیدا کی ہوئی اشیا نجی کاروبار کی اشیا سے مقابلہ کرتی ہیں۔ اور جن کی فروخت نجی کاروبار کی فروخت کی کم از کم ۲۰ فی صدی ہے۔ نئے کاروبار چھے برس کے لیے اِس سے مستثنیٰ کر دیے گئے ہیں۔ کمیشن نے سفارش کی کہ یہ فارمولا ۶۲-۱۹۶۱ء کے مالی سال کے کسی آخری دن سے نافذ ہو سوا اس کے کہ کسی معاملے میں پہلے سے معاہدہ یا فیصلہ ہو چکا ہو۔

مرکزی حکومت نے اگست ۱۹۶۴ء میں کچھ ترمیموں کے ساتھ اِن سفارشات کی منظوری کا اعلان کر دیا۔ حکومت نے کم سے کم بونس کی سفارش منظور کر لی۔ اِس طرح کسی بھی فرم کا خام منافع اُس کے ملازمین میں تقسیم ہوتا تھا۔ ادائیگی کی شرح بنیادی اُجرت اور مہنگائی بھتّے کی چار فی صدی یا ۴۰ روپے ہوگی (دونوں میں جو زیادہ ہو)۔ بالائی سطح ۲۰ فی صدی مقرّر کی گئی۔ اگر کوئی صنعت اِس سے زیادہ بونس دینا چاہتی ہے تو وہ دے سکتی ہے لیکن حکومت کے خیال میں ایسی صورت میں بہتر ہوگا کہ ایک حد سے زیادہ بونس کی رقم نقد کے بجائے سکیورٹی یا شیر کی صورت میں دی جائے۔ پہلے اِس فارمولے کا نفاذ ایک آرڈیننس کے ذریعے کیا گیا اور بعد میں اِس کو بونس ایکٹ ۱۹۶۵ء کی شکل دے دی گئی۔ اس طرح بونس فارمولا ۶۴-۱۹۶۳ء سے شروع ہو گیا تھا۔ اگرچہ ایکٹ کا نفاذ ۱۹۶۵ء سے ہوا۔

ایکٹ کے تحت مزدوروں اور دفتروں میں کام کرنے والے آتے ہیں۔ فارمولا وہی ہے یعنی اُجرت اور مہنگائی بھتّے کا ۴ فی صدی یا ۴۰ روپے، دونوں میں جو زیادہ ہو۔ بالائی حد ۲۰ فی صدی رکھی گئی ہے۔ ہندوستانی کاروبار کو خام منافع کا ۶۰ فی صدی اور بدیسی کاروبار کو ۶۷ فی صدی بونس کے لیے رکھنا ہوگا۔ ۱۶۰۰ روپے ماہوار پانے والوں تک کو بونس کا حق ہوگا لیکن ان کے بونس کا حساب زیادہ سے زیادہ ۷۵۰ روپے ماہوار پر لگایا جائے گا۔ ایک مزدور نے سال میں جتنے روز کام کیا ہوگا اُسی کے تناسب سے بونس کا حساب لگایا جائے گا۔ ایکٹ میں ان موجودہ بونسوں کے تحفّظ کا بھی

اہتمام ہے جو نئے فارمولے کے تحت بونس سے زیادہ ہیں۔اس کا یہ مطلب ہے کہ بونس کے ایک سے زیادہ قاعدے ہوں گے ۔ یہ ایکٹ ان تمام کاروباروں پر عائد ہوتا ہے جہاں بیس یا بیس سے زیادہ آدمی کام کرتے ہیں ۔

حال میں اس ایکٹ کی کچھ دفعات کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا۔ کورٹ نے سکشن ۱۰ کو دستور کے لحاظ سے جائز قرار دیا ۔ اس دفع کے تحت منافع نہ ہونے کی شکل میں کم سے کم بونس ادا ہونا ہے ۔ لیکن دو سکشن ناجائز قرار دیے گئے ۔ سکشن ۳۳ جس کا تعلق زیر غور تنازعوں پر ایکٹ کے اطلاق سے ہے اور سکشن (۲) ۳۴ جو موجودہ اونچے بونسوں کے تحفظ کے لیے ہے ۔

ایکٹ کے بونس کے فارمولے سے بڑی مدد ملیگی کیونکہ اس نے ایک معیار مقرر کردیا ہے جس کے مطابق بونس کے لیے خام منافعے کا حصہ متعین ہوگا۔ بونس کے جھگڑوں سے متعلق سرکاری شعبۂ محنت اور لیبر ٹریبیونل کے فیصلے جلد کیے جائیں گے۔ پہلے چونکہ کوئی فارمولا نہیں تھا اس لیے یہ جھگڑے مدتوں چلتے رہتے تھے ۔آجر اس بات پر مصر تھے کہ بحالی کے لیے ایک محفوظ فنڈ قائم کیا جائے اور مزدور اس کی مخالفت کرتے تھے ۔ نئے ایکٹ کے تحت آجر ریزرو فنڈ نہیں قائم کر سکتے لیکن مزدوروں کو کم سے کم سالانہ بونس کی ضمانت حاصل ہے۔

باب ۲۵

سوشل سیکیورٹی، رہائشی انتظام اور مزدوروں کی بہبود

سوشل سیکیورٹی ان خطرات کے خلاف ایک طرح کی ضمانت ہے جو سماج کے ممبروں کو پیش آتے ہیں اور جو مناسب اداروں کے ذریعے فراہم کی جاتی ہے۔ بنیادی طور سے یہ خطرات ایسے ہوتے ہیں جن کے خلاف ضمانت کا اہتمام ایک معمولی وسائل کا آدمی اپنی اہلیت اور دور اندیشی سے نہیں کر سکتا بلکہ کچھ لوگ نجی طور پر اگر مل کر بھی ایسا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ یہ خطرات ہیں بیماری، معذوری، زچگی، بڑھاپا اور موت۔

سوشل سیکیورٹی اور ترقیاتی منصوبہ بندی

ہندوستان جیسے مائل بفلاح اور جمہوری قسم کی ترقیاتی منصوبہ بندی میں سوشل سیکیورٹی اور سوشل انشورنس، جمہوریت پسند صنعتی سماج کے بنیادی اصول ہوتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں ایمپلائمنٹ انشورنس ایکٹ کے پاس ہونے کے بعد سے ہندوستان میں سماجی تحفظ صرف جزوی تحفظ ہے جبکہ سوشل سیکیورٹی کی پالسی کا نظریہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ اِس کا مقصد بیماریوں اور جسمانی نقصان سے بچانا، آمدنی کی معقول تقسیم عمل میں لانا اور لوگوں کو ہر قسم کی تنگی، عسرت اور محتاجی سے نجات دینا ہوتا ہے۔ غرضیکہ سوشل سیکیورٹی ایک مائل بفلاح ترقیاتی منصوبہ بندی کا بنیادی مقصد ہوتی ہے اور سوشل انشیورنس اِس مقصد کے حصول کا ذریعہ۔

سوشل انشیورنس کو بہت خوبی کے ساتھ ایک لیبر انشیورنس کے نظام سے ملایا جا سکتا ہے تاکہ نہ صرف بیماری بھتّوں اور طبّی امداد کی وجہ سے بلکہ انعام اور فوائد کے ایک غیر ترغیبی نظام کے

تحت بھی مزدوروں کی کارکردگی بڑھے۔ یہ بات بہت اہم ہے کیونکہ اس سے مزدوروں میں پیداوار بڑھانے کا جذبہ پیدا ہوگا جو دن بدن بڑھتی ہوئی قیمتوں کے پیش نظر آج کی بنیادی ضرورت ہے سوشل انشیورنس کو ہماری ترقیاتی منصوبہ بندی کے پروگرام کالازمی حصہ ہونا چاہیے۔ مشرقی یورپ کے ملکوں، خصوصاً چیکو سلواکیا میں سوشل انشیورنس ایکٹ ترقیاتی منصوبوں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ سماج کے وسائل اور خطرات دونوں کو یکجا کیا جائے اور منصفانہ طریقے سے انھیں سماج کے لوگوں میں تقسیم کیا جائے اور تقسیم کی بنیاد وسائل نہ ہوں بلکہ لوگوں کی ضروریات ہوں۔

برطانوی عہد کے سوشل سیکیورٹی ایکٹوں کا مختصر بیان

آزادی سے قبل ہندوستان میں سوشل سیکیورٹی کے میدان میں لے دے کر صرف ۱۹۲۳ء کا ورکس مین کمپنسیشن ایکٹ اور کچھ میٹرنٹی بنی فٹ ایکٹ (MATERNITY BENEFIT ACT) پاس کیے گئے تھے۔ ۱۹۲۳ء کے ایکٹ کے تحت آجروں کے لیے لازمی قرار دیا گیا کہ مزدوروں کے زخمی ہو جانے کی صورت میں اُن کو معاوضہ ادا کریں۔ حادثے کی وجہ سے انتقال ہو جانے کی صورت میں معاوضے کا حساب اُس کی ماہانہ اوسط اُجرت پر لگایا جاتا تھا۔ زخمی ہونے کی صورت میں معاوضے کا انحصار اس پر تھا کہ ماہانہ اُجرت کتنی ہے اور چوٹ کتنی شدید ہے۔ ایکٹ میں کچھ ردّ و بدل کرنے اور پیشہ ورانہ بیماریوں سے متعلق آئی۔ اِل۔ اُو کی سفارشات کی تعمیل کے لیے اِس میں کئی بار ترمیمیں کی گئیں۔ ان میں ۱۹۴۶ء کی ترمیم سب سے اہم ہے۔ اِس ترمیم کے ذریعے ۱۹۲۳ء کے ایکٹ کے تحت آنے والے مزدوروں کی اُجرت کی حد ۳۰۰ روپے ماہانہ سے بڑھاکر ۴۰۰ روپے ماہانہ کر دی گئی۔ میٹرنٹی بنی فٹ ایکٹ کے تحت عورتوں کو زچگی الاؤنس کا حق تھا لیکن مزدوروں کی ناواقفیت اور آجروں کی بے توجہی سوشل سیکیورٹی ایکٹوں کے نفاذ میں مانع رہی۔ ضرورت اِس بات کی تھی کہ ورکس مین کمپنسیشن ایکٹ کو از سرِ نو ترتیب دیا جائے اور حکومت کی طرف سے مزدوروں کے لیے سوشل انشیورنس کا ایک مکمل نظام قائم کیا جائے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں ایمپلائیز اسٹیٹ انشیورنس ایکٹ ۱۹۴۸ء اور ورکس مین کمپنسیشن ایکٹ ۱۹۶۲ء پاس کر کے یہ کمیاں بڑی حد تک پوری کی گئیں۔ ۱۹۲۳ء کے ایکٹ میں ۱۹۶۲ء میں ترمیم کر کے معاوضے کی شرح پر نظرثانی کی گئی اور معاوضے کے اہل مزدوروں کی اُجرت کی حد ۴۰۰ سے بڑھاکر ۵۰۰ روپے کر دی گئی۔ اِس طرح ۱۹۶۲ء کی ترمیمات نے ۱۹۲۳ء کے ایکٹ کی گیرائی کافی بڑھادی اور اُس کی تعمیل کا انتظام بھی

بہتر ہوگیا۔

ادارکر کی ہیلتھ انشورنس اسکیم

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں مزدوروں کی صحت کے بیمے کا موضوع حکومت کی توجہ کا مرکز رہا۔ ۱۹۴۰ء، ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء کی وزرائے محنت کی کانفرنس میں صحت اور بیماری کا بیمہ شروع کرنے کا مسئلہ زیر بحث رہا۔ ۱۹۴۳ء میں حکومت نے ڈاکٹر ادارکر کو صنعتی مزدوروں کی صحت کے بیمے کی اسکیم تیار کرنے پر متعین کیا۔ پروفیسر ادارکر کی اسکیم لازمی شرکت کے اصولوں پر مبنی تھی۔ تجربے کے طور پر ڈاکٹر ادارکر اس اسکیم کا اطلاق سوتی کپڑوں، انجینیرنگ، معدنی اور دھات کی صنعتوں پر چاہتے تھے۔ اسکیم کا اطلاق صرف ۱۲ سال سے لے کر ۶۰ سال کے مزدوروں اور ڈھائی سو روپے سے کم اُجرت پانے والوں پر تھا جس کی وجہ سے یہ اور بھی محدود ہوگئی۔ ڈاکٹر ادارکر نے اِس بات کی شدید حمایت کی کہ اسکیم کے مالی استحکام کی ضمانت لینے کے علاوہ حکومت اس میں شریک بھی ہو۔ ۱۹۴۵ء میں آئی۔ اِل۔ اُو کے دو ماہرین نے اس اسکیم کی جانچ کی۔ ماہروں نے تجویز کیا کہ اسکیم کا اطلاق سال بھر چلنے والی تمام فیکٹریوں پر ہو اور زچگی کی امدادوں اور مزدوروں کے معاوضے کو بھی اِس کے تحت لے آیا جائے۔ ڈاکٹر ادارکر کی رپورٹ اور آئی۔ اِل۔ اُو کے ماہرین کی سفارشات کی بنیاد پر حکومت نے ایک بِل تیار کیا جو ۱۹۴۸ء کے امپلائمنٹ اسٹیٹ انشورنس ایکٹ کی شکل میں پاس کیا گیا۔

اِمپلائیز اسٹیٹ انشورنس ایکٹ ۱۹۴۸ء

ایکٹ کی اہم باتیں یہ ہیں:

(۱) گیرائی۔ ایکٹ ان تمام صنعتوں پر عائد ہوتا ہے جو موسمی صنعتیں نہیں ہیں، جو پاور سے چلتی ہیں اور جہاں ۲۰ یا ۲۰ سے زیادہ مزدور کام کرتے ہیں۔ ایکٹ کا نفاذ جموں کشمیر کو چھوڑ کر باقی سارے ملک پر ہے۔

(۲) ایکٹ پانچ قسم کی امدادیں فراہم کرتا ہے۔ بیماری، زچگی، معذوری، طبی اور متعلقین کو امداد۔ اسکیم کے تحت جو خطرے آتے ہیں وہ ہیں روزگار کے سلسلے میں جسمانی نقصان جس میں پیشہ وارانہ بیماریاں بھی شامل ہیں، زچگی اور علالت۔ یہ امدادیں نقد، اشیا اور خدمات (مثلاً طبی امداد) کی شکل

میں دی جاسکتی ہیں۔

(۳) اسکیم کے لیے وسائل کی فراہمی۔ سوشل انشیورنس اسکیم مزدوروں اور آجروں کی شرکت کے اصولوں پر مبنی ہے۔ فیس اور مزدوروں کا حصہ ادا کرنے کی بنیادی ذمہ داری آجروں کی ہے۔

(۴) اِنتظام۔ اسکیم کی تعمیل کے لیے ایک خود مختار ادارہ ہوگا جس کا نام اسٹیٹ انشیورنس کارپوریشن ہوگا۔ کارپوریشن کی ایک اسٹینڈنگ کمیٹی ہوگی جو انتظامیہ کی حیثیت سے کام کرے گی۔ کارپوریشن کو طبی امداد کی فراہمی کے سلسلے میں مشورہ دینے کے لیے ایک میڈیکل بنی فٹس کونسل ہوگی۔

(۵) وسائل کی فراہمی۔ مالی وسائل اِمپلائمنٹ اسٹیٹ انشیورنس فنڈ فراہم کرے گا۔ اِس فنڈ کے لیے رقم مزدوروں، آجروں اور مرکزی و صوبائی حکومتوں کے چندے سے جمع ہوگی۔ مرکزی حکومت پہلے پانچ برسوں میں انتظامی اخراجات کے دو تہائی کے بقدر سالانہ گرانٹ دے گی۔

اِمپلائمنٹ اسٹیٹ انشیورنس کارپوریشن اکتوبر ۱۹۴۸ء میں قائم ہوا۔ یہ طے پایا کہ پائلٹ انشیورنس اسکیم پہلے دہلی اور کانپور میں شروع کی جائے اور اُس کے بعد بمبئی میں۔ کانپور اور دہلی کے آجروں نے اِس بنا پر مخالفت کی کہ وہ اِس اسکیم کے مصارف کیوں برداشت کریں جب ملک کے دوسرے آجروں پر اِس کو عائد نہیں کیا جارہا ہے۔ شمالی ہندوستان کے امپلائیز ایسوسیئیشن نے حکومت سے اِس تفریق کے خلاف احتجاج کیا۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں ایک ترمیمی ایکٹ پاس ہوا۔ اسکیم اب بھی چند مقامات پر نافذ ہوئی تھی لیکن اِس کے نفاذ سے اِن مقامات کے آجروں کو دوسرے مقلات کے مقابلے میں جو گھاٹا ہوگا اُس کے ازالے کے لیے ملک بھر کے آجر اِس فنڈ میں اپنا حصہ جمع کرنا شروع کردیں گے لیکن اُن علاقوں کے آجروں کے چندے کی شرح دوسروں سے کچھ زیادہ ہوگی جہاں اسکیم کی تعمیل فوراً ہوئی ہے۔ فروری ۱۹۵۲ء میں کانپور اور دہلی میں اسکیم شروع ہوئی۔ بعد میں دوسرے صنعتی علاقوں میں نافذ کردی گئی اور فروری ۱۹۵۸ء تک اس کا نفاذ ۲۸۹ مراکز میں کیا جاچکا تھا اور ۳ کروڑ، ۵ لاکھ ۸۰ ہزار مزدور اس کے تحت آچکے تھے۔ توقع ہے کہ چوتھے پلان کے ختم تک اُن علاقوں کے تمام مزدور اور ان کے خاندان اِس کے تحت لے آئے جائیں جن کی آبادی ۵۰۰ یا اِس سے زیادہ ہے اور جن پر یہ اسکیم عائد ہوتی ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مارچ ۱۹۶۱ء میں کارپوریشن نے ایک سب کمیٹی مقرر کی جس نے سفارش کی کہ اِس ایکٹ میں مناسب ترمیم کی جائے اور ۴۰۰ روپے کے بجائے ۵۰۰ روپے ماہانہ تنخواہ پانے والے اِس کے

تحت لے آئے جائیں۔ کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی کہ ایکٹ سے وہ دفع نکال دی جائے جس کے تحت آجروں کو مزدوروں کی رخصت بلا تنخواہ مدت کا بھی چندہ جمع کرنا پڑتا ہے۔ غرضیکہ ان اور دوسری تجاویز کا مقصد یہ تھا کہ فائدوں کو آسان کیا جائے اور امداد کو زیادہ منصفانہ بنایا جائے اور ۴۰۰ کے بجائے ۵۰۰ روپے تک پانے والے اس سے افادہ کر سکیں۔ جنوری ۱۹۶۵ء میں حکومت نے مستفید ہونے والوں کی تنخواہ کی حد ۴۰۰ سے بڑھا کر ۵۰۰ کر دی۔ چنانچہ اب اسکیم ۲۰ روپے ماہوار سے لے کر ۵۰۰ روپے تک پانے والوں پر عائد ہوتی ہے۔

امپلائمنٹ انشیورنس اسکیم کو ہندوستانی مزدوروں کے سوشل سیکیورٹی کی اسکیم کے حصول کی طرف ایک قدم تصور کرنا چاہیئے۔ اپنی موجودہ شکل میں یہ اسکیم بہت واجبی ہے۔ وہ تمام خطرات اس کے تحت نہیں آتے جن سے لوگ دوچار ہوتے ہیں۔ دراصل ضرورت اس بات کی ہے کہ سوشل سیکیورٹی کا ایک باقاعدہ نظام قائم کیا جائے۔ مستقبل میں جب اس اسکیم کو زیادہ وسعت دی جائے تو بیروزگاری کا بیمہ اور بڑھاپے اور معذوری کی معقول ضمانت بھی اس اسکیم میں شامل کی جائے۔ حکومت کو فوراً سوشل سیکیورٹی کا ایک مکمل نقشہ تیار کرنا چاہیئے اور اس کو ترقیاتی منصوبوں سے منسلک کرنا چاہیئے تاکہ پانچ سالہ منصوبوں کے دوران رفتہ رفتہ اس کی تکمیل ہو سکے۔

بیروزگاری کا بیمہ

چونکہ ہمارا نصب العین ایک فلاحی قسم کی جمہوری منصوبہ بندی ہے اس لیے توقع ہے کہ ہماری حکومت محنت کی منصوبہ بندی کے تمام پہلوؤں پر توجہ دے گی اور رفتہ رفتہ بیروزگاری کا بیمہ شروع کرنے کے لیے زمین ہموار کرے گی۔ انڈسٹریل ڈسپیوٹس ایکٹ ۱۹۵۳ء کے ذریعے پہلی بار ہندوستان میں بیروزگاری کی امداد ان کارخانوں اور کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو دی گئی جہاں ۵۰ سے زیادہ مزدور کام کرتے تھے۔ مئی ۱۹۵۸ء سے یہ سہولت باغات کے مزدوروں کو بھی حاصل ہو گئی۔ ہماری رائے ہے کہ اس امدادی حلقے کو اور وسیع کیا جائے تاکہ اس کے تحت ان صنعتی کاروباروں کے تمام مزدور آجائیں جہاں ۲۰ سے زیادہ مزدور کام کرتے ہیں اور جہاں پاور استعمال ہوتی ہے۔ یہ وہ کاروبار ہیں جو محنت کے بیشتر قوانین اور ۱۹۵۲ء کے امپلائمنٹ پراوڈنٹ فنڈ ایکٹ کے تحت آتے ہیں۔ یاد رہے کہ بیروزگاری کی امداد زیادہ تر چھٹنی کی ادائگیاں ہیں جنھیں بیروزگاری کا بیمہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ جہاں تک بیروزگاری کے بیمے کا سوال ہے حکومت نے ۱۹۵۸ء میں ایک ورکنگ گروپ بنایا

تھا۔ اس نے ہندوستان میں بیروزگاری کے بیمے کی اسکیم کی ضرورت پر زور دیا اور تجویز کیا کہ آجر اور مزدور دونوں اس کے پریمیم میں شریک ہوں۔ لیکن بظاہر حکومت نے امپلائمنٹ انشیورنس کی اسکیم شروع کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے اور چھٹنی کے معاوضے کے اہتمام پر زیادہ توجہ دے رہی ہے اور اس مقصد کے پیش نظر انڈسٹریل ڈسپیوٹس ایکٹ میں ضروری ترمیم کر رہی ہے۔ ہماری رائے ہے کہ بیروزگاری کے بیمے کی اسکیم پر چند پائلٹ علاقوں میں تجربہ کرنا چاہیے اور ابتدائی مراحل میں روزگار کے دفتروں کو اس کا انتظام کرنا چاہیے۔

۱۹۵۸ء کی لیبر کانفرنس کے بعد حکومت نے مرکزی اور صوبائی حلقوں میں دوسرے پلان کے دوران امپلائمنٹ ریلیف فنڈ کے قیام پر سنجیدگی سے غور کیا۔ اس سلسلے میں حکومت نے ایک تفصیلی اسکیم بھی تیار کی۔ تجویز کیا گیا کہ اس ریلیف فنڈ کا مقصد بند ہو جانے والے کارخانوں کے مزدوروں کو صرف امداد دینا نہ ہونا چاہیے بلکہ یہ بھی کہ کارخانوں کو بند ہونے سے روکنے میں بھی ممکن مدد دی جائے۔ اس فنڈ کے لیے رقم مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو فراہم کرنی چاہیے اور اگر یہ کافی نہ ہو تو صنعت کو یہ کمی پوری کرنی چاہیے۔ لیکن حسب توقع صنعت کے مالکوں نے اس کی شدید مخالفت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فروری ۱۹۶۱ء میں یہ اسکیم بالائے طاق رکھ دی گئی۔

اس سلسلے میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ کمپنیز ایکٹ ۱۹۵۶ء کے تحت ایک اور تحفظ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس ایکٹ کی ایک دفعہ ہے کہ اگر کوئی کمپنی بند ہو جائے تو اس کے چکوتے (LIQUIDATION-) کے وقت سب سے پہلے مزدوروں کے تمام مطالبات کا حساب کیا جائے۔

خوشی کی بات ہے کہ اکتوبر ۱۹۶۵ء کے شروع میں حکومت کے سوشل سکیورٹی شعبے نے بیروزگاری کے خطرے کے لیے ایک اسکیم تیار کی۔ اس اسکیم میں تجویز کیا گیا ہے کہ بہ استثنیٰ چند یہ اسکیم اُن سارے کارکنوں پر لازمی طور سے عائد ہوگی جو کارکنوں کے پراوڈنٹ فنڈ اور کول مائنز پراوڈنٹ فنڈ کے ممبر ہیں۔ اس اسکیم کے تحت وہ کارکن آئیں گے جو بیروزگار ہونے کی وجہ سے روزی نہیں کما سکتے اگرچہ وہ کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور کام کرنے پر رضامند ہیں۔ اسکیم کے مطابق اُن لوگوں کو جو امپلائیز پراوڈنٹ فنڈ کے ممبر ہیں، ان کی اوسط ماہانہ تنخواہ کا ۵۰ فی صدی اور کول مائنز پراوڈنٹ فنڈ کے ممبروں کو اُن کی مجموعی یافت ۵۰ فی صدی کے بقدر امداد دی جائے گی۔ اس کا حساب ملازمت ختم ہونے سے پورے ۱۲ مہینے کی آمدنی پر لگایا جائے گا۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں دہلی میں ہونے والی تیئیسویں لیبر کانفرنس میں اس اسکیم پر غور کیا گیا لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا جس کی بنیاد پر

بیروزگاری کے بیمے سے متعلق کوئی مؤثر قانون بن سکتا۔

امپلائیز پراوڈنٹ فنڈ ایکٹ ۱۹۵۲ء

کنٹری بیوٹری پراوڈنٹ فنڈ، نان کنٹری بیوٹری پنشن یا پنشن کے بیمے کے ذریعے معذوری اور بڑھاپے کی امداد کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں سرکاری ملازم نان کنٹری بیوٹری پنشن سے استفادہ کرتے ہیں۔ کنٹری بیوٹری فنڈ کچھ صنعتوں اور نیم سرکاری اداروں میں رائج ہے لیکن پنشن کا بیمہ کہیں بھی نہیں ہے۔

آزادی کے بعد سے حکومت نے محسوس کیا کہ ہندوستان کے صنعتی مزدوروں کے لیے لازمی پراوڈنٹ فنڈ کا نفاذ ضروری ہے۔ لازمی پراوڈنٹ فنڈ سے متعلق مسائل پر پٹنہ کی وزرائے محنت کی کانفرنس میں غور کیا گیا۔ نومبر ۱۹۵۱ء میں لازمی پراوڈنٹ فنڈ کی اسکیم نافذ کرنے کے لیے ایک آرڈیننس جاری کیا گیا، بعد میں جس کی جگہ امپلائیز پراوڈنٹ فنڈ ایکٹ ۱۹۵۲ء نے لے لی۔ ابتداً اس اسکیم کا نفاذ چھے بڑی صنعتوں کی اُن فیکٹریوں پر ہوا جہاں ۵۰ یا اس سے زیادہ آدمی کام کرتے تھے۔ یہ چھے صنعتیں یہ تھیں — سیمنٹ، سگریٹ، انجینیرنگ (الکٹریکل، میکینکل اور جنرل)، لوہا اور فولاد، کاغذ اور سوتی کپڑے کی صنعتیں۔ مرکز کو اختیار دیا گیا کہ وہ اس ایکٹ کو دوسری صنعتوں اور اُن فیکٹریوں پر عائد کر سکتی ہے جہاں ۵۰ سے کم آدمی کام کرتے ہیں۔ دسمبر ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۸ء کی ترمیموں کے ذریعے حکومت کو مزید اختیار مل گیا کہ وہ اس ایکٹ کو مرکزی اور صوبائی سرکاری کاروباروں پر اور فیکٹریوں کے علاوہ کام کرنے والوں پر بھی نافذ کر سکتی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں اس ایکٹ کے دائرہ نفاذ کو اور وسعت دی گئی اور وہ کاروبار بھی اس کے تحت آگئے جہاں ۲۰ یا اس سے زیادہ آدمی کام کرتے تھے۔ ۱۹۶۳ء میں مزید ترمیم کی گئی اور وہ مزدور بھی اس کے تحت آگئے جو ٹھیکے داروں کے ذریعے کام پر لگائے جاتے تھے۔ اِن مزدوروں سے متعلق چندہ آجر ٹھیکے داروں سے وصول کریں گے اس ایکٹ سے کچھ کارکنوں کو یہ تحفظ بھی مل گیا کہ اِن کا پراوڈنٹ فنڈ ضبط نہیں کیا جا سکتا اور انسپکٹروں کو ایکٹ کی تعمیل کے لیے مزید اختیارات حاصل ہو گئے۔ اس طرح امپلائیز پراوڈنٹ فنڈ ایکٹ ۱۹۵۲ء جو ابتدا میں صنعتی مزدوروں کو لازمی پراوڈنٹ فنڈ کی سہولت دینے کے لیے صرف چھے بڑی صنعتوں پر نافذ ہوتا تھا، جنوری ۱۹۶۸ء تک ۱۱۲ صنعتوں اور کاروباروں کو اپنے حصار میں لے چکا تھا۔

پراوڈنٹ فنڈ کی اسکیم کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ آجروں اور مزدوروں دونوں کے لیے

لازمی ہے اور دونوں کو اس سے چندے میں شریک ہونا ہے۔ اس کے تحت وہ سارے ملازمین آتے ہیں جن کی ایک سال کی مسلسل ملازمت پوری ہو چکی ہے اور جن کا مشاہرہ مع الاؤنس ایک ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ آجر اور مزدور دونوں کو مزدوروں کے مشاہرے کا ۶¼ فی صدی چندہ دینا ہے۔ یہ ایکٹ جموں اور کشمیر کو چھوڑ کر باقی سارے ملک پر نافذ ہے۔

نومبر ۱۹۶۲ء کی ترمیم کے مطابق مرکزی حکومت کو اختیار مل گیا کہ اگر تفتیش کے بعد وہ ضروری سمجھے تو پراوڈنٹ فنڈ کے چندے کی شرح ۶¼ فی صدی سے بڑھا کر ۸ فی صدی کر سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چندے کی کم سے کم شرح ۶¼ فی صدی ہے لیکن حکومت اعلان کر کے کسی صنعتی یونٹ کے چندے کی شرح ۸ فی صدی کر سکتی ہے۔ اس اختیار کے تحت مرکزی حکومت جنوری ۱۹۶۳ء سے چندے کی زائد شرح کا نفاذ مزید صنعتوں پر کرتی رہی ہے۔

اسکیم کی تعمیل یکم نومبر ۱۹۵۲ء سے شروع ہوئی۔ اس وقت سے آجروں اور مزدوروں کا چندہ پراوڈنٹ فنڈ اکاؤنٹ میں جمع ہوتا رہا ہے۔ فی الحال حکومت اسکیم کی نگرانی ایک مرکزی بورڈ آف ٹرسٹیز کے ذریعے کرتی ہے لیکن اسکیم کو لامرکزی بنانے کی تجویز پر جلد فیصلہ کیا جائے گا۔ نومبر ۱۹۶۹ء تک یہ ایکٹ ۱۱۲ صنعتوں اور اداروں کو اپنے حصار میں لے چکا تھا اور ۵۰ لاکھ ۹۶ ہزار مزدور اس سے استفادہ کر رہے تھے۔ پراوڈنٹ فنڈ کی مجموعی رقم ۱۰۴۸ کروڑ ۳۶ لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔

ہندوستان میں سوشل سیکیورٹی کے میدان میں یہ اسکیم یقیناً ایک اضافہ ہے۔ اس سے مزدوروں کا کام کرنے کا جذبہ بڑھے گا جس سے صنعتی امن کے قیام میں اور محنت کے محاذ کے استحکام میں مدد ملے گی۔ اس سلسلے میں یہ بھی ذکر کر دینا چاہیے کہ مرکزی حکومت نے یکم جولائی ۱۹۶۸ء سے ایک پبلک پراوڈنٹ فنڈ قائم کر دیا ہے۔ امپلائیز پراوڈنٹ فنڈ کی اسکیم کے لازمی چندے کے برعکس پبلک پراوڈنٹ فنڈ کے چندے کی ادائیگی میں وقت کی پابندی نہیں ہے۔ یہ اسکیم خاص کر آرٹسٹوں، وکیلوں، ڈاکٹروں اور چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ جیسے خود روزگار (SELF EMPLOYED) لوگوں کے لیے جو کسی کے ملازم نہیں ہیں۔ اپنی ماہیت کے اعتبار سے یہ رضاکارانہ اور نان کنٹری بیوٹری ہے۔

پراوڈنٹ فنڈ اور امپلائیز اسٹیٹ انشیورنس اسکیموں کی توسیع اس طرح ہونی چاہیے کہ جس سے مستقبل میں ایک مکمل سوشل سروس کا نظام قائم کرنے کے لیے زمین ہموار ہو سکے۔ یاد رہے کہ سوشل سیکیورٹی سروس کا مکمل نظام ایک فلاحی ترقیاتی منصوبہ بندی کے پروگرام کا سنگِ بنیاد ہے۔

سوشل سیکیورٹی کا ایک زیادہ وسیع پروگرام مینن کمیٹی کے خیالات اور نئی اسکیمیں

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ حکومت نے سوشل سیکیورٹی سے متعلق جو اقدام کیے ہیں اُن سب کی تشکیل اور تعمیل الگ الگ کی گئی جس کی وجہ سے ان میں بے ترتیبی اور دُہراپن (DUPLICATION) پایا جاتا ہے۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ کسی واحد ادارے کے تحت ان اسکیموں کو مربوط کیا جائے۔ اس سے نہ صرف کارکردگی بڑھے گی اور کفایت ہوگی بلکہ سوشل سیکیورٹی کے پروگراموں کو منصوبوں کے مختلف پہلوؤں سے ہم آہنگ کیا جا سکے گا۔ خوشی کی بات ہے کہ وی۔ کے۔ کرشنا مینن کی صدارت میں سوشل سیکیورٹی کے ایک اسٹڈی گروپ نے دسمبر ۵۸ء میں ایک دلچسپ رپورٹ حکومت کے سامنے پیش کی جس میں سوشل سیکیورٹی کی اسکیموں کو مربوط کرنے سے متعلق اہم سفارشات ہیں۔ اِس کی بنیادی سفارش یہ ہے کہ امپلائیز اسٹیٹ انشیورنس اسکیم اور امپلائیز پراوڈنٹ فنڈ اسکیم کو مِلا دِیا جائے اور اس کو چلانے کے لیے ایک مرکزی ادارہ قائم کیا جائے۔ کمیٹی کا خیال ہے کہ دونوں اسکیموں کو ایک کردینے کی وجہ سے مزدوروں اور آجروں پر جو مزید مالی بار پڑیگا وہ ان ذمہ داریوں سے زائد نہیں ہوگا جو موجودہ قوانین نے ان پر عائد کر رکھی ہیں۔ ۵۸ء کی وزرائے محنت کی کانفرنس نے مینن کمیٹی کی مربوط سوشل سیکیورٹی اسکیم کی بنیادی سفارشات کی پوری تصدیق کی۔

کمیٹی کی ایک دوسری سفارش یہ ہے کہ آجروں کے عطیوں (GRADUITY) کو قانونی شکل دے دی جائے اور آجر اس رقم کو پنشن اور عطیوں کی مخلوط اسکیم میں چندے کی شکل میں جمع کریں۔ پراوڈنٹ فنڈ کو ایک قانونی پنشن اسکیم میں بدل دیا جائے۔ اِس سے یہ فائدہ ہوگا کہ کچھ رقم مزدوروں کو عطیے کی شکل میں دے دی جائیگی اور باقی رقم پنشن جیسے فائدے زیادہ سے زیادہ فراہم کرنے پر صرف ہوگی۔ معقول پنشن دینے کے وسائل میں اضافے کے لیے یہ تجویز ہے کہ پراوڈنٹ فنڈ کے چندے کی موجودہ شرح ۶¼ فی صدی سے بڑھا کر ۸ فی صدی کر دی جائے۔ اِس موقع پر بھی کمیٹی نے پنشن، پراوڈنٹ فنڈ اور عطیوں کی اسکیم کو مربوط کرنے کی کوشش کی۔

مینن کمیٹی کی سفارشات کے مطابق حکومت نے حال میں مزدوروں کے لیے سوشل سیکیورٹی کی زیادہ جامع اسکیم کا اعلان کیا جس کے تحت خاندان کے لیے پنشن، رِٹائرمنٹ بِنی فِٹ پنشن اور ڈِتھ رلیف فنڈ کا اہتمام کیا گیا۔ ڈِتھ رلیف فنڈ جنوری ۶۴ء سے جاری ہوا۔ اِس کے تحت اگر کوئی مزدور مر جاتا ہے تو اُس کے خاندان والوں کو ۵۰۰ روپے ادا کیے جائیں گے چاہے اتنی رقم اُس کے

پراوڈنٹ فنڈ میں ہو یا نہ ہو۔ اگر اس کے پراوڈنٹ فنڈ میں اس سے زیادہ رقم ہے تو باقی کی ادائگی بعد میں حسب قاعدہ کی جائے گی۔ فیملی پنشن اسکیم کے مطابق مرنے والے مزدور کی بیوی کو تا زندگی ۵۰ روپے ماہوار ادا ہونگے۔ اس کے بچوں کو بھی ایک معینہ مدت تک پنشن دی جائے گی۔ رٹائرمنٹ پنشن سکیم بھی زیرغور ہے اس کے نفاذ میں ابھی وقت لگے گا۔ خیال یہ ہے کہ مزدور کو سبکدوشی کے وقت باقیماندہ زندگی کے لیے پنشن دی جائے اور ایک رقم یک مشت ادا کی جائے۔

مینن کمیٹی کی سفارشات نے بھی یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح سوشل سیکیورٹی کے اقدام کو زیادہ جامع اور بھرپور بنایا جاسکتا ہے۔ اُمید ہے حکومت بہت جلد امپلائمنٹ انشورنس ایکٹ، امپلائیز پراوڈنٹ فنڈ ایکٹ، کول مائنز پراوڈنٹ فنڈ ایکٹ اور آسام پلانٹیشن ایکٹ میں تال میل پیدا کرنے اور اُس کے مجموعی انتظام کے لیے ایک ایجنسی قائم کرے گی لیکن یہ بھی تال میل کی طرف پہلا قدم ہوگا کیونکہ رابطہ پیدا کرنے کا عمل اُس وقت تک نہیں مکمل ہو سکتا جب تک حکومت سوشل انشیورنس کی ایک مکمل اسکیم نہیں تیار کرتی اور اسے سوشل سیکیورٹی کے پروگرام سے مُنسلک نہیں کرتی۔

صنعتی رہائشی اِنتظام

سوشل سیکیورٹی کے اقدام کے ساتھ مزدوروں کی بہبود اور ان کے لیے رہائشی مکانات کی امدادی اسکیمیں بھی ہوں گی۔ رہائشی مکانوں اور بہبود کے پروگرام ہمارے پانچ سالہ منصوبوں میں نمایاں رول ادا کر رہے ہیں۔ ترقیاتی منصوبہ بندی کے دوران صنعتی ترقی اور شہروں کے پھیلنے کا عمل تیز ہوگا رہائش کے خراب انتظام کا اثر مزدوروں کی کارکردگی اور صحت پر پڑتا ہے۔ فلاحی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ مزدوروں کے لیے مناسب اور سستے مکانوں کا اہتمام کرے۔ مکانات تعمیر کرنے کے پروگرام کو محنت، آلات اور سرمائے کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے، اس کے علاوہ یہ پروگرام تب ہی کامیاب ہو سکتا ہے جب یہ ملک کی معاشی ترقی کے مجموعی پروگرام اور حتی الامکان مُستقبل کی سماجی ضروریات کے مطابق ہو۔ مزید یہ کہ رہائشی پروگرام کو روزگار کے پروگرام سے مُنسلک ہونا چاہیے۔ ہمارے جیسے ملک میں جہاں کام کرنے والوں کی زیادتی ہے مکانات کی تعمیر روزگار بڑھانے کے منصوبہ بند پروگرام کا ایک لازمی جزو ہے۔

مکانات بنانے کی سرکاری اسکیمیں: ۱۹۶۹ء میں وزارت محنت نے ایک اسکیم تیار کی

جس کے تحت صوبائی حکومتوں اور نجی آجروں کو منظور شدہ رہائشی اسکیموں کے لیے مصارف کا دو تہائی حصہ بطور قرض مل سکتا تھا جس پر کوئی سود نہیں تھا۔ مصارف کا باقی ایک تہائی حصہ آجروں اور صوبائی حکومتوں کو خود فراہم کرنا تھا۔ اسکیم زیادہ کامیاب نہیں ہوئی کیونکہ صوبائی حکومتوں کو جو رقم دی گئی وہ اُسے استعمال نہیں کر سکیں۔ ستمبر ۱۹۵۲ء میں پلاننگ کمیشن کی سفارش کے مطابق صنعتی رہائش گاہوں کی امدادی اسکیم شروع کی گئی۔ اِس کے تحت تین قسم کے مکانوں کے لیے امدادی قرض مل سکتا تھا: (۱) جو مکانات صوبائی حکومتوں اور امپرومنٹ ٹرسٹ تیار کریں (۲) مزدوروں کے لیے جو مکانات کوآپریٹیو ہاؤسنگ سوسائٹیاں بنائیں (۳) جو مکانات آجر اپنے مزدوروں کے لیے بنائیں۔ پہلے پلان کے دوران صنعتی مکانات بنانے کے لیے ۱۳٫۲۹ کروڑ روپے استعمال ہوئے۔ دوسرے پلان میں جنوری ۱۹۶۱ء تک اسکیم کے تحت ۵۵۸۲۹ مکانات تعمیر ہوئے اور ان پر ۲۲٫۹۵ کروڑ روپے خرچ ہوئے۔ یہ اسکیم اور زیادہ کامیاب ہوتی اگر کرائے کی امدادی شرح مزدوروں کی ادائیگی کی استعداد سے اِتنی زیادہ نہ ہوتی۔ کرایہ زیادہ ہونے کی وجہ سے بہت سے مکانات خالی پڑے رہے۔ تیسرے پلان میں اس اسکیم کے تحت ۲۹٫۶۸ کروڑ روپے فراہم کیے گئے اور ۷۲۰۰۰ مکانات کا نشانہ متعین ہوا۔ دسمبر ۱۹۶۷ء تک ۱۸۶۳۳۵ مکانوں کی تعمیر کے لیے ۹۰٫۴۷ کروڑ روپے منظور کیے جا چکے تھے۔ اِس سلسلے میں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ معاشی اعتبار سے سماج کے کمزور طبقے کے لیے کرائے کے مکان کا پروگرام جو لو انکم گروپ ہاؤسنگ اسکیم کے تحت شروع کیا گیا تھا اُس کو اپریل ۱۹۶۶ء میں صنعتی مکانات کی امدادی اسکیم میں مدغم کر دیا گیا۔

غرضیکہ جب ہم ترقیاتی منصوبہ بندی کے دوران رہائشی مکانات کی امدادی اسکیم کی ترقی پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت کی عام دلچسپی اور مُسابقت کے باوجود آجروں اور صنعتی کوآپریٹیوز کا ردِ عمل ہمت افزا نہیں رہا ہے۔ ہماری رائے ہے کہ پرائیویٹ سکٹر کی ہر صنعت کے لیے ایک جوائنٹ ہاؤسنگ کمیٹی قائم ہونی چاہیے جس میں حکومت، آجروں اور مزدوروں کے نمائندے ہوں۔ اِس طرح رہائشی مکانات کی اسکیموں کے لیے باہمی تعاون اور مشترک اِنتظام ممکن ہو سکے گا جس کی وجہ سے مزدوروں کے مکانات جلد تعمیر ہو سکیں گے۔

مزدوروں سے متعلق پانچ سالہ منصوبوں کی پالیسی اور پروگرام مزدور طبقے کی فلاح اور بہبود کے لیے بنائے گئے ہیں تاکہ مزدوروں کی کارکردگی اور پیداآوری میں اِضافہ ہو۔ پہلے پلان کے دوران حکومت نے مزدوروں کی حالت سدھارنے کے لیے کچھ اہم اقدام کیے۔ اِس پلان کے دوران مزدوروں سے متعلق پروگراموں کی کامیابی کی وجہ سے صنعتی روابط بہتر ہوئے، مزدوروں کی آمدنی بڑھی، سوشل

سیکیورٹی میں توسیع ہوئی اور مکانوں کی تعمیر کا پروگرام آگے بڑھا۔ لیکن پہلے پلان کی لیبر پالیسی کی بنیادی خامی یہ تھی کہ سوشل سیکیورٹی کے اور مزدوروں کی بہبود کے جامع پروگرام کو ترقیاتی منصوبہ بندی کے مختلف پہلوؤں سے مُنسلک کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلے پلان کے فلاحی اقدام، جن میں سوشل سیکیورٹی کی اسکیمیں بھی شامل ہیں، بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ انھیں غیر مربوط طریقے کے ذریعے اُوپر سے عائد کیا گیا تھا۔

دوسرے پلان میں لیبر پروگرام کے لیے ۲۹ کروڑ روپے رکھے گئے اور کوشش کی گئی کہ ہندوستان کی ترقی میں مزدوروں کا حصّہ بڑھایا جائے اور مزدوروں کی تحریک کو تقویت دی جائے لیکن دوسرے پلان کی لیبر پالیسی کی یہ خامی تھی کہ یہ جامع اور مربوط نہیں تھی۔ تمام پالیسی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تشکیل دی گئی تھی اور برسرِ اقتدار لوگوں کے اُن خیالات اور نظریوں کی عکاسی کرتی تھی جو ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ ٹریڈ یونین تحریک کو تقویت دینے کے لیے دوسرے پلان کا مقصد یہ تھا کہ کچھ شرائط کے تحت ٹریڈ یونینوں کو تسلیم کیا جائے اور اُن کی مالی حالت بہتر کی جائے۔ صنعتی امن کے بارے میں دوسرے پلان نے مصالحت اور ثالثی کے طریقوں پر زور دیا۔ بدقسمتی سے اجتماعی سودے کو جو اہمیت دی جانی چاہیے تھی وہ نہیں دی گئی۔ ہمارے خیال میں یہ بہت بڑی غلطی تھی کیونکہ صنعتی جھگڑوں کے تصفیے کے لیے اجتماعی سودے کی ہمت افزائی کرنا ٹریڈ یونین کو تقویت دینے کی پالیسی کا منطقی نتیجہ ہے۔

دوسرے پلان کے فلاحی پروگرام میں ایک نئی تجویز یہ تھی کہ انتظامی امور میں مزدوروں کو شریک کیا جائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے دوسرے پلان کے دوران زیادہ سے زیادہ صنعتوں میں انتظامی کونسلیں بنائی جائیں جن میں مزدوروں، ماہروں اور منتظمین کے نمائندے ہوں۔ دوسرے پلان کے دَوران عملاً ۲۰ جوائنٹ کونسلیں قائم ہوئیں۔ اگرچہ اِن کونسلوں کا اِنتظامی ڈھانچہ مشرقی یورپ کے ملکوں کی مؤثر کونسلوں سے بہت ملتا جلتا ہے لیکن ہماری کونسلیں مؤثر انتظامی اختیارات نہیں رکھتیں۔ یوگوسلاویہ کی مزدور کونسل بہت مؤثر اور صاحبِ اختیار جماعت ہے۔ اِس سے مزدوروں کی خود اظہاری کی خواہش کی تسکین ہوتی ہے اور صنعتی جمہوریت کا بنیادی ڈھانچہ مضبوط ہوتا ہے۔ اِس کے برعکس ہندوستان کی جوائنٹ کونسلوں کا کام صرف اظہارِ خیال، بحث و مباحثہ اور سفارش کرنے تک محدود ہے۔

دوسرے پلان میں اُجرتوں کو پیداآوری سے مُنسلک کرنے کی بے حد کوشش کی گئی۔ دعویٰ یہ تھا کہ اُجرت میں اِضافہ صرف پیداوار میں اضافے کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ دوسرے

پلان کے دوران چند منتخب صنعتوں میں ایک مخصوص قسم کی لیبر انشیورنس اسکیم چلانی چاہیے تھی جس کے تحت زیادہ پیداآور اور کارکرد مزدوروں کو زائد فائدے حاصل ہوتے۔ لیبر انشیورنس اس مخصوص اسکیم کو سوشل سیکیورٹی کے اقدام کے حلقے میں لے آنے سے سوشل سیکیورٹی کے پروگراموں کو مزدوروں کی پیداآوری بڑھانے کی اسکیموں سے مربوط کرنے میں مدد ملتی۔ ہماری رائے ہے کہ چوتھے پلان کے دوران اِس سلسلے میں کچھ کرنا چاہیے۔ جہاں تک اُجرت کی پالیسی کا تعلق ہے' دوسرے پلان میں کئی طریقے تجویز ہوئے جن میں ویج کمیشن کے تقرر' مختلف مراکز کے مصارف زندگی کے موجودہ اِنڈکسوں پر نظر ثانی اور اُجرت شماری (WAGE CENSUS) کے لیے سہ پارٹی ویج بورڈوں کے قیام کی تجویزیں شامل ہیں۔ دوسرے پلان کے ختم تک چھ صنعتوں کے لیے قومی سطح کے ویج بورڈ قائم کردیے گئے تھے لیکن یہاں بھی اتحادِ عمل اور تال میل کی وہی کمی تھی جو دوسرے معاملوں میں تھی۔

یوں تو تیسرے پلان کی لیبر پالیسی دوسرے پلان کی لیبر پالیسی کی توسیع تھی لیکن اِس میں مزدوروں کی تعلیم اور اِنتظام میں ان کی شرکت پر زور دیا گیا تھا۔ یہ پالیسی نہ صرف صنعتی جمہوریت کی تعمیر کے لیے موافق تھی بلکہ اس کی وجہ سے کاروبار سے متعلق لوگوں میں ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ سمجھ پیدا ہوئی۔

اگرچہ تیسرے پلان میں بھی صنعتی روابط کی تنظیم کے لیے اجتماعی سودے کو ترقی دینے کا کوئی واضح اور یکساں اصول نہیں نظر آتا تاہم اِس پلان میں جھگڑوں کے تصفیے کے لیے لازمی ثالثی کے بجائے رضاکارانہ ثالثی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت نے تیسرے پلان کے دوران بہبود اور کارکردگی کے ایک ضابطے کا اعلان کرنے کا فیصلہ کیا جو اُس ضابطے کا ایک تکملہ تھا جو آجروں اور مزدوروں کی رضاکارانہ منظوری کے بعد جاری کیا گیا تھا۔

مختصر یہ کہ تیسرے پلان کی لیبر پالیسی صنعتی جمہوریت کے اصولوں پر مبنی تھی جس کا مطلب عملاً یہ تھا کہ حکومت کم سے کم مداخلت کرے اور مزدوروں اور منتظمین کے درمیان زیادہ سے زیادہ تعاون ہو۔ اِس بنیادی اصول کے تحت تیسرے پلان میں ایسی تجاویز پر زیادہ زور دیا گیا جیسے بہبود اور کارکردگی کے ضابطے کی تعمیل' اِنتظام میں مزدوروں کی شرکت' مزدوروں کی تعلیم کے پروگرام' ٹریبونل اور عدالتوں کا کم سے کم استعمال اور فریقین کے جھگڑوں کے تصفیے کے لیے رضاکارانہ ثالثی کا زیادہ سے زیادہ اطلاق۔

صنعتی جمہوریت کا راستہ اختیار کرکے تیسرے پلان کی لیبر پالیسی مزدوروں اور ٹریڈ یونینوں کے لیے ایک چیلنج بن گئی۔ ہمیں یقین ہے کہ چوتھے پلان کی لیبر پالیسی صرف منظم اور منضبط مزدوروں اور ان کی حب الوطنی کے ذریعے موثر بنائی جا سکتی ہے۔

لیکن چوتھے پلان کے لیے ملک کی لیبر پالیسی کا سب سے نمایاں فیچر یہ ہے کہ مستقبل میں اُجرت کے اضافے کو پیداوار کی اونچی سطح سے منسلک کرنا ضروری ہے۔ یہ اس لیے اور بھی اہم ہے کہ چوتھے پلان کا سب سے اہم مقصد قیمتوں کو مستحکم رکھنا ہے۔

لیبر پالیسی کا دوبارہ تجزیہ اور نیشنل لیبر کمیشن

وقتاً فوقتاً یہ تجویز کی جاتی رہی ہے کہ لیبر پالیسی پر از سر نو نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اوائل لیبر کمیشن نے ۱۹۳۱ء میں اپنی رپورٹ پیش کی تھی۔ بعد میں لیبر انویسٹی گیشن کمیٹی نے ۱۹۴۶ء میں تازے اعداد شمار اکٹھا کیے۔ آزادی کے بعد سے صنعتی منظر میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ صنعتی پیداوار میں نمایاں تنوع پیدا ہوا ہے اور صنعت کے میدان میں سرکار کی شرکت ایک نیا اور اہم واقعہ ہے۔ انتظام کا ڈھانچہ بہت کچھ بدلا ہے، غالباً مزدور طبقے کے ڈھانچے سے بھی زیادہ۔ آنے والے برسوں میں مزدور تحریک کی ماہیت اور اس کی ترکیب میں اہم تبدیلیاں آئیں گی۔ معیشت میں بحیثیت مجموعی دوسری اہم تبدیلیاں رونما ہونگی۔ ان باتوں کے پیش نظر حکومت نے دسمبر ۱۹۶۶ء میں ۱۶ ممبروں پر مشتمل نیشنل لیبر کمیشن مقرر کیا جس کے صدر سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس مسٹر پی بی گجیندر گڈکر تھے۔ یہ کمیشن ان تبدیلیوں کا مطالعہ کرے گا جو آزادی کے بعد سے مزدوروں کی حالت میں پیدا ہوئی ہیں اور مزدوروں کی موجودہ حالت کے بارے میں رپورٹ پیش کرے گا۔ توقع ہے کہ کمیشن اپنی سفارشات ۱۹۶۹ء کے ختم تک حکومت کو پیش کر دے گا۔

پانچویں حصے کا ضمیمہ

الف ۔ صنعتی پیداوار کی منتخب علامتیں

ٹیبل ۵-۱

پیداواری اشیا کی پیداوار میں حاصل کی گئی ترقی (سنہ ۱۹۵۰-۵۱ء سے لے کر سنہ ۱۹۶۰-۶۱ء تک)

اشیا	سنہ ۱۹۵۰-۵۱ء	سنہ ۱۹۶۰-۶۱ء
فولاد کے ڈلے	۴ ر ۱۰ لاکھ ٹن	۳۵ لاکھ ٹن
الومنیم	۶ ر ۳ ہزار ٹن	۵ ر ۱۸ ہزار ٹن
ڈیزل انجن	۵۵ ہزار	۴۰ ہزار
الکٹرک کیبل	۷ ر ۱ ہزار ٹن	۲۲ ہزار ٹن
نائٹروجن کھاد	۹۰ ہزار ٹن	۱۱۰ ہزار ٹن
سلفورک ایسڈ	۹۹ ہزار ٹن	۳۶۳ ہزار ٹن
سیمنٹ	۷ ر ۲۰ لاکھ ٹن	۵ ر ۸۰ لاکھ ٹن
کوئلہ	۳۲۰ لاکھ ٹن	۵۵۰ لاکھ ٹن
خام لوہا	۳۰ لاکھ ٹن	۵ ر ۱۰۰ لاکھ ٹن

SOURCE: THIRD FIVE YEAR PLAN REPORT (1961)

ٹیبل ۵-۲

صرفی اشیا کی پیداوار میں حاصل کی گئی ترقی (سنہ ۱۹۵۰-۵۱ء سے لے کر سنہ ۱۹۶۰-۶۱ء تک)

اشیا	سنہ ۱۹۵۰-۵۱ء	سنہ ۱۹۶۰-۶۱ء
کارخانوں میں بنا سوتی کپڑا	۲ ر ۳ کروڑ گز	۷ ر ۵۱۲ کروڑ گز
شکر *	۱ ر ۱۰ لاکھ ٹن	۳۰ لاکھ ٹن
کاغذ اور گتا	۱۱۴ ہزار ٹن	۳۵۰ ہزار ٹن
سائکلیں (منظم سکٹر میں)	۱۰۱ ہزار	۱۰۵۰ ہزار
موٹر گاڑیاں	۵ ر ۱۶ ہزار	۵ ر ۵۳ ہزار

SOURCE: THIRD FIVE YEAR PLAN REPORT (1960-61)

* اکتوبر نومبر کے فصلی سال

ٹیبل ۵—۳

صنعتی پیداوار کا انڈکس نمبر (بنیاد ۱۰۰ = ۱۹۵۶)

	۱۹۵۱	۱۹۵۵	۱۹۶۰	۱۹۶۱	۱۹۶۲	۱۹۶۵	۱۹۶۶
عام انڈکس	۷۳٫۰	۹۲٫۳	۱۳۰٫۲	۱۳۹٫۳	۱۵۰٫۰	۱۸۹٫۹	۱۹۱٫۵
کانکنی	۸۶٫۰	۹۶٫۱	۱۲۶٫۲	۱۳۶٫۳	۱۴۱٫۲	۱۸۴٫۳	۱۹۰٫۴
غذائی اشیا بنائی گئیں	۷۹٫۶	۹۳٫۳	۱۱۶٫۴	۱۲۹٫۳	۱۲۶٫۴	۱۴۴٫۴	۱۳۶٫۸
سگرٹ	۸۱٫۶	۸۶٫۸	۱۴۰٫۶	۱۵۰٫۰	۱۵۵٫۷	۲۰۵٫۸	۲۲۲٫۵
سوتی کپڑے *	۷۹٫۱	۸۵٫۲	۱۰۳٫۹	۱۰۹٫۰	۱۰۹٫۶	۱۲۳٫۲	۱۱۹٫۹
اونی کپڑے	۷ ٫۷	۸۳٫۲	۱۰۱٫۳	۱۰۶٫۳	۱۳۸٫۴	۱۱۰٫۱	۱۰۲٫۰

* (VISCOSE YARN)، اسٹیپل فائبر اور (ACETATE YARN) شامل ہے۔

SOURCE : (1) THIRD FIVE YEAR PLAN (1961)

(2) SUPPLEMENT TO RESERVE BANK OF INDIA BULLETIN, JANUARY, 1968.

ٹیبل ۵-۴

لوہے اور فولاد کی پیداوار (ہزار ٹن)

سال	خام لوہا	تیار فولاد
۱۹۰۰	۳۵	–
۱۹۳۹	۱۸۳۵	۸۴۸
۱۹۵۰	۱۵۶۲	۱۰۰۴
۱۹۵۶	۱۸۰۷	۱۳۳۸
۱۹۵۷	۱۷۸۹	۱۳۴۶
۱۹۵۸	۲۰۰۳	۱۳۰۰
۱۹۵۹	۳۱۳۰	۱۷۱۱
۱۹۶۰	۴۱۶۲	۲۲۶۳
۱۹۶۱	۴۹۸۰	۲۸۱۰
۱۹۶۲	۵۷۹۶	۳۷۰۸
۱۹۶۳	۶۶۰۳	۴۲۵۷
۱۹۶۴	۶۵۹۳	۴۳۴۳
۱۹۶۵	۶۹۵۲	۴۵۲۹
۱۹۶۶	۷۰۴۱	۴۴۹۱
۱۹۶۷	۷۰۱۰*	۴۱۳۵

* سنہ ۶۶-۶۷ء سے متعلق

ٹیبل ۵-۵

کوئلے کی پیداوار (لاکھ ٹن)

سال	پیداوار
۱۹۴۷	۳۰۰
۱۹۵۱	۳۴۲٫۱
۱۹۵۶	۳۹۴٫۰
۱۹۵۷	۴۳۵٫۱
۱۹۵۸	۴۵۳٫۰
۱۹۵۹	۴۷۱٫۰
۱۹۶۰	۵۲۶٫۰
۱۹۶۱	۵۶۱٫۰
۱۹۶۲	۶۳۸٫۳
۱۹۶۳	۶۷۲٫۱
۱۹۶۴	۶۴۵٫۲
۱۹۶۵	۶۷۱٫۱
۱۹۶۶	۶۷۷٫۴
۱۹۶۷	۶۷۴٫۱

SOURCE: PROGRAMME OF INDUSTRIAL DEVELOPMENT (1961-66)

(2) FOURTH FIVE YEAR PLAN NEW DRAFT (MARCH 1969)

SOURCE: (1) PROGRAMME OF INDUSTRIAL DEVELOPMENT (1961-66)

(2) ANNUAL REPORT OF THE INDIAN COAL MINE ASSOCIATION

ٹیبل ۵-۶

سوتی دھاگے اور کپڑے کی پیداوار

سال	دھاگہ (لاکھ پونڈ)	کپڑا (لاکھ گز)
۱۹۴۷	۱۲۹۶۰	۳۷۶۲۰
۱۹۵۱	۱۳۰۴۰	۴۰۷۶۰
۱۹۵۶	۱۶۷۱۲	۵۳۰۶۶
۱۹۵۷	۱۷۸۰۱	۵۳۱۷۴
۱۹۵۸	۱۶۸۵۴	۴۹۲۷۰
۱۹۵۹	۱۷۲۲۸	۴۹۲۵۴
۱۹۶۰	۱۷۳۷۱	۵۰۴۸۳
۱۹۶۱	۱۸۸۷۵	۵۱۲۷۰
۱۹۶۲	۱۸۹۲۹	۴۹۸۸۳
۱۹۶۳	۲۱۷۸۴	۵۱۳۷۷
۱۹۶۴	۲۷۶۲۱	۵۳۱۰۲
۱۹۶۵	۲۶۹۹۵	۵۱۹۸۷
۱۹۶۶	۲۶۱۰۵	۵۰۹۹۲

SOURCE: (1) PROGRAMME OF INDUSTRIAL DEVELOPMENT (1961-66)
(2) ANNUAL REPORTS OF INDIAN COTTON MILLS ASSOCIATION

ٹیبل ۵-۷

جوٹ کے سامان کی پیداوار

(ہزار ٹن)

سال†	پیداوار*
۱۹۴۷	۱۰۵۲
۱۹۵۱	۸۷۵
۱۹۵۶	۱۰۹۳
۱۹۵۷	۱۰۳۰
۱۹۵۸	۱۰۶۲
۱۹۵۹	۱۰۵۲
۱۹۶۰	۱۰۸۸
۱۹۶۱	۹۷۰
۱۹۶۲	۱۲۳۶
۱۹۶۳	۱۲۸۹
۱۹۶۴	۱۳۲۴
۱۹۶۵	۱۳۳۵
۱۹۶۶	۱۳۹۹
۱۹۶۷	۱۲۳۸

† جولائی تا جون جوٹ کے سال سے متعلق اعداد و شمار۔

* ۱۹۵۸ء اور آگے کے اعداد و شمار ان کارخانوں کی پیداوار ہیں جو انڈین جوٹ مل ایسوسیشن کے رکن تھے۔ ان کے علاوہ ایک غیر رکن کارخانہ بھی شامل ہے۔

SOURCE: (1) PROGRAMME OF INDUSTRIAL DEVELOPMENT (1960-61)
(2) ANNUAL REPORTS (1951-67) OF I.J.M.A.

ٹیبل ۵—۸

چائے کی پیداوار

سال	کاشت کا رقبہ (ہزار ایکڑ)	پیداوار (ہزار پونڈ)
۱۹۴۷	۷۶۶	۵۶۱۷۴۰
۱۹۵۱	۷۸۲	۶۴۱۰۷۹
۱۹۵۵	۷۹۱	۶۷۸۲۷۱
۱۹۵۶	۷۹۲	۶۸۰۶۱۰
۱۹۵۷	۷۹۹	۶۸۵۱۳۷
۱۹۵۸	۸۰۹	۷۱۷۰۹۶
۱۹۵۹	۸۱۳	۷۱۹۶۸۱
۱۹۶۰	۸۳۲	۷۰۶۰۰۰
۱۹۶۱	-	۷۶۰۰۰۰
۱۹۶۲	-	۷۴۰۰۰۰
۱۹۶۳	-	۷۵۹۰۰۰
۱۹۶۴	-	۷۸۴۰۰۰
۱۹۶۵	-	۷۷۲۰۰۰
۱۹۶۶	-	۸۲۹۰۰
۱۹۶۷	-	۷۴۳۰۰

ٹیبل ۵—۹

شکر کی صنعت کی ترقی

سال	کارخانوں کی تعداد	شکر کی پیداوار (ہزار ٹن)
۱۹۵۰—۵۱	۱۳۹	۱۱۱۶
۱۹۵۶—۵۷	۱۴۷	۲۰۳۹
۱۹۵۷—۵۸	۱۵۸	۱۹۷۸
۱۹۵۸—۵۹	۱۶۴	۱۹۱۸
۱۹۵۹—۶۰	۱۷۰	۲۴۲۰
۱۹۶۰—۶۱	۱۷۵	۳۰۲۹
۱۹۶۱—۶۲	۱۷۲	۲۷۳۰
۱۹۶۲—۶۳	۱۷۰	۲۱۵۲
۱۹۶۳—۶۴	۱۷۱	۲۵۶۷
۱۹۶۴—۶۵	۱۷۲	۳۲۶۱
۱۹۶۵—۶۶	۱۷۱	۲۵۵۶
۱۹۶۶—۶۷	۱۷۱	۲۲۱۳
۱۹۶۷—۶۸	۱۷۱	۲۲۰۱
۱۹۶۸—۶۹	۱۷۱	۳۲۰۶

SOURCE: (1) BULLETIN OF THE INDIAN TEA BOARD
(2) STATISTICAL BULLETIN OF THE INTERNATIONAL TEA COMMITTEE

SOURCE: ANNUAL REPORT OF THE INDIAN SUGAR MILLS ASSO-CIATION.

(ب) ہندوستانی منصوبہ بندی کے پہلے دس برسوں کی خاص باتیں

ٹیبل ۵ — ۱۰

پہلے پلان میں منظم صنعتوں کے مجموعی مصارف کی صنعت وار تفصیل (نجی اور سرکاری سکٹر)

	پہلے پلان کے تحت تخمینہ (کروڑ روپے)	واقعی جتنا سرمایہ لگا (تخمینہ کروڑ میں)
مٹلرجکل صنعتیں (لوہا، فولاد، المونیم، سیسہ وغیرہ)	۸۵٫۰	۶۱٫۰
پٹرول	۶۴٫۰	۴۵٫۰
کیمیاوی صنعتیں (بھاری کیمیا اور فرٹلائزرز، دوائیں، رنگ اور پلاسٹک)	۲۶٫۰	۲۷٫۰
انجینیری صنعتیں (بھاری اور ہلکی)	۵۳٫۰	۴۶٫۰
سوتی کپڑے کی صنعت	۹٫۰	۲۰٫۰(A)
شکر کی صنعت	۰٫۱	۵٫۰
ریان کپڑے کی صنعت (مع اسٹیپل فائبر اور کیمیکل پلپ)	۱۶٫۵	۸٫۰
سیمنٹ	۱۷٫۷	۱۷٫۵
کاغذ اور گتا مع اخباری کاغذ	۷٫۴	۱۲٫۰
بجلی کی پیداوار	۱۶٫۰	۳۲٫۶
دیگر	۳۲٫۳	۱۸٫۹
میزان	۳۲۷٫۰	۲۹۳٫۰

(A) بحیثیت مجموعی جتنا سرمایہ لگا مع اس ۸۰ کروڑ کی رقم کے جو توسیع، نئے آلات اور کارخانوں کی تجدید پر صرف ہوئی۔

SOURCE : REVIEW OF THE FIRST FIVE YEAR PLAN (MAY 1957)

ٹیبل ۵–۱۱

دوسرے پلان میں منظم صنعتوں کے مجموعی سرمایہ کاری کی صنعت وار تفصیل

	دوسرے پلان کے لیے پیشین گوئی (کروڑ روپے)	۱۹۶۰–۶۱ کا تجزیہ (کروڑ روپے)
دھات کی صنعتیں (لوہا، فولاد، المونیم اور رفیرو مینگنیز)	۵۰۲ر۵	۷۷۰ر۰
انجنیری صنعتیں (بھاری اور ہلکی)	۱۵۰ر۰	۱۷۵ر۰
کیمیاوی صنعتیں (بھاری کیمیا، فرٹلائزرز، دوائیں، کول کاربن رنگ، پلاسٹک اور کیمیکل پلپ)	۱۳۱ر۰	۱۴۰ر۰
سیمنٹ، الکٹرک پورسلین اور رلفریکیٹریز	۹۳ر۰	۶۰ر۰
پٹرولیم	۱۰ر۰	۳۰ر۰
کاغذ، اخباری کاغذ اور سیکیورٹی پیپر	۵۴ر۰	۴۰ر۰
شکر	۵۱ر۰	۵۶ر۰
سوتی، جوٹ، اون اور سلک کا دھاگہ اور کپڑا	۳۶ر۰	۵۰ر۰
ریان اور اسٹیپل فائبر	۲۴ر۰	۳۴ر۰
دیگر	۴۱ر۵	۱۱۵ر۰
تجدید اور نئے آلات	۱۵۰ر۰	۱۵۰ر۰
میزان	۱۶۲۰ر۰	۱۲۴۴ر۳

SOURCE: THIRD FIVE YEAR PLAN REPORT (1961)

(ج) مخصوص مالیاتی اداروں کے اثاثے اور واجبات

ٹیبل ۵ — ۱۲

انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بینک

واجبات (لاکھ روپے)

	جون ۱۹۶۵	جون ۱۹۶۶	جون ۱۹۶۷
۱- جاری اور بیباق سرمایہ	۱۰،۰۰	۱۰،۰۰	۲۰،۰۰
۲- محفوظ رقمیں اور فنڈ	۸۱	۲،۰۹(a)	۴،۱۴(b)
۳- قرض			
(۱) ریزرو بینک سے	۲،۱۷	۳،۸۴	۵،۲۴
(۲) حکومت ہند سے	۵۵،۰۰	۹۲،۹۰	۱۲۷،۵۰
۴- دوسرے واجبات	۱،۶۷	۹۱	۱،۵۴
میزان	۶۹،۶۵	۱۰۹،۴۴	۱۵۸،۴۴

نوٹ: اعداد و شمار جنرل فنڈ اور ڈیولپمنٹ اسسٹنس فنڈ سے متعلق ہیں۔

(a) ۳ لاکھ پر غیر وصول شدہ منافع شامل ہے۔

(b) ۰،۴ لاکھ پر ڈیولپمنٹ اسسٹنس فنڈ میں غیر وصول شدہ منافع شامل ہے۔

* بینکوں کے پاس کیش اور بیلنس اِس میں شامل ہے۔

اثاثہ (لاکھ روپے)

	جون ۱۹۶۵	جون ۱۹۶۶	جون ۱۹۶۷
۱- لگا سرمایہ			
(۱) سرکاری سیکیورٹیوں میں	۱۱،۱۵	۷،۷۲	۷،۳۹
(۲) دیگر	۹،۷۶	۱۳،۵۷	۲۶،۰۲
۲- قرض اور پیشگی رقمیں			
(۱) شیڈیولڈ بینک اسٹیٹ کو اپریٹیو بینک اور دوسرے مالیاتی ادارے	۵۰،۲۲	۶۲،۹۳	۷۳،۱۸
(۲) صنعتی ادارے	—	۱۹،۸۹	۴۰،۶۰
۳- بل آف اکسچینج اور پرامسری نوٹ جو ڈسکاؤنٹ یا ری ڈسکاؤنٹ کیے گئے	۵	۲،۳۱	۸،۲۶
۴- دوسرا اثاثہ *	۱،۴۲	۲،۰۲	۲،۹۸
میزان	۶۹،۶۵	۱۰۹،۴۴	۱۵۸،۴۴

SOURCE: ANNUAL REPORT OF THE INDUSTRIAL DEVELOPMENT BANK OF INDIA.

ٹیبل ۵—۱۳

تیسرے پلان میں مالیاتی اداروں نے جو امداد منظور کی اور جو ادا کی (کروڑ روپیوں میں)

	قرض		انڈر رائٹنگ اور چندے: معمولی اور ترجیحی حصص		انڈر رائٹنگ اور چندے: ڈبنچرس		میزان		مجموعی امداد	
	منظور	ادا	منظور	ادا	منظور	ادا	منظور	ادا	منظور	ادا
	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
I.D.B.I	۱۱۱٫۵(a)	۷۹٫۴(a)	۱۲٫۲	۱٫۷	۱٫۳	۱٫۳	۱۳٫۵	۳٫۰	۱۲۵٫۰	۷۹٫۴
I.F.C	۱۳۱٫۲ (۲۴٫۵)	۷۸٫۰ (۸٫۸)	۱۳٫۱	۷٫۴	۶٫۷	۵٫۰	۱۹٫۸	۱۲٫۴	۱۵۱٫۰ (۲۴٫۵)	۹۰٫۴ (۸٫۸)
I.C.I.C.I	۸۳٫۰ (۵۶٫۱)	۵۴٫۱ (۳۵٫۵)	۱۴٫۲	۷٫۵	۸٫۹	۳٫۹	۲۳٫۱	۱۱٫۴	۱۰۶٫۱ (۵۶٫۱)	۶۵٫۵ (۳۵٫۵)
S.F.Cs	۹۰٫۵	۶۰٫۲	۸٫۱	۶٫۴	۰٫۶	۰٫۴	۸٫۷	۶٫۸	۹۹٫۲	۶۷٫۰
S.I.D.Cs	۱٫۳	۰٫۶	۱۰٫۸	۵٫۰	—	—	۱۰٫۸	۵٫۰	۱۲٫۱	۵٫۶
ضمنی میزان	۴۱۷٫۵ (۸۰٫۶)	۲۴۹٫۳ (۴۴٫۳)	۵۸٫۴	۲۸٫۰	۱۸٫۵	۱۰٫۶	۷۵٫۹	۳۸٫۶	۴۹۳٫۴ (۸۰٫۶)	۳۰۷٫۹ (۴۴٫۳)
U.T.I	—	—	۳٫۱	۲٫۶	۸٫۰	۶٫۹	۱۱٫۱	۹٫۵	۱۱٫۱	۹٫۵
L.I.C	۱۹٫۷	۱٫۸	۲۵٫۶	۲۰٫۹	۲۶٫۶	۲۳٫۸	۵۲٫۲	۴۴٫۷	۶۸٫۹	۴۶٫۵
ضمنی میزان	۱۹٫۷	۱٫۸	۲۸٫۷	۲۳٫۵	۳۴٫۶	۳۰٫۷	۶۳٫۳	۵۴٫۲	۸۰٫۰	۵۶٫۰
میزان تیسرے پلان کی	۴۳۴٫۲ (۸۰٫۶)	۲۷۱٫۱ (۴۴٫۳)	۸۷٫۱	۵۱٫۵	۵۲٫۱	۴۱٫۳	۱۳۹٫۲	۹۲٫۸	۵۷۳٫۴ (۸۰٫۶)	۳۶۳٫۹ (۴۴٫۳)
میزان دوسرے پلان کی	۱۰۵٫۲	۷۰٫۱					۱۵٫۸	۶٫۳	۱۲۱٫۰	۷۴٫۴

نوٹ ٹیبل ۵ — ۱۳

بریکیٹ کے اندر کے اعداد بیرونی کرنسی قرض سے متعلق ہیں (الف) بینکوں کو ری فائنانس، براہِ راست قرض اور ری ڈس کاؤنٹ پر مشتمل ہے (ب) دوسرے پلان کے اعداد وشمار جو R.C.I، F.C.I، I.C.I.C.I اور S.F.C کی کارروائیوں سے متعلق ہیں جن کا براہِ راست موازنہ تیسرے پلان سے مکمل طور پر نہیں کیا جا سکتا۔

SOURCE: (1) LIFE INSURANCE CORPORATION OF INDIA
(2) ANNUAL REPORT OF THE INDUSTRIAL DEVELOPMENT BANK OF INDIA

(د) صنعتی تعلقات کی خاص باتیں

ٹیبل ۵ — ۱۴

صنعتی جھگڑے (۱۹۶۶–۱۹۲۱)

سال	اسٹرائک اور ہڑتالوں کی تعداد	متاثر مزدوروں کی تعداد	کام کے دِن جو ضائع ہوئے
۱۹۲۱	۳۹۶	۶۰۰,۳۵۱	۶,۹۸۴,۴۲۶
۱۹۲۲	۲۱۳	۳۰۱,۰۴۴	۵,۰۵۱,۷۰۴
۱۹۲۹	۱۴۱	۵۳۱,۰۵۹	۱۲,۱۶۵,۶۹۱
۱۹۳۷	۳۷۹	۶۴۷,۸۰۱	۸,۹۸۲,۰۰۰
۱۹۳۸	۳۹۹	۴۰۱,۰۷۵	۹,۱۹۸,۷۰۸
۱۹۳۹	۴۰۶	۴۰۹,۱۸۹	۴,۹۹۲,۷۹۵
۱۹۴۰	۳۲۲	۴۵۲,۵۳۹	۷,۵۷۷,۲۸۱
۱۹۴۲	۶۹۴	۷۷۲,۶۵۳	۵,۷۷۹,۹۶۵
۱۹۴۶	۱۶۲۹	۱,۹۶۱,۹۴۸	۱۲,۷۱۷,۷۶۲
۱۹۴۷	۱۸۱۱	۱,۸۴۰,۷۸۴	۱۶,۵۶۲,۶۶۶
۱۹۴۸	۱۲۵۹	۱,۰۵۹,۱۲۰	۷,۸۳۷,۱۷۳
۱۹۴۹	۹۲۰	۶۸۵,۴۵۷	۶,۶۰۰,۵۹۵
۱۹۵۰	۸۱۴	۷۱۹,۸۸۳	۱۲,۸۰۷,۰۰۰
۱۹۵۱	۱۰۷۱	۶۹۱,۳۲۱	۳,۸۱۸,۹۲۸
۱۹۵۲	۹۶۳	۸۰۹,۲۴۲	۳,۳۳۶,۹۶۱
۱۹۵۳	۷۷۲	۴۶۶,۶۰۷	۳,۳۸۲,۶۰۸
۱۹۵۴	۸۴۰	۴۷۷,۱۳۸	۳,۳۷۲,۶۳۰
۱۹۵۵	۱۱۶۶	۵۲۷,۷۶۷	۵,۶۹۷,۸۴۸
۱۹۵۶	۱۲۰۳	۷۱۵,۱۳۰	۶,۹۹۲,۰۴۰

سال	اسٹرائک اور ہڑتالوں کی تعداد	متاثر مزدوروں کی تعداد	کام کے دن جو ضائع ہوئے
۱۹۵۷	۱۶۳۰	۸۸۹,۳۷۱	۶,۴۲۹,۳۱۹
۱۹۵۸	۱۵۲۴	۹۲۸,۵۶۶	۷,۷۹۷,۵۸۵
۱۹۵۹	۱۵۳۱	۶۹۳,۶۱۶	۵,۶۳۳,۱۴۸
۱۹۶۰	۱۵۸۳	۹۸۶,۲۶۸	۶,۵۲۶,۵۱۷
۱۹۶۱	۱۳۵۷	۵۱۱,۸۶۰	۴,۹۱۸,۷۵۵
۱۹۶۲	۱۴۹۱	۷۰۵,۰۵۹	۶,۱۲۰,۵۷۶
۱۹۶۳	۱۴۷۱	۵۶۳,۱۲۱	۳,۲۶۸,۵۲۴
۱۹۶۴	۲۱۵۱	۱,۰۰۲,۹۵۵	۷,۹۲۴,۶۹۴
۱۹۶۵	۱۸۳۵	۹۹۱,۱۵۸	۶,۴۶۹,۹۹۲
۱۹۶۶	۲۵۵۶	۱,۴۱۰,۰۵۶	۱۳,۸۴۶,۳۲۹

SOURCE: (1) INDIAN LABOUR YEAR BOOK

(2) INDIAN LABOUR GAZETTES.

حصّہ ششم
مالیاتِ عامّہ

باب ۲۶

ہندوستان کے ٹیکس کے نظام کی اصلاح ـــــ حال کے میزانیوں کے حوالے سے

دوسری جنگ عظیم کے دوران مالیاتِ جنگ کی ہنگامی ضروریات نے ہندوستان کے ٹیکس کے نظام کو بگاڑ دیا۔ جنگی مالیاتی کارروائیوں اور جوڑ توڑ کے بعد جو نظام رونما ہوا وہ نہایت بے ترتیب، بے منصوبہ اور استبدادی تھا۔ اس کی پہنچ بہت تھوڑی آبادی تک تھی اور ٹیکسوں سے بچنے کی کوشش عام تھی۔ برطانوی عہد میں اُن خامیوں کو مائل بفلاح اخراجاتِ عامّہ کے ذریعے دُور کرنے کی کوشش نہیں کی گئی جو نظام کی استبدادی ماہیت کا نتیجہ تھیں۔ جنگ کے دوران برطانوی حکمرانوں نے جو بجٹ تیار کیے ان میں دفاع اور حفاظتی خدمات پر بہت زیادہ صرف ہوتا اور قومی تعمیری خدمات کو تقریباً نظر انداز کیا جاتا۔ آزادی کے بعد مرکزی حکومت نے محسوس کیا کہ ہندوستان کے ٹیکس کے نظام کو از سرِ نو ترتیب دینے کی ضرورت ہے تاکہ یہ ترقیاتی منصوبہ بندی میں نمایاں رول ادا کر سکے۔ چنانچہ اپریل ۱۹۵۳ء میں مسٹر جان متھائی کی صدارت میں ٹیکسیشن انکوائری کمیشن مقرر کیا گیا۔

ٹیکسیشن انکوائری کمیشن (۱۹۵۳-۵۴ء) کی رپورٹ

(الف) بنیادی نتائج: (۱) محاصل عامّہ کے رجحانات ـــــ محاصل عامّہ کا جائزہ لیتے ہوئے کمیشن نے بتایا کہ جنگ کے قبل سے آمدنی میں جو اضافہ ہوا تھا وہ عام افراطِ زر کی وجہ سے لوگوں کی نقد آمدنی بڑھ جانے کا نتیجہ تھا۔ اگر محاصل عامّہ کو قومی آمدنی کے تناسب میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ٹیکس کی قومی کوشش میں کوئی خاص اِضافہ نہیں واقع ہوا۔ اشیا پر ٹیکس اور وہ ٹیکس جن کا

بوجھ گھریلو صرف پر پڑتا ہے اب بھی) مالیاتی نظام میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور مجموعی آمدنی کا ۵۴ فی صدی ان کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ براہ راست ٹیکسوں کا تناسب ۳۹-۱۹۳۸ء کے ۱۱ فی صدی سے بڑھ کر ۵۴-۱۹۵۳ء میں ۵۴ فی صدی ہوگیا تھا لیکن ۶۰-۱۹۵۹ء میں گھٹ کر ۲۴ فی صدی ہوگیا۔

(۲) **مصارف عامّہ کے رجحانات** ـــــ مصارف عامّہ کا جائزہ لیتے ہوئے کمیشن نے اِس بات پر زور دیا کہ لوگوں پر نئے اور مزید ٹیکس لگانے سے پہلے ٹیکس کے موجودہ وسائل کا مؤثر ترین استعمال کیا جائے۔ کمیٹی نے اعتراف کیا کہ آزادی کے بعد سے ترقیاتی کاموں پر مصارف میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ سماجی خدمات پر صَرف میں اضافے کی وجہ سے ٹیکس کے نظام کی غیر مقبولیت میں کمی ہوئی ہے۔ ترقیاتی اخراجات کو زیادہ اہمیت دینے کی وجہ سے آگے چل کر ٹیکس ادا کرنے کی لوگوں کی استعداد بڑھے گی۔

(۳) **ٹیکس کا حلقۂ اثر** ـــــ اگرچہ دیہی ٹیکس کے مقابلے میں شہری ٹیکسوں کی سطح آمدنی کی تمام سطحوں پر بحیثیت مجموعی اونچی ہے تاہم یہ تفاوت اوسط اوسط اور کم آمدنی کے درمیان اِتنا زیادہ نہیں ہے۔ کمیشن کا کہنا ہے کہ شہری بالواسطہ ٹیکس دیہی ٹیکس کے مقابلے میں کچھ ترقی پزیر ہے اور اُونچی دیہی آمدنی پر زیادہ لگانے کی مزید گنجائش ہے۔

(۴) **مصارف کے رجحانات اور ترقیاتی پروگرام** ـــــ کمیشن کی رائے ہے کہ پبلک سکٹر کے ترقیاتی مصارف کے وسائل فراہم کرنے کے لیے ٹیکس اور قرض سے زیادہ کام لینا چاہیے اور مالیاتی خسارے کے طریقے کو کم سے کم استعمال کرنا چاہیے، خصوصاً منصوبوں کی لمبی مدت کے لیے۔ لیکن کمیشن کا خیال ہے کہ قلیل مدت کے لیے مالیاتی خسارے کی تھوڑی گنجائش ہوسکتی ہے۔ کمیشن نے پتہ لگایا کہ ۵۶-۱۹۵۱ء کے پانچ برسوں میں منظم حلقے میں بحیثیت مجموعی سرمائے کی تشکیل ۲۵۹ کروڑ ہوئی۔ صنعت کی توسیع کے لیے مالی وسائل فراہم کرنے کے اہم ترین ذریعے دو تھے۔ نئے شیئر کا اجرا اور منافع کو روک کر صنعت میں لگانا۔ دونوں میں موخر الذکر کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

(ب) **کمیشن کی سفارش کردہ ٹیکس پالیسی** : کمیشن نے پانچ سالہ منصوبوں کے دوران ترقیاتی مالیات کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ٹیکس کی نئی پالیسی کے مندرجہ ذیل اصول متعین کیے : (۱) نابرابری کم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ براہ راست ٹیکس بتدریج بڑھائے جائیں اور ٹیکسوں کی وصول یابی کے زیادہ مؤثر اقدام کیے جائیں (۲) ترقیاتی پروگراموں کے لیے ٹیکس کی ایک متنوع اسکیم کی ضرورت ہے جس میں گہرائی اور گیرائی دونوں پر زور دیا جائے۔ کمیشن نے معاشی ترقی کے بارے

میں ٹیکس کی اپنی پالسی کی تلخیص اِن الفاظ میں کی " ٹیکس کا ایک ایسا نظام جو ہندوستانی معیشت کے لیے موزوں ترین ہو اور جس میں ترقیاتی پروگراموں کا لحاظ رکھا جائے، وہ ہوگا جس کے ذریعے پبلک سکٹر کے وسائل میں اِضافہ ہوسکے لیکن اِس اِضافے کی وجہ سے نجی سکٹر کے وسائل میں کم سے کم تخفیف واقع ہونا چاہیے۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب تمام طبقے صَرف کم کرنے کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دیں۔ ظاہر ہے کہ کم آمدنی والوں کے مقابلے میں زیادہ آمدنی والوں کو صَرف میں زیادہ ضبط سے کام لینا پڑے گا۔" چنانچہ کمیشن نے تجویز کیا کہ زیادہ سے زیادہ آسائشات اور نیم آسائشات پر مزید ٹیکس لگایا جائے اور ٹیکس کی شرح خاصی اُونچی ہو۔ ساتھ ہی عام استعمال کی اشیا پر ٹیکس زیادہ وسیع کیا جائے اور ٹیکس کی شرح نسبتاً کم ہو (۳) کمیشن کو نجی سکٹر کی توسیع اور ترقی کا پورا احساس تھا چنانچہ اُس نے تجویز کیا کہ تمام اثاثے کی شکل میں جو سرمایہ مخصوص کاروبار میں لگا ہوا ہے اُس پر ۲۵ فی صدی کی ترقیاتی منہائی دی جائے۔ کمیشن نے نجی سکٹر میں نئے سرمائے اور کاروبار کو ترغیب دینے کے لیے ایک اور تبدیلی یہ تجویز کی کہ اُن نئے کاروباروں کو جن کی قومی اہمیت ہو شروع کے پچھے برسوں میں ٹیکس سے بالکل آزادی دی جائے۔ کمیشن کی رائے تھی کہ اِس نئی رعایت کو اُس رعایت کی جگہ لینا چاہیے جس کے تحت نئے کاروبار کو اُس کے لگے ہوئے سرمائے پر ۶ فی صدی تک کی چھوٹ ملتی تھی (۴) کمیشن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ مزدوروں کی اکثریت پر صرف کی نابرابری کا ہمت شکن اثر پڑتا ہے اِس لیے خالص ذاتی آمدنی (بعد ادائیگی ٹیکس) کی ایک اوپری حد ہونی چاہیے جو ملک کی فی خاندان اوسط آمدنی کی تیس گنی سے زیادہ نہ ہو۔ یہ مقصد بتدریج پورا کیا جاسکتا ہے (۵) کمیشن کی رائے تھی کہ پبلک سکٹر کی ترقی کے لیے وسائل اِن ذریعوں سے حاصل کیے جائیں: (الف) اِنکم ٹیکس میں اِضافہ کیا جائے جس کے ازالے کے لیے کارپوریشن ٹیکس میں کچھ تخفیف کردی جائے اور بچت اور لگے ہوئے سرمائے پر مزید چھوٹ دی جائے (ب) محصول میں کافی اِضافہ کیا جائے (ج) قیمتوں کی پالسی میں مناسب ردّ و بدل کے ذریعے غیر ٹیکسی آمدنی (NON-TAX REVENUE) میں اِضافہ کیا جائے (د) زمین کی مالگذاری پر معتدل سرچارج لگایا جائے (ہ) زراعتی اِنکم ٹیکس کی شرح بڑھائی جائے اور مزید علاقوں پر اس کا اطلاق کیا جائے (و) جائداد پر ٹیکس لگانے کی پالسی اور زیادہ اختیار کی جائے (ز) سیلس ٹیکس کی شرح بڑھائی جائے اور اِس کا اطلاق زیادہ اشیا پر کیا جائے۔

جائزہ

ترقیاتی مالیات کے میدان میں ٹیکسیشن انکوائری کمیٹی کی سفارشات سنگ میل کی حیثیت رکھتی

ہیں۔ ہمارا ٹیکس کا نظام قدامت پرست اور رجعت پسند تھا۔ کمیشن نے اس فرسودہ نظام کو نئی شکل دینے کی کوشش کی تاکہ یہ ترقیاتی منصوبہ بندی کی ضروریات پوری کر سکے۔ ترقیاتی منہائی اور ٹیکس سے آزادی سے متعلق کمیشن کی سفارشات سے نجی کاروبار کو معاشی ترقی کے مطالبات پورے کرنے کی ترغیب ہوگی۔ یہ دُور رعایتیں اور انکم ٹیکس کے میدان میں خفیف تبدیلیاں چوتھے پلان کے دوران نجی سرمایہ کاری بڑھانے میں مدد کریں گی۔

کمیشن کی تجویز کے پیچھے جو اسپرٹ ہے اُس نے اور ٹیکس پالیسی کے عام خدوخال نے ترقیاتی مالیات کو نئی تقویت دی۔ ٹیکس سے متعلق کمیشن کی نئی پالیسی کے تین ستون ہیں، برابری کا نظریہ، ترغیب کا نظریہ اور ترقی کا نظریہ۔ ان تینوں نظریوں کی سمت بالکل درست ہے اگرچہ پالیسی کی تفصیلات میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں کرنی پڑیں گی تاکہ بدلتے ہوئے حالات کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ ترقیاتی مالیات کے میدان میں بھی کمیشن نے درست راہ اختیار کی ہے اور ایسی سفارشات کی ہیں جو تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد ہمارے منصوبوں کے پیچیدہ مسائل حل کر سکتی ہیں۔

ٹیکس کی اصلاح سے متعلق کالڈر تجویز

دوسرے پلان کے دوران مالی وسائل کی ضرورت کے پیش نظر وزارت مالیات نے جنوری ۱۹۵۶ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے مسٹر نکولس کالڈر کو ہندوستان کے ٹیکس کے نظام کی چھان بین کرنے اور مناسب تبدیلیاں تجویز کرنے پر معمور کیا۔ ٹیکس کے نظام کے ماہرانہ مطالعہ کی ضرورت تھی تاکہ دوسرے پلان کی مالی ضروریات پوری کرنے کے لیے مناسب تبدیلیاں لائی جا سکیں۔ ٹیکسیشن انکوائری کمیشن نے اپنی تجاویز اس طرح مرتب کیں کہ ان سے ترقیاتی منصوبہ بندی کی عام ضروریات پوری ہو سکیں لیکن دوسرے پلان میں مصارف کا حوصلہ مند پروگرام ہونے کی وجہ سے یہ ضروری ہو گیا کہ ٹیکس کے نئے وسائل دریافت کیے جائیں اور موجودہ وسائل کو نیا رُخ دینے کے طریقے اختیار کیے جائیں۔ مسٹر کالڈر کی تمام تر توجہ براہِ راست ٹیکس پر مرکوز رہی اور انھوں نے کئی اہم تبدیلیاں تجویز کیں۔ ان میں سے کچھ دُور رس سفارشات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

(۱) مسٹر کالڈر کا مقصد براہِ راست ٹیکس کی بنیاد کو زیادہ وسعت دینا تھا۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے وہ ایک سالانہ ولتھ ٹیکس، ایک کیپیٹل گینس ٹیکس، ایک عام گفٹ ٹیکس اور پرسنل اکسپنڈیچر ٹیکس لگانے کے حق میں تھے (اکسپنڈیچر ٹیکس موجودہ سپر ٹیکس کی جگہ ہوگا)۔ مندرجہ بالا

چاروں ٹیکس اور انکم ٹیکس کا حساب بیک وقت اور آمدنی کی ایک ہی رپورٹ پر لگایا جانا چاہیے۔ لیکن انکم ٹیکس کی شرح ۴۵ فی صدی سے زیادہ نہ ہونی چاہیے۔

(۲) مسٹر کالڈر نے ذاتی انکم ٹیکس میں جامع اصلاح لانے کی کوشش کی۔ اِس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے تجویز کیا کہ: ذاتی اخراجات پر بتدریج بڑھتا ہوا ٹیکس ہونا چاہیے جو ۲۵ فی صدی سے شروع ہو اور ۳۰۰ فی صدی تک پہنچ جائے، قابل ٹیکس آمدنی میں کیپیٹل گینس ٹیکس کو شمار کیا جائے، ایک سالانہ ولتھ ٹیکس ہونا چاہیے جو ½ فی صدی سے لے کر ۱½ فی صدی تک ہو، تحائف اور وراثت پر ٹیکس لگایا جائے، اِن اقدام کے ازالے کے لیے انکم ٹیکس کی بالائی سطح گھٹا کر سات آنے فی روپیہ کر دی جائے۔ کاروباری ٹیکسوں کے میدان میں انھوں نے اہم تبدیلیاں تجویز کیں۔ ان کی تجویز تھی کہ کمپنیوں کے تمام تقسیم شدہ اور غیر تقسیم شدہ منافعے پر سات آنے فی روپیہ کے حساب سے ری فنڈ نہ ہونے والا ٹیکس عائد کیا جائے اور باقی دوسرے ٹیکس ختم کر دیے جائیں۔ یہ تبدیلیاں اگر عمل میں لائی جائیں تو اِن سے انکم ٹیکس کی آمدنی میں (۵۵-۱۹۵۴ء کی آمدنی کی بنیاد پر) ۶۰ کروڑ سے لے کر ۱۰۰ کروڑ تک کا اضافہ ہو سکتا ہے۔

(۳) ذاتی صَرف پر ٹیکس اور سالانہ ولتھ ٹیکس کا اثر یہ ہوگا کہ انکم ٹیکس کی اونچی شرح کی وجہ سے کام، بچت اور روزگار کی جو ہمت شکنی ہوگی اُس کا اثر زائل ہو جائے گا۔ اِس طرح یہ دونوں ٹیکس آمدنی میں اضافے کا آلہ بنیں گے اور موجودہ انکم ٹیکس کے ہمت شکن اثرات کو دور کریں گے۔

(۴) جہاں تک کاروباری آمدنی کو ٹیکس سے بچانے کی کوشش پر قابو پانے کا سوال ہے، مسٹر کالڈر نے تجویز کیا کہ ۵۰ ہزار سے زیادہ کاروباری آمدنی اور ایک لاکھ سے زیادہ ذاتی آمدنی کی لازمی جانچ کی جائے۔ ٹیکس سے بچنے کی کوشش پر اگر قابو پالیا جائے تو اُس کی وجہ سے دوسرے پلان کے لیے مزید وسائل دستیاب ہو جائیں گے۔

کالڈر کی تجویز کا جائزہ

کالڈر کی تجویز پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ٹیکس کا ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس کے تحت نابرابری میں اضافہ کیے بغیر بچت بڑھائی جا سکے اور جس کا اثر زیادہ حیثیت والوں پر زیادہ اور کم حیثیت والوں پر کم پڑے۔ لیکن ولتھ ٹیکس کی ½۱ فی صدی تک شرح اور ۸۰ فی صدی گفٹ ٹیکس یقیناً مالدار لوگوں کی کمر توڑ دینگے اور سرمایہ کاری کی اُن کی ساری خواہش ختم ہو جائے گی۔

انکم ٹیکس شرح میں جو معمولی تخفیف تجویز کی گئی ہے وہ ہمت شکنی کے ازالے کے لیے کافی نہیں ہے۔
اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہندوستان کے مالیاتی نظام میں کیپیٹل گینس ٹیکس اور گفٹ ٹیکس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہماری جیسی ترقی پزیر معیشت میں اشیا اور خدمات کی شکل میں ترقی سے پیداواری اشیا کی قدر بہ لحاظ دوسری اشیا کے زیادہ ہوگی اِس لیے کیپیٹل گینس ٹیکس کو اگر بالکل ختم کردیا گیا تو ٹیکس کا نظام رجعت پزیر ہو جائے گا۔ ملک کی معاشی ترقی کے دوران دن بدن بڑھتا ہوا افراطِ زر اصل کی قدر پر نظر انداز ہوگا اور ایک چھوٹے سے سرمایہ دار طبقے کے کیپیٹل گینس میں اضافہ ہوگا۔ اِس اضافے کی وجہ سے ان کی قوتِ خرید بڑھیگی جس کے نتیجے میں افراطِ زر کی شدت بڑھیگی اِس لیے قابلِ ٹیکس آمدنی میں کیپیٹل گینس کی شمولیت سے ترقی پزیر معیشت کو فائدہ پہنچے گا، خصوصاً اُس زمانے میں جب ہم افراطِ زر کی گرفت میں ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ مسٹر کالڈر یہ بے لوچ فارمولا کہ کمپنیوں پر سات آنے فی روپیہ کے حساب سے ناقابل واپسی ٹیکس لگایا جائے، پرائیویٹ سکٹر میں سرگرمی پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اِس تخفیف سے کیپیٹل گینس ٹیکس اور دولت ٹیکس کے ثرات کی نفی نہ ہوسکے گی۔ کاروباری ٹیکس کے میدان میں کالڈر کے سیدھے سادے فارمولے میں کچھ اضافے کی ضرورت ہے، مثلاً کاروباری چھوٹ، ٹیکس سے آزادی، فرسودگی کے الاؤنس اور دوسرے مالیاتی اقدام کی ایک مناسب پالیسی ہونی چاہیئے۔

پہلے پلان کے دوران بجٹ کے رجحانات کا جائزہ

پہلے پلان کو زیادہ دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور یہ نسبتاً آسانی سے پورا ہوگیا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سیدھا سادہ اور کم پیچیدہ تھا جس کا مقصد مالیاتی استحکام تھا۔ اِس پلان کے دوران جو بجٹ پیش ہوئے وہ بھی بہت ہلکے پھلکے اور معمولی تھے چنانچہ ان میزانیوں میں ٹیکسوں کو وہ مناسب رول نہ مل سکا جو سرکاری سرمایہ کاری کے پروگرام کے لیے مالی وسائل کی فراہمی میں ٹیکسوں کا ہوتا ہے۔ اِس دوران جو مرکزی بجٹ پیش کیے گئے اُن میں کبھی محصولوں اور برآمدی ڈیوٹی میں خفیف ردّو بدل ہوتا، کبھی سرچارج سے متعلق ادھوری سفارش کردی جاتی اور کبھی ٹیکسوں میں کچھ رعایتوں کا اعلان کردیا جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پلان کے ختم کے وقت حکومت قومی آمدنی کا ۷ فی صدی حصّہ ٹیکسوں کی شکل میں حاصل کرکے مطمئن تھی۔ اس دوران ٹیکسوں کے نظام کو عقلی اصول پر مرتب کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی جس کی وجہ سے ٹیکسوں کو معاشی منصوبہ بندی سے منسلک کرنا ممکن نہیں تھا۔

یہ سارے بجٹ رسمی قاعدوں کے مطابق ترتیب دیے گئے تھے اور ان میں وہ اعتماد اور وہ جولانی نہیں تھی جس کی ضرورت ترقیاتی منصوبہ بندی کے لیے تخلیقی پالیسی بنانے میں ہوتی ہے۔ ان میزانیوں میں مزید ٹیکسوں کی تجاویز چند ہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان سے جو زائد آمدنی ہوئی وہ بس اتنی تھی کہ اُس سے پبلک سکٹر کی غیر سرمایہ کارانہ ذمہ داریاں (NON - INVESTMENT COM-MITMENT) پوری ہو جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ کارانہ اخراجات کے وسائل کے لیے خسارے کے بجٹ کا سہارا اتنے بڑے پیمانے پر لینا پڑا جو پلان بناتے وقت ذہن میں نہیں تھا۔ بجٹ کے گھاٹوں اور روپے کی بڑھتی ہوئی رسد کے باوجود پہلے پلان کے دوران افراطِ زر سے بچنا اس لیے ممکن ہو سکا کیونکہ اناج کی فصل اچھی ہوئی تھی۔ رواں مصارف کم کرنے کے لیے ٹیکس کا پیچ کسنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ ہماری نئی ترقی پزیر معیشت کی توسیعی ضروریات کی تسکین کے لیے روپے کی رسد میں اضافہ ہو رہا تھا، تاہم پہلے پلان کے دوران میزانیوں میں اُس حوصلے اور عزم کی کمی تھی جو ترقیاتی مالیات کے ستون سمجھے جاتے ہیں۔

پلان کو بچانے کے لیے کرشنما چاری کا ۵۷-۱۹۵۸ء کا بجٹ

پہلے پلان کے کامیابی سے ختم ہونے کے بعد دوسرے پلان کو زیادہ پُر عزم ہونے کی ضرورت تھی۔ یہ پلان زیادہ اُمید افزا ماحول میں بنایا گیا تھا۔ اس میں کوشش اور قربانی کے مطالبات دُو گنے تھے۔ اور آمدنی کا نشانہ ۳ فی صدی سے بڑھا کر ۵ فی صدی مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں جب دوسرا پلان شروع ہوا تو ملک کی معاشی حالت بحیثیت مجموعی زیادہ قابلِ اعتبار تھی۔ چنانچہ پلان کے پہلے سال کے لیے جو بجٹ پیش ہوا وہ نہایت سیدھا سادہ اور رسمی تھا لیکن آٹھ مہینے کے اندر ہی مزید آمدنی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مل کے بنے کپڑے پر محصول بڑھانا پڑا اور درمیان سال کے مالیاتی ایکٹ ۱۹۵۶ء کے ذریعے کیپیٹل گینس ٹیکس دوبارہ شروع کرنا پڑا۔ (یہ ٹیکس ۱۹۴۷ء میں پہلی بار عائد کیا گیا تھا اور ۱۹۴۹ء میں ختم کر دیا گیا تھا۔ ان اقدام کے باوجود ۵۶-۱۹۵۵ء کے دوران ۲۴۰ کروڑ کا خسارہ رہا)۔ ۱۹۵۷ء میں پلان کے دوسرے سال کے شروع سے ہی قلتوں اور رسد میں لوچ کی کمی کی وجہ سے معاشی محاذ پر دباؤ اور تناؤ کے آثار ظاہر ہو چکے تھے۔ تیز معاشی ترقی میں باڑھ کی جو تکلیفیں ہوتی ہیں ان کے درمیان مسٹر کرشنما چاری نے ۵۸-۱۹۵۷ء کا بجٹ پیش کیا۔ پلان کے وسائل میں جو خلا پُر کیے بغیر چھوڑ دیا گیا تھا اُس کی وجہ سے مسٹر کرشنما چاری کو ایک نازک صورتِ حال کا سامنا تھا۔ بجٹ بناتے وقت اُنھیں مالیات علاوہ

کے روایتی اصولوں کو بالائے طاق رکھنا پڑا۔

فروری ۱۹۵۷ء میں جب ۵۸-۱۹۵۷ء کے لیے عارضی بجٹ پرانی پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا اُس وقت ۵،۳۲ کروڑ کے گھاٹے کا سامنا تھا۔ یہ بات اُس وقت واضح تھی کہ اس خسارے کو پورا کرنے کے لیے بہت جلد ٹیکس لگانے کی ضرورت پڑیگی۔ مئی ۱۹۵۷ء میں جو بجٹ پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہوا اُس کا مقصد خسارے کو ۵،۲۷ کروڑ کے بقدر کم کرنا تھا۔ توقع تھی کہ باقی ۹۰ کروڑ کی کمی مزید ٹیکسوں کے ذریعے پوری کی جائیگی۔ چنانچہ مسٹر کرشنما چاری نے عوام، متوسط طبقے، دولتمند طبقے اور کمپنیوں کے مالکوں پر ٹیکس کی بندش کڑی کی۔ یہ بجٹ بہت سخت تھا لیکن معیشت کی ترقی کی رفتار کو برقرار رکھنے کے لیے اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں تھی۔

۱۹۵۷ء کے بجٹ میں مسٹر کرشنما چاری نے شکر، بناسپتی، سیمنٹ، تمباکو، دیاسلائی، کاغذ اور ڈیزل آئل پر محصول بڑھا دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے بہت سے ٹیکس عائد کیے جن میں مسٹر کالڈر کے دونوں ٹیکس، یعنی ولتھ اور اکسپنڈ چر ٹیکس بھی شامل تھے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان ٹیکسوں کی شرح اتنی زیادہ ہے کہ اس کی وجہ سے لوگوں کی پس انداز کرنے کی خواہش اور استعداد متاثر ہوگی لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ کرشنما چاری کے ان اقدام سے ایک بہت بڑا فائدہ ہوا۔ وہ فائدہ یہ تھا کہ پہلی بار وزارت مالیات کا رجحان ایجاد و اختراع کی طرف ہوا جو منصوبے کے لیے ترقیاتی مالیات کے نظریے سے بہت اہم ہے۔

ڈاکٹر کالڈر کے تجویز کردہ چار ٹیکسوں میں سے کیپیٹل گینس ٹیکس ۱۹۵۶ء سے شروع کر دیا گیا۔ ولتھ ٹیکس اور پرسنل اکسپنڈ چر ٹیکس ۵۸-۱۹۵۷ء کے بجٹ میں شامل تھے اور گفٹ ٹیکس ۵۹-۱۹۵۸ء کے بجٹ میں شامل کیا جانے والا تھا لیکن ان ٹیکسوں کی شرح میں کچھ تبدیلیاں کی گئی تھیں مثلاً ولتھ ٹیکس اور پرسنل اکسپنڈ چر ٹیکس لگاتے وقت مسٹر کرشنما چاری یہ بھول گئے کہ مسٹر کالڈر کی اصلاحات میں بنیادی سفارش یہ تھی کہ انکم ٹیکس اور سپر ٹیکس کی زیادہ سے زیادہ شرح ۴۵ فی صدی ہو۔ مسٹر کرشنما چاری نے یہ ٹیکس بے کمائی آمدنی پر ۹۲ فی صدی سے گھٹا کر ۸۴ فی صدی کر دیا اور کمائی ہوئی آمدنی پر ۷۰ فی صدی۔ یاد رہے کہ مسٹر کالڈر کی تجاویز براہِ راست ٹیکسوں کے میدان میں جامع اور مربوط اصلاحات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھیں یا تو ویسی کی ویسی منظور کرنا چاہیے یا بالکل نامنظور کر دینا چاہیئے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ گلدستے میں سے چند پھول چن لیے جائیں اور باقی یونہی چھوڑ دیے جائیں اور یہ صرف اس ڈر سے کیا جائے کہ بجٹ کے نظام کی یکسانیت بگڑ جائے گی۔

مسٹر کالڈر کی تجویز کے برعکس ۱۹۵۷ء میں جو مزید ٹیکس تجویز کیے گئے وہ براہ راست ٹیکس کے بجائے اشیا پر ٹیکس تھے یا دوسرے بالواسطہ ٹیکس تھے۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ مسٹر کالڈر کی تجویز تو یہ تھی کہ بالواسطہ ٹیکس دوسرے پلان کے لیے زائد آمدنی کے ۲۰ فی صدی ہونے چاہئیں لیکن ۱۹۵۷ء کے بجٹ میں یہ ٹیکس کل زائد آمدنی کا ۰۰ فی صدی تھے۔ ۱۹۵۷ء کے بجٹ نے زیادہ بیباک ہونے کے باوجود محصول پر روایتی توجہ جاری رکھی کیونکہ توقع یہ تھی کہ جلد ہی اِن سے اچھی آمدنی ہوگی اور ان کے ذریعے اندرونی صَرف کو کم کیا جا سکے گا تاکہ برآمد کے لیے زیادہ اشیا فراہم کرنے میں آسانی ہو۔

کرشنما چاری کے بجٹ میں اور بھی تجاویز تھیں جنھیں مالیاتی غیض و غضب سمجھا جاتا ہے جو لوگوں کے ہر طبقے پر پھٹ پڑا تھا۔ ان تجاویز میں سے کچھ یہ تھیں: (الف) اِنکم ٹیکس کے نچلے حصے کو زیادہ وسیع کرنے کے لیے قابلِ ٹیکس کم سے کم انفرادی آمدنی ۴۲۰۰ روپوں سے گھٹا کر ۳۰۰۰ روپے کر دی جائے (ب) کمپنیوں میں اِنکم ٹیکس کی شرح چار آنے فی روپے کے بجائے ۳۰ فی صدی اور کارپوریشن ٹیکس ۲¾ آنے فی روپیہ کے بجائے ۲۰ فی صدی کر دیا جائے (ج) اندرونِ ملک استعمال ہونے والے لفافوں اور تار کے محصول میں اِضافہ (د) بونس اِشوز پر ٹیکس کی شرح ۱۲½ فی صدی کے بجائے ۳۰ فی صدی کر دی جائے۔

پلان کو بچانے کے لیے ٹیکس کی جو تجاویز رکھی گئی تھیں وہ حوصلہ مند ترقیاتی منصوبے اور پلان کے پہلے سال کے تناؤ کے پیشِ نظر ناگزیر تھیں اور جن طبقوں کو یہ شکایت تھی کہ وہ زیادہ متاثر ہیں وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ پہلے سے اُنھیں خبردار نہیں کیا گیا تھا۔

نہرو کا سُست رفتار بجٹ ۵۹-۱۹۵۸ء

۱۹۵۹ء کا بجٹ پنڈت نہرو نے پیش کیا کیونکہ مسٹر کرشنما چاری کے مستعفی ہو جانے کی وجہ سے وزارت مالیات عارضی طور پر اُنھوں نے سنبھال لی تھی۔ مسٹر نہرو کا خیال تھا کہ مزید ٹیکسوں کی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۸ء کے ہنگامہ خیز بجٹ کے بعد ۱۹۵۹ء کے بجٹ میں صرف معمولی جھٹکے تھے۔ دراصل ۱۹۵۸ء کے بجٹ میں مسٹر کرشنما چاری نے دوسرے پلان کے دوران ٹیکسوں کا نیا خاکہ پیش کر دیا تھا۔ چنانچہ توقع تھی کہ آئندہ ٹیکس میں بہت معمولی ردّ و بدل ہوگا۔ پنڈت نہرو نے یہ توقع پوری کی۔

وزیر اعظم نے سب سے اہم نیا ٹیکس جو تجویز کیا وہ گفٹ ٹیکس تھا۔ اس وقت ملک میں جو

ٹیکس تھے ان کے پیش نظر یہ نیا ٹیکس مناسب اور منصفانہ تھا اور ملک کے باخبر حلقوں نے اس اقدام کو پسند کیا۔ درحقیقت گفٹ ٹیکس پہلے سے متوقع تھا۔ مسٹر کالڈر کی نیت یہ تھی کہ اسٹیٹ ڈیوٹی کی جگہ ایک واحد اور مربوط گفٹ ٹیکس شروع کیا جائے۔ یہ بات اِس سے بھی ظاہر تھی کہ گفٹ ٹیکس کی شرح تقریباً وہی تھی جو اسٹیٹ ڈیوٹی کی تھی۔ صرف اِتنا فرق تھا کہ اسٹیٹ ڈیوٹی کے پہلے سلیب میں جتنی رقم تک معافی تھی وہ گفٹ ٹیکس میں نہیں تھی۔ گفٹ ٹیکس کی شرح پہلے سلیب (۵۰۰۰۰ تک) ۴ فی صدی سے شروع ہو کر ۴۰ فی صدی تک (۵۰۰۰۰۰۰ پر) مانی تھی۔

جہاں تک براہِ راست ٹیکسوں کا تعلق ہے، انکم ٹیکس کے ڈھانچے میں کوئی اہم تبدیلی نہیں کی گئی لیکن ٹیکسوں کی دو تجاویز دلچسپ تھیں۔ سکشن ۱ے ۲۳ کے تحت کمپنیوں کو زائد منافع پر کچھ رعایت دی گئی۔ دوسری تجویز کے تحت جہاز رانی کی کمپنیوں کے لیے ترقیاتی چھوٹ ۲۵ فی صدی سے بڑھا کر ۴۰ فی صدی کر دی گئی۔ سکشن ۱ے ۲۳ میں وہ کمپنیاں آتی ہیں جن کے زیادہ تر شیئر چند لوگوں کے ہاتھ میں تھے۔ چنانچہ توقع ہے کہ یہ کمپنیاں اپنے حصے داروں کو زیادہ منافع دیں گی۔ ان کمپنیوں کو ایک حد سے زائد منافع پر سپر ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ چنانچہ رعایت یہ تھی کہ صرف اُس سکشن کے تحت آنے والی کمپنیوں کا سپر ٹیکس کم کر دیا جائے۔

بالواسطہ ٹیکسوں میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں لائی گئی لیکن سیمنٹ پر محصول بڑھا دیا گیا (۲۰ روپے فی ٹن سے بڑھا کر ۲۴ روپے فی ٹن کر دیا گیا) اور دوسرے محصولوں میں عام اِضافہ کیا گیا۔ اِن اضافوں کی وجہ سے مرکزی آمدنی میں بالواسطہ ٹیکسوں کی نمایاں حیثیت اور زیادہ مضبوط ہو گئی۔

۵۸-۱۹۵۷ء کے کرشنا چاری بجٹ کے مقابلے میں نہرو کا ۵۹-۱۹۵۸ء کا بجٹ بہت معمولی اور سُست تھا۔ کوئی غیر متوقع ٹیکس نہیں عائد کیے گئے تھے اور عام لوگوں پر کوئی مزید بوجھ نہیں پڑا۔ غالباً اِس کی وجہ یہ تھی کہ صرف ایک ہی سال پہلے ٹیکس کے نظام میں بنیادی تبدیلیاں لائی جا چکی تھیں۔

مُرار جی ڈیسائی کا ٹھہرا ہوا بجٹ

معاشی پالیسی کے ایک آلہ کار کی حیثیت سے بجٹ کی اہمیت، اُس کے مقاصد اور اُن مقاصد کے حصول کے ذریعے، دونوں پر منحصر ہوتی ہے۔ ۶۰-۱۹۵۹ء میں جو بجٹ مُرار جی نے پیش کیا اُس میں ٹیکس کے نظام میں سادگی لانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن یہ بجٹ وسائل کے مسئلے سے نپٹنے میں ناکام رہا۔

چنانچہ چوتھے پلان کے لیے مالی وسائل فراہم کرنے کے لیے خسارے کے بجٹ کا آسان نسخہ استعمال کرنا پڑا۔ مرار جی کے پہلے بجٹ میں تو وہی نظریہ جاری رہا جو پنڈت نہرو کے پچھلے سال کے بجٹ کا تھا۔ ٹیکس کی تجاویز میں ہمت اور دُور اندیشی کی کمی تھی، خصوصاً اشیا پر محصول کے معاملے میں۔ درآمدات پر مکمل پابندی کی وجہ سے بہت سی پائدار اور نیم پائدار اشیا کی پیداوار اور صنعتی خام مال کی پیداوار کو فائدہ پہنچا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس میدان میں ٹیکسوں کی کمی بیشی کی کافی گنجائش تھی۔ دیہی ٹیکسوں میں بھی اضافے اور توسیع کی بہت گنجائش تھی۔ اِس نظریے سے اگر دیکھا جائے تو ۱۹۶۸-۶۹ء کا بجٹ ایک ٹھہرا ہوا اور غیر متحرک بجٹ تھا۔

ٹیکس کی تجاویز سے ظاہر ہے کہ مزید آمدنی کے لیے بالواسطہ ٹیکسوں کا زیادہ سہارا لیا گیا تھا۔ اور براہِ راست ٹیکسوں میں جو تبدیلیاں لائی گئیں وہ ٹیکس کے نظام کو زیادہ سادہ بنانے کے لیے تھیں۔ لیکن بالواسطہ ٹیکس بھی جتنے ہونے چاہیئے تھے اُتنے نہیں تھے، نہ وسعت کے اعتبار سے اور نہ شرح کے اعتبار سے۔ ایسا لگتا ہے کہ وزیر مالیات نے محصول کے سارے نظام پر نظر ثانی کرنے کا زرّیں موقع ہاتھ سے کھو دیا ورنہ ایک مربوط منصوبے کے تحت اور ترقیاتی ضروریات کے پیش نظر محصول کے نظام کو دوبارہ ترتیب دینے کا بڑا اچھا موقع تھا۔ سگریٹوں پر ۱۶ فی صدی ڈیوٹی بڑھادی گئی۔ بعض علاقوں میں پیدا ہونے والی چائے پر محصول میں معمولی ردّ و بدل کیا گیا اور برآمدی ڈیوٹی ۲۶ پیسے فی پونڈ سے گھٹا کر ۲۴ پیسے کر دی گئی۔ ڈیزل آئل اور (VAPORISING OIL) پر ڈیوٹی ۴۰ پیسے فی گیلن سے بڑھا کر ۸۰ پیسے کر دی گئی۔ کم رفتار ڈیزل آئل کی ڈیوٹی ۴۰ پیسے فی ٹن سے ۵۰ پیسے کر دی گئی۔ عمدہ سلک کے کپڑوں پر محصول ۶ پائی فی گز سے بڑھا کر ۶ پیسے فی گز کر دیا گیا۔ لیکن گھریلو صنعتوں کے پیمانے پر ایک شفٹ میں کام کرنے والے چھوٹے یونٹوں کو کچھ رعایتیں دی گئیں۔ ریان کے دھاگے اور ریشے پر ڈیوٹی ۶۰ فی صدی بڑھادی گئی۔ موٹر کے ٹائر پر محصول ۳۰ کے بجائے ۴۰ فی صدی کر دیا گیا۔

بہ ہر حال وزیر مالیات نے کمپنیوں کو ولتھ ٹیکس اور زائد منافع کے ٹیکس سے بظاہر نجات دے دی۔ اِن ٹیکسوں کے قابلِ اعتراض پہلوؤں پر مسلسل اعتراض ہوتا رہا تھا۔ ولتھ ٹیکس کمپنیوں کے تمام دوسرے ٹیکسوں کے علاوہ تھا اور یہ ان وسائل کا بہت بڑا حصّہ لے لیتا تھا جو کاروبار کی توسیع میں لگایا گیا ہوتا۔ یہ ٹیکس گویا خطرہ مول لینے کی سزا تھی جس کی وجہ سے عام طریقوں کے ذریعے سرمایہ حاصل کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ مرار جی نے ولتھ ٹیکس اور زائد منافع پر ٹیکس تقریباً بالکل ختم کر دیا اور ساتھ ہی کمپنیوں پر ٹیکس لگانے کے نظام کو بدل دیا۔ کمپنیوں کو منافع پر ۵۴ فی صدی ٹیکس ادا کرنا تھا لیکن

اس ٹیکس کے کسی حصّے کو حصّہ داروں پر ٹیکس نہیں تصور کیا جاتا تھا۔ اس ٹیکس کے علاوہ ۲۰ فی صدی ٹیکس منافع پر تھا جس کو یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ ٹیکس حصّہ داروں پر ہے جو کمپنیاں ان کی طرف سے ادا کرتی ہیں۔ چنانچہ یہ حصّہ داروں کی آمدنی میں شمار ہوتا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ حصّہ دار نے اس کے بقدر ٹیکس اپنی آمدنی پر ادا کر دیا۔ چونکہ یہ ٹیکس اُس منافع پر عائد ہوتا ہے جس کا اعلان کمپنیاں کریں گی اس لیے منافعے کا اعلان نہ کرنے کا رجحان پہلے کی طرح برقرار رہے گا۔ اِس سب سے یہ ظاہر ہے کہ منافع اعلان کرنے کے مقابلے میں اعلان نہ کرنے میں زیادہ فائدہ تھا۔ یہ اقدام واقعی بہت اچھا تھا۔ اِس کے تحت ایک طرف تو معمولی ردّ و بدل کے ذریعے آمدنی جیوں کی تیوں قائم رکھی گئی اور ٹیکس کے نظام کی سادگی کے فوائد حاصل ہو گئے۔ اور دوسری طرف اجتماعی بچت کے رجحان کو نہ صرف باقی رکھا گیا بلکہ اس کو تقویت پہنچی۔ مُرارجی کی تجویز میں سب سے بڑی بے انصافی یہ تھی کہ غیر مقیم کمپنیوں (NON-RESIDENT COMPANIES) پر سپر ٹیکس کی شرح ۲۵ فی صدی سے بڑھا کر ۴۳ فی صدی کر دی گئی جبکہ مقیم کمپنیوں کی شرح ۲۵ فی صدی باقی رکھی گئی۔ مختصر یہ کہ کمپنیوں پر ٹیکس لگانے کے نئے نظام میں یہ اچھائی تھی کہ یہ سیدھا سادہ اور غیر پیچیدہ تھا اور اس نے اجتماعی سکٹر کو دو بڑی لعنتوں یعنی دولت ٹیکس اور زائد منافع ٹیکس سے، نجات دے دی لیکن غیر مقیم کمپنیوں کے ساتھ تفریق برتی گئی جس کی وجہ سے اُنھیں نقصان اُٹھانا پڑا۔

مُرارجی کا دُوسرا بجٹ ۶۱-۱۹۶۰ء

مُرارجی کا دوسرا یعنی ۶۱-۱۹۶۰ء کا بجٹ کم و بیش پچھلے سال جیسا تھا۔ وقتی آسانی اور سہولت کے نقطۂ نگاہ سے یہ بجٹ اچھا تھا۔ نئی در آمدات کو منتخب کرنے میں مُرارجی نے بہت احتیاط سے کام لیا۔ پہلے بجٹ کی طرح دوسرے میں مُرارجی نے اِس بات کا خاص خیال رکھا کہ ایسی اشیا پر ٹیکس لگانے سے حتی الامکان احتراز کیا جائے جو بہت عام اور وسیع استعمال کی ہیں۔ اِس کا بھی خیال رکھا گیا کہ نجی سکٹر کی ترقی میں رکاوٹ نہ پیش آئے۔

عملی دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے مُرارجی نے اِس بات کو فوراً سمجھ لیا کہ شہری ٹیکسوں کی موجودہ صورت میں اگر براہِ راست ٹیکس مزید عائد کیے گئے تو ٹیکس ادا کرنے والوں میں بڑی بے چینی پھیل جائے گی جو نہ ترقی پذیر معیشت کے لیے مفید ہے اور نہ مالیاتِ عامّہ کے لیے۔ چنانچہ ۶۱-۱۹۶۰ء کے بجٹ میں نہ ٹیکسوں کی شرح میں اور نہ براہِ راست ٹیکسوں کے بنیادی خد و خال میں کوئی تبدیلی تجویز کی گئی اگرچہ

۱۹۶۰ء کے مالی ایکٹ نے کہیں کہیں کچھ معمولی ردّ و بدل اور کچھ رعایتیں تجویز کی تھیں۔

چونکہ براہِ راست ٹیکسوں کی گنجائش بالکل نہیں رہی تھی، خصوصاً شہری حلقے میں، اِس لیے مُرارجی کو بالواسطہ ٹیکسوں کے ناگوار طریقے کا سہارا لینا پڑا۔ بالواسطہ ٹیکسوں کے میدان میں مُرارجی نے ۹ چیزوں پر نئے محصول کا اعلان کیا۔ ان ۹ چیزوں میں یہ چیزیں شامل تھیں: لوہے کے ڈلے، ٹین کی چادریں اور ٹین کے پتر، سائیکل کے ضروری پُرزے، بجلی کے موٹر اور کھنچی ہوئی فلمیں۔ اِس کے علاوہ کئی موجودہ محصولوں میں اِضافہ کیا گیا اور شرابوں پر کسٹم ڈیوٹی بڑھادی گئی۔

بالواسطہ ٹیکسوں کے دائرے کو وسیع کرنے کا عمل جاری رہا۔ ۱۹۶۰ء کی فہرست میں آٹھ اشیا کے اِضافے کو اسی نکتۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ بہت سے نئی چیزیں جو اب ملک میں کافی تعداد میں بننے لگی ہیں، محصول کی فہرست میں شامل کی جارہی ہیں۔ اِس کا جواز ظاہر ہے۔ یہی اشیا اگر درآمد کی جاتیں تو اِن پر امپورٹ ڈیوٹی عائد ہوتی۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اِس صنعت کی ترقی کی وجہ سے حکومت نقصان اٹھائے تاوقتیکہ صنعت کو شدید مقابلے کا سامنا ہو، یا صارف اپنی طلب کم کرکے اِس کے خلاف مدافعت کریں۔

مُرارجی کا تیسرا بجٹ، ۶۲-۱۹۶۱ء

مُرارجی کا تیسرا بجٹ تیسرے پلان کا پہلا بجٹ تھا۔ آیئے دیکھیں کہ اِس بجٹ کی تجاویز کس حد تک ترقیاتی منصوبہ بندی کے متعین مقاصد (خصوصاً تیسرے پلان کے مقاصد) کو پورا کرنے کے لیے ترتیب دی گئیں۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ ایک ترقی پذیر معیشت میں مالیاتی پالیسی کا مقصد معاشی ترقی کو تقویت دینا ہونا چاہیے۔ اِس کے لیے لازمی طور سے اِس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ سرمایہ بتدریج زیادہ تیزی کے ساتھ اکٹھا ہو۔ سرمایہ اکٹھا ہونے کی شرح کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ کتنی پس انداز کی ہوئی رقم پیداواری کاموں کے لیے دستیاب ہے۔ چنانچہ مالیاتی پالیسی کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیے کہ پس انداز کرنے اور اِس رقم کو پیداآور کاموں میں لگانے کی شرح بڑھائی جائے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک ترقی پذیر معیشت میں معاشی ترقی کے محرکات ریاست کو فراہم کرنے ہوتے ہیں اِس لیے بجٹ کے وسائل خصوصاً ٹیکسوں کے وسائل کو بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مُرارجی نے ٹیکس لگانے کی بہت معمولی کوشش کی، یعنی قومی آمدنی کے ۹ء۸ فی صدی سے لے کر ۴ء۱۱ فی صدی تک۔ لیکن کام اس سے بھی

ادھورا رہتا ہے کیونکہ معیشت کے کافی بڑے حصے کے لیے ترقیاتی محرکات نجی سکٹر کو فراہم کرنے ہوتے ہیں۔ ان محرکات اور مہموں کو سود مند طریقے سے ایک راہ پر لگانے کے لیے ضروری ہے کہ خود نجی سکٹر کے پاس بچت کافی ہو۔ ایک اچھی مالیاتی پالیسی اس بات کو ذہن میں رکھتی ہے۔ چنانچہ مالیاتی پالیسی کے دو مقاصد ہوتے ہیں جو بظاہر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ پہلا مقصد یہ ہوتا ہے کہ حکومت کے لیے زیادہ بچت دستیاب ہو، خصوصاً ٹیکسوں کے ذریعے سے اور دوسرا مقصد یہ کہ اتنی کافی بچت نجی سکٹر کے لیے باقی رہے جو وہ معیشت میں لگا سکے۔

مرارجی کے بجٹ کو اگر ان دو نظریوں سے دیکھا جائے تو بحیثیت مجموعی یہ ایک کامیاب بجٹ تھا۔ محصولوں کو وسیع تر کرنے جیسی بعض تجاویز پہلے نظریے پر پوری اترتی ہیں۔ دوسری طرف نجی سکٹر کو ترغیب دینے والی تجاویز دوسرے نظریے کے مطابق ہیں۔ لیکن اگر ذرا زاویہ بدل کر دیکھا جائے تو یہی خوبی خامی بن جاتی ہے۔ محصولوں کے جال کو اگر زیادہ تیزی سے پھیلایا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بالواسطہ طریقے سے عوام پر ٹیکس عائد ہوتے ہیں جو ایک جمہوری ماحول میں ترقی دشمن اقدام ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا اعتراض نجی سکٹر والے بھی کرسکتے ہیں۔ وہ یہ کہ زیادہ محصول کی وجہ سے مصارف پیداوار بڑھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچت کم ہوتی ہے۔

براہِ راست ٹیکسوں کے میدان میں قانونِ تقلیل حاصل نے کام کرنا شروع کردیا ہے اور چند منتخب اور حاشیائی تبدیلیوں سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ آمدنی کو زیادہ سے زیادہ محصولوں کا ہی سہارا لینا پڑیگا۔ ہندوستان میں محصولوں کے حلقے کو وسیع کرنے کی کوشش اس لیے کی گئی ہے کیونکہ حال میں صنعتی توسیع کی وجہ سے اندرونی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ بہت سی نئی صنعتیں قائم ہوگئی ہیں اور بہت سی موجودہ صنعتوں کی پیداواری استعداد کافی بڑھی ہے، مثلاً سوڈا ایش، کاسٹک سوڈا، بجلی کے موٹر، ربر کے ٹائر اور ٹیوب، بجلی اور ٹیلی فون کے تار وغیرہ ایسی صنعتیں ہیں جن کی پیداواری استعداد کافی بڑھی ہے۔ وزیر مالیات نے ۶۲-۱۹۶۱ء کے بجٹ میں ان موافق حالات سے فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے ۱۴ اشیا پر محصول کی شرح بڑھادی اور ۱۸ نئی اشیا پر محصول عائد کیا۔

آسائشات میں وائرلیس سیٹ، ایرکنڈیشننگ اور ریفریجریشن کی مشینری کو محصول کے لیے منتخب کیا گیا۔ غالباً یہ اس لیے کیا گیا تاکہ آسائشات پر بالائی طبقے کے بہت واضح صرف کو کم کیا جاسکے کیونکہ اکثر کم یاب وسائل پلان کے ترجیح یافتہ پروجیکٹوں کی طرف رجوع ہونے کے بجائے ان آسائشات

کے پیدا کرنے میں لگا دیے جاتے تھے۔

یہ تو رہی بجٹ اور مزید ٹیکسوں کے ذریعے بچت کو حاصل کرنے کی بات ۔ اب آئیے یہ دیکھیں کہ بجٹ نے نجی سکٹر کی بچت کے محرک کے فرائض کس حد تک انجام دیے ۔ بظاہر اس میدان میں کافی کام ہوا ۔ بونس شیئر پر ٹیکس کافی کم کر دیا گیا (۳۰ فی صدی سے گھٹا کر ۱۲½ فی صدی) ۔ بیرونی شرکا کے ساتھ کئی قسم کی تفریق اور عدم مساوات برتی جاتی تھی جنھیں یک لخت دور کر دیا گیا ۔ انٹر کارپوریٹ منافع پر سپر ٹیکس بیرونی اقلیتی حصہ داروں کے خلاف ایک طرح کی تفریق تھی ۔ بجٹ نے اسے ختم کر دیا اور اس کی جگہ ۲۰ فی صدی کا یکساں ٹیکس عائد کیا ۔ مرکزی حکومت سے منظور شدہ ہندوستانی کاروبار سے بیرونی کمپنیوں کو حاصل ہونے والی رائلٹی پر ٹیکس گھٹا کر ۵۰ فی صدی کر دیا گیا ۔ مزید یہ کہ بیرونی ماہروں کو بھی ٹیکس ہالی ڈے (TAX HOLIDAY) کی توسیع سے فائدہ اٹھانے کا حق دیا گیا ۔ ان اقدام کا مقصد بیرونی سرمایہ داروں کو یقین دلانا تھا کہ ہندوستان میں سرمایہ کاری کے لیے فضا سازگار ہے ۔

مُرارجی کا چوتھا بجٹ ۶۳-۱۹۶۲ء

مارچ ۱۹۶۲ء میں مُرارجی نے ۶۳-۱۹۶۲ء کا جو بجٹ موجودہ ٹیکسوں کی بنا پر پارلیمنٹ میں پیش کیا تھا وہ ملک کی غیر مکمل مالیاتی تصویر تھی ۔ اپریل ۱۹۶۲ء میں جب مُرارجی نے ۶۳-۱۹۶۲ء کے مرکزی بجٹ میں نئے ٹیکسوں کی تجاویز پیش کیں تو یہ ادھوری تصویر مکمل ہو گئی ۔ مُرارجی نے اِس بات کا اعتراف کیا کہ بازار سے بہت زیادہ قرض لینے کی گنجائش نہیں تھی ۔ چنانچہ انھوں نے خسارے کا بجٹ بنانے کے بجائے اِس کمی کو مزید ٹیکس لگا کر پورا کرنے کی کوشش کی ۔ ایسا لگتا ہے کہ مُرارجی کو ڈر تھا کہ خسارے کے بجٹ کی وجہ سے افراطِ زر میں اِضافہ ہوگا چنانچہ وہ نئے ٹیکسوں کے ذریعے تیسرے پلان کے مالی وسائل فراہم کرنے پر مُصر تھے ۔ وزیر مالیات کا بنیادی مقصد برآمدات بڑھانا' بچت میں اِضافہ کرنا اور صَرف کو کم کرنا تھا ۔ مُسلسل بالواسطہ ٹیکسوں کے ساتھ کسی نہ کسی منزل پر براہِ راست ٹیکسوں میں بھی منتخب معمولی اضافے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ وزیر مالیات نے ۶۳-۱۹۶۲ء کے بجٹ میں یہی کیا ۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ بالواسطہ ٹیکسوں پر مسلسل زور دینا سیاسی غیر دانشمندی ہے اِس لیے براہِ راست ٹیکسوں میں کچھ اضافے کی توقع بہر حال کرنی چاہیے ۔ یہ سمجھنا بے جا نہیں تھا کہ چونکہ کمپنیاں توسیع پذیر معیشت کے محفوظ بازار میں خوب منافع کما رہی تھیں اِس

لیے ۵ فی صدی مزید ٹیکس دے سکتی تھیں۔ جہاں تک بالواسطہ ٹیکسوں کا سوال ہے، بجٹ سے سب سے زیادہ فائدہ چائے کی صنعت کو پہنچا۔

مُرارجی کی ٹیکس کی تجاویز تین بڑے خانوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں:

(۱) **براہِ راست ٹیکس** —— ہندوستانی کمپنیوں پر ٹیکس کی شرح ۴۵ سے بڑھا کر ۵۰ فی صدی کر دی گئی اور بیرونی کمپنیوں پر ۶۳ فی صدی کی شرح برقرار رکھی گئی۔ انکم ٹیکس اور سُپر ٹیکس کی شرح آمدنی کے سب سے اونچے سلیب پر ۷۲٫۵ فی صدی رکھی گئی جس میں انکم ٹیکس اور تنخواہوں پر سَرچارج شامل نہیں تھا۔ ۵۰۰۰ سے کم آمدنی پر پرانی شرح برقرار رکھی گئی۔ انکم ٹیکس اور تنخواہوں پر سَرچارج کی شرح ۵ فی صدی سے گھٹا کر ۲٫۵ فی صدی کر دی گئی۔ اثاثے کی شکل میں سرمائے کو فروخت کرنے سے (خریدنے کے ایک سال کے اندر) جو منافع ہوگا اُس پر دوسری معمولی آمدنیوں کی طرح انکم ٹیکس اور سپر ٹیکس عائد ہوگا۔ پانچ سال پرانا اکسپنڈیچر ٹیکس ختم کر دیا گیا۔ ولتھ ٹیکس میں دو بالائی سلیب پر ۰٫۲۵ فی صدی اور ۰٫۵ فی صدی کا اضافہ کیا گیا۔

(۲) **بالواسطہ ٹیکس** —— بے بنی تمباکو اور سگریٹ کے محصول پر نظرثانی کی گئی تاکہ اِن سے ۲۸٫۵ کروڑ کی آمدنی ہو سکے۔ سوتی کپڑے اور دھاگے کے محصول پر بھی نظرثانی کی گئی۔ دیاسلائی پر محصول بڑھا دیا گیا تاکہ ماچس کے ۶ پیسے کے بکنے کی وجہ سے جو غیر متوقع منافع ہو رہا تھا وہ پیداکاروں کو نہ ملے۔ پیٹنٹ اور ذاتی ملکیت والی دواؤں پر محصول ۱۰ سے گھٹا کر ۷٫۵ فی صدی کر دیا گیا۔ جوٹ کے بنے سامان پر محصول عائد کیا گیا۔ جن اور دوسری اشیا پر محصول لگا وہ یہ تھیں: خاص قسم کے ایسڈ اور گیس، پلائی وُوڈ، ایز بسٹس، سیمنٹ سے بنا سامان، دندانے بنا ہوا ربڑ اور ربڑ کے اسپنج، گراموفون، اُس کے پُرزے اور ریکارڈ، معدنی تیل اور اُس سے بنی ہوئی چیزیں۔

(۳) **بالواسطہ ٹیکس۔ درآمداتی محصول** —— لوہے اور فولاد کی کچھ چیزوں پر کسٹم ڈیوٹی ۵ فی صدی بڑھا دی گئی۔ اِسٹین لس اسٹیل (STAINLESS STEEL) کی پیٹیوں، چادروں، ڈلوں اور ٹکڑوں پر ۲۵ فی صدی کسٹم ڈیوٹی عائد کی گئی۔ موٹروں پر کسٹم ڈیوٹی ۱۰۰ فی صدی کے بجائے ۱۵۰ فی صدی کر دی گئی۔ چائے پر برآمداتی ڈیوٹی ۴۴ پیسے سے گھٹا کر ۲ پیسے فی کیلوگرام کر دی گئی۔

وزیر مالیات کو جو دشواریاں درپیش تھیں انھیں اور ۶۳-۱۹۶۲ء کے بجٹ کی تجاویز کی بنائے منطق کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ تیسرے پلان کے پسِ منظر میں ہندوستان کے ٹیکس کے نظام کے بنیادی خد و خال کا جائزہ لیا جائے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارا ٹیکس کا نظام ایسا نہیں ہے کہ قومی آمدنی کا مقررہ

حصّہ سرکاری خزانے میں خود بخود آتا رہے ۔ قومی آمدنی بڑھنے کے ساتھ خزانے کا اضافہ اُس تناسب سے نہیں بڑھتا چنانچہ قومی آمدنی اور ٹیکس کی آمدنی کے تناسب کو ایک دی ہوئی سطح پر رکھنے کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ تازہ ٹیکس لگایا جائے ۔ ایسا خصوصاً اس لیے ہے کہ زراعتی آمدنیوں سے متناسب ٹیکس کی تحصیل نہیں ہوتی ۔ مالگذاری تقریباً بے لوچ ہوتی ہے ۔ اشیا پر جو محصول لگائے جاتے ہیں وہ اتنے مؤثر طریقے سے دیہی حلقے تک نہیں پہنچ پاتے جیسے شہری حلقے تک پہنچتے ہیں ۔ اِس سب سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ کہ ہماری بیشتر آبادی کی آمدنی بنیادی طور سے کم ہے چنانچہ اس کے مطابق ٹیکس لگانے کی گنجائش بھی کم ہے ۔ بہ ہر حال ایک جامع ترقیاتی پروگرام کے لیے مالی وسائل کی فراہمی آبادی کے تمام حصّوں سے قربانی کی طالب ہوتی ہے اِس نکتۂ نگاہ سے ٹیکسوں کی گیرائی بڑھانے کا جواز ہے ۔ ۶۳-۱۹۶۲ء کے بجٹ میں بالکل یہی کیا گیا۔

مُرارجی کا پانچواں بجٹ ۶۴-۱۹۶۳ء

۶۴-۱۹۶۳ء کا بجٹ مالیات عامّہ کے میدان میں ایک غیر معمولی بے باک تجربہ تھا ۔ نہ صرف نظریے کے اعتبار سے یہ بے باک تھا بلکہ اِس کی ٹیکس لگانے کی کوشش بھی چکرا دینے والی تھی ۔ ترقیاتی اور دفاعی ضروریات پوری کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر ٹیکس لگانا ناگزیر تھا ۔ چینی حملے کی وجہ سے جو غیر معمولی صورت حال پیدا ہوئی اُس میں ہم نے محسوس کیا کہ ترقیاتی اور دفاعی کوششوں کو ایک دوسرے کے ماتحت بلکہ ایک دوسرے پر منحصر سمجھنا چاہیے ۔ ۶۴-۱۹۶۳ء کے بجٹ کا رجحان یہی تھا ۔ پلان میں ترقیاتی پروگراموں کے لیے ۱۶۵۰ کروڑ اور دفاع کے لیے ۸۶۷ کروڑ روپے رکھے گئے تھے لیکن واقعی صرف الترتیب ۱۶۵۴ کروڑ ۸۰۸ کروڑ ہوا۔

اِس لیے دیکھیں کہ دفاعی ضروریات پوری کرنے کے لیے ٹیکس لگانے کی جو کوشش کی گئی اُس کا نقشہ کیا تھا اور اُس کی جسامت کتنی تھی ۔ مجوزہ ٹیکسوں سے ۲۵۰ کروڑ حاصل ہونے کی توقع تھی ۔ یہ ایک غیر معمولی اور تاریخی واقعہ تھا ۔ پلاننگ کے پہلے بارہ برسوں کے دوران قومی آمدنی میں ٹیکسوں کا تناسب ۶ء۱۱ فی صدی تک پہنچ گیا لیکن ۶۴-۱۹۶۳ء کے بجٹ کے نتیجے کے طور پر یہ تناسب ایک دم ۱۲ فی صدی ہو گیا ۔ اُس سال واقعی ہمیں قومی آمدنی میں ٹیکس کے تناسب کو ۳ فی صدی بڑھانے کی بے پناہ کوشش کرنی پڑی ۔ یہ کارگزاری اِتنی تھی جتنی ہم پچھلے بارہ برس میں رفتہ رفتہ کر پائے تھے ۔

مشکل کے باوجود یہ کام غیر معمولی حالات میں محکم ارادے کے ساتھ پورا کرنا پڑا۔ مزید ٹیکسوں کا جہاں تک تعلق ہے، کسٹم ڈیوٹی سے کافی رقم حاصل ہونے کی توقع تھی۔ بہت سی اشیا پر برآمداتی محصول ہٹا لیا گیا۔ محصول کی تبدیلی دو حصوں میں کی گئی۔ اوّل تو محصول میں منتخب اضافہ صَرف کو کم کرنے کے لیے کیا گیا۔ پٹرول، عمدہ صاف کیا ہوا ڈیزل آئل اور مٹی کا تیل وہ اشیا تھیں جن کے بڑھتے ہوئے صَرف کی وجہ سے زرمبادلہ کا مسئلہ شدید ہونے کا ڈر تھا۔ اس کے علاوہ منتخب اشیا کے محصول پر سرچارج لگایا گیا۔ یہ آمدنی صرف مرکز کے لیے تھی تاکہ مرکز بڑھتے ہوئے دفاعی مصارف پورے کر سکے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر وزیر مالیات نے بہت سی چیزوں پر سرچارج عائد کیا۔ ان چیزوں میں لکھنے کا کاغذ، چینی کے برتن، چائے، کافی اور مٹی کا تیل جیسی عام استعمال کی چیزیں تھیں۔ یہ اقدام مناسب نہیں تھا کیونکہ تیزی سے بڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے عوام یونہی تنگ تھے۔

۶۴-۱۹۶۳ء کے بجٹ میں براہِ راست ٹیکسوں پر بھی زور دیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ مرکز کا بالواسطہ ٹیکسوں پر غیر متناسب انحصار کم کیا جائے۔ براہِ راست ٹیکسوں کے میدان میں دو خاص تجویزیں تھیں۔ ایک تو ۳ فی صدی سے لے کر ۱۰ فی صدی تک مزید سرچارج تھا۔ یہ سرچارج جن آمدنیوں پر عائد کیا گیا وہ یہ تھیں: ٹیکس کی ادائیگی کے بعد افراد کی آمدنی، غیر منقسم ہندو خاندانوں کی آمدنی اور ان رجسٹرڈ (UN REGISTERED) فرموں اور افراد کی اسوسیٹیشنوں کی آمدنی۔ اس مزید ٹیکس کے ایک حصے سے کمپلسری ڈپازٹ اسکیم کے ذریعے عہدہ برا ہوا جا سکتا تھا۔ دوسرا ایک سُپر ٹیکس تھا جو کمپنیوں پر عائد کیا گیا تھا۔ یہ سُپر ٹیکس اُس وقت واجب ہوتا جب کمپنی کی آمدنی ٹیکس کی ادائیگی کے بعد کمپنی کی خالص مالیت کی ۶ فی صدی سے زیادہ ہوتی (کمپنی کی خالص مالیت میں شیئر کیپیٹل اور محفوظ رقم شامل تھی لیکن ترقیاتی منہائی کی محفوظ رقم نہیں شامل تھی)۔ ۵۰ ہزار تک کے منافع کو سُپر ٹیکس سے مُستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔

عوام پر اِن ٹیکسوں اور کمپلسری ڈپازٹ اسکیم کا کیا اثر پڑا؟ عوام دو چکیوں کے بیچ میں دب کر رہ گئے۔ ایک طرف اِنھیں زیادہ ٹیکس ادا کرنے تھے اور کمپلسری ڈپازٹ کے تحت کچھ پس انداز کرنے کا بھی اُن سے مطالبہ تھا۔ دوسری طرف نقل و حمل کے مصارف اور عام اشیائے صَرف میں اضافے کی وجہ سے اِن کا بجٹ ۲۵ فی صدی سے لے کر ۳۰ فی صدی تک بڑھ گیا تھا۔

کمپلسری ڈپازٹ کی اسکیم قابلِ تعریف تھی، خصوصاً غیر معمولی صورتِ حال میں۔ اس وقت دقت یہ تھی کہ ہم قومی آمدنی کا صرف ۹ فی صدی پس انداز کر رہے تھے۔ چنانچہ لازمی بچت کی اسکیم

کے ذریعے لوگوں کو مزید رقم پس انداز کرنے پر مجبور کرنا ضروری تھا۔ یہ اس لیے اور بھی ضروری تھا کہ توقع تھی کہ ٹیکسوں سے وصول ہونے والی آمدنی ۹ فی صدی سے بڑھ کر ۱۲ فی صدی کے قریب ہو جائے گی۔

لارڈ کینز پہلے آدمی تھے جنھوں نے جنگ کے زمانے میں لازمی بچت کی افادیت پر زور دیا۔ اُنھوں نے یہ خیال اپنی اُس کتاب میں ظاہر کیا جس کا نام تھا "HOW TO PAY FOR THE WAR" یعنی جنگ کے مصارف کیسے پورے کیے جائیں۔ کینز نے کمپلسری ڈپازٹ کی اپنی اسکیم میں بہت احتیاط برتی تھی اور اس کا اہتمام کیا تھا کہ متوسط طبقے کے لوگ حادثے اور موت جیسی ہنگامی ضرورت کے لیے روپیہ نکال سکیں۔ ہماری حکومت نے اپنی اسکیم میں اس طرح کا کوئی اہتمام نہیں کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ کم آمدنی والے لوگ کہیں کے نہیں رہے۔ پس انداز کرنے والے جانتے تھے کہ یہ رقم جب انھیں واپس ملے گی اس وقت اُس کی قیمت آج کے مقابلے میں گھٹ چکی ہوگی کیونکہ روپے کی قیمت برابر گرتی جارہی تھی اس پر طرہ یہ کہ ہنگامی ضرورت کے لیے بھی وہ اس رقم سے استفادہ نہیں کرسکتے تھے۔ یہ واقعی بے انصافی تھی۔ بہتر تھا کہ تمام انکم ٹیکس دینے والوں کے لیے لازمی بچت کی اسکیم کے بجائے کم اور متوسط آمدنی والے طبقے کے لیے زندگی کے لازمی بیمے کی اسکیم چلائی گئی ہوتی۔ زندگی کے بیمے کی وجہ سے لوگوں کو زیادہ تحفظات ملتے اور یہ اسکیم ہماری کمپلسری ڈپازٹ اسکیم کا بہتر بدل ہوتی جس میں ہنگامی ضروریات کے لیے کوئی شق نہیں تھی۔

جہاں تک بجٹ کی تجاویز کے بارے میں منتظمین اور کاروباری لوگوں کے ردِعمل کا سوال ہے سپر پرافٹ ٹیکس کی وجہ سے اسٹاک اکسچینج کو بہت شدید دھکا لگا اور لوگ بوکھلا گئے۔ منافعے پر سپر پرافٹ ٹیکس کا بہت خراب اثر پڑا تھا اور اس کی وجہ سے نئے کاروبار کے لیے کافی ریزرو فنڈ بنانا مشکل ہوگیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ نجی کاروبار کی صحت مند ترقی کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کی راہ میں یہ ٹیکس سدِراہ تھا۔ چنانچہ ۶۵-۱۹۶۴ء کے بجٹ میں اس کو بالکل ختم کردیا گیا۔

ٹی۔ ٹی کرشنماچاری کا "پیداوار بڑھاؤ" بجٹ ۶۵-۱۹۶۴ء

۶۵-۱۹۶۴ء کے لیے جو بجٹ وزیر مالیات مسٹر کرشنماچاری نے پیش کیا اُس میں اگر نئی معاشی پالیسی بنانے کی نہیں تو کم از کم معاشی پالیسی کو نیا رُخ دینے کی کوشش ضرور کی گئی۔ منصوبہ بند معاشی ترقی کا مسئلہ دراصل لوگوں کے وسائل کو سرمائے کی شکل میں لگانے کے لیے مجتمع کرنے کا مسئلہ ہے۔ ایک ترقی پزیر معیشت میں سرمائے کی مقدار برابر بڑھتی رہنی چاہیے۔ ہندوستان

جیسے ملک کے لیے یہ اور بھی ضروری ہے جہاں ترقیاتی اور دفاعی ضروریات بیک وقت پورا کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ابتدائی مراحل میں بچت کی کمی اس راہ میں سخت رکاوٹ بن سکتی ہے۔ ایسی معیشت میں بچت کا موثر طریقہ یہی ہے کہ یا تو لوگوں کو بچت کرنے پر مجبور کیا جائے یا ٹیکسوں کے ذریعے اُن کے صَرف کو کم کیا جائے۔ ہماری جیسی فلاحی اور ترقی پذیر معیشت میں ٹیکسوں کے ذریعے اُن لوگوں کے مصارف پر زیادہ پابندی عائد کرنی چاہیے جن کے وسائل ترقی کے دوران تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر، ترقی پذیر معیشت میں ٹیکس کا اصول یہ ہونا چاہیے کہ استفادہ کرنے والوں پر ٹیکس لگاؤ، ان کی زائد قوت خرید کو لے لو مگر معیشت کو جن ترغیبات کی ضرورت ہے ان کو نقصان نہ پہنچنے دو۔

مسٹر کرشنا چاری کا بجٹ (۱۹۶۵-۶۶ء) اسی اصول پر مبنی تھا۔ انھوں نے اُن لوگوں پر بھاری ٹیکس لگائے، وسائل پر جن کا اختیار ترقی کے دوران تیزی سے بڑھ رہا تھا یہ جاننے کے لیے مسٹر کرشنا چاری نے آمدنی کا نظریہ یہ منتخب کیا تھا کہ جن لوگوں کی سالانہ آمدنی ۱۵۰۰۰ روپے سے زیادہ تھی انھیں استفادہ کرنے والوں میں شمار کیا جائے۔ ان پر زیادہ ٹیکس لگایا گیا اور ان کے لیے بچت کی ایک لازمی اسکیم بھی شروع کی گئی جس کا نام (ANNUITY DEPOSIT SCHEME) تھا۔ اکسپنڈیچر ٹیکس دوبارہ عائد کیا گیا تاکہ استفادہ کرنے والے طبقے کے بے تحاشہ مصارف کو روکا جائے۔ ان باتوں کے باوجود ۱۹۶۵-۶۶ء کے بجٹ کو پیداوار بڑھانے والا بجٹ بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں نجی سکٹر کو ترغیب دینے کی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

اس خیال کے پیش نظر کہ ٹیکس سے زیادہ آمدنی حاصل کی جائے لیکن اس کی وجہ سے پیداوار میں کم سے کم خلل پڑے، وزیر مالیات نے متعدد اقدام تجویز کیے جن کا مقصد یہ تھا کہ کیپٹل مارکٹ میں اعتماد پیدا ہو، بنیادی صنعتوں کو ترقی کی ترغیب ہو اور صنعت میں عام طور سے ریزرو فنڈ بن سکے۔ اس مقصد کے پیش نظر سپر پرافٹ ٹیکس شروع کیا گیا جو کمپنیوں کے زائد منافع پر عائد ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ سپر ٹیکس اجتماعی منافع پر مختلف شرحوں سے لگتا تھا اور شرح کا انحصار اس پر تھا کہ کمپنی کب قائم ہوئی تھی اور کمپنی ہندوستانی تھی یا کسی بیرونی کمپنی کی ضمنی کمپنی کی حیثیت رکھتی تھی۔ سپر ٹیکس کی جگہ جب سرٹیکس لگایا گیا تو بہت سی کمپنیوں کو مستثنیٰ کر دیا گیا اور بہت سی دوسری کمپنیوں پر سے بوجھ کم کر دیا گیا۔ اجتماعی منافع کو سپر ٹیکس کی جو رعایت دی گئی وہ بہت معمولی تھی۔

کوئی شخص بھی اگر ۱۹۶۵-۶۶ء کے بجٹ کا تجزیہ کرے تو اُس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اقدام

کی دو قسمیں ہیں - اوّل تو وہ اقدام جن کا مقصد پیداوار اور سرمایہ کاری میں اضافے کو ترغیب دینا ہے - دوسرے وہ اقدام جن کا مقصد دولت اور معاشی ارتکاز کو کم کرنا ہے - پہلی قسم کے اقدام بعض اوقات دوسری قسم کے اقدام کی نفی کرتے معلوم ہوتے ہیں اِسی لیے ان دونوں میں ایک مناسب توازن رکھنا ضروری ہے - کرشنما چاری کے بجٹ کی یہی خصوصیت ہے کہ اس میں اِن دو متضاد مقاصد میں بہت حقیقت پسندانہ انداز سے توازن قائم کیا گیا ہے -

جہاں تک پہلے مقصد کا سوال ہے، بجٹ نے سرمایہ کاری کے لیے صرف چند ترغیبات فراہم کیں لیکن منتخب بنیاد پر کچھ رعایتیں بھی دی گئیں - مثلاً یہ کہ ان منتخب صنعتوں کو مزید رعایتیں دی گئی ہیں جنھیں معیشت کی ترقی کے لیے ضروری سمجھا گیا یا جن کی ہمّت افزائی مخصوص اقدام کے ذریعے ضروری سمجھی گئی - ایسی صنعتوں کی ایک فہرست تیار کی گئی جس میں ۱۴ صنعتیں ہیں - ان میں لوہے، فولاد، المونیم، صنعتی مشینوں، کوئلے، سیمنٹ، مصنوعی کھاد، کاغذ اور گودا، چائے، کافی اور ربر کی صنعتیں شامل ہیں -

اب بجٹ کے دوسرے مقاصد لیجیے، یعنی استفادہ کرنے والے طبقے کو لازمی بچت پر مجبور کرکے یا اُس پر ٹیکس عائد کرکے دولت اور معاشی قوت کے ارتکاز کو کم کرنا - وسائل پر اختیار رکھنے والوں سے زیادہ سے زیادہ بچت حاصل کرنے کی غرض سے ۱۹۵۷ء کے بجٹ میں کمپلسری ڈپازٹ اسکیم کی جگہ اینوئٹی ڈپازٹ اسکیم شروع کی گئی - لازمی بچت کے اعتبار سے یہ اسکیم یقیناً اچھی تھی کیونکہ یہ ان لوگوں پر عائد ہوتی تھی جن کی آمدنی ۱۵۰۰۰ سالانہ سے زیادہ تھی - ۱۵۰۰۰ سے اوپر کی آمدنی کو سیبوں میں بانٹ دیا گیا تھا اور ڈپازٹ کی شرح بتدریج اونچی ہوتی جاتی تھی - اینوئٹی ڈپازٹ اسکیم افراطِ زر کو روکنے کے لیے بنائی گئی تھی - اِس کا مقصد یہ تھا کہ معاشی ترقی کے دوران جن لوگوں کی آمدنی بڑھ رہی تھی ان کی آمدنی کے ایک حصّے کو معطّل کر دیا جائے (یعنی وہ اس کو صرف نہ کرسکیں)۔ [illegible] ٹیکس [illegible] ختم کر دیا گیا تھا، پھر سے عائد کر دیا گیا تاکہ زیادہ آمدنی [illegible] کے ضایع کر رہے تھے [illegible] وسائل کو آسائشات [illegible]

[illegible] ٹیکس [illegible] تھا [illegible] کیپٹل گینس ٹیکس کی شرح اور ان [illegible] ٹیکس [illegible] ویلتھ ٹیکس [illegible] اسٹیٹ ڈیوٹی کی شرح [illegible] کوشش کی - اسٹیٹ ڈیوٹی کے [illegible] ٹیکس [illegible] اسٹیٹ ڈیوٹی کے [illegible]

کی حیثیت رکھتا ہے اِس لیے وزیر مالیات نے گفٹ ٹیکس کی بھی شرح بڑھادی ۔ صرف یہی نہیں کہ گفٹ ٹیکس کی موجودہ شرح بڑھادی گئی بلکہ معافی کی سطح بھی نیچی کردی گئی ۔ ہمارے مُلک میں دولت کی ملکیت کے فرق کو آمدنی کی نابرابری کی بنیادی وجہ تسلیم کیا جاتا ہے ۔ ٹیکس کی اونچی شرح آمدنی کی نابرابری کم کرنے کے لیے تھی ۔ معافی کی سطح کم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان بہت سے لوگوں کو اس کے تحت لایا جائے جو اب تک مستثنیٰ تھے کیپیٹل گینس ٹیکس میں اضافے کا مقصد دولت کے ارتکاز کو مزید روکنا تھا ۔

استفادہ کرنے والوں پر ٹیکس تو لگایا ہی گیا ساتھ ہی نچلے طبقے کو رعایتیں بھی دی گئیں ۔ پندرہ ہزار سے کم آمدنی والوں کو لازمی بچت نہیں کرنی تھی ۔ اسی لیے کمپلسری ڈپازٹ کی اسکیم ختم کردی گئی کیونکہ اِس کے تحت تمام اِنکم ٹیکس ادا کرنے والے آجاتے تھے ۔

کرشناچاری کا سرپلس بجٹ، ۶۶-۱۹۶۵ء

مسٹر کرشناچاری کا ۶۶-۱۹۶۵ء کا بجٹ کئی معنوں میں ممتاز اور توجہ کے قابل تھا ۔ برسوں کے بعد پہلی بار وزیر مالیات نے نیا بوجھ ڈالنے سے زیادہ رعایتیں دی تھیں اور یہ پہلا موقع تھا جب بجٹ نہ صرف آمدنی کے اعتبار سے سرپلس تھا اور خسارے کی مالیات سے نجات ملی تھی حقیقت یہ ہے کہ وزیر مالیات نے بہت برسوں کے بعد متوازن بجٹ پیش کیا تھا جس میں ۱۰۶٫۱۶ کروڑ کے بقدر آمدنی فاضل تھی ۔

بجٹ اور اُس کی مجموعی تجاویز کا جائزہ لیتے وقت ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وزیر مالیات کے سامنے بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ بجٹ ایسا ہو جس سے دو متضاد مقاصد پورے ہوں ۔ پہلا مقصد یہ تھا کہ معیشت جو بڑھتی ہوئی قیمتوں، اونچے ٹیکسوں، بڑھتے ہوئے مصارف زندگی اور خراب زرعی منصوبہ بندی اور ترقی کی سُست رفتار کے دلدل میں پھنسی ہوئی تھی اُس کو دوبارہ حرکت میں لایا جائے ۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ حسب ضرورت رعایتیں دی جائیں تاکہ خیالات کی عام فضا بہتر ہو اور بچت اور سرمایہ کاری کے لیے سازگار ماحول پیدا ہو اور ساتھ ہی پانچ سالہ منصوبوں کے لیے کافی وسائل فراہم ہو سکیں ۔

وزیر مالیات نے ٹیکس کی پالیسی از سر نو ترتیب دی ۔ ذاتی ٹیکسوں میں کافی رعایت دی اور اجتماعی ٹیکسوں میں بھی محدود رعایت دی ۔ اِس طرح انھوں نے ہندوستان کے ٹیکس کے

نظام کے لیے ایک مستحکم اور معقول بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کی۔

جہاں تک براہِ راست ٹیکسوں کا سوال ہے وزیر مالیات نے نہ صرف ذاتی ٹیکس کے نظام کو آسان بنایا، ٹیکس کم کیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذاتی آمدنیوں پر ٹیکس کا بوجھ کم ہو گیا۔ ٹیکس میں تخفیف آمدنیوں کی مختلف سطحوں کے مطابق کی گئی۔ اس کے بنیادی خد و خال مختصراً یہ ہیں: پہلے انکم ٹیکس کے لیے ایک الاؤنس دیا جاتا تھا جس کو ختم کر دیا گیا۔ اب انکم ٹیکس میں پرسنل الاؤنس کی یہ رعایت دی گئی کہ فرد کے لیے ۲۰۰۰ اور اگر شادی شدہ ہے تو مزید ۱۵۰۰ روپے کو پرسنل الاؤنس کی حیثیت سے ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ ۴۰۰ روپے فی بچے کے حساب سے زیادہ سے زیادہ دو بچوں تک، یعنی ۸۰۰ روپے کی مزید رعایت دی گئی بشرطیکہ بچے ماں باپ کے زیر کفالت ہوں۔ مجموعی مستثنیٰ رقم اب بھی پہلے کی طرح ۳۰۰۰ روپے رکھی گئی۔ غیر شادی شدہ جن کی آمدنی ۳۵۰۰ روپے سالانہ تھی اُن پر ۱۵۰۰ روپے کی آمدنی پر ٹیکس عائد ہوتا تھا۔ باقی ۲۰۰۰ روپے پرسنل الاؤنس کی حیثیت سے ٹیکس سے مستثنیٰ تھے۔ پہلے ان لوگوں کو ۲۵۰۰ روپے کی آمدنی پر ٹیکس دینا پڑتا تھا اور صرف ۱۰۰۰ روپے کا پرسنل الاؤنس ٹیکس سے مستثنیٰ تھا۔ گویا شادی شدہ لوگوں کا پرسنل الاؤنس جو ٹیکس سے مستثنیٰ تھا۔ ۱۰۰۰ روپے سے بڑھا کر ۲۰۰۰ روپئے کر دیا گیا اور شادی شدہ لوگوں کے لیے جن کے دو بچے تھے چار ہزار روپے سے بڑھا کر ۴۳۰۰ روپے کر دیا گیا۔ یاد رہے کہ بے کمائی ذاتی آمدنی پر قابل ادائیگی ٹیکس کی زیادہ سے زیادہ شرح ۸۸ء۱۲ سے گھٹ کر ۱۶۲۵ء۸ فی صدی اور کمائی آمدنی پر ۲۶۵ء۸ فی صدی سے گھٹ کر ۷۴ء۶۷ فی صدی ہو گئی ——

۶۵-۱۹۶۴ء کے بجٹ میں اینوئٹی ڈپازٹ کی جو اسکیم شروع کی گئی تھی ختم کر دی گئی۔ ساتھ ہی یہ اعلان کیا گیا کہ اینوئٹی ڈپازٹ کی رقم جب واپس ہوگی تو کمائی ہوئی آمدنی شمار کی جائے گی اور دیتے وقت اس میں سے ٹیکس نہیں وضع کیا جائے گا۔

کئی برسوں سے اکاؤنٹینٹ (ACCOUNTANT) آرکی ٹکٹ (ARCHITECT) سالی سٹرس (SOLICITORS) اور وکیلوں جیسے پیشہ ور لوگوں کے ساتھ یہ زیادتی ہو رہی تھی کہ انھیں انکم ٹیکس میں ان ادائیگیوں کی منہائی نہیں دی جاتی تھی جو یہ لوگ اپنے رٹائرمنٹ کے سلسلے میں کسی فنڈ میں یا کسی معاہدے کے تحت جمع کرتے تھے جبکہ یہ رعایت کمپنیوں کے ڈائرکٹروں اور دوسرے ملازمین کو حاصل تھی۔ یہ خامی دُور کر دی گئی اور اعلان کیا گیا کہ مختلف پیشوں کے رجسٹرڈ فرموں کے شرکا بھی منہائی کے حقدار تھے۔ یہ منہائی اُن کی مجموعی آمدنی کے ⅒ یا ۵۰۰۰ روپے (دونوں میں جو کم ہو) تک

دی جائے گی لبشرطیکہ اِتنی رقم کسی منظور شدہ فنڈ میں رِٹائرمنٹ یا بڑھاپے کے لیے جمع کی جائے۔ مختلف پیشوں کے لوگوں کے لیے یہ رعایت کافی تھی اور اِس کی وجہ سے اُنھیں اپنے رِٹائرمنٹ اور بڑھاپے کے لیے اِنتظام کرنے میں مدد ملی۔

وزیر مالیات نے یہ بھی اعلان کیا کہ نئی صنعتی کمپنیوں کے ایکوئٹی شیر جو افراد یا غیر منقسم ہندو خاندان کے پاس ہیں جو انھوں نے ابتدا میں خریدے تھے، پانچ سال کے لیے ولتھ ٹیکس سے مستثنیٰ رہیں گے۔ ساتھ ہی وزیر مالیات نے شہری جائدادوں پر ولتھ ٹیکس میں مزید اضافے کا اعلان کیا۔ اِس ٹیکس کی شرح شہر کی آبادی کے لحاظ سے متعین ہوگی۔ یہ مزید ٹیکس جائداد کی بازار کی قیمت پر ایک سے ۷ کر ۴ فی صدی تک سلیب کے مطابق عائد ہوگا۔ اسٹیٹ ڈیوٹی اور گفٹ ٹیکس میں وزیر مالیات نے بہت معمولی رعایتیں کیں۔ اس سب سے یہ ظاہر ہے کہ وزیر مالیات کو نئے براہِ راست ٹیکس کے مقابلے میں ترغیبات فراہم کرنے کی زیادہ فکر تھی۔

جب ہم بالواسطہ ٹیکسوں پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ یہ مرکزی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ ۶۶-۱۹۶۵ء میں ٹیکسوں کی مجموعی متوقع آمدنی ۰۸ء۱۹۴۵ کروڑ میں سے ۶۵ء۱۲۵۴ کروڑ یعنی تقریباً ۶۵ فی صدی آمدنی بالواسطہ ٹیکسوں سے تھی۔ کسٹم ڈیوٹی سے ۵۰ء۴۱۹ کروڑ کی آمدنی کی توقع تھی اور محصول سے ۱۵ء۸۳۵ کروڑ۔ بالواسطہ ٹیکسوں کے میدان میں جو تبدیلیاں ۶۶-۱۹۶۵ء کے بجٹ میں تجویز کی گئیں ان کا مقصد دو باتوں میں سے ایک تھا: (الف) صارفوں کو ایسی اشیا میں رعایتیں دی جائیں جن کی رسد کی صورت ایسی ہو کہ رعایتوں کا فائدہ صارفوں تک پہنچنے کی توقع ہو (ب) طلب اور رسد کے عدم توازن کی وجہ سے لوگ بہت منافع کما رہے تھے بجٹ کی تجاویز کا ایک مقصد یہ تھا کہ یہ زائد منافع، چاہے ملک میں بنی ہوئی یا برآمد کی ہوئی اشیا کی فروخت سے حاصل کیا گیا ہو، وصول کر لیا جائے۔

محصول میں اضافہ کرنے کی بجائے مزید رعایتیں دینے پر زیادہ زور تھا۔ چنانچہ اِن تجاویز کی وجہ سے آمدنی میں ۱۳ کروڑ روپے کی مجموعی کمی واقع ہوئی۔ محصول میں کمی بیشتر اس لیے کی گئی کہ قیمتیں کم ہوں اور صارفوں کو کچھ راحت ملے۔ اِن محصولوں میں مندرجہ ذیل اشیا آتی ہیں: سائیکل کے ٹیوب (۸۶ء۱ کروڑ کے بقدر محصول کم کر دیا گیا)، بعض قسم کے لکھائی، چھپائی اور ٹائپ کے کاغذ (۵۰ء۲ کروڑ کی کمی)، کنٹرول کے سوتی کپڑے (۷۶ء۹ کروڑ کی کمی)، سائیکل کے پرزے (۲۵ء۲ کروڑ کی کمی) اور جوتے (۶۰ء۲ کروڑ کی کمی)۔ کچھ دوسری اشیا پر محصول اِس لیے کم کیا گیا

تاکہ اِن کا صرف بڑھ سکے۔ بہت سے رنگ پر محصول کم کر دیا گیا جن میں کیمیاوی رال استعمال ہوتی تھی۔ اِس کے علاوہ سیلولوس کے ریشے اور دھاگے اور سلک کے کپڑوں کو چونکہ مصنوعی ریشے اور دھاگے سے شدید مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا اِس لیے ان پر بھی محصول کم کر دیا گیا۔ کچھ دوسری اشیا پر محصول کم کرنے کا مقصد چھوٹی صنعتوں کی مدد کرنا تھا مثلاً صابون بنانے والوں کو جتنے مال پر محصول نہیں دینا پڑتا تھا وہ پہلے سے دوگنا کر دیا گیا لیکن یہ رعایت صرف اُن لوگوں کے لیے تھی جن کی سالانہ پیداوار ۵۰۰ ٹن سے زیادہ نہیں تھی۔ کچھ چیزوں پر سے محصول بالکل ختم کر دیا گیا کیونکہ اِن سے کوئی فائدہ نہیں تھا مثلاً سگار، چُرٹ، گراموفون اور چاندی۔

جن چیزوں کی رسد کی کمی تھی، ان پر محصول بڑھا دیا گیا کیونکہ قلت کی وجہ سے ان پر منافع زیادہ تھا۔ سب سے زیادہ نمایاں اِضافہ فولاد کے ڈلوں اور لوہے اور فولاد کی بنی چیزوں کے محصول میں کیا گیا تاکہ راج کمیٹی کی سفارشات کے مطابق اُس خلا کو پُر کیا جا سکے جو اِن چیزوں کی بازاری قیمت اور پیداواری قیمت میں پایا جاتا تھا۔ تانبے کے ڈلوں اور تانبے کی بنی چیزوں کی طلب کم کرنے اور اُن پر منافع کا حاشیہ گھٹانے کی غرض سے محصول بڑھا دیا گیا۔

منافع کی گنجائش کم کرنے کے خیال سے ٹین کے پتروں اور چادروں پر محصول بڑھا دیا گیا محصول میں مختلف اِضافوں سے ۱۶۶۸ کروڑ کی مزید آمدنی کی توقع تھی جبکہ مختلف رعایتوں کی وجہ سے آمدنی میں تخفیف ۲۹۶۶۸ کروڑ تھی۔ اِس طرح محصول کے رد و بدل کی وجہ سے مجموعی طور پر ۱۳ کروڑ کے خسارے کی توقع تھی۔

برآمداتی محصول کو جیوں کا تیوں چھوڑ دیا گیا۔ درآمداتی محصول بڑھا دیے گئے۔ بنیادی امپورٹ ڈیوٹی کے علاوہ ایک سر چارج بھی لگایا گیا جو ۶۵-۱۹۶۴ء کے محصول کا ۱۰ فی صدی تھا۔

مختصر یہ کہ ۶۶-۱۹۶۵ء کے بجٹ کی دو خصوصیات تھیں۔ ایک تو یہ کہ برسوں بعد بجٹ کی آمدنی خرچ سے زیادہ تھی اور دوسرے یہ کہ ایک مدّت بعد کچھ محصول کم کیے گئے تھے جس کا مقصد اُن عوام کو کچھ راحت دینا تھا جو مختلف محاذوں پر شدید قلتوں کا سامنا کر رہے تھے۔

سچین چودھری کا عام فہم بجٹ، ۶۷-۱۹۶۶ء

تیسرے پلان کی تمام مدّت میں قیمتیں برابر بڑھتی رہیں جس کی وجہ سے مصارف زندگی اور مصارف پیداوار دونوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ اِس پر طرہ یہ کہ مصارف دفاع بڑھ گئے۔ زرمبادلہ کی

کمی کی وجہ سے بیرونی خام مال کی قلت تھی - پیداوار کی بے استعمال استعداد دن بدن بڑھ رہی تھی۔ اور روز افزوں آبادی کا پیٹ بھرنے کا مسئلہ شدید ہوتا جا رہا تھا - مسٹر چودھری نے محسوس کیا کہ ان شدید معاشی مسائل کا ایسا عقلی حل نکالنے کی ضرورت تھی جو عام فہم تجزیے پر مبنی ہو - چنانچہ پیچیدہ مسائل کے عام فہم تجزیے کی بنیاد پر انھوں نے ۶۷-۱۹۶۶ء کا بجٹ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا یہ بہت سیدھا سادہ بجٹ تھا - آگے چل کر عقلی نظریے نے انھیں روپے کی قیمت کم کرنے کی ترغیب دی - چنانچہ ۵ جون ۱۹۶۶ء کو روپے کی قیمت میں ۵ء۳۶ فی صدی کی کمی کر دی گئی۔

۶۷-۱۹۶۶ء کا بجٹ ایک ایسی دستاویز تھا جو آسانی سے سمجھ میں آ سکتی تھی - بجٹ میں مزید ٹیکسوں کی تجاویز تھیں جن سے مرکزی خزانے کو ۱۰۱ کروڑ کی رقم ملنے کی توقع تھی - اس کے علاوہ دوسری تجاویز بھی تھیں جن سے صوبائی حکومتوں کو ۵۴ کروڑ مل سکتے تھے۔

آیئے دیکھیں کہ ۶۷-۱۹۶۶ء کے بجٹ کی مجوزہ تبدیلیوں کے مالی نتائج کیا نکلتے تھے - جہاں تک اجتماعی ٹیکس کا سوال ہے توقع تھی کہ اجتماعی آمدنی پر کم و بیش ۱۰ فی صدی ٹیکس سے ۷ء۳۶ کروڑ کی آمدنی ہوگی - مسٹر چودھری نے اُن چار ٹیکسوں کو ختم کر کے یا ان میں رد و بدل کر کے بڑی ہمت کا ثبوت دیا جن سے سرمایہ کار بہت نالاں تھے - ان میں پہلا بونس اشو ٹیکس تھا جو دیسی کمپنیوں کو بونس کی اعلان کردہ رقم کا ½ ۱۲ فی صدی ادا کرنا ہوتا تھا - یہ ٹیکس ختم کر دیا گیا - دوسرا ایکوئٹی ڈیویڈنڈ ٹیکس تھا - کمپنیاں معمولی شیئر کیپیٹل پر جو منافع تقسیم کرتی تھیں، یہ ٹیکس اس پر ½ ۷ فی صدی کے حساب سے لگتا تھا - اس ٹیکس میں یہ تبدیلی کی گئی کہ ادا شدہ معمولی سرمائے کے ۱۰ فی صدی تک کو ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا گیا - یہ تبدیلی بہت پہلے سے لانے کی ضرورت تھی کیونکہ پچھلے چند برسوں میں سُود کی شرح میں اضافے کی وجہ سے لون اور پریفرنشل کیپیٹل کے مقابلے میں معمولی شیئر پر منافع نسبتاً کم ہو گیا تھا - تیسرا ٹیکس یعنی کمپنی پرافٹ ٹیکس ۲۴ فی صدی سے گھٹا کر ۲۰ فی صدی کر دیا گیا - یہ تخفیف بہت معمولی تھی، خصوصاً اس بات کے پیش نظر کہ اجتماعی آمدنیوں پر ۱۰ فی صدی کا عام ٹیکس تجویز کیا گیا تھا - چوتھا ٹیکس یعنی کیپیٹل گینس ٹیکس جو شیئر ہولڈر اس وقت ادا کرتے ہیں - جب انھیں بونس شیئر ملتے ہیں، ذاتی ٹیکس کے زُمرے میں آتا ہے - یہ ٹیکس ختم نہیں کیا گیا لیکن اس میں یہ تبدیلی لائی گئی (یہ ٹیکس بونس شیئر ملنے کے وقت نہیں عائد ہوگا بلکہ اس وقت لگے گا جب ان شیئروں کی رقم واقعی وصول ہوگی (یعنی بونس شیئر اس وقت آمدنی تصور کیے جائیں گے جب اُن کی رقم وصول کی جائیگی۔)

جب ہم غیر اجتماعی سکٹر (NON-CORPORATE SECTOR) پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ انکم ٹیکس کے لیے کم سے کم آمدنی کی حد بڑھادی گئی ہے جس کی وجہ سے کم آمدنی والوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ ۴۰۰۰ روپے سے کم آمدنی والے افراد اور ۷۰۰۰ روپے سے کم آمدنی والے غیر منقسم ہندو خاندان اِنکم ٹیکس سے مستثنیٰ کردیے گئے جس کا یہ مطلب ہے کہ چھوٹ کی حد افراد کے لیے تین ہزار روپئے سے بڑھاکر چار ہزار روپے اور غیر شادی شدہ افراد کے لیے ۲۰۰۰ سے بڑھاکر ۲۵۰۰ روپے اور دو بچوں والے شادی شدہ لوگوں کے لیے ۳۳۰۰ روپے کے بجائے ۴۸۰۰ روپے کردی گئی۔ مسٹر چودھری نے غیر منقسم ہندو خاندان کے لیے چھوٹ کی حد ۶۵۰۰ روپے کے بجائے ۷۰۰۰ روپے کردی۔ اُنھوں نے مسئلے کا جو سیدھا سادہ حل نکالا اُس سے اُن لوگوں کو یقیناً تشفّی ہوئی ہوگی جو مہنگائی کے سب سے زیادہ شکار تھے۔ اِس کے علاوہ اُن بے شمار آدمیوں کو جن پر بہت معمولی ٹیکس واجب ہوتا تھا، انکم ٹیکس سے مستثنیٰ کرکے اِنکم ٹیکس کے عملے کو بڑی دردِ سری سے نجات دی گئی اور مصارف بھی گھٹ گئے۔

دوسری خاص تبدیلی یہ لائی گئی کہ اینوئٹی ڈپازٹ جس کو ذاتی ٹیکس کی ایک قسم تصور کرنا چاہیے، اُس کی استثنیٰ کی حد ۱۵۰۰۰ سے بڑھاکر ۲۵۰۰۰ روپے کردی گئی لیکن مستثنیٰ لوگوں میں سے اگر کوئی اینوئٹی ڈپازٹ کرنا چاہے تو کرسکتا تھا اور اس کو جمع شدہ رقم پر ٹیکس کی رعایت حاصل تھی۔

وزیر مالیات نے اکسپنڈیچر ٹیکس کو انتظامی وجوہ سے ختم کیا۔ اِس ٹیکس سے مشکل سے ۶۰ لاکھ کی آمدنی ہوتی تھی جبکہ اس کی وجہ سے اِنتظامی عملے پر بڑا بوجھ تھا اور ٹیکس ادا کرنے والوں کو بڑی دشواریاں پیش آتی تھیں۔

اسٹیٹ ڈیوٹی اور گفٹ ٹیکس میں بھی کچھ تبدیلیاں لائی گئیں۔ دو برس کے اندر دیے گئے تحفے اسٹیٹ کا حصّہ شمار کیے جائیں گے۔ پہلے یہ مدت ایک سال تھی۔ اسٹیٹ ڈیوٹی کے درمیانی سلیبوں پر ڈیوٹی بڑھادی گئی۔ ایک لاکھ سے دو لاکھ کے سلیبوں پر ڈیوٹی ۸ فی صدی کے بجائے ۱۰ فی صدی، ۲ ½ لاکھ سے ۵ لاکھ تک ۱۵ فی صدی کے بجائے ۲۵ فی صدی اور ۵ لاکھ سے ۱۰ لاکھ تک ۲۵ فی صدی کے بجائے ۳۰ فی صدی کردی گئی۔ گفٹ ٹیکس میں استثنیٰ کی حد ۵ ہزار سے بڑھاکر دس ہزار کردی گئی۔ زیادہ سے زیادہ حاشیائی شرح (MARGINAL RATE) ۵۰ فی صدی برقرار رہی لیکن اس کا نفاذ ۱۵ لاکھ سے اوپر کے سلیب پر ہوتا تھا۔ گفٹ ٹیکس کو ہلکا کرنے اور اُس کو

اسٹیٹ ڈیوٹی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کا مقصد کرشنا چاری کی مالیاتی پالسی کی خامی کو دور کرنا تھا۔

اب براہِ راست ٹیکس کی طرف رجوع کیجیے۔ صاف دانے دار شکر پر محصول ۶۵ء۲۸ کے بجائے ۳۷ روپے فی کوئنٹل کر دیا گیا۔ اُس کی مناسبت سے کھانڈسار ی کے محصول میں بھی اِضافہ کیا گیا۔ سگار، سگرٹ اور خام تمباکو جو سگرٹوں کے بنانے اور پائپ کی تمباکو تیار کرنے میں استعمال ہوتی تھی، سب پر محصول ۲۵ فی صدی کے بجائے ۳۰ فی صدی کر دیا گیا۔ ڈیزل آئل پر ۵۰ روپے فی کیلولیٹر محصول بڑھا دیا گیا۔ مختلف سُوت کے دھاگوں اور کپڑوں پر محصول بڑھا دیا گیا لیکن موٹے دھاگے پر کوئی اِضافہ نہیں کیا گیا۔ اِسی کے مطابق ریان اور دوسرے مصنوعی ریشوں پر بھی ڈیوٹی بڑھا دی گئی۔ دو نئی چیزوں یعنی بصری شیشوں کو سفید کرنے والے اجزا (OPTICAL BLEACHING) اور کیمیاوی مصفہات پر پہلی بار محصول لگایا گیا۔

صوبوں کو مزید مالی وسائل فراہم کرنے کے دو طریقے نکالے گئے۔ پہلا یہ کہ مرکز کے بین الریاستی سیلس ٹیکس کو ۲ فی صدی سے بڑھا کر ۳ فی صدی کر دیا گیا جو یکم جولائی ۱۹۶۶ء سے نافذ ہوا۔ دوسرے وہ اشیا جن کو بین الریاستی تجارت کے لیے مخصوص اہمیت کی قرار دیا گیا تھا اُن پر سیلس ٹیکس کی حد ۲ فی صدی سے بڑھا کر ۳ فی صدی کر دی گئی۔ یہ ایک اجازتی ترمیم (PERMISSIVE AMENDMENT) تھی جس سے صوبوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اگر چاہیں تو کوئلے، روئی، سُوت، کھال، چمڑے، لوہے فولاد، جوٹ اور روغنی بیجوں پر سیلس ٹیکس میں ۳ فی صدی کی حد کے اندر کمی بیشی کر سکتے تھے۔

مختصر یہ کہ مسٹر چودھری کا بجٹ بہت سیدھا سادہ اور عام فہم تھا اور اس اعتبار سے قابلِ تعریف تھا۔ لیکن وزیر مالیات نے جو شعبدہ بازی کرنے کی کوشش کی اُس سے نہ عوام خوش ہوئے اور نہ صنعت کار مطمئن ہوئے۔ جلد ہی اُن کو یہ اندازہ ہو گیا کہ معیشت کی گہری خامیاں دور کرنے کے لیے صرف بجٹ کا طریقہ ناکافی ہے۔ چنانچہ ۵ رجون ۱۹۶۶ء کو انھوں نے روپے کی قیمت میں ۶۵ء۳ کی کمی کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن روپے کی تقلیل قدر جیسا اقدام بھی اُن بے پناہ مشکلات کو دور نہ کر سکا۔ جو ہمارے معاشی اُفق پر بادل کی طرح چھائی ہوئی تھیں۔

مُرارجی کا متوازن بجٹ، ۶۸-۱۹۶۷ء

دو مسلسل خشک سالیوں اور روپے کی تقلیل قدر کی پالسی کی خراب تعمیل نے ہندوستانی

معیشت کو تقریباً مفلوج کر دیا۔ تقلیل قدر اور خشک سالی نے افراطِ زر کا دباؤ بڑھا دیا اور منصوبہ بندی کا عمل تقریباً ٹھپ پڑ گیا۔ اِس پس منظر میں کہ قیمتیں بڑھ رہی تھیں اور منصوبہ بندی کی مشین رُک گئی تھی مُرار جی کو استحکام اور ترقی حاصل کرنے کے لیے متوازن بجٹ بنانے کا کرتب دکھلانا تھا۔

مرارجی نے بجٹ پیش کرتے وقت اعلان کیا کہ معاشی استحکام کے لیے یہ ضروری ہے کہ خسارے کے بجٹ کی پالسی ختم کی جائے۔ انھوں نے ایمانداری سے اِس بات کی کوشش کی کہ بجٹ متوازن ہو اور ملک کی بگڑی ہوئی اور بد نظم معیشت کو استحکام حاصل ہو۔ چنانچہ ۶۸-۱۹۶۷ء کا بجٹ کم و بیش متوازن تھا بلکہ مصارف کے مقابلے میں آمدنی ۵۸ لاکھ کے بقدر زائد دکھائی گئی تھی۔

مزید ٹیکسوں کے ذریعے بجٹ میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مرارجی نے نہ صرف نئے ٹیکس لگائے بلکہ بہت زیادہ ٹیکس لگائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۶۸-۱۹۶۷ء کے مالی سال میں مرکز کی ٹیکس لگانے کی کوشش جیسی شروع میں معلوم ہو رہی تھی اُس سے زیادہ تھی۔ بظاہر ۹۶ کروڑ کی مزید آمدنی کی توقع تھی لیکن اس سے پوری کہانی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اوّل تو یہ تخمینہ پورے سال کے لیے نہیں تھا کیونکہ جہاں تک ۶۸-۶۷ کے مالی سال کا سوال ہے یہ تجاویز اس کے صرف ایک حصّے کے لیے تھیں۔ اگر پورے سال کو لیا جائے تو ٹیکسوں سے آمدنی ۸۳ کروڑ تک پہنچ جاتی تھی اور اگر اس رقم کو بھی لے لیا جائے جو قابلِ تقسیم ٹیکسوں میں صوبوں کا حصّہ تھا تو ٹیکسوں سے مجموعی آمدنی ۱۰۶ کروڑ ہو جائیگی۔ اِس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بجٹ کو متوازن کرنے کے لیے مرارجی نے ٹیکسوں کا بہت زیادہ سہارا لیا۔

براہِ راست ٹیکسوں کو کچھ منتخب اور معمولی رعایتیں دی گئیں۔ موجودہ ٹیکس میں غیر شادی شدہ اور دو بچّوں والے شادی شدہ لوگوں کو جو رعایتیں دی جاتی تھیں اُن کے مطابق مرارجی نے چار سو روپے کا الاؤنس اُن مقیم لوگوں کو دیا جن کی آمدنی ۱۰ ہزار سے زیادہ نہیں تھی اور جنھیں اپنے والدین یا والدین کے والدین کی کفالت کرنی پڑتی تھی۔ ٹیکس کی یہ رعایت آمدنی کے پہلے سلیب کی پانچ فی صدی کے برابر تھی۔ اِس تجویز کا مقصد یقیناً قابلِ تعریف ہے لیکن ایسی اعلیٰ تجاویز کے ساتھ مشکل یہ ہوتی ہے کہ ان کی وجہ سے بعض قسم کی بے ضابطگیاں اور بے اِنصافیاں رُونما ہوتی ہیں مثلاً فرض کیجئے کہ کوئی شخص اپنی بیوہ بہن کی کفالت کرتا ہے قاعدے کے مطابق وہ اِس رعایت کا حقدار نہیں ہے۔ اِس کے علاوہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک ہی والدین کی کفالت کی بنیاد پر ایک سے زیادہ بھائی الگ الگ اِس رعایت سے مُستفید ہو رہے ہوں اگرچہ کفالت مشترک ہو بلکہ ہو سکتا ہے کوئی

بھائی اِس کفالت میں بالکل ہی شریک ہو۔ بے کمائی آمدنی والوں کے ساتھ بھی معمولی رعایت کی گئی اور ایسی آمدنی پر ۱۵ ہزار کے بجائے ۲۰ ہزار تک سرچارج سے چھوٹ دی گئی۔

ذاتی ٹیکسوں میں بھی دُو رعایتیں کی گئیں۔ دینے والے سال کے اندر کے ۵۰۰ تک کے اپنے منافع کو اس رقم سے خارج کر سکتے تھے جس پر انھیں ٹیکس دینا تھا بشرطیکہ یہ نفع ہندوستانی کمپنیوں سے حاصل ہوا ہو۔ اِس رعایت کا مقصد متوسط اور کم آمدنی والے طبقوں کی ہمت افزائی کرنا تھا کہ یہ اپنا سرمایہ شیئر میں لگائیں۔ دوسری رعایت یہ دی گئی کہ اب تک ٹیکس دینے والے افراد اور غیر منقسم ہندو خاندانوں کو اِس رقم پر مجموعی آمدنی کی ۲۵ فی صدی تک کی چھوٹ ملتی تھی جو زندگی کے بیمے، سرکاری اور منظور شدہ غیر سرکاری پراوڈنٹ فنڈ اور ڈاک خانے میں میعادی امانت کی مد میں جمع کرتے تھے۔ نئے بجٹ میں یہ چھوٹ کی حد ۲۵ فی صدی کے بجائے ۳۰ فی صدی کر دی گئی۔

مرارجی نے منظم اور اجتماعی حلقے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ صرف ان کمپنیوں کو کچھ معمولی رعایتیں دے دیں جن کے سامنے بے استعمال استعداد کا مسئلہ تھا۔ یہ رعایت یوں دی گئی کہ اُن دشواریوں کو دُور کر دیا گیا جو غیر معاشی کمپنیوں کے مناسب اختلاط میں مانع تھیں۔ ٹیکس ہالی ڈے کو زیادہ بامعنی بنانے کے لیے مرارجی نے فیصلہ کیا کہ ۱۹۷۵-۷۶ء کے مالی سال میں جن رقموں کو معافی کی رعایت کے لیے نہیں استعمال کیا جا سکا اُنھیں کاروبار کی ابتدا سے آٹھ سال تک اگلے سال کے حساب میں شامل کرنے کی اجازت ہوگی۔ اِس اقدام کا مقصد بیرونی سرمائے کو ترغیب دینا تھا۔ ملک میں سائنسی تحقیق کو ترقی دینے کی غرض سے ۳۵ فی صدی کی ترجیحی شرح کے حساب سے ایک ترقیاتی چھوٹ دی گئی۔ یہ چھوٹ اُن آلات اور کارخانوں پر تھی جو ۳۱ مارچ ۱۹۷۶ء سے پہلے سائنسی تحقیق کی غرض سے لگائے گئے تھے۔

جہاں تک بالواسطہ ٹیکسوں کا سوال ہے، زرِ مبادلہ کی ناموافق صورت حال کو روکنے کے لیے کئی چیزوں پر برآمدی ڈیوٹی کم کر دی گئی لیکن وسائل میں اضافے کی غرض سے کچھ چیزوں پر محصول بڑھا دیا گیا۔ محصول میں اضافے کے کئی جواز تھے۔ محصول اُن اشیا پر بڑھایا گیا جہاں (۱) برآمدات بڑھانے کے لیے اندرونی صَرف کم کرنا ضروری سمجھا گیا (۲) جہاں صنعت و حرفت کو بہت منافع ہو رہا تھا (۳) جہاں قیمتوں میں تھوڑا سا اضافہ سماجی اعتبار سے نامناسب نہیں سمجھا گیا۔ مزید اس کا بھی اطمینان کر لیا گیا کہ ضروری اشیا کی قیمتوں پر کوئی اثر نہ پڑے گا اور نہ ان صنعتوں کی مصنوعات کی طلب متاثر نہیں ہوگی جن کی پیداواری استعداد استعمال سے زائد تھی۔

جن چیزوں پر محصول میں اِضافہ کیا گیا ان میں مندرجہ ذیل اشیا شامل تھیں: کافی، جوٹ کی بنی چیزیں، سگرٹ، پٹرول سے بنی چیزیں، مصنوعی اور کیمیاوی رال (RESINS)، پلاسٹک، ریان اور مصنوعی ریشے، المونیم، روئی کے بٹے ہوئے سُوت اور دھاگے جن سے عمدہ قسم کے کپڑے پاور لوم کے ذریعے بنتے تھے۔ جن نئی اشیا پر محصول لگایا وہ یہ تھیں: ربر کے پائپ، ٹیوب اور پلیٹ۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ چائے کے محصول میں اِضافے کے اثر کو زائل کرنے کے لیے چائے کے برآمداتی محصول میں ۲۵ پیسے فی کیلو کی کمی کر دی گئی۔

برآمداتی محصول میں جوٹ کے سامان پر ڈیوٹی کافی کم کر دی گئی تاکہ یہ چیزیں اپنے بدل کا مقابلہ کر سکیں۔ مینگنیز اور خام مینگنیز پر ریل کے کرائے کے اضافے کا جو اثر پڑا تھا اس کو زائل کرنے کے لیے اِکسپورٹ ڈیوٹی کم کر دی گئی۔

ہندوستان کی تباہ معیشت کو جو منصوبہ بندی کے چٹیل میدان میں ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی، ۱۹۶۷-۶۸ء کے بجٹ میں استحکام دینے کی کوشش کی گئی۔ غالباً متوازن بجٹ کے ذریعے استحکام کی ایماندارانہ کوشش زیادہ بہتر تھی بمقابلے اِس کے کہ خسارے کے بجٹ کے ذریعے سرمایہ کاری بڑھائی جائے۔

مُرارجی کا خسارے کا بجٹ، ۶۹-۱۹۶۸ء

متواتر خشک سالی، اناج اور خام اشیا کی قلت، چڑھتی ہوئی قیمتیں، مدھم صنعتی طلب، بچت اور برآمدات کی کمی اور کیپیٹل مارکٹ کی سستی، اِن سب کی وجہ سے آبادی کے تمام طبقوں پر بددلی اور ناامیدی طاری تھی۔ لیکن ۱۹۶۷-۶۸ء میں زراعتی پیداوار بہتر ہوئی جس کی وجہ سے آمدنیاں بڑھیں اور حالات سدھرنا شروع ہوئے۔ وزیر مالیات نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُن اقدام کا اعلان کرنے میں دیر نہیں کی۔ جن سے نجی سرمائے کو حرکت میں آنے میں مدد ملے اور کیپیٹل مارکٹ میں پھر سے جان پڑ سکے۔ ایسا لگتا ہے کہ ۶۹-۱۹۶۸ء کے بجٹ کا بنیادی مقصد نجی سرمایہ کاری میں پھر سے اعتماد پیدا کرنا تھا جو سرد بازاری کے میلان کا شکار تھی۔ بجٹ میں منظم اور اجتماعی سکٹر کو چند ہی رعایتیں دی گئیں۔ ٹیکس کو آسان بنانے اور حصصی سرمایہ کاری (EQUITY — INVESTMENT) کی فضا بہتر کرنے کی غرض سے حصصی منافع کی زائد تقسیم پر ڈیویڈنڈ ٹیکس ختم کر دیا گیا اور کمپنی کے منافع پر سر ٹیکس ۳۵ فی صدی سے گھٹا کر ۲۰ فی صدی کر دیا گیا تاکہ کارکردگی بڑھے

کی ترغیب ہو۔ دوسری طرف اینوئٹی ڈپازٹ ختم کردینے سے یہ اُمید تھی کہ زیادہ نجی بچت کیپیٹل مارکٹ کی طرف رجوع ہوگی۔ اس کے علاوہ اُن صنعتوں کو محرکات فراہم کی گئیں جو زراعتی پیداآوری کو ترقی دینے کی کوشش کررہی تھیں یا بیرونی منڈیوں کے لیے سامان بنارہی تھیں۔ زراعت میں لگنے والی اشیا کی فراہمی پر کمپنیاں جو صرف کررہی تھیں اُس کا ۱/۳ حصّہ کاروبار کے منافع سے خارج کرنے کی اجازت تھی (گویا اتنے حصّے پر ٹیکس نہیں دینا تھا)۔ بیج تیار کرنے کی صنعت کو ترجیحی صنعت کا درجہ دیا گیا۔ بناسپتی، ڈیری اور فارم کی دوسری اشیا بنانے پر ۳۵ فی صدی کی ترقیاتی چھوٹ دی گئی۔ بیرونی کمپنیوں کو چھوڑکر باقی ٹیکس دینے والی کمپنیوں کو اُن اخراجات پر اکسپورٹ مارکٹ ڈیولپمنٹ الاؤنس دیا گیا جو یہ کمپنیاں برآمدات کو ترقی دینے پر صرف کرتی تھیں۔ الاؤنس کی شرح ان اخراجات کی ۱/۴ مقرّر کی گئی۔

۱۹۷۸-۷۹ء کے بجٹ میں کیپیٹل مارکٹ کو تقویت دینے اور پنپنے کے لیے جن رعایتوں کا اعلان کیا گیا وہ ایسے مالیاتی اقدام تھے جو سرد بازاری کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری تھے لیکن جدید معاشیات کا طالب علم خوب جانتا ہے کہ معیشت میں سرد بازاری کا مؤثر مقابلہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مالیاتی اور سِکّہ جاتی دونوں محاذوں پر بیک وقت حملہ کیا جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بجٹ میں رعایتوں کے اعلان کے تقریباً ساتھ ساتھ بینک کی شرح ۹ فی صدی سے گھٹاکر ۵ فی صدی کردی گئی جس کی وجہ سے قرض لینا نسبتاً آسان ہوگیا۔

سرمائے کی منڈی اور برآمدات کو ترغیبات فراہم کرنے اور زراعت سے متعلق صنعتوں کو خاص رعایتیں دینے کی کوشش میں مُرارجی کو صنعتی احیا کے لیے آمدنی کا کچھ حصّہ قربان کرنا پڑا۔ ۱۹۷۹-۸۰ء کی ٹیکس کی تجاویز بیشتر اِن اقدام تک محدود تھیں: آمدنی کے بالائی خانوں کے اِنکم ٹیکس اور ولتھ ٹیکس کی شرح میں اِضافہ، بعض اشیا پر، جن میں کچھ عام استعمال کی اشیا بھی شامل تھیں، نئے محصول کا نفاذ اور ڈاک اور تار کے محصول میں عام اِضافہ۔ ڈاک کے محصول میں ایک دم اضافے کی وجہ سے عوام پر بوجھ بہت بڑھ گیا۔

ہندوستان میں ذاتی ٹیکس آمدنی کے ہر خانے کے لیے تقریباً اُس سطح پر پہنچ گیا تھا جہاں مزید ٹیکس کی گنجائش نہیں رہی ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مزید روپیہ کمانے کی ترغیب کم ہوگئی۔ چنانچہ مرارجی ذاتی ٹیکس کے معاملے میں اور زیادہ سختی نہیں برت سکتے تھے۔ انھوں نے اینوئٹی ڈپازٹ اسکیم ختم کردی اور منافع کی آمدنی پر انکم ٹیکس کو زیادہ کشادہ کردیا۔ ڈاکٹروں اور وکیلوں جیسے خود روزگار

(SELF EMPLOYED) لوگوں کو پس انداز کرنے کا وسیلہ فراہم کرنے کی غرض سے ایک پبلک پراوڈنٹ فنڈ قائم کردیا گیا ہے۔ اِس فنڈ میں جو رقمیں جمع کی جاتی ہیں اُن پر انکم ٹیکس اور دولت ٹیکس کی وہی رعایتیں دی جاتی ہیں جو منظور شدہ پراوڈنٹ فنڈوں کے نرخ کا کو حاصل ہیں۔ ٹیکس کے موجودہ نظام کو زیادہ آسان بنانے کی غرض سے کمائی اور بے کمائی آمدنیوں پر الگ الگ سرچارج ختم کردیا گیا اور صرف ۱۰ فی صدی کے موجودہ اسپیشل سرچارج کو باقی رکھا گیا۔ ٹیکس کے تدریجی اِضافے کے اصول کو برقرار رکھنے کے لیے ایک لاکھ سے ۲½ لاکھ تک کی آمدنی پر ٹیکس کی شرح ۶۵ فی صدی کے بجائے ۷۰ فی صدی اور ۲½ لاکھ سے اُوپر ۶۵ فی صدی سے بڑھا کر ۷۵ فی صدی کردی گئی۔ اِس طرح ۱۰ فی صدی کے اسپیشل سرچارج کو لے کر ٹیکس کی زیادہ سے زیادہ مختتم شرح ۸۲٫۵ فی صدی ہوگئی۔

مزید آمدنی کے لیے بالواسطہ ٹیکس لگاتے وقت مرارجی نے نئے ٹیکس لگانے کے لیے یا ٹیکس میں اِضافے کے لیے یا تو آسائشات کو منتخب کیا یا ایسی اشیا کو جن کا استعمال ضروری نہیں تھا۔ وزیر مالیات نے نئے ٹیکس کے لیے چھے اشیا منتخب کیں۔ ان کے علاوہ پانچ اشیا پر ٹیکس کی موجودہ شرح بڑھا دی گئی۔ چھے اشیا جن پر پہلی بار محصول لگایا گیا یہ تھیں: (۱) انگریزی مٹھائیاں اور چاکلیٹ (۲) مصنوعی چمڑے کا کپڑا اور ریکسین وغیرہ (۳) کشیدہ کاری کی ہوئی چیزیں (۴) ریڈیو کے والو اور ٹرانسسٹر (۵) لوہے کا بنا ہوا فرنیچر اور (۶) کارک کی ڈاٹیں (CORK CROWN)۔

جن چیزوں کے محصول میں کافی اِضافہ کیا گیا وہ یہ تھیں: تمباکو، جوٹ کی بنی چیزیں، ریفریجریٹر اور ایرکنڈیشننگ کے آلات۔ بعض کپڑوں کے محصول میں اِضافہ کیا گیا لیکن اس کا ازالہ اُن رعایتوں سے ہوگیا جو سُوت کے دھاگے پر دی گئیں۔

جہاں تک کسٹم ڈیوٹی کا سوال ہے اُن چیزوں پر محصول بڑھایا گیا جو آسائشات میں شامل تھیں مثلاً شراب، یا اُن چیزوں پر جن پر منافع بہت زیادہ تھا مثلاً لونگ، الائچی، تیز پات، یا اُن چیزوں پر جن کی اندرونی پیداوار بڑھ رہی تھی مثلاً لوہے اور فولاد کے ڈلے جیسی بعض چیزیں ... آمیزش کیے ہوئے فولاد اور سلیکان اسٹیل کی چادریں۔ ان نئے محصولوں اور پرانے محصولوں ... سے ۳،۵ کروڑ روپے مزید آمدنی کی توقع تھی۔ کیمیاوی اشیا، پلاسٹک اور مصنوعی ... محصول کی مؤثر شرح میں اضافے سے مزید ۱۲ کروڑ آمدنی کی توقع کی گئی۔

اِن تمام کوششوں کے باوجود وزیر مالیات کو آمد و خرچ کے درمیان ۲۹۰ کروڑ کا ...

کے چھوڑنا پڑا۔ اُن کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے معیشت کو سرد بازاری کی پیدا کردہ دشواریوں پر قابو پانے میں مدد ملیگی اور آگے چل کر بے استعمال استعداد کے زیادہ استعمال کی وجہ سے پیداوار بڑھیگی۔ یاد رکھنا چاہیے کہ معقول تحفظات کے بغیر زیادہ مالیاتی خسارہ افراطِ زر کو بڑھادیتا ہے اور اُس کی وجہ سے ترقیاتی عمل کی تکلیفیں شدید تر ہو جاتی ہیں۔

مختصر یہ کہ ۶۹-۱۹۶۸ء کے بجٹ کا بنیادی مقصد کیپیٹل مارکٹ کو تقویت دینا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وزیر مالیات نجی سکٹر کو نہ صرف رعایتیں دے کر مطمئن تھے بلکہ وہ مالیاتی خسارے کا بھی سہارا اس اُمید پر لے رہے تھے کہ مستقبل قریب میں جب معاشی سرگرمی تیز ہوگی تو آمد و خرچ میں توازن قائم ہو جائے گا چنانچہ ۶۹-۱۹۶۸ء کے بجٹ کو ایک سلہ جاتی آلہ سمجھنا چاہیے جس کا مقصد معاشی پس روی کو روکنا تھا تاکہ صنعتی سرگرمی دوبارہ شروع ہوسکے اور اپریل ۱۹۶۹ء سے چوتھا پلان شروع کیا جاسکے۔

۷۰-۱۹۶۹ء کے لیے مُرارجی کا بجٹ

۷۰-۱۹۶۹ء کا بجٹ پچھلے چند مہینوں صنعتی سنبھالے کے پس منظر میں تیار کیا گیا۔ قومی آمدنی (۶۱-۱۹۶۰ء کی قیمتوں کے مطابق) جو ۶۶-۱۹۶۵ء میں ۷ء۵ فی صدی سے گھٹ گئی تھی۔ ۶۸-۱۹۶۷ء میں ۹ء۸ بڑھ گئی جس کی بنیادی وجہ اس سال کی بہترین فصل تھی۔ یقین ہے کہ ۶۹-۱۹۶۸ء میں اناج کی مجموعی فصل ۶۸-۱۹۶۷ء کی رکارڈ فصل یعنی ۹۶ء۹ کروڑ ٹن سے کم نہ ہوگی۔ صنعتی پیداوار جو ۱۹۶۵ء کے ... تقریباً ایک سطح پر قائم رہی، اس میں بھی ۱۹۶۸ء کے دوران ۵ فی صدی سے لے کر ۶ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ بیرونی مبادلات کے توازن کی صورت میں بھی نمایاں اضافہ ہوا۔ یہ بات ... ہے کہ ۷۰-۱۹۶۹ء کا مالی سال چوتھے پلان کا پہلا سال ہے۔ چنانچہ یہ بات آسانی سے سمجھ ... ہے کہ ۷۰-۱۹۶۹ء میں اتنے ٹیکس لگانے کی کوشش نہیں کی گئی جتنی پچھلے تین برسوں میں کی ... ۱۹۶۸ء میں جو ٹیکس تجویز کیے گئے اُن سے آمدنی کا تخمینہ (ڈاک اور تار کی آمدنی چھوڑ کر) ... کروڑ روپے صوبوں کا حصہ بھی شامل تھا۔ اِس کے مقابلے میں ۶۹-۱۹۶۸ء ... ۱۹۶۷ء میں ۸۰ کروڑ تھا۔

... بجٹ کے چار مقاصد معلوم ہوتے ہیں، صنعتی احیا کی رفتار تیز کرنا، قیمتوں کو ... مبادلات کا عدم توازن کم کرنا اور زراعتی خوش حالی سے سرکاری وسائل حاصل کرنا۔

مُرار جی نے اپنے بجٹ میں صنعتی سکٹر کو بحیثیت مجموعی زیادہ نہیں چھیڑا۔ دس ہزار سے لے کر ۲۰ ہزار تک کی آمدنیوں پر انکم ٹیکس کی بنیادی شرح میں جو اضافہ کیا گیا اُس سے کمپنیاں نہیں متاثر ہونگی بلکہ کمپنیوں کے منتظم متاثر ہونگے۔ نئی کمپنیوں اور نئے جہازوں کے لیے ٹیکس سے آزادی کی مدّت میں پانچ سال کی توسیع سے کاروبار کو تقویت پہنچے گی۔ سُوتی کپڑے اور جوٹ کی صنعتوں کو جو رعایتیں دی گئیں وہ ان صنعتوں کے نقصان کی تلافی میں مدد کریں گی اور ان کی تجدید اور توسیع تیزی سے ہو سکے گی۔ اس کے علاوہ جوٹ کی بنی چیزوں، چائے اور ابرق پر سے اکسپورٹ ڈیوٹی کم کرنے کی وجہ سے برآمدات کو تقویت ملے گی۔

اجتماعی ٹیکسوں سے متعلق بنیادی تجاویز یہ ہیں کہ نئی کمپنیوں اور جہازوں کے لیے ٹیکس سے آزادی کی مُدّت یکم اپریل ۱۹۷۱ء سے مزید پانچ سال کے لیے بڑھا دی جائے۔ ہندوستانی کمپنیوں کے منافع کی ٹیکس سے معافی کی حد ۵۰۰۰ روپے سے بڑھا کر ۱۰۰۰۰ کر دی گئی۔ ہندوستانی کمپنیاں جو فنی مہارت دوسری کمپنیوں کو فراہم کریں گی اُس کی فیس اور رایلٹی سے وصول ہونے والی رقم ۴۰ فی صدی تک ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگی۔ یہ اس لیے کیا گیا تاکہ بیرونی ملکوں سے غیر ضروری فنی مہارت نہ حاصل کی جائے اور مقامی فنی مہارت کی ہمّت افزائی ہو۔

براہِ راست ٹیکسوں کے معاملے میں کچھ اور بھی رعایتیں اور ترغیبات فراہم کی گئیں۔ سُوتی کپڑے کی صنعت کو ترجیحی صنعتوں کی فہرست میں داخل کر لیا گیا تاکہ اُس کو ترقیاتی الاؤنس مل سکے اور اس طرح صنعت کو جدید بنانے میں اُس کی ہمّت افزائی ہو سکے۔ مصنفوں اور فن کاروں کی بیرونی ممالک سے حاصل ہونے والی آمدنی کو ۲۵ فی صدی تک ٹیکس سے مُستثنیٰ کر دیا گیا۔

جہاں تک ذاتی ٹیکسوں کا سوال ہے ۱۰۰۰۰ روپے سے لے کر ۱۵۰۰۰ تک کی آمدنی پر ٹیکس کی شرح میں ۲ فی صدی کا اضافہ کر دیا گیا یعنی ۱۷ فی صدی کر دی گئی۔ اِسی طرح ۱۵۰۰۱ سے لے کر ۲۰۰۰۰ تک کی آمدنی پر ٹیکس کی شرح ۲۰ فی صدی کے بجائے ۲۲ فی صدی کر دی گئی۔

یہ ایک عام خیال ہے کہ دیہی سکٹر کی خوشحالی برابر بڑھ رہی ہے لیکن ملک کی عام معاشی ترقی میں جو حصّہ اُس کو لینا چاہیے وہ نہیں لے رہا ہے۔ چنانچہ ۷۰-۱۹۶۹ء کے بجٹ میں پہلی بار زرعی املاک پر ٹیکس تجویز کیا گیا۔ وزیر مالیات نے دولتہ ٹیکس ایکٹ میں مناسب ترمیم تجویز کی تاکہ زراعتی زمینوں اور ان سے متّصل عمارتوں کو بھی اِس ٹیکس کی حد میں لایا جا سکے۔ کھڑی فصلیں، آلات اور ٹریکٹر جیسی مشینیں وغیرہ اس ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔ ڈیڑھ لاکھ تک کی زراعتی زمینوں کو زراعتی دولتہ ٹیکس سے

مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ چوتھے پلان کے مسودے سے ظاہر ہے کہ آنے والے چند برسوں میں منصوبہ بندی کی زیادہ توجہ زراعتی حلقے کی توسیع پر رہے گی۔ اِسی لیے وزیر مالیات نے دیہی سکٹر سے مزید وسائل حاصل کرنے کی جرأت کی۔

جہاں تک بالواسطہ ٹیکسوں سے آمدنی کے وسائل بڑھانے کا سوال تھا، مرارجی نے محصولوں اور کسٹم ڈیوٹی کو زیادہ تر منتخب کیا۔ تجویز کیا گیا ہے کہ سیمنٹ، بناسپتی سے بنی اشیا، بجلی کے پنکھوں، بلب اور ٹیوب، صابون، سوڈا ایش، کاسٹک سوڈا اور سوڈیم سلیکیٹ پر ٹیکسوں کی تصریحی شرحوں (SPECIFIC RATES) کو محصول بالواسطہ کی شرح میں بدل دیا جائے۔ بجلی کی گھریلو استعمال کی چیزوں اور بنی بنائی غذاؤں پر ۱۰ فی صدی کا بالواسطہ محصول لگایا گیا۔ جن لوگوں نے حال کی زراعتی خوشحالی سے فائدہ اٹھایا تھا، اُن کو محصولوں کے دائرے میں لانے کی غرض سے وزیر مالیات نے یہ تجویز کیا کہ کیمیاوی کھاد پر ۱۰ فی صدی کا بالواسطہ محصول اور بجلی سے چلنے والے پمپ پر ۲۰ فی صدی کا بالواسطہ محصول لگایا جائے لیکن بعد میں چھوٹے کسانوں کے خیال سے پمپ پر محصول کی تجویز ترک کر دی گئی اور کیمیاوی کھاد پر محصول برقرار رکھا گیا۔ جوٹ کے بنے سامان پر بنیادی محصول ۱۰۰ روپے فی ٹن بڑھا دیا گیا۔ اِسی طرح پٹرول پر ۷ پیسے فی لیٹر اور مٹی کے تیل پر ۴ پیسے فی لیٹر اور سگرٹوں پر ۶ فی صدی سے لے کر ۱۸ فی صدی تک محصول بڑھا دیا گیا۔ سیلولوسی اور غیر سیلولوسی ریشوں پر محصول میں ۲۰ پیسے اور ۱۲ روپے فی کیلوگرام کا بالترتیب اِضافہ کیا گیا۔ ریان کے دھاگے سے بنے رنگین کپڑوں کی عمدہ قسموں پر محصول بڑھا دیا گیا۔ — بعد میں سستے سوتی کپڑوں، سوت کے دھاگوں، پاورلوم کے بنے کپڑوں، ریان اور سیمنٹ کے لیے کچھ رعایتوں کا اعلان کیا گیا۔

سوتی کپڑے کی صنعت کو راحت دینے کے خیال سے کچھ قسم کے دھاگوں پر سے محصول ختم کر دیا گیا اور کچھ پر کم کر دیا گیا۔ یہ وہ دھاگے ہیں جو ہینڈلوم میں کام آتے ہیں اور ہینڈلوم کو اِس رعایت سے فائدہ ہوگا۔ ملیشیا پر محصول بالکل ختم کر دیا گیا اور جن چیزوں کو محصول کی رعایتیں دی گئیں وہ یہ تھیں: انگریزی مٹھائیاں، کشیدہ کاری کی بنی ہوئی چیزیں، بجلی کے والو، ٹیوب اور ٹرانسسٹر، سینما کے لیے فلمیں اور فولاد کے ڈلے اور وہ چیزیں جو کباڑ سے بجلی کی بھٹی والے بناتے ہیں۔ جب ہم کسٹم ڈیوٹی پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ چکنے تیلوں پر کسٹم ڈیوٹی ۱۵ فی صدی کے بجائے ½۲۷ فی صدی کر دی گئی اور درآمد کی ہوئی کاروں پر ۶۰ فی صدی سے بڑھا کر ۱۰۰ فی صدی۔ خشک میوے پر محصول کے لیے قیمت کا اندازہ کرنے کا جو طریقہ تھا اُس پر نظرثانی کی گئی۔ برآمدات کی ہمت افزائی کی غرض سے ٹاٹ پر

اکسپورٹ ڈیوٹی ۵۰۰ روپے فی ٹن سے گھٹا کر ۱۵۰ روپے کردی گئی۔ چائے پر اکسپورٹ ڈیوٹی ۲۰ فی صدی، یعنی ۵۰ پیسے فی کیلو گرام سے گھٹا کر ۱۵ پیسے کردی گئی۔ ابرق کے چھوٹے ٹکڑوں پر ڈیوٹی ۴۰ فی صدی کے بجائے ۲۰ فی صدی کردی گئی۔

ڈاک اور تار کے محکمے سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے کی غرض سے مُرار جی نے زیادہ تر اُن چیزوں کو منتخب کیا جو امیروں کے استعمال کی تھیں مثلاً مُبارکباد کے تار، ملٹیپل ٹیلی گرام، ٹیلکس اور دُوسری خدمات۔ ٹیلی فون کا کرایہ بڑھا دیا گیا۔ معلومات کے لیے اِنکوائری کو فون کرنے کے لیے پیسے دینے ہوں گے۔ ٹیلی فون کی شرح بڑھانے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ محکمہ اپنے اخراجات سے زائد آمدنی کر رہا ہے اور پچھلے چند برسوں میں اس کے کام کا معیار کافی گرا ہے۔

۷۰-۱۹۶۹ء کا بجٹ چوتھے پلان کی طرف ایک پُر اعتماد قدم ہے جس کے پس منظر میں نئی زراعتی ترقی، صنعتی احیا اور برآمدات میں اِضافے کا احساس کارفرما ہے۔ چوتھے پلان کے لیے وسائل کی تحصیل کا کام شروع کرتے وقت وزیر مالیات کو اُن ٹیکسوں سے احتراز کرنا تھا جن سے معاشی صحت یابی کے عمل میں رخنہ پڑے۔ چنانچہ مُرار جی نے بجٹ کی عام حکمت عملی کو استعمال کیا اور بالواسطہ ٹیکسوں کا سہارا لیا لیکن خسارے کی مالیات سے نہ بچ سکے۔ توقع ہے کہ بالواسطہ ٹیکسوں سے ۱۱۳٫۷۷ کروڑ کی مزید مجموعی آمدنی ہوگی۔ بجٹ میں خسارہ ۲۵۰ کروڑ ہے جو پچھلے سال کے تقریباً برابر ہے۔

پچھلے بجٹوں کی طرح یہ بجٹ بھی سب کو تو نہ خوش کر سکے گا لیکن اِس بات سے لوگ عام طور سے اِتفاق کریں گے کہ ۷۰-۱۹۶۹ء کا بجٹ نجی سکٹر کے لیے ایک چیلنج ہے کہ یہ چوتھے پلان کے ابتدائی برسوں میں معیشت کی صحت یابی میں پورے طور سے شریک ہو۔ اِس بجٹ میں معاشی صحت یابی کے عمل کو جاری رکھنے کے لیے بنیادی اجزا موجود ہیں لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ ترقی کی منزل تک صرف بجٹ کے سہارے سے نہیں پہنچا جا سکتا۔ پلان کے مقاصد کے حصول کے لیے سماج کے تمام طبقوں کی ضابطہ بند شرکت ضروری ہے۔

باب ۲۷

مرکز اور صوبوں میں مالی وسائل کی تقسیم

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے پاس ہونے سے مرکز اور صوبوں کے درمیان مالی وسائل کی تقسیم کے مسئلے کو اور زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی۔ اِس ایکٹ کے تحت مالی وسائل چار قسموں میں تقسیم ہوئے —— (الف) خالصتاً وفاقی وسائل (ب) خالصتاً صوبائی وسائل (ج) وہ ٹیکس جو مرکز اور صوبوں میں تقسیم ہوتے ہیں (د) وہ ٹیکس جو مرکز کو وصول کرکے صوبوں کے حوالے کردیتے ہیں۔

نیمیر اوارڈ (NIEMEYER AWARD) اور دیش مُکھ اوارڈ

۱۹۳۶ء میں سر آٹو نیمیر، برطانوی خزانے کے ایک ماہر، کو دعوت دی گئی کہ وہ تفتیش کرکے رپورٹ دیں کہ صوبوں کے حصّے کا تناسب کیا ہو اور یہ صوبوں میں کس طرح تقسیم کیا جائے۔ موصوف نے سفارش کی کہ اِنکم ٹیکس کا ۵۰ فی صدی حِصّہ صوبوں کو ملنا چاہیے۔ یہ رقم صوبوں میں کس تناسب سے تقسیم ہو۔ اِس کا انحصار کچھ تو آبادی اور کچھ (RESIDENCE) پر ہونا چاہیے۔ انھوں نے بعض خسارے والے صوبوں کے لیے نقد امدادی گرانٹ کی بھی سفارش کی۔ جہاں تک جوٹ درآمداتی محصول کا سوال تھا، سر نیمیر نے سفارش کی جوٹ پیدا کرنے والے صوبوں کا حِصّہ بڑھا کر ½ ۶۲ فی صدی کردیا جائے۔ حکومت نے یہ سفارشات منظور کیں اور اِن پر اگست ۱۹۴۷ء، یعنی آزادی کے وقت تک بغیر کسی تبدیلی کے عمل ہوتا رہا۔

نئے دستور میں وسائل کی تقسیم میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں لائی گئی اور تقریباً وہی تقسیم جاری رہی جو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت تھی لیکن اِنکم ٹیکس کی آمدنی کی تقسیم میں عارضی تناسب مقرر کیا گیا

جو نیمیر اوارڈ سے کچھ مختلف تھا۔ مرکز اور صوبوں کے درمیان آمدنی کی تقسیم کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے ۱۹۴۶ء میں اِن۔ آر۔ سرکار کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس نے سفارش کی کہ اِنکم ٹیکس اور کارپوریشن ٹیکسوں میں صوبوں کا حِصّہ ۵۰ فی صدی سے بڑھا کر ۶۰ فی صدی کر دینا چاہیے۔ حکومت نے یہ سفارش منظور نہیں کی۔

۱۹۴۹ء میں مسٹر چِنتامنی دیش مُکھ کو اس مسئلے پر دوبارہ غور کرنے کی دعوت دی گئی۔ اُنھوں نے اپنے کام کو انکم ٹیکس کی اُس آمدنی کی تقسیم تک محدود رکھا جو پاکستان میں ملنے والے صوبوں کا حِصّہ تھا۔ اُنھوں نے جوٹ کی اکسپورٹ ڈیوٹی کے عوض جوٹ پیدا کرنے والے صوبوں کے لیے ایک امدادی گرانٹ بھی شروع کرنے کی تجویز کی۔ دیش مُکھ ایوارڈ کے تحت مغربی بنگال اور پنجاب کا حِصّہ نیمیر اوارڈ کے مقابلے میں کم ہو گیا جبکہ بمبئی، یوپی، بہار، آسام، مدھیہ پردیش اور اُڑیسہ کا حِصّہ بڑھ گیا۔ مغربی بنگال کا حِصّہ نیمیر اوارڈ کے ۲۰ فی صدی سے گھٹ کر ۱۲ فی صدی ہو گیا۔ مغربی بنگال کے تقسیم زدہ صوبے کو یقیناً اِنکم ٹیکس کا زیادہ حِصّہ ملنا چاہیے تھا معلوم نہیں کس بنیاد پر دیش مُکھ نے مغربی بنگال کے حصّے میں کافی تخفیف کر دی اور بمبئی کا حِصّہ بڑھا دیا۔ علاقے اور تحصیل دونوں اعتبار سے بنگال زیادہ حقدار تھا۔

مسٹر دیش مُکھ نے جوٹ پیدا کرنے والے صوبوں کے لیے مندرجہ ذیل امدادی گرانٹ مقرر کی:

مغربی بنگال ۱۰۵ لاکھ، آسام ۴۰ لاکھ، بہار ۳۵ لاکھ اور اُڑیسہ ۵ لاکھ۔

ہندوستانی ریاستوں کی مالیاتی یک جہتی

مرکز اور اُس کے مختلف یونٹوں کے مابین مالی رشتوں کے ارتقا کے میدان میں آزادی کے بعد کا ایک اہم واقعہ ہندوستانی ریاستوں کا مالی الحاق ہے۔ اِنڈین یونین میں ریاستوں کے الحاق کے بعد سب سے پہلے سیاسی الحاق ہوا تاکہ ریاستیں ملک کے جمہوری نظام میں جگہ لے سکیں۔

حکومت نے محسوس کیا کہ صوبوں اور ریاستوں کے فرق کو ختم ہونا چاہیے چنانچہ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں مسٹر کرشنما چاری کی صدارت میں اِنڈین اسٹیٹس فائنانس انکوائری کمیٹی قائم کی گئی۔ کمیٹی نے سفارش کی کہ صوبوں کی طرح ریاستوں میں بھی مرکز کو اپنے اختیارات اپنی انتظامی ایجنسیوں کے ذریعے استعمال کرنے چاہئیں۔ چونکہ صوبے اور ریاستیں دونوں ہی یونین میں برابر کے شریک تھے اِس لیے مالیات کے معاملے میں مساوات ہونی چاہیئے۔

کمیٹی کی سفارش کے مطابق مرکز نے اپریل ۱۹۵۰ء سے آمدنی کے بعض مدات اِنتظامی بنیاد

پھر اپنے ہاتھ میں لے لیں اور واجب الادا ذمہ داریوں کا بھی تعین مرکز اور صوبوں کے درمیان کر دیا۔ اِس کے نتیجے کے طور پر مرکز کو ۳۶۲،۷۰۴ لاکھ کا فائدہ ہوا اور سابق ریاستوں کو جو ریاستوں کی فہرست پارٹ 'بی' میں شامل تھیں' ۹۸۱ لاکھ کا نقصان ہوا۔ مسٹر کرشنما چاری کے مشورے کے مطابق مرکز نے آمدنی کے اِس خلا کو پانچ سال تک پورے طور پر اور مزید پانچ سال تک تخفیف پذیر شرح سے پُر کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن مرکز کو حق تھا کہ ریاستوں کو ملنے والے اِنکم ٹیکس کے حصّے اور دوسری قابلِ تقسیم آمدنیوں کو اِس رقم میں سے وضع کر سکتا تھا جو آمدنی کے خلا کو پُر کرنے کے لیے ریاستوں کو ادا ہونی تھیں۔ نومبر ۱۹۵۶ء میں جب اسٹیٹس ری آرگنائزیشن کمیٹی کی سفارش کے مطابق ہندوستانی صوبوں کی ازسرِ نو تنظیم کی گئی تو پارٹ 'بی' کی بیشتر ریاستوں کو پارٹ 'اے' کی بڑی ریاستوں کے ساتھ منسلک کر دیا گیا چنانچہ جہاں تک پارٹ 'بی' کی ریاستوں کی آمدنی کے خلا کے مسائل تھے وہ عملاً حل ہو گئے۔

ہندوستانی مالیاتی کمیشن اور اُن کی سفارشات

پہلے فائنانس کمیشن کی رپورٹ ـــــ راشٹرپتی نے دستور کے آرٹیکل ۲۸۰ کے تحت نومبر ۱۹۵۱ء میں پہلا فائنانس کمیشن مقرر کیا۔ اِس کمیشن کے چار ممبر تھے اور مسٹر کے۔ سی۔ نیوگی اِس کے صدر تھے۔ کمیشن نے دسمبر ۱۹۵۲ء میں اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ کمیشن کی اہم سفارشات یہ تھیں:

(۱) **اِنکم ٹیکس سے آمدنی کی تقسیم** ـــــ تقریباً تمام صوبوں نے اِنکم ٹیکس میں زیادہ حصّے کا مطالبہ کیا تھا۔ اِس سلسلے میں مغربی بنگال کا یہ نظریہ قابلِ توجّہ ہے کہ اِنکم ٹیکس میں سے مرکز کا حصّہ نکالنے کے بعد باقی رقم اُن علاقوں کو دی جائے جہاں سے وہ رقم وصول ہوئی ہو۔ کمیشن نے فیصلہ کیا کہ اِنکم ٹیکس کی آمدنی کے ۵۰ فی صدی کے بجائے ۵۵ فی صدی حصہ صوبوں کے قابلِ تقسیم ذخیرے کو دیا جائے۔ جہاں تک صوبوں کے حصّوں کے تناسب کا سوال تھا کمیشن نے آبادی اور تحصیل دونوں کو تقسیم کی خاص بنیاد قرار دیا۔ کمیشن نے سفارش کی کہ اِنکم ٹیکس کی آمدنی کا ۲۰٪ حصّہ صوبوں میں تحصیل کے تناسب سے تقسیم کیا جائے اور بقیہ ۸۰٪ حصّہ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی کے تناسب سے۔ اہم صوبوں کا تناسب کمیشن کی سفارش کے مطابق یہ تھا: بمبئی ۱۷٫۵٪، مدراس ۱۵٫۲۵٪، مغربی بنگال ۱۱٫۲۵٪، بہار ۹٫۷۵٪، مدھیہ پردیش ۵٫۲۵٪، راجستھان ۳٫۷۵٪، اڑیسہ ۳٫۷۵٪، پنجاب ۳٫۲۵٪ اور آسام ۲٫۲۵ فی صدی۔

(۲) **مرکزی محصول** ـــــ دوسری جنگ عظیم کے دوران اور اُس کے بعد سے مرکزی محصولوں کی اہمیّت کافی بڑھ گئی۔ ۱۹۵۱ء میں جب کمیشن مقرر کیا گیا مرکزی محصول سے ۸۶ کروڑ کی آمدنی تھی چنانچہ

یہ قدرتی بات تھی کہ صوبائی حکومتیں کمیشن کے سامنے اپنے مطالبات پیش کریں۔ کمیشن کا خیال تھا کہ تمباکو (مع سگرٹ اور سگار)، ماچس اور بناسپتی گھی جیسی اشیا کا محصول تقسیم کے لیے زیادہ موزوں تھا۔ چنانچہ کمیشن نے سفارش کی کہ ان اشیا کے محصول کی آمدنی کا ۴۰ فی صدی صوبوں کو دے دیا جائے۔ جہاں تک اِس رقم کی تقسیم کا سوال تھا کمیشن نے آبادی کے تناسب کو معیار مانا اور صَرف کو معیار بنانے سے اِس لیے اِنکار کیا کیونکہ صَرف کے بارے میں قابلِ اعتماد اعداد و شمار نہیں تھے۔ مرکزی محصولوں کی آمدنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ یوپی کو سب سے زیادہ حِصّہ ملا ہے، یعنی ۱۸٫۲۸ فی صدی۔ بمبئی کا حِصّہ ۱۰٫۳۷ فی صدی، مدراس کا ۱۶٫۴۴ فی صدی اور مغربی بنگال کا ۱۲٫۷ فی صدی ہے۔

(۳) جوٹ کی اکسپورٹ ڈیوٹی کے عِوض امدادی گرانٹ —— کمیشن کی رائے تھی کہ جوٹ کی اکسپورٹ ڈیوٹی کے عِوض جو مالی امداد دی جائے اُس کا تناسب وہ نہ ہونا چاہیئے جو صوبے کی مجموعی آمدنی میں جوٹ کی اکسپورٹ ڈیوٹی کی آمدنی کا تناسب تھا۔ کمیشن نے اِس بات پر زور دیا کہ مالی امداد کی ایک مقررہ رقم ہونی چاہیئے۔ یہ بھی سفارش کی گئی کہ مغربی بنگال کو ۱۰۵ لاکھ کے بجائے ۱۵۰ لاکھ، آسام کو ۴۰ کے بجائے ۷۵ لاکھ، بہار کو ۳۵ کے بجائے ۷۵ لاکھ اور اُڑیسہ کو ۵ لاکھ کے بجائے ۱۵ لاکھ کی امداد دی جائے۔

(۴) دُوسری قسم کی امدادیں —— مرکز یونٹوں کو جو مشروط اور غیر مشروط امدادیں دیتا ہے وہ ہندوستان کے وفاقی مالیات کی ایک نمایاں خصوصیت ہیں۔ کینیڈا اور آسٹریلیا جیسے ملکوں میں مشروط امداد کے مقابلے میں غیر مشروط امدادیں زیادہ اہم ہیں۔ آسٹریلیا میں ہر سال کامن ویلتھ گرانٹ کمیشن صوبوں کی پچھلی کارگزاریوں اور اُن کی ضرورتوں کا جائزہ لیتا ہے اور تب غیر مشروط امداد کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے۔

کمیشن نے کچھ اصُول مرتب کیے ہیں جن کے مطابق صوبوں کو امداد دی جانی چاہیئے: (الف) پہلا اصُول صوبوں کے بجٹ کی ضرورت ہے۔ صوبوں کو اپنے بجٹ متناسب بنیاد پر کم کرنا چاہیئے اور مرکز سے امداد طلب کرنے سے پہلے ٹیکس لگانے کی مناسب کوشش کرنی چاہیئے۔ ٹیکس کے مناسب نظام میں مصارف کی کفایت کو نہیں شامل کرنا چاہیئے (ب) امداد کے فیصلے کا دوسرا اصُول سماجی خدمات کا معیار ہے۔ ملک بھر میں بنیادی سماجی خدمات کا مساوی معیار قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جن صوبوں کا معیار پست ہے اُنھیں اُن صوبوں سے زیادہ دیا جانے جن کا معیار بہتر ہے (ج) بعض صوبوں پر کچھ مخصوص ذمہ داریاں ہیں جن کی قومی اہمیت ہے۔ مثلاً کچھ ریاستوں پر ملک کی تقسیم کی وجہ سے بہت بوجھ پڑا ہے

جس کی وجہ سے یہ امداد کی حقدار ہیں (د) آخری بات یہ ہے کہ مرکز کو کم ترقی یافتہ صوبوں کو امداد دینی چاہیے کیونکہ قومی مفاد میں ان پس ماندہ علاقوں کی ترقی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں قبائلی علاقوں کے مطالبوں پر خاص دھیان دینا چاہیے۔ مختصر یہ کہ پہلا فائنانس کمیشن اس نتیجے پر پہنچا کہ مرکز کو یا تو قومی اہمیت کی خدمت انجام دینے کے سلسلے میں گرانٹ دینی چاہیے یا صوبوں کے بجٹ کی ضرورت پوری کرنے کے لیے۔ ان صوبوں کو ذہن میں رکھ کر کمیشن نے فیصلہ کیا کہ مدراس، یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، حیدرآباد، راجستھان، مدھیہ بھارت اور پیپسو (PEPSU) کو کوئی امداد نہیں ملنی چاہیے۔ بمبئی، مغربی بنگال، اڑلیسہ اور سوراشٹر بہت معمولی امداد کے حقدار ہیں۔ کمیشن کی رائے میں پنجاب اور آسام دو صوبے تھے جن کو کافی مالی امداد کی ضرورت تھی۔ ٹراونکور کوچین اور میسور کے وسائل چونکہ محدود تھے اس لیے انھیں اپنی ترقی جاری رکھنے کے لیے کچھ امداد ملنی چاہیے۔ چنانچہ کمیشن نے مندرجہ ذیل امداد کی سفارش کی: مغربی بنگال ۸۰ لاکھ (تقسیم کے بعد کی مخصوص ضروریات کے پیش نظر)، اڑلیسہ ۷۵ لاکھ (سماجی خدمات کی فراہمی اور شیڈیولڈ ٹرائب اور دوسرے پس ماندہ طبقوں کی ترقی کے پیش نظر)، میسور اور سوراشٹر ۴۰ لاکھ، پنجاب ۱۲۵ لاکھ (تقسیم کے مخصوص مسائل کے پیش نظر)، آسام ۱۰۰ لاکھ (یعنی پچھلی امداد سے ۷۰ لاکھ زیادہ) اور ٹراونکور کوچین ۴۵ لاکھ۔ ان عام امداد کے علاوہ کمیشن نے کچھ صوبوں کو ابتدائی تعلیم کی توسیع کے لیے مخصوص گرانٹ دینے کی سفارش کی۔ وہ صوبے یہ تھے: بہار، مدھیہ پردیش، مدھیہ بھارت، حیدرآباد، راجستھان، اڑلیسہ، پنجاب اور پیپسو۔

حکومت ہند نے کمیشن کی تمام سفارشات منظور کرکے ایک اچھی نظیر قائم کی۔ حکومت کی پالیسی سے مستقبل میں قائم ہونے والے کمیشنوں کی حیثیت بڑھ جائیگی اور یہ زیادہ ذمہ داریاں سنبھال سکیں گے۔

جائزہ ـــــ سر آٹو نیمیر نے مرکز اور یونٹوں کے مابین وسائل کی تقسیم میں صوبوں کے بجٹ کی ضروریات کو غیر معمولی اہمیت دی اور اسی کو انھوں نے امداد کے تعین کا پیمانہ بنایا۔ انھیں صوبائی خزانوں کی سیاسی ضروریات پوری کرنے کی زیادہ فکر تھی چنانچہ معیاری سماجی خدمات اور قومی اہمیت کی ضرورتوں کی طرف انھوں نے کم سے کم توجہ دی۔ اس طرح امداد سے متعلق پہلے فائنانس کمیشن کی کشادہ بنیاد اور متوازن اصولوں سے ہندوستان میں وفاقی مالیات کا نیا باب شروع کیا گیا۔

دیش مکھ اور نیمیر کے مقابلے میں پہلے فائنانس کمیشن کا کام زیادہ بھرپور تھا۔ وجہ یہ تھی کہ دیش مکھ اور نیمیر سے وفاقی مالیات کے ایک مخصوص پہلو پر ماہرانہ مشورہ طلب کیا گیا تھا جبکہ فائنانس کارپوریشن کو وفاقی مالیات کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا تھا۔ ہم فائنانس کمیشن کی اس بات سے متفق ہیں کہ صوبوں

کو ان کی ضروریات کے پیش نظر امداد ملنی چاہیئے۔ یہ ایک درست قدم ہے اور اس سے صوبوں کے درمیان معاشی مساوات پیدا ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ ایک صوبہ وسائل کی کمی کی وجہ سے ترقی نہ کر پا رہا ہو۔ اگر ایسا ہو تو مرکز کو معقول امداد دے کر اُس کی ضرورت پوری کرنی چاہیئے۔

اِنکم ٹیکس کی آمدنی کی تقسیم کے بارے میں کمیشن کا خیال تھا کہ مالی ضرورت کے مقابلے میں آبادی اور تحصیل کو تقسیم کی بنیاد بنانا زیادہ بہتر ہوگا۔ ہمارا خیال ہے کہ آبادی اور تحصیل کی بنیاد پر صوبوں کے حصے مقرر کرنے کے بعد کمیشن کو صوبوں کی مالی ضروریات کا بھی لحاظ کرنا چاہیئے تھا۔ ضروریات کی کسوٹی پر پرکھنے سے صوبوں کے ساتھ انصاف کیا جا سکتا تھا اور ان اعتراضات کی بوچھاڑ سے بچا جا سکتا تھا جو مغربی بنگال نے رپورٹ چھپنے کے بعد کیے۔

بہ ہر حال بحیثیت مجموعی پہلے کمیشن کی رپورٹ نے دلیش مکھ اور نیمیر کے مقابلے میں صوبوں کے مابین زیادہ اِنصاف کیا۔ کمیشن کی سفارش کے مطابق محصولوں اور امداد کی تقسیم سے صوبوں کو پہلے کے مقابلے میں ۲۱ کروڑ روپے زائد ملنے لگے۔

دُوسرے فائنانس کمیشن کی رپورٹ کا تجزیہ

راشٹرپتی نے جون ۱۹۵۶ء میں دوسرا فائنانس کمیشن مقرر کیا جس کے صدر مسٹر کے سنتھانم تھے۔ اِس کمیشن کی رپورٹ ستمبر ۱۹۵۷ء میں پیش ہوئی اور حکومت نے اِس کی تمام سفارشات منظور کر لیں۔

کمیشن نے سفارش کی کہ ریاستوں کو ملنے والی رقم ۱۴۰ کروڑ کر دی جائے جبکہ پہلے کمیشن کی سفارش کے مطابق ۳۱ مارچ ۱۹۵۷ء تک کے پانچ برسوں میں اوسطاً رقم ۹۲ کروڑ تھی۔ یونٹوں کو وسائل کی منتقلی کی ایک جامع اسکیم تجویز کی گئی جس میں صوبوں کی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ مرکز اپنی وفاقی اور دفاعی ذمہ داریاں پوری کرتے ہوئے کتنے وسائل صوبوں کو منتقل کر سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وسائل کی منتقلی کا فارمولا بناتے وقت مرکز معاشی ترقی اور انصاف کے متضاد مطالبوں سے دوچار تھا۔ تیز معاشی ترقی کے نظریے کے مطابق نسبتاً خوشحال علاقوں کو ترقیاتی مصارف کا زیادہ حصہ ملیگا کیونکہ وہاں منصوبہ بندی کی کوششوں کے نتائج جلد برآمد ہونگے۔ لیکن ایسا کرتے وقت معاشی اعتبار سے پس ماندہ علاقوں کی ضروریات عموماً نظر انداز ہو جاتی ہیں جو انصاف کے اصول کے منافی ہے۔ غرضیکہ ترقی اور انصاف کے متضاد مطالبات ایک سنگین مسئلہ بن جاتے ہیں۔ دوسرا فائنانس کارپوریشن جو

پلاننگ کمیشن کے دامن سے بندھا ہوا تھا، بدقسمتی سے ان متضاد مطالبات کو پورا کرنے میں توازن نہ قائم رکھ سکا اور اس کا رجحان ترقیاتی مطالبات کی طرف زیادہ رہا۔

جہاں تک کسی مالی سال میں انکم ٹیکس کی آمدنی میں صوبوں کے حصّے کا سوال تھا، کمیشن کا خیال تھا کہ صوبوں کی متفقہ خواہش کے مطابق اس کو ۵۰ کے بجائے ۶۰ فی صدی کر دیا جائے۔ ۱۹۵۲ء سے پہلے صوبوں کو آبادی کے تناسب سے حصّہ ملتا تھا۔ پہلے کمیشن نے یہ طریقہ بدلا۔ اب ۸۰ فی صدی آبادی کا لحاظ رکھا جاتا تھا اور ۲۰ فی صدی تحصیل کا۔ اِس تبدیلی کے ذریعے اُن صوبوں کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی گئی جو صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ تھے لیکن جن کی آبادی کم تھی۔ دوسرے کمیشن کا یہ نظریہ تھا کہ صوبوں کے مابین آمدنی کی تقسیم آبادی کے تناسب سے ہونی چاہیئے اور تحصیل کے عنصر کو بالکل نکال دینا چاہیے لیکن اس کی رائے تھی کہ تحصیل کے عنصر کو بتدریج نکالا جائے۔ چنانچہ تجویز کیا گیا کہ فی الحال یہ تقسیم ۹۰ فی صدی آبادی کے لحاظ سے اور ۱۰ فی صدی تحصیل کے لحاظ سے کی جائے۔

اُتر پردیش کا حصّہ سب سے زیادہ ہے، یعنی ۱۶٫۲۵ فی صدی۔ بمبئی کا نمبر دوسرا ہے۔ اُس کو ۱۵٫۹۷ فی صدی اور بنگال کو ۱۰٫۰۸ فی صدی ملتا ہے۔

جموں اور کشمیر کو سب سے کم یعنی ۱٫۱۳ فی صدی ملتا ہے۔ دوسرے صوبوں کے حصّوں کا تناسب یہ ہے: آسام ۲٫۴۴ فی صدی، بہار ۹٫۹۴ فی صدی، کیرل ۳٫۶۴ فی صدی، مدھیہ پردیش ۶٫۷۲ فی صدی، مدراس ۸٫۴۰ فی صدی، میسور ۵٫۱۴ فی صدی، اُڑلیسہ ۳٫۷۳ فی صدی، پنجاب ۴٫۲۴ اور راجستھان ۴٫۰۹ فی صدی۔ یہ تقسیم آبادی کے لحاظ سے کی گئی تھی اور اس میں تحصیل کی حیثیت صرف بفر کی تھی۔ اِس تقسیم کی وجہ سے بمبئی اور بنگال جہاں سب سے زیادہ تحصیل تھی گھاٹے میں رہے کچھ گھاٹا مدراس کو بھی ہوا۔ جن صوبوں کو فائدہ پہنچا ان میں خاص کر یو پی، بہار اور مدھیہ پردیش تھے۔ آبادی کے لیے ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کو بنیاد مانا گیا۔ چنانچہ مغربی بنگال کی آبادی میں اُن مہاجرین کا لحاظ نہیں رکھا گیا جو مردم شماری کے بعد آئے تھے۔ اگر آبادی کو ہی تقسیم کی بنیاد بنانا تھا تو مغربی بنگال کی آبادی میں مہاجروں کو شامل کرنا چاہیے تھا اور اُس کا حصّہ زیادہ ہونا چاہیے تھا۔

جہاں تک محصول کی آمدنی کی تقسیم کا سوال تھا، کمیشن نے اُن اشیا کی گنتی بڑھادی جن کا محصول مرکز اور صوبوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ پہلے صرف تین ایسی اشیا تھیں، تمباکو، ماچس اور بناسپتی سے بنی چیزیں۔ اب پانچ اشیا بڑھادی گئیں۔ نئی پانچ اشیا یہ تھیں: شکر، چائے، کافی، کاغذ

اور نان اِسنٹیل بناسپتی تیل ۔ لیکن ساتھ ہی تقسیم کا تناسب ۴۰ فی صدی سے گھٹا کرہ ۲ فی صدی کر دیا گیا۔ کمیشن نے سفارش کی کہ صوبوں کے حصے کی رقم کا ۹۰ فی صدی آبادی کے تناسب سے تقسیم کیا جائے اور باقی ۱۰ فی صدی حساب درست کرنے (ADJUSTMENT) کے لیے ۔ اگر آبادی ہی کو آمدنی کی تقسیم کو بنیاد بنانا تھا تو عام استعمال کی اشیا کی فہرست کو صرف چائے، کافی، ماچس، شکر، تمباکو، کا غذ اور بناسپتی کی چیزوں تک محدود رکھنے کا کیا جواز تھا۔ کمیشن کو پورے طور سے معلوم تھا کہ منصوبے کے مالی وسائل کے معاملے میں صوبوں کی خود اکتفائی کی منزل اب بھی بہت دُور تھی ۔ تعجب ہے کہ کمیشن نے سب اشیا کے بجائے صرف چند منتخب کیں جن کا محصول مرکز اور صوبوں کو تقسیم ہونا تھا۔

جہاں تک اسٹیٹ ڈیوٹی کی آمدنی تقسیم کرنے کا سوال تھا، دوسرے کمیشن نے پچھلے آسان فارمولے سے انحراف کرکے بصیرت کا ثبوت دیا ۔ پہلے کمیشن کا فارمولا اسی صوبے وار تقسیم پر مبنی تھا جو انکم ٹیکس کی قابلِ تقسیم آمدنی کے لیے تھا ۔ دوسرے کمیشن نے تجویز کیا کہ قابلِ تقسیم آمدنی کا ایک فی صدی مرکزی علاقوں کے لیے الگ کر دیا جائے ۔ باقی رقم کو غیر منقولہ جائداد اور دوسرے اثاثوں کے درمیان اُن کی اُس سال کی خام قیمت کے تناسب میں تقسیم کیا جائے ۔ درحقیقت کمیشن نے غیر منقولہ اور دوسرے اثاثوں کے درمیان خطِ فاصل کھینچ دیا اور تجویز کیا کہ غیر منقولہ جائداد کے حصے میں جو رقم آئے وہ صوبوں میں اسی تناسب میں تقسیم کی جائے جس تناسب میں یہ جائدادیں مختلف صوبوں میں واقع ہیں ۔ محصول کی باقی رقم صوبوں کی آبادی کے تناسب سے تقسیم ہونی چاہیئے۔

جہاں تک ریل کے کرائے سے آمدنی کی تقسیم کا سوال ہے کمیشن نے تجویز کیا کہ حتی الامکان ریاستوں کا حصہ متعلقہ علاقوں سے ریلوے کی آمدنی کے تناسب کے مطابق متعین کیا جائے ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بالآخر اس کا انحصار اِس پر ہوگا کہ کس علاقے میں کتنے میل لمبی ریلوے لائن موجود ہے ۔ سکہ جاتی معاشیات کے طالب علم کی حیثیت سے ہم جانتے ہیں کہ ریلوے ٹیکس دراصل صَرف پر ٹیکس کی حیثیت رکھتا ہے اور صَرف سے عوام کی سفر کرنے کی استعداد ظاہر ہوتی ہے ۔ کسی علاقے میں کتنے میل لمبی ریلوے لائن ہے اِس بات کو نہیں ظاہر کرتی کہ اس علاقے کے عوام سفر پر کتنا صَرف کرتے ہیں دراصل کسی علاقے میں ٹریفک کا دباؤ صَرف کو زیادہ واضح طریقے سے ظاہر کرتا ہے ۔ کمیشن کو صوبوں کے حصے متعین کرنے میں اِسی پیمانے کو لینا چاہیئے تھا۔

کمیشن کی سفارش کے مطابق مغربی بنگال کو جوٹ کی اکسپورٹ ڈیوٹی کے عوض ۵۲،۶۹ لاکھ روپے ملے ۔ دوسرے صوبوں کو جو رقمیں ملیں یہ تھیں : آسام ۷۵ لاکھ، بہار ۲۳،۱۳ لاکھ اور اڑیسہ ۱۵ لاکھ۔

۱۹۶۰-۶۱ء کے مالی سال کے ختم پر یہ گرانٹ خود بخود بند ہوگئی۔ کمیشن کی سفارش کے مطابق عام امدادیں پہلے سے بہت زیادہ تھیں جس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے صوبوں کی ترقیاتی ضروریات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا تھا، مثلاً بنگال کی گرانٹ ۴۰ لاکھ سے بڑھا کر ۳۲۵ لاکھ اور ۱۹۶۰ء میں جوٹ کی اکسپورٹ ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد ۴۷۵ لاکھ کردی گئی۔ کم از کم سالانہ امداد کے مقابلے میں کمیشن نے معاملہ صاف رکھا اور بصیرت کا ثبوت دیا اور اس بے انصافی کا بہت کچھ ازالہ کردیا جو رپورٹ کے دوسرے حصوں میں مجوزہ تناسب کے معاملے میں سرزد ہوئی تھی۔

تیسرے فائنانس کمیشن کی رپورٹ کا جائزہ

تیسرے کمیشن نے اپنی رپورٹ دسمبر ۱۹۶۱ء میں پیش کی۔ اس کمیشن کے صدر مسٹر اے۔ کے چندا تھے اور راشٹرپتی نے یہ کمیشن دسمبر ۱۹۶۱ء میں مقرر کیا۔ کمیشن کی رپورٹ متفقہ نہیں تھی۔ مسٹر جی۔ آر۔ کامتھ ممبر سکریٹری کا اختلافی نوٹ اس کے ساتھ شامل تھا۔ یہ نوٹ دو باتوں کے بارے میں تھا، ایک تو رسل و رسائل کی ترقی کے لیے مخصوص گرانٹ دینے کے سلسلے میں اور دوسرے ریاستوں کو امداد دینے کی سفارش میں صوبائی منصوبے کی ۷۵ فی صدی آمدنی کی شمولیت کے بارے میں۔

یہ بات دلچسپ ہے کہ حکومت نے اس کمیشن کی تمام متفقہ سفارشات منظور کرلیں وہ سفارش نامنظور کردی جو صوبوں کو منصوبائی امداد کے ایک حصے کو کمیشن کی تقسیم کی اسکیم میں شامل کرنے کے بارے میں تھی۔ متفقہ سفارشات کی منظوری کے نتیجے کے طور پر صوبوں کو اپریل ۱۹۶۲ء سے ۴۵ کروڑ روپے زائد ملنے لگے کیونکہ انکم ٹیکس میں ریاستوں کا حصہ ۶۰ فی صدی سے بڑھ کر ۶۶ ۲/۳ فی صدی ہوگیا تھا۔ حکومت نے رسل و رسائل کے لیے مخصوص امداد سے متعلق اکثریت کی سفارش منظور کرلی۔

اگلے صفحے پر ٹیبل میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ تیسرے کمیشن کی سفارشات کے مطابق ٹیکسوں اور امدادوں میں مختلف صوبوں کا کیا حصہ تھا۔ صوبوں کو انکم ٹیکس کا ۶۶ ۲/۳ فی صدی اور محصولوں کا ۲۰ فی صدی حصہ دیا گیا۔ صوبوں کی سالانہ امدادی گرانٹ کی رقم ۳۹۶۵ کروڑ سے بڑھا کر ۵۲ کروڑ کردی گئی۔ دوسرے ٹیبل میں رسل و رسائل کی ترقی کے لیے صوبوں کو ملنے والی مخصوص گرانٹ کی تقسیم دکھلائی گئی ہے:

	انکم ٹیکس میں	محصول میں	امدادی گرانٹ	رسل و رسائل کی ترقی کے لیے امداد
ریاستوں کا حصّہ	⅔ ۶۶ فی صدی	۲۰ فی صدی		
تقسیم	فی صد	فی صد	لاکھ روپے	لاکھ روپے
آندھرا پردیش	۷٫۷۱	۸٫۲۳	۹۰۰	۵۰
آسام	۲٫۴۴	۴٫۷۳	۵۲۵	۷۵
بہار	۹٫۳۳	۱۱٫۵۶	–	۷۵
جموں کشمیر	٫۷۰	۲٫۰۳	۱۵۰	۵۰
گجرات	۴٫۷۸	۶٫۴۵	۴۲۵	۱۰۰
کیرل	۳٫۵۳	۵٫۴۶	۵۵۰	۷۵
مدھیہ پردیش	۶٫۴۱	۸٫۴۶	۱۲۵	۱۷۵
مدراس	۸٫۱۳	۶٫۸۸	۳۰۰	–
مہاراشٹر	۱۳٫۴۱	۵٫۷۳	–	–
میسور	۵٫۱۳	۵٫۸۳	۶۲۵	۵۰
اُڑیسہ	۳٫۴۴	۷٫۰۰	۱۱۵۰	۱۷۵
پنجاب	۴٫۴۹	۶٫۷۱	–	–
راجستھان	۳٫۴۷	۵٫۹۳	۴۵۰	۷۵
اُتر پردیش	۱۴٫۴۱	۱۰٫۶۸	–	–
بنگال	۱۲٫۶۹	۵٫۶۰	–	–
میزان			۵۲۰۰	۹۰۰

پہلے اِنکم ٹیکس کی آمدنی کا ۹۰ فی صدی حِصّہ آبادی کے مطابق تقسیم ہوتا تھا اور صرف ۱۰ فی صدی تحصیل کے مطابق ۔ اب ۸۰ فی صدی آبادی کے مطابق اور ۲۰ فی صدی تحصیل کے مطابق کردیا گیا۔
پہلے صرف آٹھ اشیا کے محصول کی آمدنی کا ۲۵ فی صدی صوبوں کو ملتا تھا (ماچس، تمباکو، شکر، بناسپتی کی چیزیں، کافی، چائے، کاغذ اور بناسپتی کے نان اسنشیل آئل) ۔ اب یہ اشیا آٹھ سے بڑھاکر ۳۵

کردی گئیں لیکن آمدنی کا ۲۰ فی صدی حصّہ صوبوں کو دیا گیا۔ اِن ۲۵ اشیا میں پٹرول کو چھوڑ کر باقی وہ تمام اشیا شامل تھیں جن پر ۱۹۶۱ء میں محصول لگایا گیا تھا۔ اِس فہرست میں سلک کو چھوڑ کر باقی وہ اشیا نہیں شامل کی گئیں جن سے ۵۰ لاکھ سے کم کی سالانہ آمدنی تھی۔ صوبوں کا حصّہ متعیّن کرنے میں اگرچہ اب بھی آبادی کو ہی بنیاد مانا گیا لیکن ساتھ ہی صوبوں کی مالی حالت، ترقی کی نابرابری اور پس ماندہ علاقوں میں شیڈیولڈ کاسٹ کے تناسب کا بھی لحاظ رکھا گیا۔ مل کے بنے کپڑوں، شکر اور تمباکو پر مزید محصول کی پوری آمدنی مرکزی علاقوں کو چھوڑ کر باقی صوبوں کو دے دی گئی کیونکہ یہ محصول صوبائی سیلس ٹیکس کی جگہ پر لگایا گیا تھا۔

دوسرے فائنانس کمیشن کی سفارشات کے مطابق گیارہ صوبوں کو مجموعی طور سے ۳۹٫۵ کروڑ کی سالانہ گرانٹ ملتی تھی۔ اِس میں آندھرا پردیش کو ۴ کروڑ، آسام کو ۴٫۵ کروڑ، بہار کو ۴٫۲۵ کروڑ، جموں کشمیر کو ۳ کروڑ، کیرل کو ۱٫۷۵ کروڑ، مدھیہ پردیش کو ۳ کروڑ، میسور کو ۶ کروڑ، اڑیسہ کو ۳٫۵ کروڑ، پنجاب کو ۲٫۲۵ کروڑ، راجستھان کو ۲٫۵ کروڑ اور مغربی بنگال کو ۴٫۷۵ کروڑ ملتے تھے۔

تیسرے کمیشن نے ۱۱۰٫۲۵ کروڑ کی گرانٹ کی سفارش کی۔ اِس میں سے ۵۲ کروڑ صوبوں کے بجٹ کی کمی پوری کرنے کے لیے اور ۵۸٫۲۵ کروڑ صوبائی منصوبوں کے لیے ۷۵ فی صدی آمدنی کی مد میں تھے۔

صوبائی بجٹ کی کمی پوری کرنے کے لیے ۵۲ کروڑ کی امداد کی متفقہ سفارش حکومت نے منظور کر لی اِس سے دس صوبوں کو فائدہ پہنچا۔ بہار، مہاراشٹر، پنجاب، یوپی اور مغربی بنگال کو اِس گرانٹ کا حق نہیں تھا۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اگرچہ کمیشن کی چند سفارشات (مثلاً انکم ٹیکس سے متعلق) مغربی بنگال جیسے ترقی یافتہ صوبوں کے لیے نفع بخش تھیں، لیکن زیادہ تر سفارشات، خصوصاً گرانٹ سے متعلق، اڑیسہ، راجستھان جیسے پس ماندہ صوبوں کے لیے مفید تھیں۔

ریلوے ٹیکسوں میں صوبوں کے حصّے کے عوض ۱۲٫۵ کروڑ کی گرانٹ کی سفارش کی گئی تھی۔ یہ رقم اِس طرح تقسیم ہونی تھی کہ صوبوں کو کم و بیش اُسی تناسب سے رقم مل جائے جو ریلوے ٹیکس ختم ہونے سے پہلے تھا۔

کمیشن کی سفارشات یکم اپریل ۱۹۶۲ء سے چار سال کے لیے تھیں لیکن ریلوے ٹیکس کے عوض جو گرانٹ دی گئی اُس کی مدت یکم اپریل سے ۵ سال رکھی گئی۔

تیسرے فائنانس کمیشن نے دوسرے کمیشن کے اِس خیال سے اتفاق کیا کہ پلاننگ کمیشن اور

فائنانس کمیشن کے دائرہ عمل واضح نہیں ہیں اور ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ چنانچہ اُس نے تجویز کیا کہ یا تو فائنانس کمیشن کے اختیارات اتنے بڑھا دیے جائیں کہ صوبوں کو دی جانے والی ساری امداد اس کے تحت آجائے یا پلاننگ کمیشن حسب ضرورت فائنانس کمیشن کے فرائض خود انجام دیا کرے۔

چوتھے فائنانس کمیشن کی رپورٹ کا تجزیہ

چوتھا کمیشن مئی ۱۹۶۴ء میں مقرّر ہوا۔ اس کے صدر پی۔ وی۔ راجامنار، مدراس کے سابق چیف جسٹس تھے۔ اِس کمیشن نے اپنی رپورٹ اگست ۱۹۶۵ء میں پیش کی۔ یہ رپورٹ اور اس کے متعلق سرکاری فیصلے وزیر مالیات نے ستمبر ۱۹۶۵ء میں پارلیمنٹ میں پیش کیے۔ چوتھے کمیشن نے اِنکم ٹیکس میں صوبوں کا حصہ ۶۶ ۲/۳ فی صدی سے بڑھا کر ۷۵ فی صدی کر دیا اور سالانہ امداد ۴۶ کروڑ سے بڑھا کر ۱۴۰ کروڑ کر دی۔

حسب سابق حکومت نے کمیشن کی بیشتر متفقہ سفارشات منظور کر لیں۔ اِس کمیشن کی خاص سفارشات یہ تھیں:

(۱) ریلوے پسنجر ٹیکس کے عوض امدادوں اور ٹیکسوں میں صوبوں کا حصّہ:

(الف) اِنکم ٹیکس — جیسا ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، کمیشن نے اِنکم ٹیکس کی آمدنی کا قابلِ تقسیم حِصّہ ۶۶ ۲/۳ فی صدی سے بڑھا کر ۷۵ فی صدی کر دیا۔ جہاں تک صوبوں میں اس رقم کی تقسیم کا سوال تھا، اُس کا وہی اصول رہا، یعنی ۸۰ فی صدی آبادی کے لحاظ سے اور ۲۰ فی صدی تحصیل کے لحاظ سے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ پہلے اور تیسرے کمیشنوں نے یہی فارمولا تجویز کیا تھا جبکہ دوسرے کمیشن نے آبادی کے تناسب پر زیادہ زور دیا تھا اور تجویز کیا تھا کہ ۹۰ فی صدی آبادی کا لحاظ کیا جائے۔

(ب) محصول — جہاں تک محصولوں کا سوال ہے، صوبوں کے حصّے میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی اور وہی فارمولا قائم رکھا گیا، یعنی اصل تحصیل کا ۲۰ فی صدی۔ لیکن اب تیسرے کمیشن کی سفارش کردہ ۳۵ اشیا کے بجائے تمام اشیا کے محصول میں صوبوں کا حِصّہ ہوگا۔ اِنکم ٹیکس کی طرح محصول کے معاملے میں بھی حکومت نے کمیشن کی تمام سفارشات مان لیں۔ کپڑے، تمباکو اور شکر کے زائد محصول کی تمام آمدنی، علاوہ اس کے جو مرکزی علاقوں کے لیے محفوظ تھی، صوبوں کو سیلس ٹیکس کے عوض دے دی جائے گی۔ مجموعی آمدنی میں مرکزی علاقوں کا حِصّہ ایک فی صدی قرار دیا گیا۔ جموں کشمیر اور ناگالینڈ کا حصہ ۱ ۱/۲ فی صدی اور ۰.۶۵ فی صدی مقرّر کیا گیا۔ اگلے ٹیبل میں اِنکم ٹیکس اور مرکزی محصولوں کی

آمدنی میں صوبوں کا حصّہ دکھلایا گیا ہے۔

دو اہم ٹیکسوں میں صوبوں کا حصّہ :

صوبوں کا حصّہ تقسیم	* اِنکم ٹیکس میں ۷۵ فی صدی فی صد	+ مرکزی محصولوں میں ۲۰ فی صدی فی صد
آندھر پردیش	۷٫۳۷	۷٫۷۷
آسام	۲٫۴۴	۳٫۳۲
بہار	۹٫۰۴	۱۰٫۰۳
گجرات	۵٫۲۹	۴٫۸۰
جموں کشمیر	۰٫۷۳	۲٫۲۶
کیرل	۳٫۵۹	۴٫۱۶
مدھیہ پردیش	۶٫۴۷	۷٫۴۰
مدراس	۸٫۳۴	۷٫۱۸
مہاراشٹر	۱۴٫۲۸	۸٫۲۳
میسور	۵٫۱۴	۵٫۴۱
ناگالینڈ	۰٫۰۷	۲٫۲۱
اُڑیسہ	۳٫۴۰	۴٫۸۲
پنجاب	۴٫۳۶	۴٫۸۶
راجستھان	۳٫۹۷	۵٫۰۶
اُتر پردیش	۱۴٫۶۰	۱۴٫۹۸
مغربی بنگال	۱۰٫۹۱	۷٫۵۱

* مرکزی تنخواہوں اور مرکزی علاقوں کی رقم کے علاوہ اِنکم ٹیکس کی تمام آمدنی مرکز اور صوبوں میں تقسیم ہوگی۔ مرکزی علاقوں کا حصّہ ½ ۲ فی صدی برقرار رکھا گیا۔

+ تمام اشیا پر محصول کی مجموعی آمدنی۔

(ج) **اسٹیٹ ڈیوٹی** —— زراعتی زمین کے علاوہ باقی جائداد پر لگنے والے ٹیکس کی آمدنی (مرکزی علاقوں کے حصے کو چھوڑکر) صوبوں کو ملتی تھی۔ کمیشن نے مرکزی علاقوں کا حصہ ایک فی صدی سے بڑھاکر دو فی صدی کردیا۔

(د) **ریلوے محصول** —— انکم ٹیکس اور محصول کی آمدنی کے بڑے حصے اور پوری اسٹیٹ ڈیوٹی کے علاوہ صوبوں کو ریلوے پسنجر ٹیکس کے عوض گرانٹ کا بھی حق تھا۔ صوبوں کے درمیان گرانٹ کی تقسیم کا اصول وہی برقرار رکھا گیا، یعنی صوبوں کو معاوضہ اتنا دیا جائے کہ اُن کی آمدنی کی وہی صُورت رہے جو ریلوے ٹیکس ختم ہونے سے پہلے تھی۔ فائنانس کمیشن نے صرف تقسیم کی فی صد کی سفارش کی تھی۔ گرانٹ کی واقعی رقم بعد میں ریلوے کنونشن کمیٹی کی سفارش پر مقرر کی گئی۔

(۲) امدادی گرانٹ :

اگرچہ ایک معقول وفاقی نظام میں ٹیکسوں اور ان کی تقسیم میں بیشتر صوبوں کی ضروریات کا لحاظ رکھا جاتا ہے تاہم ضرورتوں کی دو قسمیں ایسی ہیں جو امدادی گرانٹ ہی کے ذریعے پوری کرنی ہوتی ہیں۔ ٹیکس کی تقسیم سب کے لیے عام ہوگی اور بیشتر یہ تقسیم متعلقہ علاقوں کی تحصیل پر مبنی ہوگی۔ غریب صوبے جن کے وسائل کم ہیں اور جن کی ضروریات زیادہ شدید ہیں یا وہ صوبے جو ترقی کی استعداد رکھتے ہیں تقسیم کے اِس عام اصول کے تحت کافی وسائل نہ حاصل کر پائیں گے۔ اِس کے علاوہ کچھ ایسے مرکزی پروگرام ہونگے جن میں حکومت یکسانیت اور سارے ملک کے مفاد کے پیشِ نظر بنیادی دلچسپی لے گی مثلاً ملک کے مختلف علاقوں کو جوڑنے کے لیے سڑکوں اور رسل ورسائل کا مشترک پروگرام یا غذا کے معاملے میں ملک کی خود اکتفائی کا پروگرام ایسے کام ہیں جو پورے ملک کے لیے اہم ہیں اگرچہ سڑکوں کی تعمیر اور زراعت اتفاق رائے سے صوبائی کام ہیں۔ چنانچہ ایسی ضرورتوں کے لیے امدادی گرانٹ ضروری ہے۔

چوتھے کمیشن نے تیسرے سے زیادہ فراخ دلی سے صوبوں کو گرانٹ دینے کی سفارش کی۔ اگلے ٹیبل میں دکھلایا گیا ہے کہ تیسرے اور چوتھے فائنانس کمیشنوں نے کتنی امداد کی سفارش کی، حکومت نے کتنی منظور کی اور ان گرانٹوں میں سے ریاستوں کو کیا ملا۔

امدادی گرانٹ

	تیسرے پلان کے تحت	چوتھے پلان کے تحت	حکومت کی منظور کردہ امداد
آندھرا پردیش	۹٫۵۰	۷٫۲۲	۱۲٫۵۱
آسام	۶٫۰۰	۱۶٫۵۲	۱۶٫۵۲
بہار	۰٫۷۵	-	-
گجرات	۵٫۲۵	-	-
جموں کشمیر	۲٫۰۰	۶٫۵۷	۵٫۵۷
کیرل	۶٫۵۲	۲۰٫۸۲	۲۰٫۸۲
مدھیہ پردیش	۳٫۰۰	۲٫۷۰	۲٫۷۰
مدراس	۳٫۰۰	۶٫۸۴	۶٫۸۴
میسور	۶٫۷۸	۱۸٫۲۴	۲۰٫۸۲
ناگالینڈ	۲٫۷۵	۷٫۰۷	۷٫۰۷
راجستھان	۵٫۲۵	۶٫۷۳	۶٫۷۳
اُترپردیش	-	-	۹٫۸۵
میزان	۶۳٫۷۵	۱۲۱٫۸۹	۱۴۰٫۶۱

ٹیبل سے ظاہر ہے کہ حکومت نے آندھرا پردیش، میسور اور اُترپردیش کو کمیشن کی سفارش کردہ رقم سے زیادہ دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ اِس لیے کرنا پڑا کیونکہ کمیشن اخراجات کے تخمینے میں مہنگائی الاؤنس کے بعض اضافوں کو نہ شامل کر سکا تھا جو جولائی ۱۹۶۵ء میں اِن صوبوں نے دینا قبول کیا تھا۔ حکومت نے پروفیسر جی۔ وی۔ کاروے سے درخواست کی کہ وہ اِن صوبوں کی مالی ذمہ داریوں کا جائزہ لے کر مناسب سفارش کریں۔ موصوف کی سفارش کے مطابق آندھرا کو ۶٫۲۹ کروڑ، میسور کو ۲٫۵۸ کروڑ اور اُترپردیش کو ۹٫۸۵ کروڑ کی امداد دی گئی۔

فائنانس کمیشن کی گرانٹ غیر مشروط ہیں اور ان کا مقصد اُس خلا کو پُر کرنا ہے جو ٹیکسوں سے آمدنی اور متعینہ اخراجات کے درمیان واقع ہو۔ مالیاتی خسارے کی گرانٹ اب تک جانچ کی بنیادی کسوٹیوں پر پرکھے بغیر دی جاتی ہے مثلاً یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ریاست نے ٹیکس لگانے کی کوشش خود

کس حد تک کی ہے، سماجی خدمات کا معیار کیا ہے، انتظام میں مستعدی اور کفایت کا کیا معیار ہے۔ چنانچہ مساوات اور زیادہ سے زیادہ ترقی کے مقاصد کے پیش نظر امداد کے پورے نظام پر مکمل نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ ایسا کرنے سے ہندوستان کے وفاقی مالیاتی رشتوں کی تعمیر کے لیے قیمتی مواد فراہم ہوگا۔

(۴) عام سفارشات

چوتھے کمیشن نے وفاقی مالیات کے مختلف مسائل پر بعض اہم خیالات کا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں اُس نے تجویز کیا کہ مرکز اور صوبوں کے مشترک مالی وسائل پر باہمی مشورے کے لیے ادارہ جاتی طریقہ نکالا جائے، فائنانس کمیشنوں کے لیے تازہ ترین معلوماتی مواد اکٹھا کرنے کے لیے وزارت مالیات ایک مستقل تنظیم قائم کرے جو مسلسل جانچ پڑتال کرتی رہے۔ اس کے علاوہ صوبوں کی مقروضیت اور اس کے متعلقہ پہلوؤں کے تفصیلی جائزے کے لیے ایک بااختیار تنظیم قائم کی جائے۔

پانچویں فائنانس کمیشن کی عارضی رپورٹ سے متعلق ایک نوٹ

فروری ۱۹۶۸ء میں مسٹر مہاویر تیاگی کی صدارت میں پانچواں فائنانس کمیشن مقرر ہوا۔ اس کمیشن نے اکتوبر ۱۹۶۸ء میں اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ کمیشن نے صوبوں پر زور دیا ہے کہ وہ اپنے بجٹ متوازن کریں اور تدبیر و ترکیب (WAGE AND MEANS ADVANCES) کے ذریعے عام میزانیہ کے وسائل فراہم کرنے کے بجائے اپنے وسائل کے اندر رہ کر مصارف پورے کرنے کی کوشش کریں۔ کمیشن نے ریزرو بینک سے درخواست کی کہ وہ میعادی طور سے اِن تدبیری اور ترکیبی وسائل کا جائزہ لیتا رہے۔ کمیشن نے حکومت پر زور دیا کہ وہ سال کی آخری دو سہ ماہیوں میں انکم ٹیکس کے صوبائی حصے کو زیادہ جلدی ادا کر دیا کرے۔

زائدکشی (OVERDRAFT) کے مسئلے سے نپٹنے کے لیے کمیشن نے تجویز کیا کہ اگر کوئی صوبہ بینک میں جمع رقم سے زیادہ نکالے تو ریزرو بینک متعلقہ صوبے کو نوٹس جاری کرے اور حکومت کو اِس امر سے مطلع کر دے۔ صوبائی حکومت کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ نوٹس کی مدت کے اندر حساب صاف کرلے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں ریزرو بینک کو ادائگیاں روک دینی چاہئیں۔ کمیشن نے اصرار کیا کہ مرکز تجاویز اور عملی تعاون کے ذریعے صوبوں کی مدد کرے تاکہ صوبے اپنا حساب صاف کرسکیں۔ اِس کے باوجود اگر کوئی صوبہ غیر مصدقہ زائدکشی سے نہیں باز آتا تو مرکز کو فیصلہ کرنا پڑے گا کہ آیا صوبائی

چیکوں کی ادائیگی روک دینے سے جو بحران پیدا ہوگا اُس کو چلنے دیا جائے یا حکومت دستور کی دفعہ ۳۶۰ کے تحت اپنے اختیارات کو استعمال کرکے حالات کا سدِ باب کرے۔ بظاہر کمیشن کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ مالیاتی بحران سے متعلق دستور کی دفعہ ۳۶۰ کے تحت اختیارات کا استعمال صرف اُس وقت کیا جائے جب اور کوئی صورت باقی نہ رہے۔ اِس سفارش سے مرکز کو غیر معمولی حالات میں صوبائی مالیاتی معاملات کو سنبھالنے کے کلّی اختیارات مل جاتے ہیں۔ اِنکم ٹیکس اور محصول کی آمدنی کی تقسیم کا موجودہ تناسب ۶۹-۱۹۷۰ء کے مالی سال کے لیے برقرار رکھا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ صوبوں کو اِنکم ٹیکس کی آمدنی کا ۷۵ فی صدی اور مرکزی محصولوں کی آمدنی کا ۲۰ فی صدی ملے گا۔

اسٹیٹ ڈیوٹی کی تقسیم سے متعلق کچھ صوبوں نے تجویز کیا کہ اثاثے (غیر زرعی) پر لگائی گئی اسٹیٹ ڈیوٹی کی مجموعی رقم زائدِ ضرورت، آبادی اور تحصیل کے مطابق تقسیم کی جائے لیکن پچھلے کمیشنوں کی طرح پانچواں کمیشن بھی زائدِ ضرورت جیسا یکساں معیار قبول کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ کمیشن نے تجویز کیا کہ مرکزی علاقوں کو ملنے والا اسٹیٹ ڈیوٹی کا حصّہ ۲ فی صدی سے بڑھاکر ۳ فی صدی کر دیا جائے۔ بقیہ رقم کی تقسیم اُسی تناسب سے کی جائے جو دوسرے کمیشن نے متعین کیا تھا اور بعد کے کمیشنوں نے جس کی تصدیق کی تھی۔ ریلوے ٹیکس کے عوض گرانٹ کی تقسیم کے سلسلے میں کمیشن کا خیال تھا کہ یہ اندازہ کرنا ناممکن ہے کہ کسی صوبے میں مسافروں کی آمد و رفت کتنی ہے یا صوبے کے ریلوے رُوٹ کی لمبائی میں کتنی تبدیلی کا امکان ہے۔ چنانچہ کمیشن نے تقسیم کی موجودہ بنیاد کو برقرار رکھا یعنی مسافروں کے ٹکٹ سے ہونے والی آمدنی (مع نواحی ٹریفک) صوبوں کے درمیان ہر ریلوے زون کے الگ الگ گیجوں (GUAGES) کی لمبائی کے مطابق تقسیم کی جائے۔ اِس آمدنی کے عوض صوبوں کو جو گرانٹ دی جائے گی اُس کے تناسب پر ریلوے رُوٹ کی لمبائی اور پچھلے تین برسوں میں غیر نواحی پسنجر ٹریفک کی آمدنی کی بنا پر نظرِ ثانی کی گئی ہے۔

اِس وقت گیارہ صوبوں کو ۶۱ء۱۴۰ کروڑ روپے کی سالانہ اِمداد ملتی ہے۔ پانچویں کمیشن نے ۶۹-۱۹۷۰ء کے لیے مع بنگال و بہار تیرہ صوبوں کو ۱۷۱ء۱۸ کروڑ کے بقدر امداد دینے کی سفارش کی ہے اِس کا مطلب یہ ہے کہ صوبوں کو ۳۶ء۲۲ کروڑ روپے زائد ملیں گے۔ بہار اور مغربی بنگال اب تک اِس امداد کے حقدار نہیں تھے۔ اب پہلی بار اِنھیں ۶۹-۱۹۷۰ء میں امدادی گرانٹ ملے گی۔

نئے اِنتظام کے تحت بنگال کو ۴۴ء۷ کروڑ اور بہار کو ۴۲ء۳ کروڑ روپے ملیں گے کمیشن نے جن صوبوں کو مزید امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے وہ یہ ہیں: مدھیہ پردیش کو ۶۶ء۶ کروڑ کی مزید گرانٹ، جموں کشمیر کو ۴۵ء۵ کروڑ کی، ناگالینڈ ۸۱ء۳ کروڑ، آسام ۳۸ء۳ کروڑ، آندھرا ۳۰ء۳ کروڑ اور راجستھان

کو ۲ء۹۳ کروڑ۔ کیرل، مدراس، میسور، اڑلیسہ اور اُتر پردیش کی امداد میں کوئی اِضافہ نہیں کیا گیا۔

ٹیکسوں، محصولوں اور گرانٹ کی تقسیم سے متعلق کمیشن کی تمام سفارشات حکومت نے مان لی ہیں۔

غیر مصدقہ زائد کشی (OVERDRAFT) کے بارے میں تجاویز زیر غور ہیں اور اب تک ان کے بارے میں کسی فیصلے کا اعلان نہیں کیا گیا ہے۔

منصوبہ بند معیشت میں وسائل کی تقسیم کو پلان کے تقدمات (PRIORITIES) کے مطابق ہونا پڑے گا۔

کمیشن کی آخری رپورٹ ۳۱ جولائی ۱۹۶۹ء کو شائع ہونے والی ہے۔ اِس رپورٹ کو چوتھے پلان کے ہدایت کردہ نہج کی پابندی کرنی پڑے گی کیونکہ اِس پلان میں یکم اپریل ۱۹۶۹ء سے اگلے پانچ برسوں کی مدت آ جائے گی۔

باب ۲۸

مرکزی مالیات اور صوبائی مالیات —— اہم ٹیکسوں کے حوالے سے

دوسری جنگِ عظیم کے آغاز سے مرکزی حکومت کے آمد و خرچ میں غیر معمولی اضافہ واقع ہوا ہے جس کا اندازہ مرکزی بجٹ کے آمدنی و خرچ کے کھاتے پر ایک نظر ڈالنے سے ہو جاتا ہے ۔ ۱۹۳۸-۳۹ء میں مرکزی حکومت کی آمدنی ۸۴ کروڑ تھی جو ۱۹۶۸-۶۹ء میں بڑھ کر ۲۷۱۴ کروڑ ہو گئی اور توقع ہے کہ ۱۹۶۹-۷۰ء میں ۲۸۰۱ کروڑ تک پہنچ جائیگی ۔ اسی طرح مرکزی مصارف ۱۹۳۸-۳۹ء کے ۸۵ کروڑ سے بڑھ کر ۱۹۶۸-۶۹ء میں ۲۷۱۱ کروڑ ہو گئے اور ۱۹۶۹-۷۰ء تک ۲۹۲۱ کروڑ ہونے کی توقع ہے ۔

مرکزی مالیہ — آمدنی کے وسائل اور مصارف کی مدّیں

۱۹۶۹-۷۰ء کے بجٹ میں جو مرارجی نے ۲۸ فروری کو پارلیمنٹ میں پیش کیا، آمد و خرچ کا مجموعی تخمینہ ۳۰۸۲ کروڑ اور ۳۲۶۲ کروڑ ہے ۔ کیپٹل رسیٹ اینڈ اکسپنڈیچر کا تخمینہ ۲۳۳۸ کروڑ اور ۲۶۲۸ کروڑ ہے ۔ مجموعی خسارہ ۲۵۰ کروڑ یونہی رہنے دیا گیا ہے ۔

مرکزی آمدنی کے خاص ذرائع کسٹم، مرکزی محصول، ذاتی انکم ٹیکس، سپر ٹیکس، کارپوریشن ٹیکس، کیپٹل گینس ٹیکس، دلیتھ ٹیکس، اور گفٹ ٹیکس ہیں ۔ ریلوے، ڈاک اور تار کے منافع میں بھی مرکز کا حصّہ ہوتا ہے ۔ ریزرو بینک اور ٹکسال سے بھی کچھ آمدنی ہو جاتی ہے ۔ سول ایڈمنسٹریشن میں فیس، جُرمانے اور وزارتوں کی دوسری آمدنیاں شامل ہیں ۔ سول ورکس سے مراد وہ تعمیرات عامّہ ہیں جو مرکزی ملکیت ہیں اور جن کی نگہ داشت مرکز کرتا ہے ۔

صَرف کی مدات دفاعی اخراجات، سول اخراجات اور اخراجاتِ اصل (CAPITAL EXPENDITURE)

پر مشتمل ہیں۔ دفاعی اخراجات وہ اخراجات ہیں جو زمینی، بحری اور ہوائی فوج پر خرچ ہوتے ہیں۔ اِن میں پنشن اور وظیفے جیسے غیر مؤثر (NON-EFFECTIVE) مصارف بھی شامل ہیں جو شعبۂ دفاع کی ذمہ داری ہیں۔ سول اخراجات میں اِنتظامی مصارف، قرضوں کے سُود، مہاجرین کی بحالی کے مصارف اور غذا کے امدادی اخراجات شامل ہیں۔ مصارف اصل میں صنعتوں، ریلوں، ڈاک تار، ہوا بازی اور دریائی پروجیکٹوں وغیرہ کے مصارف آتے ہیں۔ ان کے اخراجات کا الگ بجٹ ہوتا ہے جس میں ایسی مدات دکھلائی جاتی ہیں مثلاً مستقل قرضوں کی ادائیگی اور صوبوں کو دیے جانے والے قرض اور پیشگی رقمیں۔

ہندوستان میں قرض عامّہ کے جدید رجحانات

غیر تقسیم شدہ ہندوستان کی سُودی واجبات کی ذمہ داری جو ۳۹-۱۹۳۸ء میں ۱۲۰۵٫۷۶ کروڑ تھی ۴۶-۱۹۴۵ء میں ۲۳۰۸٫۳۹ کروڑ تک پہنچ چکی تھی۔ قرض عامّہ میں اِس قدر اِضافہ جنگی ضروریات کی وجہ سے ہوا تھا۔ قرض عامّہ میں اِتنی توسیع کی توقع حکومت کو نہیں تھی اور نہ یہ ضرورت وقت کے مطابق تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ انگلستان اور امریکہ میں مالیاتِ جنگ کا بنیادی ذریعہ اندرونی قرض تھا، ہندوستان میں یہ ضرورت نوٹ چھاپ کر پوری کی گئی۔ اِسی لیے انگلستان اور امریکہ کے مقابلے میں ہندوستان کو افراطِ زر کے زیادہ شدید مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ بہرحال آزادی کے بعد سے سرکاری قرض کے مطالبوں کا ردِّ عمل ہمّت افزا رہا۔ مرکزی حکومت کے سودی واجبات کی مجموعی رقم آزادی کے فوراً بعد یعنی ۴۹-۱۹۴۸ء کی ۲۴۵۵٫۰۵ کروڑ سے بڑھ کر پہلے منصوبے کے آخری سال، یعنی ۵۶-۱۹۵۵ء میں بڑھ کر ۳۳۱۱٫۵۹ کروڑ ہوگئی۔ سرکار کے سودی واجبات برابر بڑھتے رہے اور ۵۷-۱۹۵۶ء کے ۳۶۷۶ کروڑ سے بڑھ کر ۶۸-۱۹۶۷ء میں ۱۵۸۵۹ کروڑ ہوگئے۔ سودی واجبات میں داخلی اور بیرونی قرض عامّہ، جاری رہنے والے یا متحرک قرض اور سودی امانتیں شامل ہیں۔

روپے کی شکل میں ہندوستان کا قرض، یعنی اندرونی قرض، تین منصوبوں کے دوران بے حد بڑھا ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں یہ قرض ۲۴۶۹ کروڑ تھا جو ۶۸-۱۹۶۷ء میں بڑھ کر ۹۷۲۷ کروڑ ہوگیا لیکن چونکہ اِس مدت میں قومی آمدنی اِتنی تیزی سے نہیں بڑھی جتنی تیزی سے قرض بڑھا اِس لیے ۵۱-۱۹۵۰ء کے مقابلے میں ۶۸-۱۹۶۷ء میں قرض عامّہ قومی آمدنی کا زیادہ بڑا حِصّہ تھا۔

مرکز کا واجب الادا قرضِ عامّہ مارچ ۱۹۶۹ء میں ۱۲۷۲۷ کروڑ تھا یعنی مارچ ۱۹۶۸ء کے

ختم پر جتنا قرض تھا اُس سے ۶۰۰ کروڑ زیادہ ۔ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۶۹ء کے درمیان مرکزی حکومت کی قرض کی ذمہ داری چھ گنی سے زیادہ ہوگئی تھی اور توقع تھی کہ مارچ ۱۹۷۰ء تک اس میں ۹۴۰ کروڑ کا مزید اضافہ ہوگا یعنی مجموعی قرض ۱۳۸۲۱ کروڑ ہو جائے گا۔

قرضِ عامہ کی طرف توجہ کرتے وقت ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ قرض عامہ دو قسم کے ہوتے ہیں، قابلِ فروخت اور ناقابلِ فروخت ۔ عموماً قابلِ فروخت قرض ہی مجموعی قرض کا بڑا حصہ ہوتا ہے اور یہی قرض ہے جس کے ذریعے عملِ قرض کے اثرات معیشت تک پہنچتے ہیں ۔ قابلِ فروخت قرض میں کچھ متحرک قرض ہوتے ہیں (مثلاً ٹریژری بل اور دوسری سیکیورٹیاں جو بارہ مہینے میں واجب الادا ہوتی ہیں) اور کچھ مستقل قرض مثلاً بانڈ اور دوسرے ایسے قرض جو بارہ مہینوں سے زیادہ مدت کے بعد واجب الادا ہوتے ہیں ۔ ناقابلِ فروخت قرض بیشتر چھوٹی بچتوں پر مشتمل ہوتا ہے ۔

آیئے اب ہندوستان کے قرض عامہ کا مقابلہ برطانیہ اور امریکہ کے قرض عامہ سے کرنے کی کوشش کریں ۔ ۱۹۶۸ء کے آخر میں قرض عامہ خام قومی پیداوار کی فی صد کی حیثیت سے امریکہ میں ۶۰ اور برطانیہ میں ۱۷۰ تھا جبکہ قبل از جنگ کی فی صد بالترتیب ۵۰ اور ۲۰۰ تھی ۔ ہندوستان کی خام پیداوار کے قابلِ اعتبار اعداد و شمار نہیں ہیں لیکن ریزرو بینک کے تخمینے کے مطابق ۱۹۶۸-۶۹ء کے آخر میں ہندوستان کا قرضِ عامہ خام قومی پیداوار کے ⅓ سے زیادہ تھا ۔ قومی آمدنی کی فی صد کے اعتبار سے یہ ۵۴ فی صدی تھا جبکہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں صرف ۲۸ فی صدی تھا ۔ لیکن ۱۹۶۷-۶۸ء کے آخر میں قرض عامہ قومی آمدنی کے نصف سے کچھ کم تھا (رواں قیمتوں کے مطابق) ۔

ایک اور پہلو جس کا کسی ملک کے قرض عامہ سے قریبی تعلق ہوتا ہے یہ ہے کہ اُس قرض پر جتنا سود واجب ہوتا ہے اُس کا تناسب سرکاری آمدنی کے ساتھ کیا ہے ۔ اندرونی قرض کے سود کی ادائیگی کا اثر آمدنی کی تقسیم پر پڑتا ہے لیکن اُس صورت میں اِس اثر کی کافی نفی ہو جاتی ہے ۔ اگر یہ قرض پھیلا ہوا ہو (یعنی حکومت چند لوگوں کے بجائے بہت سے لوگوں کی مقروض ہو) ۔ ۱۹۵۷-۵۸ء میں مرکزی اور صوبائی قرض عامہ کا سود مجموعی آمدنی کا ۷ فی صدی تھا ۔ اِس کے مقابلے میں امریکہ میں گیارہ فی صدی (صرف وفاقی حکومت کا قرض) اور برطانیہ میں ۱۵ فی صدی سے لے کر ۱۶ فی صدی تک تھا ۔

مالیاتی پالیسی اور اِنتظامِ قرض کے نکتہ نگاہ سے قرض عامہ کا ایک دوسرا اہم پہلو اُس کے واجب الادا ہونے کی مدت ہوتی ہے جس کے نتائج اہم ہوتے ہیں ۔ اگر قرضِ عامہ کا کافی بڑا حصہ کم میعاد کے قرض پر مشتمل ہو تو قرض کے اِنتظام میں بڑی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں کیونکہ بڑے پیمانے پر

قرض نقد کی ضرورت ہونے کی وجہ سے قرض کے ذریعے قرض کی ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔ بیرونی ملکوں میں امریکہ میں قرض کا کافی بڑا حصہ کم مدت کے قرض پر مشتمل ہے جس کا اندازہ اِس سے کیا جاسکتا ہے کہ کم مدت کے قرض کا تناسب سنہ ۱۹۴۶ء کے ۲۴ فی صدی سے بڑھ کر سنہ ۱۹۵۹ء میں ۴۳ فی صدی ہوگیا۔ اِس کے مقابلے میں برطانیہ میں سنہ ۱۹۵۸ء میں مجموعی قابلِ فروخت قرض عامّہ کا صرف ۱/۵ حصہ وہ تھا جو ۵ سال کے اندر واجب الادا تھا۔ ہندوستان میں داخلی قرضِ عامّہ ادائیگی کی میعاد کے اعتبار سے مختلف میعاد کے قرض میں بٹا ہوا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۵۸ء میں جتنا قرض تھا اُس کا ۳۶ فی صدی حصہ ۵ سال کے اندر ادا ہونا تھا، ۳۲ فی صدی ۵ سے لے کر ۱۰ برس میں، ۱۲ فی صدی ۱۰ سے لے کر ۱۵ برس میں اور ۱۸ فی صدی حصہ ۱۵ برس کے بعد ادا ہونا تھا۔

اِس موقع پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہندوستانی منصوبہ بندی کے پہلے ۱۰ برسوں میں بیشتر قرض مرکز نے ترقیاتی پروجیکٹوں کے لیے مالی وسائل فراہم کرنے کے سلسلے میں لیا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ قرض کے کافی بڑے حصّے کو ایسا پیداآور اثاثہ حاصل کرنے پر صرف کیا گیا جو ایک مدت بعد نفع دینا شروع کر دے گا۔ پانچ سالہ منصوبوں کے دوران حکومت کی قرض کی پالیسی کی تشکیل میں دو باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اوّل تو حکومت دفاع اور ترقی کے لیے زیادہ وسائل حاصل کر رہی ہے، دوسرے حکومت کا مقصد یہ ہے کہ حکومت کے پاس جو زائد روپیہ ہے اُس کو قرض کے ذریعے اُن سے لے لیا جائے۔ پہلے، دوسرے اور تیسرے منصوبوں سے یہ ظاہر ہے کہ منصوبہ بند ترقی نے سرکاری قرض اور عام سرمایہ کاری کے درمیان ایک بامعنی رابطہ قائم کر دیا ہے۔

کچھ مرکزی ٹیکسوں کا مخصوص جائزہ

(۱) اِنکم ٹیکس : اب تک مرکز صرف غیر زرعی آمدنی پر ٹیکس لگانے کا مجاز ہے۔ زرعی آمدنی پر صرف صوبائی حکومتیں اِنکم ٹیکس لگاتی ہیں۔ سنہ ۱۸۶۰ء میں جب اِنکم ٹیکس شروع ہوا اُس وقت یہ زرعی اور غیر زرعی دونوں آمدنیوں پر لگایا جاتا تھا۔ لیکن سنہ ۱۸۶۶ء کے اِنکم ٹیکس ایکٹ کے تحت یہ ٹیکس صرف غیر زرعی آمدنی پر لگایا گیا۔

سنہ ۱۸۶۶ء سے لے کر سنہ ۱۹۱۴ء تک کا زمانہ اِنکم ٹیکس کے نظام کو پختگی دینے کا زمانہ تھا۔ ولڈاپنو کے زمانے میں اِس کی اِنتظامی خامیاں اور کوتاہیاں دُور کی گئیں، سُپر ٹیکس کے ذریعے اس کو تقویت دی گئی اور رفتہ رفتہ اس کو زیادہ تدریجی بنایا گیا۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں جنگ شروع ہونے سے کچھ ہی پہلے

ہندوستان کے ٹیکس کے نظام کو ۱۹۳۶ء کی انکم ٹیکس انکوائری کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں جدید شکل دی گئی۔ اب تک ٹیکس لگانے کا جو طریقہ تھا اُس کو اسٹیپ سسٹم کہتے تھے۔ اِس کی جگہ پر سلیب سسٹم جاری کیا گیا اور مختلف رعایتیں دی گئیں۔ (اسٹیپ سسٹم میں یہ ہوتا ہے کہ ایک انکم گروپ کے تمام لوگوں کو اپنی آمدنی کے ہر روپے پر ایک ہی شرح سے ٹیکس دینا پڑتا ہے جبکہ سلیب سسٹم کے تحت ہر سلیب کا ٹیکس الگ لگایا جاتا ہے اور بعد میں اُس کو جوڑ دیا جاتا ہے۔)

اِکسس پرافٹ ٹیکس ۱۹۱۹ء میں پہلی بار لگایا گیا اور صرف ایک سال رہا لیکن دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں اس ٹیکس کا پورا فائدہ اٹھایا گیا۔ اِکسس پرافٹ ٹیکس ۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک جاری رہا اور ان منافعوں پر عائد ہوتا تھا جو ستمبر ۱۹۳۹ء اور مارچ ۱۹۴۶ء کے درمیان کمائے گئے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں جب یہ ٹیکس ختم کیا گیا تو اس کی جگہ بزنس پرافٹ ٹیکس عائد کیا گیا جس کا حساب لگانا زیادہ آسان تھا اور یہ کمپنیوں کے منافع پر عائد ہوتا تھا۔ اس کے نفاذ کا بنیادی مقصد افراطِ زر پر قابو پانا تھا۔ اِنکم ٹیکس اور سپر ٹیکس کی اہل آمدنی کا تعین کرنے کے لیے بزنس پرافٹ ٹیکس ایک قابلِ قبول پیمانہ تھا۔

اِنکم ٹیکس انکوائری کمیشن نے سفارش کی کہ انکم ٹیکس سے استثنیٰ کی حد ۴۲۰۰ روپے سے گھٹا کر ۳۰۰۰ روپے کر دی جائے۔ ۱۹۵۷-۵۸ء میں پہلی بار مسٹر کرشنا چاری نے اپنے بجٹ میں اس سفارش پر عمل کیا۔ لیکن آگے چل کر ۱۹۶۴-۶۵ء، ۱۹۶۵-۶۶ء اور ۱۹۶۶-۶۷ء کے بجٹوں میں اِس میں تبدیلی کی گئی۔ چودھری کی ۱۹۶۶-۶۷ء کی ٹیکس کی اسکیم میں، جو ابھی نافذ ہے، اِنکم ٹیکس سے استثنیٰ کی حد افراد کے لیے ۴۰۰۰ روپے اور مشترک ہندو خاندانوں کے لیے ۷۰۰۰ روپے کر دی گئی۔ مشترک ہندو خاندانوں کے لیے یہ شرط تھی کہ خاندان میں کم از کم دو افراد آمدنی میں تقسیم کے حقدار ہوں۔ شادی شدہ افراد جن کے کوئی بچہ نہیں تھا اور مشترک ہندو خاندان جس کا کوئی نابالغ وارث نہیں تھا ان کے لیے ٹیکس سے مستثنیٰ پہلا سلیب ۴۰۰۰ روپے تھا۔ کسی شخص کے اگر ایک بچہ تھا یا مشترک ہندو خاندان جس کا ایک نابالغ وارث تھا اُس کے لیے پہلا مستثنیٰ سلیب ۴۴۰۰ روپے تھا۔ شادی شدہ افراد جن کے ایک سے زیادہ بچے تھے یا مشترک ہندو خاندان جن کے ایک سے زیادہ نابالغ وارث تھے پہلا مستثنیٰ سلیب ۴۸۰۰ روپے تھا۔ غیر شادی شدہ لوگوں کے لیے ۲۵۰۰ روپے تک کی آمدنی ٹیکس سے مستثنیٰ تھی۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شادی کا الاؤنس اور خاندان کا الاؤنس پہلی بار ٹیکسیشن انکوائری کمیٹی نے تجویز کیا تھا۔ مرارجی نے ۱۹۶۷-۶۸ء کے بجٹ میں ایک مزید لیکن معمولی رعایت کا اعلان کیا۔ شادی شدہ

اور غیر شادی شدہ لوگوں کے لیے موجودہ اِنکم ٹیکس الاؤنس کی طرح مُرارجی نے اُن مقیم افراد کے لیے ۴۰۰ روپے کا ایک الاؤنس دیا جن کی آمدنی ۱۰۰۰۰ روپے کے اندر تھی اور جنھیں اپنے والدین یا والدینِ والدین کی کفالت کرنی پڑتی تھی۔ اِس الاؤنس پر ٹیکس کی رعایت کا حساب آمدنی کے پہلے سلیب پر ۵ فی صدی کی شرح سے لگایا جاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ خود والدین کی ذاتی آمدنی ۱۰۰۰ روپے سال سے زیادہ نہ ہو۔

ہندوستان کے ٹیکس کے نظام کی اصلاح کے بارے میں کالڈر رپورٹ میں یہ تجویز کیا گیا تھا کہ کمائی ہوئی اور پس اندازکی ہوئی آمدنی پر انکم ٹیکس کی مختتم شرح ۴۰ فی صدی سے ۵۰ فی صدی تک ہو۔ اور بنے کمائی آمدنی پر (یعنی املاک اور کاروبار سے آمدنی) سالانہ ولتھ ٹیکس کی شکل میں امتیازی ٹیکس نافذ کیا جائے جس کی مختتم شرح ایک سے لے کر ۱ ½ فی صدی سے زیادہ نہ ہو۔ کرشنا چاری نے ۱۹۵۶-۵۷ء کے بجٹ میں ولتھ ٹیکس شروع کیا لیکن اِنکم ٹیکس اور سُپر ٹیکس کی مختتم شرح میں بہت خفیف کمی کی۔ مسٹر کالڈر نے آمدنی کی واحد مکمل رپورٹ میں ذاتی ٹیکسوں کے خود جانچ کرنے والے نظام اور ایک خودکار رپورٹ دینے والے نظام کی سفارش کی تھی۔ فی الحال چونکہ ہم نے کیپیٹل گینس ٹیکس، گفٹ ٹیکس اور ولتھ ٹیکس لگا رکھے ہیں اِس لیے ہم ایک ایسے نظام پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں جس کے تحت آمدنی کی رپورٹ زیادہ مکمل ہو۔

بڑھتے ہوئے دفاعی اور ترقیاتی مصارف کے لیے بھاری نئے ٹیکسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۳-۶۴ء، ۱۹۶۴-۶۵ء اور ۱۹۶۵-۶۶ء کے بجٹوں میں بالواسطہ اور براست دونوں ٹیکسوں پر مناسب زور دیا گیا۔ اِنکم ٹیکس کے نظام کی عقلی اصول پر تنظیم کی پہلی کوشش ۱۹۶۴-۶۵ء کے بجٹ میں کی گئی۔ آگے چل کر ۱۹۶۶-۶۷ء، ۱۹۶۷-۶۸ء اور ۱۹۶۸-۶۹ء کے بجٹوں میں اِس کو مکمل کیا گیا۔ ٹیکس کے ڈھانچے کو زیادہ آسان بنانے کے پیشِ نظر حکومت نے ۱۹۶۸-۶۹ء کے بجٹ میں بے کمائی اور کمائی آمدنی پر الگ الگ سرچارج لگانے کا طریقہ ختم کر دیا اور موجودہ دس فی صدی کا سرچارج باقی رکھا گیا۔ بہر حال ٹیکس کی شرح کی تدریجی ماہیت برقرار رکھنے کی غرض سے ایک سے ڈھائی لاکھ تک کی آمدنی پر ٹیکس کی بنیادی شرح ۵ء۲ فی صدی سے بڑھا کر ۷۰ فی صدی اور ۲ ½ لاکھ سے اوپر ۵ء۲ فی صدی سے بڑھا کر ۵ء۷ فی صدی کر دی گئی۔ اِس موقع پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اینوٹنٹی ڈپازٹ اسکیم جو ۱۹۶۴-۶۵ء میں شروع کی گئی تھی ۱۹۶۹-۷۰ء میں ختم کر دی گئی۔ ۱۹۶۹-۷۰ء کے بجٹ میں ایک ہزار سے اوپر اور ۵ ا ہزار تک کی آمدنی پر ٹیکس ۲ فی صدی بڑھا کر ۷ ا فی صدی اور ۵ ا ہزار سے اوپر اور ۲۰ ہزار تک پر ۳ فی صدی بڑھا کر ۲۳ فی صدی کر دیا گیا۔ وزیر مالیات نے بیرونی ذرائع سے ہونے والی آمدنی پر ۵ء۲ فی صدی کی چھوٹ کا بھی اعلان

کیا ہے۔ یہ رعایت مصنفوں، آرٹسٹوں، ڈرامہ نویسوں، موسیقاروں اور ایکٹروں کے لیے ہے۔
حال کے چند برسوں میں ٹیکسوں کی گرفت سخت کی گئی ہے لیکن نفاذ کرنے والے عملے کے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ ٹیکس سے بچنے کی کوشش کا سدِباب کیسے کیا جائے۔ براہِ راست ٹیکسوں کے اِنتظام کے بارے میں ایک اِنکوائری کمیٹی قائم کی گئی تھی جس کے صدر مہاویر تیاگی تھے۔ اِس کمیٹی نے اپنی رپورٹ دسمبر ۱۹۵۹ء میں پیش کی جس میں کہا گیا ہے کہ ٹیکس کے کسی بھی اِنتظام کے دو مقاصد ہونے چاہئیں۔ ایمانداروں کی ہمّت افزائی کرنا اور بے ایمانوں کو سخت سزا دینا۔ اِن مقاصد کے پیشِ نظر کمیٹی نے موجودہ قوانین میں کئی ترمیمیں تجویز کی ہیں جن میں یہ تجاویز شامل ہیں: ایک شعبۂ نفاذ قائم کیا جائے جو ٹیکس چوروں کا پتہ چلائے، اُن پر مقدمہ چلائے اور انھیں سزا دے، جن لوگوں پر ۵۰۰۰ روپے سے زیادہ کا جرمانہ ہو، اُن کے نام گزٹ میں شائع کیے جائیں، مُخیّر وقفوں کے کاروبار پر چھوٹ کی جو رعایتیں دی جاتی ہیں اُنھیں زیادہ محدود کیا جائے تاکہ بڑے کاروباری گھرانے اُن سے فائدہ نہ اُٹھا سکیں۔ کمیٹی نے یہ بھی کہا ہے کہ سماعتی حکّام کو یہ اپیل سُننے کا اختیار تو ہو کہ ٹیکس چوری سرزد ہوئی ہے یا نہیں لیکن اُنھیں اِنکم ٹیکس افسر کے عائد کیے ہوئے جُرمانے کو کم کرنے کا اختیار نہ ہونا چاہیے۔
تیاگی کمیٹی کی اِنکم ٹیکس سے متعلق وہ سفارشات جو حکومت نے مان لی تھیں، ۱۹۶۱ء کے اِنکم ٹیکس ایکٹ میں شامل ہیں۔ یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ تیاگی کمیٹی کی سفارشات کا مقصد یہ تھا کہ ٹیکس زیادہ مُستعدی کے ساتھ وصُول کیے جائیں، ٹیکس چوروں کو سخت سزائیں دی جائیں اور زیرِ تشخیص لوگوں، خصوصاً کم آمدنی والوں کو دِقّ نہ کیا جاسکے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ۱۹۶۱ء کے ایکٹ کا ایک اہم نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مُخیّر وقف جو متعیّنہ مقاصد سے ہٹ کر کاروبار کر رہے ہوں گے ٹیکس سے استثنیٰ کے حقدار نہیں ہوں گے۔ اِس کے علاوہ جو لوگ اپنی آمدنی کی رپورٹ ہر سال ۳۰ جُون تک نہیں داخل کریں گے انھیں واجب الوصول ٹیکس پر سود دینا ہوگا۔ لیکن اگر حکّام رقم کے ریفنڈ میں چھ ماہ سے زیادہ لگائیں گے تو انھیں بھی واپس ملنے والے کو سُود ادا کرنا ہوگا۔ ٹیکس سے بچنے کی کوشش کے سدِباب کے لیے ۱۹۶۸-۶۹ء کے بجٹ میں کئی اقدام کا اعلان کیا گیا۔ مثلاً یہ کہ خاطر تواضع کے اخراجات کو ٹیکس سے مستثنیٰ کرنے اور زیادہ تنخواہ پانے والوں کو بالائی یافت کی بعض رعایتیں دینے کے قاعدوں میں سختی برتی جائے۔
(۲) ولتھ ٹیکس: ۱۹۵۶ء میں کالڈر کی رپورٹ میں خام دولت پر ایک سالانہ ٹیکس تجویز کیا گیا تھا۔ ہندوستان کے لیے جس قسم کے ولتھ ٹیکس کی سفارش کی گئی تھی وہ اسکینڈینویائی ممالک

کے ولتھ ٹیکس کا چربہ تھا۔ مسٹر کالڈر کی رائے تھی کہ یہ ٹیکس سب سے نچلے سلیب (ایک لاکھ سے ۴ لاکھ تک) پر ۳ء۰ فی صدی کی شرح سے لگایا جائے اور بتدریج بڑھ کر سب سے اونچے سلیب (۱۵ لاکھ سے اُوپر) کے لیے ۶ء۱ فی صد سالانہ ہو جائے۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ مسٹر کالڈر نے ایک لاکھ تک کی دولت کو ولتھ ٹیکس سے مستثنیٰ رکھنے کی سفارش کی تھی۔ اُنھوں نے اِس بات پر زور دیا کہ ازراہِ انصاف یہ ٹیکس جامع ہونا چاہیے، یعنی ہر قسم کی املاک پر عائد ہونا چاہیے۔

ولتھ ٹیکس کی حیثیت ذاتی اِنکم ٹیکس کے تکملے کی ہونی چاہیے کیونکہ قابلِ فروخت اثاثے کی شکل میں اِملاک کی ملکیت سے صاحب ملک کو قابلِ ٹیکس استعداد حاصل ہوتی ہے جو املاک سے ہونے والی نقد آمدنی سے بالکل مختلف ہے۔ اگر انکم ٹیکس کے ساتھ ولتھ ٹیکس بھی ہو تو ٹیکس کے اُس اصُول پر بہتر عمل ہو سکتا ہے کہ ٹیکس ادائیگی استعداد کے مطابق ہونا چاہیے۔ اِس کے علاوہ ولتھ ٹیکس اِنکم ٹیکس کی طرح جوکھم والی سرمایہ کاری کے خلاف تفریق نہیں برتتا۔ مثلاً ٹیکس کے تحت ایک اِملاک پر وہی ٹیکس لگتا ہے چاہے وہ نقد یا زیورات یا سرکاری بانڈ کی شکل میں ہو یا پیدا آور کاروبار میں مصروف ہو جہاں اس پر ۲ فی صدی سے ۱۰ فی صدی تک سُود ملتا ہو۔ آخر میں یہ بات بھی اہم ہے کہ آمدنی تو چھپائی جا سکتی ہے لیکن اِملاک کا چھپانا مشکل ہے چنانچہ اِنکم ٹیکس کے ساتھ اگر ولتھ ٹیکس بھی ہو تو، جو عام اِملاک پر ٹیکس کی ایک قسم ہے، تو ٹیکس سے بچنے کی کوشش کی کامیابی مشکل ہو جاتی ہے۔ بہ ہر حال ولتھ ٹیکس لگانے اور اُسے وصول کرنے میں بہت سی اِنتظامی دشواریاں ہیں اور سب سے بڑا مسئلہ ٹیکس کی تشخیص کا ہوتا ہے۔

مسٹر کالڈر کے دلائل سے متاثر ہو کر مسٹر کرشنما چاری نے ۵۸-۱۹۵۷ء کے بجٹ میں دولت پر ٹیکس لگانے کا اعلان کیا۔ ستمبر ۱۹۵۷ء کو راشٹرپتی نے ولتھ ٹیکس ایکٹ پر دستخط کر دیے۔ یکم اپریل ۱۹۵۷ء سے اِس ایکٹ کا نفاذ ہوا اور یہ اُس اثاثے پر عائد ہوتا ہے جو پچھلے سال کے آخری دِن کسی شخص کی ملکیت میں ہوتا ہے۔ یہ ٹیکس اُن افراد کو دینا پڑتا ہے جن کی آمدنی دو لاکھ سے اُوپر ہوتی ہے۔ ٹیکس سے بچنے کی کوشش کے سدِباب کے لیے یہ بھی طے پایا کہ کسی شخص کی بیوی اور اُس کے نابالغ بچوں کے نام جو اثاثہ ہو اُس کو بھی ٹیکس کے لیے اُس شخص کی ملکیت تصور کیا جائے۔

۱۹۵۷ء کے ولتھ ٹیکس کے تحت کچھ قسم کے اثاثوں کو ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، مثلاً وہ اثاثہ جس کی حیثیت امانت کی ہو، فرنیچر، گھریلو استعمال کے برتن، کپڑے اور دوسری اشیا جو ذاتی استعمال کے لیے ہوں، ۲۵,۰۰۰ تک کی قیمت کے زیورات، ۲۰,۰۰۰ روپے تک کے پیشہ ورانہ اوزار اور آلات وغیرہ۔

کچھ اور بھی چیزوں کو ٹیکس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے لیکن ٹیکس کی شرح کے تعین کے لیے ان کی قیمت بھی جوڑی جائیگی۔ غیر ملکی غیر مقیم شہری کو اس رقم کا صرف نصف ادا کرنا ہوگا جو کسی زیرِ تشخیص سال کے لیے اُس پر واجب ہوتا ہے۔ کمپنیوں پر جو دولتہ ٹیکس ۱۹۶۰ء میں لگایا گیا تھا اُس کو ۱۹۶۰ء میں ختم کر دیا گیا۔

مُرار جی نے ۶۳-۱۹۶۲ء کے بجٹ میں دولتہ ٹیکس کی شرح میں اہم تبدیلیوں کا اعلان کیا۔ دو سب سے اونچے سلیبوں پر ٹیکس کی شرح ۲۵ء۰ فی صدی اور ۵ء۰ فی صدی بڑھا دی گئی۔ سلیبوں کی ساخت پر بھی نظر ثانی کی گئی۔ ۱۹۵۷ء کے ایکٹ کے تحت کمپنیوں کے شیئر پہلے پانچ برسوں کے لیے ٹیکس سے مستثنیٰ تھے۔ ۶۳-۱۹۶۲ء کے بجٹ میں یہ رعایت ختم کر دی گئی۔ ۲۵۰۰۰ روپے تک کے زیورات پر بھی ٹیکس کی چھوٹ ۶۳-۱۹۶۲ء کے بجٹ میں واپس لے لی گئی۔ ایسے وقت میں جب حکومت نے سونے کے لالچ اور سونا رکھنے کی خواہش کم کرنے کے لیے اپنی نئی پالیسی شروع کر رکھی تھی، زیورات پر کسی قسم کی چھوٹ دینا بے معنی تھا۔ چنانچہ ۶۴-۱۹۶۳ء کے بجٹ میں اس سلسلے میں ضروری اقدام کیے گئے۔

مسٹر کرشنا چاری نے ۶۵-۱۹۶۴ء کے بجٹ میں دولتہ ٹیکس کی نئی شرحوں کا اعلان کیا۔ ٹیکس سے استثنیٰ کی حد افراد کے لیے ۲ لاکھ سے گھٹا کر ایک لاکھ اور مشترک ہندو خاندان کے لیے ۴ لاکھ سے گھٹا کر ۲ لاکھ کر دی گئی۔ دولت کے پہلے سلیب یعنی ۴ لاکھ تک پر (مشترک ہندو خاندان کے لیے ۳ لاکھ) ٹیکس کی شرح ۵ء۰ فی صدی کر دی گئی اور دوسرے سلیبوں کو دوبارہ ترتیب دیا گیا۔

افراد اور مشترک ہندو خاندانوں پر دولتہ ٹیکس ½ فی صدی سے لے کر ½ ۲ فی صدی تک جاری رہا۔ اِس کے علاوہ مسٹر کرشنا چاری نے شہری اِملاک پر بھی دولتہ ٹیکس لگایا۔ یہ ٹیکس ایک لاکھ یا اس سے اُوپر کی آبادی والی شہری املاک پر عائد ہوتا ہے۔ شہری املاک پر زائد دولتہ ٹیکس کے لیے استثنیٰ کی مختلف حدیں چھوٹے بڑے شہروں کے لحاظ سے متعین کی گئیں۔ اِن کے علاوہ شہری املاک کی بازاری قیمت کے سلیبوں پر ایک سے ۴ فی صدی تک مزید دولتہ ٹیکس تدریجی طور سے لگتا ہے۔

۶۹-۱۹۶۸ء کے بجٹ میں زرعی دولت کو بھی ۷۰-۱۹۶۹ء کے مالی سال سے دولتہ ٹیکس کے تحت لے آیا گیا۔ افراد اور مشترک ہندو خاندانوں کی ملکیت میں مخصوص قسم کے زرعی املاک* کو غیر زرعی املاک

---

* زرعی املاک میں یہ چیزیں شامل ہیں : زراعتی زمین اور ان زمینوں پر کے درخت، عمارتیں چاہے اس زمین پر ہوں یا اُس کے پاس، چاہے وہ کسان کی ملکیت ہوں یا اس کے استعمال کی۔

کی قیمت کے ساتھ جوڑ دیا جائے گا اور اس طرح دولت کی جو اوسط نکلے گی اُس پر معینہ شرح سے ٹیکس لگے گا۔ کھڑی فصلوں، اوزار، آلات اور مشینوں مثلاً ٹریکٹر وغیرہ پر یہ ٹیکس نہیں لگے گا۔

(۳) **محصول مصارف (اکسپنڈیچر ٹیکس)**: یہ تجویز مسٹر کالڈر کی تھی کہ ہندوستان میں ذاتی مصارف پر ٹیکس لگایا جائے جس کی استثنیٰ کی حد نسبتاً اونچی رکھی جائے۔ ساتھ ہی زیادہ سے زیادہ اِنکم ٹیکس کی شرح گھٹا کر ۷ آنے فی روپیہ کر دی جائے (یا مع سرچارج ۴۵ فی صدی)۔

مسٹر کرشنا چاری نے ۵۸-۱۹۵۷ء کے بجٹ میں مصارف پر ٹیکس تجویز کیا۔ یہ ٹیکس افراد اور مشترک ہندو خاندانوں پر عائد ہوتا تھا۔ پارلیمنٹ نے یہ ایکٹ ۱۲ ستمبر ۱۹۵۷ء کو پاس کر دیا اور یکم اپریل ۱۹۵۸ء سے اِس کا نفاذ ہوا۔ ابتداً یہ ٹیکس ۵ سال کے لیے لگایا گیا۔ دورانِ نفاذ اندازہ ہوا کہ اِس ٹیکس سے جتنی آمدنی ہے اُس کے دیکھنے پر انتظامی مصارف زیادہ ہیں۔ چنانچہ پانچ سال کی مدّت ختم ہونے پر ۶۳-۱۹۶۲ء کے مالی سال سے اِس کو ختم کر دیا گیا لیکن زیادہ آمدنی والوں کے بڑھتے ہوئے مصارف کے پیشِ نظر مسٹر کرشنا چاری نے ۶۵-۱۹۶۴ء کے بجٹ میں یہ ٹیکس دوبارہ شروع کر دیا۔ ٹیکس کی نئی شرح پرانی شرح سے کم تھی۔ اِس میں استثنیٰ کی حد ۳۶،۰۰۰ روپے رکھی گئی اور ٹیکس کی شرح ہر ۱۲ ہزار کے سلیب پر مصارف کے ۵ فی صدی سے بڑھ کر ۲۰ فی صدی تک جاتی تھی۔ لیکن سب سے اُونچے سلیب یعنی ۴۸،۰۰۰ روپے سے اُوپر کے لیے ۲۰ فی صدی کی شرح ۶۶-۱۹۶۵ء کے مالی سال سے نافذ کی گئی۔ اِس ٹیکس سے تقریباً ۶۰ لاکھ سالانہ کی آمدنی تھی۔ اِنتظامی دُشواریوں اور زیرِ تشخیص لوگوں کو جو زحمت اٹھانی پڑتی تھی اُس کے دیکھتے آمدنی بہت برائے نام تھی۔

مصارف پر محصول ایک سالانہ ٹیکس تھا جس کے ساتھ کچھ بنیادی رعایتیں بھی تھیں ۱۹۵۷ء کے ایکٹ کے تحت شرحیں سلیب سسٹم کے مطابق مقرّر کی گئی تھیں اور مصارف زیادہ ہونے کے ساتھ بتدریج بڑھتی جاتی تھیں۔ ۱۰،۰۰۰ روپے تک قابلِ ٹیکس مصارف کے لیے ٹیکس کی شرح ۱۰ فی صدی تھی جو مصارف کے ساتھ بتدریج بڑھتی جاتی تھی۔ ۵۰ ہزار سے اُوپر مصارف کے لیے سب سے زیادہ شرح تھی، یعنی ۱۰۰ فی صدی۔

مسٹر کالڈر نے محصول مصارف کی جو شرحیں تجویز کی تھیں وہ قابلِ توجہ ہیں۔ اُنھوں نے سفارش کی تھی کہ چھوٹ کی حد ۱۰،۰۰۰ روپے فی بالغ ہونا چاہیے۔ اِس سے زیادہ مصارف پر تدریجی ٹیکس لگایا جائے جو سب سے پچھلے سلیب (۱۰،۰۰۰ سے ۱۲،۵۰۰) پر ۲۱ فی صدی سے شروع ہو کر ۵۰،۰۰۰ سے زیادہ کے سلیب پر ۳۰۰ فی صدی تک پہنچ جائے۔ مصارف پر ٹیکس کی اِن شرحوں کے

ساتھ مسٹر کالڈر نے یہ بھی سفارش کی کہ ، آنے فی روپیہ سے اُوپر والے سلیب کی ذاتی آمدنیوں پر سپر ٹیکس ختم کر دیا جائے۔ مسٹر کرشنا چاری نے ۱۹۵۸ء کے بجٹ میں ذاتی مصارف پر ٹیکس کی شرح میں معمولی اِضافہ کر دیا لیکن سپر ٹیکس نہیں ختم کیا۔ ذاتی اِنکم ٹیکس اور سپر ٹیکس جو سب سے اُونچے سلیب پر ہوتا تھا ۹۱.۶۸ فی صدی سے گھٹا کر کمائی آمدنی کے ۸۴ فی صدی اور بے کمائی آمدنی کے ۷۷ فی صدی پر لے آیا گیا۔ مسٹر کالڈر نے سپر ٹیکس کی جگہ پر محصولِ مصارف کی سفارش اِس لیے کی تھی تاکہ محصول کا بوجھ زیادہ پس انداز کرنے والوں پر سے ہٹایا جا سکے اور زیادہ صَرف کرنے والوں پر بڑھایا جا سکے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ افراطِ زر کم ہوگا اور بچت بڑھے گی جس کی معاشی ترقی کو ضرورت ہے لیکن مسٹر کرشنا چاری زیادہ آمدنی والوں سے زیادہ سے زیادہ ٹیکس وصول کرنا چاہتے تھے چنانچہ انھوں نے بیک وقت دو گھوڑوں کی سواری کا خطرہ مول لیا۔ یکم اپریل سے محصولِ مصارف کا نفاذ ہوا۔ یہ سپر ٹیکس کے بجائے نہیں تھا بلکہ اِس میں ایک اِضافہ تھا جس کی وجہ سے بچت اور نجی سرمائے کی تشکیل دونوں متاثر ہوئیں غالباً یہ بھی ایک وجہ تھی کہ مُرارجی نے یکم اپریل ۱۹۶۲ء سے یہ ٹیکس ختم کر دیا' اگرچہ ختم کرنے کی بنیادی وجہ اِنتظامی دُشواریاں تھیں۔

محصولِ مصارف کے حق میں مندرجہ ذیل دلیلیں دی جاتی ہیں۔ پہلی دلیل اِنصاف ہے۔ بتدریج بڑھتا ہوا محصولِ مصارف سپر ٹیکس اور سر ٹیکس کے مقابلے میں زیادہ منصفانہ ہے لیکن اِس کی وجہ سے اُونچے طبقے کا معیارِ زندگی پست ہوگا۔ اگر محصولِ مصارف کے ساتھ ولتھ ٹیکس اور پراپرٹی ٹیکس نہ ہوں تو اونچے مصارف کی ہمت شکنی ہوگی اور دولت زیادہ جمع کرنے کا میلان بڑھے گا۔ اِس لیے بہ تقاضائے اِنصاف یہ ضروری ہے کہ محصولِ مصارف کے ساتھ ولتھ ٹیکس بھی ہو جس کی کوشش ہندوستان نے حال میں کی تھی۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ محصولِ مصارف سے بچت بڑھے گی اور اُونچے طبقے کے صَرف کی ہمت شکنی کی وجہ سے افراطِ زر کم ہوگا۔ آخری دلیل یہ ہے کہ اگر محصولِ مصارف نافذ ہو تو اونچے منافعے سماجی اعتبار سے نامناسب نہیں ہونگے بلکہ ان کی وجہ سے کمپنیوں کے لیے بازار سے نیا قرض حاصل کرنا آسان ہوگا۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں اِنتظامی دشواریوں اور مصارف تحصیل زیادہ ہونے کی وجہ سے محصولِ مصارف کامیاب نہیں ہوا اور یکم اپریل ۱۹۶۶ء سے اِس کو ختم کرنا پڑا۔

(۴) کیپیٹل گینس ٹیکس : دولتِ مشترکہ کے تمام ملکوں میں ہندوستان پہلا ملک تھا' جس نے یہ ٹیکس شروع کیا۔ ۱۹۴۷ء میں پہلی بار لیاقت علی خان نے اپنے بجٹ میں کیپیٹل گینس ٹیکس

شروع کیا تھا جو ۱۹۷۷ء کے بجٹ میں واپس لے لیا گیا۔ مسٹر کالڈر کی سفارش کے مطابق یہ ٹیکس نومبر ۱۹۵۶ء کے فائنانس بل کے ذریعے دوبارہ زندہ کیا گیا۔ دوبارہ اس کے لگانے کا مقصد یہ تھا کہ آمدنی کی نابرابری دور کی جائے، ترقیاتی منصوبوں کے لیے وسائل مہیا کیے جائیں اور انکم ٹیکس کے نظام کی بعض خامیاں دور کی جائیں۔

افزائش اصل یا نقصانِ اصل سے مُراد اثاثے کی اصلی قیمت میں اِضافہ یا کمی ہے مثلاً تمسکات، شیئر، سیکیورٹی، زمین، عمارتیں، کارخانوں اور مشینوں کی فروخت سے یا تو افزائش اصل ہوگی یا نقصانِ اصل۔ بقول ہیرلڈ گروز (HAROLD GROVES) یہ آمدنی کسی چشمے کے بہاؤ سے نہیں بلکہ اُس کی فروخت سے حاصل ہوتی ہے۔ اِس لیے اس کی حیثیت اِتفاقی اور غیر مستقل ہوتی ہے لیکن تیز ترقی کے دَور میں افزائش اصل تیزی سے واقع ہوتی ہے اِس لیے کیپیٹل گینس ٹیکس کے ذریعے سرکاری خزانے کو بھی اِس کا حِصّہ ملنا چاہیے۔

ٹیکسیشن انکوائری کمیشن کیپیٹل گینس ٹیکس کے دوبارہ شروع کیے جانے کے خلاف تھا۔ اُس کی رائے تھی کہ پچھلے دو برسوں میں اِس سے آمدنی کم ہوتی رہی ہے اور نجی سرمایہ کاری پر اس کا اثر خراب پڑا ہے۔ پانچ سالہ منصوبوں کے دوران نجی سرمائے کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنے کی ضرورت کے پیشِ نظر کمیشن کا خیال تھا کہ کیپیٹل گینس ٹیکس شروع کرنے کے بجائے اِنکم ٹیکس بڑھا دیا جائے۔ مسٹر کالڈر اِس نتیجے پر پہنچے کہ ۱۹۴۸ء میں کیپیٹل گینس ٹیکس واپس لینے کے دلائل بہت کمزور تھے۔ انھوں نے اِس بات پر زور دیا کہ بنیادی طور سے اِس ٹیکس کا مطلب انصاف کرنا تھا۔ کیپیٹل گینس ٹیکس کو اِنکم ٹیکس کے دائرے سے نکال دینا بے اِنصافی کے مترادف تھا کیونکہ اِس کا مطلب یہ تھا کہ ایک خاص قسم کے ٹیکس ادا کرنے والوں کے ساتھ دوسرے کے مقابلے میں رعایت برتی جارہی تھی۔ چنانچہ اُن کی سفارش تھی کہ یہ ٹیکس جلد از جلد دوبارہ نافذ کیا جائے۔ حکومت نے اس سفارش کی فوراً تعمیل کی اور ۱۹۵۶ء کے وسط تک انکم ٹیکس ایکٹ کی دفعہ (B) ۱۲ میں ضروری تبدیلی لائی گئی تاکہ مندرجہ ذیل آمدنیوں کو ٹیکس کے تحت لایا جاسکے: (۱) اِنتقالِ اثاثہ کی وجہ سے ہونے والی لازمی آمدنی (۲) کمپنیوں اور ساجھے داریوں کے ختم ہونے کی صورت میں اثاثے کی تقسیم سے ہونے والی آمدنی (۳) رہائشی جائداد کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی۔

۱۹۵۶ء میں وسط سال کے مالیاتی ایکٹ کے ذریعے کیپیٹل ٹیکس دوبارہ نافذ کیا گیا۔ ترقیاتی منصوبہ بندی کے افراطِ زر کے دَور میں اثاثے کی فروخت سے لوگوں نے بہت منافع کمایا تھا اور دولت

جمع کی تھی۔۔ ایکٹ کے ذریعے اِس دولت پر کافی بندشوں کا اہتمام کیا گیا۔ ۴۸-۴۷ء سے ۵۰-۴۹ء تک کیپٹل گینس ٹیکس کی شرح ۵۰ ہزار تک ایک آنہ فی روپیہ تھی۔ بالائی سطح یعنی ۱۰ لاکھ سے اُوپر کے لیے شرح ۵ آنے فی روپیہ تھی۔ مسٹر کالڈر کا خیال تھا کہ یہ شرح بہت کم ہے۔ چنانچہ انھوں نے تجویز کیا کہ بالائی شرح ۴ آنے سے لے کر ۷ آنے فی روپیہ کر دی جائے اور سپر ٹیکس صرف تب لگایا جائے جب آمدنی ۴۰ ہزار سے اُوپر ہو۔ اِس اِنتظام کے تحت کیپٹل گینس ٹیکس اِنکم ٹیکس پر واجب ہوگا لیکن سپر ٹیکس پر نہیں واجب ہوگا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ٹیکس کی تشخیص کے وقت اِضافۂ اصل مجموعی آمدنی میں جوڑ دیا جائیگا اور انکم ٹیکس کی مختتم شرح ۷ آنے فی روپیہ سے زیادہ نہ رکھی جائے گی۔ دلیل یہ دی گئی کہ ایسا کرنے سے نجی سرمائے کی تخلیق پر کوئی خراب اثر نہیں پڑے گا۔

۵۶ء کے فائنانس ایکٹ کے ذریعے حکومت نے اِضافۂ اصل کو انکم ٹیکس میں شامل کر لیا۔ اِس ایکٹ کے تحت ٹیکس کی شرح ۴ آنے فی روپیہ یعنی بالائی سطح ۲۵ فی صدی تھی۔ افراد کے لیے زیادہ سے زیادہ شرح ایک ہی رکھی گئی چاہے آمدنی معمول کے مطابق ہوئی ہو یا افزائش اصل کی شکل میں۔ ایکٹ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر کسی حسابی سال میں افزائشِ اصل ۵۰۰۰ روپے سے کم ہے تو اُس پر ٹیکس نہیں واجب ہوگا۔ اسی کے مطابق اگر کسی سال تخفیفِ اصل ۵۰۰۰ روپے سے کم ہے تو اگلے سال کے حساب میں اُس کو درج کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ افزائشِ اصل پر ۲۵ فی صدی اِنکم ٹیکس واجب ہوگا لیکن سپر ٹیکس نہیں واجب ہوگا۔

فائنانس ایکٹ ۶۳ء میں یہ اعلان کیا گیا کہ اثاثہ اصل حاصل کیے جانے کے سال بھر کے اندر فروخت کرنے سے جو آمدنی ہوگی اُس پر دوسری معمولی آمدنیوں کی طرح اِنکم ٹیکس اور سپر ٹیکس دونوں واجب ہوں گے۔ یہ اِس لیے کیا گیا کہ مختلف قسم کے کیپٹل گینس ٹیکس ادا کرنے والے لوگوں کے ساتھ بے اِنصافی نہ ہو۔ کمپنیوں کو چھوڑ کر باقی ٹیکس ادا کرنے والوں کے پاس اگر کوئی اثاثہ سال بھر سے زیادہ رہا ہو تو اُس پر ۲۵ فی صدی یا کم مدت کے منافع کی شرح سے اِنکم ٹیکس واجب ہوگا (دونوں میں سے جو کم ہو) کمپنیوں کے طویل المدت اضافہ اصل پر ۳۰ فی صدی ٹیکس برقرار رہے گا۔

۶۴ء کے فائنانس ایکٹ میں تین اہم تبدیلیوں کا اعلان کیا گیا۔ اوّل یہ کہ کیپٹل گینس ٹیکس تدریجی ہوگا اور پہلے کی طرح ۲۵ فی صدی کی بالائی حد نہ ہوگی۔ دوسرے یہ کہ مکان اور دوسرے غیر منقولہ اثاثے پر ٹیکس کی شرح مختلف ہوگی۔ یہ شرح اِنکم ٹیکس اور سپر ٹیکس کے متعلقہ سلیب کی ۷۵ فی صدی ہوگی۔ دوسرے قسم کے اثاثوں پر ذاتی ٹیکسوں کی ۵۰ فی صدی شرح ہوگی۔ تیسرے یہ کہ

اگر کسی شخص کو بونس شیئر ملتے ہیں تو اُس کو جس سال یہ شیئر جاری ہوئے ہیں اُن پر گینس ٹیکس دینا ہوگا ٹیکس ان شیئروں کی اُس بازاری قیمت پر لگے گا جو ان کے اجرا کے اکیسویں[۲۱] دن ہوگی۔ اِس سلسلے میں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اگر کوئی ضمنی کمپنی اپنا اثاثہ اپنی اصل ہندوستانی کمپنی کو منتقل کرتی ہے جس کے تصرف میں ضمنی کمپنی کا تمام سرمایہ ہے تو ۱۹۶۵ء کے ایکٹ کے تحت اِس کمپنی پر کیپیٹل گینس ٹیکس واجب نہ ہوگا۔ اِس رعایت سے یہ فائدہ ہے کہ ضمنی کمپنیاں جو ۱۰۰ فی صدی کسی بڑی کمپنی کی ملکیت میں اُس کمپنی میں مدغم ہوسکیں گی اور اس طرح بڑے معاشی یونٹ بن سکیں گے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۶۶ء کے فائنانس ایکٹ کے مطابق ۶۷-۱۹۶۶ء کے حسابی سال یا اُس کے بعد کے برسوں میں بونس شیئر سے متعلق اضافۂ اصل صرف اُس وقت حساب میں داخل ہوگا جب یہ بونس شیئر واقعی فروخت یا منتقل کیے جائیں گے۔

(۵) مرکزی محصول : ۱۹۳۴ء میں شکر اور ماچس پر مرکزی محصول لگایا گیا۔ یہ محصول لگانے کی ضرورت اِس لیے پڑی کیونکہ بعض صنعتوں کو تحفظ دیے جانے کی وجہ سے کسٹم کی آمدنی بہت کم ہو گئی تھی۔ جنگ کے زمانے میں مالی وسائل کی فراہمی کے لیے محصول کی پرانی شرحیں بڑھائی گئیں اور بہت سی نئی اشیا پر محصول لگایا گیا۔ آزادی کے بعد سے محصول کی آمدنی بڑھی ہے۔ یہ اضافہ کچھ تو پیداوار بڑھنے کی وجہ سے اور کچھ شرحوں میں اضافے کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ چوتھے اور پانچویں فائنانس کمیشن کی سفارشات کے مطابق صوبوں کو مرکزی محصول کی آمدنی کا ۲۰ فی صدی حصّہ ملتا ہے۔

ترقیاتی منصوبہ بندی جب سے شروع ہوئی اُس وقت سے حکومت چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو ترقی دینے کے لیے محصول لگانے کے اپنے اختیارات کا استعمال کر رہی ہے مثلاً ماچس کی اوسط درجے کی صنعتوں کی پیداوار پر ترجیحی ٹیکس لگایا گیا ہے۔ کھادی اور ہینڈلوم کی صنعت کو تقویت دینے کے لیے حکومت نے مِل کے بنے کپڑے پر محصول لگایا اور کھادی اور ہینڈلوم کو اس سے مستثنیٰ رکھا۔ ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۵ء میں جب سِلک کے کپڑوں، جوتوں، صابون اور دوسری اشیا پر محصول لگایا گیا تو یہ اشیا پیدا کرنے والی چھوٹی صنعتوں کو یا تو ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا گیا یا اُنھیں رعایتیں دی گئیں۔

آزادی کے بعد سے جن چیزوں پر محصول لگائے گئے وہ یہ تھیں : سگرٹ (۱۹۴۸ء)، سوتی کپڑے (۱۹۴۹ء)، آرٹ سِلک کے کپڑے، سیمنٹ، صابون اور جوتے (۱۹۵۴ء)، بجلی کے پنکھے،

بلب، ڈرائی سیل، بیٹری، کاغذ، اُونی کپڑے، رنگ اور وارنش (۱۹۵۵ء)۔ مسٹر کرشنا چاری نے شکر، پٹرول، بناسپتی گھی، سیمنٹ، لوہے کے ڈبے، تمباکو، ماچس، کاغذ اور ڈیزل آئل پر محصول بڑھا دیا۔ پنڈت نہرو کے بجٹ ۱۹۵۸-۵۹ء میں محصول پر پھر سے زور دیا گیا مثلاً سیمنٹ پر محصول ۲۰ روپے فی ٹن سے بڑھا کر ۲۴ روپے فی ٹن کر دیا گیا۔ ۱۹۵۹-۶۰ء سے لے کر ۱۹۶۷-۶۸ء تک کے تمام بجٹوں میں مزید آمدنی حاصل کرنے کے لیے محصولوں پر زیادہ بھروسہ کیا گیا۔ صرف ۱۹۶۵-۶۶ء کے بجٹ میں محصول کی کچھ رعایتیں دی گئیں جن کا مقصد قیمتیں کم کرنا اور صارفوں کو راحت دینا تھا۔ ساتھ ہی ۱۹۶۵-۶۶ء کے بجٹ میں اُن اشیا پر محصول بڑھا دیا گیا جن کی رسد کم تھی اور کمیابی کی وجہ سے ان پر منافع زیادہ تھا۔ ۱۹۶۶-۶۷ء کے بجٹ میں چینی، سگار، سگرٹ، ہلکے ڈیزل آئل اور خام تمباکو پر محصول بڑھا دیا گیا۔ سوتی دھاگے اور کپڑوں پر محصول میں منتخب اضافہ کیا گیا۔ ۱۹۶۷-۶۸ء کے بجٹ میں پہلی بار ربر کے پائپ، ٹیوب اور بلب پر محصول لگایا گیا۔ ۱۹۶۸-۶۹ء کے بجٹ میں وزیر مالیات نے مزید وسائل حاصل کرنے کے لیے جن اشیا پر نیا محصول لگایا یا جن کے محصول میں اضافہ کیا وہ عموماً عیش و آرام کی اشیا تھیں یا ایسی اشیا جن کا صَرف غیر ضروری تھا۔ جن نئی چھے اشیا پر ٹیکس لگایا گیا وہ یہ تھیں :
انگریزی مٹھائیاں اور چاکلیٹ، کڑھا ہوا سامان، فولاد کا فرنیچر، لیدر کلاتھ، والو (VALUE)، ٹرانسفر اور کارک کی ڈاٹ۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ زراعت میں سرمایہ لگا کر استفادہ کرنے والوں کو محصول کے حصار میں لانے کی غرض سے وزیر مالیات نے ۱۹۶۹-۷۰ء کے بجٹ میں مصنوعی کھاد پر ۱۰ فی صدی اور پاور سے چلنے والے پمپ پر ۲۰ فی صدی کا محصول بالواسطہ شروع کیا۔

جب پہلا پلان شروع ہوا اس وقت ۱۲ چیزوں پر محصول نافذ تھا۔ اب ۷۲ اشیا پر محصول لگا ہوا ہے۔ محصول کی شرح میں تیزی سے اضافہ ہوتا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پچھلے سترہ برسوں میں محصول کی آمدنی نے سرکاری خزانے میں اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔ ۱۹۵۰-۵۱ء میں محصول کی آمدنی ۶۸ کروڑ تھی جو ۱۹۵۵-۵۶ء میں ۱۴۵ کروڑ، ۱۹۶۱-۶۲ء میں ۴۸۹ کروڑ، ۱۹۶۵-۶۶ء میں ۸۹۸ کروڑ اور ۱۹۶۸-۶۹ء میں تقریباً ۱۳۲۱ کروڑ ہو گئی۔ پچھلے اٹھارہ برسوں میں مرکزی ٹیکسوں میں مرکزی محصول کا تناسب ۱۶ فی صدی سے بڑھ کر تقریباً ۵۵ فی صدی ہو گیا ہے۔

جب عام صَرف کی اشیا پر محصول لگایا جاتا ہے تو اس سے کافی آمدنی ہوتی ہے اور پیداآوری کا معیار بھی اونچا ہوتا ہے۔ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ ماچس، شکر، مٹی کا تیل، چائے، کپڑوں، جوتوں، بناسپتی اور کاغذ جیسی اشیا پر محصول لگانے سے متوسط طبقے پر بوجھ بڑھتا ہے جنھیں اِن چیزوں

کی زیادہ قیمت ادا کرنی ہوتی ہے۔ حال میں قیمتوں کے اِضافے کے پیشِ نظر مسٹر کرشنا چاری نے ۶۶-۱۹۶۵ء کے بجٹ میں ان اشیا پر کچھ محصول کم کیا جو عام استعمال کی تھیں۔ یہ کمی اس توقع پر کی گئی تھی کہ اِس رعایت سے صارفوں کو فائدہ پہنچے گا لیکن اس کے باوجود ان میں سے بیشتر چیزوں کی قیمتیں بڑھتی رہیں۔

ٹیکسیشن انکوائری کمیشن نے شکر، چائے، مٹی کے تیل، کپڑے اور ماچس کے موجودہ محصول میں اِضافے کی سفارش کی اور کچھ نئی چیزوں پر محصول تجویز کیا۔ مثلاً اُونی کپڑے، بلب، ڈرائی بیٹری، کاغذ، سلائی کی مشین، رنگ اور وارنش، بسکٹ، چینی اور شیشے کے برتن، بناسپتی اور سوڈا واٹر وغیرہ۔ کمیشن کا خیال تھا کہ مجوزہ اِضافوں سے مرکزی آمدنی ۴۰ فی صدی سے ۵۴ فی صدی تک بڑھ جائے گی۔ ۵۶-۱۹۵۵ء اور ۵۷-۱۹۵۶ء کے بجٹوں میں بیشتر سفارشات کی تعمیل کر دی گئی۔ بعد کے بجٹوں میں نہ صرف نئی چیزوں پر محصول لگایا گیا بلکہ شرحوں میں رد و بدل کر کے اور منتخب سرچارج کے ذریعے محصول میں اِضافہ کیا گیا۔

(۶) اسٹیٹ ڈیوٹی یا ڈِتھ ڈیوٹی: اسٹیٹ ڈیوٹی کی شکل میں ڈتھ ڈیوٹی ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۳ء سے شروع کی گئی۔ یہ ڈیوٹی صاحبِ مِلک کے انتقال پر اُس کی املاک وارثوں کو منتقل ہونے سے پہلے عائد ہوتی ہے۔ دستور کے تحت یہ ڈیوٹی زراعتی زمینوں کو چھوڑ کر باقی املاک پر عائد ہوتی ہے اور مرکز یہ ڈیوٹی وصول کر کے صوبوں کو دے دیتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اسٹیٹ ڈیوٹی مرکزی اور صوبائی مالیات کے بیچ کی چیز ہے۔ بہت سے ماہرینِ معاشیات نے ڈتھ ڈیوٹی کی حمایت اِس بنا پر کی ہے کہ اِس کے ذریعے بہت زیادہ دولت کا سدِ باب کیا جا سکتا ہے۔ ڈتھ ڈیوٹی سے حاصل ہونے والی آمدنی کو کم ترقی یافتہ ملکوں کی ترقیاتی اسکیموں کے لیے مالی وسائل مہیا کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اِنکم ٹیکس کے مقابلے میں ڈتھ ڈیوٹی سے بچنا نسبتاً مشکل ہے اور پیداآوری کی ترغیب اِس سے کم متاثر ہوتی ہے۔ اِس کے علاوہ ڈتھ ڈیوٹی سے چونکہ عدم مساوات کم ہوتی ہے اِس لیے یہ ایک مفید سماجی مقصد پورا کرتی ہے۔

اِس ڈیوٹی کی مخالفت بہت سے لوگ اِس بِنا پر کرتے ہیں کہ اِس کی وجہ سے پس انداز کرنے کی تحریک کم ہوتی ہے اور نجی سرمائے کی تشکیل پر اِس کا خراب اثر پڑتا ہے۔ لیکن جدید معاشیات ہمیں یہ بتلاتی ہے کہ صَرف اور بچت میں ایک مناسب توازن ہونا چاہیے اور یہ کہ ریاست نجی بچت کو بڑھانے کے مؤثر اقدام کر سکتی ہے۔ اگر ان اقدام کے باوجود بچت کم ہو تو خود ریاست اپنی بچت

بڑھا سکتی ہے۔ مغربی ملکوں کے تجربے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بچت اور سرمائے کی تشکیل پر ڈیتھ ڈیوٹی کے مادّی اور ذہنی اثرات اتنے خراب نہیں ہوتے جتنے بتائے جاتے ہیں۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ ہندوستان میں ڈیتھ ڈیوٹی پہلی بار ۱۹۵۳ء میں اس وقت شروع ہوئی جب پارلیمنٹ نے اسٹیٹ ڈیوٹی ایکٹ پاس کیا۔ اسٹیٹ ڈیوٹی کے دو خاص مقصد یہ تھے: (الف) دولت کی تقسیم میں نابرابری کو روکنا اور درست کرنا اور (ب) آمدنی کے وسائل حاصل کرکے ریاست کی ترقیاتی اور فلاحی اسکیموں کی مالی ضروریات پوری کرنا۔ ستمبر ۱۹۵۸ء میں اس ایکٹ میں کچھ تبدیلیاں لانے کے لیے ایک ترمیمی ایکٹ پاس کیا گیا۔ اس ترمیم کے ذریعے استثنیٰ کی حد ایک لاکھ سے گھٹا کر ۵۰ ہزار کردی گئی اور لڑائی میں کام آنے والوں کے لیے خاص رعایتیں دی گئیں۔

ہندوستان میں اسٹیٹ ڈیوٹی مرنے والے کی تمام املاک اور جائداد پر عائد ہوتی ہے۔ اس میں نقد روپیہ، سونا، چاندی، زیورات، گھر گرہستی اور موٹر کار وغیرہ سب شامل ہیں۔ مرنے والے نے انتقال سے دو سال قبل تک جو تحفے دیے ہیں اُن پر بھی ڈیوٹی واجب ہوتی ہے لیکن جو تحفے خیر مقاصد کے لیے مرنے سے چھے ماہ پہلے دیے گئے ہوں وہ ڈیوٹی سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ ڈیوٹی سلیب کے قاعدوں کے مطابق لگتی ہے۔

۱۹۶۵ء کے بجٹ میں مسٹر کرشنا چاری نے اسٹیٹ ڈیوٹی کی شرح میں تبدیلی کا اعلان کیا: نئی شرح کے مطابق ۱۰ لاکھ سے اوپر کی مالیت کی املاک پر ۴۰ فی صدی، ۱۵ لاکھ سے اوپر ۵۰ فی صدی اور ۲۰ لاکھ سے اوپر ۸۵ فی صدی رکھی گئی۔ لیکن شرحوں کے نئے نظام کے تحت بھی استثنیٰ کی حد ۵۰ ہزار باقی رہی اور ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ تک کی مالیت کی املاک پر محصول ۴ فی صدی رکھا گیا۔

۱۹۶۶ء کے بجٹ میں مسٹر سچین چودھری نے کچھ نچلے سلیبوں پر ٹیکس کی شرح پر نظرِ ثانی کی۔ ایک سے دو لاکھ تک کی املاک پر ڈیوٹی کی شرح ۸ فی صدی سے بڑھا کر ۱۰ فی صدی کردی گئی، ۲ سے ۵ لاکھ تک ۱۵ فی صدی سے بڑھا کر ۲۰ فی صدی اور ۵ لاکھ سے ۱۰ لاکھ تک ۲۵ فی صدی سے بڑھا کر ۳۰ فی صدی کردی گئی۔

ہندوستان میں جب اسٹیٹ ڈیوٹی شروع ہوئی اس وقت سے دولتمند طبقے کا نمایاں رُجحان یہ رہا ہے کہ مرنے سے قبل ہی املاک وارثوں کو تحفے کے طور پر دے دی جائے (تاکہ ڈیوٹی سے بچ جائے)۔ اسی لیے مسٹر کالڈر نے اپنی رپورٹ میں یہ تجویز کیا کہ اسٹیٹ ڈیوٹی کی جگہ پر ایک عام گفٹ ٹیکس لگایا جائے جو ہر منتقلی پر واجب ہو، چاہے وہ منتقلی تحفے کے طور پر ہوئی ہو یا وراثت

کی منتقلی کے طور پر۔ یہ ٹیکس ہر اُس شخص پر واجب ہوگا جس کو ۱۰ ہزار سے زیادہ کی املاک تحفے یا ورثے کی شکل میں ملے گی۔ مسٹر کالڈر کا خیال تھا کہ اگر تمام منتقلیوں پر عائد ہونے والا ایک واحد اور بتدریج بڑھنے والا ٹیکس، جنرل گفٹ ٹیکس، فوراً ممکن نہ ہو تو فی الحال اسٹیٹ ڈیوٹی کے ساتھ ساتھ ایک گفٹ ٹیکس بھی نافذ کر دیا جائے۔ اِس کا فائدہ یہ ہوگا کہ حکومت کی آمدنی بڑھے گی اور مستقبل کے وارثوں کو تحفے دے کر انھیں زیادہ ٹیکس سے بچانے کی جو کوشش کی جاتی ہے وہ کم ہو جائے گی۔ مختصراً مسٹر کالڈر نے تجویز کیا کہ کسی بھی فرد کے لیے استثنیٰ کی حد ۱۰ ہزار ہونا چاہیے۔ ۱۰ ہزار سے ایک لاکھ تک کے تحفوں پر ٹیکس کی شرح ۔ا فی صدی اور اس سے اوپر تقریباً دوگنی ہونی چاہیے۔ کالڈر کی تجویز کا ایک اچھا پہلو یہ ہے کہ ان کی تعمیل سے ہندوستان کے محصول وراثت کا نظام زیادہ جامع ہو سکتا ہے۔ اسٹیٹ ڈیوٹی کے ساتھ گفٹ ٹیکس لگانے سے ٹیکس کی چوری مشکل ہو جاتی ہے۔

(۷) گفٹ ٹیکس: ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسٹر کالڈر کی مربوط مالیاتی اسکیم ایک مکمل ذاتی محصول کے نظام پر مبنی تھی اور اِس میں جنرل گفٹ ٹیکس کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ اسٹیٹ ڈیوٹی کی طرح گفٹ ٹیکس کا بھی مقصد املاک کے منتقل کرنے کی آزادی پر پابندی لگانا تھا۔ ہنری سائمن نے ایک بار کہا تھا کہ تمام نجی املاک اور اُس سے حاصل ہونے والی آمدنی پورے سماج کی طرف سے رعایتوں کے عطیے کی حیثیت رکھتی ہے۔ وراثت ٹیکس دراصل اُن رعایتوں پر پابندی کی ایک شکل ہے جو حق ملکیت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ ان کے تحت فرد کو اپنی املاک سے استفادہ کرنے کی مکمل آزادی ہوتی ہے لیکن اِس املاک کو دوسری نسل کو منتقل کرنے کی اِتنی آزادی نہیں ہوتی۔

گفٹ ٹیکس ۵۹-۱۹۵۸ء کے بجٹ میں ایک مرکزی تجویز تھی جو پنڈت نہرو نے اُس وقت پیش کی جب وہ عارضی طور پر وزیر مالیات تھے۔ ۵۸-۱۹۵۷ء میں جب مسٹر کرشنا چاری نے اپنے بجٹ میں محصول مصارف تجویز کیا تو یہ توقع تھی کہ گفٹ ٹیکس کا بھی اعلان جلد ہی کیا جائے گا تاکہ اس کے ذریعے محصول مصارف کو زیادہ بار آور بنایا جا سکے اور زیادہ مصارف کی ہمت شکنی ہو۔ مسٹر نہرو نے اِس حقیقت پر خاص زور دیا کہ نئے ٹیکس کا بنیادی اثر یہ ہوگا کہ اسٹیٹ ڈیوٹی اور دوسرے ٹیکسوں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کم ہو جائے گی۔

۱۹۵۸ء کے گفٹ ٹیکس ایکٹ کے تحت سالانہ چھوٹ ۱۰ ہزار متعین کی گئی لیکن ۶۵-۱۹۶۴ء کے بجٹ میں مسٹر کرشنا چاری نے یہ حد ۱۰ ہزار سے گھٹا کر ۵ ہزار کر دی۔ ۶۷-۱۹۶۶ء میں سچین چودھری نے یہ حد دوبارہ ۱۰ ہزار کر دی۔ بھودان اور سمپتی دان کرنے والوں کو اور ان عطیات کو جو بچوں کی تعلیم

کے لیے دیے جائیں یا جو کسی ملازم کو بونس، پنشن یا انعام کی شکل میں دیے جائیں اس ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ مخیر ادارے، جو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں گفٹ ٹیکس سے بھی مستثنیٰ رہیں گے۔ حال میں اُن عطیات کو ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا گیا جو مندروں اور سرکاری اعلان کردہ دوسری عام عبادت گاہوں کو دیے جاتے ہیں۔ گفٹ ٹیکس کی سب سے اونچی شرح ۵۰ فی صدی ہے جو ۱۰ لاکھ سے اوپر کے لیے ہے۔ [illegible]ء کے بجٹ میں گفٹ ٹیکس کی شرحوں پر مکمل نظر ثانی کی گئی تاکہ انھیں اسٹیٹ ڈیوٹی کی شرحوں کے مطابق بنایا جا سکے۔

مختصر یہ کہ گفٹ ٹیکس سے صرف یہی فائدہ نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے عطیات دینے کی رغبت کم ہوتی ہے بلکہ مالی مشکلات کے اُس دَور میں جس سے ہم گزر رہے ہیں یہ آمدنی کا بھی ایک اہم ذریعہ ہے۔

(۸) **سپر پرافٹ ٹیکس:** وزیر مالیات نے ۶۴-۱۹۶۳ء کے بجٹ میں ٹیکس کی جن تجاویز کا اعلان کیا ان میں کمپنیوں پر عائد ہونے والا سپر پرافٹ ٹیکس سب سے زیادہ متنازع فیہ تھا۔ اگر کسی کمپنی کا منافع اِنکم ٹیکس دینے کے بعد اس کے بیباق سرمائے اور محفوظ رقم کے ۶ فی صدی سے زیادہ ہے تو اُس پر سپر پرافٹ ٹیکس واجب ہوگا۔ محفوظ رقم میں سے وہ رقم نکال دی جائے گی جو انکم ٹیکس کے لیے آمدنی نہیں شمار کی گئی ہے لیکن اگر شیئر پریمیم کی کوئی محفوظ رقم ہوگی تو شامل کی جائے گی۔ اگر سپر پرافٹ ٹیکس کے تحت آنے والا خالص منافع بیباق سرمائے کے ۶ فی صدی سے زیادہ لیکن ۱۰ فی صدی سے کم ہے تو ٹیکس کی شرح ۵۰ فی صدی اور اگر ۱۰ فی صدی سے اُوپر ہے تو ۶۰ فی صدی ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ سپر پرافٹ ٹیکس، اِنکم ٹیکس اور سپر ٹیکس کے علاوہ ایک ٹیکس ہے جو کمپنیوں کے قابلِ ٹیکس منافع پر ۵۰ فی صدی کی شرح سے عائد ہوتا ہے۔

سپر پرافٹ ٹیکس کے حق میں وزیر مالیات نے جو دلیلیں دیں وہ یہ تھیں: (۱) سماج کے دوسرے طبقوں کی طرح منظم سکٹر کو بھی بڑھی ہوئی قومی ذمہ داری میں برابر شریک ہونا چاہیے (۲) ٹیکس کی وجہ سے منافع کمانے کی ترغیب کم ہوگی اور (۳) قیمتوں کو کم رکھنے میں مدد ملیگی۔

اِس ایکٹ کے نفاذ سے اجتماعی سکٹر کو شدید صدمہ پہنچا اور کیپیٹل مارکٹ میں بوکھلاہٹ مچ گئی۔ اِس ٹیکس پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ مندرجہ ذیل چھے قسموں میں آتے ہیں: (۱) اِس ایکٹ کا مطلب یہ ہے کہ کارکردگی اور حرکت پزیری گویا جُرم ہے اور یہ ٹیکس اُس کی سزا ہے کیونکہ جتنی ہی مستعد اور کارکرد ایک فرم ہوگی اتنا ہی اُس کے سرمائے کے مقابلے میں اُس کے منافعے کا تناسب

زیادہ ہوگا۔ ٹیکس کی شرح کو منافع کی شرح سے منسلک کرنے کا یہ مطلب ہے کہ کم مستعد فرم کے مقابلے میں زیادہ مستعد فرم گھاٹے میں رہے گی (۲) معقول حد تک بھی محفوظ رقم رکھنے کی استعداد میں خلل پڑتا ہے۔ منافع کو صنعتی ترقی کے حقیقی پروگرام میں دوبارہ لگانے پر خراب اثر پڑتا ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ سرمائے کی خود فراہمی میں، جو جدید مالیات کا اہم جز ہے، خلل پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پیداوار کی توسیع اور مشینوں اور آلات کی تجدید اور ان کی تبدیلی کے پروگرام کو نقصان پہنچتا ہے (۳) یہ ٹیکس مساوات کے اصول کے منافی ہے۔ بتدریج بڑھنے والے ٹیکس کا اصول صرف افراد کی آمدنی پر عائد ہوتا ہے، اجتماعی آمدنیوں پر نہیں۔ تمام سرمایہ کاری میں جوکھم ایک طرح کا نہیں ہوتا ہے۔ بعض کاروبار میں نسبتاً زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔ ایسے کاروبار میں لگے ہوئے سرمائے کے منافع کو اُس سرمائے کے منافع کے برابر قرار دینا غلط ہے جہاں جوکھم نسبتاً کم ہے۔ سیاسی اعتبار سے تو ممکن ہے یہ ٹھیک ہو لیکن تمام قسم کے منافعوں پر ٹیکس کی یکساں شرح معاشی اعتبار سے غلط ہے۔ (۴) اس ٹیکس کی وجہ سے زیادہ منافع کمانے والی کمپنیاں زیادہ منافع کا اعلان نہیں کر سکتیں اور اس طرح گویا منافع کی تقسیم کی ایک حد مقرر ہو جاتی ہے۔ کمپنیوں کو اگر کم منافع دینے پر مجبور کیا جائے گا تو قدرتاً کمپنیوں کے شیئر کی خریداری کم نفع بخش ہو جائیگی اور کمپنیوں کے لیے سرمایہ حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اجتماعی سکٹر میں سرمائے کی تشکیل کو نقصان پہنچے گا۔ غرضیکہ سپر پرافٹ ٹیکس کے خلاف اعتراضات کی بوچھاڑ اتنی شدید ہوئی کہ ۶۵-۱۹۶۴ء کے بجٹ میں وزیر مالیات کو اسے واپس لینا پڑا۔

صوبائی حکومتوں کی آمدنی کے وسائل اور خرچ کی مدّات

ترقیاتی منصوبہ بندی کے پیش نظر ہندوستان کی معاشی ترقی میں صوبائی مالیات کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی لیے صوبائی بجٹوں میں پانچ سالہ منصوبوں کی ضروریات غالب نظر آتی ہیں۔ زیادہ بجٹوں میں خسارہ ہوتا ہے اور آمدنی کے نئے ذرائع کی تلاش برابر جاری رہتی ہے۔

صوبوں کے کچھ حالیہ میزانیوں پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی آمدنی کے بڑے ذرائع یہ ہیں: سیلس ٹیکس، مالگذاری، تفریحی ٹیکس، جوئے اور سٹہ بازی پر ٹیکس، اسٹامپ کی آمدنی، آبپاشی کی اُجرت، جنگلات سے آمدنی، رجسٹری کی فیس اور چُنگی۔ آٹھ صوبوں، یعنی بہار، بنگال، آسام، یوپی، کیرل، مدراس، مہاراشٹر اور میسور میں زراعتی انکم ٹیکس ان کی آمدنی کا اہم ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ صوبوں کو مرکزی انکم ٹیکس اور محصولوں کا ایک حصّہ ملتا ہے۔ اسٹیٹ ڈیوٹی کی ساری

آمدنی ملتی ہے۔ ریلوے پسنجر ٹیکس کے عوض سالانہ گرانٹ اور مختلف دوسری امدادیں ملتی ہیں صوبائی محصول، شراب، بھنگ اور افیون وغیرہ کے بنانے اور ان کے فروخت پر عائد ہوتا ہے۔ بہت سے صوبوں میں نشہ بندی عائد کرنے کی وجہ سے محصول کی آمدنی گھٹ گئی ہے۔ مالگزاری پہلے صوبائی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔ اب اِس کی اہمیت کم ہوگئی ہے جبکہ تفریحی ٹیکس اور زراعتی انکم ٹیکس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

صوبائی حکومتیں اپنی بیشتر آمدنی حفاظتی انتظام اور سماجی خدمات پر صرف کرتی ہیں۔ حفاظتی خدمات یا سول انتظام میں یہ چیزیں شامل ہیں: عام انتظامات، پولیس، عدالتی انتظام اور جیل خانے وغیرہ۔ سماجی خدمات میں تعلیم، صحت عامہ۔ زراعت، صنعت، امدادِ باہمی اور مویشیوں کا علاج وغیرہ شامل ہیں۔ صوبائی آمدنی کا بیشتر حصہ نظم و نسق، تعلیم اور صحت عامہ پر صرف ہوتا ہے۔ اگرچہ حال میں سماجی بہبود کے اخراجات بھی بڑھے ہیں۔ ترقیاتی اور فلاحی مصارف میں اضافے کی وجہ سے عوام کو بہتر سہولتیں فراہم ہوئی ہیں۔ توقع ہے کہ ترقیاتی منصوبہ بندی کا عمل جیسے جیسے بڑھے گا ویسے ویسے فلاح و بہبود پر زیادہ خرچ کیا جائے گا جس کی وجہ سے لوگوں کی حالت سدھرے گی۔

سیلس ٹیکس اور زراعتی انکم ٹیکس کا تجزیہ

(۱) سیلس ٹیکس ـــ آمدنی کے ایک مفید ذریعے کی حیثیت سے صوبائی میزانیوں میں سیلس ٹیکس کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ سنٹرل پراونس پہلا صوبہ تھا جس نے ۱۹۳۸ء میں پٹرول پر سیلس ٹیکس لگایا۔ اِس کے بعد ۱۹۳۹ء میں مدراس اور ۱۹۴۱ء میں بنگال میں یہ ٹیکس لگایا گیا۔ اب تقریباً تمام صوبوں میں سیلس ٹیکس عام ہے۔ آزادی کے بعد بمبئی اور مدراس میں سیلس ٹیکس پر زیادہ زور دیا گیا کیونکہ نشہ بندی کی وجہ سے محصول کی آمدنی بہت گھٹ گئی تھی۔

امریکہ اور برطانیہ کے محصول کے نظام پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں سیلس ٹیکس یا محصول خریداری (PURCHASE TAX) آمدنی کا اہم ذریعہ ہے۔ امریکہ میں سیلس ٹیکس ۱۹۳۳ء میں شروع ہوا اور اب اِس ذریعے سے حاصل ہونے والی آمدنی کل آمدنی کی ½ ہے۔ برطانیہ میں محصول خریداری ۱۹۴۰ء میں شروع ہوا۔ اِس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اپنے مصارف کم کریں سیلس ٹیکس اور محصول خریداری میں فرق یہ ہے کہ سیلس ٹیکس چیزوں کی فروخت پر عائد ہوتا ہے اور فروخت کرنے والوں سے وصول کیا جاتا ہے جبکہ محصول خریداری خریدار کو دینا پڑتا ہے لیکن یہ فرق اس وقت ختم

ہو جاتا ہے جب طلب میں لچک نہ ہونے کی وجہ سے فروخت کرنے والے اس ٹیکس کو خریداروں کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ ہندوستان کے بیشتر صوبوں نے اہم اشیائے صَرف پر سیلس ٹیکس لگا رکھا ہے۔ محصول خریداری بنگال نے جوٹ پر، یوپی نے گنّے پر اور مدراس نے بغیر ٹین کی ہوئی کھالوں پر لگا رکھا ہے۔

ہندوستانی صوبوں میں سیلس ٹیکس یا تو صرف ایک بار یا بار بار لگنے والا ٹیکس ہے۔ بار بار لگنے والے یا ملٹیپل ٹیکس کے تحت ٹیکس فروخت کی ہر منزل پر عائد ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل صارف تک پہنچنے سے پہلے اشیا پر کئی بار ٹیکس لگ چکتا ہے۔ تھوک فروشوں اور خوردہ فروشوں میں لین دین بڑھنے کے ساتھ یہ ٹیکس برابر بڑھتا جاتا ہے۔ اسی لیے ملٹیپل ٹیکس کی شرح سنگل ٹیکس کے مقابلے میں عموماً کم رکھی جاتی ہے۔ ملٹیپل ٹیکس کے نظام میں ٹیکس سے بچنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ یہ فروخت کی ہر منزل پر عائد ہوتا ہے۔ یہ ٹیکس مدراس، بمبئی اور میسور میں نافذ ہے۔ یوپی میں بعض اشیا پر سنگل پوائنٹ اور باقی اشیا پر ملٹیپل سیلس ٹیکس عائد ہوتا ہے۔

سنگل پوائنٹ ٹیکس کے تحت سارے لین دین میں صرف ایک بار ٹیکس عائد ہوتا ہے۔ عموماً یہ ٹیکس فروخت کی آخری منزل میں خوردہ فروشوں سے وصول کیا جاتا ہے۔ اس نظام کے تحت اُن اشیا کی فروخت کا الگ حساب رکھنا پڑتا ہے جن پر سیلس ٹیکس واجب ہوتا ہے۔ سنگل پوائنٹ ٹیکس بنگال، پنجاب، مدھیہ پردیش اور دلّی میں نافذ ہے۔

حال میں مشرقی بنگال نے بنگال فائنانس سیلس ٹیکس امنڈمنٹ ایکٹ ۱۹۵۳ء کے تحت سیلس ٹیکس کی گیرائی اور گہرائی دونوں پر زور دیا ہے۔ بنگال نے ڈیڑھ روپے سے زیادہ کے کھانے تک پر سیلس ٹیکس لگا رکھا ہے اور آسائشات پر سیلس ٹیکس کی شرح ۷ فی صدی سے بڑھا کر ۱۰ فی صدی کر دی ہے۔ حکومت نے یہ بھی اعلان کیا کہ بہت سی اشیا جن پر آخری منزل میں ٹیکس لگتا تھا اب اُن پر تھوک فروخت کی پہلی منزل پر ٹیکس واجب ہوگا۔ اس کی وجہ سے بنگال کے سیلس ٹیکس کا نظام مخلوط ہو گیا ہے یعنی سنگل پوائنٹ اور ملٹی پوائنٹ دونوں ٹیکس نافذ ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یکم اگست ۱۹۶۶ء سے بنگال نے عام سیلس ٹیکس ۵ فی صدی سے بڑھا کر ۶ فی صدی کر دیا ہے۔ نہ صرف آمدنی کے اعتبار سے سیلس ٹیکس بارآور ٹیکس ہے بلکہ اس میں لچک کی بھی خصوصیت ہے۔ ٹیکس کی شرح اور اس کی گیرائی میں ردوبدل کر کے اس کو ضرورت کے مطابق بنایا جا سکتا ہے لیکن اس ٹیکس کی سب سے بڑی خامی اس کی رجعت پذیری (REGRESSIVENESS) ہے۔ افراطِ زر

کے دَور میں جب اِس کا نفاذ عام اشیائے صَرف پر ہوتا ہے تو متوسط اور غریب طبقہ اس کے بوجھ سے دب جاتا ہے ۔ ایک خامی یہ بھی ہے کہ مختلف صوبوں کا سیلس ٹیکس کا نظام یکساں نہیں ہے ۔

یہ بات اطمینان بخش ہے کہ مرکزی حکومت صوبوں کے سیلس ٹیکس کے نظام میں یکسانیت پیدا کرنے کے مسئلے پر غور کر رہی ہے ۔ نومبر ۱۹۵۶ء میں صوبائی وزرائے مالیات کی کانفرنس میں یہ طے پایا کہ سیلس ٹیکس کی جگہ پر ایک مزید مرکزی محصول شکر، تمباکو اور مِل کے بنے کپڑے پر لگایا جائے اور آسانشات پر سارے صوبوں میں مساوی شرح سے ٹیکس لگایا جائے چنانچہ مِل کے بنے کپڑوں، تمباکو اور شکر پر سیلس ٹیکس ختم کر کے مرکزی محصول عائد کیا گیا ۔ تیسرے فائنانس کمیشن نے سفارش کی کہ اس محصول کی تمام آمدنی صوبوں کو دے دی جائے ۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ صوبوں کے لیے مزید وسائل کی فراہمی کے لیے ۶۷-۱۹۶۶ء کے بجٹ میں دو طریقے نکالے گئے ۔ ایک تو یہ کہ صوبوں کے مابین تجارت پر عائد ہونے والے مرکزی سیلس ٹیکس کی شرح ۲ فی صدی سے بڑھا کر ۳ فی صدی کر دی جائے اور یہ شرح یکم جولائی ۱۹۶۶ء سے نافذ کر دی جائے ۔ دوسرے یہ کہ صوبوں کے مابین تجارت کی اُن اشیا پر جنھیں خصوصی اہمیت کی اشیا قرار دیا گیا ہے، محصول کی حد ۲ فی صدی سے بڑھا کر ۳ فی صدی کر دی گئی ۔ اِس کی وجہ سے صوبوں کو یہ موقع ملا کہ اگر وہ چاہیں تو یکم جولائی ۱۹۶۶ء سے کوئلے، روئی، سُوت، کھالوں، چمڑے، لوہے اور فولاد، جوٹ اور روغنی بیجوں پر مقامی سیلس ٹیکس کی شرح کو ۳ فی صدی کی حد کے اندر پھر سے مقرر کر سکتی ہیں ۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ آیا سیلس ٹیکس لگانے اور اُس کے وصول کرنے کی ذمہ داری مرکز کی ہونی چاہیے ۔ یہ تجویز بالکل ختم کر دینی چاہیے کیونکہ صوبے کبھی اِس پر رضامند نہ ہوں گے ۔ ہمارا خیال ہے کہ صوبوں کے مابین تجارت کے اہم خام مال کی فروخت اور اس فروخت پر محصول کا نفاذ قطعی مرکز کے اختیار میں ہونا چاہیئے ۔ اس کام میں سہولت پیدا کرنے کے لیے مرکزی حکومت کو بین الریاستی سیلس ٹیکس کمیشن مقرر کرنا چاہیئے جو مختلف صوبوں کے سیلس ٹیکس کے قوانین میں یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کرے ۔ یہ بات اُمید افزا ہے کہ صوبوں کے سیلس ٹیکس اور بین الریاستی تجارت کے دَوران اشیا پر لگنے والے ٹیکس کے میدان میں یکسانیت پیدا کرنے کی غرض سے جولائی ۱۹۵۷ء سے مرکزی سیلس ٹیکس ایکٹ، ۱۹۵۶ء کا نفاذ کر دیا گیا ہے ۔ اِس ایکٹ کے مطابق ہر اُس رجسٹرڈ بیوپاری پر یہ ٹیکس واجب ہے جو بین الریاستی تجارت کے دوران کسی دوسرے رجسٹرڈ بیوپاری کے ہاتھ وہ اشیا فروخت

کرتا ہے جن کا ایکٹ میں ذکر ہے۔

سیلس ٹیکس کے سلسلے میں صوبوں کو جو مسائل درپیش ہیں وہ یہ ہیں: (۱) کسی طرح ایک ایسا نظام بنایا جائے جس میں رشوت اور ٹیکس چوری کم سے کم ممکن ہو (۲) کم سے کم صرف سے زیادہ سے زیادہ آمدنی کیسے حاصل کی جائے (۳) ایک ایسا نظام کیسے قائم کیا جائے جو آمدنی کے لچک دار ذریعے کی حیثیت سے کام کرے۔ ٹیکسیشن انکوائری کمیشن نے ہندوستانی نظام محصول کو نئی شکل دینے کے لیے جو روشن تجاویز رکھیں ان میں سے کچھ دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔

کمیشن نے تجویز کیا کہ ہندوستان کے حالات کے لیے سیلس ٹیکس کا ملٹی پوائنٹ نظام سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اس کے ذریعے یہ ٹیکس کم آمدنی والے طبقے تک پہنچ کر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہے۔ متوسط اور اونچی آمدنی والے طبقے کے لیے اور بڑے پیمانے پر کاروبار کرنے والوں کے لیے یا تو ملٹی پوائنٹ نظام کی جگہ سنگل پوائنٹ نظام ہونا چاہیے یا دونوں کو ساتھ ساتھ ہونا چاہیے۔ آسائشات پر سیلس ٹیکس کی شرح زیادہ ہونی چاہیے۔ چنانچہ توقع ہے کہ آنے والے برسوں میں صوبائی بجٹوں میں سیلس ٹیکس کو اہم جگہ حاصل ہوگی۔

(۲) زراعتی اِنکم ٹیکس —— ہندوستان میں زراعتی آمدنی مرکزی اِنکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے لیکن بیشتر صوبائی حکومتوں نے زراعتی اِنکم ٹیکس کے نام سے محصول لگا رکھا ہے۔ گورنمنٹ آف اِنڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت جب صوبوں کو خود مختاری ملی تو انھیں زراعتی اِنکم ٹیکس لگانے کا بھی اختیار ملا۔ سب سے پہلے بہار نے ۱۹۳۸ء سے زراعتی اِنکم ٹیکس شروع کیا اور اب گجرات اور پنجاب دو صوبوں کو چھوڑ کر تمام صوبوں میں زراعتی اِنکم ٹیکس نافذ ہے لیکن صوبوں نے ٹیکس کی جو شرحیں اور استثنیٰ کی جو حدیں مقرر کی ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ چنانچہ مختلف علاقوں میں زراعتی اِنکم ٹیکس کا مطلب مختلف ہے۔ ٹیکسیشن انکوائری کمیشن نے یہ سفارشات کی تھیں: (۱) زراعتی اِنکم ٹیکس تمام صوبوں میں نافذ کیا جائے (۲) ٹیکس کی شرح معقول سطح تک بڑھا دی جائے (۳) تمام صوبے محصول کی کم سے کم حد ۳۰۰۰ روپئے مقرر کریں۔

دراصل زراعتی اِنکم ٹیکس اُس زمانے میں شروع کرنا چاہیے تھا جب زمینداری اپنے عروج پر تھی۔ اُس وقت اِس ٹیکس کے ذریعے کافی آمدنی کی جا سکتی تھی اور زراعتی آمدنی کی عدم مساوات کم کی جا سکتی تھی۔ زمینداری ختم ہو جانے کی وجہ سے زراعتی اِنکم ٹیکس کی آمدنی خود بخود کم ہو گئی ہے چنانچہ اگرچہ آزادی کے بعد سے مختلف صوبوں نے ترقی پزیر زراعتی ٹیکس لگانے کی کوشش کی ہے

لیکن اس کی حیثیت سماجی انصاف کے ادھورے اقدام سے زیادہ نہیں ہے۔ مارچ ۱۹۶۴ء میں ریزرو بینک کے بلیٹن میں شائع شدہ ایک جائزے کے مطابق ملک کے زیر کاشت علاقے کا ۵۵ فی صدی حصہ زراعتی انکم ٹیکس کی زد سے باہر ہے اور بیشتر آمدنی چند صوبوں میں مرتکز ہے۔ جہاں باغات کو اہمیت حاصل ہے۔ ۱۹۶۱-۶۲ء سے لے کر ۱۹۶۳-۶۴ء تک کے تین برسوں میں اس ٹیکس کی مجموعی آمدنی کا ۷۰ فی صدی حصہ آسام، کیرل اور مدراس نے وصول کیا۔ ریزرو بینک کے جائزے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ زراعت میں بیچ کے لوگوں کے ختم ہو جانے اور ملکیت اراضی کی بالائی حد مقرر ہو جانے کی وجہ سے بڑے زمیندار ختم ہو گئے۔ چنانچہ اس ٹیکس کا دائرہ کافی محدود ہو گیا ہے۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ آیا زراعتی انکم ٹیکس زمین کے لگان کے ساتھ لگایا جائے یا زمینی اصلاحات کے مجوزہ نظام کے تحت لگان کو ختم کر دیا جائے اور زراعتی انکم ٹیکس اس کی جگہ لے لے۔ ٹیکسیشن انکوائری کمیشن نے یہ تجویز نہیں منظور کی کہ لگان بالکل ختم کر دیا جائے کیونکہ کمیٹی نے جب اس مسئلے کا جائزہ لیا تو اس وقت (۱۹۵۳-۵۴ء) صوبوں کو لگان سے ۷۰ کروڑ روپے کی آمدنی تھی۔ موجودہ مالی ضروریات کے پیش نظر لگان کو ختم کر کے زراعتی انکم ٹیکس لگانا شاید ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے شاید بیشتر صوبوں میں یکساں شرح کے لگان کے ساتھ ساتھ زراعتی انکم ٹیکس نافذ ہے۔ لیکن شاید یہ اتنا کافی نہیں ہے کیونکہ زراعتی حلقے میں نئی آمدنیوں کی تشکیل ہو رہی ہے اور غالباً یہ عمل جاری رہے گا۔ زراعتی انکم ٹیکس کو خالص آمدنی پر مبنی ہونا چاہیے۔ زیادہ آمدنی والوں کو کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہیئے اور ان پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس عائد کرنا چاہیئے۔

دیہی سکٹر پر ٹیکس لگانے سے متعلق ایک نوٹ

عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ اگلے چند برسوں میں منصوبہ بندی کی بیشتر توجہ زراعتی حلقے کی طرف رہے گی۔ یہ بات بھی صاف ہے کہ چوتھے پلان کے دوران جس نئی آمدنی کی تشکیل ہو گی اس کا بڑا حصہ زراعت میں ہو گا بشرطیکہ جن پروگراموں کو پلان میں شامل کیا گیا ہے وہ کامیاب ہوں۔ اس لیے انصاف کا تقاضہ یہی ہے کہ اگر چوتھے پلان سے زراعت کو فائدہ پہنچتا ہے تو زراعت کو پلان کے وسائل کی فراہمی میں شریک ہونا چاہیے۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ دیہی حلقے پر نسبتاً کم ٹیکس لگے ہیں۔ تخمینہ ہے کہ زراعتی حلقے

میں ہونے والی آمدنی کی صرف ۶ فی صدی یا ۷ فی صدی ٹیکس کے تحت آتی ہے جبکہ غیر زراعتی آمدنی کی ۲۵ فی صدی پر ٹیکس لگتا ہے۔ شہر میں رہنے والے ۴۰۰۰ روپے سے لے کر ۵۰۰۰ روپے تک کی آمدنی والے لوگ دیہات کے اتنی ہی آمدنی والے لوگوں سے زیادہ ٹیکس دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دیہی علاقے کے لوگ اپنی آمدنی کا ۶ء۶۲ فی صدی حصہ ٹیکسوں کی شکل میں سرکاری خزانے کو دیتے ہیں جبکہ شہری حلقے کی آمدنی کا ۴ء۷۱ فی صدی حصہ سرکاری خزانے کو جاتا ہے۔ یہ بات عام طور سے تسلیم کی جاتی ہے کہ اور مساوات کا یہی تقاضہ ہے کہ شہری اور دیہی حلقے کے دوران ٹیکس کی شدید نابرابری حتی الامکان کم کی جانی چاہیے۔

اس وقت دیہی سکٹر پر جو دو اہم ٹیکس نافذ ہیں وہ ہیں لگان اور زراعتی انکم ٹیکس۔ ۱۹۷۰-۷۱ء کے بجٹ میں وزیر مالیات نے ویلتھ ٹیکس ایکٹ میں ضروری ترمیم کرنے کی تجویز کی تاکہ زراعتی آراضی کی قیمت پر ٹیکس لگایا جا سکے۔ زراعتی آراضی میں وہ عمارتیں بھی شامل ہیں جو ان زمینوں پر یا ان سے متصل واقع ہوں لیکن کھڑی فصلیں، اوزار، آلات اور ٹریکٹر جیسی مشینیں اس نئے ٹیکس سے مستثنیٰ رکھی گئی ہیں۔ بالواسطہ ٹیکسوں کے معاملے میں بھی وزیر مالیات نے اُن لوگوں کو نہیں چھوڑا جنھوں نے زراعت میں کافی سرمایہ لگا کر منافع حاصل کیا ہے۔ ابتدا میں وزیر مالیات نے مصنوعی کھاد پر ۱۰ فی صدی اور پاور سے چلنے والے پمپ پر ۲۰ فی صدی کا بالواسطہ ٹیکس تجویز کیا تھا بعد میں پاور پمپ پر محصول کی تجویز واپس لے لی گئی کیونکہ ڈر یہ تھا کہ اس کا اثر ان چھوٹے کسانوں پر خراب پڑے گا جو سرگرم ہیں اور ترقی کرنا چاہتے ہیں۔

زراعت کی نئی حکمت عملی کے تحت سہولتوں اور امدادی چیزوں کے پیکج پروگرام (PACKAGE PROGRAMME) صرف پندرہ منتخب حلقوں میں چلائے جا رہے ہیں جو کل قابل کاشت علاقے کے ۱۲ فی صدی رقبے پر مشتمل ہے۔ ان ضلعوں کے کسان دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نفع کما رہے ہیں اور ان کی حالت زیادہ بہتر ہے لیکن ٹیکسوں کا تناسب تمام ضلعوں کے لیے یکساں ہے جو مساوات کے اصول کے منافی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ غریب کسان خوشحال علاقوں کے امیر کسانوں کی مالی امداد کر رہے ہیں۔ یہ بے انصافی صرف اس طرح دور کی جا سکتی ہے کہ منتخب خوشحال پندرہ ضلعوں کے متمول ترین ۱۰ فی صدی کسانوں پر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ٹیکس لگایا جائے۔

آخر میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دیہی سکٹر پر زیادہ ٹیکس لگانے کا مسئلہ معاشی نہیں سیاسی

ہے۔ متمول کسانوں کا دیہات کے ووٹروں پر اب بھی بڑا اثر ہے۔ اِسی لیے ان لوگوں کو ٹیکس کی گرفت میں لانا مشکل ہے۔ اِس کے علاوہ اِنتظامی دشواریاں بھی ہیں جن کا مقابلہ کرنا ہوگا اگر دیہی سکٹر پر محصول لگانے کے کسی جامع پروگرام کو عمل میں لانا ہے۔

چھٹے حصے کا ضمیمہ

ہندوستان کی محصول کی شرحوں کا دوسرے ملکوں کی شرحوں سے موازنہ

ٹیبل ۶—۱

ٹیکس آمدنی فی صدی کی حیثیت سے

ہندوستان اور دوسرے ترقی پزیر ملکوں کا موازنہ

(دو بچوں والے شادی شدہ افراد)

آمدنی روپے	پونڈ	ہندوستان ۱۹۶۰--۶۱ (RC1=1sh,6d.)	پاکستان ۱۹۵۹—۶۰ (1RC=1sh,6d)	سیلون ۱۹۵۹—۶۰ Re 1 = 1sh. 6d	کینیا ۱۹۵۹	نائجیریا ۱۹۵۹--۶۰
۱۳،۳۳۳	۱۰۰۰	۶٫۴	۵٫۸	۳٫۸	۳٫۶	۳٫۲
۲۶،۶۶۶	۲۰۰۰	۱۶٫۵	۱۵٫۲	۱۰٫۹	۹٫۳	۱۰٫۷
۴۰،۰۰۰	۳۰۰۰	۲۶٫۳	۲۳٫۳	۱۷٫۹	۱۵٫۷	۱۶٫۵
۵۳،۳۳۳	۴۰۰۰	۳۴٫۵	۳۲٫۰	۲۵٫۰	۲۱٫۶	۲۱٫۲
۶۶،۶۶۶	۵۰۰۰	۴۰٫۷	۳۸٫۶	۳۰٫۵	۲۶٫۴	۲۵٫۵
۸۰،۰۰۰	۶۰۰۰	۴۶٫۰	۴۵٫۰	۳۵٫۲	۳۰٫۴	۳۰٫۱
۹۳،۰۰۰	۷۰۰۰	۴۹٫۸	۵۰٫۰	۳۸٫۸	۳۴٫۰	۳۳٫۹
۱۰۶،۶۶۶	۸۰۰۰	۵۳٫۱	۵۳٫۹	۴۱٫۴	۳۷٫۳	۳۶٫۷
۱۲۰،۰۰۰	۹۰۰۰	۵۵٫۷	۵۶٫۷	۴۳٫۵	۴۰٫۵	۳۸٫۸
۱۳۳،۳۳۳	۱۰۰۰۰	۵۷٫۹	۵۹٫۰	۴۵٫۱	۴۳٫۵	۴۰٫۶
۲۰۰،۰۰۰	۱۵۰۰۰	۶۴٫۲	۶۶٫۰	۵۰٫۱	۵۴٫۰	۵۱٫۷
۲۶۶،۶۶۶	۲۰۰۰۰	۶۷٫۴	۶۹٫۵	۵۲٫۶	۵۹٫۲	۶۷٫۵
۳۳۳،۳۳۳	۲۵۰۰۰	۶۹٫۳	۷۱٫۶	۵۴٫۱	۶۲٫۴	۶۱٫۰
زیادہ سے زیادہ مختتم شرح		۷۷	۸۰	۶۰	۷۵	۷۵
آمدنی جس پر عائد ہوتی ہے		۱۰۰،۰۰۰	۷۶۰۰۰	۶۶۰۰۰	۱۳۱۷۳۳	۱۳۳۰۶۷

SOURCE: TAXATION AND PRIVATE INVESTMENT

(N.C.A.E.R. PUBLICATION)

ٹیبل ۶—۲

ٹیکس کمائی آمدنی کی فی صد کی حیثیت سے (ہندوستان اور کچھ ترقی یافتہ ملکوں کا موازنہ) (دو بچوں والے شادی شدہ افراد)

آمدنی روپے	آمدنی پونڈ	ہندوستان ۱۹۶۰—۶۱ (Re 1/- = 1 SH 6d.)	برطانیہ ۱۹۶۰—۶۱	مغربی جرمنی (DM 12 = £1)	فرانس NF ۱۳٫۸۰ = £1	ناروے KR ۲۰ = £1	امریکہ $ ۲٫۸۰ = £1	کناڈا ۲٫۷۵ = £1	جاپان Yen ۱۰۰۸ = £1
۱۳,۳۳۳	۱۰۰۰	۹٫۴	۷٫۷	۱۰٫۹	۳٫۸	۱۱٫۳	۷٫۹	-	۱۵٫۶
۲۶,۶۶۶	۲۰۰۰	۱۶٫۵	۱۸٫۸	۱۸٫۳	۹٫۳	۳۰٫۸	۱۱٫۳	۷٫۵	۲۳٫۰
۴۰,۰۰۰	۳۰۰۰	۲۶٫۳	۲۵٫۱	۲۳٫۱	۱۳٫۷	۴۲٫۱	۱۴٫۸	۱۱٫۸	۲۶٫۵
۵۳,۳۳۳	۴۰۰۰	۳۳٫۵	۳۰٫۴	۲۶٫۵	۱۶٫۹	۴۹٫۱	۱۶٫۹	۱۵٫۱	۳۰٫۶
۶۶,۶۶۶	۵۰۰۰	۴۰٫۶	۳۵٫۴	۲۹٫۴	۲۰٫۴	۵۴٫۶	۱۸٫۶	۱۸٫۳	۳۳٫۳
۸۰,۰۰۰	۶۰۰۰	۴۶٫۰	۳۹٫۶	۳۱٫۹	۲۲٫۹	۵۸٫۳	۱۹٫۹	۲۱٫۶	۳۵٫۳
۹۳,۰۰۰	۷۰۰۰	۴۹٫۸	۴۳٫۳	۳۳٫۸	۲۴٫۶	۶۰٫۹	۲۱٫۶	۲۳٫۵	۳۷٫۲
۱۰۶,۶۶۶	۸۰۰۰	۵۳٫۱	۴۶٫۲	۳۵٫۵	۲۵٫۹	۶۲٫۸	۲۳٫۱	۲۷٫۱	۳۸٫۸
۱۲۰,۰۰۰	۹۰۰۰	۵۵٫۷	۴۸٫۹	۳۶٫۹	۲۷٫۸	۶۳٫۴	۲۳٫۸	۲۹٫۱	۴۰٫۱
۱۳۳,۳۳۳	۱۰,۰۰۰	۵۷٫۹	۵۱٫۲	۳۸٫۲	۲۹٫۴	۶۵٫۶	۲۴٫۴	۳۰٫۷	۴۱٫۱
۲۰۰,۰۰۰	۱۵,۰۰۰	۶۳٫۲	۶۲٫۰	۴۳٫۲	۳۴٫۳	۶۹٫۲	۳۳٫۸	۳۷٫۱	۴۵٫۷
۲۶۶,۶۶۶	۲۰,۰۰۰	۶۷٫۴	۶۸٫۷	۴۶٫۵	۳۸٫۳	۷۱٫۰	۳۹٫۹	۴۱٫۴	۴۸٫۰
۳۳۳,۳۳۳	۲۵,۰۰۰	۶۹٫۳	۷۲٫۷	۴۸٫۶	۴۱٫۲	۷۲٫۱	۴۴٫۵	۴۴٫۵	۵۰٫۴
مختتم شرح		۷۷	۸۸٫۷۵	۵۷٫۲۴	۶۶	۷۶٫۵	۹۱	۸۰	۷۰
جن آمدنیوں سے اوپر عائد ہوتا ہے		۱۰۰,۰۰۰	۲۰۳,۰۰۰	۲۵۲,۰۰۰	۲۱۷,۳۳۳	۵۰,۶۶۷	۱۹۱۷,۰۰۰	۱۹۵۳,۳۳۳	۹۶۱,۳۶۹

SOURCE: TAXATION AND PRIVATE INVESTMENT (N.C.A.E.R PUBLICATION)

(ب) صوبائی اور مرکزی بجٹوں کی صورت

ٹیبل ۶ — ۳

حکومت ہند کے بجٹ کی صورت (۵۷-۱۹۵۶ تا ۷۰-۱۹۶۹)

	پہلا پلان مجموعہ	دوسرا پلان مجموعہ	۶۲-۱۹۶۱ اکاؤنٹس	۶۶-۱۹۶۵ اکاؤنٹس	تیسرا پلان مجموعہ	۶۷-۱۹۶۶ اکاؤنٹس	۶۸-۱۹۶۷ اکاؤنٹس	۶۹-۱۹۶۸ نظرثانی شدہ تخمینہ	۷۰-۱۹۶۹ بجٹ کا تخمینہ
۱- ریونیو اکاؤنٹ									
(A) آمدنی	۲۲۳۲٫۴۵	۳۶۹۲٫۸۶	۱۰۳۹٫۶۹	۲۳۲۰٫۳۹	۸۶۱۱٫۴۴	۲۴۹۳٫۲۲	۲۵۵۳٫۹۴	۲۶۱۱٫۴۰	۲۹۹۱٫۵۶ (c)
(B) مصارف (c)	۱۹۸۲٫۹۶	۳۴۴۲٫۸۶	۹۱۱٫۹۴	۲۰۰۰٫۹۳	۶۹۹۱٫۹۹	۲۲۶۴٫۳۴	۲۴۴۰٫۹۵	۲۶۱۰٫۶۶	۲۹۲۱٫۳۸
(C) بچت یا خسارہ	۲۴۹٫۴۸+	۲۲۰٫۰۰+	۱۲۴٫۸۵+	۳۱۹٫۴۶+	۱۶۱۹٫۴۵+	۲۲۸٫۶۹+	۱۰۳٫۹۹+	۳٫۶۳+	۷۰٫۱۹ (c)
۲- کیپٹل اکاؤنٹ									
(A) آمدنی (c)	۱۰۶۶٫۹۳	۳۱۵۶٫۹۳ (d)(e)	۱۰۲۲٫۳۶ (e)	۱۶۰۵٫۳۹ (c)	۶۰۹۰٫۵۶	۱۴۷۲٫۱۶ (c)	۲۳۵۰٫۶۲ (c)	۲۲۲۱٫۳۶ (c)	۲۳۴۶٫۷۰
(B) تقسیم	۱۶۲۱٫۴۱	۴۳۱۲٫۹۳	۱۵۴۲٫۲۹	۲۱۲۵٫۳۲	۸۸۸۲٫۲۶	۲۰۵۹٫۹۳	۲۶۹۵٫۲۴	۲۴۷۲٫۳۷	۲۶۲۳٫۵۳
(C) بچت یا خسارہ	۴۵۴٫۴۸-	۱۱۵۶٫۰۰-	۵۱۹٫۹۳-	۵۱۹٫۹۳-	۱۶۹۱٫۷۰-	۵۸۶٫۷۷-	۳۴۳٫۶۲-	۲۵۱٫۰۱-	۲۷۶٫۸۳-
۳- متفرق خالص	۸٫۱۱-	۱۸٫۰۰+	۲۳٫۳۹+	۲۳٫۳۹+	۹٫۸۸-	۴۲٫۶۴+	۴۳٫۳۳+	۱۲٫۲۹	۱۲٫۲۱-
۴- مجموعی بچت یا خسارہ (IC+IIC+III)	۲۰۳٫۰۱-	۹۱۸٫۰۰-	۳۷۶٫۶۸-	۱۶۲٫۶۸-	۶۸۲٫۱۳-	۲۹۵٫۲۹-	۲۰۶٫۲۹-	۲۵۹٫۹۶+	۳۳۹٫۸۵+ (c)

نوٹ ٹیبل ۶ — ۳

حسابات عارضی ہیں۔ سنہ ۶۹-۱۹۶۸ء سے متعلق بجٹ کے تخمینے وہ ہیں جو لوک سبھا میں پیش ہوئے۔

(A) محصول اور دوسرے ٹیکسوں میں صوبوں کا حصہ نکال کر۔

(B) محصول اور زائد محصولوں میں صوبوں کے حصے کی ادائیگی نکال کر۔

(C) ٹریژری بلوں کی آمدنی نکال کر۔

(D) اس میں ۳۰۰ کروڑ کے وہ عارضی ٹریژری بل شامل نہیں ہیں جو ۴ فی صدی کے قرض میں بدل دیے گئے اور جو ریزرو بینک نے جولائی ۱۹۵۸ء میں لے لیے اور جنھیں نہیں فروخت ہونا ہے۔ لیکن ۲۵ر۵ کروڑ کے وہ ٹریژری بل شامل ہیں جو پبلک آکشن کے ذریعے فروخت ہوئے۔

(E) یہ بل شامل نہیں ہیں: ۶۰-۱۹۵۹ء کے ۱۵۰ کروڑ کے عارضی ٹریژری بل، ۵۰ کروڑ کے بالترتیب ۶۱-۱۹۶۰ء، ۶۲-۱۹۶۱ء اور ۶۳-۱۹۶۲ء کے بل، ۷۵ کروڑ کے ۶۴-۱۹۶۳ء کے بل اور ۵۰ کروڑ کے ۶۵-۱۹۶۴ء، ۶۶-۱۹۶۵ء اور ۶۷-۱۹۶۶ء کے بل اور ۷۵ کروڑ کے بالترتیب ۶۸-۱۹۶۷ء اور ۶۹-۱۹۶۸ء کے بل۔

(F) ۱۷ر۹ کروڑ کی وہ رقم شامل نہیں ہے جو ریزرو بینک نے عارضی طور پر سونا خریدنے کے لیے جاری کی تاکہ ہندوستان I.M.F. فنڈ کا بڑھا ہوا چندہ جمع کر سکے۔

(G) ریزرو بینک کی امانتیں اور وہ نقد شامل ہے جس کی ادائیگی یا منتقلی ہندوستان اور انگلستان کے درمیان ہوئی۔

(Q) بجٹ کی تجاویز کا اثر شامل ہے۔

SOURCE: RESERVE BANK OF INDIA BULLETIN APRIL 1969

ٹیبل ۶-۴ صوبوں کے کان سالیڈیٹ کیے ہوئے بجٹ کی صورت (۵۲-۱۹۵۱ تا ۶۹-۱۹۶۸)

	۵۲-۱۹۵۱ اکاؤنٹس	۵۶-۱۹۵۵ اکاؤنٹس	۶۱-۱۹۶۰ اکاؤنٹس	۶۳-۱۹۶۲ اکاؤنٹس	۶۵-۱۹۶۴ اکاؤنٹس	۶۷-۱۹۶۶ اکاؤنٹس	۶۸-۱۹۶۷ بجٹ	۶۸-۱۹۶۷ نظرثانی شدہ	۶۹-۱۹۶۸ بجٹ
۱- ریونیو اکاؤنٹ									
A- آمدنی	۳۹۴٫۴	۵۵۴٫۳	۱۰۱۱٫۸	۱۲۸۳٫۹	۱۶۲۵٫۰	۲۱۳۵٫۲	۲۳۷۷٫۸ (۲۴۰۹٫۸)	۲۳۴۴٫۱	۲۵۸۷٫۱ (۲۶۰۳٫۶)
مصارف	۳۹۲٫۶	۶۰۳٫۱	۹۸۷٫۴	۱۲۶۰٫۹	۱۵۸۴٫۷	۲۱۹۴٫۳	۲۴۲۸٫۲	۲۳۴۹٫۸	۲۵۹۶٫۷
بچت یا خسارہ	+۳٫۸	-۴۹٫۸	+۲۴٫۴	+۲۳٫۰	+۵۰٫۳	-۵۹٫۱	-۵۰٫۴	-۲۰٫۷	-۹٫۶ (+۷٫۹)
۲- کیپیٹل اکاؤنٹ									
آمدنی	۱۳۵٫۰	۳۸۲٫۰	۵۸۰٫۰	۷۷۸٫۲	۱۰۳۸٫۲	۱۲۲۴٫۰	۱۲۹۰٫۲	۱۳۲۸٫۰	۱۲۸۴٫۲
تقسیم	۱۸۸٫۷	۳۳۵٫۹	۶۳۲٫۹	۷۴۹٫۱	۱۰۳۳٫۰	۱۱۴۵٫۴	۱۳۵۶٫۳	۱۴۱۲٫۳	۱۳۷۸٫۵
بچت یا خسارہ	-۵۳٫۷	+۴۶٫۱	-۵۲٫۹	+۲۹٫۱	+۵٫۲	+۷۸٫۶	-۹۶٫۱	-۸۴٫۳	-۹۱٫۳
۳- زر مرسلہ	+۱٫۶	+۴٫۱	-۱۹٫۹	-۲۴٫۶	-۱۶٫۷	-۲۶٫۰	-۵٫۷	+۹٫۴	+۱٫۳
۴- مجموعی بچت یا خسارہ	-۴۸٫۳	+۰٫۴	-۴۸٫۴	+۲۷٫۵	+۳۸٫۸	-۶٫۵	-۱۵۲٫۲ (-۱۲۵٫۲)	-۱۰۲٫۶	-۹۹٫۶ (-۸۲٫۱)(F)
رقم کیسے حاصل ہوئی									
A- کیش بیلنس گھٹا کر یا بڑھا کر	-۱۰٫۸	+۱۰٫۰	۳٫۷(d)	+۱۱٫۴	+۲۱٫۴	-۲۶٫۲	۱۳۷٫۸	-۶۸٫۳	-۹۰٫۰
(۱) ابتدائی بیلنس	+۹۱٫۵	+۹۲٫۸	-۴٫۶	-۱٫۸	-۹٫۶	+۲۲٫۶	-۲۲٫۶	-۰٫۴	-۶۸٫۰
(۲) آخری بیلنس	+۵۰٫۷	+۱۰۳٫۸	-۹٫۹	+۹٫۶	+۱۴٫۸	-۳٫۶	-۱۶۰٫۴	-۶۸٫۷	-۱۵۸٫۷
B- سیکیورٹیوں کی خریداری (+) یا فروخت (-) سے	۳۷٫۶	-۹٫۶(e)	-۵۲٫۱	+۱۶٫۱	+۱۲٫۴	+۱۹٫۷(g)	-۱۴٫۴(g)	-۳۳٫۲(g)	-۹٫۶(g)

نوٹ: ٹیبل ۶ — ۴

۱۹۵۰-۵۱ء کے سال کے اعداد شمار میں اس وقت کی پارٹ (C) اسٹیٹ نہیں شامل ہیں (اجمیر، بھوپال، کرگ، دہلی، ہماچل پردیش اور وندھیہ پردیش) کیونکہ ان کا کیپٹل بجٹ صرف ۱۹۵۱-۵۲ء سے تھا۔ ۱۹۵۰-۵۶ء کے اعداد شمار آڈیٹر جنرل کے شائع کردہ COMBINED FINANCE AND REVENUE ACCOUNTS CENTRAL STATE GOVERNMENT سے لیے گئے ہیں۔ ۱۹۵۰-۵۶ء تک کے سیکیوریٹیوں کی خرید اور فروخت کے اعداد شمار A اور B اسٹیٹس سے متعلق ہیں۔ ۱۹۵۶-۵۷ء سے آگے کے اعداد شمار نئے منظم صوبوں سے متعلق ہیں جن میں دہلی اور ہماچل پردیش نہیں شامل ہیں جو اب مرکزی علاقے ہیں لیکن کچھ شامل ہے جو اس وقت کے بمبئی صوبے میں تھا اور اب گجرات کا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ جموں اور کشمیر بھی شامل ہے۔ ۱۹۶۷-۶۸ء (B E) اور ۱۹۶۸-۶۹ء (B.E) کے اعداد شمار ٹیکس کی تبدیلیوں سے پہلے کے ہیں۔ ٹیکس میں تبدیلی کے بعد کے اعداد بریکٹ میں دیے گئے ہیں۔ ۱۹۶۶-۶۷ء کے آخری بیلنس اور ۱۹۶۷-۶۸ء کے ابتدائی بیلنس میں ۲ء۳ کروڑ کے فرق کی وجہ ۱۹۶۶-۶۷ء میں پنجاب کے حسابات کی غلط درجہ بندی ہے۔

(a) آمدنی اور خرچ میں اور سے منتقلیاں شامل نہیں ہیں (b) سیکیوریٹیوں کی خالص خرید شامل نہیں ہے (c) ڈرافٹ نہیں شامل ہیں (d) ان عدد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ردو بدل کرکے وہ رقم نکال دی گئی جو گجرات کو منتقل ہوئی (E) چونکہ کیش بیلنس انوسٹمنٹ اکاؤنٹ کے الگ اعداد شمار حاصل نہیں ہیں اس لیے ٹوٹل سسپنس اکاؤنٹ اس مد میں شامل کردیا گیا ہے (F) اگر نئے ٹیکس کے اقدام میں صوبوں کے حصے کو لے لیا جائے تو ۱۹۶۸-۶۹ء کا مجموعی خسارہ ۱۵ کروڑ گھٹ جائے گا یعنی ۱ء ۶۷ کروڑ ہو جائے گا (g) اسپیشل ریونیو ریزرو فنڈ سے جو رقمیں نکالی گئیں وہ شامل ہیں۔ یہ فنڈ ۱۹۶۶-۶۷ء میں ۳ء۴ کروڑ، ۱۹۶۷-۶۸ء میں ۴ء۳ کروڑ اور ۱۹۶۸-۶۹ء میں ۱ء۲ کروڑ تھا۔

* ناگالینڈ اور مرکزی علاقوں کے اعداد شمار نہیں شامل ہیں۔

SOURCE: REPORT ON CURRENCY AND FINANCE FOR THE YEAR 1967-68

ٹیبل ۶-۵ تیسرے فائنانس کمیشن کی سفارش کے مطابق ٹیکسوں اور گرانٹ میں صوبوں کا حصہ

صوبوں کا حصہ	انکم ٹیکس کا حصہ ×	مرکزی اکسائز ڈیوٹی ++ میں حصہ	آرٹیکل ۲۷۵(۱) کے تحت امدادی گرانٹ	رسل و رسائل کی ترقی کے لیے مخصوص گرانٹ	اسٹیٹ ڈیوٹی میں حصہ	پسنجر ٹیکس کے عوض گرانٹ	اکسائز کی نئی ڈیوٹی: آمدنی جس کی یقین دہانی کی گئی	اکسائز کی نئی ڈیوٹی: فاضل رقم کی تقسیم
	۶۶ ۲/۳ فی صدی	۲۰ فی صدی	لاکھ روپے	لاکھ روپے	۹۹ فی صدی xx	لاکھ روپے	لاکھ روپے	۵ر۷۹ فیصدی
	فی صد	فی صد			فی صد			فی صد
آندھرا پردیش	۷ر۷۱	۸ر۲۳	۹۰۰	۵۰	۸ر۳۴	۱۱۱	۲۳۵ر۲۴	۷ر۷۵
آسام	۲ر۴۴	۳ر۷۳	۵۲۵	۷۵	۲ر۷۵	۳۴	۸۵ر۰۸	۲ر۵۰
بہار	۹ر۳۳	۱۱ر۵۶	-	۷۵	۱۰ر۶۸	۱۱۷	۱۳۰ر۱۹	۱۰ر۰۰
گجرات	۴ر۶۸	۶ر۴۵	۴۲۵	۱۰۰	۴ر۷۸	۴۸	۳۲۳ر۴۵	۴ر۴۰
جموں کشمیر	۰ر۷۰	۲ر۰۲	۱۵۰	۵۰	۰ر۸۳	-	-	xxx
کیرل	۳ر۵۵	۵ر۴۶	۵۵۰	۷۵	۳ر۹۲	۲۳	۹۵ر۰۸	۴ر۲۵
مدھیہ پردیش	۶ر۴۱	۸ر۴۶	۱۲۵	۱۷۵	۷ر۵۱	۱۰۴	۱۵۵ر۱۷	۷ر۰۰
مدراس	۸ر۱۳	۶ر۰۸	۳۰۰	-	۷ر۸۰	۸۱	۲۸۵ر۳۴	۹ر۰۰
مہاراشٹر	۱۴ر۳۱	۵ر۷۳	-	-	۹ر۱۶	۱۳۵	۶۳۷ر۷۷	۱۰ر۶۰
میسور	۵ر۱۴	۵ر۸۲	۶۲۵	۵۰	۵ر۴۶	۵۶	۱۰۰ر۱۰	۵ر۲۵
اڑیسہ	۳ر۴۴	۷ر۰۷	۱۱۵۰	۱۷۵	۴ر۰۸	۲۲	۸۵ر۱۰	۴ر۵۰
پنجاب	۴ر۴۹	۶ر۷۱	-	-	۴ر۷۱	۱۰۱	۱۷۵ر۱۹	۵ر۲۵
راجستھان	۳ر۹۷	۵ر۹۳	۴۵۰	۷۵	۴ر۷۷	۸۵	۹۰ر۱۰	۴ر۰۰
اترپردیش	۱۴ر۴۲	۱۰ر۶۸	-	-	۱۷ر۱۰	۲۳۴	۵۷۵ر۸۱	۱۵ر۵۰
بنگال	۲ر۰۹	۵ر۰۷	-	-	۸ر۱۱	۷۹	۲۸۰ر۴۱	۹ر۰۰
			۵۲۰۰	۹۰۰		۱۲۵۰	۳۲,۵۴۰۰	

فٹ نوٹ:

× - انکم ٹیکس کی خالص آمدنی علاوہ اس آمدنی کے جو مرکز اور مرکزی علاقوں کی ہے۔ کمیشن نے مرکزی علاقوں کا حصہ بڑھاکر مجموعی آمدنی کا ایک فی صدی کی بجائے ۲ ۱/۲ فی صدی کردیا۔

xx - ناقابل انتقال املاک کو چھوڑکر دوسری املاک کے ٹیکس پر عائد ہوتا ہے۔

xxx - جموں کشمیر کو مجموعی آمدنی کا ۱۲ فی صد کے علاوہ کوئی معاوضہ نہیں ملے گا۔

++ - کمیشن کی سفارش کردہ ۳۵ اشیا پر یونین اکسائز ڈیوٹی کی خالص آمدنی۔

SOURCE: REPORT OF THE THIRD FINANCE COMMISSION 1962

ٹیبل ۶-۶ چوتھے فائنانس کمیشن کی سفارش کے مطابق ٹیکسوں اور گرانٹ میں صوبوں کا حصہ

صوبوں کا حصہ تقسیم	انکم ٹیکس میں حصہ	یونین اکسائز میں حصہ	دفعہ (۱) ۲۷۵ کے تحت امدادی گرانٹ	اسٹیٹ ڈیوٹی میں حصہ	پسنجر ٹیکس کے عوض گرانٹ	سیلس ٹیکس کے عوض مزید اکسائز: آمدنی میں کی یقین دہانی کی گئی	سیلس ٹیکس کے عوض مزید اکسائز: بقیہ کی تقسیم
	۷۵ فی صدی	۲۰ فی صدی		۹۸ فی صدی		۲۳۵ر۹۷ فی صدی	
	فی صد	فی صد	لاکھ روپے	فی صد	فی صد xx	لاکھ روپے	فی صد
آندھرا پردیش	۷ر۳۷	۷ر۷۷	۱۳۵۱ (a)	۸ر۳۴	۹ر۰۵	۲۳۵ر۲۳	۷ر۴۲
آسام	۲ر۴۴	۳ر۳۲	۱۴۵۲	۲ر۷۵	۲ر۷۹	۸۵ر۰۸	۱ر۹۸
بہار	۹ر۰۴	۱۰ر۰۳	-	۱۰ر۷۶	۹ر۹۹	۱۳۰ر۱۹	۶ر۱۷
گجرات	۵ر۲۹	۴ر۸۰	-	۴ر۷۸	۷ر۱۱	۳۲۳ر۴۵	۷ر۴۳
جموں کشمیر	۰ر۷۳	۲ر۲۶	۶۵۷	۰ر۸۳	-	-	-+
کیرل	۳ر۵۰	۴ر۱۶	۲۰۸۲	۳ر۹۲	۱ر۸۵	۹۵ر۰۸	۵ر۶۵
مدھیہ پردیش	۶ر۴۷	۷ر۴۰	۲۷۰	۷ر۵۰	۹ر۸۵	۱۵۵ر۱۷	۴ر۶۲
مدراس	۸ر۳۴	۷ر۱۸	۶۸۴	۷ر۸۰	۵ر۸۱	۲۸۵ر۳۴	۱۱ر۱۳
مہاراشٹر	۱۴ر۲۸	۸ر۲۳	-	۹ر۱۶	۸ر۹۸	۶۳۷ر۷۷	۱۹ر۸۷
میسور	۵ر۱۴	۵ر۴۱	۲۰۸۲ (a)	۵ر۴۶	۳ر۹۸	۱۰۰ر۱۰	۵ر۲۱
ناگالینڈ	۰ر۰۷	۲ر۲۱	۷۰۷	۰ر۰۹	۰ر۰۱		-+
اڑیسہ	۳ر۴۰	۴ر۸۲	۲۹۱۸	۴ر۰۷	۲ر۱۲	۸۵ر۱۰	۲ر۵۸
پنجاب	۴ر۲۶	۴ر۸۶	-	۴ر۷۰	۷ر۴۳	۱۷۵ر۱۹	۵ر۰۱
راجستھان	۳ر۹۷	۵ر۰۶	۶۷۳	۴ر۴۶	۶ر۴۰	۹۰ر۱۰	۳ر۱۷
اتر پردیش	۱۴ر۶۰	۱۴ر۹۸	۹۸۵ (a)	۱۷ر۰۸	۱۸ر۲۳	۵۷۵ر۸۱	۷ر۸۳
بنگال	۱۰ر۹۱	۷ر۵۱	-	۸ر۰۹	۶ر۴۰	۲۸۰ر۴۱	۱۱ر۹۳
			۱۴۰٫۶۱			۳۲۵۴ر۰۰	

فٹ نوٹ: ٹیبل ۶-۶

× -- انکم ٹیکس کی خالص آمدنی، علاوہ اُس کے جو مرکز اور مرکزی علاقوں کی ہے۔ کمیشن نے مرکزی علاقوں کا حصہ ۲½ فی صدی برقرار رکھا۔

+ - تمام اشیا پر یونین اکسائز ڈیوٹی کی خالص آمدنی۔

(a) - مہنگائی بھتہ اور تنخواہوں کے وہ اضافے شامل ہیں جو کمیشن نے نہیں جوڑے تھے۔

×× -- صرف اُس ٹیکس سے متعلق ہے جو ناقابل انتقال املاک کے علاوہ املاک پر عائد ہوتا ہے۔

++ -- ناگالینڈ اور جموں کشمیر کو کوئی ضمانت یافتہ رقم نہیں ادا ہوتی ہے لیکن دونوں کو خالص آمدنی کا بالترتیب ۰.۰۳ فی صدی اور ½۱ فی صدی ملے گا۔

SOURCE: REPORT OF THE FOURTH FINANCE COMMISSION, 1964.

حصۂ ہفتم

بینکنگ اور نظامِ زر

باب ۲۹

ہندوستان کا بینکی نظام، ریزرو بینک اور حالیہ بل مارکٹ اسکیم

ہندوستان کا بینکی نظام دو۲ حصّوں پر مشتمل ہے، منظم جدید سکٹر اور غیر منظم دیسی سکٹر۔ جدید سکٹر جن اداروں پر مشتمل ہے یہ ہیں: (۱) ریزرو بینک جو کہ مرکزی بینک ہے (۲) اسٹیٹ بینک جو پہلے امپیریل بینک تھا (۳) جوائنٹ اسٹاک کمرشل بینک جو دو۲ قسموں میں تقسیم ہیں ایک کو شیڈیولڈ بینک اور دوسرے کو نان شیڈیولڈ بینک کہا جاتا ہے (۴) اکسچینج بینک جو ہندوستان کی خارجی تجارت کے لیے مالی وسائل فراہم کرتے ہیں۔ غیر منظم سکٹر دیسی بینکوں اور ساہوکاروں پر مشتمل ہے۔ ملک کے مختلف علاقوں میں دیسی بینکروں کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے، مثلاً صراف، سیٹھ، مہاجن وغیرہ۔ ساہوکاروں کو بنیا، ساہوکار اور کھتری وغیرہ کہا جاتا ہے۔ ان دو۲ قسموں کے علاوہ ہندوستان میں اور بھی ادارے ہیں جیسے یونٹ ٹرسٹ، کواپریٹیو بینک، لینڈ مارٹگیج بینک۔ غرضیکہ ہندوستان کے بینکی نظام کی نچلی سطح پر مختلف قسم کے لاکھوں دیسی بینکر، جوائنٹ اسٹاک بینک اور کواپریٹیو بینک ہیں۔ درمیانی حلقے میں امپیریل بینک ہے جو منظم اور ترقی یافتہ ہے اور جسے حال میں قومی ملکیت میں لایا گیا ہے۔ ان سب کے اوپر ریزرو بینک ہے جس کی حیثیت سرکاری سنٹرل بینک کی ہے۔ اسٹیٹ بینکوں اور ریزرو بینک میں اشتراکِ عمل ہے۔ اسٹیٹ بینک عام بینکی کاروبار کے علاوہ غیر کاروباری اور ترقیاتی کام بھی انجام دیتا ہے۔ یہ کواپریٹیو اداروں،

زراعت اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو قرض فراہم کرتا ہے۔
جوائنٹ اسٹاک بینک ریزروبینک کی نگرانی اور کنٹرول کے تحت کام کرتے ہیں۔ ریزرو بینک کو نگرانی اور کنٹرول کے اختیارات ۱۹۴۹ء کے انڈین بینکنگ کمپنیز ایکٹ کے تحت حاصل ہیں۔ ایکسچینج بینکوں میں نیشنل گرنڈلیز بینک، چارٹرڈ بینک اور فرسٹ نیشنل سٹی بینک کو خارجی تجارت کے لیے مالی وسائل کی فراہمی کی عملاً اجارہ داری حاصل ہے۔ یہ بینک دوسرے بینکی کام بھی انجام دیتے ہیں۔ مثلاً روپیہ جمع کرنا، قرض دینا، بلوں کو سکارنا وغیرہ۔ حال میں ان بینکوں نے داخلی تجارت کے لیے بھی وسائل فراہم کرنا شروع کیا ہے۔ کوآپریٹو بینک اور لینڈ مارٹگیج بینک زیادہ تر دیہی بینک کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ حال میں اسٹیٹ بینک نے بھی اپنی شاخیں دیہاتوں میں کھول دی ہیں اور وہاں مالی وسائل کی فراہمی کا کام شروع کر دیا ہے۔ دیسی بینک ریزروبینک کے لیے ایک مستقل دردِ سر ہیں۔ یہ بینک اپنا کاروبار اپنی مرضی کے مطابق کرتے ہیں۔ ان کی سود کی شرح بہت اونچی ہوتی ہے اور یہ ریزروبینک کی نگرانی اور کنٹرول قبول کرنے پر نہیں آمادہ ہوتے۔ یہ بینک ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور منظّم نہیں ہیں۔ ان غیر منظّم لیکن آزاد بینکوں کی وجہ سے ریزروبینک قرض کے کاروبار پر مؤثر کنٹرول نہیں عائد کر پاتا۔ حال میں ۱۹۶۳ء کے بینکنگ لاز ایکٹ کے تحت ریزروبینک کو دیسی بینکوں سمیت ان تمام اداروں کی نگرانی کے وسیع اختیارات مل گئے ہیں جو پبلک کی امانت قبول کرتے ہیں۔ جون ۱۹۶۴ء کے شروع سے بینکی اور غیر بینکی اداروں کے لیے پبلک کی امانت کا تفصیلی حساب ریزروبینک میں داخل کرنا لازمی ہے۔

ریزروبینک آف اِنڈیا

(الف) دستور اور انتظام —— ریزروبینک آف اِنڈیا یکم اپریل ۱۹۳۵ء میں ریزرو بینک آف اِنڈیا ایکٹ کے تحت قائم ہوا۔ قیام کے بعد سے سکّے جاری کرنے کا سرکاری کام اور قرض کو کنٹرول کرنے کا کام ریزروبینک کے سپرد ہے۔ ریزروبینک کی ابتدا شیر ہولڈروں کے بینک کی حیثیت سے ہوئی۔ شروع میں اس کا بیباق سرمایہ ۵ کروڑ تھا۔ یکم جنوری ۱۹۴۹ء سے ریزروبینک سرکاری اور مرکزی بینک کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ ریزروبینک کے عوامی ملکیت میں لائے جانے سے متعلق ۱۹۴۸ء کے ایکٹ کے تحت شیر ہولڈروں کو شیروں کی بازاری قیمت کے مطابق معاوضہ ادا کر دیا گیا۔ اُس وقت ۱۰۰ روپے کے شیر کی قیمت ۱۱۸ روپے دس آنے تھی۔

۱۹۳۴ء کے ایکٹ کے تحت مرکزی حکومت ریزرو بینک کے گورنروں کو مقرر یا نامزد کرتی ہے۔ اِس وقت بینک کا مرکزی بورڈ اِن افراد پر مشتمل ہوتا ہے: ایک گورنر اور چار ڈپٹی گورنر جنھیں مرکزی حکومت مقرر کرتی ہے، لوکل بورڈوں کے نامزد کیے ہوئے چار ڈائرکٹر، چھے دوسرے ڈائرکٹر اور ایک سرکاری افسر۔ اِس کے علاوہ چار مقامی بورڈ بھی ہوتے ہیں۔ ہر لوکل بورڈ گورنمنٹ کے نامزد کیے پانچ ممبروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لوکل بورڈ کے ممبران چار برس کے لیے ہوتے ہیں۔ قومی ملکیت میں آنے کے بعد سے حکومت اور بینک میں بہت گہرا تعلق ہو گیا ہے۔ بینک قومی مفاد میں دیے گئے سرکاری احکام کی تعمیل کرتا ہے لیکن ہدایات کے اجرا سے قبل وزیر مالیات اور ریزرو بینک کے گورنر کے درمیان صلاح مشورہ ہوتا ہے۔

(ب) ریزرو بینک کے کام —— ریزرو بینک ایک سنٹرل بینک کے تمام فرائض انجام دیتا ہے۔ اس کے اولین فرائض یہ ہیں: (۱) نوٹ چھاپنا (۲) سرکاری بینک کی حیثیت سے کام کرنا (۳) کمرشل بینکوں کی طرف سے دیے جانے والے قرضوں اور پیشگیوں پر کنٹرول عائد کرنا (۴) ایسے بینک کی حیثیت سے کام کرنا جو صرف اُس وقت قرض دیتا ہے جب کوئی اور چارہ کار نہ ہو۔ اس کے ثانوی فرائض یہ ہیں: (۱) روپے کی بیرونی شرح مبادلہ کو قائم رکھنا (۲) زراعتی قرض فراہم کرنا (۳) مالیاتی اور سکہ جاتی اطلاعات جمع کرنا اور شایع کرنا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ بینک بہت سے ایسے ترقیاتی اور تائیدی فرائض بھی انجام دیتا ہے جن کی انجام دہی منصوبوں کے شروع ہونے کے بعد سے ضروری ہو گئی ہے۔

صرف ایک روپے کے نوٹ چھوڑ کر باقی تمام نوٹوں کے اجرا کے اختیارات ریزرو بینک کے ہیں۔ ایک روپے کے نوٹ کا اجرا حکومت ہند کی وزارتِ مالیات کرتی ہے۔ سرکاری بینک کی حیثیت سے ریزرو بینک حکومت کی طرف سے تمام ادائیگیاں اور وصول یابی اور زرِ مبادلہ کی خرید و فروخت کرتا ہے۔ ریزرو بینک ہی کے تحت قرض عامہ کا اہتمام ہوتا ہے اور نئے قرض جاری کیے جاتے ہیں۔ قرض کے کنٹرولر کی حیثیت سے ریزرو بینک کو دوسرے تمام بینکوں پر کنٹرول رکھنے اور اُنھیں ہدایات دینے کے اختیارات حاصل ہیں۔

۱۹۴۹ء کے انڈین بینکنگ کمپنیز ایکٹ اور ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۲ء کی ترمیمات کے پاس ہونے کے بعد سے ریزرو بینک کے ہدایت اور کنٹرول کے اختیارات بہت وسیع ہو گئے ہیں۔ ۱۹۳۴ء کے ریزرو بینک ایکٹ کے تحت ۵ لاکھ سے زیادہ بیباق سرمائے والے اور درج فہرست جوائنٹ اسٹاک

بینکوں کے لیے یہ لازمی تھا کہ وہ اپنے کاموں کی ہفتہ وار رپورٹ ریزرو بینک کو دیں اور اپنی میعادی امانت کا ۲ فی صدی اور غیر میعادی امانت کا ۵ فی صدی ریزرو بینک کے پاس کم از کم قانونی ریزرو کی حیثیت سے جمع رکھیں۔ ۱۹۵۶ء کے ریزرو بینک امنڈمنٹ ایکٹ کے تحت ریزرو بینک کو اختیار دیا گیا کہ وہ محفوظ رقم کے تناسب کو میعادی امانت کے لیے ۵ فی صدی سے بڑھاکر ۲۰ فی صدی اور غیر میعادی امانت کے لیے ۲ فی صدی سے بڑھاکر ۸ فی صدی کر سکتا ہے۔ ۱۹۶۲ء کے ترمیمی ایکٹ کے بعد سے درج فہرست بینکوں کے لیے یہ لازمی قرار پایا کہ یہ اپنی میعادی اور غیر میعادی امانت کی روز آمد اوسط کا ۳ فی صدی ریزرو بینک کے پاس جمع رکھیں جبکہ پہلے انھیں میعادی امانت کا ۲ فی صدی اور غیر میعادی امانت کا ۵ فی صدی رکھنا پڑتا تھا۔ انڈین بینکنگ کمپنیز ایکٹ کے پاس ہونے کے بعد سے ریزرو بینک کو قرض کی مقدار پر کنٹرول رکھنے کے اختیارات حاصل ہیں اور ریزرو بینک نے ۱۹۵۶ء کے وسط سے ان اختیارات کو سکّے کے پھیلاؤ پر قابو پانے کے لیے استعمال کیا ہے۔ حال میں بینک لا ایکٹ ۱۹۶۳ء کے تحت ریزرو بینک کو بینکوں اور غیر بینکی مالیاتی اداروں پر کنٹرول کے نئے اختیارات مل گئے ہیں۔ اِس ایکٹ کے تحت ریزرو بینک کو اختیار ہے کہ غیر بینکی مالیاتی اداروں اور پبلک کی امانت قبول کرنے والے دیسی بینکروں کے کاموں پر نگرانی اور کنٹرول رکھ سکتا ہے۔

ریزرو بینک انٹرنیشنل مونٹری فنڈ کی امداد سے روپے کی بیرونی قیمت کو قائم رکھتا ہے۔ ستمبر ۱۹۴۹ء تک ریزرو بینک نے مونٹری فنڈ کی اجازت سے روپے کی قیمت ۰ر۲۶۸۶۹۱ گرام سونے کے برابر قائم رکھی۔ ستمبر ۱۹۴۹ء میں جب روپے کی شرح مبادلہ میں کمی کا اعلان کیا گیا، روپے کی قیمت ۰ر۱۸۶۶۲۱ گرام سونے کے برابر کردی گئی۔ یہ شرح ۵ جون ۱۹۶۶ء تک قائم رہی۔ جب ایک بار پھر روپے کی قیمت میں ۳۶ر۵ فی صدی کی کمی کی گئی تو ۶ جون ۱۹۶۶ء سے روپے کی قیمت ۰ر۱۱۸۵۱۶ گرام سونے کے برابر کردی گئی۔ ۱۹۲۷ء میں روپے کی شرح مبادلہ ایک شلنگ ۶ پنس مقرّر ہوئی تھی۔ یہ تناسب ۵ جون ۱۹۶۶ء تک برقرار رہا۔ اُس کے بعد پیسے کی قیمت ۳۶ر۵ فی صدی کم کردی گئی۔ چنانچہ جون ۱۹۶۶ء سے ایک روپیہ ایک شلنگ کے برابر ہوگیا۔ ریزرو بینک اکسچینج بینکوں اور کچھ دوسرے تسلیم شدہ کاروباری اداروں کی مدد سے ہندوستان کے تبادلۂ زر کے نظام کو چلاتا ہے۔ ریزرو بینک کا زرعی قرض کا شعبہ دیہی قرض کے مسائل سے نپٹتا ہے۔ اجرا اور بینکی کاموں سے متعلق ریزرو بینک کی سرگرمیوں کی ہفتہ وار رپورٹ

شائع کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ماہانہ بلیٹن شائع ہوتا ہے جس میں قومی اور بین الاقوامی معاشی اور سکہ جاتی مسائل کا تجزیہ ہوتا ہے۔

ریزرو بینک کے بنیادی مقاصد یہ ہیں : (۱) کمرشل بینکنگ کا صحت مند نظام قائم کرنا (۲) قرض کی ماہیتی، مقداری اور منتخب پالیسی میں ربط پیدا کرنا اور اس پر نگرانی رکھنا (۳) دیہی بینک کاری کو ترقی دینا (۴) صنعتوں کو مالی امداد دینے والے اداروں کو ترقی دینا اور ان کی مدد کرنا (۵) ہندوستان کے غیر منظم اور کم ترقی یافتہ بازار زر کو باقاعدہ ترقی دینا۔

(ج) **ریزرو بینک کے کاموں کا جائزہ** (خریداری بالقطّ اور نگرانی قرض کے مخصوص حوالے سے) ---- ۱۹۳۵ء میں اپنے قیام کے بعد سے ریزرو بینک ملک میں سود کی شرح کو کم کرنے میں خاصہ کامیاب رہا ہے۔ بینک نے ترسیل زر کی سہولتیں بھی پہلے کے مقابلے میں کم شرح پر مہیا کی ہیں۔ قرض عامہ کے اہتمام میں بھی اس نے اپنی اہلیت اور افادیت ظاہر کردی ہے۔ آزادی کے بعد سے ریزرو بینک ترقیاتی بینک کاری کی ضروریات کے مطابق کمرشل بینکوں کی قرض کی پالسی کو مؤثر طور سے کنٹرول کر رہا ہے۔ ۱۹۵۲ء سے ریزرو بینک نے ہنڈی بازار کی اسکیم چلاکر ملک کے نظام قرض کو کافی لچک دار بنایا ہے۔ دیہی مالیات کے میدان میں ریزرو بینک کے دیہی قرض کے شعبے نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ حال کے چند برسوں میں بینک نے کئی اُن مالیاتی اور ترقیاتی کارپوریشنوں کے قیام میں بھی نمایاں رول ادا کیا ہے جو صنعتوں کو لمبی مدت کے لیے مالی وسائل فراہم کرتے ہیں۔

۱۹۶۱ء میں ریزرو بینک نے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور کواپریٹو اداروں کو دیے جانے والے قرض کا سروے کیا تاکہ اس بات کا اندازہ کیا جاسکے آیا کمرشل بینکوں کو اس بات کی ترغیبات فراہم کی جاسکتی ہیں کہ وہ اس حلقے کو قرض کی زیادہ سہولتیں فراہم کریں۔ سروے سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ جون ۱۹۶۱ء کے ختم تک چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو ۲۷ کروڑ روپیہ قرض دیا گیا جو درج فہرست بینکوں کو دیے گئے مجموعی قرض کا ½ ۲ فی صدی تھا۔ کواپریٹو اداروں کو ۹ کروڑ کا قرض دیا گیا تھا جو ان بینکوں کے مجموعی قرض کا صرف ایک فی صدی تھا۔ بینکوں کو اس بات پر راغب کرنے کے لیے کہ یہ معیشت کے ان دو اہم سکٹروں کو قرض کی زیادہ سہولتیں فراہم کریں، یہ طے کیا گیا کہ عام انتظام کے تحت ان بینکوں کو ریزرو بینک سے جتنا قرض لینے کی اجازت ہے اُس کے علاوہ یہ بینک کی شرح سود پر مزید قرض لے سکتی ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے یکم جنوری ۱۹۶۳ء سے

ریزرو بینک کی اس کریڈٹ گارنٹی اسکیم کو مستقل کردیا گیا ہے اور پورے ملک کو اس کے تحت لے آیا گیا ہے جو جولائی ۱۹۶۰ء میں تجرباتی حیثیت سے شروع کی گئی تھی۔

۱۹۶۶-۶۷ء کے درمیان ریزرو بینک نے غیر ملکی بینکی کمپنیوں پر کچھ پابندیاں عائد کیں تاکہ یہ اتنی زیادہ امانت نہ رکھ سکیں جو ان کے سرمائے کے لحاظ سے غیر مناسب ہو۔ ریزرو بینک کی حال کی ہدایات کے مطابق غیر بینکی کمپنیوں کو (جن میں خریداری بالقسط اور تعمیر مکان کے لیے قرض دینے والی کمپنیاں نہیں شامل ہیں) چھوٹی مدت کی امانتیں قبول کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ مجموعی امانتوں کی جو حد مقرر کی گئی ہے وہ ان کے بیباق سرمائے اور آزاد محفوظ رقم (FREE RESERVE) کی ۲۵ فی صدی ہے۔ خریداری بالقسط اور تعمیر کے لیے قرض دینے والی کمپنیوں سے توقع کی جاتی ہے کہ واجب الادا امانت کا ۱۰ فی صدی نقد کی صورت میں رکھیں گی۔ خریداری بالقسط کے قرض دینے والی کمپنیوں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے واجب الوصول قرض اور خریداری بالقسط کے معاہدوں کی رقموں کا ۲۵ فی صدی نصف سال کے اندر واپس ہو جائے۔ چنانچہ پچھلے چند برسوں میں ریزرو بینک خریداری بالقسط کے لیے دیے جانے والے اُس قرض کو براہِ راست منضبط کر رہا ہے جس سے مائل بہ قلت معیشت کو افراطِ زر کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

ریزرو بینک دیسی بینک کاروں کو ضابطے اور نگرانی کے تحت لانے کے لیے کوئی متحدہ نظام قائم کرنے میں ناکام رہا ہے۔ چنانچہ بینک کا سب سے اہم کام جس کی تکمیل اب تک نہیں ہو پائی ہے یہ ہے کہ دیسی بینک کاری کو باقاعدہ منظم کیا جائے اور اُسے جدید بینکی نظام سے مربوط کیا جائے۔ بینک نے ہندوستانی اکسچینج بینکوں کو ترقی دینے کی طرف بھی ٹھوس قدم نہیں اُٹھایا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد بھی غیر ملکی اکسچینج بینک ہماری بیرونی تجارت کے تقریباً اجارہ دار ہیں۔ اِن خامیوں کے باوجود ریزرو بینک مالیاتی اِستحکام اور سکہ جاتی کنٹرول کا نیا دَور شروع کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ اس نے ہندوستان کے بازارِ زر کو نئی شکل دی اور تجارتی بینک کاری کو مضبوطی دی۔ پانچ سالہ منصوبوں کے شروع ہونے کے بعد سے ریزرو بینک جو سرکاری ملکیت اور اختیار میں ہے افراطِ زر پر قابو رکھنے، خسارے کی مالیاتی اور ترقیاتی بینک کاری کے میدان میں مرکزی حکومت کے ساتھ اشتراک اور تعاون کرتا رہا ہے۔

ریزرو بینک ایک مددگار بینک کی حیثیت سے ——— ریزرو بینک کے تمام

کاموں میں سب سے اہم کام کمرشل بینکوں کو امدادی سہولتیں فراہم کرنا ہے۔ چنانچہ اس کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ آخری قرض دینے والے کی حیثیت سے ریزرو بینک کے کیا فرائض ہیں ۱۹۳۴ء کے ریزرو بینک ایکٹ کے اہلیت کے قواعد بہت سخت تھے جن کی وجہ سے ریزرو بینک کے لیے کمرشل بینکوں کو امدادی سہولتیں بہم پہنچانے کی گنجائش بہت کم تھی۔ غیر معمولی حالات یا بحران کی صورت میں اگر کوئی بینک ریزرو بینک کے پاس امداد کے لیے جاتا تھا تو اُس کو دو شرائط پوری کرنی ہوتی تھیں۔ اوّل تو یہ کہ وہ مدد کا حقدار ہو اور دوسرے یہ کہ اُس کی درخواست قبولیت کے معیار پر پوری اترتی ہو۔ بہ الفاظ دیگر، اس سے قبل کہ کوئی بینک ریزرو بینک کی مدد حاصل کرسکے اُس کے لیے یہ ثابت کرنا ضروری تھا کہ اُس کا کاروبار مستحکم ہے اور مزید یہ کہ ریزرو بینک سے جن تمسکات کو قبول کرنے کی درخواست کی جارہی ہے اور وہ اہلیت کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ قابلِ قبول تمسکات کے لیے یہ شرائط پوری کرنی ضروری تھیں: (۱) اس کا تعلق سٹہ بازی سے نہ ہو بلکہ واقعی تجارت اور لین دین سے ہو (۲) اُس کی واجب الادا ہونے کی میعاد قلیل ہو (۳) اس پر ساکھ رکھنے والے دو دستخط ہوں۔ اِن سخت شرائط کی وجہ سے جوائنٹ اسٹاک بینکوں کے لیے وقتِ ضرورت ریزرو بینک سے امدادی سہولتیں حاصل کرنا مشکل تھا۔

۱۹۳۹ء میں ٹراونکور نیشنل اینڈ کوئلان بینک کا دیوالیہ ہونا اس کی ایک مثال ہے۔ بینک کو اپنا کاروبار صرف اِس لیے بند کرنا پڑا کیونکہ ریزرو بینک نے امدادی سہولت دینے سے اِنکار کردیا۔ بعد میں جب بینک کے نقد اثاثے کا باقاعدہ جائزہ لیا گیا تو پتہ چلا کہ بینک کی مالی حالت اِتنی مستحکم تھی کہ وہ بینک میں جمع ہر روپے میں سے چودہ آنے ادا کرسکتا تھا۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۸ء کے درمیان مغربی بنگال اور دوسرے صوبوں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے بینکوں کے دیوالیہ ہونے کی ایک حد تک یہ وجہ تھی کہ ریزرو بینک کے اہلیت کے قواعد بہت سخت تھے۔

اِن قاعدوں کو زیادہ وسیع اور نرم بنانے کی غرض سے ۱۹۴۷ء میں ریزرو بینک ایکٹ ۱۹۳۴ء کی دفعہ ۱۷ میں ترمیم کی گئی۔ ۱۹۴۶ء میں اِنڈین بینکنگ کمپنیز ایکٹ کے پاس ہونے کے بعد سے اہلیت کے قواعد کافی نرم ہوگئے ہیں اور ریزرو بینک کو اِس کا اختیار ہے کہ وہ کسی بھی اس تمسک کو قبول کرسکتا ہے جس کو وہ مناسب سمجھتا ہے چاہے تمسک پیش کرنے والا بینک مالی مشکلات میں ہی کیوں نہ مبتلا ہو۔ ۱۹۴۹ء کے ایکٹ کے تحت ریزرو بینک کو تمسکات منتخب کرنے اور کمرشل بینکوں کو امدادی سہولتیں دینے کے وسیع اختیارات حاصل ہیں۔

امریکہ میں ۱۹۳۲ء کے گلاس اسٹیگال (GLASS-STEGAL) ایکٹ کے تحت اہلیت کے قواعد وسیع ہونے کے بعد سے تجارتی بینک کاری کو ترقی ہوئی اور عام بینکی بحران سے آسانی سے بچا جا سکا۔ حال کے برسوں میں ریزرو بینک پر کمرشل بینکوں کا انحصار نمایاں طور سے بڑھا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ریزرو بینک نے بینکی حلقے کو جو قرض دیے وہ ۱۶ کروڑ سے زیادہ نہیں تھے جبکہ ۶۲-۱۹۶۱ء میں رقم ۱۷۶ کروڑ تک پہنچ گئی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اہلیت کے قواعد نرم ہونے کے ساتھ ریزرو بینک کو بھی آخری قرض دینے والے کے فرائض کی بہتر انجام دہی میں مدد ملی ہے۔

بینک ریٹ پر اثر ڈالنے کے حالیہ اقدام

بینک ریٹ یا بینک کی شرح سود کا اتار چڑھاؤ قرض کی مقدار پر قابو رکھنے کا اہم ترین آلہ کار ہے۔ ریزرو بینک دوسرے مرکزی بینکوں کی طرح اس آلہ کار کو کمرشل بینکوں سے لیے جانے والے قرض اور ملک میں قرض کی عام صورتِ حال کو منضبط کرنے اور افراطِ زر پر قابو رکھنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ بینک کے سود کی اونچی شرح کے ذریعے افراطِ زر کو روکا جا سکتا ہے۔ زر کی رسد کم کرنے اور قرض کمیاب کرنے سے قرض مہنگا ہو جاتا ہے اور سٹہ بازوں اور ذخیرہ اندوزوں کو چیزوں کے ذخیرہ کرنے کے لیے اتنی رقم نہیں مل پاتی جتنی انھیں درکار ہوتی ہے۔

عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ افراطِ زر پر قابو حاصل کرنے کی غرض سے بینک کی شرح سود اونچی کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بینکوں، انشیورنس کمپنیوں اور ادارہ جاتی سرمایہ کاروں کے اثاثے کی قیمتِ اصل (CAPITAL VALUE) گھٹ جائے گی اور انھیں کافی خسارہ اٹھانا پڑے گا لیکن یہ دلیل بے بنیاد ہو جاتی ہے اگر کمرشل بینک اپنی پونجی کو لگانے میں اس بات کا اہتمام کریں کہ ایک منصوبے کے تحت معینہ مدت پر رقمیں واپس ہوتی رہیں۔ اگر بینک کمرشل بینک کاری کے اصولوں پر کاربند ہو کر اپنے سرمائے کو اس احتیاط کے ساتھ تقسیم کریں کہ زیادہ تر تمسکات قلیل المدت ہوں اور ان کی واجب الادا ہونے کی مدت متوازن ہو تو سود کی شرح اونچی کرنے کے باوجود انھیں خسارہ نہ اٹھانا پڑیگا کیونکہ قلیل المیعاد تمسکات کے واجب الادا ہونے کے بعد وہ رقم فوراً ان تمسکات میں لگ جائے گی جن پر زیادہ سود ملے گا چنانچہ قیمتِ اصل کم ہونے سے جو نقصان ہوا ہوگا وہ نئے تمسکات پر بڑھی ہوئی آمدنی سے پورا ہو جائے گا۔

(الف) **نومبر میں بینک کی شرح سُود میں تبدیلی :** نومبر ۱۹۵۱ء میں ریزرو بینک نے شرح سود ۳ فی صدی سے بڑھاکر ۱/۲ ۳ فی صدی کردی۔ کافی عرصے تک سستے قرض کی پالسی پر چلنے کے بعد جب سود کی شرح ۳ فی صدی قائم رکھی گئی، بینک نے قرض پر قابو رکھنے کے لیے سُود کی شرح کی ایک لچکدار پالسی شروع کی۔ بینک کی شرح سُود اونچی کرنے کے ساتھ ہی قرض کی باگ ڈور ریزرو بینک کے ہاتھ میں آگئی۔ بہ الفاظ دیگر ملک کی روپے کی سپلائی پورے طور سے بینک کی گرفت میں آگئی جس کا مطلب یہ تھا کہ بازار زر میں زر کی رسد کا انحصار ریزرو بینک کی صواب دید پر تھا نہ کہ بازار کی طلب پر۔ شرح سُود اونچی کرنے کے بعد ایک دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ جنوری ۱۹۵۲ء میں بِل مارکٹ اسکیم شروع کی گئی۔ اِس اسکیم کے تحت ریزرو بینک نے کچھ شرائط کے تحت کمرشل بینکوں کو ان کے میعاد ادائیگی والے بلوں (USANCE BILLS) کو ۳ فی صدی سُود پر قبول کرنے کی سہولت دی۔ یہ شرح سُود بینک کی شرح سے ۱/۲ فی صدی کم تھی۔ اِس باب کے آخر میں ہم بِل مارکٹ اسکیم پر تفصیلی بحث کریں گے

جس زمانے میں بینک کی شرح میں اِضافہ کیا گیا عین انھیں دنوں کوریا کی لڑائی کی گرم بازاری مدھم پڑگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سٹہ بازوں اور ذخیرہ اندوزوں نے مال نکالنا شروع کردیا۔ بازار میں چیزوں کی بھرمار ہونے کی وجہ سے قیمتوں کی سطح وقتی طور سے گرگئی۔ فروری ۱۹۵۲ء کی سردبازاری اِسی کا نتیجہ تھی۔ حکومت نے فوری اقدام کے لیے سردبازاری کی روک تھام کی اور ۱۹۵۲ء کے آخر تک قیمتیں ٹھہر گئیں۔

(ب) **مئی ۱۹۵۷ء میں بینک کی شرح میں تبدیلی :** ۱۶ مئی ۱۹۵۷ء میں مرکزی بجٹ کے پارلیمنٹ میں پیش ہونے کے ساتھ ہی ریزرو بینک نے سُود کی شرح ۱/۲ ۳ فی صدی سے بڑھاکر ۴ فی صدی کردی۔ سُود کی شرح میں اِضافہ نہ صرف بہ لحاظ میزانیہ بلکہ بازارِ زر کے لحاظ سے بھی اہم تھا۔ ۱۹۵۷-۵۸ء کے بجٹ کی ٹیکس کی پالسی دوسرے پلان کی مالیاتی ضروریات کے پیشِ نظر بنائی گئی تھی۔ محصُول کی شرح میں اِضافے اور بالواسطہ دوسرے طریقوں سے ٹیکسی آمدنی اور غیر ٹیکسی آمدنی بڑھانے کی کوشش سے معیشت میں مزید افراطِ زر کی توقع تھی۔ اِس لیے حکومت نے ریزرو بینک کی مدد سے بینک ریٹ میں اِضافہ کیا تاکہ افراطِ زر کا سدِباب کیا جاسکے۔ ریزرو بینک کو ۱۹۵۶ء کے ایکٹ کے تحت یہ اختیار حاصل ہی تھا کہ وہ کمرشل بینکوں کا محفوظ رقم کا تناسب گھٹا بڑھا سکتا تھا۔ ۱۹۴۹ء کے بینکنگ کمپنیز ایکٹ کے تحت ریزرو بینک کو قرض کی قسم منتخب کرنے کے اختیارات

حاصل تھے۔ چنانچہ اب ریزرو بینک کا بنیادی مقصد سکّے کے پھیلاؤ پر قابو رکھنا ہوگیا۔ دوسرے پلان کے دوران توسیع پر قابو رکھنے میں بینک کی اونچی شرح سود نے یقیناً ایک نمایاں رول ادا کیا

بینک ریٹ کیوں کیوں بڑھایا گیا اور اِس کا اعلان ۱۹۵۷-۵۸ء کے بجٹ کے وقت کیوں کیا گیا؛ اوّل تو اگر ہم بِل مارکٹ اسکیم کے میعادِ ادائیگی والے بِلوں کی شرح کا گہرا جائزہ لیں تو بینک کی بلند ترین شرح کے سبب کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ۱۹۵۲ء میں جب بِل مارکٹ اسکیم شروع کی گئی تو میعاد ادائیگی والے بلوں کی شرح ۳ فی صدی تھی۔ مارچ ۱۹۵۶ء میں یہ شرح ۳ فی صدی سے بڑھا کر ۳½ فی صدی اور نومبر ۱۹۵۶ء میں ۳¾ فی صدی کر دی گئی۔ بِل پر اسٹامپ ڈیوٹی بھی کافی بڑھا دی گئی۔ مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ فروری ۱۹۵۷ء کی اِن بِلوں کی واقعی شرح ۴ فی صدی پر پہنچ گئی۔ یہ دراصل بینک ریٹ بڑھانے کا پیش خیمہ تھا۔

فروری ۱۹۵۷ء سے سنٹرل بینک شیڈیولڈ بینکوں کو جو قرض دیتا تھا اُس پر سُود کی شرح چار فی صدی اور بعض صورتوں میں اس سے زیادہ تھی۔ یہ شرح شیڈیولڈ بینکوں کے قرضوں کے لیے ہے جو یہ ریزرو بینک سے سرکاری سیکیورٹیوں یا میعاد ادائیگی والے بِلوں پر لیتے ہیں۔ اِس کو عموماً ریزرو بینک کا لِنڈنگ ریٹ (LANDING RATE) یا قرض دینے کی شرح کہا جاتا ہے۔ فروری ۱۹۵۷ء سے یہ لِنڈنگ ریٹ ۴ فی صدی تھا جبکہ سرکار تخلیق کردہ روپے پر اور اُن وقتی سرکاری بلوں پر جو ریزرو بینک کے حق میں فروخت کیے جاتے تھے، سود دینے کی شرح ۳½ فی صدی تھی۔ سود لینے اور دینے کی شرح میں یہ فرق زیادہ عرصے تک نہیں چل سکتا تھا کیونکہ یہ مرکزی بینکی اصولوں کے منافی تھا۔ ریزرو بینک صرف موقعے کا اِنتظار کر رہا تھا کہ جب دونوں شرحوں کو برابر کر دیا جائے، یا دوسری تمام شرحوں کے ساتھ مستحکم رشتہ قائم ہو سکے۔ چنانچہ مئی ۱۹۵۷ء کو بینک ریٹ بڑھا کر ۴ فی صدی کر دیا گیا اور لیے جانے والے اور دیے جانے والے سود کی شرح کا فرق ختم کر دیا گیا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ زرِ مبادلہ کی نازک صورتِ حال کے زمانے میں بینک ریٹ کو حرکت میں لانے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ دوسرے پلان کے دوسرے سال میں داخل ہونے کے ساتھ ہی یہ اندازہ ہوگیا کہ زرِ مبادلہ کی صورت نمایاں طور سے بگڑ گئی تھی۔ قدرتاً حکومت نے عالمی بینک سے زیادہ سے زیادہ اِمداد حاصل کرنے کی پوری کوشش کی۔ عالمی بینک کے ماہرین جو دوسرے پلان کے شروع ہوتے وقت ہندوستان آئے تھے انھوں نے پلان کی وجہ سے افراطِ زر پیدا

ہونے کے اِمکان کے بارے میں اپنا ڈر ظاہر کیا تھا۔ اِس کا یہ مطلب تھا کہ اگر ہمیں عالمی بینک سے نئے قرض لینے تھے تو ہمیں بینک کو یقین دلانا تھا کہ ہماری مالیاتی اور سکّہ جاتی پالسی میں افراطِ زر کو ردّ کرنے کی مؤثر ترکیبیں موجود ہیں۔ اِسی لیے ۵۷-۱۹۵۶ء کے بجٹ میں ٹیکس کی ایسی تجاویز شامل تھیں جن کا مقصد لوگوں کے صَرف کو کم کرنا اور اُن کی فاضل قوتِ خرید کو اُن سے لے لینا تھا۔ افراطِ زر کو روکنے کی اِس قسم کی سکّہ جاتی پالسی کے اعلان کے ساتھ اسی کے مطابق اُس مالیاتی پالسی کو بھی عمل میں لایا گیا جس کا محور بینک کی اونچی شرح تھی۔

جیسے جیسے معیشت پر دباؤ بڑھا طریقہ یہ اپنایا گیا کہ ریزرو بینک کے دیے ہوئے قرض پر سود کی تعزیری شرح برابر بڑھائی جاتی رہی۔ یہ اعلان کیا گیا کہ یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء سے شیڈیولڈ بینک ریزرو بینک سے اپنی معینہ شرح رقم سے زیادہ قرض بینکی شرح پر نہ حاصل کرسکیں گے۔ ہر بینک کے لیے قرض کا کوٹا مقرر کر دیا گیا۔ یہ کوٹا ہر بینک کی اُس اوسط ریزرو کا ۵۰ فی صدی تھا جو اُنھیں پچھلے ہفتے میں ریزرو بینک کے پاس رکھنا تھا۔ اِس کا بھی لحاظ ہوتا تھا کہ ایکٹ کی اصل دفعات کے تحت کتنی رقم ریزرو رکھی گئی۔ مقررہ کوٹے اور ۲۰۰ فی صدی تک کے قرض پر سود کی شرح پلس ایک فی صدی (PLUS 1%) رکھی گئی۔ اِس سے اوپر قرض کے لیے بینک ریٹ پلس ۲ فی صدی رکھا گیا۔ ساتھ ہی بینکوں کو یہ ہدایت جاری کی گئی کہ وہ بھی سود کی شرح بڑھادیں۔ قلیل المیعاد امانت پر سود کی شرح کی حد مقرر کر دی گئی۔ دیے جانے والے قرض پر سود کی شرح ½ فی صدی بڑھادی گئی اور کم سے کم شرح ۵ فی صدی رکھی گئی۔ قلیل المیعاد امانت پر دیے جانے والے سود کی زیادہ سے زیادہ شرح ۲ فی صدی رکھی گئی۔ قرض کو کنٹرول کرنے کا یہ سہ منزلہ طریقہ جولائی ۱۹۶۲ء تک جاری رہا۔ جس کے بعد اس میں تبدیلی کی گئی۔

(ج) اکتوبر ۱۹۶۰ء اور جولائی ۱۹۶۲ء میں جاری کیے گئے اقدام: یہ سہ منزلہ نظام یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء میں جاری کیا گیا اور ۲ جولائی ۱۹۶۲ء کو اِس میں تبدیلی کی گئی۔ اِس نظام کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیڈیولڈ بینکوں کو ریزرو بینک سے ملنے والے قرض کی قیمت ۶۲-۱۹۶۰ء کے دوران برابر بڑھائی جاتی رہی جس کی وجہ سے عام شرح سود چڑھتی رہی۔

(د) جنوری ۱۹۶۳ء میں بینک ریٹ میں تبدیلی: ۲ جنوری ۱۹۶۳ء میں کاروبار بند ہونے کے وقت سے بینک ریٹ ۴ فی صدی سے بڑھا کر ½ ۴ فی صدی کر دیا گیا۔ اِس اضافے کا مقصد اس شرح سود کو ایک باقاعدہ شکل دینا تھا جو سلیب ریٹ سسٹم کی مسلسل ترمیم کی وجہ سے

پیدا ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی سہ منزلہ سلیب ریٹ کو دو منزلہ بنا کر آسان کر دیا گیا۔

سہ منزلہ سسٹم کے تحت جو ۲ر جولائی ۱۹۶۲ء سے ۲ر جنوری ۱۹۶۳ء تک جاری رہا کوئی بینک اپنی قانونی ریزرو کے ۱۰۰ فی صدی تک قرض لے سکتا تھا۔ اس کو بنیادی کوٹا کہتے تھے۔ شرح سود یہ تھی:

شرح	قرض کا کوٹا
۴ فی صدی	قانونی ریزرو کے ۲۵ فی صدی تک
۵ " "	" " " اگلے ۲۵ فی صدی تک
۶ " "	" " " " " ۵۰ " " " "

۴ر جنوری ۱۹۶۳ء سے جو دو منزلہ نظام وجود میں آیا اس کے تحت کوئی بینک اپنے قانونی ریزرو کے ۱۰۰ فی صدی تک مندرجہ ذیل شرح پر قرض لے سکتا تھا:

۴½ فی صدی	قانونی ریزرو کے ۵۰ فی صدی تک
۶ " "	" " " اگلے ۵۰ فی صدی تک

ریزرو بینک نے اکتوبر ۱۹۶۰ء اور جولائی ۱۹۶۲ء میں ہدایت جاری کر کے شیڈیولڈ بینکوں کو دیے جانے والے قرض کے لیے سود کا سہ منزلہ نظام جاری کیا جس کا مقصد قرض پر کچھ پابندیاں عائد کر کے معیشت کو استحکام دینا تھا۔ دو منزلہ نظام کے تحت ریزرو بینک سے شیڈیولڈ بینکوں کو ملنے والے قرض کی قیمت کم و بیش جیوں کی تیوں باقی رہی کیونکہ سہ منزلہ نظام میں شیڈیولڈ بینکوں کو قرض کے پہلے ۲۵ فی صدی کے سلیب پر ۴ فی صدی اور اگلے ۲۵ فی صدی پر ۵ فی صدی سود دینا ہوتا تھا جبکہ اب انھیں ان دونوں سلیبوں پر ۴½ فی صدی دینا تھا۔ قانونی ریزرو سے آگے قرض کے مزید کوٹے کے لیے سود کی تعزیری شرح ۶½ فی صدی رکھی گئی۔

بینک ریٹ میں ½ فی صدی کا اضافہ اس زمانے میں کیا گیا جب بازارِ زر میں برابر سختی پیدا ہو رہی تھی اور مابین بینک قرضوں کے سود کی شرح ۵ فی صدی ہو گئی تھی۔ یہ صورت ۱۹۶۲ء کے مندے زمانے میں بھی کچھ دنوں باقی رہی لیکن بینک ریٹ اور ریزرو بینک سے شیڈیولڈ بینکوں کو ملنے والے قرض کی شرحوں کے نظام میں تبدیلی کے ذریعے مہنگے روپے کے لیے زمین ہموار کی جارہی تھی۔

(۵) ستمبر ۱۹۶۴ء اور فروری ۱۹۶۵ء میں بینک ریٹ کی تبدیلیاں: مجموعی طلب مجموعی رسد سے کافی زیادہ تھی اور قیمتیں تیزی سے چڑھ رہی تھیں۔ چنانچہ ۵ مہینوں کے اندر دو بار بینک

ریٹ بڑھایا گیا۔ عین اُس زمانے میں جب طلب کی زیادتی سے ہماری ترقی کی شرح کو نقصان پہنچ رہا تھا اور ترقی ایسے حلقوں میں ہو رہی تھی جو سماجی اعتبار سے کم ضروری تھے، ہم نے قیمتوں کو بہت زیادہ بڑھنے سے روکنے کے لیے مہنگے روپے (یعنی مہنگا قرض) کی پالیسی کو اپنایا۔

ریزرو بینک نے ۲۵ ستمبر ۱۹۶۴ء کو کاروبار بند ہونے کے وقت سے بینک ریٹ ۴ ½ فی صدی سے ۵ فی صدی کر دیا۔ بینک کے اِس اقدام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قیمتوں میں بے حد اضافے کی وجہ سے بینک کو تشویش بڑھ گئی تھی لیکن ساتھ ہی ریزرو بینک کو عام بینکوں کی موسمی ضروریاتِ قرض بھی پوری کرنی تھیں چنانچہ اُس نے وہ قاعدہ ختم کر دیا جس کے تحت بینک اپنے مقررہ کوٹے کے مطابق ریزرو بینک سے قرض لے سکتے تھے۔ اس کی جگہ پر قرض کا نیا نظام جاری کیا گیا جس کے تحت معیشت کو زیادہ سود پر ریزرو بینک کی ڈِس کاؤنٹ کی سہولتیں حاصل رہیں۔ سود کی ایک تفریقی شرح مقرر کی گئی جس کے تحت قرض لینے والے بینکوں کو ریزرو بینک کو بتدریج زیادہ سود ادا کرنا پڑتا تھا۔ اِس شرح کا انحصار اس پر تھا کہ قرض لینے والے بینکوں کی نقد پزیری کس حد تک متاثر ہے۔ سود کی تفریقی شرح کو مؤثر بنانے کے لیے ریزرو بینک نے یہ بھی کیا کہ بینکوں کو اجازت دی کہ بڑے ہندوستانی اور بیرونی بینک جو قرض دیں اُس پر ۹ فی صدی تک سود مقرر کر سکتے تھے۔

ستمبر ۱۹۶۴ء کی اسکیم کے تحت بینک ریزرو بینک کی تفریقی شرح سود پر جتنی رقمیں قرض لے سکتے تھے وہ بینکوں کی نقد پزیری کے تناسب پر مبنی تھیں۔ اس اسکیم کے تحت ایک بینک کی نقد پزیری معلوم کرنے کے لیے یہ دیکھا جاتا ہے کہ اُس بینک کی کتنی نقد رقم ریزرو بینک اور دوسرے شیڈیولڈ بینکوں کے پاس ہے، دوسرے بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ میں اس بینک کے حق میں کتنا بیلنس ہے، بینک کی کتنی رقم سرکاری سیکیوریٹیوں میں لگی ہے۔ اِس مجموعے میں سے وہ رقمیں نکال دی جاتیں جو بینک نے ریزرو بینک یا دوسرے بینکوں سے قرض لے رکھی تھیں۔ بقیہ رقم بینک کی نقد پزیری ظاہر کرتی ہے۔ جب تک کسی بینک کی نقد پزیری کا تناسب ۲۸ فی صدی تک ہے وہ بینک ۵ فی صدی شرح سود پر جتنا چاہے قرض لے سکتا ہے لیکن اِس نقد پزیری میں ہر ایک فی صدی کی تخفیف کے ساتھ بینک کے لیے ہوئے تمام قرض پر سود کی شرح ½ فی صدی بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ اِس نظام کے تحت اگر نقد پزیری ایک فی صدی گھٹتی ہے تو نہ صرف نئے قرض پر ½ فی صدی سود کا اِضافہ ہو جاتا ہے بلکہ اِس سے پہلے جو قرض کم سود پر لیا گیا تھا اُس پر بھی نئی شرح سے سود عائد

ہوتا ہے۔

۱۷ فروری ۱۹۶۵ء کو ریزرو بینک نے پھر بینک ریٹ بڑھاکر ۵ فی صدی سے ۶ فی صدی کر دیا۔ قرض مہنگا کرنے کی اِس پالیسی سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ بینک کو قیمتوں کی طرف سے تشویش تھی۔ اناج کی متوقع پیداوار میں کافی اضافے کے باوجود فروری ۱۹۶۵ء میں قیمتیں پچھلے سال سے ۱۶ فی صدی زیادہ تھیں۔

فروری ۱۹۶۵ء میں بینک ریٹ میں اضافے کے ساتھ ریزرو بینک کی طرف سے شیڈیولڈ بینکوں کو دیے جانے والے قرض کے سُود کی تفریقی شرح میں بھی تبدیلی کی گئی۔ ستمبر ۱۹۶۴ء کی اسکیم کے تحت جب تک کسی بینک کی نقد پزیری ۲۸ فی صدی تھی وہ ریزرو بینک سے قرض بینک ریٹ پر حاصل کر سکتا تھا۔ اب نقد پزیری کی حد ۲۸ فی صدی سے بڑھاکر ۳۰ فی صدی کر دی گئی۔ اِس نقد پزیری میں ہر ایک فی صدی کی کمی پر مجموعی قرض پر شرح سُود ½ فی صدی بڑھ جاتی تھی۔

توقع تھی کہ بینک ریٹ میں اِس اضافے سے سُود کی شرحوں کے سارے نظام میں نمایاں اضافہ ہو جائیگا۔ یہ بھی امید تھی کہ سُود کی عام شرح میں اضافے کی وجہ سے بچت کی ترغیب ہوگی اور محدود وسائل کی تقسیم زیادہ کفایت کے ساتھ اور نفع بخش طریقے سے کی جائیگی اور ایسے پروجکٹ ملتوی کر دیے جائیں گے جن سے صرف واجبی منافع کی توقع ہوگی اور اس اقدام کی وجہ سے مؤثر طلب اور قیمتوں میں متناسب کمی واقع ہوگی۔ بدقسمتی سے یہ توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ یاد رہے کہ جس ملک میں نظامِ زر کمزور ہوتا ہے وہاں بینک ریٹ کے اثرات محدود ہوتے ہیں۔ قرض کا کافی بڑا حصّہ اُس حلقے سے آتا ہے جو نظامِ زر سے باہر ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں سکّہ جاتی کنٹرول کی عام ترکیبیں مؤثر نہیں ہوتیں جب تک ضروری سکّہ جاتی پالیسی نہ اپنائی جائے اور مادّی کنٹرول کے اقدام نہ کیے جائیں۔

(و) مارچ ۱۹۶۸ء میں بینک ریٹ میں تبدیلی: ۶۹-۱۹۶۸ء کے بجٹ میں وزیر مالیات نے معیشت کو تقویت دینے اور تشکیل زر کی ہمت افزائی کے لیے مالی محرکات کا اعلان کیا۔ ساتھ ہی ریزرو بینک نے سکّہ جاتی میدان میں ضروری اقدام کیے تاکہ قرض کچھ کم شرح سُود پر دستیاب ہو سکے۔ چنانچہ ۲ مارچ ۱۹۶۸ء کو بینک ریٹ ۶ فی صدی سے گھٹاکر ۵ فی صدی کر دیا گیا۔ اسی کے مطابق دوسرے سودوں کی شرح میں بھی کمی کی گئی۔ یہ اقدام اس عام پالسی کے عین مطابق تھے جس کا مقصد مالیاتی اور سکّہ جاتی اقدام کے ذریعے اقتصادی بحالی تھا۔ یہ اقدام

خصوصاً اِس لیے اور بھی مناسب تھا کہ ۱۹۶۷-۶۸ء میں زراعتی پیداوار بڑھی تھی۔

ریزرو بینک کی ہدایات کے مطابق ان ۷۴ کمرشل اور شیڈیولڈ بینکوں نے، جو بینک ریٹ کے معاہدے میں شریک ہیں، ۷ مارچ ۱۹۶۸ء سے اُس شرح سُود میں ½ فی صدی کی کمی کر دی جو ۹۱ دن سے زیادہ جمع کی گئی رقموں پر دیتے تھے۔ اسٹیٹ بینک آف انڈیا نے ۱۱ مارچ ۱۹۶۸ء سے دیے جانے والے قرض پر سود کی شرح ½ فی صدی گھٹا دی۔ مرکزی حکومت نے بھی یکم اپریل ۱۹۶۸ء سے ڈاک خانوں میں جمع کی گئی رقموں پر سود کی شرح میں ½ فی صدی کی کمی کا اعلان کر دیا۔ مختصر یہ کہ ریزرو بینک کی خواہش کے مطابق سود کی تمام شرحوں میں ایک سے لے کر ½ فی صدی کی کمی واقع ہوگئی۔ ہندوستان میں ۱۹۵۴-۶۲ء کے دوران قیمتوں میں ہر سال اوسطاً ۶ فی صدی سے لے کر ۷ فی صدی کا اضافہ ہوا تھا۔ اِس دوران بینک ریٹ ۳½ فی صدی اور ۴ فی صدی کے درمیان رہا تھا۔ لوگوں کی بچت کی استعداد پر شدید دباؤ تھا۔ سود کی شرح اِتنی کم تھی کہ جو لوگ اپنی فاضل رقم بینک میں جمع کر سکتے تھے اُن کے لیے کوئی محرک نہیں تھا۔ مرکزی بجٹ میں جن مالی اقدام کا اِعلان کیا گیا تھا وہ بھی بچت کے لیے سازگار نہیں تھے۔ اتنی کم شرح سُود پر بینک میں روپیہ جمع کرنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ جن لوگوں کے پاس روپیہ تھا وہ اپنی رقم شیر خریدنے، شہروں کی زمینیں خریدنے اور مکانات کی تعمیر پر صرف کرنا زیادہ نفع بخش سمجھتے تھے کیونکہ اس طرح اُن کے اصل کی قیمت میں اِضافہ ہوتا رہتا تھا جو افراطِ زر کے نقصان کے خلاف ایک طرح کی ضمانت تھی۔

ان رجحانات کو روکنے کے لیے ریزرو بینک نے ستمبر ۱۹۶۴ء اور فروری ۱۹۶۵ء کے دوران سود کی شرح میں اِضافہ کر کے مہنگے قرض کی پالسی پر عمل کیا لیکن ۱۹۶۶-۶۷ء میں سرد بازاری کے آثار ظاہر ہونے کی وجہ سے بعض بنیادی صنعتوں کو زائد استعداد کے مسئلے سے دوچار ہونا پڑا جس کے نتیجے کے طور پر انھیں اپنی پیداوار کم کرنی پڑی۔ صنعتی سرد بازاری اور سرمائے کے بازار کی بے اعتباری کی وجہ سے زمینوں اور مکانات میں روپیہ لگانا کچھ زیادہ نفع بخش نہیں رہا۔ صورت حال اِس کی متقاضی تھی کہ سود کم کر کے قرض کو سستا کیا جائے تاکہ سرمائے کے بازار کو تقویت دینے کے لیے ضروری محرکات مہیا ہو سکیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ہندوستان میں مہنگے قرض کی پالسی بھی ۱۹۶۶-۶۷ء کے افراطِ زر پر قابو نہ پا سکی۔ اِس مدّت میں قیمتوں میں ۱۲ فی صدی سے لے کر ۱۴ فی صدی تک کا اِضافہ ہوا۔ اِن حالات میں ۶ فی صدی بینک ریٹ بھی ذخیرہ اندوزی اور سٹے بازی کے رجحانات کو روکنے

کے لیے ناکافی تھا۔ ۶۷-۱۹۶۶ء کے دوران افراطِ زر کی حالت میں سرد بازاری کے آثار ظاہر تھے چنانچہ حکومت کو ۶۹-۱۹۶۸ء کے بجٹ میں اس سرد بازاری کے خلاف اقدامات کا اعلان کرنا پڑا۔ اس طرح ہم دیکھیں گے کہ بینک ریٹ کی کمی کو باقی اقدام سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا بلکہ اس کو اُن تمام مالی اقدام کے ساتھ دیکھنا ہوگا جو سرمائے کے بازار کو تقویت دینے کے لیے تھے اور جن کا اعلان بجٹ میں کیا گیا تھا۔ اِن مالیاتی اقدام میں یہ باتیں شامل تھیں: ڈیویڈنڈ ٹیکس ختم کردیا گیا۔ اینوٹی ڈپازٹ اسکیم ترک کردی گئی۔ کمپنیوں کے منافع پر سرٹیکس ۳۵ فی صدی سے گھٹاکر ۲۵ فی صدی کردیا گیا اور بعض مصنوعات پر ترقیاتی چھوٹ دی گئی۔

اس بات کی پھر بھی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ بینکوں سے کم سُود پر قرض دستیاب ہونے کی وجہ سے یہ ساری رقم پیداآور کاموں میں لگائی جائیگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سستے قرض سے غیر پیداآور اور سٹّے بازی کے کاموں میں مدد ملے بلکہ خطرہ یہ ہے کہ کہیں سٹّہ بازوں کی ذخیرہ اندوزی کی سرگرمیاں بڑھ نہ جائیں۔

ہندوستان میں زیادہ تر بڑی کمپنیاں سرمایہ حاصل کرنے کے لیے شیر جاری کرنے کے مقابلے میں قرض لینے کو ترجیح دیتی ہیں۔ ہماری موجودہ شرح سود نسبتاً کم ہونے کی وجہ سے اِس نامناسب رجحان کو تقویت پہنچاسکتی ہے جس کے تحت شیر جاری کرنے پر قرض کو ترجیح دی جاتی ہے اور کمپنیاں نئے شیر نہیں جاری کرتیں اور قرض لے کر اپنا کام نکال لیتی ہیں۔ اِس رجحان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشی قوت چند ہاتھوں میں مرتکز ہوگی اور چند بڑے کاروباری لوگ زیادہ تر کاروبار پر حاوی ہوجائیں گے۔

آخر میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر شرح سود کم ہوتی ہے تو بینکوں میں رقم جمع کرنا کم نفع بخش ہوجاتا ہے اور اداروں جن کے پاس یہ رقمیں جمع کی جاتی ہیں ان رقموں کو سرکاری سکٹر کے بانڈوں میں لگانا کم نفع بخش پاتے ہیں۔ ایک عام رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ اگر بانڈوں پر سود کی شرح نسبتاً کم ہوتی ہے تو سرمایہ پبلک سکٹر سے ہٹ کر نجی سکٹر کی طرف راغب ہوجاتا ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ یہ سرمایہ جائز طریقوں سے اور پیداآور کاموں میں لگایا جائے۔ شروع میں تو ممکن ہے کہ اِن بچتوں سے بانڈ اور شیر خریدے جائیں لیکن خطرہ یہ ہوتا ہے کہ آخر میں یہ سرمایہ شہری عمارتوں، زمینوں اور اناج کے ذخیروں جیسی غیر پیداآور شکل نہ اختیار کرلے۔ اگر ایسا ہوا اور ساتھ ہی افراطِ زر میں مزید اضافہ ہوا تو بینک ریٹ میں خفیف اضافہ ضروری ہوجاتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اس وقت ہندوستان کو نہ پورے طور پر مہنگے قرض کی پالسی کی ضرورت ہے اور نہ

روایتی سستے قرض کی پالیسی کی۔ ہمیں بیچ کا راستہ اپنانا چاہیے اور سود کی ایک ایسی لچکدار شرح رکھنی چاہیے جس کے ذریعے ہم افراطِ زر اور کساد بازاری دونوں رجحانات کا مقابلہ کرسکیں۔

۱۹۵۶ء کے ایکٹ کے تحت ریزرو بینک کے نئے اختیارات اور ذمہ داریاں

قرض کی انتخابی پالیسی کی طرف رجحانات

دوسرے پلان کے دوران قرض کی توسیع پر قابو رکھنے کی ضرورت کے پیش نظر ۱۹۳۴ء کے ریزرو بینک ایکٹ میں ۱۹۵۶ء میں ترمیم کی گئی۔ نئے ایکٹ کے تحت ریزرو بینک کو ایک طرف تو وہ اختیارات مل گئے جو نئے نوٹ چھاپنے کی لچکدار پالیسی کے لیے ضروری تھے، دوسری طرف وہ اختیارات جن سے وہ خسارے کے بجٹ کے نتائج سے نپٹ سکے اور کمرشل بینکوں کے بے روک قرض دینے کے اختیارات پر قابو رکھ سکے۔ ۱۹۵۶ء کے ترمیمی ایکٹ نے ریزرو بینک کو اس قابل بنایا کہ وہ دوسرے پلان کے بنیادی مقاصد سے ہم آہنگ ہوسکے اور تیز معاشی ترقی کے لیے مالیاتی اور سکہ جاتی ڈھانچہ فراہم کرسکے۔ ذیل میں ۱۹۵۶ء کے ایکٹ کی بنیادی دفعات دی جاتی ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس حد تک یہ دفعات ضابطہ بند سکہ جاتی توسیع کا دور شروع کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔

(۱) زیادہ نوٹ چھاپنے کے لیے ضروری ریزرو کا اہتمام ——— ۱۹۳۴ء کے ایکٹ کے تحت ریزرو بینک کے لیے اپنے کُل اثاثے کا ۲/۵ حصہ سونے اور سونے کے سکّوں اور بیرونی سیکیورٹیوں کی شکل میں رکھنا لازمی تھا۔ یہ بھی ضروری تھا کہ سونے اور سونے کے سکّوں کی قیمت ۴۰ کروڑ روپے سے کم نہ ہونے پائے۔ دوسرے پلان میں ترقیاتی مصارف کے جو نشانے مقرر کیے گئے تھے اور انھیں پورا کرنے کے لیے جس پیمانے پر ڈیفیسٹ فائنانس کی ضرورت تھی اُس کے پیش نظر یہ پابندیاں غیر معمولی حد تک زیادہ تھیں۔ دوسرے پلان کے دوران بھاری صنعتوں کو ترجیح دینے کی وجہ سے زرِ مبادلہ اور سونے پر سخت دباؤ پڑنے کی توقع تھی لیکن اس کے باوجود یہ بھی ضروری تھا کہ پلان کے پُرحوصلہ پروگراموں کی تعمیل کے لیے نوٹ چھاپے جائیں۔ ان حالات میں ۱۹۳۴ء کے ایکٹ میں تبدیلی لانا ضروری تھا جس کے تحت ریزرو بینک کی سکہ جاتی توسیع کی صلاحیت محدود تھی۔

سنہ۱۹۵۶ء کی ترمیم کے تحت ۱۱۵ کروڑ روپے کے نقد سونے اور سونے کے سکے کا ریزرو رکھنا ضروری تھا۔ اِس شرط کو پورا کرنے کے لیے ریزرو بینک کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ اپنے سونے اور سونے کے سکے کے ذخیرے کی قیمت کو ۲۱ روپے ۳ آنے ۱۰ پائی فی تولہ کے بجائے ۶۲ روپے ۸ آنے فی تولہ کے حساب سے لگائے۔ ذخیرے کے تعین کے لیے اِس نئے فارمولے نے جادو کا کام کیا اور ریزرو بینک کے سونے کے ذخیرے کی قیمت ۴۰ کروڑ سے بڑھ کر ۱۱۵ کروڑ ہوگئی۔ اِس طرح توقع کی گئی کہ دوسرے پلان کے خسارے کی پالسی اِس ۱۱۵ کروڑ روپے کے سونے اور بیرونی سیکیورٹیوں کے بل پر چلائی جاسکے گی۔ سنہ۱۹۵۶ء کی ترمیم میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی کہ ریزرو بینک کی بیرونی سیکیورٹیاں کسی بھی صورت میں ۳۰۰ کروڑ کے بقدر سے کم نہیں ہوں گی۔ زرمبادلہ کی بگڑتی ہوئی صورت کے پیشِ نظر ایک اور بھی اقدام عمل میں آیا جو کم اہم نہیں ہے۔ ۳۱ اکتوبر سنہ۱۹۵۷ء کو صدر جمہوریہ نے ایک آرڈیننس جاری کیا جس کے تحت ریزرو بینک ایکٹ میں فوری ترمیم ہوگئی تاکہ بیرونی سکّوں کے ریزرو میں کمی کی جاسکے۔ اب ریزرو بینک کے لیے صرف ۲۰۰ کروڑ کے بقدر ریزرو رکھنا ضروری تھا جس میں سے ۱۱۵ کروڑ کی مالیت کا سونا ہونا چاہیے۔ اب تک ریزرو بینک ایکٹ سنہ۱۹۵۶ء کی دفعہ ۴ کے مطابق سونے اور بیرونی سیکیورٹیوں کے کم سے کم ریزرو کی الگ حدیں مقرر تھیں۔ بینک کو ۱۱۵ کروڑ کے بقدر سونا اور ۴۰۰ کروڑ کے بقدر بیرونی سیکیورٹیاں رکھنا ضروری تھا۔ ناگزیر حالات میں ۴۰۰ کے بجائے ۳۰۰ کروڑ کے بقدر سیکیورٹیاں رکھنے کی اجازت تھی۔ آرڈیننس کے نتیجے کے طور پر اگرچہ سونے کے ریزرو کی کم سے کم حد وہی قائم رہی لیکن بیرونی سیکیورٹیوں کی حد ۸۵ کروڑ کے بقدر کردی گئی۔ ہمارا خیال ہے کہ حکومت کو یہ اقدام پہلے کرنا چاہیے تھا۔ اگست سنہ۱۹۵۷ء میں جب حکومت نے ریزرو بینک کو ۶ مہینوں کے لیے اِس بات کی اجازت دی کہ بیرونی سیکیورٹیاں گھٹا کر ۴۰۰ کے بجائے ۲۰۰ کروڑ کی جاسکتی ہیں اُسی وقت اگر یہ اقدام پورا کر لیا گیا ہوتا تو اس سے حکومت کی دُور اندیشی، ذہانت اور سربراہی کی صلاحیت کا ثبوت ملتا اور بار بار پالسی بدلنے کی وجہ سے جو بداعتمادی پیدا ہوئی وہ نہ ہوتی۔

(۲) **کمرشل بینکوں کے ریزرو کے تناسب میں ردوبدل** — سنہ۱۹۱۳ء میں جب امریکہ میں فیڈرل ریزرو سسٹم قائم ہوا اُس وقت سے سنٹرل بینکوں کے لیے کم سے کم کیش بیلنس رکھنے کا قاعدہ عام ہوگیا ہے۔ شیڈیولڈ بینکوں کے لیے نقد کی کم سے کم ریزرو رکھنا چونکہ لازمی ہے اِس لیے اس کم سے کم رقم کو گھٹا بڑھا کر ان بینکوں کی طرف سے دیے جانے والے قرض کی رقم کو

مؤثر طریقے سے کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ ریزرو کے تناسب کو گھٹا بڑھا کر قرض کو کنٹرول کرنے کا طریقہ امریکہ کے سنٹرل بینک نے شروع کیا تھا اور اس کا مقصد معاشی ترقی کے عمل کے دوران امریکی معیشت کو استحکام دینا تھا۔ اس طریقے کو اگر ڈھنگ سے استعمال کیا جائے تو ریزرو بینک قرض اور سکے کا ضابطہ بند پھیلاؤ عمل میں لا سکتا ہے اور معاشی ترقی کے عمل کے دوران مالی استحکام قائم رکھنے میں مدد کر سکتا ہے۔

ریزرو بینک آف انڈیا کی اصل دفعات کے تحت شیڈیولڈ بینکوں کو اپنی میعادی اور غیر میعادی امانتوں کا کم سے کم ۲ فی صدی اور ۵ فی صدی نقد ریزرو بینک کے پاس قائم رکھنا لازمی تھا۔ ۱۹۵۶ء کی ترمیم سے ریزرو بینک کو یہ اختیار مل گیا کہ وہ اس تناسب کو میعادی امانتوں کے لیے ۲ فی صدی سے لے کر ۸ فی صدی کے اندر اور غیر میعادی امانتوں کے لیے ۵ فی صدی سے ۲۰ فی صدی کے اندر گھٹا بڑھا سکتا تھا۔ ریزرو بینک کو یہ بھی اختیار تھا کہ وہ کسی مقررہ تاریخ سے فاضل قبول کی جانے والی امانتوں پر مزید ریزرو طلب کر سکتا تھا۔ یہ زائد ریزرو امانت کا ۱۰۰ فی صدی تک ہو سکتا تھا لیکن بحیثیت مجموعی یہ ریزرو میعادی امانتوں کے لیے ۸ فی صدی اور غیر میعادی امانتوں کے لیے ۲۰ فی صدی کے اندر رہنا چاہیے۔

ریزرو کے تناسب میں کمی بیشی کے اختیار کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ریزرو بینک شوقیہ اس کا استعمال کرنے پر راغب رہا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے جیسا بعد کے واقعات سے ظاہر ہوا کہ یہ قرض کی مؤثر پالیسی کا ایسا آلہ کار بن سکتا ہے جس کا مقصد افراطِ زر کا تدارک اور قرض کی ضابطہ بند توسیع ہو۔ قرض کے پھیلاؤ کے معاملے میں ریزرو بینک جس پالیسی پر عمل پیرا رہا ہے اُس سے یہ پورے طور پر ثابت ہو گیا کہ ریزرو بینک قرض کے پھیلاؤ پر قابو رکھنے کے نئے اور پرانے طریقے برتنے پر تلا ہوا ہے۔ اِس سلسلے میں مزید معلومات آگے چل کر دی گئی ہیں۔

(۳) **منتخب ضابطہ بند قرض کا تجزیہ** ---- ایک کم ترقی یافتہ ملک میں منتخب ضابطہ بند قرض کی پالیسی کو ایک متوازن ترقیاتی پروگرام کے تحت ہی اپنایا جا سکتا ہے۔ ایک ترقی پذیر معیشت جو ترکیبی تبدیلیوں سے گزر رہی ہو اُس میں آئے دن نئے نازک موقعے آتے ہیں۔ ملک کے سنٹرل بینک کو فوراً ان نازک موقعوں کا اندازہ ہونا چاہیے اور اُن آلات کو استعمال کرنے پر آمادہ رہنا چاہیے جن کے ذریعے اِن پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ ان تبدیلیوں سے نپٹنے کے لیے ترکیبوں کے کارگر ہونے کا زیادہ اِمکان ہے جو ایسی ضرورتوں کے لیے مخصوص ہوں

ایک تغیر پزیر معیشت کے لیے سنٹرل بینکنگ کی بینک ریٹ اور اوپن مارکٹ آپریشن جیسی کاروائیاں موزوں نہیں ہوتیں کیونکہ ان سے ایک طرح کا انتخابی رویّہ جھلکتا ہے۔ مختصر یہ کہ قرض کے پھیلاؤ کو قابو میں رکھنے کے لیے انتخابی آلات کی اہمیت اِس لیے نمایاں ہوگئی ہے کیونکہ معیشت کے حساس مقامات کو دبانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہمارے جیسے کم ترقی یافتہ ملک میں ترقیاتی منصوبوں کی وجہ سے سرکاری صَرفہ میں نمایاں اِضافہ ہوا ہے۔ قرض کے پھیلاؤ کے انتخابی طریقے اِس لیے بھی ضروری ہیں کیونکہ ان کے ذریعے افراطِ زر کے دباؤ کو روکا جاسکتا ہے۔ تجارتی حلقے کے سرمایہ کارانہ مصارف قیاسی طلب سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اِس لیے قرض کے پھیلاؤ پر قابو رکھنے کے انتخابی اقدام بہت مفید ہوتے ہیں۔ کم یاب اشیا کی سٹے بازانہ ذخیرہ اندوزی سے قیمتیں اور بھی چڑھ جاتی ہیں اور ایک ترقی پزیر معیشت پر اِن کا شدید دباؤ پڑتا ہے چنانچہ یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ انتخابی اقدام کے ذریعے ایسے قرضوں کو تو روکا جائے جو سٹہ بازانہ ذخیرہ اندوزی کے لیئے بینک سے لیے جاتے ہیں لیکن دوسرے کاموں کے لیے قرض دستیاب رہے۔

پچھلے بارہ برسوں سے ریزروبینک افراطِ زر کے آثار کو روکنے کے لیے منتخب قرض کے طریقوں پر تجربہ کرتا رہا ہے۔ یہ تجربہ ۱۹۵۶ء کے وسط سے شروع ہوا اور اب تک جاری ہے۔ اِس مدت میں منتخب قرض کی پالیسی کی ایک واضح نوعیت رہی ہے جس کا بنیادی مقصد اناج کی سٹے بازی کو روکنے کے لیے مختلف تدابیر عمل میں لانا رہا ہے۔ بدقسمتی سے اِس پالیسی کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ معیشت میں دباؤ کے نکات اب بھی نمایاں ہیں اور اناج کی ذخیرہ اندوزی اب بھی کی جاتی ہے۔ اِس کا ایک سبب یہ ہے کہ ہمارے کمرشل بینک قرض کی مختلف پالیسی کی دفعات پر عمل کرنے میں بیشتر ناکام رہے ہیں، خصوصاً اُن دفعات پر جن کا تعلق قرض کو معیّنہ سطح تک کم کرنے سے ہے لیکن ناکامی کی عام وجہ یہ ہے کہ منتخب قرض کی پالیسی پر اس وقت تک عمل نہیں کیا جاسکتا جب تک قرض کی مجموعی مقدار پر مؤثر پابندی نہ عائد ہو۔ ہندوستان میں اب تک یہ ہوتا رہا ہے کہ منتخب قرض کی پالیسی پر عمل تو کیا گیا لیکن اس کے لیے وہ ماحول نہیں پیدا کیا گیا جس کے لیے قرض پر عام پابندی عائد کرنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اقدام سے صرف محدود کامیابی حاصل ہوئی۔

مئی اور ستمبر ۱۹۵۶ء کے دوران ریزروبینک نے دھان اور چاول کی ضمانت پر دیے

جانے والے قرض کو محدود کرنے کے لیے شیڈیولڈ بینکوں اور دُوصوبوں سے متعلق نان شیڈیولڈ بینکوں کو ہدایات جاری کیں۔ اِن ہدایات کے ذریعے پہلی بار قرض کی منتخب پالسی شروع کی گئی جس کا مقصد اناج، دال اور سوتی کپڑے سے متعلق قرض پر پابندی لگانا تھا۔ جون ۱۹۵۶ء میں ریزرو بینک نے شیڈیولڈ بینکوں کو نئی ہدایات جاری کیں جن کے تحت اناج کی ضمانت پر دیے جانے والے قرض پر کم از کم ۴۰ فی صدی کی گنجائش رکھنا لازمی قرار دیا گیا۔ اناج کی ضمانت پر دیے جانے والے قرض سے متعلق اس ہدایت کے ساتھ جون ۱۹۵۷ء میں ریزرو بینک نے ایک اور ہدایت جاری کی جو شکر اور دوسری اشیائے خوردنی سے متعلق تھی۔ اناج سے متعلق ہدایات کا کوئی خاص نتیجہ نہیں برآمد ہوا تھا لیکن شکر سے متعلق ہدایت کامیاب ثابت ہوئی۔ یکم جولائی ۱۹۵۷ء کو ریزرو بینک کے گورنر نے تمام کمرشل بینکوں سے قرض کی مقدار گھٹانے کی اپیل کی۔ اور بینکوں کے قرض کی سطح نیچی کرنے میں ان کا تعاون چاہا تاکہ خود ریزرو بینک سے طلب کیے جانے والے قرض کی مقدار کم کی جاسکے۔ اِس اپیل کا اخلاقی اثر یہ پڑا کہ قرض کی قسم پر پابندی کی پالسی عمل میں آئی جو منتخب قرض کے ممد کی حیثیت سے اب تک جاری ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ۱۹۴۹ء کے بینکنگ کمپنیز ایکٹ کے سکشن ۲۱ کے تحت ریزرو بینک کو یہ اختیار حاصل ہے کہ یہ قرضوں پر انتخابی اور نوعیتی پابندیاں عائد کرسکتا ہے۔

اگرچہ انتخابی قرض کی پالسی کو صرف معمولی کامیابی ہوئی تاہم ریزرو بینک افراطِ زر کے اُن رجحانات کو روکنے کے لیے اِن اقدام پر زور دیتا رہا جو اشیا کی ذخیرہ اندوزی سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ ستمبر ۱۹۵۷ء کی ہدایت کے مطابق منفرد شیڈیولڈ بینکوں کو گیہوں کی ضمانت پر پچھلے سال کی اسی مدت کی اوسط کے ۲/۳ ۶۶ اور دوسرے اناجوں کی ضمانت پر اس اوسط کے ۸۰ فی صدی سے زیادہ قرض دینے کی اجازت نہیں تھی۔ اِس کے بعد ریزرو بینک کی منتخب قرض کی پالسی جو اب تک اناج کے لیے تھی، مونگ پھلی کی ضمانت پر قرض کی مد اسٹاک کی قیمت ۴۵ فی صدی مقرر کی گئی۔ آگے چل کر دوسرے روغنی بیجوں کو بھی اِس پالسی کے تحت لے آیا گیا۔

مختصر یہ کہ انتخابی قرض کی پالسی بیشتر تجارتی کاموں کے لیے قرض دینے کے سلسلے میں استعمال کی گئی۔ فیکٹریوں کو دیے جانے والے قرض کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ سامان کی نقل و حرکت کے لیے جو قرض دیا جاتا ہے وہ بھی اِس قاعدے کے تحت نہیں لایا گیا اسی طرح روغنی بیجوں جیسی اشیا کی برآمد کرنے والوں کو بھی رعایت دی گئی۔

فروری ۱۹۶۱ء میں ریزرو بینک نے دو نظر ثانی شدہ ہدایات بینکوں کے گورنروں کو جاری کیں۔ ایک ہدایت اناج کی ضمانت پر دیے جانے والے قرض سے متعلق تھی، دوسری ہدایت مونگ پھلی اور دوسرے روغنی بیجوں سے متعلق تھی۔ پہلی ہدایت میں گیہوں کو اس لیے نہیں شامل کیا گیا کیونکہ گیہوں سے متعلق قرض پر پابندی مئی ۱۹۶۰ء میں ختم کر دی گئی تھی۔ دوسری ہدایت کے ذریعے روغنی بیجوں سے متعلق فروری اور مئی ۱۹۶۰ء کی ہدایات کو رد کر دیا گیا۔ اس سے پہلے دسمبر ۱۹۶۰ء میں ریزرو بینک نے ایک ہدایت کے ذریعے شکر کی ضمانت پر دیے جانے والے قرض کو ۴۵ فی صدی سے گھٹا کر ۲۵ فی صدی کر دیا تھا لیکن اپریل ۱۹۶۱ء میں شکر کی رسد بہتر ہو جانے کی وجہ سے ۲۵ فی صدی کی شرط واپس لے لی گئی۔ مختصر یہ کہ شکر اور گیہوں کی ضمانت پر دیے جانے والے قرض پر سے تمام پابندیاں اپریل اور مئی ۱۹۶۱ء تک اٹھالی گئیں۔

دسمبر ۱۹۶۰ء میں ریزرو بینک نے جوٹ اور جوٹ کی بنی اشیا کی ضمانت پر دیے جانے والے قرض پر انتخابی قرض کے قواعد عائد کر دیے لیکن بعد میں جب یہ اندازہ ہو گیا کہ جوٹ کی صنعت نے نارمل طریقے سے کام کرنا شروع کر دیا ہے اور خام مال کی رسد تشفی بخش ہے تو اگست ۱۹۶۱ء میں جوٹ اور جوٹ کی بنی اشیا پر سے پابندی ہٹالی گئی۔

۶۴-۱۹۶۳ء کے دوران انتخابی قرض کی پالیسی جاری رہی اگرچہ وقتاً فوقتاً حالات کے مطابق اس میں ترمیمیں کی جاتی رہیں، مثلاً گوداموں کی رسید کی ضمانت پر دیے جانے والے قرض اور شکر اور روغنی بیج کی ضمانت پر قرض کے قاعدوں میں ترمیمیں کی گئیں۔ گوداموں کی رسید کو پہلی بار انتخابی قرض کی پالیسی کے تحت لایا گیا تھا۔ ۱۹۶۳ء میں شکر کی پیداوار کم ہونے کی وجہ سے شکر کی قیمتیں مستحکم ہو گئی تھیں اور تاجر بڑی مقدار میں شکر کی ضمانت پر قرض طلب کر رہے تھے چنانچہ اپریل ۱۹۶۳ء میں شیڈیولڈ بینکوں کو ہدایت جاری کر کے انتخابی قرض کے قواعد دوبارہ نافذ کیے گئے۔ جہاں تک روغنی بیجوں کا تعلق تھا سستے داموں روغنی بیج کی رسد کی وجہ سے ان کی ضمانت پر قرض پر سے پابندیوں کو ختم ہو جانے دیا گیا اور اب مونگ پھلی اور روغنی بیجوں پر صرف ۴۵ فی صدی اور ۴۰ فی صدی کی شرط باقی رکھی گئی۔

اپریل اور اگست ۱۹۶۴ء میں اناج کی قیمتوں میں کافی اضافے کی وجہ سے اور ان اشیا کی سٹے بازی کو روکنے کی غرض سے اپریل ۱۹۶۴ء کی ہدایات میں ترمیم کی گئی اور ان کی ضمانت پر دیے جانے والے قرض سے متعلق ترمیم شدہ ہدایات اگست ۱۹۶۴ء میں جاری کی گئیں۔ ان ہدایات کے

مطابق اناج کی ضمانت پر دیے جانے والے قرض پر ۳۵ فی صدی کے مارجن کو بڑھا کر ۵۰ فی صدی اور گوداموں کو رسید پر دیے جانے والے قرض کے مارجن کو ۲۵ فی صدی سے بڑھا کر ۴۰ فی صدی کر دیا گیا۔

ضروری اشیا کی قیمتوں کو قابو میں رکھنے کی غرض سے ریزرو بینک نے ۱۹۶۵-۶۶ء کے دوران اناج، روغنی بیجوں اور بناسپتی کے بارے میں انتخابی قرض کی پالسی زیادہ سخت کر دی۔ اس دوران جن اشیا کی ضمانت پر قرض کی بالائی حد مقرر کی گئی وہ یہ تھیں (۱) مئی ۱۹۶۵ء میں چاول اور دھان پر (۲) جولائی ۱۹۶۵ء میں مونگ پھلی پر اور (۳) اگست ۱۹۶۵ء میں گیہوں اور دوسرے اناج پر۔ روغنی بیجوں اور بناسپتی کی ضمانت پر قرض کی بالائی حد پہلی بار مقرر کی گئی تھی لیکن روغنی بیجوں سے مونگ پھلی اور بنولے (COTTON SEED) کو مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔ اگست ۱۹۶۵ء میں روئی اور کپاس کی ضمانت پر دیے جانے والے قرض پر مارجن کا قاعدہ عائد کیا گیا۔ اس قاعدے سے صرف وہ قرض مستثنیٰ تھا جو سوتی کپڑوں کی ملوں کو دیا جائے۔

۱۹۶۷-۶۸ء کے دوران ریزرو بینک نے آہستہ آہستہ کچھ فصلی اشیا پر انتخابی قرض کی پالسی نرم کر دی۔ یہ خاص کر روغنی بیجوں اور مونگ پھلی کے ساتھ کیا گیا چونکہ توقع تھی کہ ۱۹۶۷-۶۸ء میں مونگ پھلی کی فصل بہت اچھی ہوگی اور روغنی بیجوں خصوصاً سرسوں کی پیداوار میں بھی خاصہ اضافہ ہوگا اس لیے ریزرو بینک نے جنوری ۱۹۶۸ء میں کارخانوں کو دیے جانے والے قرض پر پابندی ہلکی کر دی۔

جوٹ سے بنی چیزوں کی قیمتیں تیزی سے بڑھنے کے پیش نظر اکتوبر ۱۹۶۸ء میں ریزرو بینک نے ان اشیا کی ضمانت پر قرض کی پابندیاں عائد کر دیں۔ دیسی روئی کی رسد بہتر ہو جانے کی وجہ سے نومبر ۱۹۶۸ء کے آخر میں ریزرو بینک نے دیسی روئی اور کپاس پر سے کافی پابندیاں ہٹا لیں۔ چونکہ ۱۹۶۸-۶۹ء کے دوران روغنی بیجوں کی پیداوار کم ہونے کی توقع تھی اور قیمتیں بڑھنے کا امکان تھا اس لیے نومبر ۱۹۶۸ء میں ریزرو بینک نے شیڈیولڈ بینکوں کو ان اشیا کی ضمانت پر قرض کا مارجن ۱۰ فی صدی بڑھانے کی ہدایت کی۔

اس موقعے پر قرض کی اس نئی پالسی کا ذکر کرنا ضروری ہے جس کے تحت قرض کی پالسی کو منتخب قرضوں کے لیے نرم کر دیا گیا ہے۔ ۲۰ نومبر ۱۹۶۵ء کو حکومت نے اس پالسی کا اعلان کیا۔ یہ اعلان ۱۹۶۵-۶۶ء کی فصل کے لیے تھا، یعنی نومبر ۱۹۶۵ء سے اپریل ۱۹۶۶ء تک کے لیے۔

اِس پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ قرض کے ان نئے مطالبات کو منضبط کیا جائے جن کا دباؤ معیشت پر پڑ رہا تھا۔ چنانچہ ریزرو بینک نے شیڈیولڈ بینکوں کے ذریعے دیے جانے والے بعض قرضوں پر پابندی نرم کر دی، مثلاً دفاعی رسد کے سلسلے میں دیے جانے والے قرض، مال برآمد کرنے والوں کو پیکنگ کے لیے قرض اور غلّے کی خریداری کے لیے سرکاری ایجنسیوں کو دیے جانے والے قرض۔ اِن قرضوں کے لیے ریزرو بینک نے بینک ریٹ پر مالی وسائل فراہم کرنے کا وعدہ کیا لیکن دوسرے کاموں کے لیے دیے جانے والے قرض کو مہنگا کر دیا گیا۔ ریزرو بینک نے بینکوں کو یہ بھی ہدایت کی کہ کسی پارٹی کو بھی ایک کروڑ سے زیادہ قرض دینے سے پہلے اس کی منظوری لی جائے۔

منتخب قسم کے قرضوں کے لیے نرمی کی یہ پالیسی جاری رکھی گئی اور نومبر ۱۹۶۶ء سے اپریل ۱۹۶۷ء تک فصل کے زمانے میں یہ نرمی قرض کی پالیسی کی ایک نمایاں خصوصیت رہی۔ اِس پالیسی کا اعلان ریزرو بینک نے اکتوبر ۱۹۶۶ء میں کیا۔ اِس کا مقصد شرح تبادلہ کم کرنے اور پیداوار اور برآمدات میں اضافے کی توقع کی وجہ سے پیدا ہونے والی صورتِ حال سے نپٹنا تھا۔ چونکہ زراعتی پیداوار کچھ بہتر ہوئی تھی اور درآمدات کی پالیسی قدرے نرم کر دی گئی تھی اِس لیے خام مال، کل پرزوں اور آلات کی درآمد بڑھ گئی تھی جس پر قابو رکھنا ضروری تھا۔ مختصر یہ کہ ۶۷-۱۹۶۶ء کی قرض کی پالیسی کا مقصد صنعتوں کو مالی وسائل فراہم کرنا تھا تاکہ یہ اپنی استعداد کو پورے طور سے بروئے کار لا سکیں اور صوبائی حکومتوں کی مدد کرنا تھا تاکہ یہ اناج کی خریداری کا پروگرام پورا کر سکیں۔ پہلے کی طرح ۶۸-۱۹۶۷ء میں بھی قرض کی یہی پالیسی قائم رہی۔ ریزرو بینک نے اعلان کیا کہ ری فائنانس کی سہولت بعض منتخب حلقوں کے قرض پر دی جائیگی۔ یہی پالیسی ۶۹-۱۹۶۸ء میں جاری رہی۔

منتخب قرض کی پالیسی کی کامیابی کا جہاں تک تعلق ہے ہمارا تجزیہ دوسرے ملکوں سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ ان پابندیوں کا اثر محدود ہوتا ہے اور جو کامیابی ہوتی بھی ہے وہ منتخب قرض اور عام قرض پر پابندیوں کا مِلا جُلا نتیجہ ہوتی ہے۔ منتخب قرض کی پالیسی قرض کی عام پالیسی کے ساتھ مل کر ہی مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ بہرحال بہت سے موقعوں پر ان اقدام سے فائدہ پہنچا ہے مثلاً مختلف اشیا کی ذخیرہ اندوزی روکنے کے سلسلے میں یہ عام رجحان ہوتا ہے کہ فصل کم ہونے کی صورت میں لوگ زیادہ منافعے کی توقع میں ذخیرہ کر لیتے ہیں اور یہ ذخیرہ بینک سے لیے گئے

قرض کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں بینک کے بے روک ٹوک قرض فراہم کرنے کی وجہ سے قیمتیں بڑھ جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی صنعتیں مشکل میں پڑ جاتی ہیں جو مونگ پھلی جیسی خام اشیا خریدتی ہیں یا برآمداتی اور صرفی اشیا بناتی ہیں۔ ایسی صورت میں قرض کے پھیلاؤ پر پابندی مفید ثابت ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ زائد طلب کی وجہ سے پیدا ہونے والے افراطِ زر کی صورت میں ایسا ہو سکتا ہے کہ کافی عرصے تک اسٹاک کی حرکت کی ایک ہی سمت قائم رہے اور ان اشیا کی ضمانت پر قرض کو منضبط کرنا ضروری ہو جو معیشت کے لیے اہم ہوں اگرچہ بذاتِ خود ان اقدام کی تاثیر محدود ہوتی ہے۔

(۴) ۱۹۶۰ء میں قرض کی سختی —— ریزرو بینک نے ۱۹۶۰ء کے دوران دو اہم اقدام کیے، ایک تو قرض کے کنٹرول کا مقداری طریقہ اور دوسرا انتخابی طریقہ۔ مارچ ۱۹۶۰ء میں ریزرو بینک نے شیڈیولڈ بینکوں کو ہدایت جاری کی کہ پریفرنس شیر کے علاوہ بقیہ شیروں کی ضمانت پر ۵ ہزار سے زیادہ کے قرض پر کم از کم ۵۰ فی صدی کا مارجن رکھیں۔ اِس کے علاوہ بینکوں کے بدلے (CARRY FORWARD) کا براہِ راست کاروبار ممنوع قرار دیا گیا اور صاف قرضوں (CLEAN LOANS) کے لیے پہلی بار بالائی حد مقرر کی گئی۔

ساتھ ہی ۱۹۶۰ء میں پہلی بار قانونی محفوظ رقم کے تناسب کو گھٹانے بڑھانے یا بینک کی امانت میں اضافے کو منضبط کر لینے کے اختیارات استعمال کیے گئے۔ ۴ مارچ ۱۹۶۰ء کو بینکوں کو ریزرو بینک کے پاس مزید بیلنس رکھنے کی ہدایت کی گئی۔ اِس کے مطابق بینکوں کو ۱۱ مارچ ۱۹۶۰ء تک زائد مجموعی قرض کا ۲۵ فی صدی بیلنس ریزرو بینک کے پاس رکھنا ضروری تھا۔ ۵ مئی ۱۹۶۰ء کو دوبارہ ہدایات جاری کی گئیں جن کے مطابق بینکوں کو ۶ مئی تک کے زائد مجموعی قرض پر ۵۰ فی صدی مزید بیلنس ریزرو بینک کے پاس رکھنا تھا۔ اِس طرح بینکوں کو ریزرو بینک کے پاس جو رقمیں رکھنی ضروری تھیں۔ وہ یہ تھیں: ۱۱ مارچ ۱۹۶۰ء کو بینکوں کے پاس عند الطلب امانت (DEMAND LIABLITIES) کی جو مجموعی رقم تھی اُس کا ۵ فی صدی، ۱۱ مارچ اور ۶ مئی کے درمیان امانت میں جتنا اضافہ ہوا تھا اُس کا ۲۵ فی صدی، ۶ مئی کے بعد جو اضافہ ہوا تھا اُس کا ۵۰ فی صدی۔ لیکن بینکوں کو بحیثیت مجموعی جو محفوظ رقم ریزرو بینک کے پاس جمع کرنی تھی وہ عند الطلب امانت کی ۲۰ فی صدی سے زیادہ نہیں ہونی تھی۔ یہی شرائط میعادی امانتوں پر بھی عائد کی گئیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کے لیے بنیادی شرح ۲ فی صدی اور

بالائی حد ۸ فی صدی رکھی گئی تھی۔ جنوری ۱۹۶۱ء میں بازارِ زر میں شدید تنگی تھی۔ ریزرو بینک نے ۱۳ر جنوری ۱۹۶۱ء سے امانت کو ضبط کرنے کے قاعدے منسوخ کر دیے۔ ۱۹۶۲ء کے ترمیمی ایکٹ کے پاس ہونے کے بعد سے شیڈیولڈ بینکوں کو ریزرو بینک کے پاس اپنی عند الطلب اور میعادی امانتوں کا ۳ فی صدی رکھنا پڑتا ہے جبکہ پہلے میعادی امانت کا ۲ فی صدی اور عند الطلب امانت کا ۵ فی صدی رکھنا پڑتا تھا۔ لیکن ریزرو بینک کا یہ حق برقرار رکھا گیا کہ وہ اس تناسب کو بڑھا سکتا ہے یا زائد امانتوں کو ۱۰۰ فی صدی تک معطل کر سکتا ہے۔

ایک ترقی پذیر معیشت میں دباؤ کے جو نکتے نمودار ہوتے ہیں ان میں سے بعض پر محفوظ رقم کا تناسب گھٹا بڑھا کر اور ساتھ ہی انتخابی قرض کی پالیسی عمل میں لاکر قابو پایا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں مل کر سٹے بازاری اور افراطِ زر کی قوتوں سے فوراً نپٹ لیتی ہیں لیکن قرض کے کنٹرول کی پالیسی بذاتِ خود افراطِ زر کو روک کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ ہمارے جیسے کم ترقی یافتہ ملک میں افراطِ زر پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ قرض کی پالیسی اور مالیاتی پالیسی میں ہم آہنگی ہو، دونوں ایک دوسرے کی ممد ہوں، دونوں کا رخ ایک ہو اور ساتھ ہی افراطِ زر پر قابو پانے کے دوسرے طریقے بھی اختیار کیے جائیں۔

مختصر یہ کہ ترقیاتی منصوبہ بندی کے دوران ریزرو بینک کا بنیادی مقصد نقد وسائل کے زیادہ سے زیادہ حصے کو اپنے قابو میں کر لینا ہوتا ہے تاکہ ان اشیا پر طلب کا دباؤ کم کیا جا سکے جن کی رسد نسبتاً کم ہے۔ اِس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ سکّے کے پھیلاؤ پر قابو رکھا جائے۔ یہ اقدام برابر کیے جا رہے ہیں لیکن اِس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ قرض کی پابندیوں کی وجہ سے پیداوار اور فروخت کے کاموں میں رخنہ نہ پڑے۔ غرضیکہ ان حالات میں ریزرو بینک کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ قرض کا پھیلاؤ اور زر کی رسد میں اِتنا اعتدال رکھا جائے کہ صنعت اور تجارت کی جائز ضروریات پوری ہوتی رہیں سٹے اور غیر پیداآور کاموں کے لیے قرض نہ استعمال کیا جا سکے۔ اِسی لیے ریزرو بینک نے اپنی حالیہ پالیسی کو منضبط توسیع کا نام دیا ہے۔

ہندوستانی بازارِ زر اور ریزرو بینک کی منضبط توسیع کی پالیسی

ہندوستانی بازارِ زر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اِس کی دو قسمیں ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے یہاں دو واضح قسم کے بازار ہیں، ایک منظم اور دوسرا غیر منظم۔ منظم بازار

کے تحت ریزرو بینک، اسٹیٹ بینک، جوائنٹ اسٹاک بینک اور غیر ملکی بینک آتے ہیں۔ نیم سرکاری ادارے، سرمایہ لگانے والے نجی ادارے، سرکاری لائف انشیورنس کارپوریشن اور بڑی جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں بھی بازارِ زر میں قرض فراہم کرنے کے کام انجام دیتی ہیں۔ ان کے علاوہ عام قسم کے غیر بینکی مالیاتی بچولے (MIDDLE MEN) بھی ہوتے ہیں، مثلاً قرض دلانے والے دلال اور اسٹاک بروکر اور مخصوص قسم کی ہائر پرچیز (HIRE PURCHASE) کمپنیاں بلڈنگ سوسائٹیاں، چٹ فنڈ وغیرہ۔ غیر منظم بازار میں تمام دیسی ساہوکار اور مہاجن شامل ہیں۔ مختصر یہ کہ ہندوستان کا بازارِ زر دو خانوں میں تقسیم ہے، ایک وہ جس کا تعلق کمرشل بینکنگ سے ہے اور دوسرا وہ جو دیسی ساہوکاروں پر مشتمل ہے جو صدیوں سے یہ کاروبار کرتے چلے آئے ہیں۔ ان متعدد بازاروں میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنا بے حد ضروری ہے۔ ریزرو بینک نے منظم اور غیر منظم سکٹر میں بل مارکٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ غیر منظم سکٹر میں یہ کوشش بالکل ناکام رہی اور منظم سکٹر میں بھی صرف محدود کامیابی حاصل ہوئی۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۲ء کے درمیان ریزرو بینک نے دیسی ساہوکاروں سے ربط پیدا کرنے کی کوشش کی جو اس لیے ناکام رہی کیونکہ دیسی ساہوکار اپنے غیر بینکی کاروبار سے دست بردار ہونے اور ریزرو بینک کو حسابات جانچنے کا حق دینے پر رضامند نہیں تھے۔ نجی ساہوکاروں سے صرف اس حد تک رابطہ قائم کیا جا سکا کہ نان شیڈیولڈ بینکوں کی طرح انھیں بھی ترسیل (REMITTANCE) کی سہولتیں دے دی گئیں۔ حال میں ۱۹۶۳ء کے بینکنگ لاز کے تحت ریزرو بینک کو اُن تمام اداروں کو منضبط کرنے کا حق دے دیا گیا ہے جو پبلک سے امانتیں قبول کرتے ہیں۔ ان اداروں میں دیسی مہاجن بھی شامل ہیں۔ غیر منظم سکٹر کے برعکس منظم سکٹر میں ہم دیکھتے ہیں کہ کمرشل بینکنگ کے نظام میں توسیع اور یک جہتی کی وجہ سے حال میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ چھوٹی صنعتوں کو قرض کی سہولتیں بہم پہنچانے کی اسٹیٹ بینک کی کوشش کی وجہ سے توقع ہے کہ قرض لینے والے اُس طبقے کو بھی ملنے لگیں گی جو اب تک محروم ہے۔

بازارِ زر کی ان خصوصیات کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ ترقی ہو رہی ہے اور ساتھ ہی افراطِ زر کے بھی آثار نمایاں ہیں یہ ضروری ہے کہ مالیاتی پالیسی اِک رُخی نہ ہو۔ بہ الفاظ دیگر ہندوستانی معیشت کے موجودہ حالات میں منضبط مالیاتی توسیع ناگزیر ہے۔ ہماری معیشت ایک ایسی معیشت ہے جس میں ایک طرف تو روپے کو ملک کے پیداواری وسائل کے تیز استعمال پر مرتکز کرنا ہے اور دوسری طرف اِس استعمال سے پیدا ہونے والے افراطِ زر کے رجحان کو قابو میں

رکھنا ہے نومبر ۱۹۵۱ء میں منتخب قسم کے قرضوں کو آسان کرنے کی جو پالسی ریزرو بینک نے شروع کی تھی اور جس پر اب بھی عمل ہو رہا ہے، وہ اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ جس وقت اس پالسی کی تشکیل کی گئی اس وقت صورت حال یہ تھی کہ فصل بہت خراب ہوئی تھی، زرمبادلہ کی حالت نازک تھی، بیرونی خام مال اور آلات کمیاب تھے اور ضرورت اس بات کی تھی کہ دفاعی پیداوار تیز کی جائے اور برآمدات بڑھائی جائیں۔ چنانچہ اس پالسی کا مقصد دفاعی ضرورتوں برآمدات اور غذا کے لیے زیادہ سے زیادہ وسائل فراہم کرنا اور ساتھ ہی غیر ضروری کاموں کے لیے قرض کی فراہمی کو کم کرنا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ دفاع، برآمدات اور غذا کو ترجیح دی گئی اور ان کاموں کے لیے قرض کی دستیابی آسان کی گئی لیکن غیر ترجیحی سکٹر کے لیے قرض بدستور مہنگا رہا اور دقتیں برقرار رہیں۔

مختصر یہ کہ منضبط توسیع کی پالسی کی بنیاد یہ ہے کہ روپے اور قرض کی رسد کو اس طرح بڑھایا جائے کہ ساری جائز ضروریات پوری ہو سکیں تاکہ ملک کی ترقیاتی اور دفاعی کوششوں میں وسائل کی کمی کی وجہ سے رخنہ نہ پڑے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ قرض کی سہولتیں پیداآور حلقے کو دی جائیں اور غیر پیداآور حلقے کو نہ دی جائیں۔ اِسی لیے قرض کے کنٹرول کے مقداری آلات کے ساتھ انتخابی قرض کے اقدام ضروری ہوتے ہیں۔

ریزرو بینک کی بِل مارکٹ اسکیم

بل مارکٹ اسکیم پر بحث کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ایک ہنڈی (کمرشل بِل) کیسے وجود میں آتی ہے۔ اِس کی وضاحت ایک مثال کے ذریعے آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ فرض کیجیے کوئی چینی مِل کسی تھوک فروش کے ہاتھ تین ماہ کے قرض پر شکر فروخت کرتی ہے۔ چینی مِل تھوک فروش کے نام بِل جاری کرتی ہے جسے تھوک فروش قبول کر کے دستخط کر دیتا ہے۔ یہ بِل یا ہنڈی ایک حقیقی فروخت کا نتیجہ ہے جو معینہ مدّت پر خود کیش ہو جائیگی اور جس کی پُشت پر فروخت شدہ مال کی ضمانت ہے۔ اب اگر چینی مل کو تین ماہ سے پہلے نقد کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ کمرشل بینک سے اِس ہنڈی کو کیش کرنے کی درخواست کریگا۔ اگر چینی مِل اور تھوک فروش دونوں کی ساکھ اچھی ہے تو بینک اُس کو کیش کر دیگا۔ خود کمرشل بینک اگر اُس ہنڈی کو کیش کرانا چاہے تو ری ڈسکاونٹ کے لیے سنٹرل بینک کو پیش کر سکتا ہے۔

(الف) ہندوستان میں بِل مارکٹ کی راہ میں رکاوٹیں: ریزرو بینک نے

جنوری ۱۹۵۲ء میں بل مارکٹ اسکیم شروع کی۔ اِس سے پہلے ہندوستان میں بلوں کو ڈسکاؤنٹ کرنے کا رواج عام نہیں تھا۔ ۱۹۳۵ء میں ریزرو بینک کے قیام کے بعد بھی مختلف وجوہ سے بل مارکٹ کو فروغ نہ ہوسکا۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ ریزرو بینک صرف مصدقہ ضمانت پر قرض دیتا تھا اور بل کا کاروبار کرنے کے لیے شیڈیولڈ بینکوں کی براہِ راست ہمت افزائی نہیں کرتا تھا۔ خود شیڈیولڈ بینک اپنے بل امپیریل بینک کو ڈسکاؤنٹ کے لیے پیش نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ امپیریل بینک پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے کہ اُن کا بلوں کا کاروبار کتنا ہے۔ اِس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ بلوں کے ری ڈسکاؤنٹ کا کام صرف امپیریل بینک کرتا تھا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں بلوں کا فقدان تھا۔ بیشتر کاروبار زراعتی پیداوار کا تھا اور مناسب گودام کی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے زرعی بل بڑی تعداد میں جاری کرنا ناممکن تھا۔ اِس کے علاوہ ہمارے یہاں مالی وسائل کی طلب موسمی ہوتی ہے اور ایک ہی زمانے میں بیک وقت ملک کے مختلف حصوں میں مالی وسائل کی ضرورت ہونے کی وجہ سے ایک حلقے کے وسائل دوسرے حلقے کی ضرورت پورا کرنے کے لیے نہیں استعمال کیے جاسکتے۔ بلوں کے فقدان کی ایک وجہ کمرشل بینکوں کا رویّہ ہے جو عموماً سنہری سیکیورٹیاں (GILL-EDGED) حاصل کرکے اپنی نقد پزیری کو تقویت دینے کی فکر میں رہتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد بہت سے صوبوں میں بینکی بحران آیا جس کا اثر نئے بلوں کے اجرا پر پڑنا ناگزیر تھا۔

تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ملک میں ہُنڈیاں مختلف قسم کی اور مختلف زبانوں میں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے بل مارکٹ کی صحت مند تنظیم اور ترقی میں رخنہ پڑتا ہے۔ اِس کے علاوہ بلوں پر اسٹامپ کی اُونچی شرح بھی بل مارکٹ کی ترقی میں مانع ہے۔

(ب) بل مارکٹ اسکیم: نومبر ۱۹۵۱ء میں بینک ریٹ ۳ فی صدی سے بڑھا کر ۳ ½ فی صدی کرنے کے ساتھ ساتھ ریزرو بینک نے بل مارکٹ قائم کرنے پر سنجیدگی سے غور کیا چنانچہ جنوری ۱۹۵۲ء میں بل مارکٹ اسکیم تیار ہوگئی۔ پہلے اس کو صرف تجربے کے طور پر شروع کیا گیا بعد میں یہ ہندوستان کے بازارِ زر کا مستقل فیچر بن گئی۔

اِس اسکیم کے بنیادی خدوخال وہی تھے جو ریزرو بینک کے قیام سے پہلے بلوں کے کاروبار میں پائے جاتے تھے۔ اُس زمانے میں بھی امپیریل بینک زیادہ کاروبار کے موسم میں اُن اندرونی ہُنڈیوں کی ضمانت پر کرنسی ڈپارٹمنٹ سے قرض لے سکتا تھا جن کا اجرا حقیقی تجارت کے سلسلے میں

مالی وسائل فراہم کرنے کے لیے ہوتا تھا۔ پہلے سال یہ اسکیم ان شیڈیولڈ بینکوں تک محدود رکھی گئی جن کے پاس دس کروڑ یا زیادہ کی امانتیں جمع تھیں۔ بلوں کے ذریعے کاروبار کی ہمت افزائی کی غرض سے ریزرو بینک نے ان قرضوں پر بینک کی شرح سے ½ فی صدی کم سود لینے کا فیصلہ کیا یعنی ۳½ فی صدی کے بجائے ۳ فی صدی۔ بعد میں اِس شرح میں ¼ فی صدی کا اضافہ دو بار کیا گیا اور اس کے بعد مئی ۱۹۵۱ء میں بینک ریٹ بھی بڑھا دیا گیا۔ بل مارکٹ اسکیم کے ابتدائی دور میں ریزرو بینک نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ قرض لینے والے بینکوں کو اِن بلوں کو ادائیگی کے بلوں میں تبدیل کرنے کے لیے جو اسٹامپ ڈیوٹی دینی ہوگی اُس کی نصف ریزرو بینک دے گا۔

(ج) اسکیم کی توسیع : ۵۳-۱۹۵۲ء میں بل مارکٹ اسکیم موسمی مالی مشکلات رفع کرنے میں کامیاب رہی۔ چنانچہ جون ۱۹۵۲ء میں ریزرو بینک نے اِس اسکیم کو وسعت دی اور اُن شیڈیولڈ بینکوں کو اس کے تحت لے آیا گیا جن کی امانت ۵ کروڑ یا زیادہ تھی۔ اِس کے بعد اُن بینکوں کو بھی لے آیا گیا جن کو ۱۹۴۹ء کے بینکنگ کمپنیز ایکٹ کے تحت لائسنس مِلا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ منظور شدہ شیڈیولڈ بینک بھی اس اسکیم میں شامل کر لیے گئے۔ اسکیم کے تحت قرض کی کم سے کم رقم ۲۵ لاکھ سے گھٹا کر ۵ لاکھ اور بِل کی کم سے کم رقم ایک لاکھ سے گھٹا کر ۵۰ ہزار کر دی گئی۔ یہ اِس لیے کیا گیا تاکہ چھوٹے بینک بھی اس سہولت سے فائدہ اٹھا سکیں

۱۹۵۵ء کے وسط میں قیمتوں کے بڑھنے کے رجحان کے پیشِ نظر اور اس وجہ سے کہ ۵۶-۱۹۵۵ء کے موسم میں شیڈیولڈ بینکوں نے قرض پھیلا رکھا تھا' ریزرو بینک نے اِس اسکیم کے تحت دی جانے والی رعایتوں کو جاری رکھنا غیر ضروری سمجھا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۵۶ء میں ریزرو بینک نے اسکیم کے تحت دیے جانے والے قرض کے سود کی شرح ½ فی صدی بڑھا کر ۳¼ فی صدی کر دی۔ نومبر ۱۹۵۶ء میں ¼ فی صدی مزید اضافہ کیا گیا اور اس طرح شرح سود ۳½ فی صدی ہو گئی جو سرکاری اور دوسری منظور شدہ سیکیورٹیوں کی ضمانت پر دیے جانے والے قرض پر عائد ہوتی تھی۔ اِسی درمیان اسٹامپ ڈیوٹی کی رعایت بھی واپس لے لی گئی۔ فروری ۱۹۵۷ء میں اسکیم کے تحت قرض لینے کی قیمت عملاً ۴ فی صدی بڑھ گئی کیونکہ تین ماہ کی ادائیگی والے پرامسری نوٹ پر اسٹامپ ڈیوٹی دو آنے فی ہزار سے بڑھا کر ایک روپیہ چار آنے فی ہزار کر دی گئی۔ یہ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ مئی ۱۹۵۷ء کے وسط میں بینک کی شرح ۴ فی صدی کر دی گئی تھی جس کی وجہ سے بینک اِن بلوں پر جو سود لیتے تھے وہ بھی اُسی کے بقدر بڑھ گیا تھا۔ بِل مارکٹ اسکیم کے رفتہ رفتہ بڑھنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ

مئی ۱۹۵۹ء تک اسکیم کے تحت آنے والے بینکوں کی تعداد دوگنی ہو گئی اور ۵۱ تک پہنچ گئی فصلوں کے زمانے میں چونکہ بازار زر کو قلت کا سامنا ہوتا تھا اس لیے روز بروز زیادہ بینک اِس اسکیم میں شریک ہوتے گئے۔

اکتوبر میں پہلی بار ریزرو بینک نے برآمدات کی ہمت افزائی کی غرض سے برآمداتی بلوں کو بھی اس اسکیم کے تحت لانے کا فیصلہ کیا تاکہ مال باہر بھیجنے والوں کو مناسب مالی وسائل فراہم ہوسکیں۔ مارچ ۱۹۶۳ء میں ریزرو بینک نے اکسپورٹ بل کریڈٹ اسکیم شروع کر کے اِس سلسلے میں اہم قدم اٹھایا۔ اس اسکیم کی وجہ سے ریزرو بینک سے لیے جانے والے قرض کی گنجائش بڑھ گئی ہے کیونکہ اب بینک برآمداتی بلوں کی بنیاد پر قرض لے سکتے ہیں۔ بینکوں کو اکسپورٹ بلوں کی بنیاد پر بینک ریٹ پر قرض لینے کی اجازت دے دی گئی لیکن اِس شرط پر کہ یہ بینک برآمد کرنے والوں سے بینک ریٹ سے ½ فی صدی سے زیادہ سود نہ طلب کریں۔ اُس وقت سے یہ سہولت برابر جاری ہے۔ یہ اسکیم صرف اُن شیڈیولڈ بینکوں تک محدود ہے جو بل مارکٹ کی عام اسکیم کے تحت آتے ہیں اور جنھیں زر مبادلہ میں کاروبار کرنے کا حق ہے۔ لیکن اِس خیال سے کہ چھوٹے برآمد کرنے والوں کو بھی اسکیم سے فائدہ پہنچ سکے، بینک کو دیے جانے والے قرض کی کم سے کم رقم ایک لاکھ اور پر امیسری نوٹ کی ۵ ہزار مقرر کی گئی۔ بل مارکٹ کی عام اسکیم کے تحت کم سے کم رقم کی یہ حدیں ۵ لاکھ اور ۵۰ ہزار تھیں۔ ستمبر ۱۹۶۸ء میں ریزرو بینک نے بل مارکٹ اسکیم کو مزید وسعت دی اور فصل کے زمانے میں اُن قرض کے بلوں کو بھی قبول کرنا شروع کر دیا جو شیڈیولڈ بینکوں کو کوآپریٹو بینکوں کو دینے تھے۔ اِس کا مقصد یہ تھا کہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو مالی وسائل فراہم ہوسکیں۔

(د) ہندوستان میں بل مارکٹ کی ترقی کے امکانات: ہندوستان میں بل مارکٹ کی ترقی کے امکانات کو برطانوی تجربے کی روشنی میں دیکھنا مناسب ہوگا۔ برطانیہ میں دوسری جنگِ عظیم کے بعد بینکوں کی شاخوں کے بڑھنے اور تار کے ذریعے ادائیگی کا قاعدہ رائج ہونے کے بعد اندرونی تجارت کے بلوں کا طریقہ ختم ہو گیا لیکن ہندوستان میں نہ بینکوں کی اتنی شاخیں ہیں اور نہ تار کے ذریعے روپے کی منتقلی کا رواج ابھی عام ہوا ہے۔

اس کے علاوہ دیہی علاقوں میں بینکی سہولت ابھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ چنانچہ ایسا لگتا ہے کہ برطانیہ اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں جن قوتوں کے بڑھنے کی وجہ سے بلوں کا کاروبار کم کرتا

ممکن ہوا تھا انھیں ہماری دیہی اور کم ترقی یافتہ معیشت میں مضبوط ہونے میں دیر لگے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ دیہی قرض کی نئی تنظیم اور پانچ سالہ منصوبوں کے دوران دیہی علاقوں میں گوداموں کے قیام سے بل مارکٹ کی ترقی کی بڑی گنجائش ہے جس سے ہماری معیشت کے زراعتی سکٹر کے فصلی مطالبات کو پورا کرنے میں خصوصاً مدد ملے گی۔

(۵) جائزہ ـــــ اب تک ریزرو بینک کی بل مارکٹ اسکیم کی تمام تر توجہ صنعت اور تجارت کی طرف رہی ہے اور اس کا بھی مقصد فصلی مطالبات پورے کرنے رہا ہے۔ اس کے علاوہ اب تک شیڈیولڈ بینکوں کے مقابلے میں ایکسچینج بینک اس اسکیم کے تحت قرض کی سہولت سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک باقاعدہ بل مارکٹ قائم ہو جس کے تحت زراعت، صنعت اور تجارت سب آئیں۔ یہ اسکیم اتنی وسیع ہو کہ اس سے ہر قسم کے واقعی تاجر اور چھوٹے بڑے بینک فائدہ اٹھا سکیں۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ فصلی مطالبات کو پورا کرنے میں جو کامیابی ہوئی ہے اس سے مطمئن ہو کر ہم نہ بیٹھ جائیں گے۔ ریزرو بینک کو ہندوستان میں ایک ایسی بل مارکٹ قائم کرنے کی پوری کوشش کرنی ہے جس کی بنیاد وسیع ہو۔

باب ۳۰

جوائنٹ اسٹاک بینکنگ، رورل بینکنگ اور اسٹیٹ بینک

دوسری جنگِ عظیم کے دوران ہندوستانی شیڈیولڈ بینکوں نے تیزی سے ترقی کی لیکن اس ترقی میں ربط نہیں تھا۔ بہت سے چھوٹے یونٹ تھے جن کے پاس نقد اثاثہ کافی نہیں تھا لیکن انھوں نے عام بینکی کاروبار کے جوکھم تجارت اور صنعت کے کاموں میں بھی اپنے کو اُلجھالیا۔ جنگ کے دوران صنعت کاروں کے چھوٹے گروپ نے بہت سے بینک قائم کیے جن کا مقصد خود اپنی صنعتوں کے لیے مالی وسائل فراہم کرنا تھا۔ مالی وسائل ناکافی اور قرض کی نامناسب پالسی کی وجہ سے ان بینکوں کو جنگ کے فوراً بعد کے زمانے میں بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ ان بینکوں میں سے بعض کے دیوالیہ ہو جانے کی وجہ سے اُن لوگوں کو شدید نقصان اُٹھانا پڑا جن کا روپیہ ان بینکوں میں جمع تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں حکومت نے آرڈیننس جاری کیا جس کے تحت ریزرو بینک کو کسی بھی جوائنٹ اسٹاک بینک کے حسابات کی جانچ کرنے اور ان بینکوں کے خلاف کاروائی کرنے کا اختیار دے دیا گیا، جن کے معاملات کو وہ روپیہ جمع کرنے والوں کے مفاد کے خلاف سمجھے۔ اس آرڈیننس نے مارچ ۱۹۴۹ء کے بینکنگ کمپنیز ایکٹ کے لیے راہ ہموار کی۔ اس ایکٹ کو اب انڈین بینکنگ ریگولیشن ایکٹ، ۱۹۴۹ء کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

بینکنگ ریگولیشن ایکٹ، ۱۹۴۹ء کو ہندوستان کے بینکی نظام کی ترقی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ ذیل میں وہ بنیادی دفعات درج ہیں جن کے ذریعے ہندوستان کے جوائنٹ اسٹاک بینکوں کی خامیاں دُور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۱) بینکنگ کمپنیوں کے بیباق سرمائے اور محفوظ رقم کے بارے میں سخت قاعدے مرتب

کیے گئے ہیں۔ ایکٹ میں یہ بات وضاحت کے ساتھ کہی گئی ہے کہ ہندوستانی بینک کا بیباق سرمایہ اور محفوظ رقم ۵۰ ہزار روپے سے کم نہ ہونا چاہیے اگر اس کو صرف ایک صوبے میں کام کرنا ہے۔ اگر اس بینک کے آفس کلکتے یا بمبئی یا ان دونوں شہروں میں ہوں تو یہ رقم ۲۰ لاکھ ہونی چاہیے۔ ہر بینکنگ کمپنی اپنے منافعے کا ۲۰ فی صدی ریزرو فنڈ میں اس وقت تک منتقل کرتی رہیگی جب تک محفوظ رقم بیباق سرمائے کے برابر نہ ہو جائے۔ ایکٹ میں یہ دفعات اس لیے رکھی گئی تھیں تاکہ ایسی کمپنیوں کی روک تھام ہو سکے جن کے وسائل کافی نہ ہوں (۲) بینکوں کے اثاثے کی نقد پزیری کی ضمانت کے لیے ایکٹ کے تحت یہ لازمی قرار دیا گیا کہ بینکنگ کمپنیاں اپنی میعادی اور غیر میعادی امانتوں کا کم از کم ۲۰ فی صدی سونے یا منظور شدہ سیکیورٹیوں کی شکل میں رکھیں (۳) ایکٹ میں اس کی بھی احتیاط رکھی گئی ہے کہ بینکنگ کمپنیوں پر چند سرمایہ داروں کی اجارہ داری نہ قائم ہو سکے (۴) ایکٹ کے تحت بینکوں کے لیے ضمنی کمپنیاں قائم کرنا ممنوع ہے اور سٹے کے کاروبار یا صنعتی کاروبار کرنے پر سخت پابندی ہے (۵) ایکٹ میں مختلف بینکوں کے ڈائرکٹروں کا آپسی گٹھ جوڑ ممنوع ہے اور اس کا مؤثر اہتمام ہے کہ بینکوں کے ڈائرکٹر اور منیجر بینک کے روپے کو اپنے کاروبار کی ترقی کے لیے نہ استعمال کر سکیں (۶) ریزرو بینک کو بینکوں کے حسابات کی جانچ کا حق حاصل ہے اور ریزرو بینک ان بینکوں کے حسابات کا میعادی یا وقتی گوشوارہ طلب کر سکتا ہے۔ ایکٹ کے تحت ریزرو بینک کو قرض کی رقم اور مقدار پر کنٹرول رکھنے کا بھی اختیار حاصل ہے۔

۱۹۴۹ء کے بینکنگ کمپنیز ایکٹ میں ۱۹۵۳ء، ۱۹۵۶ء، ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۲ء میں ترمیمیں کی گئیں۔ ۱۹۵۶ء کی ترمیم کے تحت ریزرو بینک کے اعلیٰ افسروں اور ان کے مشاہرے کو منضبط کرنے اور ان کے بورڈ کے جلسوں میں بیٹھنے کے لیے اپنے آدمی نامزد کرنے کا اختیار ہے۔ اس کے علاوہ ریزرو بینک پہلے کے مقابلے میں زیادہ تفصیلی معلومات طلب کر سکتا ہے۔ ۱۹۵۹ء کی ترمیم کے تحت کچھ تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ بینکوں کو ملک سے باہر کے کاروبار کے لیے ضمنی کمپنیاں قائم کرنے کا حق دیا گیا بشرطیکہ پہلے سے ریزرو بینک کی رضامندی حاصل کر لی جائے۔ ریزرو بینک کو غیر ملکی بینکوں کی شاخوں اور ہندوستانی بینکوں کے غیر ملکی ماتحتوں کے معائنے کا اختیار دیا گیا۔ ترمیم کے تحت منافع کی ادائیگی اور محفوظ فنڈ کے قیام کے قاعدوں کو زیادہ لچک دار بنایا گیا تاکہ غیر متوقع حالات میں ان سے کام لیا جا سکے۔ ریزرو بینک کو بینکنگ کمپنیوں کو مشروط لائسنس دینے کا حق دیا گیا۔ ریزرو بینک کی پیشگی منظوری کے بغیر اپنے اثاثے پر کسی قسم کا فلوٹنگ چارج (FLOATING CHARGE)

قائم کرنا بینکوں کے لیے ممنوع قرار پایا۔ اِس بات کی وضاحت کی گئی کہ کن حالات میں ریزرو بینک کسی بینک کو ختم کرنے کی کارروائی شروع کر سکتا ہے۔ خود کاروبار بند کرنے سے متعلق پابندی تمام بینکوں پر عائد کر دی گئیں۔ ۱۹۵۹ء کی دوسری ترمیمات ضوابط کی تشریح سے متعلق ہیں۔

بینکنگ کمپنیز (سکنڈ امنڈمنٹ) ایکٹ ۱۹۶۱ء کے ذریعے ملک کے بینکی نظام کو ازسرِنو تنظیم دینے کی سنجیدہ کوشش سمجھنا چاہیے۔ اِس کے تحت ۱۹۴۹ء کے بینکنگ کمپنیز ایکٹ کے سکشن A ۴۴ میں مناسب ترمیم کی گئی تاکہ لازمی انجام (COMPULSORY AMALGAMATION) سے متعلق کمپنیز ایکٹ ۵۶ کے سکشن ۳۹۶ کا نفاذ بینکنگ کمپنیوں پر ہو سکے۔ ایکٹ میں ایک نئے سکشن کا اضافہ کیا گیا تاکہ کسی بینکنگ کمپنی کے لازمی انجام اُس کی تشکیل نو کے لیے ایک اور طریقہ بھی نکالا جا سکے۔ تشکیل نو کا مقصد حصصی سرمایہ یا امانتوں اور دوسرے واجبات میں تخفیف یا انتظامی تبدیلیاں ہو سکتی ہیں۔

جون ۱۹۶۰ء میں مہاراشٹر کے لکشمی بینک اور اگست میں کیرل کے پلائی بینک کے دیوالیہ ہونے کی وجہ سے جو خلفشار پھیلا اُس کی وجہ سے ایسے اقدام ضروری ہو گئے کہ اصلاحات جلد از جلد عمل میں لائی جائیں تاکہ بینکوں کے دیوالیہ ہونے کی وجہ سے بینکنگ کی ترقی اور بینکوں کے نظام میں خلل نہ پڑے۔ بینکوں کے دیوالیہ ہونے کی وجہ سے حکومت کو ڈپازٹ انشیورنس کارپوریشن قائم کرنا پڑا جس نے یکم جنوری ۱۹۶۲ء سے کام کرنا شروع کر دیا۔ اِس کے علاوہ ۱۹۶۲ء کے ریزرو بینک امنڈمنٹ ایکٹ کے تحت شیڈیولڈ بینکوں کے لیے اِن کی میعادی امانتوں کا ۲۵ فی صدی نقد رکھنا لازمی قرار دیا گیا جبکہ پہلے ۲۰ فی صدی کی شرط تھی۔ ۱۹۶۲ء کے امنڈمنٹ ایکٹ کے تحت ریزرو بینک کو مختلف بینکوں اور مالی اداروں کے قرضوں سے متعلق معلومات حاصل کرنے کا حق ہے۔ مزید یہ کہ ۱۹۶۲ء کے ایکٹ کے نفاذ کے بعد قائم ہونے والی بینکنگ کمپنیوں کے لیے بیباق سرمائے کی کم سے کم حد ۵۰ ہزار سے بڑھا کر ۵ لاکھ کر دی گئی چاہے اُس کمپنی کا کاروبار کسی صوبے کے صرف ایک مقام پر یا کئی جگہوں پر ہو۔

بینکنگ کمپنیز ایکٹ کا مختصر جائزہ

۱۹۴۹ء کے بینکنگ کمپنیز ایکٹ اور بعد کی ترمیمات نے جوائنٹ اسٹاک بینکوں پر نہ صرف ریزرو بینک کے اختیارات بڑھا دیے بلکہ ان کی وجہ سے ہندوستان میں صحت مند بینکی

نظام کی ترقی ہوئی ۔ لیکن اس کے باوجود ایک طاقتور بینکنگ انکوائری کمیشن کا قیام مفید ہوگا ۔ یہ کمیشن ہندوستان کے بینکنگ کے مسائل پر نظرثانی کر سکے گا اور جوائنٹ اسٹاک بینکوں کی موجودہ حالت اور ہندوستانی صنعتوں سے ان کے تعلق کو پھر سے جانچ سکے گا ۔ خوشی کی بات ہے کہ جنوری ۱۹۶۹ء میں حکومت نے یہ کمیشن مقرر کر دیا ۔ اس کے چیرمین آر ۔ جی ۔ سرئیا ہیں ۔ کمیشن بینک کاری کے تمام ڈھانچے کا جائزہ لیگا اور یہ واضح کریگا کہ ہندوستان کی بدلتی ہوئی معیشت میں ان کا رول کیا ہونا چاہیے ۔ کمیشن کام کے طریقوں کو بہتر کرنے اور کمرشل بینکوں کی انتظامی پالیسی کو جدید بنانے سے متعلق بھی سفارش کرے گا ۔

بینکنگ لاز ایکٹ ۱۹۶۳ء کی اہم باتیں

دسمبر ۱۹۶۳ء میں بینکنگ لاز ایکٹ کے بن جانے کے ساتھ ہی بینکنگ کمپنیز ایکٹ ۱۹۴۹ء ریزرو بینک ایکٹ، ۱۹۳۴ء اور اسٹیٹ بینک آف انڈیا ایکٹ، ۱۹۵۹ء کی ترمیم ہوگئی اور ریزرو بینک کو بینکوں اور غیر بینکی مالیاتی ہیولوں کو کنٹرول کرنے کے اختیارات حاصل ہو گئے ۔

اب ہم ۱۹۶۳ء کے ایکٹ کی اہم دفعات کا جائزہ لیں گے ۔ ایکٹ کے تحت بینکوں کے لیے مندرجہ ذیل کو بے ضمانت قرض دینا ممنوع قرار دیا گیا ۔

(الف) بینک کے ڈائرکٹروں کو (ب) فرم یا پرائیویٹ کمپنیوں کو جن میں بینک کا کوئی ڈائرکٹر یا ساجھے دار یا مینجنگ ایجنٹ، ضامن کی حیثیت سے دلچسپی رکھتا ہو (ج) کسی پبلک کمپنی کو جن میں بورڈ آف ڈائرکٹرز کا چیرمین پبلک کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر کی حیثیت سے یا اُس کمپنی کے مینجنگ ایجنٹ کے ساجھے دار کی حیثیت سے دلچسپی رکھتا ہو ۔ اس کے علاوہ ریزرو بینک کی اجازت کے بغیر کسی ایسے قرض کو معاف کرنے سے بینک کو منع کیا جا سکتا ہے جو کسی ایسی کمپنی کے ڈائرکٹروں پر واجب ہو جس میں بینک کے ڈائرکٹر دلچسپی رکھتے ہوں یا بینک کا کوئی ڈائرکٹر اُن کا ضامن یا ساجھے دار ہو ۔ ریزرو بینک کو اختیار ہے کہ اگر وہ بینک میں روپے جمع کرنے والوں کے مفاد میں ضروری سمجھے تو زیادہ سے زیادہ پانچ آدمیوں کو کسی بینک کے ڈائرکٹر نامزد کر سکتا ہے ۔ اِس کے علاوہ ایکٹ ریزرو بینک کو اختیار ہے کہ بینکوں کو فرداً فرداً یا عام ہدایات ان باتوں کے بارے میں دے سکتا ہے : (۱) کسی بینک کے بیباق سرمائے، محفوظ رقم اور امانتوں کے پیشِ نظر وہ بینک کسی کمپنی یا فرد کو کتنی رقم قرض دے سکتا ہے (۲) مندرجہ بالا امور کے پیشِ نظر ایک بینک کسی کمپنی یا فرد کی کتنی رقم کی ضمانت لے سکتا ہے

(۳) کس شرح سود اور کن شرائط پر بینک قرض دے سکتا ہے اور ضمانت لے سکتا ہے۔

اِن تبدیلیوں کا مقصد امانت رکھنے والوں کا تحفظ تھا۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر ریزرو بینک کا کنٹرول ان غیر بینکی اداروں پر بھی عائد کیا گیا جو امانتیں قبول کرتے تھے۔ اس وقت کے قوانین کے تحت ان کمپنیوں اور اداروں کی نگرانی ممکن نہیں تھی جو بینک کی حیثیت نہیں رکھتی تھیں لیکن پبلک کی امانت قبول کرتی تھیں اور دوسرے بینکی کاروبار کرتی تھیں۔ چونکہ یہ اپنی امانتوں کا حساب دینے کے پابند نہیں تھے اِس لیے یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ ان کے پاس کتنی امانت ہے اور آیا ان کے اپنے سرمائے کو دیکھتے یہ رقم اتنی زیادہ تو نہیں ہے کہ پبلک کی جمع شدہ رقم کو خطرہ لاحق ہو۔ اِس کے علاوہ ان میں سے بعض ادارے میعادی امانت پر نسبتاً زیادہ سود دیتے تھے جس کی وجہ سے سود کی عام شرح بعض حالات میں متاثر ہو سکتی تھی چنانچہ یہ ضروری سمجھا گیا کہ ریزرو بینک کو ان اداروں کو منضبط کرنے کے اختیار دیے جائیں تاکہ اگر ضرورت ہو تو مالی ضوابط کو زیادہ مؤثر طریقے سے نافذ کیا جاسکے۔ چنانچہ ۱۹۶۳ء کے ایکٹ کے ذریعے ریزرو بینک ایکٹ میں بھی ترمیم کی گئی تاکہ ریزرو بینک پبلک کی امانتیں رکھنے والے غیر بینکی اداروں کو اشتہار دینے اور پراسپکٹس شایع کرنے سے منع کرسکے یا ضابطے کے تحت لاسکے۔ ان اداروں سے امانتوں کا حساب طلب کرسکے اور امانتوں سے متعلق ہدایات جاری کرسکے، مثلاً شرح سود اور امانت کی مدّت کے بارے میں۔ اگر کوئی ادارہ اِن ہدایات پر عمل کرنے سے اِنکار کرے تو اُس کو امانتیں لینے سے منع کیا جاسکتا ہے۔ ریزرو بینک اِن اداروں سے ان کے بیباق سرمائے، محفوظ رقم اور دوسرے واجبات اور لگے ہوئے سرمائے اور ان کی شرائط کے بارے میں معلومات طلب کرسکتا ہے اور انھیں کاروبار سے متعلق ہدایات دے سکتا ہے۔

قسطوں پر سامان بیچنے والی کمپنیوں، بلڈنگ سوسائٹیوں اور دوسری قسم کے غیر بینکی مالی اداروں مستقبل قریب میں کافی اہمیت حاصل کرنے کا امکان رکھتے ہیں۔ ان کے سلسلے میں ابتدائی اقدام یہ کیا گیا ہے کہ بینکی اور غیر بینکی دونوں قسم کے اداروں کو جمع امانتوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنی پڑتی ہیں۔ جو اعداد و شمار اِن غیر بینکی کمپنیوں نے ریزرو بینک کو فراہم کیے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے پاس ۳۱ مارچ ۱۹۶۳ء کو امانتوں کی مجموعی رقم ۱۸۶ کروڑ روپے تھی۔ اس رقم میں سے ۱۵۸ کروڑ یعنی ۸۵ فی صدی قبل المیعاد امانتیں تھیں جنھیں بینکنگ نظام کے براہِ راست مقابلے میں تصوّر کیا جاسکتا ہے۔ اسی لیے جنوری ۱۹۶۶ء کے انضباطی اقدام کا اعلان کیا گیا تاکہ غیر بینکی اداروں اور کمپنیوں کی سرگرمیاں کنٹرول میں لائی جاسکیں۔ جنوری ۱۹۶۶ء میں ریزرو بینک نے بینکنگ لاز ایکٹ ۱۹۶۳ء

کے تحت دو[2] ہدایات جاری کی تھیں۔ ایک اُن غیر بینکی اور غیر مالی کمپنیوں کے لیے تھی جو اپنے ممبروں سے امانتیں قبول کرتی تھیں۔ اِن میں انشیورنس کمپنیاں نہیں شامل تھیں۔ دوسری ہدایت غیر بینکی مالی کمپنیوں کے لیے تھی جو قسط پر مال فراہم کرنے کا کاروبار کرتی تھیں۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء میں دو[3] اور ہدایات جاری کرنی پڑیں جن کی وجہ یہ تھی کہ نجی چھوٹی کمپنیوں نے اپنی ذمہ داریاں بہت بڑھالی تھیں اور ان میں سے دِلّی کی کچھ کمپنیوں کے دیوالیہ ہونے کی بھی خبر تھی۔

ڈِپازٹ انشیورنس کارپوریشن کے قیام کے بنیادی مسائل

جون ۱۹۶۰ء میں لکشمی بینک اور اگست ۱۹۶۰ء میں پلائی بینک کے دیوالیہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے بینکی نظام کو مضبوط کرنے کے سوال پر سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا اور حکومت اور عوام دونوں کی خاص توجہ ڈِپازٹ انشیورنس کی طرف مرکوز ہوگئی۔ پبلک کی طرف سے امانتوں کے تحفظ کے مطالبے سے یہ ظاہر ہے کہ افراد خصوصاً متوسط طبقے کے' ایسے اقدام چاہتے تھے جن سے ان کی امانتیں محفوظ رہیں۔ عوام کے اِس مطالبے کے پیش نظر حکومت نے ڈپازٹ انشیورنس کارپوریشن قائم کیا تاکہ بینکوں میں رکھی گئی امانتوں کا تحفظ ہوسکے۔ یکم جنوری ۱۹۶۲ء کو ایک خود مختار کارپوریشن قائم کیا گیا جس کا مقصد ڈپازٹ انشیورنس کی تعمیل کرنا تھا۔ اِس کے چیرمین ریزرو بینک کے گورنر تھے۔

یہ کارپوریشن ایک کروڑ روپے کے سرمائے کا مجاز تھا اور یہ پوری رقم ریزرو بینک نے لگائی۔ پانچ ممبروں پر مشتمل ایک بورڈ آف ڈائرکٹرز ہے جو کارپوریشن کے انتظام اور نگرانی کا ذمہ دار ہے۔ کارپوریشن کو ریزرو بینک سے ۵ کروڑ تک قرض لینے کا اختیار ہے۔ ڈپازٹ انشیورنس کارپوریشن ایکٹ کے تحت تمام موجودہ کمرشل بینکوں کو انشیورڈ بینکوں کی حیثیت سے خود کو رجسٹرڈ کرانا ہے۔ آئندہ جو بینک قائم ہوں انھیں بھی اسی حیثیت سے خود کو رجسٹرڈ کرانا ضروری ہے۔ اِس موقع پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جنوری ۱۹۶۲ء میں کارپوریشن کی ابتدا کے وقت انشیورڈ بینکوں کی تعداد ۲۸۷ تھی جو جون ۱۹۶۸ء میں گھٹ کر ۹۰ ہوگئی۔ تعداد میں اس کمی کی وجہ یہ تھی کہ بہت سی بینکنگ کمپنیاں ایک دوسرے میں مدغم ہوگئیں اور ان کا اثاثہ اور واجبات دوسری کمپنیوں کو منتقل ہوگئے۔

کارپوریشن نے شروع میں ہر بینک کے ہر ڈپازٹر کے لیے ۱۵۰۰ تک کی رقم کی انشیورنس کا ذمہ لیا۔ آگے چل کر یکم جنوری ۱۹۶۸ء سے یہ رقم بڑھا کر ۵۰۰۰ فی ڈپازٹر کر دی گئی لیکن اِس تاریخ سے

پہلے کی قبول کی ہوئی ذمہ داریوں کی وہی حد یعنی ۱۵۰۰ باقی رکھی گئی۔ ایکٹ کے تحت کارپوریشن کو مفادِ عامہ کے پیش نظر اس حد کو وقتاً فوقتاً بڑھانے کا اختیار ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ امریکہ کے فیڈرل ڈپازٹ انشیورنس کارپوریشن نے ۱۹۳۴ء میں اپنی ابتدا کے وقت انشیورنس کی حد ۲۵۰۰ ڈالر فی ڈپازٹر رکھی تھی جسے ۱۹۵۰ء میں بڑھا کر ۱۰۰۰۰ ڈالر کر دیا گیا۔

کارپوریشن انشیورڈ بینکوں سے مجموعی امانت کی رقم پر زیادہ سے زیادہ ۱۵ پیسے فی سئو روپیہ سالانہ وصول کرسکتی ہے۔ اس امانت میں سرکاری ملازموں، بیرونی حکومتوں اور بینکنگ کمپنیوں کی جمع شدہ رقم شامل نہیں کی گئی ہے۔ کارپوریشن نے پریمیم کی شرح ۵ پیسے سیکڑا رکھی ہے یعنی جمع رقم کے ایک فی صدی کا بیسواں حصہ۔ اگر کوئی انشیورڈ بینک اپنا پریمیم نہیں جمع کرتا ہے تو اس سے زیادہ سے زیادہ ۸ فی صدی سالانہ سود وصول کیا جا سکتا ہے۔ ڈپازٹ انشیورنس کی اسکیم کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ انشیورڈ بینکوں کے کاموں کی نگرانی کس حد تک کی جاتی ہے اور خود انشیورڈ بینک اپنے کام کے معیار کو اونچا کرنے پر کس حد تک آمادہ ہیں۔ امریکہ میں فیڈرل ڈپازٹ انشیورنس کارپوریشن خود ان بینکوں کی نگرانی کرتا ہے جن کی جانچ فیڈرل گورنمنٹ کی ایجنسیاں کرتی ہیں۔ ہندوستان میں چونکہ تمام کمرشل بینکوں کا معائنہ ریزرو بینک کرتا ہے اِس لیے کارپوریشن کو ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن کارپوریشن ریزرو بینک سے کسی بھی انشیورڈ بینک کے معائنے کی درخواست کرسکتا ہے۔ ریزرو بینک کو معائنے کے بعد اپنی رپورٹ کارپوریشن کو بھیجنی چاہیے۔

جنوری ۱۹۶۲ء میں جب سے بینکوں کی امانت کی لازمی انشیورنس کی اسکیم شروع ہوئی گیارہ ایسے کیس ہوئے جن میں کارپوریشن کو انشیورڈ بینک کے ڈپازٹروں کو رقمیں ادا کرنی پڑیں۔ پہلا کیس اگست ۱۹۶۲ء میں ہوا جب حکومت نے مدراس کے یونٹی بینک لیمیٹڈ کا لائسنس منسوخ کر دیا۔ دوسرا موقع بینک آف چائنا کا اور تیسرا بینک آف اناگاپوری کا تھا۔ ان تینوں بینکوں کے ڈپازٹروں کے مطالبات کارپوریشن نے ۱۹۶۳ء میں ادا کر دیے۔ ۱۹۶۴ء میں چھ مزید بینکوں کے ڈپازٹرز کے مطالبات کارپوریشن کو پورے کرنے پڑے۔ ۱۹۶۵ء میں مطالبے کی کوئی صورت نہیں پیدا ہوئی۔ ۱۹۶۶ء میں کارپوریشن کو نیشنل بینک آف پاکستان کلکتہ اور حبیب بینک بمبئی کے ڈپازٹرز کے مطالبات پورے کرنے پڑے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۶۲ء سے اب تک کارپوریشن نے گیارہ بینکوں سے متعلق ۵۶ء۸۵ کروڑ روپے کے مطالبات پورے کیے ہیں۔

اِس موقع پر یہ ذکر کرنا مناسب ہے کہ حال میں چونکہ ڈپازٹ انشیورنس فنڈ کے پاس کافی رقم جمع ہوگئی اِس لیے حکومت نے کارپوریشن کی تجویز کے مطابق کوآپریٹو بینکوں کو بھی اس کے حصار میں لے لیا ہے۔ جولائی ۱۹۶۸ء میں ڈپازٹ انشیورنس اسکیم میں ترمیم لوک سبھا میں پیش ہوئی۔ ترمیم کا مقصد اس اسکیم کے تحت اُن ریاستی اور مرکزی کوآپریٹو بینکوں اور شہری کوآپریٹو بینکوں کو لانا تھا، جن کا بیباق سرمایہ اور محفوظ رقم ایک لاکھ یا اس سے زیادہ ہو۔

ذیل میں ہم ہندوستان کی ڈپازٹ اسکیم کے مسائل کا جائزہ لیں گے اور یہ دیکھیں گے کہ آیا موجودہ حالات میں کارپوریشن کا قیام مُسکّن کا کام دے سکتا ہے۔ ہم اِس پر بھی بحث کریں گے کہ امریکہ میں جہاں ۱۹۳۳ء کے بحران کی وجہ سے بینکوں پر سے عوام کا اعتبار اُٹھ گیا تھا، بینکی نظام کو مضبوط اور مستحکم بنانے کے لیے فڈرل ڈپازٹ انشیورنس کارپوریشن نے کیا کام انجام دیے۔ اِس سے ہمیں خود اپنے جائزے کا اچھا پسِ منظر مل جائے گا۔

یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ڈپازٹ انشیورنس کارپوریشن بینکوں کے دیوالیے پن کے تدارک کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اِنڈین بینکس اسوسیئیشن نے تجویز کیا تھا کہ یہ کارپوریشن امریکہ کے فڈرل ڈپازٹ انشیورنس کارپوریشن کے نہج پر قائم کیا جائے۔ گویا اسوسیئیشن کی تجویز یہ تھی کہ ہندوستانی کارپوریشن امریکن کارپوریشن کی نقل ہو۔

پچھلے پندرہ برسوں میں ماہروں کی دو کمیٹیوں نے اِس تجویز کو جانچا۔ رورل بینکنگ انکوائری کمیٹی (۱۹۵۰ء) اور شراف کمیٹی (۱۹۵۴ء) دونوں اِس اسکیم سے اصولاً متفق تھیں لیکن فوراً اِس کی بلاشرط سفارش سے ہچکچاتی تھیں۔

شراف کمیٹی نے اِس سلسلے میں جو تفصیلی اسکیم تیار کی اُس کے تحت ریزرو بینک کو ۵ کروڑ کے سرمائے سے یہ کارپوریشن شروع کرنا تھا اور کارپوریشن کو تمام بینکوں کے ڈپازٹرز کی ۵ ہزار تک کی رقم کا بیمہ کرنا تھا۔ اسکیم کے تحت بینکوں کو اپنی امانتوں کی مجموعی رقم کے ایک فی صدی کا سولہواں حصّہ پریمیم ادا کرنا تھا۔ امریکہ میں شروع میں یہ شرح ایک فی صدی کا بارھواں حصّہ تھی جس میں سے کچھ رقم کارپوریشن کے کامیاب ہونے کے بعد واپس ہوسکتی تھی۔ ہندوستان میں بھی یہی تجویز کیا گیا۔ شراف کمیٹی نے رپورٹ میں لکھا کہ کمیٹی کے سامنے بیان دینے والے کچھ بینک کاروں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اسکیم پر خرچ بہت زیادہ ہے۔ لیکن کمیٹی کا خیال تھا کہ اسکیم مفید ہے اور اِس کو عمل میں لانا چاہیے بشرطیکہ تفصیلی جائزے کے بعد بینک اس کی ضرورت پر متفق ہوں۔

[illegible]ن کمیٹی سے پہلے اے۔ ڈی۔ گورووالا کی زیر صدارت رورل بینکنگ انکوائری [illegible] نے تجویز کیا تھا کہ ڈپازٹ انشیورنس اسکیم اس وقت تک کے لیے ملتوی کی جائے جب [illegible] کمپنیز ایکٹ کے تحت بینکی نظام کو مضبوط نہ کر لیا جائے۔ صرف اس صورت میں یہ اسکیم [illegible] اور تشفی بخش ہو سکتی ہے۔

جس وقت یہ دونوں کمیٹیاں ڈپازٹ انشیورنس اسکیم پر غور کر رہی تھیں ریزرو بینک ایک خاموش تماشائی تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ ابھی اس اسکیم کو عمل میں لانے کا وقت نہیں آیا ہے لیکن پلائی بینک کے دیوالیہ ہونے کے بعد ریزرو بینک پر اعتراضات کی جو بوچھاڑ ہوئی اُس کی وجہ سے بینک کے حکام کو بینک اسوسیئیشن کے ساتھ مل کر ان تجاویز پر غور کرنا ضروری ہو گیا۔ ڈپازٹ انشیورنس اسکیم کے بہت سے پہلو ہیں جن پر غور کرنے کے بعد ہی کسی نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے۔

امریکہ میں ڈپازٹ انشیورنس اسکیم اُس وقت شروع کی گئی جب ملک ایک شدید بینکی بحران میں مبتلا تھا۔ ۱۹۳۳ء تک کے چار برسوں میں امریکہ کے ایک تہائی بینک ناپید ہو گئے جن کی امانتوں کی مجموعی رقم ۷۰ لاکھ ڈالر تھی اور جن کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کو شدید مصائب برداشت کرنے پڑے۔ وقتی طور پر سارا ملک بینکی سہولتوں سے تقریباً محروم ہو گیا جس کی وجہ سے بحران کی شدت اور بڑھ گئی۔ چنانچہ اس ہنگامی دَور میں بینکی نظام میں لوگوں کا اعتماد دوبارہ قائم کرنے کے لیے ڈپازٹ انشیورنس اسکیم ضروری تھی۔

ظاہر ہے ہندوستان میں دو بینکوں کے دیوالیے ہونے کی وجہ سے وہ ہنگامہ نہیں ہوا جو امریکہ میں ہوا تھا۔ اِس سلسلے میں ہمیں سنٹرل بینک کے سابق چیف مسٹر آئنگر کا بیان یاد رکھنا چاہیے۔ ۱۹۶۱ء کے وسط میں قومی آمدنی کی تحقیق سے متعلق دوسری کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے مسٹر آئنگر نے کہا تھا کہ کچھ کمزور حلقوں کے باوجود ۹۰ فی صدی امانتیں ایسے بینکوں میں ہیں جو مضبوط اور صحت مند ہیں۔ انھوں نے اِس بات پر زور دیا کہ امانتوں کے تحفظ کے لحاظ سے ہندوستان کا بینکی نظام قومی ہے۔ مسٹر آئنگر کی اِس یقین دہانی سے بڑی ڈھارس بندھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا ایسی صورت میں ڈپازٹ انشیورنس کے طاقتور ٹانک کی ضرورت تھی!

ایک مشکل اور بھی ہے۔ بینکوں کے دیوالیے ہونے سے روپیہ جمع کرنے والوں کو کتنا مالی نقصان اٹھانا پڑتا ہے اس کے اعداد و شمار نہیں ہیں جن کی بنیاد پر پریمیم کی صحیح شرح متعین کی جائے۔

امریکہ میں چونکہ یہ اعداد شمار دستیاب تھے۔ اِس لیے یہ حساب لگانا آسان تھا۔ چنانچہ امریکہ میں مجموعی امانتوں اور ٹرسٹ کی رقموں کے ایک فی صدی کا بارہواں حصّہ پریمیم مقرر کیا گیا۔ یہ شرح اس مجموعی نقصان کے اعداد پر مبنی تھی جو ۱۸۶۳ء سے لے کر ۱۹۳۳ء تک کے غیر بحرانی برسوں میں بینکوں کے بند ہونے کی وجہ سے رقم جمع کرنے والوں کو اٹھانا پڑا تھا۔ یہ حساب لگانا اس لیے ممکن ہوا تھا کیونکہ نقصان کے اعداد شمار موجود تھے۔ ہندوستان میں ایسے اعداد شمار موجود نہیں ہیں جن سے اندازہ ہو سکے کہ دیوالیے ہونے کی وجہ سے لوگوں کو کتنا نقصان ہوا چنانچہ کسی واقعی بنیاد پر پریمیم کی شرح مقرر کرنا ممکن نہیں ہے۔ بہرحال ہمارے ڈپازٹ انشیورنس کارپوریشن نے تخمینہ کیا ہے کہ مجموعی امانت کے ایک فی صدی کا بیسواں حصّہ پریمیم کے لیے کافی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ تخمینہ ایک عقلی گدا ہے لیکن حسابات کے معاملے میں عقلی گدا بہت خطرناک ہوتا ہے اور بڑی مشکلوں کا باعث بن سکتا ہے۔

دوسرا سوال ان بڑے بینکوں پر پریمیم کے بوجھ کا ہے جو معتبر اور صحت مند ہیں اور جن کے پاس زیادہ امانتیں رہتی ہیں۔ بڑے بینکوں کو عوام کا اعتماد حاصل ہے، اُن کا سرمایہ معقول کاموں میں اور ہموار طریقے سے لگا ہوا ہے۔ انھیں مشکلوں میں پھنسنے کا خطرہ نسبتاً کم ہے۔ بڑے بینکوں کے دیوالیہ ہونے کی صورت شاذ ہی پیدا ہوتی ہے اور اگر کبھی ایسا ہو بھی تو حکومت اُن کی مدد کرتی ہے۔ جو کبھی کبھی اس تناسب سے زیادہ ہوتی ہے جس کے یہ بینک اپنے اثاثے کے اعتبار سے حقدار ہوتے ہیں۔ چنانچہ جہاں تک ان بینکوں کا تعلق ہے انھیں ڈپازٹ انشیورنس اسکیم سے نہ کوئی براہ راست فائدہ ہے اور نہ اُس شرح پر پریمیم ادا کرنے کا بوجھ اٹھانا پسند کریں گے جو چھوٹے بینکوں کے لیے بھی وہی ہے جنھیں خطرے کا سامنا زیادہ ہے۔ رہا یہ کہ ان دونوں کے لیے پریمیم کی شرحیں مختلف ہوں، یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کی وجہ سے محض دشواریاں پیدا ہونگی اور اسکیم کو عمل میں لانے میں مشکلات پیش آئیں گی۔ غرضیکہ پریمیم کی شرح ایک ہی سکتی ہے۔ بڑے بینکوں کو سمجھایا جاسکتا ہے کہ انھیں اس اسکیم سے بالواسطہ فائدے حاصل ہونگے۔ اگرچہ اِس میں شبہ ہے کہ بالواسطہ فائدے پریمیم کے بوجھ کے مقابلے میں متناسب ہونگے۔

یہ بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ امانتوں کا بیمۂ زندگی، آتش زدگی اور سمندری بیمے سے مختلف ہے کیونکہ یہ سب بیمے قدرتی آفات سے متعلق ہیں جبکہ امانتوں کا بیمہ انسان کی لائی ہوئی مصیبتوں کے لیے ہے جن کا کنٹرول نسبتاً ممکن ہے۔ اِس لیے جہاں تک ڈپازٹ انشیورنس کا سوال ہے صرف امکانات

کے ان اصولوں پر بھروسہ کرنا کافی نہیں ہے جو دوسرے تمام قسموں کے بیمے کی بنیاد ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کی لائی ہوئی اِن مُصیبتوں کو مؤثر طریقے سے کنٹرول کیا جائے۔ امریکہ میں مسئلے کے اِس پہلو پر کافی زور دیا جاتا ہے۔ فڈرل ڈپازٹ انشیورنس کارپوریشن ان ہزاروں بینکوں کا بھی معائنہ اور ان کی نگرانی کرتا ہے جو اس اسکیم کے ممبر نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض بینکوں کا انتظام اچھا بھی نہیں ہوتا۔ ہندوستان کا کارپوریشن بینکوں کے براہِ راست معائنے کا مجاز نہیں ہے بلکہ اُس کو ریزرو بینک سے معائنے کی درخواست کرنی پڑتی ہے۔

یہ درست ہے کہ اس کارپوریشن کے ذریعے ان بینکوں کو دیوالیہ ہونے سے روکا جاسکتا ہے جو عدم اعتماد کی صورت میں امانتوں کے بے تحاشہ نکالے جانے کی وجہ سے دیوالیہ ہو جاتے ہیں لیکن بعض عملی دشواریوں کی وجہ سے یہ کام ہندوستان میں مشکل نظر آتا ہے۔ یہ بھی شبہ کی بات ہے آیا یہ اسکیم کامیاب بھی ہوگی۔ موجودہ صورت میں سب سے زیادہ ضرورت اِس بات کی ہے کہ بینکوں کی نگرانی کی جائے اور غلطی کرنے والے بینکوں کے خلاف کاروائی کی جائے۔ اِس وقت امریکہ کی طرح ایک بااختیار ادارہ قائم کرنے کے بجائے ریزرو بینک کے اختیارات بڑھانا زیادہ بہتر ہے۔ ریزرو بینک کے نافرمابردار بینکوں کے خلاف سخت براہِ راست کاروائی کی جانی چاہیے۔

مسئلہ دراصل اُن چھوٹے بینکوں کے کمزور مالی ڈھانچے کا ہے جنھیں مشکل پیدا کرنے والے بینک کہا جاتا ہے۔ ریزرو بینک کو ان بینکوں کی حالت سے پوری واقفیت ہونی چاہیے اور ایسی تبدیلیاں تجویز کرنا چاہیے جن سے ان کی کارکردگی بڑھے اور یہ صحت مند اور قابلِ عمل یونٹ بن سکیں۔ اس موقعے پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ آیا مناسب حالات میں مختلف یونٹوں کو مدغم کرنے کے اختیارات ضروری ہیں۔ اِس کا جواب مشکل ہے لیکن ایک ملک کا سنٹرل بینک اِس سے بچ نہیں سکتا۔ سنٹرل بینک پورے بینکی نظام کا امین اور مجبوری کی حالت میں قرض کا ذریعہ ہے۔ اگر سنٹرل بینک کو ضروری اختیار حاصل ہوں اور وہ انھیں مؤثر ڈھنگ سے کام میں لائے تو ڈپازٹ انشیورنس کی اسکیم کے بغیر بھی تمام بُرائیاں دور ہو سکتی ہیں۔ غرضیکہ بالآخر سنٹرل بینک ہی بحران کے شکار بینکوں کو اُن کے وقتی طور پر معطل اثاثے کی ضمانت پر نقد فراہم کرکے انھیں مشکلوں سے بچا سکتا ہے۔ اگر سنٹرل بینک کے پاس وسیع اختیارات ہیں اور یہ اپنے کام مستعدی سے انجام دیتا ہے تو ڈپازٹ اسکیم غیر ضروری ضمیمہ بن کر رہ جاتی ہے۔ دوسری طرف اگر سنٹرل بینک اپنے فرائض کی انجام دہی میں ناکام رہتا ہے تو ڈپازٹ اسکیم بھی معاملات کو نہیں سلجھا سکتی۔

کمرشل بینک، شراف کمیٹی اور نجی سکٹر کے لیے مالی وسائل

ہمارے پانچ سالہ منصوبوں میں صنعتی ترقی کی جو رفتار سوچی گئی ہے اُس کے پیشِ نظر ان سوالات پر دوبارہ غور کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا: آیا ہندوستانی کمرشل بینکوں کو درمیانی مدت کے قرض صنعت کو دینے چاہئیں۔ ۱۹۳۱ء کی سنٹرل بینکنگ انکوائری کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ جو بینک مالی اعتبار سے مضبوط ہیں انھیں صنعتوں کو درمیانی مدت کے قرض دینے چاہئیں۔ مالیات کے میدان میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ کئی مالیاتی اور ترقیاتی کارپوریشن قائم ہوچکے ہیں جن کا مقصد ہندوستانی صنعتوں کو لمبی اور درمیانی مدت کے قرض مہیا کرنا ہے۔

(الف) کمرشل بینکنگ اور صنعتی مالیات کے بارے میں شراف کمیٹی کا نظریہ:
۱۹۵۴ء میں اے۔ ڈی۔ شراف کی صدارت میں ایک کمیٹی نے اس سوال پر غور کیا آیا کمرشل بینکوں کو صنعتی مالیات کے میدان میں داخل ہونا چاہیے۔ اس کمیٹی نے صنعت کو لمبی مدت کے براہ راست قرض پر غور کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس رجحان کی ہمت افزائی نہیں کرنی چاہیے کہ کمرشل بینک اُن قرضوں کی ضمانت پر ریزرو بینک سے نقد کی دستیابی پر بھروسہ کریں جو وہ اپنی صواب دید کے مطابق دیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ کمیٹی نے سفارش کی کہ بیمہ کرنے والوں اور بینکوں کا ایک کنسورٹیم (CONSORTIUM) بنایا جائے جو کمپنیوں کے جاری کردہ شیئر اور ڈبنچروں کو لینے میں شریک ہو۔ لیکن شراف کمیٹی کی اِس سفارش کے سلسلے میں اب تک کچھ نہیں کیا گیا ہے۔

(ب) شراف کمیٹی کی اصلاحی تجاویز: ہندوستان کے بینکی نظام کو صحت مند بنانے اور نجی سکٹر کے لیے مالی سہولتیں بڑھانے کے لیے شراف کمیٹی نے یہ سفارش کی: (۱) بینکنگ سکٹر کی تنخواہوں اور اُجرت کے نظام کو بہتر بنانے کے لیے حکومت ماہروں کی ایک کمیٹی مقرر کرے (۲) بل مارکٹ اسکیم کے تحت سہولتیں اُن شیڈیولڈ بینکوں کو بھی دی جائیں جن کی امانت کی رقم ایک کروڑ یا اس سے زیادہ ہے (۳) ریزرو بینک کو ایسے مؤثر اقدام کرنے چاہئیں کہ رقموں کی ترسیل میں دیر نہ لگے اور زیادہ خرچ نہ ہو (۴) بینک میں امانت رکھنے والوں کے مفاد میں امریکہ کے نہج پر ایک ڈپازٹ انشیورنس کارپوریشن قائم کرنے کی مخلصانہ کوشش کی جائے (۵) مختلف قسم کے بینکوں کے مفاد کے تحفظ اور مشترک مفاد کے معاملوں میں اتفاق رائے حاصل کرنے کے لیے بینکوں کا ایک اسوسیئیشن قائم کیا جائے (۶) دیسی ساہوکاروں کو اپنے بینکی کاروبار کو منظم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے اور

ریزرو بینک کو ہُنڈیاں بھی شیڈیولڈ بینکوں کے ذریعے سکھارنا چاہیئے (۷) چھوٹی صنعتوں کی مالی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایک صنعتی ترقیاتی کارپوریشن قائم کرنا چاہیئے جو حکومت کی ملکیت ہو اور اُس کے زیر اہتمام ہو۔ حکومت نے معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ان میں سے بیشتر سفارش کی تعمیل کردی ہے۔

(ج) **مختصر جائزہ** : اِس وقت ہندوستان کے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ بینکنگ کے معیار کو کس طرح ترقیاتی منصوبہ بندی کی ضروریات سے ہم آہنگ کیا جائے۔ نجی حلقے کو بھی مقررہ نشانے تک پہنچنے کے لیے مالی امداد کی ضرورت ہے۔ اِس وقت کمپنیوں کے نقد کے وسائل کا بڑا حصّہ ٹیکس میں چلا جاتا ہے۔ یہ صورت خاصکر مصنوعاتی کمپنیوں کے ساتھ ہے۔ چنانچہ اِن کمپنیوں کو بینکوں سے زیادہ مدد لینی پڑتی ہے۔ اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر بینکوں کے کنسرٹیم سے متعلق شراف کمیٹی کی سفارش خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کمرشل بینکوں اور صنعتی مالیات سے متعلق کمیٹی کی سفارشات بڑی بصیرت افروز اور تعمیری ہیں۔ ان کی اگر تعمیل کی جائے تو کمرشل بینک ملک کی صنعتی ترقی میں مؤثر رول ادا کرسکنے کے قابل ہوسکتے ہیں۔

ہندوستان میں دیہی بینک کاری

شہری علاقوں میں بینکی سہولتوں کے برعکس دیہی علاقوں میں زیادہ تر ساہوکار اور مہاجن یا چند لینڈ مارگیج بینک اور کواپریٹیو بینک ہیں۔ حال میں اسٹیٹ بینک نے دیہی علاقوں میں کچھ شاخیں کھولی ہیں۔ دیہی بینک کاری کی سہولتوں کا جائزہ لینے کے لیے لینڈ مارگیج بینکوں اور کواپریٹیو بینکوں کی سرگرمی پر توجہ کرنا ضروری ہے۔

(الف) **کواپریٹیو بینکنگ** : ہندوستان میں کواپریٹیو بینکوں کا نظام وفاقی ہے۔ اِس نظام کی بنیاد گاؤں کی پرائمری سوسائٹیاں ہیں۔ مرکزی بینکوں اور یونینوں کا کام پرائمری سوسائٹیوں کے لیے مالی وسائل فراہم کرنا ہے۔ سنٹرل کواپریٹیو بینک کا رواں سرمایہ خود اس کے بیباق سرمائے، محفوظ رقم، افراد اور سوسائٹیوں کی امانتوں اور صوبائی کواپریٹیو بینک سے لیے گئے قرض سے حاصل ہوتا ہے سب سے اوپر اسٹیٹ کواپریٹیو بینک ہوتا ہے۔ تقریباً ہر صوبے میں اِس طرح کا ایک بینک ہوتا ہے جو صوبے کے تمام کواپریٹیو بینکوں کے کاموں میں تال میل پیدا کرتا ہے۔ اسٹیٹ کواپریٹیو بینک صوبائی حکومت اور ریزرو بینک سے قرض لے سکتا ہے۔ چوٹی کے بینکوں کا بنیادی مقصد مرکزی کواپریٹیو بینکوں کو

قرض دینا ہوتا ہے۔ مرکزی کواپریٹیو بینک پرائمری سوسائٹیوں کو قرض دیتے ہیں۔ چوٹی کے بینک بازارِ زر اور سنٹرل کواپریٹیو بینکوں کے بیچ کی کڑی ہے۔

ہر صوبے میں ایک چوٹی کا بینک قائم ہے۔ آسام میں دو ایسے بینک ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں پہلے سے ایک صوبائی کواپریٹیو بینک قائم تھا اور ۱۹۴۸ء میں چوٹی کا بینک قائم کیا گیا۔ کام کرنے کے لیے چوٹی کے بینکوں کو امانتوں اور قرضوں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ قرض کا چوتھا حصّہ کمرشل بینکوں سے حاصل ہوتا ہے اور باقی ریزرو بینک، حکومت اور دوسرے ذرائع سے۔

جب ہم سنٹرل بینکوں کے اعداد شمار پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ۱۹۶۴-۶۵ء میں سنٹرل کواپریٹیو بینکوں کی تعداد ۳۸۱ تھی جن کے ممبروں کی مجموعی تعداد ۳,۸۱,۱۲۷ تھی۔ ان بینکوں کے پاس جو امانتیں تھیں اُس میں سے دو تہائی حصّہ افراد کا تھا اور ایک تہائی سے کم پرائمری سوسائٹیوں کا۔

ریزرو بینک کی حال کی ایک تحقیق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بمبئی اور مدراس کو چھوڑ کر باقی صوبوں کی پرائمری سوسائٹیوں کی سُود کی شرح کافی اونچی تھی۔ بمبئی اور مدراس میں سود کی شرح اِس لیے کم تھی کیونکہ ان صوبوں کی حکومتوں نے کواپریٹیو بینکوں کو کم سود پر مالی وسائل فراہم کرنے کے خاص اقدام کیے تھے۔ اِن صوبوں کی حکومتوں نے کئی موقعوں پر کواپریٹیو بینکوں کو ان کا خسارہ اور ان کی انتظامی لاگت کا ایک حِصّہ پورا کرنے کے لیے براہِ راست امداد دی۔ ہمارا خیال ہے کہ دوسرے صوبوں کی حکومتوں کو بھی یہی کرنا چاہیے اور ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ معتبر کسانوں کو جو قرض دیے جائیں اُن پر سُود قلیل ہو اور درمیانی مدّت کے قرض پر ۸ فی صدی اور لمبی مدّت کے قرض پر ۶ فی صدی سے زیادہ نہ ہو۔

(ب) لینڈ مارٹگیج بینک : عام کواپریٹیو سوسائٹیاں اور بینک اپنے ممبروں کو لمبی مدّت کے قرض نہیں دے سکتیں کیونکہ کواپریٹیو اصولوں کے مطابق ممبروں کو ان کی ذاتی ذمّہ داری پر دیا جانا چاہیے۔ ذاتی ذمّہ داری اور ساکھ پر لمبی مدّت کے قرض دینا ممکن نہیں ہے چنانچہ لینڈ مارٹگیج بینک ان کسانوں کو لمبی مدّت کے قرض دیتے ہیں جو اپنی زمینوں کو رہن رکھتے ہیں۔

ہندوستان میں پہلا لینڈ مارٹگیج بینک ۱۹۲۰ء میں پنجاب میں قائم ہوا لیکن ابتدائی مشکلات کی وجہ سے مؤثر طریقے سے نہ چل سکا۔ کامیابی کے ساتھ پہلی بار چلانے کا سہرا مدراس کے سر ہے۔ جس نے ۱۹۲۹ء میں سنٹرل مارٹگیج بینک قائم کیا۔ اس کے بعد سے مدراس کے نمونے پر دوسرے صوبوں میں لینڈ مارٹگیج بینک قائم کیے گئے۔

لینڈ مارگیج سوسائٹیاں اور بینک اپنے ممبروں کو لمبی مدت کے قرض دیتے ہیں۔ یہ قرض زمینوں کو بہتر بنانے، نئی زمین خریدنے اور پرانے قرض کو ادا کرنے کے لیے دیے جاتے ہیں۔ مدراس اور بمبئی میں لینڈ مارگیج بینک سرمایہ حاصل کرنے کے لیے ڈبنچرز جاری کرتے ہیں۔ اِس ڈبنچرز کی ضمانت صوبائی حکومت لیتی ہے۔ حال میں ریزرو بینک ۲۰ فی صدی ڈبنچر خریدنے پر رضامند ہوگیا ہے۔ لینڈ مارگیج بینک پبلک کی لمبی مدت کی امانت قبول کرتے ہیں۔ اِس طرح جو سرمایہ حاصل ہوتا ہے وہ لینڈ مارگیج سوسائٹیوں کو فراہم کیا جاتا ہے جس سے یہ سوسائٹیاں اپنے ممبروں کو قرض دیتی ہیں۔ پنجاب، مدھیہ پردیش اور مغربی بنگال کی دیہی لینڈ مارگیج سوسائٹیاں اپنے وسائل براہ راست اسٹیٹ کواپریٹیو بینکوں سے حاصل کرتی ہیں جبکہ اتر پردیش میں یہ سوسائٹیاں سرمایہ حاصل کرنے کے لیے ڈبنچرز جاری کرتی ہیں۔

رورل کواپریٹیو بینکوں کی طرح لینڈ مارگیج بینکوں نے صرف مدراس اور بمبئی میں کچھ ترقی کی ہے۔ کواپریٹیو بینکوں کی طرح یہ بینک بھی کسانوں کو جو قرض دیتے ہیں اُس پر سود زیادہ لیتے ہیں۔ اِس کے علاوہ درخواستوں کی جانچ کے لیے تربیت یافتہ عملے کی کمی اور کسانوں کی جہالت کی وجہ سے قرضوں کی منظوری میں بڑی دیر لگتی ہے۔ اِن خامیوں کی وجہ سے یہ بینک کسانوں کو لمبی مدت کے قرض کم دے پاتے ہیں۔

ہندوستان میں لینڈ مارگیج بینک کاری کی آئندہ ترقی کے لیے لینڈ مارگیج بینکوں، کواپریٹیو بینکوں اور صوبوں کے شعبۂ زراعت کے کاموں میں تال میل پیدا کرنا ضروری ہے۔ مارگیج بینکوں کے پاس تربیت یافتہ اسٹاف ہونا چاہیئے اور انھیں کتابچے شائع کرنا چاہیئے جن میں آسان زبان میں قرض حاصل کرنے کے طریقے اور ان کی شرائط درج ہوں۔ صوبائی حکومت، ریزرو بینک اور اسٹیٹ بینک کی دیہی شاخوں کو مارگیج اور کواپریٹیو بینکوں کو بلاواسطہ اور بالواسطہ مالی امداد مہیا کرنا چاہیے اور ان کی بہتر تنظیم کی نئی اسکیمیں تیار کرنی چاہئیں۔

(ج) رورل بینکنگ انکوائری کمیٹی کا تجزیہ: ۱۹۵۰ء میں رورل بینکنگ انکوائری کمیٹی نے دیہی بینک کاری اور قرض کی سہولتوں کے سلسلے میں مندرجہ ذیل سفارشات کیں: (۱) کمیٹی نے سفارش کی کہ دیہی قرض اور دیہی بچت کو حاصل کرنے کے مسائل سے ایک ہی مشینری کو نپٹنا چاہیئے جس کی تنظیم کواپریٹیو اصولوں کے مطابق ہو (۲) کمرشل بینکوں کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے کہ یہ دیہی علاقوں میں اپنی شاخیں کھولیں اور وہاں اپنا کاروبار بڑھائیں۔ قرض کی کواپریٹیو سوسائٹیوں اور

پوسٹ آفس سیونگ بینک کی سہولتیں گاؤں میں بھی ہونی چاہئیں۔ کوآپریٹو بینکوں اور سوسائٹیوں کو پوسٹ آفس سیونگ بینکوں کے ذریعے کم خرچ پر روپیہ ارسال کرنے کی سہولت دینی چاہیے۔ کوآپریٹو بینک اور سوسائٹیاں بھی نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ فروخت کرنے کی مجاز ہوں (۳) کمیٹی امپیریل بینک کے قومی ملکیت میں لائے جانے کے خلاف تھی۔ اُس نے امپیریل بینک پر عائد کیے گئے الزامات کو دُور کرنے کے لیے کئی تجاویز رکھیں۔ کمیٹی نے اجارہ داری، ضابطہ پرستی، دوسرے بینکوں سے غیر صحت مند مقابلہ، حد سے زیادہ مرکزیت اور ہندوستانی بنانے کی پالیسی کی عدم تعمیل، ان تمام الزامات کی پوری جانچ کی۔ لیکن کمیٹی کا خیال تھا کہ امپیریل بینک کے تعاون اور سرکاری کنٹرول اور ضابطوں کے ذریعے زیادہ تر خامیاں دُور کی جاسکتی ہیں اور نجی ملکیت میں رہ کر بھی یہ بینک سرکاری نگرانی میں ریزرو بینک کے ضمیمے کی حیثیت سے نمایاں رول ادا کرسکتا ہے۔ (۴) کمیٹی نے پورے ملک کے لیے مرکزی زرعی کارپوریشن کا قیام تجویز کیا۔

زراعتی ری فائنانس کارپوریشن کا جائزہ

ہندوستان میں یکم جولائی ۱۹۶۳ء سے کوآپریٹو مارگیج بینکوں کے علاوہ کوئی ایسا ادارہ نہیں تھا جو دیہی سرمایہ کاری میں دلچسپی رکھتا ہو۔ خود مارگیج بینکوں کی بھی دلچسپی محدود تھی اور ان میں سے بیشتر کی پہنچ وسائل کے کھلے بازار تک نہیں تھی۔ انڈسٹریل فائنانس کارپوریشن اور انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بینک کے دائرہ کار میں زراعتی سرگرمیاں نہیں تھیں۔ اگر کوئی جوائنٹ اسٹاک بینک زراعتی کاموں کے لیے قرض دینا بھی چاہتا تو ری فائنانس کی سہولت اس کو کسی ادارے سے نہ مل پاتی۔ چنانچہ زراعتی کاموں میں سرمایہ لگانے کے لیے کوآپریٹو اور شیڈیولڈ بینکوں کا ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے ایک ایسی مرکزی تنظیم کی ضرورت تھی جس کے پاس کافی وسائل ہوں اور جس کی رسائی حکومت، ریزرو بینک اور سرمائے کے بازار تک ہو۔ اس سلسلے میں یاد رکھنا چاہیے کہ اُنیس۱۹ برس پہلے رورل بینکنگ انکوائری کمیٹی نے سنٹرل ایگریکلچرل کارپوریشن کا قیام تجویز کیا تھا۔

خوشی کی بات ہے کہ حکومت اور ریزرو بینک کی کوششوں سے پارلیمنٹ میں ایگریکلچرل ری فائنانس کارپوریشن بل پیش ہوا جسے مارچ ۱۹۶۳ء میں پارلیمنٹ کی منظوری حاصل ہوگئی اور یکم مئی ۱۹۶۳ء سے اس کا نفاذ ہوگیا۔ یکم جولائی ۱۹۶۳ء سے ایگریکلچرل ری فائنانس کارپوریشن نے کام کرنا شروع کردیا۔

یہ کارپوریشن ایک ایسی ایجنسی ہے جو زراعتی ترقی کے لیے حاصل وسائل کو بڑھانے میں مدد کرتی ہے۔ لمبی اور درمیانی مدت کے قرضوں کے لیے موجودہ انتظام میں کارپوریشن ان کا بدل نہیں ہے بلکہ مددگار ہے۔ قرض کی ایجنسی کی حیثیت سے اس کی جو ذمہ داریاں ہیں ان کے علاوہ کارپوریشن کوشش کرتا ہے کہ لوگوں کو زراعتی ترقی کی مخصوص اسکیموں میں دلچسپی پیدا ہو، اداروں کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ کس طرح زراعتی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے قرض کی سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مجاز ادارے بیرونی ممالک سے جو مشینیں وغیرہ قرض خریدتے ہیں اُن کی ادائیگی کی ضمانت بھی کارپوریشن لیتا ہے۔ کارپوریشن کو شیئر سرمائے، پبلک کی امانتوں، ریزرو بینک اور حکومت سے قرض اور بانڈ اور ڈبنچرز جاری کرکے وسائل فراہم کرنے کا اختیار ہے۔ کارپوریشن ۵۰ کروڑ کے سرمائے کا مجاز ہے جو دس دس ہزار کے ۲۵ ہزار شیئر میں تقسیم ہے۔ ابتدا میں ۵ کروڑ سرمائے کے لیے ۵۰۰۰ شیئر جاری کیے گئے تھے۔

کارپوریشن سنٹرل مارگیج بینکوں، اسٹیٹ کواپریٹو بینکوں اور شیڈیولڈ بینکوں کو ری فائنانس کی شکل میں مالی امداد مہیا کرتا ہے۔ براہ راست مالی امداد صرف مخصوص حالات میں دی جاتی ہے جہاں تک لینڈ مارگیج بینکوں کا سوال ہے، ری فائنانس کی یہ بھی صورت ہوسکتی ہے کہ یہ بینک اُن ترقیاتی ڈبنچروں کو خریدے جو زراعتی ترقی کی منظور شدہ اسکیموں کے سلسلے میں جاری کیے گئے ہوں۔ یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ کارپوریشن زراعتی ترقی کی صرف اُن اسکیموں کو ری فائنانس کی سہولت دیتا ہے جو معاشی اعتبار سے مستحکم اور تکنیکی اعتبار سے ممکن ہوں۔

کارپوریشن کا انتظام ایک بورڈ کے سپرد ہے جس میں مع مینجنگ ڈائرکٹر ۹ ممبر ہوتے ہیں۔ ریزرو بینک کا ڈپٹی گورنر، جس کے ذمے زراعتی قرض کا شعبہ ہوتا ہے، اس بورڈ کا چیرمین ہوتا ہے۔

۳۰ جون ۱۹۶۸ء کو کارپوریشن نے ۵ برس پورے کرلیے۔ ۶۸-۱۹۶۷ء کے دوران کارپوریشن نے ۹۰ اسکیمیں منظور کیں جن کا مجموعی خرچ ۶۸ر۱۶ کروڑ تھا۔ اس میں کارپوریشن کی ذمہ داری بقدر ۵۸ر۴۶ کروڑ تھی۔ اس کے مقابلے میں پہلے چار برسوں میں کارپوریشن نے ۴۴ر۲۹ کروڑ کی ۴۴ اسکیمیں منظور کیں جن میں کارپوریشن کی ذمہ داری ۳۲ر۳۴ کروڑ تھی۔ یکم جولائی ۱۹۶۳ء سے ۳۰ جون ۱۹۶۸ء تک کارپوریشن نے ۰۷ر۵۷ اکروڑ کی ۱۲۸ اسکیمیں منظور کیں اور بقدر ۹۰ر۹ کروڑ کی ذمہ داری قبول کی۔

مختصر یہ کہ کارپوریشن کے قیام سے اسٹیٹ کواپریٹو بینکوں، مارگیج بینکوں اور شیڈیولڈ

بینکوں کو زراعت میں سرمایہ لگانے اور زراعتی پیداوار بڑھانے میں مدد کرنے کا موقع بلا براہ راست قرض کے بجائے ری فائنانس کے ذریعے وسائل کی فراہمی سے کارپوریشن کو دوسرے اداروں کی مدد کرنے کا موقع ملے گا۔ ور زراعتی استحکام اور تنظیم نو میں سہولت ہوگی جو اس وقت اشد ضروری ہے۔

امپیریل بینک اور اُس کا قومی ملکیّت میں آنا

(الف) کام : امپیریل بینک ہندوستان کا سب سے بڑا کمرشل بینک تھا اور ہندوستان کے بازارِ زر میں اُس کی مخصوص حیثیت تھی ۔ امپیریل بینک ۱۹۲۱ء میں مدراس، بمبئی اور کلکتے کے پریسیڈنسی بینکوں کو مدغم کرکے وجود میں لایا گیا تھا۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۵ء کے درمیان اس کی حیثیت کمرشل بینک کے ساتھ ساتھ سرکاری بینکر کی بھی تھی۔ ۱۹۳۵ء میں ریزرو بینک قائم ہونے کے بعد اُس کی یہ حیثیت ختم ہو گئی لیکن اُس کو ریزرو بینک کے ایجنٹ کی حیثیت سے اُن جگہوں پر سرکاری لین دین کا کام کرنے کی اجازت تھی جہاں ریزرو بینک کا کوئی آفس نہیں تھا۔ ایسی جگہوں پر یہ بینک ریزرو بینک کی طرف سے کرنسی اور سکوں کے خزانے کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ ان خصوصیات کی وجہ سے امپیریل بینک کی ایک ساکھ قائم ہو گئی تھی اور دوسرے بینکوں کے مقابلے میں اس کا انتظام بہتر تھا۔

بڑی حیثیت، بڑے وسائل اور تعلقات کی وجہ سے امپیریل بینک ملک کے بازارِ زر میں رہنما تصور کیا جاتا تھا۔ امپیریل بینک بلوں کو ری ڈسکاؤنٹ کرتا تھا اور ملک کی اندرونی تجارت کے لیے مالی وسائل فراہم کرتا تھا۔ اندرونی تجارت میں فصلوں کی منتقلی بھی شامل تھی۔

(ب) امپیریل بینک کے خلاف اعتراضات : امپیریل بینک کے خلاف مندرجہ ذیل اعتراضات کیے جاتے تھے :

(۱) بینک کے منتظمین کی ضابطہ پرستی اور صرف چند ہاتھوں میں سارا انتظام بہت قابلِ اعتراض باتیں سمجھی جاتی تھیں ۔ چنانچہ معترضین کا اصرار تھا کہ حکومت اسے اپنی ملکیت میں لے لے۔

(۲) دوسرا اعتراض یہ تھا کہ یورپی کمپنیوں کو زیادہ نوازا جاتا ہے جس کی وجہ سے ہندوستانی کاروبار کو نقصان پہنچتا ہے ۔

(۳) آزادی کے بعد سے اس بات پر بہت زور تھا کہ اعلیٰ عہدوں کو فوراً ہندوستانی ہاتھوں میں دیا جائے ۔ معترضین کا مطالبہ تھا کہ عام اعلیٰ افسر ہندوستانی رکھے جائیں اور اس مقصد کے

پیشِ نظر ہندوستانی افسروں کی تربیت کا انتظام کیا جائے اور انھیں ترقی دی جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ بینک کو قومی ملکیت میں لائے بغیر اعلیٰ عہدوں کو ہندوستانی ہاتھوں میں لانے میں تاخیر ہوگی۔

(۴) ایک اور اعتراض یہ تھا کہ یہ دوسرے بینکوں کے ساتھ ناجائز مقابلہ کرتا ہے۔ یہ بینک چونکہ سرکاری لین دین بھی کرتا تھا اور اپنے گاہکوں کی رقموں کی منتقلی کم شرح پر کرتا تھا اِس لیے اُس کی ایک مخصوص حیثیت ہوگئی تھی اور دوسرے بینکوں کے لیے اُس کا مقابلہ کرنا مشکل تھا۔ معترضین کا کہنا تھا کہ قومیانے کے بعد امپیریل بینک ایک سرکاری ادارہ بن جائے گا جس کا ایک مخصوص حلقۂ کار ہوگا اور اِس طرح اُس کی موجودہ غیر معمولی صورت ختم ہو جائیگی اور دوسرے بینکوں کو بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع ملیگا۔

امپیریل بینک کا قومی ملکیت میں آنا (اسٹیٹ بینک کا قیام)

اگرچہ ۱۹۵۰ء کی رورل انکوائری کمیٹی امپیریل بینک کو قومی ملکیت میں لانے کے خلاف تھی لیکن ۱۹۵۴ء کی آل انڈیا رورل کریڈٹ سروے کمیٹی نے کچھ اسٹیٹ اسوشیٹڈ بینکوں اور امپیریل بینک کو ملا کر اسٹیٹ بینک قائم کرنے کی سفارش کی۔ چنانچہ ۱۹۵۵ء میں اسٹیٹ بینک آف انڈیا ایکٹ پاس ہوا اور یکم جولائی ۱۹۵۵ء سے اِس نے امپیریل بینک کا تمام اثاثہ اور واجبات لے کر کام شروع کر دیا۔

اسٹیٹ بینک کا قانونی شیئر کیپیٹل ۲۰ کروڑ اور جاری شیئر کیپیٹل ۵ء۶۲ کروڑ ہے ۱۹۵۵ء کے اسٹیٹ بینک آف انڈیا ایکٹ کے تحت امپیریل بینک کے شیئر ہولڈروں کو پورے بیباق شیئروں پر ۱۷۶۵ روپے ۱۰ آنے اور جزوی بیباق شیئروں پر ۴۳۱ روپے ۱۲ آنے ۴ پائی معاوضہ ادا کیا گیا۔ معاوضے کا حساب لگانے کے لیے حکومت نے شیئر کی ایک مدت تک کی قیمت کا اوسط نکال لیا۔ معاوضہ مرکزی حکومت کی سیکیورٹیوں کی شکل میں دیا گیا اور ہر شیئر ہولڈر کو اختیار دیا گیا کہ وہ چاہے تو اپنے امپیریل بینک کے شیئر کے بدلے اسٹیٹ بینک کے شیئر لے لے لیکن ریزرو بینک کو اختیار دیا گیا کہ شیئر کی یہ منتقلی زیرِ استعمال سرمائے کے صرف ۴۵ فی صدی تک عمل میں لائے۔ بہ الفاظ دیگر زیرِ استعمال سرمایہ کا ۵۵ فی صدی حکومت اور ریزرو بینک کے ہاتھ میں رکھا گیا۔ ۱۹۵۵ء کے ایکٹ کے تحت اسٹیٹ بینک کا انتظام ایک مرکزی بورڈ کے سپرد ہے جس میں ایک

چیرمین، ایک وائس چیرمین اور دو[۲] مینیجنگ ڈائرکٹروں کے علاوہ ۱۴ ڈائرکٹر ہوتے ہیں چیرمین اور وائس چیرمین کا تقرر ریزرو بینک کے مشورے سے مرکزی حکومت کرتی ہے۔

۱۹۵۵ء کے ایکٹ کے تحت اسٹیٹ بینک کو اختیار ہے کہ وہ حکومت کی منظوری سے دوسرے بینکوں کا کاروبار ان کے شیئر ہولڈروں کو معاوضہ دے کر اُن سے لے سکتی ہے۔ حکومت سے منظور شدہ توسیعی پروگرام کے تحت اسٹیٹ بینک کو ۳۰ جون ۱۹۶۰ء تک بینک کی چار سو شاخیں کھولنی تھیں۔ قومی مفاد میں اِن شاخوں کے کھولنے کی وجہ سے اسٹیٹ بینک کو جو خسارہ ہو اُسے پورا کرنے کے لیے ایک ترقیاتی فنڈ قائم کیا گیا۔ ریزرو بینک کے ۵۵ فی صدی شیئروں پر جو منافع ہو وہ سب اس فنڈ میں جمع ہوتا تھا۔ اِس کے علاوہ ریزرو بینک اور مرکزی حکومت اِس فنڈ کو وقتاً فوقتاً اور رقمیں بھی دے سکتی ہے۔

اسٹیٹ بینک نے معینہ مدت کے ختم ہونے سے پہلے ہی دیہی اور شہری علاقوں میں شاخیں کھولنے کا اپنا پروگرام پورا کر لیا۔ چار سوویں شاخ مظفر نگر ضلع کے کیرانہ مقام پر یکم جون ۱۹۶۰ء کو کھول دی گئی۔ اب تک (یعنی جون ۱۹۶۸ء تک) اسٹیٹ بینک دیہی اور نیم شہری علاقوں میں ایک ہزار شاخیں کھول چکا ہے۔ جون ۱۹۵۵ء میں اسٹیٹ بینک کے ۴۷۴ دفاتر تھے۔ نئی شاخیں کافی تیزی سے بڑھیں اور جون ۱۹۶۸ء کے ختم تک شاخوں کی تعداد ۱۵۰۶ تک پہنچ گئی تھی۔

اسٹیٹ بینک کی ماتحت کمپنیوں نے اکتوبر ۱۹۵۹ء سے اپنی سرگرمی شروع کر دی تھی اور اب اِن کی ۴۰۵ شاخیں کام کر رہی ہیں۔ غرضیکہ اسٹیٹ بینک کی شاخوں اور ماتحت کمپنیوں کا جال کافی پھیل چکا ہے اور ان کے ذریعے عوام کی مختلف بینکی ضروریات پوری ہو رہی ہیں اور یقین ہے کہ یہ ملک کی معاشی ترقی میں نمایاں رول ادا کریں گی۔

سرکاری نگرانی اور کنٹرول کے تحت بینکنگ کی راہ امپیریل بینک کا قومی ملکیت میں لانا ایک بہت بڑا قدم ہے جس کا مقصد ہماری ترقیاتی منصوبہ بندی کے دوران دیہی اور شہری علاقوں کی ہم وقت ترقیاتی ضروریات پورا کرنا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ قومی ملکیت میں آنے کے بعد سے اسٹیٹ بینک کی قوت اور ساکھ بڑھی ہے۔ اس کو اپنی مضبوطی کا پورا احساس ہے اور اُس کے کام کا حلقہ ۱۴ برس پہلے کے مقابلے میں اب بہت وسیع ہے لیکن اسٹیٹ بینک اپنی کارگزاری سے مطمئن نہیں ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اگرچہ وسائل بڑھے ہیں لیکن ذمّہ داریاں اور

توقعات میں اِن سے بھی زیادہ تیزی سے اِضافہ ہوا ہے

زراعت اور چھوٹی صنعتوں کے لیے وسائل کی فراہمی میں اسٹیٹ بینک کا رول

اسٹیٹ بینک تجارتی بینکنگ کے عام کاروبار کرتا ہے اور زراعت، صنعت اور تجارت کے لیے قرض دیتا ہے۔ یہ دیہی علاقوں کے لیے امپیریل بینک کے مقابلے میں رقموں کی منتقلی کی زیادہ سہولتیں فراہم کرتا ہے اور اپنی شاخوں کے ذریعے دیہی بچت کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اسٹیٹ بینک زراعتی سکٹر کو براہِ راست امداد نہیں دیتا بلکہ یہ امداد کواپریٹیو سوسائٹیوں کے ذریعے دی جاتی ہے اور بیشتر زراعتی پیداوار کو فروخت کرنے اور قابلِ فروخت بنانے کے لیے ہوتی ہے۔ ریزرو بینک کی اسکیم کے تحت اسٹیٹ بینک کواپریٹیو مالیاتی اداروں کو رقموں کی ترسیل کی جو سہولت دیتا ہے اس میں ۳ کروڑ کے بقدر اضافہ ہوا۔ ۳۰ جون ۱۹۶۴ء کو ختم ہونے والے ۱۲ مہینوں میں رقم ۲۵۹ کروڑ تھی جو اگلے بارہ مہینوں میں، یعنی ۳۰ جون ۱۹۶۵ء تک ۲۶۲ کروڑ ہوگئی۔ اسٹیٹ بینک کی خود اپنی اسکیم کے تحت یہ سہولتیں ۱۸۶ کروڑ سے بڑھ کر ۲۲۵ کروڑ کے بقدر ہوگئیں۔

کواپریٹیو اداروں کو دیے جانے والے تمام قرضوں کی، جو زیادہ سے زیادہ حد اسٹیٹ بینک نے منظور کر رکھی ہے وہ ۱۹۶۶ء کے ۹٫۵۹ کروڑ سے بڑھ کر ۱۹۶۷ء میں ۶۱٫۷ کروڑ ہوگئی۔ لینڈ مارٹگیج بینکوں کے ڈبنچر کی ضمانت پر بھی بینک انھیں قرض دیتا ہے۔

اسٹیٹ بینک نے گوداموں کی رسید کی ضمانت پر قرض دے کر گوداموں کی اسکیم کو مقبول بنانے میں مدد کی۔ مرکزی اور صوبائی گودام کارپوریشن کے گوداموں کی رسید کی ضمانت پر دیا گیا قرض ۱۹۶۶ء کے ۸٫۳ کروڑ سے بڑھ کر ۱۹۶۷ء میں ۸٫۴ کروڑ ہوگیا۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو مالی وسائل فراہم کرنے سے متعلق اسٹیٹ بینک کی پائلٹ اسکیم جو ۱۹۵۶ء میں چند منتخب مرکزوں میں شروع کی گئی تھی کافی کامیاب رہی۔ اس تجربے کی بنیاد پر یکم جنوری ۱۹۵۹ء سے اسٹیٹ بینک اپنی شاخوں کے ذریعے چھوٹی صنعتوں کو مالی وسائل فراہم کرتا رہا ہے۔ ۲۵ جنوری ۱۹۵۶ء کو چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے حسابات کی تعداد صرف ۲۵ تھی جو دسمبر ۱۹۶۷ء تک ۱۳۰۰۰ ہوگئی اور قرض کی زیادہ سے زیادہ حد ۱۹۵۶ء کی ۱۱ لاکھ سے بڑھ کر دسمبر ۱۹۶۷ء کے ختم پر ۸۵ کروڑ ہوگئی۔

بینک نے چھوٹی صنعتوں کی قابلِ قبول ضمانتوں کی فہرست میں بہت سی نئی چیزوں کا اضافہ کر لیا ہے جو پہلے قابلِ قبول نہیں تھیں۔ اس فہرست میں بھی نئی چیزوں کا اضافہ کیا گیا ہے جن کی ضمانت پر ایجنٹ اپنے اختیارات خصوصی استعمال کرکے قرض دے سکتا ہے۔ فہرست میں تقریباً تمام فوراً فروخت ہونے والا مال شامل ہے۔ یکم اگست ۱۹۶۶ء سے قرضوں کو آسان بنانے کے نئے اقدام حکومت کی منظوری سے کیے گئے۔

حال میں حکومت نے ریزرو بینک کے ساتھ مل کر چھوٹی صنعتوں کے لیے کریڈٹ گارنٹی اسکیم بنانے کی طرف جو قدم اٹھایا ہے وہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ اسٹیٹ بینک اس اسکیم سے پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اسٹیٹ بینک نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ چھوٹی صنعتوں کو دیے جانے والے تمام قرض اس اسکیم کے تحت لے آئے جائیں۔ یہ اسکیم یکم جولائی ۱۹۶۰ء سے تجرباتی حیثیت میں ۲۲ منتخب حلقوں میں شروع کی گئی۔ یکم جون ۱۹۶۱ء سے اس اسکیم کو بڑھا کر ۵۲ ضلعوں پر نافذ کر دیا گیا۔ بعد میں آگے چل کر پورا ملک اس کے تحت لے آیا گیا۔ ضمانت کی قیمت زیادہ سے زیادہ منظور شدہ رقم کی ½ فی صدی سالانہ مقرر کی گئی ہے۔ اسکیم کے تحت جتنی رقم پر ضمانت دی جا سکتی ہے وہ بتدریج گھٹتی جاتی ہے، یعنی بڑے قرضوں کے مقابلے میں چھوٹے قرضوں کو زیادہ ضمانت حاصل ہوتی ہے۔ ضروری ضمانتی فنڈ حکومت نے فراہم کیا ہے اور اسکیم ریزرو بینک چلاتا ہے۔ اسکیم کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ نہ ادا ہو سکنے والے ممکن قرض کے خلاف ضمانت فراہم کرکے کمرشل بینکوں کو سہولت دی جائے کہ وہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو زیادہ قرض دیں۔ اب تک کے تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اسکیم سے اسٹیٹ بینک، کمرشل اور کوآپریٹو بینکوں اور اسٹیٹ فائنانس کارپوریشن کو تحریک ہوئی ہے اور اب چھوٹی صنعتوں کو بھی قرض کی زیادہ سہولتیں دی جا رہی ہیں۔

کمرشل بینکوں کو قومی ملکیت میں لانے کا سوال

۱۹۵۵ء میں امپیریل بینک کے قومی ملکیت میں آنے کے بعد کمرشل بینکوں کے قومی ملکیت میں لانے کے سوال پر بحث شروع ہوئی۔ لیکن ادھر کچھ عرصے سے یہ مطالبہ شدید ہو گیا ہے کیونکہ بہت سے لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ان بینکوں کے قومی ملکیت میں آنے سے چھپی ہوئی دولت کا کچھ تدارک ہو سکے گا اور یہ وسائل حکومت کے ہاتھ آ جائیں گے جنھیں ترقیاتی کاموں میں لگایا

جاسکے گا۔ اِس کے حق میں جو دلیلیں دی جاتی ہیں وہ یہ ہیں :

(۱) پرائیویٹ سکٹر کے بینک جن کا بیباق سرمایہ بہت تھوڑا ہے، پبلک کی امانتوں کی بہت بڑی رقم کنٹرول کرتے ہیں اور اس کے ذریعے اجارہ داری اور قوت و دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہونے کے رجحان کو بڑھا رہے ہیں۔ مہالنوبس کمیٹی جس نے اپنی رپورٹ فروری ۱۹۶۴ء میں پیش کی اس نتیجے پر پہنچی کہ نجی اسٹاک کا ۵ء۷ فی صدی ملک کے ایک فی صدی خاندانوں کے ہاتھ میں ہے اور اس چھوٹی سی اقلیت میں بھی تھوڑے سے خاندان ہیں جن کے ہاتھ میں سب سے زیادہ طاقت ہے۔ مناپلیز انکوائری کمیشن نے اپنی رپورٹ دسمبر ۱۹۶۵ء میں پیش کی۔ اِس میں کہا گیا ہے کہ ملکیت کے مقابلے میں انتظامی کنٹرول چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے کا رجحان زیادہ ہے اور بینک اور دوسرے مالیاتی ادارے جس فراخ دلی سے قرض دیتے ہیں اُن کی وجہ سے ارتکاز کا رجحان مضبوط تر ہو رہا ہے۔ چنانچہ ان بینکوں کو قومی ملکیت میں لے آنے سے یہ خرابی ایک حد تک دُور ہو جائے گی۔

(۲) پرائیویٹ سکٹر کے کمرشل بینکوں پر صنعت کار حاوی ہیں جو پبلک کی ساری امانت کو اپنے کام کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مجموعی وسائل جو ان کے ہاتھ میں ہیں ان کے دیکھتے اُن کا شیئر کیپیٹل صرف ۲ فی صدی ہوگا۔ عام طور سے بڑے کاروباری بے روک ٹوک مالی کارروائیوں اور سٹے بازی میں مشغول رہتے ہیں کیونکہ ان کے ہاتھوں میں شیئر کیپیٹل برائے نام ہوتا ہے۔ اِن کاموں کے لیے انھیں اُن بینکوں سے قرض کی خاص سہولتیں دستیاب ہوتی ہیں جو ان کے دوستوں اور عزیزوں کے زیرِ اہتمام ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کمرشل بینکوں کے بے پناہ وسائل کاروباری لوگ خالص سٹے بازی اور ضروری اشیا کی ذخیرہ اندوزی کے لیے استعمال کرتے ہیں اور صرف اِس لیے کہ بہت سے بینکوں کے ڈائرکٹر ان کے ذاتی دوست ہوتے ہیں۔ ویوین بوس کمیشن کی تحقیق سے مندھرا کے سلسلے میں بینکوں کی غیر سماجی حرکتیں، زرِ مبادلہ کے قاعدوں کی خلاف ورزیاں اور دوسری بہت سی بدعنوانیاں ظاہر ہوئیں۔ بینکوں کے قومی ملکیت میں لانے سے یہ خرابیاں دُور کی جا سکتی ہیں۔

(۳) قومی ملکیت میں لانے کی وجہ سے دیہی اور نیم شہری علاقوں میں بینک کی شاخیں کھولی جا سکیں گی اور اِس طرح اِن علاقوں کی بچتوں کو مجتمع کرنے کی رفتار تیز ہوگی۔

(۴) قومی ملکیت میں آجانے کی وجہ سے روپیہ جمع کرنے والوں کی رقم سو فی صدی محفوظ

رہےگی اور ڈپازٹ انشیورنس اسکیم پر کچھ نہ خرچ ہوگا۔

(۵) چھپی ہوئی آمدنی اور دولت کا ایک حد تک تدارک ہو سکیگا اور ترقیاتی ضروریات کے لیے زیادہ وسائل دستیاب ہونگے۔

(۶) آخر میں اگر ہم اکسچینج بینکوں کے رول پر نظر ڈالیں تو قومی ملکیت میں لانے کے حق میں دلیل زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے۔ ان بینکوں میں اس وقت ۳۰۰ کروڑ کی امانتیں جمع ہیں جبکہ خود ان کا کوئی سرمایہ ہندوستان میں نہیں لگا ہے۔ یہ بینک ہندوستانی کمرشل بینکوں سے سخت مقابلہ کرتے ہیں۔ اِن کا سارا منافع باہر جاتا ہے جس کا اثر ہماری ادائیگی کے توازن پر پڑتا ہے۔ قومی ملکیت میں لانے کی وجہ سے اِن غیر ملکی بینکوں سے نجات حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔

قومی ملکیت میں لانے کے خلاف یہ دلیلیں دی جاتی ہیں

(۱) اِس وقت چونکہ بینک کا انتظام شخصی ہے اِس لیے مستعدی سے کام ہوتا ہے۔ قومی ملکیت میں آنے کے بعد یہ مستعدی، خصوصاً اکسچینج بینکوں کی مستعدی ختم ہو جائے گی۔ ضابطہ پرستی، تاخیر، پہل اور فوری فیصلے کی کمی کی وجہ سے بینک کاری کا نظام خراب ہو جائے گا۔

(۲) اسٹیٹ بینک پچھلے دس برسوں سے مستعدی سے کام کر رہا ہے لیکن اِس سے یہ نتیجہ نہ نکلنا چاہیے کہ کمرشل بینک بھی قومی ملکیت میں لے آئے جائیں۔ اسٹیٹ بینک کی کارکردگی کی وجہ یہ ہے کہ اس کو پرائیویٹ سکٹر کے خوش انتظام اور منظم بینکوں سے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر اِن تمام بینکوں کو قومی ملکیت میں لے آیا گیا تو روپیہ جمع کرنے والے بد انتظامی کی صورت میں اپنا حساب دوسرے بینک کو نہ منتقل کر سکیں گے۔ ایسی حالت میں قدرتاً بینک کی سروس خراب ہو جائے گی۔

(۳) جہاں تک زراعت اور چھوٹی صنعتوں کو نظر انداز کرنے کا سوال ہے، یہ دلیل بھی معقول نہیں ہے کیونکہ کمرشل بینکوں کو نقد پزیری سے متعلق اصولوں کی پابندی کرنی پڑتی ہے حقیقت یہ ہے کہ کمرشل بینکوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ یہ اپنا سرمایہ لمبی مدت کے غیر نفع بخش کاروبار میں پھنسا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اِن کاموں کے لیے مالی وسائل کی فراہمی حکومت کا کام ہے جس کو یہ کام ریزرو بینک، اسٹیٹ بینک اور کواپریٹوز کے ذریعے کرنا چاہیے۔

(۴) روپیہ جمع کرنے والوں کی رقم کی سو فی صدی ضمانت کا بھی سوال نہیں اُٹھتا کیونکہ

ڈپازٹ انشیورنس کارپوریشن مستعدی سے کام کر رہا ہے اور اِس کی وجہ سے روپیہ جمع کرنے والوں کو ذہنی اطمینان حاصل ہے۔

(۵) جہاں تک نجی سکٹر کے بینکوں کی بدعنوانیوں کا سوال ہے مالیاتی اقدام اور سکہ جاتی تدابیر کی ہم آہنگی اور مادی کنٹرول کو اگر مؤثر طریقے سے عمل میں لایا جائے تو یہ بدعنوانیاں بڑی حد تک دُور کی جاسکتی ہیں۔ اِس کے علاوہ ریزرو بینک کے معائنہ کرنے والے عملے کو اگر از سرِ نو ترتیب دیا جائے تو اِس سے بھی بدعنوانیاں دُور کرنے میں مدد ملے گی۔

(۶) قومی ملکیت میں لانے سے سرکاری خزانے کی آمدنی کچھ بہت زیادہ نہ بڑھے گی کیونکہ شیر ہولڈروں کو معاوضہ دینا ہوگا۔ اِس کے علاوہ قومی ملکیت میں آنے کے بعد بھی منافع کا کافی حصّہ ریزرو فنڈ کو مستحکم کرنے کے لیے الگ کر دینا ہوگا۔

مختصر یہ کہ اِس وقت جبکہ حکومت مختلف اصلاحات کے ذریعے قیمتوں کو قابو میں کرنے اور معاشی استحکام لانے کی کوشش کر رہی ہے اور معیشت کساد بازاری کے رجحانات پر قابو پانے لگی ہے یہ تجربہ خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ بینکوں کے قومیانے کو الگ کرکے نہ دیکھنا چاہیے بلکہ اِس کو سماجیانے کے جامع پروگرام کا ایک اہم جزو سمجھنا چاہیئے جس کے لیے پہلے سے زمین ہموار کرنا ضروری ہے۔ اِسی لیے حکومت نے ابتداً کمرشل بینکوں کو سماجی کنٹرول میں لانے کا فیصلہ کیا ہے۔

بینکوں کے سماجی کنٹرول کا تجزیہ

دوسری جنگِ عظیم کے بعد بینکوں کے دیوالیہ ہونے کا جو خراب اثر ملک کے بینکنگ نظام، ملک کی معیشت اور عوام پر مرتب ہوا اُس سب کا مجموعی نتیجہ ۱۹۴۹ء کا بینکنگ کمپنیز ایکٹ تھا جس کا مقصد بینکوں کی رہنمائی کرنا اور بینکی کاروبار کو مستحکم کرنا تھا۔ اِس ایکٹ کے نفاذ سے بینک کاری میں ربط اور ہم آہنگی پیدا ہوئی اور امانتوں کو مجتمع کرنے اور قرض دینے کے معاملات میں صحیح سمت کا تعین ہوا ہے۔ اِس کے باوجود یہ عام طور سے یقین کیا جاتا ہے کہ معاشی منصوبے کے تحت جو چیزیں مقدّم سمجھی جاتی ہیں اُن میں اور قرض دینے کی پالسی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ملک کی معاشی زندگی میں بینکوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اِس لیے اُن کا فرض ہے کہ یہ معاشی اور سماجی مقاصد پورے کرنے میں مدد کریں، ترقی کی زیادہ سے زیادہ شرح حاصل کریں، اجارہ داری اور قوت کے اجتماع کا تدارک کریں اور وسائل کو غلط کاموں میں لگنے نہ دیں۔

اِس میں شک نہیں کہ قومی ملکیت میں لانے کی وجہ سے حکام کو بیشتر خامیاں دُور کرنے کا موقع ملیگا لیکن چونکہ فوری طور پر ایسا کرنا ممکن نہیں ہے جب تک زمین ہموار نہ کر لی جائے۔ اِس لیے ابتدائی قدم کی حیثیت سے یہ طے کیا گیا کہ کمرشل بینکوں کے کاموں کو مؤثر سماجی کنٹرول کے تحت لے آیا جائے۔ سماجی کنٹرول کے مقاصد یہ ہیں: (۱) قرض دینے کی پالیسی کو وسعت دی جائے اور قرض دیے جانے والوں کی فہرست میں زراعت اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو بہتر جگہ دی جائے (۲) منصوبوں کی مؤثر تعمیل اور سوشلسٹ سماج قائم کرنے سے متعلق سرکاری پالیسی کو ترقی دی جائے (۳) بینکوں کے بورڈ آف ڈائرکٹرز میں اور قرض دینے کے فیصلوں میں زیادہ نمائندوں کو شامل کیا جائے۔

اِس سلسلے میں اُس دُو ہزار الفاظ پر مشتمل رپورٹ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو ریزرو بینک کے مسٹر وی۔ اے۔ پانڈیکر نے تیار کی تھی اور جو اکتوبر کے پہلے ہفتے میں پیش کی گئی۔ رپورٹ میں اِس بات پر زور دیا گیا ہے کہ بینکوں کے طریقۂ کار میں مناسب تبدیلی لائے بغیر صرف قومی ملکیت میں لے آنے سے بینکی نظام سماجی مقصد کے مطابق تجارت اور صنعت کو قرض کی سہولت نہ فراہم کر سکے گا۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ سرکاری بینکوں کی پالیسی اور ان کا طریقہ کار بھی نجی بینکوں سے مختلف نہیں ہوتا ہے۔ رپورٹ میں سفارش کی گئی کہ فرانسیسی نمونے پر ایک نیشنل کریڈٹ کونسل قائم کی جائے جو سماجی کنٹرول کا مقصد پورا کرنے میں کمرشل بینکوں کی رہنمائی کرے۔

رپورٹ میں ان تمام دلیلوں پر غور کیا گیا جو قومی ملکیت میں لانے کے حق میں یا اُس کی مخالفت میں پیش کی جاتی ہیں اور نتیجہ یہ اخذ کیا گیا کہ قومی ملکیت میں لانے کے بہت سے خراب معاشی، انتظامی اور مالی اثرات ہونگے۔ اِس میں کہا گیا ہے کہ مخلوط معیشت اور بینکوں کا قومی ملکیت میں لانا متضاد چیزیں ہیں۔ حکومت کی زیرِ نگرانی نجی بینک سماجی مقاصد بھی پورے کر سکتے ہیں اور ساتھ ہی لوچ اور اثر پزیری بھی قائم رکھ سکتے ہیں۔ جو افراد اور صنعت کاروں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ضروری ہے۔

قومی ملکیت میں لانے کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ بینکوں کے ساتھ صنعت اور تجارت کا جو رشتہ قائم ہے وہ درہم برہم ہو جائے گا۔ امانتوں کا بڑھنا رک جائے گا کیونکہ قومی ملکیت میں آنے کا نفسیاتی اثر یہ ہوگا کہ لوگ اپنی امانتیں منظم بازارِ زر سے غیر منظم بازارِ زر کو منتقل کر دیں گے۔ بینکوں پر سیاسی دباؤ پڑیں گے اور قرض کی منظوری میں کاروباری اصولوں کے بجائے سیاسی لحاظ پیش نظر ہوگا۔ جہاں تک

انتظام کا تعلق ہے قومی ملکیت میں آنے کی وجہ سے مقابلہ ختم ہو جائے گا اور ضابطہ پرستی آجائے گی نتیجہ یہ ہوگا کہ گاہکوں اور بینک کے تعلقات خراب ہوں گے۔ ضرورت سے زیادہ احتیاط کی وجہ سے فیصلے کا عمل طویل ہوگا۔ موجودہ شیئر ہولڈروں کو معاوضہ دینے کی وجہ سے محدود وسائل اُدھر منتقل ہو جائیں گے رپورٹ میں خیال ظاہر کیا گیا کہ قومی تجارت، بیرونی امداد اور بیرونی سرمائے کی آمد پر اس کا خراب اثر پڑے گا۔

مسٹر پانڈے نے اِس خلا پر بھی غور کیا جو قرضوں کی طلب اور رسد کے درمیان واقع ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ معیشت کے اہم حلقوں میں سرمائے کی قلت ہے جس کی وجہ سے معیشت کی ترقی میں رخنہ پڑتا ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ مختلف حلقوں کی قرض کی ضروریات کا تخمینہ کیا جائے اور سماجی مقصد کے پیش نظر مقدم کاموں کی فہرست تیار کی جائے۔ اِس لیے رپورٹ میں ایک نیشنل کونسل کا قیام تجویز کیا گیا ہے۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ قرض کے معاملات میں حکومت کا کنٹرول نہ پورے طور پر بینکوں کو قومی ملکیت میں لانے سے قائم ہو سکتا ہے اور نہ جزوی طور سے۔ چنانچہ رپورٹ اس بات کی حامی ہے کہ سماجی مقاصد کے حصول کے لیے بینکنگ کے نظام پر اور زیادہ کنٹرول قائم کیا جائے۔ اگرچہ رپورٹ بینکوں کو قومی ملکیت میں لانے کے خلاف ہے تاہم نجی بینکوں کی خرابیوں کی لیپ پوت کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اِس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ نئے صنعت کار جو ایک ترقی پذیر معیشت کی جان ہوتے ہیں، حسب ضرورت قرض نہیں حاصل کر پاتے ہیں۔ رپورٹ میں تجویز کیا گیا ہے کہ قرض کا مطالبہ اتنا زیادہ رہا ہے کہ بینکوں نے صرف اُن قرض خواہوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کو ترجیح دی جن کی حیثیت مسلّم ہے۔

یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ بینک زراعت اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی مدد کرنے میں ناکام رہا ہے۔ مجموعی قرض میں زراعتی حلقے کا حصہ ایک فی صدی کا صرف پانچواں حصہ ہے۔ چھوٹے فارموں کو مالی وسائل مہیا کرنے کی مشکلات کے باوجود کوئی وجہ نہیں ہے کہ جن لوگوں کے پاس دس ایکڑ سے زیادہ کے فارم ہیں اِن کی ضروریات کمرشل بینک نہ پوری کر سکیں۔ ملک کی مجموعی صنعتی پیداوار میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کا حصہ ۴۰ فی صدی ہے لیکن صنعتوں کو دیے جانے والے قرض کا صرف ۶ فی صدی چھوٹی صنعتوں کو ملتا ہے۔ ان تمام خامیوں کو دُور کرنے کے لیے مسٹر پانڈے نے بینکوں کا سوشل کنٹرول تجویز کیا۔

سوشل کنٹرول سے مراد یہ ہے کہ بینکنگ کے کاروبار پر حکومت کا اختیار بڑھایا جائے۔ یہ اختیار ریزرو بینک یا نیشنل کریڈٹ کونسل کے ذریعے استعمال کیا جائے یا حکومت براہ راست استعمال کرے۔ سوشل کنٹرول سے متعلق ایک بل دسمبر ۱۹۶۷ء کے تیسرے ہفتے میں پارلیمنٹ میں پیش ہوا۔ اس کا نام بینکنگ لاز بل ۱۹۶۷ء ہے۔ دسمبر ۱۹۶۸ء کے چوتھے ہفتے میں بل کو راشٹرپتی کی منظوری حاصل ہوگئی۔ یکم فروری ۱۹۶۹ء سے اِس کا نفاذ ہوگیا۔

سوشل کنٹرول کے لیے دو اقدام تجویز کیے گئے (۱) قرض کی پالسی کی تشکیل کے لیے نیشنل کریڈٹ کونسل کا قیام (۲) بینکوں کے بورڈ آف ڈائرکٹرز میں ضروری ردوبدل۔ کونسل میں مختلف حلقوں کے قرض کے مطالبات پر غور کیا جاتا ہے اور ترجیحات متعین کی جاتی ہیں۔ کونسل بینکوں کے سماجی کنٹرول اور منصوبہ بندی کے مقاصد کے مطابق مختلف حلقوں کی رقم متعین کرنے میں بھی حکومت کی مدد کرتی ہے جنوری ۱۹۶۸ء میں حکومت نے قومی سطح پر نیشنل کریڈٹ کونسل قائم کردی جس کا پہلا جلسہ وزیر مالیات کی صدارت میں مارچ ۱۹۶۸ء میں منعقد ہوا۔

حکومت نے فیصلہ کیا کہ کونسل کے ممبر ۲۵ سے زیادہ نہ ہوں۔ وزیر مالیات کونسل کے چیرمین ہیں اور ریزرو بینک کے گورنر وائس چیرمین۔ اِن کے علاوہ تین مستقل ممبر ہیں، ایک پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیرمین، دوسرے وزارت مالیات کے معاشی معاملات کے شعبے کے سکرٹری اور تیسرے ایگریکلچرل ری فائنانس کارپوریشن کے چیرمین۔ باقی بیس ممبر کمرشل بینکوں، کواپریٹیو سکٹر، زراعت، تجارت، پیشوں اور چھوٹی، درمیانی اور بڑی صنعتوں کے نمائندے ہوتے ہیں جن کی ممبری کی مدت تین سال ہوتی ہے۔

کونسل کے بنیادی کام یہ ہیں: (۱) مختلف سکٹروں کے قرض کے مطالبات کو جانچنا (۲) وسائل کی دستیابی اور ترجیحی حلقوں کی ضروریات، خصوصاً زراعت، چھوٹی صنعتوں اور درآمداتی ضروریات کے پیش نظر قرض اور پیشگی ادائیگیوں کی منظوری کے لیے ترجیح مرتب کرنا (۳) کمرشل بینکوں، کواپریٹیو بینکوں اور مخصوص ایجنسیوں کی قرض کی پالسی میں تال میل پیدا کرنا تاکہ حاصل وسائل کا بہتر سے بہتر استعمال ہو سکے (۴) اُن دوسرے متعلقہ وسائل پر غور کرنا جو چیرمین یا وائس چیرمین کونسل کے سپرد کریں۔ سال میں کم از کم دو بار کونسل کا جلسہ ہونا چاہیئے۔

کونسل کی کارروائیوں کی روشنی میں ریزرو بینک جو فیصلے کرے اُن کی تعمیل کے لیے ریزرو بینک کو قانونی اختیارات دیے گئے۔ اِس سے پہلے کے قوانین کے تحت ریزرو بینک کو صرف روپیہ جمع کرنے

والوں کے مفاد کے تحفظ سے متعلق اختیار حاصل تھے ۔ ان کو دیکھتے ہوئے نئے اختیارات زیادہ بامقصد اور واضح تھے ۔ ۶۸ء کے ترمیمی ایکٹ نے بینکوں کے نظام میں بنیادی تبدیلی کی گئی ۔ ہر بینک کا ایک کل وقتی چیرمین ہوگا جو ظاہر ہے کہ پیشہ ور بینک کار ہوگا ۔ ابتدا میں ریزرو بینک یہ اختیارات صرف ان بینکوں کے لیے استعمال کریگا جن کی امانتوں کی رقم ۲۵ کروڑ یا زیادہ ہے ۔ ڈائرکٹروں اور اُن کاروباروں کو جن میں ڈائرکٹروں کو دلچسپی ہو قرض یا ضمانت کی سہولت دینا ممنوع ہے ۔ ترمیمی ایکٹ کے تحت بینکنگ کمپنیوں کو اپنے بورڈ کی از سر نو تشکیل اِس طرح کرنی ہے کہ ان میں زراعت، دیہی معیشت، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں، کواپریشن، بینکنگ اور مالیات سے متعلق مخصوص جانکاری اور تجربہ رکھنے والے لوگوں کو شامل کیا جائے ۔ غیر ملکی بینکوں کو بھی اِس طرز پر مشاورتی کمیٹی بنانی ہے ۔ اگر کوئی کمپنی ریزرو بینک کی ہدایات ایک بار سے زیادہ نظر انداز کرتی ہے تو حکومت کو اختیار ہے کہ وہ اُس کو اپنے قبضے میں لے لے ۔

ترمیمی ایکٹ کے اِس مقصد کو ہمیں زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے کہ کمرشل بینکوں کے بورڈ اور صنعت کاروں کے درمیان رابطہ قائم کیا جائے ۔ خیال اچھا ہے لیکن اس میں شبہ ہے کہ جو اقدام اب تک کیے گئے ہیں وہ اس خاص مقصد کے حصول کے لیے کافی ہیں ۔ بورڈ میں زراعت، چھوٹی صنعت یا پیشہ ور محاسبوں اور ماہرین معاشیات کے چند نمائندے نامزد کرنے سے کمرشل بینکوں کے طریقہ کار میں کوئی بنیادی فرق لانے کا امکان نہیں ہے ۔ بہتر نتائج صرف تب برآمد ہوسکتے ہیں جب یہ واضح طور سے کہہ دیا جائے کہ بینک کی مجموعی رقم کا اتنا حصہ زراعت اور چھوٹی صنعتوں کے کاموں میں لگانا ضروری ہے ۔ اِس تناسب پر وقتاً فوقتاً نظر ثانی ہوتی رہنی چاہیے ۔ اِس میں شک نہیں کہ یہ کام نیشنل کریڈٹ کونسل اور ریزرو بینک کا ہے کہ وہ ایسی صورتیں نکالیں کہ بینک کی رقم اور ساکھ خطرے میں نہ پڑیں ۔

یاد رہے کہ جسے قرض کی منصفانہ تقسیم کہا جاتا ہے وہ قرض اور لائسنسنگ کے سرکاری طریقے کا چربہ ہے ۔ اگر صنعتی لائسنسنگ، امپورٹ لائسنسنگ اور سرمائے کے اجرا کی شکل ایک اجرام کی ہے جس کی جڑ صنعت کاروں کے کنٹرول میں ہے تو سوشل کنٹرول کے قوانین کے باوجود قرض کی شکل وہی رہے گی چنانچہ سوشل کنٹرول کے معنی صرف نجی بینکوں کا کنٹرول نہ ہونا چاہیئے بلکہ بڑے نجی کاروباروں پر بھی براہ راست کنٹرول ہونا چاہیئے ۔

چودہ ۱۴ بڑے بینکوں کو قومی ملکیت میں لانے کے سوال پر تجزیہ

بینکنگ لاز ایکٹ ۱۹۶۸ء کے تحت بینکوں کا سوشل کنٹرول کوئی ایسا قدم نہیں سمجھا جاسکتا جس کا مقصد زیادہ سے زیادہ سماجی منفعت ہو۔ نجی انتظام کے بینکوں کا مقصد نجی منافع کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا ہوتا ہے اور نجی منفعت عموماً سماجی منفعت سے مختلف ہوتی ہے۔ سوشل کنٹرول جس کا مقصد زیادہ سے زیادہ سماجی منفعت ہوتا ہے تمام بینکوں کو قومی ملکیت میں لائے بغیر نہیں عائد کیا جاسکتا۔

حکومت نے حال میں یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ بینکنگ لاز ایکٹ ۱۹۶۸ء کے تحت جس قسم کا سماجی کنٹرول عائد کیا گیا ہے اُس سے قومی ترجیحات کے مطابق معیشت کی ترقی کی ضرورتوں کی تشفی نہ ہو پائیگی۔ چنانچہ ۱۸ جون ۱۹۶۹ء کو حکومت نے ۱۴ بڑے بینکوں کو قومی ملکیت میں لانے کا فیصلہ کیا۔ جن بینکوں کو قومی ملکیت میں لایا گیا اُن کے نام یہ ہیں: سنٹرل بینک، پنجاب نیشنل بنک، بینک آف بڑودا، یونائیٹڈ کمرشل بینک، کنارا بینک، یونائیٹڈ بینک آف انڈیا، سنڈیکیٹ بینک، الہ آباد بینک، یونین بینک، انڈین بینک، بینک آف مہاراشٹر اور انڈین اوورسیز بینک۔ اِن بینکوں کے قومی ملکیت میں لانے کی وجہ سے ہمارے پانچ سالہ منصوبوں کے لیے زیادہ وسائل حاصل ہوسکیں گے۔ یہ بینک ۱۹۶۹ء کے بینکنگ کمپنیز آرڈیننس کے تحت قومی ملکیت قرار دیے گئے ہیں۔ بیرونی ملکوں میں قائم کیے گئے بینک اور وہ شیڈیولڈ بینک جن کی امانتیں جون ۱۹۶۹ء کے ختم پر ۵۰ کروڑ سے کم تھیں، انھیں آرڈیننس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے قومیانے کی جزوی اور انتخابی پالیسی اختیار کی ہے۔ ہندوستان کے تمام بینکوں کی مجموعی امانت کا ۷۲ فی صدی ان چودہ بینکوں کے پاس ہے اور مجموعی قرض کا ۶۵ فی صدی اِن بینکوں نے فراہم کیا۔ اِس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ امانتوں کی مجموعی رقم کا ۲۸ فی صدی اور مجموعی قرض کا ۳۵ فی صدی غیر ملکی بینکوں کی شاخوں اور ۵۰ کروڑ سے کم امانت والے ہندوستانی بینکوں کے پاس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاوضے کی وجہ سے پیدا ہونے والے مالی وسائل تمام بینکوں کو قومی ملکیت میں نہ لانے کا جواز نہیں ہیں۔

معاوضہ شیئروں کی بازاری قیمت یا پچھلے منافع کی بنیاد پر دیا جاسکتا ہے لیکن نقد ادائیگی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اِس لیے غیر ملکی بینکوں اور چھوٹے ہندوستانی بینکوں کو قومی ملکیت میں نہ لانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایسا نہ کرنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ بیرونی تجارت اور امداد پر اِس کا

اثر خراب پڑیگا ۔ غیر ملکی بینکوں کو اس امتیازی پالسی سے فائدہ پہنچے گا ۔ یہ درست ہے کہ چھوٹے ہندوستانی بینک بھی فائدے میں رہیں گے ۔

آرڈی ننس میں کہا گیا ہے کہ قومیانے کے بعد فی الحال ہر بینک کی انفرادیت باقی رکھی جائے گی اور ہر بینک کی حیثیت ایک نئی منظم جماعت کی ہو جائے گی جو قومیائے گئے بینک کا کاروبار چلانے کی ذمہ دار ہوگی ۔ ان چودہ بینکوں کے چیرمین ان کے کسٹوڈین بن جائیں گے ۔ آرڈیننس کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ کم ازکم سال بھر تک ان بینکوں کی انفرادی حیثیت باقی رکھی جائے گی اور حکومت مشاورتی بورڈ اور اپنے مقرر کیے ہوئے کسٹوڈین کے ذریعے ان کی رہنمائی کریگی ۔ بینکنگ کمیشن کی رپورٹ سنہ کے آخر تک پیش ہونے کی امید نہیں ہے ۔ اس رپورٹ پر بینکوں کی آئندہ تنظیم منحصر ہے ۔ قومیانے کا مطلب یہ ہے کہ کمیشن کو اپنا کام از سرِ نو شروع کرنا ہوگا ۔

ان بینکوں کی پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی کی حیثیت ختم ہو جائے گی اور یہ سرکاری سکٹر کی کمپنیاں بن جائیں گے ان کا سارا سرمایہ حکومت کو منتقل ہو جائے گا ۔ جو معاوضہ موجودہ بینکوں کو ملیگا وہ اثاثے کی اُس مجموعی قیمت کے برابر ہوگا جو واجبات وضع کرنے کے بعد بچے گا ۔

اگر مناسب انسدادی تدابیر نہ کی گئیں تو ممکن ہے کہ اس جزوی اور انتخابی پالسی کی وجہ سے قومی ملکیت میں لائے گئے بینکوں کی امانت کی کچھ رقم دوسرے بینکوں کو منتقل ہو جائے ۔ اگر ایسا ہوا تو غیر ملکی بینکوں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچے گا ۔

بحث طلب بات یہ ہے کہ آیا اُن چودہ بینکوں کو قومی ملکیت میں لانے کا یہ وقت مناسب ہے جو نجی حلقے کو بیشتر سرمایہ فراہم کرتے ہیں ۔ اس وقت چوتھے پلان کے زیر اثر معیشت نے سنبھلنا شروع کیا ہے اور نجی حلقہ بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ سرکاری حلقہ ۔ ممکن ہے کہ نجی کاروبار پر قومیانے کا خراب اثر مرتب ہو اور بازار میں ہراس پھیل جائے ۔

ہمارا خیال ہے کہ اصل علاج یہ ہے کہ سارے بینک مکمل طور سے قومی ملکیت میں لے آئے جائیں ۔ لیکن اس میں جلد بازی نہیں کرنی چاہیئے بلکہ پہلے زمین ہموار کرنی چاہیئے ۔ سوشل کنٹرول جس کے تحت اب صرف غیر ملکی بینک اور چھوٹے ہندوستانی بینک آئیں گے، غالباً بیکار ہے ۔ لیکن زیادہ سے زیادہ سماجی منفعت ان چودہ بینکوں کو قومی ملکیت میں لانے سے بھی نہیں حاصل ہوگی، یہ اسی وقت ممکن ہے جب سارے بینک قومی ملکیت میں لے آئے جائیں جس کے لیے زمین ہموار کرنا ضروری ہے، اس لیے ہمیں ابھی کچھ دن اور انتظار کرنا ہے ۔

باب ۳۱

نظامِ زر، سکّے اور قیمتیں

ہندوستان کے نظامِ زر کی تاریخ پُر از واقعات رہی ہے۔ سلور اسٹینڈرڈ، گولڈ بلین سٹینڈرڈ، گولڈ ایکسچینج اسٹینڈرڈ اور اسٹرلنگ ایکسچینج اسٹینڈرڈ، یہ سارے معیار یکے بعد دیگرے نافذ ہوئے۔ اِس وقت ہندوستان انٹرنیشنل مونٹری فنڈ کا ممبر ہے اور کاغذی کرنسی کا منضبط نظام رکھتا ہے۔

ہندوستان کی حکومت نے مونٹری فنڈ کے مشورے سے سونے میں روپے کی قیمت متعین کی ہے۔

ہندوستان کے موجودہ نظامِ زر کو ٹھیک سے سمجھنے کے لیے نظامِ زر کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

۱۹۳۹ء تک کی ہندوستان کی کرنسی اور ایکسچینج کی تاریخ کا مختصر جائزہ

(۱) ۱۸۳۵ء اور ۱۸۹۳ء کے درمیان سلور اسٹینڈرڈ: ہم یہ جائزہ ۱۸۳۵ء سے شروع کرتے ہیں کیونکہ اسی سال ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ تسلط ہندوستانی علاقوں میں روپیہ ایک معیاری سکّے کی حیثیت سے جاری کیا گیا۔ ۱۸۳۵ء کے بعد آہستہ آہستہ سارے ملک میں روپے کی حیثیت ایک معیاری سکّے کی ہوگئی۔ اس کا وزن ۱۸۰ گرین تھا جس میں $\frac{11}{12}$ حصہ خالص چاندی تھی۔ اِس طرح ملک میں چاندی کا ایک دھاتی (MONOMETALLISM) دَور شروع ہوا کیونکہ اب سونے کے سکّوں کی قانونی حیثیت ختم کردی گئی تھی۔ سلور اسٹینڈرڈ کے تحت سکّے کی ڈھلائی

پر کوئی پابندی نہیں تھی اور کوئی شخص بھی چاندی سے جاکر ٹکسال میں بلا معاوضہ روپے ڈھلوا سکتا تھا۔

۱۸۷۳ء کے بعد سے مشکلات پیش آنے لگیں جن سے سلور اسٹینڈرڈ متاثر ہوا۔ چاندی کی نئی کانوں کی دریافت کی وجہ سے چاندی کی رسد بڑھ گئی اور سونے میں اس کے دام گرنے لگے۔ اس کی وجہ سے روپے کی قوت مبادلہ اور سرکاری آمدنی دن بدن گھٹنے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری بیرونی تجارت کو شدید نقصان پہنچا۔ چنانچہ حکومت نے ہرشل کمیٹی کی سفارشات کے مطابق سلور اسٹینڈرڈ کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۸۹۳ء سے روپے کی مفت ڈھلائی بند کر دی گئی اور روپیہ صرف علامتی سکہ بن گیا۔

(۲) ۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۸ء تک کا عبوری دور: ہرشل کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ سونے کا سکہ اور گولڈ اسٹینڈرڈ شروع کرنے سے پہلے ایک مختصر عبوری مدت ضروری تھی ۱۸۹۸ء میں جب روپے اور اسٹرلنگ کی شرح مبادلہ ایک روپیہ برابر ایک شلنگ چار پنس تھی، حکومت نے سکریٹری آف اسٹیٹ سے گولڈ اسٹینڈرڈ نافذ کرنے کی درخواست کی چنانچہ گولڈ اسٹینڈرڈ کی مناسب اسکیم تیار کرنے کے لیے فاؤلر کمیٹی مقرر کی گئی۔

(۳) گولڈ اکسچینج اسٹینڈرڈ۔ جنوری ۱۸۹۹ء تا اگست ۱۹۱۷ء:

فاؤلر کمیٹی نے صرف چند ترمیمات کے ساتھ روایتی گولڈ اسٹینڈرڈ کے نفاذ کی سفارش کی۔ گولڈ اکسچینج اسٹینڈرڈ جس نے اس دور میں نمایاں شکل اختیار کی وہ حکومت کے بہت سے اقدام کا نتیجہ تھا۔ یہ اقدام فاؤلر کمیٹی کی سفارشات کے مطابق نہیں تھے بلکہ مخصوص حالات کے پیش نظر کیے گئے تھے۔

جان مائنارڈ کینس (JOHN MYNARD KEYNES) نے گولڈ اسٹینڈرڈ کو سراہا اور اسے ہندوستان جیسے کم ترقی یافتہ ملک کے لیے بہترین نظام زر قرار دیا۔ اس نظام کے تحت داخلی لین دین کے لیے چاندی کا روپیہ معیاری سکہ تھا۔ بیرون ملک کے لیے روپیہ ایک شلنگ چار پنس کی شرح سے سونے میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔

اسٹرلنگ میں روپے کی قیمت کونسل بلوں اور ریزرو کونسل بلوں کی فروخت ایک شلنگ ۴ پنس اور ایک شلنگ $3\frac{29}{32}$ پنس کے درمیان مقرر تھی۔

اِس نظام کی ہمواری برقرار رکھنے کے لیے دو ریزرو فنڈ قائم کیے گئے - ایک روپے پر مشتمل دوسرا لندن میں اسٹرلنگ پر مشتمل - ہندوستان کے سکّہ جاتی نظام کی جانچ کرنے اور اصلاحات تجویز کرنے کے لیے ۱۹۱۳ء میں چیمبرلین کمیشن مقرر کیا گیا - کمیشن کی رائے تھی کہ ہندوستان میں جو گولڈ ایکسچینج اسٹینڈرڈ رائج تھا وہ ملک کے لیے بہت مناسب تھا - لیکن ۱۹۱۶ء سے چاندی کی رسد میں کمی کی وجہ سے چاندی کی قیمت تیزی سے بڑھنے لگی چنانچہ لوگوں نے روپیہ پگھلا کر چاندی کی شکل میں بیچنا شروع کر دیا - اِن حالات میں حکومت کے لیے یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ زیادہ قیمت پر چاندی خرید کر ایک شلنگ چار پنس کی کم قیمت پر روپے فراہم کرے - چنانچہ اگست ۱۹۱۷ء سے روپیہ علامتی سکّہ نہیں رہا اور گولڈ ایکسچینج اسٹینڈرڈ ختم کر دیا گیا اور حکومت نے روپے کی قیمت کا تعلق بازار میں چاندی کی قیمت پر چھوڑ دیا -

(۴) غیر مستحکم شرحِ مبادلہ کا زمانہ - اگست ۱۹۱۷ء تا ستمبر ۱۹۲۰ء : اِس مدت میں حکومت نے چاندی کی قیمت میں اضافے کے ساتھ روپے کی شرح مبادلہ بڑھا کر مستحکم گولڈ ایکسچینج اسٹینڈرڈ کی بحالی کی ناکام کوشش کی - دسمبر ۱۹۱۹ء میں روپیہ ۲ شلنگ ۴ پنس کے برابر تھا - ۱۹۲۰ء میں بینگٹن اسمتھ (BABINGTON SMITH) کمیٹی کی سفارشات کے مطابق حکومت نے روپے کی شرح مبادلہ دو شلنگ متعین کرنے کی کوشش کی -

(۵) تعطل کا زمانہ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۷ء : ۱۹۲۰ء کے بعد حکومت نے کوئی ایک شرح مبادلہ برقرار رکھنے کی کوشش چھوڑ دی - یہ کچھ نہ کرنے کی پالیسی کا دَور کہا جاتا ہے جو ۱۹۲۵ء تک جاری رہا - ہلٹن کمیشن نے ہندوستانی کرنسی کی اصلاح کے لیے دُور رس سفارشات کہیں - کمیشن گولڈ ایکسچینج اسٹینڈرڈ پر سخت معترض تھا اور اس نے گولڈ بلین اسٹینڈرڈ قائم کرنے کی سفارش کی - کمیشن نے خیال ظاہر کیا کہ ماضی میں گولڈ ایکسچینج اسٹینڈرڈ کرنسی کے پھیلاؤ میں مانع رہا اور اس نے ہندوستان کی کرنسی کے نظام کو برطانیہ نظامِ زر کے دامن سے باندھے رکھا - گولڈ بلین اسٹینڈرڈ کے تحت ہندوستان نسبتاً آزادی سے اپنی مالی پالیسی متعین کر سکے گا - گولڈ بلین اسٹینڈرڈ کے تحت علامتی سکّے یا کاغذ کے نوٹ مقررہ شرح پر سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے - کمیشن کی ایک اور اہم سفارش یہ تھی کہ ہندوستان کے مرکزی بینک کی حیثیت سے ایک ریزرو بینک قائم کیا جائے - جہاں تک روپے کی شرح مبادلہ کا سوال تھا کمیشن کے ممبروں کی اکثریت نے ایک شلنگ چھ پنس کی سفارش کی - اگرچہ معاشیات دان ایک شلنگ چار پنس کے حق میں تھے - حکومت نے ایک شلنگ چھ پنس کی سفارش فوراً قبول کر لی -

اور آگے چل کر ۱۹۳۵ء میں ریزرو بینک قائم کر دیا۔

(۶) چھپا ہوا گولڈ بلین اسٹینڈرڈ - جنوری ۱۹۲۷ء تا ستمبر ۱۹۳۱ء: ۱۹۲۷ء کے کرنسی ایکٹ کے تحت روپے کو سونے سے براہِ راست منسلک کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس کی قیمت ۸٫۴۷۵ گرین سونے کے برابر قرار پائی تھی جو اسٹرلنگ میں ایک شلنگ ۶ پنس تھی۔ اگر بیرونی ادائگی کے لیے سونے کی ضرورت ہوتی تو حکام کو اختیار تھا کہ بشکل اسٹرلنگ لندن میں فوری ادائگی کریں۔ اِس طرح ۱۹۲۷ء کے ایکٹ کے تحت کرنسی کا جو نظام قائم ہوا وہ گولڈ بلین اسٹینڈرڈ اور اسٹرلنگ اکسچینج اسٹینڈرڈ کا مِلا جُلا نظام تھا۔ یہ مخلوط نظام ستمبر ۱۹۳۱ء تک قائم رہا۔

(۷) گولڈ اکسچینج اسٹینڈرڈ کی بہار کا زمانہ۔ ستمبر ۱۹۳۱ء تا اگست ۱۹۳۹ء:
ستمبر ۱۹۳۱ء میں جب برطانیہ نے گولڈ اسٹینڈرڈ چھوڑ دیا تو ہندوستان کی حکومت نے بھی چھپا ہوا گولڈ بلین اسٹینڈرڈ ختم کر دیا اور روپے کو براہ راست پونڈ اسٹرلنگ سے ایک شلنگ ۶ پنس کی شرح پر منسلک کر دیا۔ اِس طرح ہندوستان میں اسٹرلنگ اکسچینج اسٹینڈرڈ شروع ہوا اور ایک بار پھر ہندوستان کی کرنسی کا نظام برطانوی پالیسی کا پابند ہو گیا۔ برطانیہ کے ضمنی علاقے کی حیثیت سے ہندوستان کو اسٹرلنگ اکسچینج اسٹینڈرڈ کے تحت کافی نقصان اٹھانا پڑا۔

سن ۳۲ء کی سرد بازاری میں ہندوستان کی برآمدات کافی گھٹ گئیں اور اسٹرلنگ اکسچینج اسٹینڈرڈ کے تحت ہونے کی وجہ سے ملک کو درآمدات کی قیمت اور ہوم چارجز (HOME CHARGES) کے سلسلے میں سونا باہر بھیجنا پڑا۔ (ہوم چارجز کے تحت سالانہ رقم ہندوستان برطانیہ کو اسٹرلنگ میں ادا کرتا تھا) چنانچہ ہندوستان کے ماہرین معاشیات کا اصرار تھا کہ روپے کی شرح مبادلہ ۱ شلنگ ۶ پنس سے گھٹا کر ۱ شلنگ ۴ پنس کر دی جائے تاکہ برآمدات بڑھ سکیں اور ملک سے سونے کی آمد کم کی جا سکے۔ حکومت اس پر رضامند نہیں تھی۔ ۱۹۳۵ء میں ریزرو بینک قائم ہوا جس کی وجہ سے ملک کا بینکی نظام کافی مستحکم ہوا۔ اب کرنسی قانوناً ریزرو بینک کے تحت آ گئی اور روپے کی شرح مبادلہ ۱ شلنگ ۶ پنس پر برقرار رکھنا اس کی ذمہ داری ہو گئی۔ اسٹرلنگ اکسچینج اسٹینڈرڈ اپریل ۱۹۴۷ء تک نافذ رہا۔ اِس کے بعد ہندوستان انٹرنیشنل مانٹری فنڈ کا ممبر بن گیا۔

ہندوستانی کرنسی اور اکسچینج جنگ کے زمانے میں اور اُس کے بعد

دوسری جنگِ عظیم (۴۵-۱۹۳۹ء) کے دُور رس اثرات پیداوار، تجارت اور قیمتوں پر مرتب ہوئے۔

کرنسی اور اکسچینج کے نظام پر بھی اِس کا اثر پڑا۔ اِس سلسلے میں مندرجہ ذیل واقعات سب سے زیادہ اہم ہیں:

(۱) اکسچینج کنٹرول ۔ دورانِ جنگ ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت اکسچینج کنٹرول نافذ کیا گیا اور ریزرو بینک کو اسے عمل میں لانے کا اختیار دیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ ملک کے زرمبادلہ کو بچایا اور مجتمع کیا جا سکے ۔ سلطنت برطانیہ کے باہر تمام ملکوں سے زرمبادلہ کا لین دین صرف ریزرو بینک یا اُن بینکوں کے ذریعے کیا جا سکتا تھا۔ جنھیں ریزرو بینک متعین کرے۔

سلطنت برطانیہ کے ملکوں میں کناڈا، نیو فاؤنڈلینڈ اور ہانگ کانگ کو اکسچینج کنٹرول کے تحت رکھا گیا۔ ڈالر اور دوسری کمیاب کرنسیوں کو حکومت نے لازمی طور سے اپنے قبضے میں کر لیا اور اُسے اِمپائرڈ ڈالر پول (EMPIRE DOLLER POOL) کو منتقل کر دیا۔ یہ ایک مشترک فنڈ تھا جس سے اسٹرلنگ علاقے کے ممالک استعمال کر سکتے تھے۔ ڈالر فنڈ لندن میں رکھا گیا اور ممبر ملکوں نے طے کیا کہ اس میں سے ڈالر صرف مجبوری کی صورت میں نکالے جائیں گے۔ ۱۹۴۶ء میں لڑائی ختم ہونے کے بعد اس فنڈ کو ختم کر دیا گیا لیکن اسٹرلنگ ایریا کے اسٹرلنگ بیلنس کو لندن ہی میں ایک مرکزی فنڈ میں رکھا گیا۔ ہندوستان میں جنگ کے بعد بھی فارن اکسچینج ریگولیشن ایکٹ ۱۹۴۷ء کے تحت اکسچینج کنٹرول، باقی رکھا گیا۔

(۲) شرحِ مبادلہ: دورانِ جنگ تجارت کا توازن مسلسل ہندوستان کے حق میں رہا۔ چنانچہ شرح مبادلہ کم کرنے کا سوال خود بخود ختم ہو گیا۔ جنگ کے زمانے میں روپے کی شرح مبادلہ ایک شلنگ ۶ پنس پر قائم رہی ۔ جنگ کے بعد برطانیہ کو مسلسل توازن کی ادائیگی کی مشکلات در پیش رہیں اور اسے پونڈ کی قیمت ۵ ر ۳۰ فی صدی کم کرنی پڑی ۔ ہندوستان نے بھی دفاعی اقدام کے طور پر اس کے بقدر روپے کی قیمت کم کر دی چنانچہ روپے کی شرح مبادلہ ایک شلنگ ۶ پنس برقرار رہی ۔ ۶ جون ۱۹۶۶ء کو روپے کی قیمت ۵ ر ۳۶ فی صدی کم کر دی گئی ۔ جون ۱۹۶۶ء کے ڈی ویلوایشن (تقلیل قدر) کے بعد روپے کی شرح مبادلہ ایک شلنگ ۶ پنس پر قائم رہی یعنی ایک پاؤنڈ ۱۸ روپے کے برابر ہو گیا۔ بہر حال روپے اور ڈالر کی قیمت برقرار رہی یعنی ایک ڈالر ½ ۷ روپے کے برابر رہا۔

(۳) سکّے کی تبدیلیاں : جنگ کے زمانے میں چاندی کی قیمت بہت بڑھ گئی ۔ چنانچہ حکومت کے لیے روپے اور اٹھنی کے سکّے ڈھالنا بہت مشکل ہو گیا۔ روپے اور اٹھنی میں چاندی

کا تناسب کم کر دیا گیا اور ملک میں پہلی بار ایک اور دو روپے کے نوٹ چلائے گئے۔ اپریل ۱۹۵۷ء سے ڈسمل طریقہ نافذ کیا گیا۔ اگست ۱۹۵۵ء میں انڈین کوائج ایکٹ (۱۹۰۶ء) میں ترمیم کی گئی۔ اس کے تحت روپیہ معیاری سکہ رہا لیکن سو پیسوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

(۴) **کرنسی کا بے تحاشا پھیلاؤ اور اس کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ :** دورانِ جنگ کی مالی ضروریات کی وجہ سے نوٹوں کی تعداد بے حد بڑھ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیمتیں اتنی چڑھ گئیں جتنی پہلے کبھی نہیں چڑھی تھیں۔ جنگ کے فوراً بعد کے زمانے میں بھی افراطِ زر بدستور رہا جس کی وجہ یہ تھی کہ دورانِ جنگ صرفی اشیا کی کمیابی کی وجہ سے اب ان کی طلب اور بھی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ دوسری وجہ ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری تھی۔ پہلے پلان کے ختم کے قریب نومبر ۱۹۵۱ء میں بینک ریٹ بڑھانے کی وجہ سے افراطِ زر میں کچھ کمی ضرور واقع ہوئی۔ لیکن آگے چل کر اناج کی قلت اور دفاعی اخراجات میں اضافے کی وجہ سے افراطِ زر کی قوتیں پھر زور پکڑ گئی ہیں۔ تھوک کی قیمتوں کا انڈکس نمبر (۱۰۰ = ۵۳ - ۱۹۵۲) جو مئی ۱۹۵۷ء میں ۱۰۹ تھا۔ جنوری ۱۹۵۸ء میں گھٹ کر ۱۰۶، مارچ ۱۹۶۳ء میں بڑھ کر ۱۳۹، اپریل ۱۹۶۷ء میں ۲۰۴ر۴ اور اپریل ۱۹۶۹ء میں ۲۱۱ر۷ ہو گیا۔

(۵) **اسٹرلنگ فاضلات کا اجتماع :** دوسری جنگ کے دوران ہندوستان کی حکومت نے اتحادی فوجوں پر اور اتحادی حکومتوں کے لیے سامانِ جنگ کی خریداری پر برطانوی حکومت کی طرف سے بہت روپیہ خرچ کیا تھا جس کے عوض ہندوستانی حکومت کو اسٹرلنگ سیکیورٹیاں ملی تھیں۔ انھیں اسٹرلنگ فاضلات کہا جاتا ہے۔ ان اسٹرلنگ سیکیورٹیوں کی بنیاد پر ہم نے لڑائی کے زمانے میں اپنی کرنسی بڑھائی تھی۔ ۱۹۴۵-۴۶ء میں اسٹرلنگ فاضلات ۱۷۳۳ کروڑ روپے کے برابر تھے۔ اس کے بعد سے وقتاً فوقتاً ہندوستان اور برطانوی حکومت کے درمیان ن فاضلات کی ادائیگی کی بات ہوتی رہی۔ ان فاضلات کی ادائیگی ہی کی بنیاد پر ہم پہلے تین منصوبوں کے دوران خسارے کی مالیات کا پروگرام چلا سکے ہیں۔

ہندوستان کے اسٹرلنگ فاضلات

دوسری جنگ عظیم سے پہلے بھی ریزرو بینک اسٹرلنگ سیکیورٹیاں ضمانت کے طور پر لندن میں رکھتا تھا۔ جس وقت لڑائی شروع ہونے والی تھی اس وقت لندن میں ہندوستان کے

اسٹرلنگ ریزرو ۶۴ کروڑ تھے ۔ دورانِ جنگ اسٹرلنگ فاضلات میں بہت تیزی سے اِضافہ ہوا اور ۴۶-۱۹۴۵ء تک یہ رقم ۱۷۳۳ کروڑ ہوگئی ۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد اسٹرلنگ فاضلات ۱۱۶۵ کروڑ تھے۔

کس طرح اِن فاضلات میں اِضافہ ہوا یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان میں سامانِ جنگ کی خریداری کی گئی جس کی رقم اسٹرلنگ کی شکل میں ہندوستان کے حساب میں جمع ہوگئی۔ اِس کے عِلاوہ جنگ میں ہندوستان کی شرکت کے جو اخراجات تھے اُس کا ایک حِصّہ برطانیہ کو برداشت کرنا تھا جو ہندوستان کے حساب میں اسٹرلنگ سیکیورٹیوں کی شکل میں جمع کردیا گیا۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ دورانِ جنگ توازنِ تجارت ہندوستان کے حق میں رہا اور برطانیہ ہندوستان کا قرضدار ہوگیا ۔ یہ رقم ہندوستان کو اسٹرلنگ کی شکل میں ادا ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگ سے پہلے اسٹرلنگ ہندوستان سے باہر بھیجنا پڑتا تھا لیکن جنگ کے زمانے میں اسٹرلنگ کا دھارا اُلٹا بہنے لگا اور اِس طرح لندن میں اسٹرلنگ سیکیورٹیاں ہندوستان کے حساب میں جمع ہونے لگیں ۔ انھیں کو اسٹرلنگ فاضلات کہا جاتا ہے ۔ ہندوستان نے یہ سیکیورٹیاں ریزرو بینک کو منتقل کردیں ۔ انھیں کی بنیاد پر دورانِ جنگ کرنسی کا بے تحاشا پھیلاؤ ممکن ہوا۔

لڑائی ختم ہونے کے بعد برطانیہ اِن فاضلات کی تمام رقم ادا کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ برطانیہ کا کہنا تھا کہ ان فاضلات کا بیشتر حِصّہ اخراجاتِ جنگ کا نتیجہ تھے اور چونکہ اتحادیوں نے ہندوستان کو جاپانی جارحیت کا شکار ہونے سے بچایا ہے اِس لیے ہندوستان کو اِن فاضلات کی پوری ادائگی پر اصرار نہیں کرنا چاہیے ۔ برطانیہ کی کنزرویٹو حکومت کے نمایندوں نے بہت زور دے کر یہ بات کہی کہ ان فاضلات کی مجموعی رقم خصوصاً اِس لیے کافی کم کردینی چاہیے کیونکہ یہ سامان دورانِ جنگ کی بے حد بڑھی ہوئی قیمتوں پر خریدا گیا تھا۔

ہندوستان کے عوام اور علمی حلقے نے برطانیہ کی اِس تجویز کی شدید مخالفت کی۔ اُن کا کہنا تھا کہ ہندوستان ایک پس ماندہ ملک ہے جس نے جنگ کا بہت بھاری بوجھ اُٹھایا ہے جس کی وجہ سے اس کی معیشت تباہ ہوگئی ہے ۔ (۴۵-۱۹۴۴ء میں ہندوستان کے اخراجاتِ جنگ ۵۰۳ کروڑ تک پہنچ گئے) اگر برطانیہ نے ہندوستان کے اسٹرلنگ سیکیورٹیوں کے مطالبات نہ پورے کیے تو ہندوستان کے لیے اپنی تباہ معیشت کی تعمیر مشکل ہوجائیگی ۔ اِس کے علاوہ یہ بھی

کہا گیا کہ اتحادی فوجوں کے لیے سامان کنٹرول کی قیمتوں پر خریدا گیا اور یہ قیمتیں عام قیمتوں سے بہت کم تھیں۔ چنانچہ یہ دلیل کہ سامانِ جنگ بے حد بڑھی ہوئی قیمتوں پر خریدا گیا کوئی وزن نہیں رکھتی۔ اِس کے علاوہ یہ بات عام طور سے معلوم تھی کہ ان فاضلات کی ادائیگی سے برطانیہ کی فوری آمدنی صرف ایک فی صدی گھٹے گی جس کا بہت زیادہ خراب اثر برطانوی معیشت پر نہیں پڑے گا۔

برطانیہ میں جب لیبر پارٹی برسرِ اقتدار آئی، اُس نے اِس بات کی یقین دہانی کی کہ اسٹرلنگ فاضلات میں تخفیف نہیں کی جائیگی اور یہ رقم آہستہ آہستہ قسطوں میں ادا کی جائیگی۔ اسٹرلنگ فاضلات کے تصفیے اور ان کی ادائیگی کے سلسلے میں ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان مختلف معاہدے ہوئے۔ آزادی کے فوراً بعد اگست ۱۹۴۷ء میں ایک معاہدہ ہوا اور اس کے مطابق ریزرو بینک نے بینک آف انگلینڈ میں دو حسابات کھولے، ایک کرنٹ اکاؤنٹ اور دوسرا بلاکڈ اکاؤنٹ (BLOCKED ACCOUNT)۔ کرنٹ اکاؤنٹ میں ½۶ کروڑ پونڈ منتقل کر دیے گئے۔ اس میں سے ½۳ کروڑ رواں اخراجات کے لیے تھے اور ۳ کروڑ ورکنگ بیلنس کے لیے۔ جون ۱۹۴۸ء میں ایک اور معاہدہ ہوا جو ۳۰ جون ۱۹۵۱ء کو ختم ہونے والی تین سال کی مدت کے لیے تھا۔ اِس معاہدے کے تحت رواں اخراجات کے لیے مزید ۱۶ کروڑ پونڈ آزاد کیے گئے۔ اِس معاہدے کے ختم ہونے سے کچھ ہی پہلے جون ۱۹۵۱ء میں ایک اور معاہدہ ہوا جس کی مدت جون ۱۹۵۷ء تک تھی۔ اِس کے تحت اکاؤنٹ نمبر ۲ میں سے ۳۱ کروڑ پونڈ اکاؤنٹ نمبر ایک کو منتقل کر دیے گئے۔ یہ رقم اِس لیے تھی کہ ریزرو بینک اِس رقم کو کرنسی ضمانت کے لیے رکھے۔ لیکن ۱۹۵۱ء میں ترقیاتی منصوبہ بندی شروع ہوئی اور یہ محسوس کیا گیا کہ جس رفتار سے اسٹرلنگ فاضلات کو استعمال کرنے کی اجازت مل رہی ہے وہ ہماری بڑھتی ہوئی ضروریات کے لیے ناکافی ہے۔

پہلے پلان کے دوران خسارے کے بجٹ اسٹرلنگ فاضلات کی ادائیگی کی بنیاد پر بنائے گئے۔ یہی وجہ تھی کہ خسارے کے بجٹ کے نتیجے میں افراطِ زر زیادہ نہیں ہوا۔ (پہلے پلان کے ریڈیو کے مطابق یہ خسارہ ۴۲۰ کروڑ تھا)۔ دوسرے پلان میں ۱۲۰۰ کروڑ خسارے کا تخمینہ تھا۔ اگرچہ واقعی خسارہ ۹۴۸ کروڑ ہوا۔ پلان تیار کرتے وقت پلاننگ کمیشن نے ۲۰۰ کروڑ روپے کے بقدر اسٹرلنگ فاضلات کی وصولی کی توقع کی تھی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ خسارہ پورا کرنے کے لیے ۱۰۰۰ کروڑ کے نئے نوٹ چھاپنے تھے۔

۵۶-۱۹۵۵ء کے مالی سال میں مال کی درآمد اور برآمد کا خلا بہت بڑھ گیا۔ دوسرے پلان کے پہلے سال ہم نے ۲۰۰ کروڑ روپیے سے زیادہ اسٹرلنگ فاضلات وصول کیے۔ جنوری ۱۹۵۶ء میں فاضلات کی رقم ۷۴۰ کروڑ روپیے تھی لیکن دسمبر ۱۹۵۶ء تک گھٹ کر ۵۲۳ کروڑ ہوگئی۔ ۱۹۵۷ء کے دوران اِس میں مزید کمی واقع ہوئی۔ مارچ ۱۹۵۸ء میں یہ رقم گھٹ کر ۲۹۷ کروڑ ہوگئی۔ حکومت نے اس رقم کی مزید تخفیف روکنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے مارچ ۱۹۵۹ء میں ۲۱۳ر۰۶ کروڑ ہوگئی۔ لیکن اپریل ۱۹۶۱ء میں ہم نے جب تیسرا پلان شروع کیا اس وقت اسٹرلنگ فاضلات ۱۳۶ کروڑ روپیے رہ گئے تھے۔ اپریل ۱۹۶۶ء میں یہ گھٹ کر ۸۶ کروڑ روپیے پر آگئے۔ موجودہ قانون کے تحت حکومت کو کرنسی کی ضمانت کے لیے ۸۵ کروڑ روپیے کے برابر غیر ملکی سیکیورٹیوں کا رکھنا ضروری ہے۔ اسٹرلنگ فاضلات کی صورت بے حد تشویش ناک تھی۔ چنانچہ ۵ جون ۱۹۶۶ء کو حکومت نے روپیے کی قیمت میں کمی کرنے کا فیصلہ کیا۔

ستمبر ۱۹۴۹ء میں روپیے کی شرح مبادلہ میں تخفیف

۲۰ ستمبر ۱۹۴۹ء کو حکومت نے روپیے کی قیمت میں کمی کرنے کے فیصلے کا اعلان کیا جس کے نتیجے میں، روپیے کی قیمت ڈالر میں ۳۰ر۲۲۵ سینٹ سے گھٹ کر ۲۱ سینٹ ہوگئی۔ سونے میں روپیے کی قیمت ۲۶۸۶۹۱ر۰ گرام سے گھٹ کر ۱۸۶۶۲۱ر۰ گرام ہوگئی۔ حکومت ہند کو یہ اقدام اِس لیے کرنا پڑا کیونکہ برطانیہ اور پاکستان کو چھوڑ کر اسٹرلنگ ایریا کے تمام ملکوں نے ڈالر میں اپنے سکوں کی قیمت گھٹا دی تھی۔

لڑائی کے فوراً بعد کے زمانے میں برطانیہ کو امریکہ سے تجارت میں برابر گھاٹا ہو رہا تھا برطانیہ اسٹرلنگ حلقے کا لیڈر تھا۔ توازن تجارت برطانیہ کے خلاف ہونے کا مطلب یہ تھا کہ برطانیہ کی سونے اور ڈالر پر مشتمل محفوظ رقم گھٹ کر خطرناک حد تک کم ہو گئی تھی۔ چنانچہ پونڈ کی قیمت کم کیے بغیر برطانیہ کے لیے امریکہ کو اپنی برآمدات بڑھانا ناممکن تھا۔ جنگ کے بعد کے زمانے میں امریکہ کی صنعتوں کی تکنیکی اور پیداواری استعداد برطانیہ سے بہت زیادہ تھی جس کی وجہ سے پورے نظام میں عدم توازن پیدا ہوگیا تھا۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ امریکہ کی معیشت بڑی حد تک خود کفیل ہے اور اس کی مجموعی قومی آمدنی کا صرف دو یا تین فی صدی بیرونی تجارت سے حاصل ہوتا ہے چنانچہ برطانیہ کے لیے امریکہ کو برآمدات بڑھانا بڑا مشکل تھا۔ برآمدات بڑھانے

اور تجارتی عدم توازن دُور کرنے کی صورت صرف یہی تھی کہ برطانیہ اپنے پونڈ کی قیمت کم کر دے۔ جو ۱۸ ستمبر ۱۹۴۹ء کو برطانیہ کو کرنا پڑا۔

سوال یہ ہے کہ ہندوستان کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ پاکستان ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء تک اپنے روپے کی قیمت کم نہ کرنے کے فیصلے پر قائم رہا۔ یاد رہے کہ ہندوستان میں قیمتیں زیادہ ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے برآمدات کا بڑھانا مشکل تھا جبکہ درآمدات برابر بڑھتی جا رہی تھیں۔ اناج کی شدید قلت کی وجہ سے ہمیں باہر سے اناج منگانا پڑا۔ اس کے علاوہ صرفی اشیا کی بڑھتی ہوئی طلب کی تھوڑی بہت تشفی کے لیے صرفی اشیا بھی برآمد کرنی پڑیں۔ قدرتاً ہمیں ادائیگی کے توازن سے دوچار ہونا پڑا اور ڈالر کی شکل میں ہماری محفوظ رقم آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ اس سب کے باوجود ہماری حالت اتنی خراب نہیں تھی جتنی برطانیہ کی خراب تھی۔ ہمیں روپے کی قیمت اس لیے گھٹانی پڑی کہ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو ہماری تجارت کو ان ملکوں کے مقابلے میں نقصان ہوتا۔ جنھوں نے اپنے سکے کی قیمت گھٹانے کا فیصلہ کیا تھا یعنی ہمارے مقابلے میں ان ملکوں کے برآمدات بڑھ جاتے۔ روپے کی قیمت کم نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ لنکا شائر کا بنا کپڑا، سیلون کی چائے، ساؤتھ افریقہ کی مینگنیز، ایسٹ افریقہ کی مونگ پھلی اور ڈنڈی کا بنا جوٹ کا مال ہماری ان چیزوں کے مقابلے میں سستا بکتا اور ہمارے مال کی کھپت کم ہو جاتی اور روپے کی قیمت کم نہ کرنے کی وجہ سے ان ملکوں کے مال کی کھپت بڑھ جاتی۔ ریزرو بینک کے نومبر ۱۹۴۹ء کے بلیٹن میں یہ کہا گیا تھا کہ روپے کی تقلیل قدر ایک دفاعی ضرورت تھی، جس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔

پاکستان نے اپنے روپے کی قیمت اس لیے نہیں کم کی کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ اُس کی معیشت افراطِ زر کے رجحان سے بچی رہیگی اور ملک کو معاشی استحکام حاصل ہوگا۔ اس وقت پاکستان انٹرنیشنل مانٹری فنڈ کا ممبر نہیں تھا اس لیے ایسا کرنا اس کے لیے ممکن ہوا۔ غالباً ہندوستان کو انٹرنیشنل مانٹری فنڈ سے اس کی اجازت نہ ملتی خصوصاً اس لیے کہ برطانیہ اور اسٹرلنگ ایریا کے دوسرے ممالک جو فنڈ کے ممبر تھے وہ اپنی کرنسی کی قیمت کم کر رہے تھے۔ پاکستان کے فیصلے سے پاکستان کی معیشت پر بہت تباہ کُن اثر پڑا اور انٹرنیشنل مانٹری فنڈ کا ممبر ہونے کے بعد آسے ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء کو اپنی کرنسی کی قیمت کم کرنے پر مجبور کیا گیا۔

روپے کی قیمت کم کرنے کی وجہ سے ہندوستانی مال کی قیمت امریکہ اور دوسرے کمیاب

کرنسی والے ملکوں میں ان ملکوں کے مقابلے میں کم ہوگئی جنھوں نے اپنی کرنسی کی قیمت کم نہیں کی تھی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی برآمدات بڑھ گئیں اور توازن ادائیگی ہندوستان کے لیے کافی بہتر ہوگیا۔ ۱۹۴۸-۴۹ء میں ہندوستان کا تجارتی خسارہ ۵۰۴ر۳۸۱ کروڑ تھا جو گھٹ کر ۱۹۴۹-۵۰ء میں ۱۱۸ر۰۹ کروڑ اور ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۲۲ر۰۱ کروڑ ہوگیا۔ اِس میں شک نہیں کہ توازن ادائیگی کی بہتری میں روپے کی قیمت میں کمی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ لیکن بد قسمتی سے ۱۹۵۱-۵۲ء میں تجارتی توازن پھر بگڑا اور خسارہ ۲۰۸ر۶۲ کروڑ پر پہنچ گیا۔

جنگ کے بعد کے زمانے میں قیمتوں کی زیادتی اور پاکستان سے خام مال کی فراہمی کی بے اعتباری کی وجہ سے جوٹ اور سوتی کپڑوں کی برآمد کو سخت نقصان پہنچا لیکن اِس سلسلے میں ملک نے خود کفیل بننے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ سے ۱۹۵۳-۵۴ء کے درمیان حالت کافی سدھر گئی۔ اناج اور خام مال کی صورت بہتر ہونے کی وجہ سے اور افراطِ زر پر کچھ قابو حاصل ہونے کی وجہ سے تجارتی خسارہ پہلے پلان کے ختم کے قریب کافی کم ہوگیا لیکن دوسرا پلان بہت بڑا اور پُر حوصلہ تھا جس کی وجہ سے تجارتی خسارہ پھر کافی بڑھ گیا۔ تیسرے پلان کے دوران بیرونی زرمبادلہ کے ذخیرے پر شدید دباؤ پڑا جس کی وجہ سے ہمیں جون ۱۹۶۶ء میں روپے کی قیمت ۳۶ر۵ فی صدی کم کرنی پڑی۔

جون ۱۹۶۶ء میں روپے کی قیمت میں کمی کے متوقع فائدے اور اثرات

تیسرے پلان کے دوران ادائیگی کے توازن کی حالت بگڑتی ہی گئی جس کی وجہ سے زرمبادلہ کی صورت بڑی تشویش ناک ہوگئی۔ مرکزی وزارت تجارت نے ہندوستان کی بیرونی تجارت کے جو اعداد شمار دیے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ تیسرے پلان کے تیسرے سال (۱۹۶۵-۶۶ء) ۸۶۵ کروڑ کا مال برآمد کیا گیا اور ۱۳۹۰ کروڑ کا مال درآمد کیا گیا۔ اِس طرح درآمد اور برآمد کے درمیان خلا ۵۲۵ کروڑ ہوگیا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جتنا مال ہم نے درآمد کیا اس کی صرف ۶۲ فی صدی قیمت ہم مال برآمد کرکے ادا کرسکے۔ بقیہ ادائیگی امداد، مانٹری فنڈ سے قرض اور ریزرو کی گھٹتی ہوئی رقم سے کی گئی۔ ایک عرصے تک ہمارے پالیسی بنانے والوں نے اِس بات کو ترجیح دی کہ ادائیگی کے توازن کے لیے روپے کی اس شرحِ مبادلہ پر بھروسہ کیا جائے جو روپے کی صنعتی قیمت سے زیادہ تھی۔ ساتھ ہی درآمد پر پابندی عائد کرکے اور برآمد کی مالی

امداد کرکے درآمد، برآمد کے خلا کو کم کیا جائے۔ لیکن یہ مصنوعی صورت زیادہ دن نہیں چل سکتی تھی اور یہ بات بالکل واضح تھی کہ معیشت بنیادی طور سے عدم توازن کا شکار تھی۔ یہ عدم توازن صرف درآمد برآمد ہی میں نہیں تھا بلکہ قیمت اور لاگت کے درمیان بھی شدید نابرابری پیدا ہو گئی تھی۔ دوسرے پلان کے دوران تھوک قیمتوں کا انڈکس نمبر ۳۰ فی صدی اور تیسرے پلان کے دوران ۵۰ فی صدی بڑھ گیا تھا۔ اس طرح ۶۶-۱۹۶۵ء میں قیمتوں کی عام سطح دوسرے پلان کے ابتدائی زمانے یعنی ۱۰ برس پہلے کے مقابلے میں ۸۰ فی صدی اونچی ہو گئی تھی۔ ۱۹۴۹ء سے روپے کی سرکاری قیمت بدستور رہی تھی۔ دوسرے ملکوں میں قیمتیں اتنی نہیں بڑھی تھیں جتنی ہمارے ملک میں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے مال کو غیر ملکی منڈیوں میں شدید مقابلے کا سامنا تھا۔

مختصر یہ کہ ملک کے اندر افراطِ زر کی وجہ سے چیزوں کی اندرونی طلب برابر بڑھ رہی تھی۔ طلب زیادہ ہونے کی وجہ سے قیمتیں چڑھتی جا رہی تھیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستانی مال کے لیے بیرونی منڈیوں میں دوسرے ملکوں سے مقابلہ کرنا دن بدن مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ملک میں بیرونی مال کی طلب زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ اس طلب کی تسکین کے لیے لوگ غیر قانونی راستے اختیار کر رہے تھے۔ درآمدات پر کئی بار ڈیوٹی بڑھانی پڑی۔ برآمد کرنے والوں کو مالی محرکات فراہم کرنے کے لیے اسکیمیں عمل میں لائی گئیں اور وقتاً فوقتاً امدادی رقم میں اضافہ کیا گیا۔ لیکن ٹیکس میں رعایت اور مالی امداد کے ذریعے برآمدات کی ہمت افزائی کا سرکاری خزانے پر کافی بوجھ تھا۔ ان ساری کوششوں کے باوجود برآمدات تقریباً جیوں کی تیوں رہیں۔

ان وقتی اقدام سے برآمدات نہیں بڑھائی جا سکتی تھیں۔ عدم توازن اتنا بنیادی اور شدید تھا جسے دور کرنے کے لیے یہ وقتی ترکیبیں بے سود تھیں۔ اسی لیے حکومت نے ۵ر جون ۱۹۶۶ء کو روپے کی قیمت میں ۵۔۳۶ فی صدی کمی کرنے کا فیصلہ کیا۔

روپے کی قیمت میں کمی کرنے جیسے معاملے سے نپٹنے کے لیے حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ اس بنیادی علاج کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی ضروری اصلاحات بھی کرنی چاہئیں جو اس تبدیلی سے فائدہ اٹھانے میں مدد کریں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم اقدام یہ تھا کہ خام مال اور صنعتوں کے کل پرزوں کی درآمد کی سہولت دی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ روپے کی قیمت میں کمی کی وجہ سے درآمد کی ہوئی چیزیں مہنگی ہو جائیں گی لیکن درآمداتی ڈیوٹی میں کمی کی وجہ سے یہ دقت کچھ

حد تک کم ہو جائیگی۔ اِس پالیسی کا ایک ہمّت افزا پہلو یہ فیصلہ تھا کہ خام تیل پر سے امپورٹ ڈیوٹی ختم کر دی جائے اور یہ چیزیں صنعتوں اور صارفوں کو اُسی قیمت پر فراہم کی جائیں جس قیمت پر روپے کی قیمت کم کیے جانے سے پہلے ملتی تھیں۔ توقع یہ تھی کہ خام مال اور کل پرزوں کی درآمد آسان ہو جانے اور اناج، کھاد، مٹی کا تیل اور ڈیزل آئل جیسی ضروری اشیا کے مقابلے میں امدادی اقدام کی وجہ سے ملک میں پیداوار بڑھ جائے گی اور اِس طرح قیمتوں میں اضافے کی تھوڑی بہت تلافی ہو جائیگی۔ لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔

چونکہ امید یہ تھی کہ روپے کی قیمت کم ہو جانے کی وجہ سے روایتی اور غیر روایتی درآمدات خود بخود بڑھ جائیں گی اِس لیے درآمداتی ٹیکس کریڈٹ اسکیم کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ چنانچہ اسے واپس لے لیا گیا۔ امپورٹ ڈیوٹی میں ہونے والے نقصان کی تلافی کے لیے جوٹ سے بنی ہوئی چیزوں، چائے، کافی، کالی مرچ، کھلی اور دوسری اشیا پر اکسپورٹ ڈیوٹی لگا دی گئی۔ اس ڈیوٹی سے ابرق، خام روئی، کھالوں اور ناریل کے ریشے اور اس سے بنی چیزوں کو مستثنیٰ رکھا گیا۔

آیئے اب دیکھیں کہ روپے کی قیمت میں کمی کرنے کی پالیسی سے کن فائدوں کی توقع تھی۔

(۱) حکومت کا خیال تھا کہ ہندوستانی مال کی قوتِ مقابلہ کی بحالی کے لیے روپے کی قیمت میں کمی ضروری تھی کیونکہ اس کا اثر اُن اقدام کے مقابلے میں زیادہ دیرپا ہوگا جو اب تک حکومت نے کیے تھے۔ مثلاً برآمدات کی مالی اعانت اور دوسرے مختلف اقدام۔ توقع تھی کہ روپے کی قیمت میں کمی کے نتیجے کے طور پر برآمداتی صنعتوں میں سرمایہ زیادہ لگے گا اور اس طرح ملک کی برآمدات کو تقویت ملیگی۔ جوٹ، چائے اور کھالوں جیسی روایتی صنعتیں جنھیں محرکات کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں تھی، ان پر اکسپورٹ ڈیوٹی عائد کی گئی۔

(۲) روپے کی قیمت میں کمی کے بعد درآمداتی پالیسی میں جو نرمی لائی گئی تھی اُس کی وجہ سے درآمد کیے ہوئے خام مال اور کل پُرزوں کی رسد بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ توقع تھی کہ معیشت کی رفتار تیز ہو جائیگی جس سے نہ صرف افراطِ زر کا دباؤ کم ہوگا بلکہ ٹیکسوں اور دوسرے راستوں سے حکومت کے مالی وسائل میں اضافہ ہوگا جو ترقیاتی کاموں میں لگائے جا سکیں گے۔

(۳) روپے کی قیمت میں کمی کا ایک اثر یہ ہوا کہ غیر ملکی نجی سرمایہ کار جو اپنا منافع، رائلٹی اور سرمایہ ملک سے باہر بھیجتے تھے اُس میں ایک دم کمی آگئی اور اس طرح سے زرمبادلہ کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

(۴) یہ بھی توقع تھی کہ اس اقدام سے سونے اور دوسری اشیا کی اسمگلنگ، غیر قانونی طریقوں سے رقموں کی آمد و رفت اور ٹراویلرس چیک کی فروخت کم نفع بخش ہو جائیگی۔ غیر قانونی اور چوری چھپے لین دین مثلاً اسمگلنگ، درآمدات کا بِل اصل سے کم بتانا اور برآمدات کا بِل اصل سے زیادہ بنانا جس سے سرکار کو نقصان پہنچا تھا اور نجی لوگوں کو ناجائز منافع ملتا تھا۔ ان میں بھی کافی کمی کی امید تھی۔

(۵) غرضیکہ روپے کی قیمت میں کمی کے بعد امید تھی کہ غیر ملکی خام مال اور کل پرزوں کی زیادہ درآمد ہوگی جس سے صنعتوں کو اپنی پوری استعداد بروئے کار لانے کا موقع ملیگا اور اس ملک میں مال کی پیداوار بڑھ جائیگی۔ بنیادی چیز تھی کہ پیداوار کی ہمت افزائی کی جائے۔ برآمدات بڑھائی جائیں اور پوری معیشت کو حرکت میں لایا جائے۔ مزید یہ بھی توقع تھی کہ بیرونی زرمبادلہ کا غیر قانونی اور چوری چھپے لین دین کم ہوگا۔ روپے کی شکل میں بیرونی قرضوں کی ادائیگی کا بار بڑھے گا لیکن ساتھ ہی بیرونی امداد بشکل روپیہ بڑھ جائے گی اور اس طرح نفع نقصان برابر ہو جائے گا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ روپے کی قیمت میں کمی ان لوگوں کی اعانت تھی جو بیرونی زرمبادلہ کماتے تھے۔ یہ کوئی بُری بُری بات نہیں ہے کیونکہ بیرونی زرمبادلہ ہمارے لیے بہت کمیاب شے ہے جس کی زیادہ قیمت متعین ہونا چاہیئے۔

لیکن روپے کی قیمت میں کمی کوئی الہ دین کا چراغ نہیں ہے جس سے پلک جھپکاتے تنگ و تاریک ماحول روشن ہو جائے۔ اس حربے کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ان ہاتھوں پر ہے جو اس نازک اور حساس حربے کو استعمال کرتے ہیں۔ کامیابی کا بہت کچھ انحصار ان اصلاحات پر بھی ہے جو ساتھ ہی ساتھ عمل میں آنی چاہئیں۔ ان اصلاحات سے معیشت میں ضابطہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حربے کی حیثیت آب حیات کی نہیں بلکہ اس تلخ دوا کی ہے جس کے کچھ مُضر اثرات بھی ہوتے ہیں جن کے علاج کی جلد از جلد ضرورت ہوتی ہے۔

سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ بنیادی صنعتی استعداد کے استعمال میں کچھ وقت لگے گا اور اس درمیان قیمتیں کافی بڑھ جائیں گی۔ درآمد کیے ہوئے اناج اور مصنوعی کھاد کی رعایتی قیمت اور کروڈ آیل پر امپورٹ ڈیوٹی کے خاتمے سے صورت حال بہتر نہیں ہو سکتی تھی۔ درآمداتی پالیسی کی نرمی سے جس تیز صنعتی ترقی کی توقع تھی وہ نہیں پوری ہوئی۔ غرضیکہ ہماری جیسی معیشت میں جہاں قلتوں کا سامنا تھا اور جہاں کاروباری ایمانداری ناپید تھی، یہ یقین کرنا کہ قیمتوں کو بڑھنے سے روکا جاسکے گا

صرف ایک آرزو کی حیثیت رکھتا ہے۔

روپے کی قیمت میں کمی کا مقصد قیمتوں کو اور ان کے ذریعے درآمد اور برآمد کی جانے والی اشیا کی مقدار کو متاثر کرنا تھا۔ کتابی معاشیات ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جہاں تک برآمداتی آمدنی پر تقلیل قدر کے اثر کا سوال ہے، اس کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ بیرونی ملکوں کی طلب کی شرح پر قیمتوں کی تبدیلی کا مجموعی اثر کیا مرتب ہوا ہے یا اندرونی رسد کی چیزوں کو برآمد کرنے کے منافع پر کیا اثر پڑا ہے۔

آخرالذکر کے لیے بیشتر اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ برآمداتی صنعتوں کی از سرِ نو منصوبہ بندی کی جائے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ صنعتوں کی پلاننگ نئے سرے سے کرنی پڑتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں یہ سب نہیں کیا گیا۔

۶۷-۱۹۶۶ء میں ہندوستان میں بیرونی تجارت کا جو ریویو وزارت تجارت نے شائع کیا، اس کے مطابق تقلیل قدر ایک بنیادی مقصد نہیں حاصل کر سکا۔ یعنی برآمدات میں اضافہ نہیں واقع ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۶۶ء کے دوران برآمدات میں کمی واقع ہوئی۔ یعنی مجموعی طور پر ۱۵۸ کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر کا مال برآمد کیا گیا جو ۱۹۶۵ء کے مقابلے میں ۶ فی صدی کم تھا۔ اپریل ۱۹۶۶ء سے دسمبر ۱۹۶۶ء کے نو مہینوں میں برآمدات سے مجموعی آمدنی ۱۱۵ کروڑ ۱۰ لاکھ ڈالر تھی جو ۱۹۶۵ء کی اسی مدت کی مجموعی آمدنی سے ۱۱ کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر کم تھی۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ چائے اور جوٹ کے سامان پر اکسپورٹ ڈیوٹی لگا دی گئی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برآمد کیے جانے کے بجائے یہ چیزیں ملک کے بازار میں زیادہ کھپنے لگیں۔

آئیے دیکھیں کہ روپے کی قیمت میں کمی کے بعد برآمدات میں جس اضافے کی توقع تھی وہ کیوں نہیں پوری ہوئی۔ جہاں تک چائے اور جوٹ جیسی روایتی اشیا کا سوال تھا۔ نئی اکسپورٹ ڈیوٹی کی وجہ سے ہم تقلیل قدر کے فائدوں سے محروم رہے۔ اس کے علاوہ جن ملکوں سے ہمارا مقابلہ تھا، انھوں نے ان اشیا کی برآمد پر مالی رعایتیں دے کر ان کی قیمت ہمارے مقابلے میں کم کر دی۔

سوال یہ ہے کہ انجینیری اشیا، پلاسٹک، کاغذ کی بنی اشیا اور کیمیاوی اشیا کی برآمد بڑھانے کی ہماری کوشش کا کیا حشر ہوا۔ ان چیزوں میں مقابلہ زیادہ سخت تھا کیونکہ ہم نہ ان چیزوں کی قسم کو بہتر کر سکے اور نہ ان کی پیکنگ کا بہتر انتظام کر سکے۔ چنانچہ ان کی برآمد میں بھی ہم

نے ترقی نہیں کی۔ ہماری چیزوں کا معیار اتنا ادنیٰ تھا اور ہمارے تاجروں کے ہتھکنڈے اتنے خراب تھے کہ روپے کی قیمت گھٹانے کے بعد بھی ہمارے لیے بیرونی ملکوں سے مقابلہ کرنا بڑا مشکل تھا۔

مختصر یہ کہ روپے کی قیمت کم کرکے ہم زرمبادلہ کے عدم توازن کو درست کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ تقلیل قدر کا مقصد توازنِ تجارت کو توازن کی ایک سطح سے ہٹاکر دوسری سطح پر لانا نہیں ہوتا بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ عدم توازن کو ختم کرکے توازن قائم کیا جائے۔ اگر زیادہ نہیں تو یہی کہ ادائیگیوں کے فرق کو حتی الامکان کم کیا جائے۔ چنانچہ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ روپے کی قیمت گھٹانے سے تمام غلط پالیسیوں کے نتائج درست ہو جائیں گے۔ تقلیل قدر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو خود بخود اس عدم توازن کو دور کردے جس کی وجہ سے تقلیل قدر کی ضرورت پڑی۔ یعنی تقلیل قدر اس اندرونی افراطِ زر کا علاج نہیں ہے جس کی وجہ سے روپے کی قیمت گھٹانی پڑی۔

اِس سلسلے میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ تقلیل زر کا عمل صرف وقتی ہو سکتا ہے کیونکہ ضروری درآمدات کی بڑھی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے جلدی ہی اندرونی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں اور اِس طرح تقلیل زر کے فائدوں کی بڑی حد تک نفی ہو جاتی ہے۔ تھوڑی ہی مدت میں دوبارہ تقلیل قدر سے کرنسی پر اعتماد نہیں باقی رہتا جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ ملک سے باہر جانا شروع کر دیتا ہے، اور خود اپنے شہری سرمایہ کو ان ملکوں کو منتقل کرنے لگتے ہیں جہاں وہ اُسے محفوظ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ نومبر ۱۹۶۷ء میں پونڈ کی قیمت کم ہونے کے بعد بھی ہندوستان نے روپے کی قیمت میں مزید کمی نہیں کی۔

کاغذی کرنسی کے اجرا اور انضباط کا موجودہ طریقہ

انٹرنیشنل مانٹری فنڈ کے قیام سے پہلے ہندوستان میں اسٹرلنگ ایکسچینج اسٹینڈرڈ نافذ تھا اور ریزرو بینک نے روپے کی شرح مبادلہ ایک شلنگ ۶ پنس پر قائم رکھی۔ یکم مارچ ۱۹۴۷ء سے ہندوستان مانٹری فنڈ کا ممبر بن گیا اور روپے کی شرح مبادلہ سونے میں مقرر کی گئی اس شرح کا تعلق ریزرو بینک اور مانٹری فنڈ دونوں نے مل کر کیا۔ یہ شرح ایسی رکھی گئی کہ اس کے بعد بھی روپیہ ایک شلنگ ۶ پنس کے برابر رہا۔ اصولی طور پر روپے کو کسی بھی بیرونی کرنسی میں بدلا جا سکتا تھا۔ اور ریزرو بینک اِشوڈپارٹمنٹ (ISSUE DEPARTMENT) کو اسٹرلنگ کے علاوہ

دوسری کرنسیاں بھی اپنے پاس رکھنی تھیں۔ لیکن سنہ ۱۹۴۷ء کے ایکسچینج کنٹرول ایکٹ کے تحت ہندوستان میں زرمبادلہ کے کنٹرول میں مزید توسیع کر دی گئی۔ چنانچہ ڈالر یا ان کرنسیوں میں نہیں تبدیل کیا جا سکتا تھا جو اس ایکٹ کے تحت آتی تھیں۔

اِس سلسلے میں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ توازن ادائیگی کی شدید مشکلات سے مجبور ہو کر ہندوستان نے جون سنہ ۱۹۶۶ء میں روپے کی قیمت میں ۳۶٫۵ فی صدی کمی کرنے کا فیصلہ کیا۔ نومبر سنہ ۱۹۶۷ء میں روپے کی شرح مبادلہ ایک پونڈ برابر ۲۱ روپے اور ایک ڈالر برابر ۷ ۱/۲ روپے تھی۔ اب نئی شرح کے مطابق پونڈ ۱۸ روپے کے برابر ہے لیکن ڈالر میں وہی قیمت ہے یعنی ایک ڈالر برابر ۷ ۱/۲ روپیہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پونڈ کی قیمت میں کمی کے بعد ہندوستان نے روپے کی قیمت میں دوبارہ کمی نہیں کی۔ چنانچہ روپیہ کی قیمت ڈالر میں وہی باقی رہی لیکن پونڈ میں بدل گئی۔

جب ہم ہندوستان کی کاغذی کرنسی کے نظام پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ایک روپے کے نوٹ وزارت مالیات چھاپتی ہے اور باقی نوٹ ریزرو بینک کا ایشو ڈپارٹمنٹ چھاپتا ہے۔ ہندوستان میں نوٹ چھاپنے کا موجودہ نظام مینیمم ریزرو (MINIMUM RESERVE) کے طریقے پر مبنی ہے۔ اس سے پہلے ہمارے یہاں پروپورشنل ریزرو (PROPORTIONAL RESERVE) کا طریقہ نافذ تھا اور اسی اصول کے تحت نوٹ چھپتے تھے۔ سنہ ۵۷-۱۹۵۶ء کے بیرونی زرمبادلہ کے بحران کے زمانے میں ہم نے مینیمم ریزرو کا طریقہ اپنایا جس کے تحت ریزرو بینک کو ۲۰۰ کروڑ روپے کے بقدر سونا اور غیر ملکی سیکیورٹیاں اپنے پاس رکھنا ضروری تھا۔ یہ رقم ہندوستانی کرنسی کی ساکھ کی مؤثر ضمانت تھی۔

پروپورشنل ریزرو سسٹم کے تحت سنٹرل بینک کو جاری کیے گئے نوٹوں کی ایک مقررہ فی صد سونے یا غیر ملکی سیکیورٹیوں کی شکل میں رکھنا تھا۔ سنہ ۱۹۳۴ء کے ریزرو بینک ایکٹ کے مطابق ریزرو بینک کو جاری کیے گئے نوٹوں کے مقابلے میں سونے کے سکوں، سونے اور اسٹرلنگ سیکیورٹیوں کی صورت میں ۴۰ فی صدی ریزرو رکھنا ضروری تھا۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کے بعد ہندوستان مانٹری فنڈ کا ممبر بن گیا۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے ایکٹ میں ترمیم کی گئی تاکہ ۴۰ فی صدی ریزرو میں اسٹرلنگ کے علاوہ دوسری بیرونی کرنسیوں کو بھی شامل کیا جا سکے۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے ایکٹ کے تحت ۴۰ فی صدی ریزرو کو ۴۰ کروڑ روپے سے کم نہیں ہونا

چاہیئے تھا۔ باقی ۶۰ فی صدی نوٹ ہندوستانی سکّے، حکومت ہند کی سیکیورٹیوں، منظور شدہ بلز آف اکسچینج اور پرامسری (PROMISSARY) نوٹس میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔ سرکاری سیکیورٹیاں مجموعی اثاثے کی ۲۵ فی صدی یا ۵۰ فی صدی کروڑ روپے سے زیادہ نہ ہونی چاہئیں۔

۱۹۵۶ء میں ترقیاتی منصوبہ بندی کی ضروریات کے پیش نظر ۱۹۳۴ء کے ریزرو بینک ایکٹ میں ترمیم کی گئی۔ جس کے تحت سونے اور سونے کے سکوں کا ریزرو ۱۱۵ کروڑ روپے ہونا ضروری تھا۔ اس ضرورت کے پیش نظر سونے کی قیمت پر نظر ثانی کی گئی۔ ۱۹۵۹ء کے ترمیمی ایکٹ کے تحت ریزرو میں غیر ملکی سیکیورٹیوں اور سونے کے تناسب کی نچلی حد کم کردی گئی ــ اب ریزرو بینک کے اِشوڈ پارٹمنٹ کو ۱۱۵ کروڑ کے بقدر سونا اور ۴۰۰ کروڑ کے بقدر غیر ملکی سیکیورٹیاں ریزرو کے طور پر رکھنا ضروری تھا۔ مخصوص حالات میں سیکیورٹیاں ۴۰۰ کروڑ کے بجائے ۳۰۰ کروڑ کی ہوسکتی تھیں۔ ۱۹۵۷ء کے آخری تین مہینوں میں صدر نے ایک آرڈیننس نافذ کیا جس کے تحت ریزرو بینک ایکٹ میں ترمیم کی گئی تاکہ بیرونی سیکیورٹیوں کی شکل میں کم سے کم کرنسی ریزرو کی حد کم کی جاسکے۔ نئے انتظام کے تحت کرنسی کی ساکھ کے لیے ریزرو بینک کو ۲۰۰ کروڑ روپے ریزرو رکھنا ضروری تھا جس میں سے ۱۱۵ کروڑ سونے یا سونے کے سکّے کی شکل میں ہونا چاہیئے چنانچہ اس آرڈیننس کا مجموعی اثر یہ ہے کہ سونے کے ریزرو میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن بیرونی سیکیورٹیوں کی کم سے کم مؤثر حد ۸۵ کروڑ ہوگئی جس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں کرنسی کا اجرا مینمم ریزرو کے اصول پر ہوتا ہے۔

ہندوستان میں آئی۔ایم۔ایف اور آئی۔بی۔آر۔ڈی

انٹرنیشنل مونٹری فنڈ ۲۷ دسمبر ۱۹۴۵ء کو قائم ہوا۔ اِس کے مقاصد یہ تھے: (۱) بین الاقوامی تجارت کی توسیع اور متوازن ترقی میں مدد کرنا (۲) مبادلاتی استحکام لانا (۳) ادائیگیوں کے مختلف السمت نظام کے قیام میں مدد دینا (۴) بیرونی زرمبادلہ کی پابندیوں کو ختم کرنا۔ مونٹری فنڈ کے تحت قدر کا نسب نما سونا ہے اور تمام ملکوں کی کرنسیوں کی قیمت سونے میں ظاہر کی جاتی ہے۔ سونے کو سب سے زیادہ نقد اثاثہ تصوّر کیا جاتا ہے کیونکہ ممبر ملک کو اپنے کوٹے کا ۲۵ فی صدی یا اپنے سونے کی مجموعی مقدار کا ۱۰ فی صدی سونے کی شکل میں چندہ جمع کرنا پڑتا ہے۔ مونٹری فنڈ معمولاً اپنے ممبروں کو اس کی اجازت دیتا ہے کہ وہ شرح مبادلہ میں دس

فی صدی تک ردّ و بدل کر سکتا ہے ۔ اگر کوئی ملک ادائیگیوں کے شدید عدم توازن میں مبتلا ہے تو ۱۰ فی صدی سے زیادہ بھی وہ ردّ و بدل کر سکتا ہے ۔ مونٹری فنڈ گولڈ اسٹینڈرڈ سسٹم سے یقیناً بہتر ہے ۔ یہ ایک طرح کا کنٹرولڈ انٹرنیشنل اکسچینج اسٹینڈرڈ ہے جو اندرونی اور بیرونی توازن ایک بیچ کے راستے کی حیثیت رکھتا ہے ۔

ہندوستان کو مونٹری فنڈ کی رکنیت سے بہت فائدہ پہنچا ہے ۔ ستمبر ۱۹۴۹ء میں روپے کی قیمت میں کمی سے پہلے جب ہندوستان ادائیگیوں کے عدم توازن سے دوچار تھا اس نے فنڈ سے ۹ کروڑ ڈالر لیے ۔ پھر ۱۹۵۲ء میں جب بین الاقوامی تجارت میں اس کا گھاٹا کافی بڑھ گیا تو اس نے فنڈ سے مزید امداد حاصل کی ۔ دوسرے پلان کے پہلے ہی سال سے زرمبادلہ کے ہمارے وسائل گھٹنا شروع ہوگئے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے اگرچہ درآمدات کو زیادہ سے زیادہ کم کرنے کی کوشش کی گئی اور ریزرو بینک نے کرنسی ریزرو کافی کم کردی ۔ ۱۹۵۷ء میں جب حالت بہت نازک ہوگئی تو حکومت نے مونٹری فنڈ سے کم مدت کی امداد طلب کی چنانچہ فنڈ نے ۹۵.۲۰ کروڑ روپے یعنی ۲۰ کروڑ ڈالر قرض دیئے ۔

اِس کے بعد سے یہ سوال اکثر اٹھا ہے کہ مونٹری فنڈ سے مزید امداد کے کیا امکانات ہیں ۔ اِس کا جواب دینے سے پہلے فنڈ کی شرائط پر نظر ڈالنا ضروری ہے ۔ فنڈ کے ضابطوں کے تحت ایک ممبر ملک اپنے کوٹے کا ۲۵ فی صدی بیرونی زرمبادلہ بارہ مہینوں میں خرید سکتا ہے ۔ حال میں فنڈ کے حکام نے برما اور برطانیہ کے لیے یہ شرط ہٹا دی ۔ اِس کے بعد سے کوٹے کا ۵۰ فی صدی تک خریدنے کی اجازت عام ہوگئی لیکن مجموعی خریداری پر اب بھی شرط عائد ہے وہ شرط یہ ہے کہ فنڈ کے پاس کسی ممبر ملک کی کرنسی اس کے کوٹے کے ۲۰۰ فی صدی سے زیادہ نہ ہونی چاہیے ۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ فنڈ سے ملنے والی کم مدت امداد کی اوپری سطح ملک کے کوٹے اور سونے کی شکل میں دیے گئے اس ملک کی چندے کی رقم کے برابر مقرر ہے ۔ اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ ہندوستان کے لیے یہ بالائی حد ۴۰ کروڑ ڈالر اور سونے کی قیمت یعنی ۲ کروڑ ۷۰ لاکھ ڈالر ہے ۔ یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ ہندوستان ۲۰ کروڑ ڈالر کے بقدر بیرونی کرنسی ۱۹۵۸ء میں خرید چکا ہے چنانچہ فنڈ سے مزید خریداری کی گنجائش ۲۲ کروڑ ۷۰ لاکھ ڈالر یعنی ۱۰۸ کروڑ روپے ہے ۔

لیکن اکتوبر ۱۹۵۸ء میں فنڈ بینک کی جو کانفرنس دلّی میں منعقد ہوئی اس کے بعد سے

مزید امداد کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ فنڈ بینک کی سرگرمیوں میں ایک بنیادی تبدیلی یہ واقع ہوئی ہے کہ اب تعمیر سے زیادہ استحکام اور ترقی پر زور دیا جانے لگا ہے۔ فنڈ بینک میٹنگ میں مونٹری فنڈ کے وسائل بڑھانے سے متعلق کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ لیکن عام طور سے یہ رائے تھی کہ ۵۰ فی صدی ہونا چاہیئے۔ یہ بھی تجویز تھی کہ اضافے کا ۲۵ فی صدی سونے کی شکل میں ادا ہونا چاہیئے۔ بعد میں مونٹری فنڈ کے حکام نے اعلان کیا کہ انھوں نے کوٹے کو ۵۰ فی صدی کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس اضافے کا ۲۵ فی صدی سونے میں ادا ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اپریل ۱۹۵۹ء میں ہندوستان نے مونٹری فنڈ کو اطلاع کی کہ وہ اپنے بڑھے ہوئے کوٹے کے مطابق ۲۰ کروڑ ادا کرنے پر تیار ہے۔ اس ۲۰ کروڑ میں سے ایک چوتھائی سونے میں ادا کیا گیا اور باقی ہندوستانی روپے سیکیورٹیوں کی شکل میں ادا کیا گیا۔ یہ سیکیورٹیاں فنڈ کے حق میں جاری کی گئی تھیں جن پر کوئی سود نہیں تھا اور جو سکھاری نہیں جا سکتی تھیں۔ فنڈ کے وسائل میں اضافے کی وجہ سے اس کی کارکردگی بڑھ گئی اور ہندوستان کے لیے اپنے ترقیاتی کاموں کے سلسلے میں خصوصاً تیسرے پلان کے دوران امداد حاصل کرنے کے امکانات بڑھ گئے۔

تیسرے پلان کے پہلے ہی سال کے دوران یہ واضح ہو گیا کہ زرمبادلہ پر دباؤ پھر بڑھ گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بیرونی زرمبادلہ کی تحصیل بیرونی قرضوں کی ادائیگی اور ضروری درآمدات کی قیمت ادا کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ چنانچہ حکومت ہند نے مونٹری فنڈ سے احتیاطی انتظام کیا کہ جس کے تحت ہندوستان فنڈ سے ۱۲ کروڑ ۵۰ لاکھ ڈالر ان کرنسیوں میں لے سکتا ہے۔ جو فنڈ کے پاس دستیاب تھیں۔ یہ رقم جولائی ۶۲ء اور جون ۶۳ء کے دوران لی جا سکتی تھی مبادلاتی صورت حال اور خراب ہوئی تو ہندوستان نے مارچ ۶۵ء میں فنڈ سے ۲۰ کروڑ ڈالر ہنگامی قرض کے طور پر لیا۔ فروری ۶۶ء میں ۹ کروڑ ڈالر کا دوسرا قرض لیا گیا۔ یہ قرض کمپنسیٹری فائنانس اسکیم کے تحت تھا جس کا مقصد برآمدات کی وقتی کمی کی صورت میں امداد دینا ہوتا ہے۔ ۸ اکروڑ ۷۵ لاکھ کا تیسرا قرض اپریل ۶۷ء میں لیا گیا۔ یہ قرض قحط کی مشکلات سے نپٹنے کے لیے تھا۔

بڑی امید افزا بات ہے کہ جون ۶۸ء میں مونٹری فنڈ کے گورنروں کی کونسل نے یہ فیصلہ کیا کہ مونٹری فنڈ سے رقم حاصل کرنے کے لیے اسپیشل ڈرا ونگ رائیٹس قائم کیے جائیں۔ اس کے تحت ممبروں کو یہ مخصوص حق پانچ قسطوں میں دیا جائیگا اور وہ اپنے موجودہ کوٹے کے تناسب سے رقم لے سکیں گے۔ مثلاً اگر فنڈ نے سالانہ منظوری ۱۰۰ کروڑ ڈالر کے لیے دی تو اس میں سے

امریکہ ۲۲ کروڑ، برطانیہ ۱۰ کروڑ اور ہندوستان ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ ڈالر کا حقدار ہوگا۔ اسی طرح پانچ سال تک ہر سال اتنی رقم نکالنے کا حق ملتا رہے گا۔ لیکن ممبر ملک پانچ سال کی مدت میں صرف ستر فی صدی استعمال کر سکیں گے۔ اسپیشل ڈرا ونگ رائیٹس کی ضمانت صرف سونے میں ہوگی۔ مونٹری فنڈ سے عام قاعدوں کے تحت اور S. D. R کے تحت روپیہ لینے میں یہ فرق ہے کہ S. D. R کی وجہ سے دُنیا کی محفوظ رقم میں مستقل اِضافہ ہوتا ہے۔ S.D.R کے ضابطے کے تحت ہندوستان کو ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ ڈالر کی مزید رقم نکالنے کا حق مل جائیگا جس میں سے ۷۰ فی صدی وہ واپسی کی فکر کیے بغیر پانچ برس میں استعمال کر سکیگا۔ ہندوستان چونکہ ۹۰ کروڑ ڈالر کا مونٹری فنڈ کا قرضدار ہے اِس لیے اس مزید سہولت سے اس کے توازن ادائیگی پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ لیکن بات صرف اِتنی ہی نہیں ہے۔ ہندوستان اور دوسرے ترقی پزیر ملکوں کو بالواسطہ فائدہ بھی ہے۔ اِس مخصوص سہولت کی وجہ سے توقع کی جاتی ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں کو اپنی ادائیگی کے توازن کی مشکلات دور کرنے کے لیے تجارتی اور امدادی پابندیوں کی پالسی نہیں اپنانی پڑے گی۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے آگے چل کر تجارت کا توازن بہتر ہو جائے اور کم ترقی یافتہ ملکوں کو مختلف سمتوں سے زیادہ امداد ملنے لگے۔

"انٹرنیشنل بینک فار ری کانسٹرکشن اینڈ ڈیولپمنٹ" مونٹری فنڈ کے ایک ساتھی ادارے کی حیثیت سے قائم کیا گیا۔ عام طور سے اس کو عالمی بینک کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اِس کا مقصد لمبی مدت کے لیے بیرونی سرمایہ لگانا ہے۔ عالمی بینک نے ۱۰۰۰ کروڑ ڈالر کے مجاز سرمایہ سے کام شروع کیا۔ ۱۹۵۹ء میں اس سرمایہ کی حد بڑھا کر ۲۱۰۰ کروڑ ڈالر کر دی گئی۔

اپنے قیام کے بعد سے عالمی بینک نے یورپ کے اُن ملکوں کی صنعتی تعمیر نو کی طرف بہت توجہ دی جو جنگ کی وجہ سے تباہ ہو گئے تھے۔ اِس کے ساتھ ہی عالمی بینک نے کم ترقی یافتہ ملکوں کی معاشی ترقی کے لیے مالی وسائل فراہم کرنا شروع کیے۔ عالمی بینک کی ایک سال کی سالانہ رپورٹ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بینک نہایت خلوص کے ساتھ کم ترقی یافتہ ملکوں کی معاشی بنیاد کو مستحکم بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بڑی اُمید افزا بات ہے کہ ۱۹۵۹ء میں ایشیائی ملکوں کو دیے گئے قرض کی مجموعی رقم ۱۰۰ کروڑ ڈالر سے زیادہ ہو چکی تھی۔ ترقیاتی مالیات کے طور پر بینک نے جتنی رقم ایشیائی ملکوں میں لگائی ہے اُتنی کسی دوسرے براعظم میں نہیں لگائی ہے۔ ۳۰ جون ۱۹۶۰ء تک ہندوستان کو اس بینک سے ۳۶ قرض ملے۔ جن کی مجموعی رقم ۱۰۰ کروڑ لاکھ

ڈالرتھی۔ مجموعی رقم کے اعتبار سے ہندوستان کو سب سے زیادہ قرض ملا ہے اگرچہ فی کس قرض کے اعتبار سے ہندوستان کا نمبر پہلا نہیں ہے۔

عالمی بینک ایک مخصوص قسم کا ادارہ ہے جو بینکنگ کے اصولوں پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے کام بھی کرتا ہے جو بینک کاروں کے کام نہیں ہیں۔ قرض دینے میں پوری احتیاط برتی جاتی ہے اور ترقی کے کاموں میں ہمت سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ یہ لمبی مدت کے لیے سرمایہ لگاتا ہے جو کوئی دوسرا بینک نہیں کرتا۔ بین الاقوامی سطح پر کام کرنے میں مشکلات پیش آتی ہیں خصوصاً اس حالت میں جب ملکوں کے قوانین اور ان کی معاشی پالیسیاں اتنی مختلف ہوں۔

عالمی بینک عام قرض دینے کے خلاف ہے۔ یہ صرف مخصوص پروجیکٹوں کے لیے قرض دیتا ہے۔ فی الحال بینک کے قرضوں کا مقصد ممبر ملکوں کی معاشی ترقی کی بنیاد کو استحکام دینا ہے۔ جن پروجیکٹوں کے لیے قرض دیا جاتا ہے انھیں بجلی اور رسل و رسائل کو سب سے زیادہ ترجیح حاصل ہے کیونکہ ان پروجیکٹوں سے نئے وسائل پیدا ہوتے ہیں اور ترقی کی رفتار تیز ہوتی ہے۔ لیکن معاشی ترقی اس طرح خانوں میں نہیں عمل میں آتی۔ چنانچہ اکثر ایسے پروجیکٹوں کے لیے بھی قرضے دیے گئے ہیں جو ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں مثلاً ہندوستان کو ریلوں کی ترقی کے لیے جو قرض عالمی بینک نے دیا اس سے سب سے زیادہ فائدہ دامور گھاٹی کو پہنچا ہے۔ ایک دوسرا قرض ملا ہے جس سے گھاٹی میں فولاد اور لوہے کی پیداوار کو بڑھانے میں مدد مل رہی ہے۔ ایک اور قرض مختلف صنعتوں کے لیے پاور دستیاب کرنے میں استعمال ہو رہا ہے۔ ایک اور قرض ایسے مختلف المقاصد پروجیکٹوں کی ترقی کے لیے ہے جن سے صنعت اور زراعت دونوں کو فائدہ پہنچے گا۔

۲۰ جولائی ۱۹۵۶ء کو ایک اور ادارہ قائم کیا گیا جس کا نام انٹرنیشنل فائنانس کارپوریشن ہے۔ یہ کارپوریشن ایک بین الاقوامی ادارہ ہے جو عالمی بینک سے ملحق ہے۔ یہ کم ترقی یافتہ ملکوں کے لیے نجی کاروبار کی مدد کرتا ہے جس کی ضمانت حکومت نہیں لیتی اس کا بیباق سرمایہ ۹ کروڑ ۹۹ لاکھ ڈالر ہے۔ جون ۱۹۶۸ء کے ختم تک کارپوریشن نے ۳۹ ملکوں کو ۲۷ کروڑ ۸۱ لاکھ ڈالر کی رقم فراہم کی تھی ان میں سے تقریباً آدھے ملک کم آمدنی والے تھے۔

انٹرنیشنل فائنانس کارپوریشن اور عالمی بینک دو مختلف ادارے ہیں جن کے فنڈ مختلف ہیں لیکن دونوں مل کر کام کرتے ہیں۔ کارپوریشن ترقی یافتہ اور کم ترقی یافتہ ملکوں کے

نجی کاروبار کو مالی وسائل فراہم کرتا ہے۔ عالمی بینک کے برعکس یہ ادارہ حکومت کی ضمانت نہیں طلب کرتا۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ کارپوریشن جو سرمایہ لگاتا ہے وہ قرض اور شیئر کی درمیانی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ قرض بھی ہوتا ہے جس پر سُود دینا پڑتا ہے اور اِس سرمایہ کو اس کاروبار کے منافع میں بھی کچھ شرکت کا حق ہوتا ہے۔ کارپوریشن کے سرمایہ کاری کے تین اجزا ہوتے ہیں۔ ایک تو قائم سود پر لمبی مدت کے لیے قرض ہوتا ہے۔ یہ مدت عموماً آٹھ یا دس برس ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کاروبار کے منافع میں شریک ہونے کا حق ہوتا ہے اور تیسرے یہ کہ کارپوریشن اپنے سرمائے سے کاروبار کے شیئر خرید سکتا ہے اور اِس طرح سرمائے کو اسٹاک میں تبدیل کرسکتا ہے۔ کارپوریشن کے قیام سے ہندوستان اور ان دوسرے کم ترقی یافتہ ملکوں کے نجی کاروبار کو بڑی مدد ملی ہے جو اپنے کارخانوں اور آلات کو وسعت دینا چاہتے تھے لیکن اِس کام کے لیے عالمی بینک سے براہ راست قرض اس لیے نہیں حاصل کرسکتے تھے کیونکہ حکومتیں ان قرضوں کی ضمانتیں لینے پر نہیں آمادہ تھیں۔ ۶۲-۱۹۶۱ء میں کارپوریشن کے معاہدے کی دفعات میں ترمیم کی گئی جس کے تحت کارپوریشن اکوئیٹی (EQUITY) شیئر خریدنے میں اور عام شیئروں کو (UNDER-WRITE) کرنے میں سرمایہ لگا سکتا ہے۔ کارپوریشن کو قائم ہوئے تیرہ برس ہوچکے ہیں۔ قیام کے پہلے چھ برسوں میں کارپوریشن نے ہندوستان میں دو بار سرمایہ لگایا۔ پہلی بار آسام سلمنائٹ (ASSAM SILLIMANITE) لمیٹڈ میں جو رانچی کے ریفریکٹری سامان بنانے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ دوسرے کارپوریشن نے کے۔ ایس۔ پی پمپس لیمیٹڈ (K.S.P. PUMPS LTD) میں سرمایہ لگایا جو پونا میں قائم کیا گیا تھا۔ دسمبر ۱۹۶۶ء میں کارپوریشن نے جے شری کیمیکلز لیمیٹڈ میں سرمایہ لگایا تاکہ یہ مشرقی ہند کے گنجم نامی مقام پر کاسٹک سوڈے کا کارخانہ لگا سکے۔ جون ۱۹۶۸ء تک کارپوریشن نے مجموعی طور سے ۲ کروڑ ۴۳ لاکھ ڈالر ہندوستانی کاروباروں میں لگائے تھے جس کا مقصد ٹکسٹائل مشینری ایلوائے اسٹیل (ALLOY STEEL)' بال بیرنگ اور پمپ وغیرہ بنانے کے کارخانوں کے لیے مالی وسائل فراہم کرنا تھا۔

نومبر ۱۹۶۰ء سے ایک اور ادارے نے کام کرنا شروع کیا جس کا نام انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ ایسوسیشن ہے۔ یہ ادارہ بھی عالمی بینک سے ملحق ہے اور بینک کا پریسیڈنٹ اس کا بھی پریسیڈنٹ ہوتا ہے۔ اس کے قیام کی وجہ یہ تھی کہ امریکہ اور دوسرے کچھ ملک یہ محسوس کر رہے تھے کہ ترقیاتی امداد دینے میں اور زیادہ صنعتی ملکوں کو شریک ہونا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ اس ایسوسیشن کے

قیام سے اِس مقصد کے پورا کرنے میں مدد ملیگی۔ عالمی بینک کے ممبر ممالک اس ایسوسیئشن کے بھی ممبر بن سکتے ہیں۔ دسمبر ۱۹۶۰ء تک ۲۲ ملکوں نے اس کا ممبر بننا قبول کر لیا تھا۔ ان میں ہندوستان بھی تھا۔ ممبروں کے ابتدائی چندے سے جو رقم بنتی تھی وہ ۷۶ کروڑ ۵۰ لاکھ ڈالر تھی۔ یہ رقم کسی بھی کرنسی میں بدلی جا سکتی تھی اور ممبروں کو اسے پانچ برسوں میں ادا کرنا تھا۔ ایسوسیئشن پانچ برس کی مدت میں اس رقم کے بقدر ذمہ داری قبول کر سکتا تھا۔ آگے چل کر یہ رقم بڑھا کر ۷۷ کروڑ ۵۰ لاکھ ڈالر کر دی گئی۔ یہ اضافہ سویڈن کے (SUPPLEMENTARY) چندے سے ممکن ہوا۔ اس مجموعی رقم میں سے ۱۹۶۲-۶۳ء کے ختم تک ۴۹ کروڑ ۵۰ لاکھ ڈالر قرض کی ذمہ داری لی جا چکی تھی جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس ۲۸ کروڑ ڈالر بچ رہے تھے۔ کام اتنا پھیلا اور مطالبات اتنے بڑھے کہ ۱۹۶۳ء کے وسط تک ایسوسیئشن کے زیادہ تر وسائل پابند ہو چکے تھے۔ ستمبر ۱۹۶۹ء تک ۱۸ دولت مند ملکوں سے ۷۵ کروڑ ۳۰ لاکھ ڈالر مزید چندہ لے کر ایسوسیئشن کے وسائل میں اضافے کی کارروائی پوری کی جا چکی تھی۔ ان ملکوں میں امریکہ، برطانیہ اور جرمنی شامل تھے۔ چونکہ ایسوسیئشن لمبی مدت کے لیے بلا سود قرض دیتا ہے اس لیے ترقی پزیر ممالک ایسوسیئشن سے زیادہ سے زیادہ قرض کے خواہش مند رہتے ہیں۔ اب تک یعنی ۳۰ جون ۱۹۶۸ء تک ایسوسیئشن نے تمام ملکوں کو مجموعی طور پر جو قرض دیا ہے اُس میں سے آدھے سے کچھ زیادہ ہندوستان کے مختلف پروجکٹوں کو ملا ہے۔ جون ۱۹۶۸ء تک ایسوسیئشن نے ہندوستان کو ۲۱ قرض دیے جن کی مجموعی رقم ۸۸ کروڑ ۷۰ لاکھ ڈالر بنتی ہے۔ یہ قرضے صنعتی درآمدات، ریلوے، ٹیلی کمیونیکیشن، آبپاشی اور بجلی جیسے مختلف کاموں کے لیے دیے گئے ہیں۔ ایسوسیئشن کے قرضے ۵۰ سال کی مدت میں ادا ہونے ہیں۔ ان پر سود نہیں لگتا لیکن ۷۵ء۰ فی صدی سالانہ سروس چارج دینے پڑتے ہیں۔

مختصر یہ کہ عالمی بینک اور انٹرنیشنل مونٹری فنڈ دونوں ادارے ابتدائی مراحل سے گزر کر اب بلوغیت کی منزل تک پہنچ رہے ہیں۔ انٹرنیشنل فائنانس کارپوریشن اور انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ ایسوسیئشن بھی اپنے پیروں پر کھڑے ہو چکے ہیں۔ یونائیٹڈ نیشن کی ان مخصوص ایجنسیوں نے ہندوستان جیسے ترقی یافتہ ملکوں کو کافی امداد فراہم کی ہے۔

جنگ کے دوران اور جنگ کے بعد کے زمانے میں افراطِ زر

افراطِ زر یا قیمتوں کی سطح کا بڑھنا بے حد طلب اور اس کے دیکھتے رسد کی کمی کا نتیجہ ہوتی

ہے۔ افراطِ زر کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ چیزوں کی بڑھی ہوئی مانگ کے مقابلے میں رسد بے لوچ ہو جاتی ہے۔ عام فہم انداز میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ طلب، پیداوار اور روپے کی مقدار میں عدم توازن کی وجہ سے افراطِ زر کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ افراطِ زر کے مقداری اصول ہمیں یہ بتلاتے ہیں کہ اگر روپے کی مقدار بڑھے گی تو اسی تناسب سے قیمتوں میں اضافہ واقع ہوگا لیکن یہ اصول اس وقت عمل میں آتے ہیں جب سماج میں مکمل روزگار ہو۔ مکمل روزگار کی منزل پر پہنچنے سے پہلے اگر روپے کی مقدار بڑھتی ہے تو اضافے کو بے استعمال وسائل اور بے روزگار لوگوں کی مدد سے پیداوار کو بڑھانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اِس طرح پیداوار جو بڑھے اُس سے اشیا کی اُس طلب کو پورا کیا جا سکتا ہے جو لوگوں کی قوتِ خرید بڑھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور جو روپے کی مقدار میں اضافے کا نتیجہ تھی۔ اِس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اگر طلب میں اِضافے کے ساتھ ساتھ رسد میں بھی اضافہ ہو تو روپے کی مقدار بڑھنے کے باوجود افراطِ زر نہ ہوگا اور قیمتیں نہیں بڑھیں گی۔ لیکن مکمل روزگار سے پہلے نیم افراطِ زر واقع ہو سکتا ہے جس کی مختلف وجہیں ہو سکتی ہیں مثلاً معیشت کے بعض حلقوں میں بے آہنگی اور عارضی رُکاوٹیں یا عوامل پیداوار کی کم یابی مثلاً بنیادی خام مال، بھاری آلات اور ہُنر مند عملے کی قِلت۔

دُوسری لڑائی کے دوران افراطِ زر

ستمبر ۱۹۳۹ء میں جنگ چھڑتے ہی سٹہ بازی کی وجہ سے قیمتیں بڑھنے لگیں۔ یہ سلسلہ تین مہینے یعنی دسمبر ۱۹۳۹ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد قیمتیں ٹھہر گئیں اور ۱۹۴۰ء کے دوران افراطِ زر کا رجحان دبا رہا لیکن آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ یاد رکھنا چاہیے اس زمانے میں بھی کچھ زائد طلب تھی جو آہستہ آہستہ چھپے ہوئے اسٹاک کے نکلنے سے پوری ہوتی رہی۔ افراطِ زر کے اثرات کی کافی نفی اِس لیے ہو گئی کیونکہ ذخیرہ اندوز بیوپاری اور تھوک فروش جمع کیا ہوا مال رفتہ رفتہ نکال رہے تھے۔

۱۹۴۱ء میں یہ چھپا ہوا افراطِ زر کھُل کر سامنے آگیا اور لوگوں نے قیمتوں کے بڑھتے ہوئے رجحان کو واقعی محسوس کرنا شروع کیا۔ ۱۹۴۲ء کے شروع میں حکومت ہند نے برطانیہ کی طرف سے بڑے پیمانے پر مال کی خریداری شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے استعمال کے لیے چیزوں کی دستیابی

کم ہوگئی۔ ۱۹۴۰ء میں چھپا ہوا مال نکالنے کا جو رجحان ظاہر ہوا تھا وہ ایک دم غائب ہوگیا اور سٹہ بازوں کی ذخیرہ اندوزی کی سرگرمیاں زوروں کے ساتھ بڑھنے لگیں۔

۱۹۴۱ء میں جاپان لڑائی میں شریک ہوگیا جس کی وجہ سے افراطِ زر اور تیزی سے بڑھنے لگا۔ صرفی اشیا کی قلت اور اناج کی شدید کمی نے صورت حال بڑی تاریک کردی۔ قیمتوں کے اعتبار سے ۱۹۴۳ء سب سے خراب سال تھا۔ غرضیکہ ۱۹۴۱-۴۳ء کے دوران ہندوستان میں کھلا ہوا نیم افراطِ زر تھا جو مکمل روزگار نہ ہونے کی صورت میں پیدا ہوتا ہے اور جس کی وجہ حلقوں میں بے آہنگی اور ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل کی رکاوٹیں تھیں۔ ہم نے اسے کھلا ہوا افراطِ زر اس لیے کہا ہے کیونکہ ۱۹۴۳ء سے پہلے حکومت نے قیمتوں کو بڑھنے سے روکنے کے کوئی اقدام نہیں کیے۔

۱۹۴۳ء کے آخری تین مہینوں میں حکومت نے قیمتوں پر کنٹرول اور اناج، کپڑے، شکر اور دوسری ضروریات زندگی کی چیزوں پر راشننگ کا نفاذ کیا۔ ۱۹۴۳ء کے بعد حکومت نے کاغذی نوٹ کے اجرا کی رفتار بھی کم کردی۔ بڑے پیمانے پر قرض لینے کا پروگرام شروع کیا تاکہ لوگوں کی زائد قوتِ خرید کو ان کے ہاتھوں سے نکال لیا جائے۔ ساتھ ہی زیادہ اناج اگاؤ تحریک شروع ہوئی تاکہ غلّے کی پیداوار بڑھائی جاسکے۔ اِن اقدام کی وجہ سے ۱۹۴۳-۴۵ء کے دوران قیمتوں میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہوا۔ اِس مدّت میں قیمتوں کا عام انڈکس ۲۳۶ اور ۲۴۴ کے درمیان رہا۔ اِس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۴۳-۴۵ء کے دوران کھلے ہوئے نیم افراطِ زر کو کنٹرول، راشننگ اور مختلف مالیاتی اقدام کے ذریعے دبے ہوئے نیم افراطِ زر میں بدل دیا گیا۔

جنگ کے فوراً بعد کے زمانے میں افراطِ زر (اگست ۱۹۴۵ء تا نومبر ۱۹۵۱ء)

افراطِ زر کے رجحانات جو دورانِ جنگ دبے ہوئے تھے جنگ ختم ہوتے ہی جھٹکے کے ساتھ منظرِ عام پر آگئے اور وہ طلب جو اب تک جنگ کے زمانے کی پابندیوں کی وجہ سے دبی ہوئی تھی اِک دم پھوٹ پڑی۔ لڑائی کے زمانے میں لوگوں نے خود اپنی ضرورتیں روک رکھی تھیں لیکن اب لڑائی ختم ہوچکی تھی اور لوگ صرفی اشیا کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بے چین تھے۔

جنگ کے فوراً بعد کے زمانے میں صرفی اشیا کی بڑھتی ہوئی طلب پوری نہیں کی جا

سکتی تھی کیونکہ دورانِ جنگ صنعت کار اپنے کارخانوں میں نئی مشینیں اور آلات نہیں لگا سکے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ جنگ کے فوراً بعد کے زمانے کی خصوصیت یہ تھی کہ صارفوں کی قوتِ صَرف بڑھ گئی تھی لیکن اس کی مناسبت سے پیداآور سرمایہ کاری میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔ صَرف اور پیداوار کا یہ فرق اور زیادہ تشویش ناک صورت اِس لیے اختیار کر گیا تھا کیونکہ جنگ کے فوراً بعد کے زمانے میں کاغذی کرنسی کی مزید توسیع ہوئی۔ مرکزی حکومت اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرتی رہی اور بڑے کاموں میں سرمایہ لگانے کی وجہ سے گھاٹے کا بجٹ بنتا رہا۔ چنانچہ جنگ کے بعد کا افراطِ زر صَرف پیداوار اور روپے کی رسد میں شدید بے آہنگی کا نتیجہ تھا۔ اب تک لوگوں نے ضرورتیں روک رکھی تھیں لیکن لڑائی ختم ہوتے ہی چیزوں کی طلب ایکدم بڑھ گئی۔ دوسری طرف فرسودہ ہونے کی وجہ سے اور صنعتی جھگڑوں کی وجہ سے پیداوار گھٹ گئی تھی اِس پر طرّہ یہ کہ روپے کی رسد ۴۹-۱۹۴۵ء کے دوران ۵۰۰ کروڑ روپے کے بقدر بڑھ گئی۔

حکومت نے اُجرتوں پر نظرِ ثانی کی اور مہنگائی بھتّہ بڑھا دیا جس کی وجہ سے اور خراب صورت پیدا ہوگئی کیونکہ دبے ہوئے افراطِ زر کی صورت میں اُجرتوں کے بڑھنے سے افراطِ زر کی شدّت بڑھ جاتی ہے اور دبا ہوا افراطِ زر جھٹکے کے ساتھ نیم عریاں افراطِ زر میں بدل جاتا ہے۔

جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں ہندوستان کے افراطِ زر کو ایک دبا ہوا نیم افراطِ زر سمجھنا چاہیے کیونکہ ۱۹۴۳ء سے حکومت کنٹرول اور راشننگ کے ذریعے افراطِ زر کے اثرات کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دبے ہوئے افراطِ زر کو نیم عریاں افراطِ زر بنانے میں صرف بڑھی ہوئی اُجرتوں ہی کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں حکومت نے جلدبازی میں اناج اور شکر پر سے کنٹرول ہٹا لینے کا فیصلہ کیا۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں کپڑے پر سے کنٹرول ختم ہوتے ہی معیشت میں افراطِ زر کی بنیادی خصوصیات نمایاں ہو گئی تھیں۔ مشیرِ معاشیات کا عام انڈکس جو نومبر ۱۹۴۷ء میں ۳۰۲ تھا۔ جولائی ۱۹۴۸ء میں ۳۹۰ پر پہنچ گیا۔ قیمتوں کا اتنی تیزی سے بڑھنا نیم عریاں افراطِ زر کے زُمرے میں آتا ہے کیونکہ افراطِ زر کو دبانے کے اقدام کے بجائے حکومت نے کنٹرول ہٹانے کی پالیسی اپنا کر کم از کم وقتی طور پر قیمتوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

حکومت نے جولائی ۱۹۴۸ء میں کپڑے پر اور اکتوبر ۱۹۴۸ء میں اناج پر دوبارہ کنٹرول عائد کر دیا اور افراطِ زر پر قابو پانے کے لیے ایک جامع پروگرام کا اعلان کیا۔ اِس پروگرام کے

مقاصد یہ تھے: (۱) بجٹ کے خسارے کو کم کرنا (۲) پبلک کمپنیوں کے دیے جانے والے منافع کو محدود کرنا (۳) آسائشات پر درآمداتی ڈیوٹی کی شرح بڑھانا (۴) چھوٹی بچت کی مہم کو تیز کرنا (۵) ایکسس پرافٹ ٹیکس ڈپازٹ کی واپسی ملتوی کرنا (۶) ٹیکس کی رعایتوں اور فرسودگی کا الاؤنس دے کر صنعتی پیداوار بڑھانے کی رغبت پیدا کرنا (۷) اناج میں خودکفالت حاصل کرنا۔ افراطِ زر کو رد کرنے کے اس پروگرام کی وجہ سے نہ صرف قیمتوں کا بڑھنا رک گیا بلکہ عام انڈکس جولائی ۱۹۴۸ء کے ۳۹۰ سے گھٹ کر مارچ ۱۹۴۹ء میں ۳۷۰ ہوگیا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ اس پروگرام نے دسمبر ۱۹۴۷ء اور جولائی ۱۹۴۸ء کے نیم عیاں افراطِ زر کو ایک بار پھر دبے ہوئے افراطِ زر میں بدل دیا۔ ستمبر ۱۹۴۹ء میں روپے کی قیمت گھٹانے کے بعد حکومت نے مزید افراطِ زر کی پیش بندی کے طور پر ایک آٹھ نکاتی پروگرام کا اعلان کیا۔ اس پروگرام کی خاص باتیں یہ تھیں: (۱) اناج، کپڑے لوہے، فولاد اور کوئلے کی قیمتیں کم کرنا (۲) اہم اشیا میں سٹہ بازی اور پیشگی خریداری کو روکنا (۳) سرکاری اخراجات کم کرنا (۴) سرکاری ملازموں کے لیے لازمی بچت شروع کرنا۔ ان اقدام کا اثر یہ ہوا کہ قیمتیں واقعی کم ہوگئیں لیکن صورت حال میں یہ بہتری کوریا کی لڑائی کی وجہ سے چند روزہ ثابت ہوئی۔

کوریا کی لڑائی کو تیسری جنگِ عظیم کا پیش خیمہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اس کی وجہ سے ذخیرہ اندوزی کا رجحان بہت بڑھ گیا۔ ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے رسد کم ہوگئی اور افراطِ زر کی قوتیں اور زور پکڑ گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ستمبر ۱۹۴۹ء اور اپریل ۱۹۵۱ء کے دوران قیمتیں تقریباً مسلسل بڑھتی رہیں۔ ان انیس (۱۹) مہینوں میں قیمتوں کی عام سطح میں ۱۹٫۴ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ اس ابھرتے ہوئے افراطِ زر کو دبانے کے لیے حکومت نے نومبر ۱۹۵۱ء میں بینک ریٹ ۳ فی صدی سے بڑھا کر ۳½ فی صدی کر دیا۔ اس اقدام کا مقصد یہ تھا کہ قرض کی قیمت (یعنی سود) بڑھا کر ذخیرہ اندوزی کی استعداد کم کی جائے۔

پہلے اور دوسرے پلان کے دوران قیمتوں کی سطح

اگرچہ پلاننگ کمیشن کی آخری رپورٹ دسمبر ۱۹۵۲ء میں قوم کے سامنے پیش کی گئی۔ لیکن پہلا پلان یکم اپریل ۱۹۵۱ء سے شروع ہوگیا تھا۔ پلان کے پہلے سال کے دوران قیمتوں میں بہت نمایاں کمی واقع ہوئی۔ ۱۵ مارچ ۱۹۵۱ء اور ۱۵ مارچ ۱۹۵۲ء کے درمیان قیمتوں میں ۲۱ فی صدی کی کمی

ہوئی۔ قیمتوں میں اس کمی کی وجہ سے ایک قلیل مدت کے لیے سرد بازاری کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ریزرو بینک کی کڑی مالیاتی پالیسی جس کا اعلان نومبر ۱۹۵۱ء میں گیا اور اشیا کا ذخیرہ کم کرنے کے عالمی رجحان نے ہندوستان کی معیشت پر اپنا اثر ڈالا جو کوریا کی لڑائی ختم ہو جانے کے بعد سے پیدا ہوا تھا۔ ریزرو بینک نے بینک ریٹ ۳ فی صدی سے بڑھا کر ۳½ فی صدی کر دیا۔ فروری مارچ ۱۹۵۲ء تک ہندوستان کے بازار مال سے پٹ گئے۔ یہ وہ مال تھا جس کا پہلے ذخیرہ کیا گیا تھا۔ اب دوکانداروں، تھوک فروشوں اور صنعت کاروں میں بے اطمینانی کی لہر دوڑ گئی اور سب پریشان تھے۔ بہ ہر حال حکومت نے قیمتوں کی سطح کو مستحکم کرنے اور سرد بازاری کے رجحان کو روکنے کے اقدام کیے۔

اِس سلسلے میں یہ اقدام کیے گئے: خام اُون اور روغنی بیجوں پر سے برآمداتی ڈیوٹی ختم کر دی گئی۔ جوٹ سے بنے مال اور خام روئی پر برآمداتی ڈیوٹی کافی کم کر دی گئی۔ جوٹ کے بنے سامان اور سوتی کپڑے پر اکسپورٹ ڈیوٹی اور بہت سی چیزوں پر اندرونی کنٹرول بہت نرم کر دیا گیا۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام قیمتوں کا انڈکس ستمبر ۱۹۵۲ء میں ۳۸۹ پر ٹھہر گیا۔ اس کے دو ماہ بعد پہلے پلان کا اعلان کیا گیا۔ یہ پلان بہت معمولی تھا جس میں تمام تر زور معاشی استحکام پر دیا گیا تھا۔ مارچ ۱۹۵۲ء کے تیسرے ہفتے سے قیمتوں نے سنبھالا لیا اور اگست ۱۹۵۳ء یعنی ۱۷ مہینوں میں قیمتوں کی عام سطح ۸ر۱۲ فی صدی بڑھ گئی۔

پہلے پلان کے دوران مانسون سازگار رہے اور موسمی حالات بھی بہتر رہے جس کی وجہ سے زراعتی پیداوار مقررہ نشانے سے زیادہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ستمبر ۱۹۵۳ء اور جون ۱۹۵۵ء کے دوران اناج کی قیمتیں تیزی سے گریں۔ پہلے پلان کے دوران صنعتی پیداوار بھی بڑھی۔ اگرچہ یہ اِضافہ زراعتی پیداوار کے مقابلے میں کم تھا۔ مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ جون ۱۹۵۵ء تک قیمتیں پست ترین سطح پر آگئیں۔ تھوک کی قیمتوں کا عام انڈکس نمبر مئی ۱۹۵۵ء میں ۳۴۲ پر آگیا۔ (اگست ۱۹۳۹ء برابر ۱۰۰) حقیقت یہ ہے کہ ستمبر ۱۹۵۳ء اور جون ۱۹۵۵ء کے درمیان قیمتیں ۵ر۱۵ فی صدی گھٹی تھیں۔ جون ۱۹۵۵ء کے تیسرے ہفتے سے قیمتیں پھر چڑھنے لگیں اور مسلسل بڑھتی رہیں۔ ابھی پہلے پلان کی مدت پوری ہونے میں نو مہینے باقی تھے۔ پلان کے ختم کے وقت حالت ایک دم بدل گئی جس کی وجہ یہ تھی کہ پلان کے آخری سال میں مصارف وسائل سے بہت زیادہ تھے اور بجٹ کا خسارہ ۲۹۲ کروڑ تک پہنچ گیا۔ اِسی دوران مانسون کی بے ربطی کی وجہ سے فصل بھی خراب ہوئی۔

پہلے پلان کے آخری سال میں افراطِ زر اور قیمتوں میں جو اضافے کا رجحان پیدا ہوا تھا
وہ دوسرے پلان کے دوران بدستور رہا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ فصل کٹنے کے زمانے میں
قیمتیں گھٹ گئیں۔ تھوک قیمتوں کا عام انڈکس (۱۰۰ = ۵۳ - ۵۲) جون ۵۶-۱۹۵۵ء میں ۹۹ تھا،
۵۷-۱۹۵۶ء میں ۱۰۱ ہو گیا۔ فروری ۱۹۵۸ء میں قیمتیں بڑھنے کا نیا دور شروع ہوا۔ صرف ۱۹۵۸ء
کے آخری مہینوں اور ۱۹۵۹ء کے شروع میں صورت کچھ تیز رہی لیکن اس کے بعد افراطِ زر کی
قوتوں نے پھر شدت اختیار کر لی۔ تھوک قیمتوں کا انڈکس نمبر جو فروری ۱۹۵۸ء میں ۱۰۵٫۱ تھا،
ستمبر ۱۹۵۸ء میں ۱۱۶٫۵ ہو گیا۔ اپریل ۱۹۵۹ء میں کچھ کمی ہو گئی اور انڈکس ۱۰۷٫۶ ہو گیا لیکن
یہ کمی عارضی تھی۔ قیمتیں پھر بڑھنے لگیں اور مارچ ۱۹۶۱ء میں انڈکس نمبر ۱۲۷ پر پہنچ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا
کہ عوام کی ضروریات زندگی بے حد مہنگی ہو گئیں۔ اگرچہ عوام کی ضروریات زندگی کا انڈکس نمبر نہیں
دستیاب ہے لیکن مزدور طبقے کی صرفی اشیا کے انڈکس سے کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کنزیومر
پرائس انڈکس نمبر (۱۰۰ = ۱۹۴۹) جون ۵۶-۱۹۵۵ء میں ۹۶ تھا، ۵۷-۱۹۵۶ء میں ۱۰۷، مارچ ۱۹۶۱ء
میں ۱۱۲، ۵۹-۱۹۵۸ء میں ۱۱۸ اور ۶۰-۱۹۵۹ء میں ۱۲۳ ہو گیا۔ مارچ ۱۹۶۱ء میں قیمتوں کا انڈکس
۱۲۵ تھا۔ اِس سے ہمیں دوسرے پلان کے دوران قیمتوں کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال کا کچھ اندازہ
ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کھانے کی چیزوں اور دوسری صرفی اشیا جو تمام آدمیوں کے
استعمال میں آتی ہیں ان کی قیمتیں اُس سے بہت زیادہ بڑھی تھیں جتنی سرکاری انڈکس سے ظاہر
ہوتی تھیں۔

تیسرے پلان کی قیمتوں کی پالیسی

جون ۱۹۶۶ء میں روپے کی قیمت میں کمی کرتے وقت وزیر مالیات نے اِس بات کا اعتراف
کیا کہ تیسرے پلان کے دوران قیمتوں میں بہت زیادہ اضافہ واقع ہوا ہے۔ مسٹر سچین چودھری نے
بتلایا کہ عام قیمتیں تیسرے پلان کے دوران ۵۰ فی صدی بڑھی ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ان
پانچ برسوں میں اوسطاً ۱۰ فی صدی کا اضافہ ہوتا رہا۔ زیادہ تر اضافے پلان کے تیسرے برسوں میں
(۶۴-۱۹۶۳ء اور ۶۵-۱۹۶۴ء) میں واقع ہوئے۔ پلاننگ کمیشن کے مطابق اس مدت میں عام قیمتوں کا
انڈکس ۳۶ فی صدی بڑھ گیا۔ اِس موقع پر یہ بھی ذکر کرنا ضروری ہے کہ مارچ ۱۹۶۲ء اور اپریل
۱۹۶۶ء کے درمیان تمام اشیا کی تھوک قیمتوں کا انڈکس (۱۰۰ = ۵۳ - ۵۲) بہت تیزی سے

بڑھا اور ۱۴۹٫۸ سے ۱۷۶٫۲ پر پہنچ گیا۔ کھانے کی چیزوں کی قیمتوں کا انڈکس ۱۲۷٫۷ سے بڑھ کر ۱۷۸٫۴ ہو گیا۔ پورے ملک کا کنزیومر پرائس انڈکس بھی مارچ ۱۹۶۳ء کے ۱۲۰ سے بڑھ کر مارچ ۱۹۶۶ء میں ۱۴۰ پر پہنچ گیا۔

جب ہم پیچھے کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ پہلے پلان کے برعکس دوسرے پلان کے دوران قیمتوں کا رجحان توقع کے مطابق نہیں تھا۔ دوسرے پلان کے پانچ برسوں میں تھوک قیمتوں کے انڈکس میں ۳۰ فی صدی، کھانے کی اشیا کے انڈکس میں ۲۷ فی صدی، صنعتی سامان کے انڈکس میں ۲۵ فی صدی اور صنعتی خام مال کے انڈکس میں ۴۵ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں تک قیمتوں سے متعلق پالیسی کی تشکیل کا سوال تھا صرف کھانے ہی کی اشیا نہیں بلکہ صنعتی خام مال بھی خطرے کے دائرے کے اندر رہتے۔ مختصر یہ کہ دوسرے پلان کی بنیادی ناکامی یہ تھی کہ یہ ضروری اشیا اور صنعتی خام مال کی قیمتوں کو بڑھنے سے نہ روک سکا۔ اس کے دو خاص نتائج برآمد ہوئے، ایک تو پلان کی مالی لاگت بڑھ گئی جس کا اثر پلان کے مادّی نشانوں پر پڑا اور دوسرے کروڑوں لوگوں کے مصارف زندگی بڑھ گئے۔ قیمتوں کے محاذ پر دوسرے پلان کے تجربے کے باوجود پلاننگ کمیشن نے قیمتوں سے متعلق ایسی پالیسی مرتب کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی جو یہ سمجھ کر بنائی گئی ہو کہ قیمتیں موٹر کے اسٹیرنگ کی طرح ترقی کے سفر میں سمت متعین کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ تیسرے پلان کی رپورٹ میں اس بات کا گہرا مطالعہ نہیں کیا گیا کہ قیمت کی کس مخصوص پالیسی کا مختلف شعبوں پر کیا اثر مرتب ہوگا۔ اس کے بجائے رپورٹ میں بیشتر کسی مخصوص سکٹر میں قیمتوں کے اضافے کے پیشِ نظر قیمتوں کی پالیسی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ گویا یہ ایک ایسی بات ہے جس کا معیشت کے دوسرے شعبوں سے تعلق نہیں ہے۔ غرضیکہ تیسرے پلان کا وہ باب جو قیمتوں کے بارے میں ہے بہت ناکافی اور بے ربط ہے۔ اس میں قیمتوں کے اُس باہمی تعلق کو نظر انداز کیا گیا ہے جو ایک ترقی پذیر معیشت کے لیے توجّہ کا مرکز ہونا چاہیے اگرچہ خود تیسرے پلان کی رپورٹ میں یہ کہا گیا ہے کہ قیمتوں پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے اور یہ کہ بڑھتی ہوئی قیمتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مالیاتی اور سکّہ جاتی پالیسیوں میں ہم آہنگی ضروری ہے۔

افراطِ زر کے کچھ عوامل ہوتے ہیں جن کی وجہ سے سرگرمی بڑھتی ہے اور ملکی وسائل پر دباؤ پڑتا ہے اور کچھ عوامل جن کی وجہ سے ان وسائل اور ان کی قیمتوں میں اضافے کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ قیمتوں کے اصول کے تجزیے کے لیے ان دو قسم کے عوامل میں فرق کرنا ضروری ہے۔ پیداوار اور

وسائل کو معیشت کے توسیع پزیر حلقے کی طرف موڑنے کے لیے قیمتوں میں مناسب اضافہ ضروری ہے اِس میں اور اُس اضافے میں فرق کرنا چاہیے جس سے مجموعی طور سے پیدا آور وسائل کا ناکافی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ قیمتوں میں اول الذکر قسم کا اضافہ ترقیاتی منصوبہ بندی کے لیے عموماً اچھا ہوتا ہے۔

لیکن ایک ترقی پزیر معیشت میں قیمتوں سے متعلق اصل مسئلہ یہ ہے کہ کسی مخصوص چیز کی قیمت کے سلسلے میں کوئی پالیسی قیمتوں کے باہمی رشتے کو بدلے بغیر نہیں اختیار کی جاسکتی۔ یعنی ایک حلقے کی قیمتوں کا اثر دوسرے حلقے کی قیمتوں پر پڑنا ضروری ہے۔ اسی لیے حال میں قیمتوں کے باہمی رشتے پر دوبارہ توجہ دی جانے لگی ہے جو ترقی پزیر معیشتوں کے مسائل میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔

لیکن اب یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ایک ترقی پزیر معیشت میں بالکل تھمی ہوئی قیمتیں اُس کی ترقی میں مانع آتی ہیں۔ جب سرمایہ زیادہ لگنے کی وجہ سے آمدنیاں بڑھیں تو اُسی تناسب سے پیداوار بھی بڑھنی چاہیے لیکن پیداوار بڑھی ہوئی قیمتوں کے محرک کے بغیر نہیں بڑھ سکتی۔ ہمارے ماہرین منصوبہ کو اس بات کا احساس تھا۔ چنانچہ تیسرے پلان کی تشکیل کے وقت یہ فیصلہ کیا گیا کہ قیمتوں میں اگر آہستہ اور متوازن اضافہ ہو (مثلاً ۴ فی صدی سے ۵ فی صدی تک کا سالانہ اضافہ) تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ اس سے ترقی کے عمل میں مدد ملیگی۔ لیکن تیسرے پلان کے دوران حالات بگڑ گئے اور پلان کے آخری تین برسوں میں قیمتیں غیر متوقع حد تک بڑھ گئیں۔ اس دوران قیمتوں میں ہر سال ۱۲ فی صدی کا اضافہ ہوا۔

حال میں قیمتوں کے بے تحاشا بڑھنے کے اسباب اور اُس کا تدارک

ہندوستان کے ماہرین منصوبہ اور ترقیاتی معاشیات کے حامی اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ ترقی کے عمل کے دوران قیمتوں کی سطح کا آہستہ اونچا ہونا ضروری ہے۔ اِس سلسلے میں یہ کہا گیا کہ قیمتوں میں اِس حد تک اضافہ جو پیدا آور وسائل کو توسیع پزیر معیشت کی طرف راغب کرنے کے لیے ضروری ہے، اُس میں اور اس بات کی حمایت میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے کہ قیمتوں کا آہستہ اور یکساں اضافہ ترقی کے عمل میں مدد کرتا ہے۔ چنانچہ ۶۲-۱۹۵۱ء کے درمیان قیمتوں میں ۶ فی صدی کا جو اضافہ ہوا اُسے ہم مناسب تسلیم کرسکتے ہیں۔ لیکن ۱۹۶۲ء سے قیمتیں بہت تیزی سے بڑھیں جس کا سبب کچھ بھی ہو، اناج کی پیداوار میں کمی، بھاری دفاعی اخراجات، غلط کاموں میں سرمایہ لگانا یا

ضروری اشیا کی ذخیرہ اندوزی۔ مارچ ۱۹۶۲ء اور مارچ ۱۹۶۳ء کے دوران تھوک قیمتوں کا اشاریہ (۱۰۰=۵۳-۱۹۵۲) ۱۲۸ر۸ سے بڑھ کر ۱۳۹ر۲ ہو گیا۔ پھر اپریل ۱۹۶۳ء سے اپریل ۱۹۶۴ء کے دوران میں اور اضافہ ہوا اور یہ ۲۱۱ر۷ پر پہنچ گیا۔ ۶۴-۱۹۶۳ء کے دوران قیمتوں میں اضافے کا سبب غذا جیسی اشیا کی شدید قلت تھا۔ چنانچہ قیمتوں کے اس اضافے کو تفاعلی (FUNCTIONAL PRICE RICE) اضافہ نہیں کہا جا سکتا۔ مزید یہ کہ قیمتوں میں ۱۳ فی صدی کا اضافہ جو ۶۴-۱۹۶۳ء کے دوران واقع ہوا، اضافے کے اُس زُمرے میں نہیں آتا جسے آہستہ اور یکساں اضافہ کہا جا سکے جو ترقی کے عمل کے لیے مفید ہوتا ہے۔

قیمتوں کے اضافے کے جس دَور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں مستقل اور کم آمدنی والے طبقے کا معیار زندگی نمایاں طور سے گھٹتا ہے اور اُجرتوں اور قیمتوں کے بڑھنے کا وہ چکر شروع ہو گیا ہے جس میں ایک کی وجہ سے دوسرے میں اضافہ ہوتا ہے۔ دولت کی تقسیم پر اس کا خراب اثر پڑتا ہے اور ذخیرہ اندوزی نفع بخش ہو جاتی ہے۔ ایک جمہوری ملک میں قیمتوں میں اس قسم کا بے تکان اضافہ ترقیاتی منصوبہ بندی کے لیے ایک مستقل مسئلہ بن جاتا ہے جو ترقی کے عمل کے لیے مُضر ہے جس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔

ان تمام خرابیوں کی بنیادی وجہ زرعی منصوبہ بندی کی خامیاں اور آبادی کا بے حد اضافہ ہے جس سے ہم پچھلے دس برسوں سے دوچار ہیں۔ زراعت کو تقویت دینے اور اس کی از سرِ نو تنظیم کے سلسلے میں جو کچھ کیا گیا ہے وہ ناکافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حال میں قیمتوں کا جو اضافہ ہے اُس کی خاص وجہ اناج کی پیداوار ہے جو طلب کے مقابلے میں بہت کم رہتی ہے۔ تیز صنعتی ترقی اور بڑھتی ہوئی سرمایہ کاری کے مقابلے میں پچھڑی ہوئی زراعتی پیداوار نے غذا اور خام مال کی قلت پیدا کر دی ہے جس کا اثر زراعتی قیمتوں پر پڑا ہے۔

اگرچہ ہم نے اب تک تمام تر زور پیداوار کی کمی اور اس کی وجہ سے بڑھتی ہوئی قیمتوں پر دیا ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اس وقت قیمتوں پر جو دباؤ پڑ رہا ہے اس کی بیشتر ذمہ داری بڑھتی ہوئی طلب پر ہے۔ معیشت میں بڑے پیمانے پر سرمایہ لگ رہا ہے۔ اُدھر پانچ سالہ منصوبوں کے سلسلے میں سرکاری اخراجات برابر بڑھ رہے ہیں۔ ان دونوں کی وجہ سے مؤثر طلب کے حجم میں مُسلسل اِضافہ ہوتا رہا ہے۔ حال میں دفاعی مصارف اور برآمدات کی وجہ سے طلب میں اضافہ ہوا ہے۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قیمتوں کا بے تحاشا اضافہ طلب کی زیادتی کا نتیجہ ہے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان میں قیمتوں کے اضافے کی تشریح میں طلب کی قوتوں کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ لیکن ساتھ ہی رسد کی اُن بنیادی قوتوں اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کو نہیں نظر انداز کیا جا سکتا جن کی وجہ سے قلیل مدت میں مصارف نمایاں طور سے بڑھے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حال میں قیمتوں کا اضافہ طلب کے بڑھتے ہوئے دباؤ اور بڑھتے ہوئے مصارف کے باہمی ردِّعمل کا نتیجہ ہے۔ اس مسئلے کو اگر ایک دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ پچھلے دس برسوں میں قیمتوں کا مسلسل اضافہ مجموعی طلب اور مجموعی رسد کے درمیان عدم توازن ظاہر کرتا ہے۔ یہ عدم توازن تیسرے پلان کے دوران اور زیادہ شدید ہو گیا۔ مالیاتی عناصر نے قیمتوں کے بڑھنے کی رفتار اور تیز کر دی۔

اناج کی قلت کی وجہ سے جو عارضی عدم توازن پیدا ہو گیا ہے اس کے فوری علاج کے طور پر براہ راست ضابطوں اور کنٹرول پر پورے طور سے زور دینے کی ضرورت ہے۔ قیمتوں کے کنٹرول اور راشننگ کے کڑے نظام کے ساتھ اناج اور دوسری ضروری اشیا کی تجارت میں سرکار کی شرکت بے حد ضروری ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر جنوری ۱۹۶۵ء میں فوڈ کارپوریشن قائم کیا گیا جس کے ذریعے حکومت قومی پیمانے پر غلّے کا کاروبار کرتی ہے۔ آگے چل کر ہمیں ایک ایسی زراعتی پالیسی اپنانا ہے جس کے تحت کھاد، کیڑے مارنے والی دواؤں، پودوں کو قوت دینے والے اجزا اور جدید زراعتی آلات کی پیداوار پر پوری توجہ دی جا سکے۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ زراعت میں جلد از جلد بنیادی تبدیلیاں لائی جائیں۔ چنانچہ فوری طور پر اور لمبی مدت کے پیش نظر ضرورت اس بات کی ہے کہ زیادہ مؤثر تنظیم کے ذریعے اور بہتر قسم کے بیج اور کھاد کی رسد بڑھا کر زراعتی پیداوار میں اضافہ کیا جائے۔ قیمتوں سے متعلق پالیسی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ قرض کی بہت زیادہ سہولت فراہم کرنے سے احتراز کیا جائے۔ چنانچہ حکومت کی مالیاتی پالیسی کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اخراجات میں اضافے کی شرح اصل پیداوار میں اضافے کی شرح کے مطابق ہو۔

حال کی سرد بازاری کا تجزیہ

۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۶۵ء کے دوران افراطِ زر بالکل واضح طور سے طلب اور رسد

کے عدم توازن کا نتیجہ تھا یعنی مجموعی طلب مجموعی رسد کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ لیکن ۶۷-۱۹۶۶ء کے دوران افراطِ زر زیادہ پیچیدہ تھا۔ اس زمانے میں قیمتیں اس لیے بڑھ رہی تھیں کیونکہ طلب کے مقابلے میں بہت سے حلقوں کی پیداوار زیادہ تیزی سے گھٹ رہی تھی۔ گویا ان دو برسوں میں قیمتوں کے اعتبار سے تو افراطِ زر تھا لیکن اگر پیداوار میں کمی اور بے استعمال پیداواری استعداد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو سرد بازاری تھی۔ یہ صنعتی معیشت کی بڑی خوش قسمتی سمجھی جاتی ہے کہ وہ جمع شدہ ذخیرے کا سہارا لے کر سرد بازاری کی آزمائش سے گزر جائے۔ ہندوستان میں کچھ ایسا ہی ہوا اور ملک اس مرحلے سے گزر گیا۔ ۱۹۶۸ء سے صنعتی پیداوار نے پھر بڑھنا شروع کیا۔ عارضی اعداد شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۶۷ء کے مقابلے میں ۱۹۶۸ء میں پیداوار میں ۶ فی صدی کا اضافہ ہوا۔

سوال یہ ہے کہ پیداوار کی استعداد کا پورا استعمال کیوں نہیں ہو رہا تھا۔ کپڑے، جوٹ اور انجینیری صنعتوں کی کافی استعداد تو زراعتی خام مال اور درآمدات کی قلت کی وجہ سے نہیں استعمال ہو پا رہی تھی۔ ۶۷-۱۹۶۶ء کے دوران ان کسانوں کی کم آمدنی کی وجہ سے بھی طلب میں کمی واقع ہوئی تھی جن کے پاس قابل فروخت زائد مال نہیں تھا۔ اس کے علاوہ مستقل آمدنی والے لوگوں کو بہت چڑھی ہوئی قیمتوں پر اناج خریدنا پڑ رہا تھا۔ چنانچہ انھیں دوسری اشیا پر اپنے مصارف کم کرنے پڑ رہے تھے جس سے صنعتی سرد بازاری پیدا ہو رہی تھی۔ لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بہت سے صنعتی فرم کم قیمت پر اپنا مال بیچنے پر کم مال پیدا کرنے کو ترجیح دے رہے تھے۔

سرد بازاری کی ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ درمیانی اشیا پیدا کرنے والی صنعتوں میں سرمایہ لگنے کی رفتار مختلف وجوہ سے سست ہو گئی تھی اور یہی وہ صنعتیں تھیں جو بھاری صنعتوں کو پورے طور سے مصروف رکھتی تھیں۔ پوری استعداد استعمال نہ ہونے کا نتیجہ یہ تھا کہ بے روزگاری پہلے سے ہی موجود تھی اُس میں اضافہ ہو گیا۔

دوسرے اور تیسرے پلان کے دَوران زراعتی اور صنعتی ترقی کے مقابلے سے پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں حلقوں میں متوازن ترقی نہیں ہوئی۔ صنعتی پیداوار کے انڈکس سے ظاہر ہے کہ دوسرے اور تیسرے پلان کے دوران ۳۱ فی صدی اور ۳۹ فی صدی کا اِضافہ ہوا جبکہ زراعتی پیداوار دوسرے پلان میں ۲۲ فی صدی بڑھی اور تیسرے پلان میں ۶ فی صدی گھٹی۔ زراعت اور صنعت جیسے اہم شعبوں کی ناہموار ترقی سے نہ صرف قیمتیں متاثر ہوئیں بلکہ معیشت کی عام حالت پر اس کا خراب اثر

پڑا۔ زراعتی پیداوار میں کمی کی وجہ سے اناج اور خام مال کی قلت پیدا ہوئی اور قیمتیں بڑھیں۔

زراعتی پیداوار کی قیمتوں میں اضافے کا اثر مصنوعات کی قیمتوں اور مصارف پیداوار پر براہ راست اور بالواسطہ پڑا۔ براہ راست اثر خام مال کی اور پیداواری اشیا کی مہنگائی کی صورت میں اور بالواسطہ اثر بڑھی ہوئی اُجرتوں کی شکل میں پڑا۔ قیمتیں زیادہ ہونے کی وجہ سے زراعتی پیداوار کی ذخیرہ اندوزی میں مدد ملی اور ذخیرہ اندوزی نے قیمتوں کو اور بڑھایا۔

ہندوستان میں قیمتوں کے جس غیر معمولی اضافے سے دوچار ہیں اس سے قومی پیداوار میں کوئی خاص کمی نہیں واقع ہوئی لیکن ملک کے مختلف طبقوں کے درمیان اُس کی تقسیم بدل جاتی ہے۔ جن اشیا کی قیمت بڑھتی ہے ان کے مالکوں کو فائدہ ہوتا ہے اور خریداروں کو نقصان۔ جب اناج کی قیمت بڑھتی ہے تو ان کسانوں کو فائدہ پہنچتا ہے جن کے پاس قابلِ فروخت فاضل اناج ہوتا ہے لیکن اُن خریداروں کو نقصان پہنچتا ہے جن کی آمدنی نہیں بڑھی ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ معیشت میں ایک شدید تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ ایک طرف بہترین فصل کے باوجود زراعتی قیمتیں بڑھی ہیں اور دوسری طرف افراطِ زر کی حالت کے باوجود پیداوار کی ترقی سُست رہی ہے۔ تیسرے پلان کے دوران ترقیاتی اور دفاعی اخراجات کی وجہ سے جتنی بھی براہ راست اور بالواسطہ طلب پیدا ہوئی ہے وہ انجنیری سامان اور اُن اشیا پر صرف ہونے کے بجائے جن سے سرمائے کی تشکیل ہوتی، ساری کی ساری اناج کی نذر ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ اناج اور دوسری اشیا کی قیمتیں تیزی سے چڑھ گئیں جبکہ مصنوعات کی قیمتیں کم و بیش بدستور رہیں۔ اُجرتوں میں اضافے کی وجہ سے قیمتوں کے کم ہونے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ چنانچہ صرف ایک ہی ردِعمل ممکن تھا کہ اگر مصارف پیداوار نہیں کم ہو سکتے تو پیداوار بند کر دی جائے۔ صنعتی حلقے کی بے استعمال استعداد کی یہی وجہ تھی۔ اِس طرح ہمارے یہاں ایک طرف عام افراطِ زر کی حالت تھی اور زراعتی قیمتیں برابر چڑھ رہی تھیں اور ساتھ ہی صنعتی حلقے میں سرد بازاری تھی اور یہ سرد بازاری ۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۷ء کے دوران بہت نمایاں تھی۔ لیکن ۱۹۶۸ء کے آخر میں ہندوستان کی معیشت نے پلٹا لیا اور صنعتی پیداوار نے پھر بڑھنا شروع کر دیا۔

نوٹ ٹیبل نمبر ۷ — ۱

xxx اس میں یہ شامل ہیں: (i) مجموعی کیپٹل ریزرو (ii) نیشنل ایگریکلچرل فنڈ اور نیشنل انڈسٹریل کریڈٹ فنڈ میں ریزرو بینک کا حصہ (iii) مندرجہ ذیل کا فرق: (الف) ریزرو بینک کے دوسرے واجبات خاص کر واجب الادا بل، اور مختلف مدوں میں ملنے والا بینک کا منافع (ب) دوسرے اثاثے مثلاً عمارت، فرنیچر، اسٹیشنری وغیرہ (iv) ریزرو بینک کے ملازمین کا پنشن فنڈ، پراوڈنٹ فنڈ اور کواپریٹیو گارنٹی فنڈ (v) پاکستان سے واپس ہوئی ہندوستانی کرنسی کی حساب فہمی کے لیے رکھے گئے ۳۴ کروڑ۔

ΔΔ بینکوں کے ریزرو، پونجی اور مندرجہ ذیل کے فرق پر مشتمل ہے (الف) دوسرے واجبات (ب) دوسرے اثاثے۔

x وہ ۱۷ء۳۴ کروڑ کے ہندوستانی نوٹ نہیں شامل ہیں جو پاکستان سے واپس ہوئے اور جن کی حساب فہمی نہیں ہوئی ہے لیکن کویت سے مخصوص کرنسی نکالنے کی اجازت ہے (۹۳ء۲۶ کروڑ اپریل ۱۹۶۱ء میں، ۲۷ء۹ کروڑ مئی ۱۹۶۱ء میں اور ۵۵ء۰ کروڑ جون ۱۹۶۱ء میں)۔

a دسمبر ۱۹۵۷ء تک کی حالی سکہ کرنسی شامل ہے

†† ۱۹۶۰-۱۹۶۱ء کے بعد کے اعداد شمار کا پچھلے برسوں کے اعداد شمار سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ۱۲ مئی ۱۹۶۰ء سے ۴۸۰ PL کے انتظام میں تبدیلی کی گئی۔

† ۱۹۵۲ء میں نان شیڈیولڈ بینکوں کو شامل کرنے کی وجہ سے گیرائی میں جو فرق آیا اس سے مطابق پیدا کر لی گئی۔

xx شیڈیولڈ بینکوں کی میعادی اور غیر میعادی امانتوں اور مارچ ۱۹۶۱ء کے دوسرے واجبات کو لے کر یہ اعداد شمار نکالے گئے۔

aa ان بیرونی بلوں کے مطابق بنایا گیا جن سے متعلق اعداد شمار صرف ۱۴ مئی ۱۹۵۲ء سے دستیاب ہوئے۔

SOURCE: RESERVE BANK OF INDIA'S REPORT ON CURRENCY AND FINANCE (FOR 1965—66) BOMBAY 1966.

ٹیبل نمبر ۷—۲

تھوک کی قیمتوں کے رجحانات (سالانہ انڈکس نمبر)

۱۹۵۲—۵۳ = ۱۰۰

مہینوں کا اوسط وزن	تمام اشیا ۱۰۰۰	غذائی اشیا ۵۰۴	شراب اور تمباکو ۲۱	ایندھن پاور روشنی ۳۰	صنعتی خام مال ۱۵۵	مصنوعات		
						میزان ۲۹۰	درمیانی پیداوار ۴۱	تیار اشیا ۲۴۹
۱۹۵۰—۵۱	۱۱۱٫۸	۱۰۲٫۵	۹۸٫۴	۹۲٫۶	۱۳۰٫۹	۱۰۳٫۳	۱۱۲٫۴	۱۰۱٫۸
۱۹۵۶—۵۷	۱۰۵٫۳	۱۰۲٫۳	۸۴٫۳	۱۰۴٫۲	۱۱۶٫۰	۱۰۶٫۲	۱۱۰٫۹	۱۰۵٫۶
۱۹۵۷—۵۸	۱۰۸٫۴	۱۰۶٫۳	۹۴٫۰	۱۱۳٫۵	۱۱۶٫۵	۱۰۸٫۱	۱۰۷٫۲	۱۰۸٫۲
۱۹۵۸—۵۹	۱۱۲٫۹	۱۱۵٫۲	۹۵٫۴	۱۱۵٫۴	۱۱۵٫۶	۱۰۸٫۲	۱۱۰٫۳	۱۰۸٫۱
۱۹۵۹—۶۰	۱۱۷٫۱	۱۱۹٫۰	۹۹٫۵	۱۱۶٫۵	۱۲۳٫۷	۱۱۱٫۷	۱۱۳٫۸	۱۱۱٫۳
۱۹۶۰—۶۱	۱۲۴٫۹	۱۲۰٫۰	۱۰۴٫۹	۱۲۰٫۰	۱۴۵٫۴	۱۲۳٫۹	۱۳۰٫۶	۱۲۲٫۸
۱۹۶۱—۶۲	۱۲۵٫۱	۱۲۰٫۱	۱۰۰٫۳	۱۲۲٫۱	۱۴۲٫۶	۱۲۶٫۶	۱۳۸٫۸	۱۲۴٫۶
۱۹۶۲—۶۳	۱۲۷٫۹	۱۲۶٫۱	۱۰۰٫۹	۱۲۳٫۴	۱۳۶٫۵	۱۲۸٫۸	۱۳۹٫۵	۱۲۷٫۱
۱۹۶۳—۶۴	۱۳۵٫۳	۱۳۶٫۸	۱۱۹٫۶	۱۳۹٫۴	۱۳۹٫۵	۱۳۱٫	۱۳۹٫۶	۱۲۹٫۷
۱۹۶۴—۶۵	۱۵۲٫۷	۱۵۹٫۹	۱۳۱٫۲	۱۴۴٫۹	۱۶۲٫۷	۱۳۷٫۲	۱۵۲٫۴	۱۴۴٫۸
۱۹۶۵—۶۶	۱۶۵٫۱	۱۶۸٫۸	۱۳۶٫۶	۱۵۰٫۰	۱۸۹٫۱	۱۴۹٫۲	۱۶۲٫۳	۱۴۵٫۴
۱۹۶۶—۶۷	۱۹۱٫۲	۱۹۹٫۹	۱۳۰٫۳	۱۶۹٫۷	۲۲۸٫۷	۱۶۰٫۳	۲۰۴٫۵	۱۵۶٫۱
۱۹۶۷—۶۸	۲۱۲٫۴	۲۹۲٫۲	۱۳۶٫۶	۱۸۴٫۱	۲۱۹٫۱	۱۶۵٫۵	۲۱۱٫۷	۱۵۷٫۹
۱۹۶۸—۶۹	۲۱۰٫۲	۲۳۱٫۳	۲۱۲٫۱	۱۹۲٫۵	۲۲۲٫۷	۱۶۸٫۶	۲۰۲٫۲	۱۶۳٫۱

x اخذ کیے گئے اعداد

SOURCE: COMPILED FROM THE DATA PUBLISHED BY THE OFFICE OF THE ECONOMIC ADVISOR TO THE GOVERNMENT OF INDIA.

ٹیبل نمبر ۷-۳
مزدور طبقے کا اشیائے صرف کے انڈکس نمبر

۱۹۴۹=۱۰۰

سال	ہندوستان	برطانیہ	امریکہ	کناڈا	آسٹریلیا
۱۹۵۰-۵۱	۱۰۱	۱۰۳	۱۰۱	۱۰۳	۱۱۰
۱۹۵۱-۵۲	۱۰۵	۱۱۳	۱۰۹	۱۱۴	۱۳۴
۱۹۵۲-۵۳	۱۰۳	۱۲۲	۱۱۱	۱۱۶	۱۵۶
۱۹۵۳-۵۴	۱۰۶	۱۲۶	۱۱۲	۱۱۵	۱۶۳
۱۹۵۴-۵۵	۱۰۱	۱۲۹	۱۱۳	۱۱۶	۱۶۴
۱۹۵۵-۵۶	۹۶	۱۳۵	۱۱۲	۱۱۶	-
۱۹۵۶-۵۷	۱۰۷	۱۲۹	۱۰۸	۱۱۵	۱۶۶
۱۹۵۷-۵۸	۱۱۲	۱۳۱	۱۱۱	۱۱۶	-
۱۹۵۸-۵۹	۱۱۸	۱۳۲	۱۱۲	۱۱۵	۱۶۷
۱۹۵۹-۶۰	۱۲۳	۱۳۳	۱۱۱	۱۱۶	۱۶۶
۱۹۶۰-۶۱	۱۲۴	۱۳۳	۱۱۰	۱۱۵	۱۶۵
۱۹۶۱-۶۲	۱۲۷	۱۳۴	۱۱۱	۱۱۶	۱۶۴
۱۹۶۲-۶۳	۱۳۱	۱۳۳	۱۱۲	۱۱۵	۱۶۶
۱۹۶۳-۶۴	۱۳۷	۱۳۳	۱۱۱	۱۱۵	۱۶۵
۱۹۶۴-۶۵	۱۵۷	۱۳۴	۱۱۲	۱۱۶	۱۶۷
۱۹۶۵-۶۶	۱۶۹	۱۳۵	۱۱۱	۱۱۵	۱۶۶
۱۹۶۶-۶۷	۱۹۱	۱۳۶	۱۱۲	۱۱۶	۱۶۸
۱۹۶۷-۶۸	۲۱۳	۱۳۹	۱۱۴	۱۱۶	۱۶۷
۱۹۶۸-۶۹	۲۱۲	۱۳۸	۱۱۳	۱۱۵	۱۶۸

SOURCE: LABOUR BEUREAU, GOVERNMENT OF INDIA

ٹیبل نمبر ۷ — ۴

حال میں قیمت اور سکہ جاتی رجحان

قیمتیں صنعتی BASE SEPT. ۴۹=۱۰۰	قیمتیں تھوک BASE AUG. ۳۹=۱۰۰	پبلک کے پاس روپیہ	پبلک کے پاس امانت (کروڑ)	عوام کے پاس کرنسی (کروڑ)	ختم ہونے والے تین مہینوں میں
۱۰۴	۳۸۱٫۴	۱۷۸۴٫۶	۵۸۵٫۳	۱۱۹۹٫۳	مارچ ۱۹۵۳ء
۱۰۶	۳۹۵٫۹	۱۷۴۵٫۵	۵۵۷٫۵	۱۱۸۸٫۰	جون ''
۱۱۱	۴۰۳٫۷	۱۶۶۵٫۵	۵۵۰٫۱	۱۱۱۵٫۴	ستمبر ''
۱۰۶	۳۹۱٫۲	۱۷۰۹٫۴	۵۴۳٫۰	۱۱۶۶٫۴	دسمبر ''
۱۰۱	۳۹۵٫۸	۱۷۹۴٫۰	۵۹۴٫۶	۱۲۲۹٫۴	مارچ ۱۹۵۴ء
۱۰۲	۳۹۳٫۴	۱۷۸۶٫۱	۵۷۷٫۹	۱۲۰۸٫۲	جون ''
۱۰۱	۳۸۲٫۷	۱۷۵۹٫۵	۵۸۶٫۰	۱۱۷۳٫۵	ستمبر ''
۹۹	۳۷۵٫۲	۱۸۳۲٫۲	۶۰۷٫۶	۱۲۲۴٫۶	دسمبر ''
۹۴	۳۵۹٫۸	۱۹۲۰٫۶	۶۰۸٫۸	۱۳۱۲٫۸	مارچ ۱۹۵۵ء
۹۳	۳۴۲٫۵	۱۹۷۷٫۲	۶۲۳٫۵	۱۳۳۳٫۷	جون ''
۹۶	۳۵۳٫۲	۱۹۵۴٫۷	۶۴۴٫۰	۱۳۰۹٫۷	ستمبر ''
۹۹	۳۶۸٫۴	۲۰۴۷٫۲	۶۶۱٫۳	۱۳۸۵٫۹	دسمبر ''
۱۰۰	۳۸۹٫۴	۲۱۸۴٫۳	۶۷۹٫۲	۱۵۰۵٫۱	مارچ ۱۹۵۶ء
۱۰۶	۳۹۷٫۹	۲۱۸۹٫۳	۶۸۴٫۶	۱۵۰۴٫۵	جون ''
۱۰۸	۴۱۹٫۸	۲۱۰۹٫۴	۶۷۳٫۵	۱۴۳۵٫۹	ستمبر ''
۱۰۹	۴۲۸٫۸	۲۱۷۸٫۶	۶۹۳٫۳	۱۴۸۵٫۳	دسمبر ''
۱۰۷	۴۲۱٫۳	۲۳۱۲٫۹	۷۵۶٫۴	۱۵۵۶٫۵	مارچ ۱۹۵۷ء
۱۱۰	۴۲۹٫۱	۲۳۴۴٫۰	۷۸۱٫۲	۱۵۶۲٫۹	جون ''
۱۱۳	۴۴۰٫۳	۲۲۲۳٫۸	۷۴۲٫۸	۱۴۹۱٫۰	ستمبر ''
۱۱۳	۴۲۷٫۶	۲۲۷۴٫۰	۷۴۸٫۸	۱۵۲۶٫۲	دسمبر ''

ختم ہونے والے تین مہینوں میں	عوام کے پاس کرنسی (کروڑ)	پبلک کے پاس امانت (کروڑ)	پبلک کے پاس روپیہ	قیمتیں: تھوک BASE Aug. ۳۹=۱۰۰	قیمتیں: پھٹکل BASE Sept. ۳۹=۱۰۰
مارچ ۵۸ء	۱۶۰۵٫۷	۷۸۱٫۹	۲۳۸۷٫۶	۳۱۵٫۲	۱۱۰
〃 ۵۹ء	۱۷۲۴٫۵	۷۷۴٫۲	۲۴۹۸٫۷	۴۲۳٫۳	۱۱۲
〃 ۶۰ء	۱۹۸۱٫۹	۷۸۶٫۸	۲۷۶۸٫۱	۴۲۲٫۹	۱۱۱
〃 ۶۱ء	۲۰۹۸٫۱	۷۷۶٫۱	۲۸۷۴٫۱	۴۲۵٫۱	۱۱۳
〃 ۶۲ء	۲۲۰۱٫۸	۸۴۷٫۷	۳۰۴۹٫۵	۴۲۳٫۴	۱۱۲
〃 ۶۳ء	۲۳۷۹٫۵	۹۳۰٫۵	۳۳۱۰٫۳	۴۳۲٫۳	۱۱۴
〃 ۶۴ء	۲۶۰۲٫۱	۱۱۴۷٫۲	۳۷۴۹٫۳	۴۵۱٫۲	۱۱۹
〃 ۶۵ء	۲۷۶۹٫۲	۱۳۱۱٫۳	۴۰۸۰٫۵	۴۷۸٫۱	۱۳۵
〃 ۶۶ء	۳۰۳۴٫۳	۱۴۹۵٫۱	۴۵۲۹٫۴	۴۹۹٫۱	۱۴۲
〃 ۶۷ء	۳۱۹۶٫۸	۱۷۵۲٫۴	۴۹۴۹٫۲	۵۳۲٫۶	۱۶۳
〃 ۶۸ء	۳۳۷۴٫۶×	۱۹۷۵٫۴	۵۳۵۰٫۰×	۵۴۱٫۱	۱۷۱

× عارضی

SOURCE: RESERVE BANK OF INDIA REPORT ON CURRENCY AND FINANCE FOR THE YEAR 1956-57 TO 1967-68

ٹیبل نمبر ۷—۵ ریزرو بینک کے اشوڈ پارٹمنٹ کے سالانہ، ماہانہ اور ہفتہ وار اسٹیٹمنٹ

حکومت ہند کی معیادی سیکورٹی	روپے کے سکے	بیرونی سیکورٹی	سونے کے سکے اور سونا	مجموعی واجبات یا اثاثے	جاری نوٹ	نوٹ جو بینکنگ شعبہ میں تھے	آخری جمعہ
۱۶۲۲۲۰	۱۱۹۶۲	۱۳۳۰۱	۱۱۷۷۶	۱۹۹۲۵۹	۱۹۸۴۷۴	۷۸۴	۱۹۶۰ — ۶۱
۱۷۴۷۴۳	۱۱۶۹۱	۱۱۳۸۹	۱۱۷۷۶	۲۰۹۵۹۷	۲۰۷۰۳۰	۲۵۳۷	۱۹۶۱ — ۶۲
۱۹۱۱۴۲	۱۱۹۲۴	۱۰۵۰۸	۱۱۷۷۶	۲۲۵۰۵۲	۲۲۴۱۹۷	۸۵۶	۱۹۶۲ — ۶۳
۲۱۳۳۳۷	۱۰۹۱۱	۱۱۲۳۹	۱۱۷۷۶	۲۲۷۳۸۰	۲۲۵۴۰۰	۱۹۸۰	۱۹۶۳ — ۶۴
۲۳۳۷۹۲	۹۷۷۵	۷۷۴۶	۱۳۳۷۶	۲۶۴۶۸۹	۲۶۰۶۸۶	۴۰۰۳	۱۹۶۴ — ۶۵
۲۵۸۶۲۷	۹۴۰۰	۹۵۰۵	۱۱۵۸۹	۲۸۹۱۲۱	۲۸۶۶۳۴	۲۴۸۷	۱۹۶۵ — ۶۶
۲۶۸۴۹۲	۷۸۰۷	۱۸۶۴۲	۱۱۵۸۹	۳۰۶۵۳۰	۳۰۱۹۷۷	۴۵۵۳	۱۹۶۶ — ۶۷
۲۸۸۰۴۴	۷۸۹۶	۱۴۶۴۲	۱۱۵۸۹	۳۲۲۱۷۱	۳۱۹۳۹۶	۲۷۷۵	۱۹۶۷ — ۶۸
۳۰۶۱۴۸	۷۵۷۷	۲۱۶۴۲	۱۸۲۵۳	۳۵۳۶۲۰	۳۴۹۶۶۷	۳۹۵۳	۱۹۶۸ — ۶۹
۲۹۸۲۳۹	۷۵۸۷	۱۶۶۴۲	۱۱۵۸۹	۳۳۴۰۵۷	۳۳۰۷۸۹	۳۲۶۸	اپریل ۱۹۶۸ء
۲۷۸۳۰۵	۸۵۷۸	۲۲۶۴۲	۱۱۵۸۹	۳۲۱۱۱۴	۳۱۵۶۸۸	۵۴۲۶	نومبر "
۲۸۶۳۱۰	۸۳۱۵	۲۰۶۴۲	۱۱۵۸۹	۳۲۶۸۵۶	۳۲۲۱۱۶	۴۷۴۰	دسمبر "
۲۹۶۸۱۱	۸۱۸۲	۱۷۱۴۲	۱۱۵۸۹	۳۳۳۷۲۴	۳۳۰۱۰۷	۳۶۱۷	جنوری ۱۹۶۹ء
۲۹۹۱۴۷	۷۸۱۶	۱۷۱۴۲	۱۸۲۵۳	۳۴۲۳۵۸	۳۳۹۶۱۵	۲۷۴۳	فروری "
۳۰۶۱۴۸	۷۵۷۷	۲۱۶۴۲	۱۸۲۵۳	۳۵۳۶۲۰	۳۴۹۶۶۷	۳۹۵۳	مارچ "
۳۱۴۱۳۹	۷۲۹۱	۲۱۶۴۲	۱۸۲۵۳	۳۶۱۳۲۴	۳۵۷۷۹۳	۳۵۴۲	۴ر اپریل "
۳۱۸۷۱۵	۷۱۰۳	۲۱۶۴۲	۱۸۲۵۳	۳۶۵۷۱۳	۳۶۴۵۳۱	۱۱۸۲	۱۱ " "
۳۱۷۴۱۵	۷۱۶۱	۲۱۶۴۲	۱۸۲۵۳	۳۶۴۴۷۱	۳۶۲۷۲۹	۱۵۴۲	۱۸ " "
۳۱۴۷۱۵	۷۱۹۱	۲۱۶۴۲	۱۸۲۵۳	۳۶۱۸۰۱	۳۵۸۷۴۸	۳۰۵۳	۲۵ر اپریل ۱۹۶۹ء

نوٹ: اشو شعبے کے سونے کے ریزرو ۳۱ر جنوری ۱۹۶۹ء تک ۵۳ر۵۸ روپے فی دس گرام اور اس کے بعد ۸۴ر۳۹ روپے فی دس گرام کے حساب سے

۱ — سرکار کے ایک روپے کے نوٹ شامل ہیں جو جولائی ۱۹۴۰ء سے جاری ہوئے۔

حصہ ہشتم

تجارت، مبادلہ اور نقل و حمل

باب ۳۲

بیرونی تجارت، زرمبادلہ اور اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن

تاریخی پس منظر —— ۱۸۶۹ء میں سویز نہر کے کھلنے کے بعد سے ہندوستان کی تجارت کا نیا دور شروع ہوا۔ اِس کے بعد سے ہندوستان کی بیرونی تجارت رفتہ رفتہ بڑھتی رہی۔ اور یہ ۱۸۶۹ء کے ۹۰ کروڑ سے بڑھ کر ۱۹۱۳-۱۴ء میں ۳۷۶ کروڑ تک پہنچ گئی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران ہماری بیرونی تجارت قدرتاً گھٹ گئی۔ جنگ ختم ہونے کے فوراً بعد ۱۹۲۰-۲۲ء کے درمیان ہندوستانی تجارت کو جاپانی مقابلے کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑا لیکن ۱۹۲۳ء سے بیرونی تجارت پھر بڑھنے لگی اور ۱۹۲۸-۲۹ء میں ۶۰۴ کروڑ تک پہنچ گئی۔ ۱۹۳۰ء کے بعد کے برسوں میں جو عظیم سرد بازاری پھیلی اُس میں زراعتی قیمتیں بہت گر گئیں اور چونکہ ہندوستان زراعتی اشیا برآمد کرتا تھا اِس لیے اُس کو بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ سرد بازاری کے زمانے میں ہندوستانی برآمدات کافی گھٹ گئیں جس کی وجہ سے بیرونی تجارت میں بھی خاصی کمی آئی۔ ۱۹۳۳-۳۴ء میں ہماری بیرونی تجارت نے پھر بڑھنا شروع کیا جس کی خاص وجہ عالمی تجارت کی بحالی تھی۔

جنگ عظیم شروع ہونے سے کچھ پہلے ہندوستان کی بیرونی تجارت کی ساخت میں ایک کم ترقی یافتہ معیشت کی خصوصیات واضح طور سے موجود تھیں۔ ہماری برآمدات کا بیشتر حصہ زراعتی اشیا پر مشتمل تھا۔ برآمد کی جانے والی خاص چیزیں خام روئی، خام جوٹ، تلہن، چائے اور کھالیں تھیں۔

منظم حلقے میں صرف چند صنعتیں تھیں جو مصنوعات کی مجموعی طلب کو پورا نہیں کرسکتی تھیں

چنانچہ درآمد کی جانے والی بیشتر اشیا مصنوعات تھیں جن میں سب سے اہم صرفی اشیا تھیں مثلاً موٹریں، سوتی کپڑے، چمڑے کا سامان، سائیکلیں، سلائی کی مشین، لوہے کا سامان، دوائیں اور کیمیاوی اشیا وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ جس وقت دوسری جنگ عظیم شروع ہونے والی تھی اُس وقت ہندوستان کی کل برآمدات کا ۴۶ فی صدی حصہ مصنوعات اور مخصوص صرفی اشیا تھیں۔

اس زمانے میں ہندوستان کی بیرونی تجارت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ تجارتی اشیا کے معاملے میں توازن تجارت ہندوستان کے حق میں تھا۔ ظاہری برآمدات کو ظاہری درآمدات سے زیادہ رکھنا ضروری تھا کیونکہ ہندوستان کو ہر سال ۴۰ کروڑ سے ۵۰ کروڑ تک برطانوی حکومت کو ہوم چارجز کی مد میں دینے پڑتے تھے۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ہماری بیرونی تجارت زیادہ تر برطانیہ کے ساتھ تھی۔ مثلاً [illegible]ء میں ہم نے جتنا مال باہر سے منگایا اُس میں سے ۳۲ فی صدی برطانیہ سے آیا۔ اسی طرح جو مال ہم نے باہر بھیجا اُس میں سے ۳۵ فی صدی برطانیہ گیا۔

دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد ہندوستان کی بیرونی تجارت

(الف) دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں ہماری بیرونی تجارت کی ساخت، اُس کی سمت اور اس کے حجم میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ اگرچہ دوران جنگ مجموعی تجارت قبل از جنگ کے زمانے سے کم رہی لیکن توازن تجارت واضح طور سے ہمارے حق میں رہا۔ ۴۲-۱۹۴۱ء کے ۸۰ کروڑ کے مقابلے میں ۴۴-۱۹۴۳ء میں ہم نے ۹۴ کروڑ کا زائد مال برآمد کیا۔ تجارت کی سمت میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ امریکہ، برطانیہ اور دولت مشترکہ کے دوسرے ممالک سے ہماری تجارت برقرار رہی لیکن جرمنی اور جاپان جیسے دشمن ملکوں سے تجارت بند ہوگئی۔ ہندوستان نے جنوبی افریقہ کے ملکوں کو بھی بنی اور ادھ بنی اشیا برآمد کرنا شروع کیں۔ پہلے ان ملکوں کو یہ سامان برطانیہ، جرمنی اور جاپان برآمد کرتا تھا۔

جہاں تک دورانِ جنگ ہندوستان کی بیرونی تجارت کی ترکیب کا سوال ہے، اُس میں پہلے کے مقابلے میں بنی ہوئی چیزوں کا تناسب کافی بڑھ گیا۔ سرفہرست جوٹ کی بنی ہوئی چیزیں تھیں۔ سوتی کپڑے کی برآمد کافی بڑھ گئی۔ نئے منظم حلقے میں کچھ صنعتوں کے قیام سے اور پرانی صنعتوں کے پورے طور پر کام شروع کر دینے سے خام مال کا پورا استعمال ہونے لگا جس کے نتیجے کے طور پر خام مال کی برآمد کا تناسب گھٹ گیا۔

(ب) بیرونی تجارت لڑائی کے بعد — لڑائی کے بعد ہندوستانی حکومت نے امپورٹ کنٹرول نرم کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ صَرفی اشیا کی بڑھی ہوئی طلب پوری ہو سکے اور صنعتی آلات کی مرمت اور نئے آلات کی درآمد ہو سکے جو دورانِ جنگ رُکی ہوئی تھی۔ یہ بھی توقع تھی کہ درآمدات پر پابندیاں نرم ہونے سے بازار میں بیرونی مال کی بھرمار ہو جائیگی اور اس طرح افراطِ زر کا رجحان رُک جائیگا جو لڑائی کے بعد پیدا ہو گیا تھا۔ امپورٹ پالیسی نرم کرنے کا رجحان ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۸ء تک جاری رہا اور اس کی وجہ سے درآمدات کافی بڑھ گیئں۔ ۴۹-۱۹۴۸ء تک برآمدات ۶۲۲،۱۷ کروڑ روپے تک پہنچ گیئں جبکہ برآمدات صرف ۴۵۸،۲۷ کروڑ کی تھیں۔ اس طرح برآمد کے مقابلے میں درآمد ۱۸۳،۴۵ کروڑ روپے زائد تھی۔

برآمدات کے مقابلے میں درآمدات کی زیادتی کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ حکومت نے درآمد کی پالسی نرم کر دی تھی بلکہ ہندوستان کی تقسیم کے زیرِ اثر بھی ایسا ہوا تھا۔ تقسیم سے پہلے ہندوستان خام جوٹ برآمد کرتا تھا لیکن تقسیم کے بعد یہ نہ صرف ہماری برآمدات کی فہرست سے خارج ہو گیا بلکہ ہمیں اس اہم خام مال کو درآمد کرنا پڑا۔ اسی طرح خام روئی درآمد کی جانے والی اشیا کی فہرست میں آگئی۔ شدید قلت کا سامنا ہونے کی وجہ سے ہمیں اناج بھی بڑی مقدار میں منگانا پڑا۔ غرضیکہ آزادی کے بعد سے پہلے پلان کے شروع ہونے تک ہندوستان کی صورت حال عجیب تھی۔ بنیادی طور سے زراعتی ملک ہونے کے باوجود ہمیں زرِمبادلہ کا کافی بڑا حصّہ گیہوں، چاول، روئی اور جوٹ منگانے پر صَرف کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آزادی کے فوراً بعد کے زمانے میں ہندوستان کی بیرونی تجارت کی پالسی ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھی۔ ایک طرف اناج کی قلت دور کرنے اور افراطِ زر کے متواتر دَوز کے اثرات کی نفی کے لیے اناج اور صَرفی اشیا کی درآمد ضروری تھی لیکن دوسری طرف برآمدات کم ہو جانے کی وجہ سے زرمبادلہ کے وسائل محدود تھے۔ مجموعی نتیجہ یہ تھا کہ اگست ۱۹۴۸ء کی اوپن جنرل لائسنس پالسی کو مئی ۱۹۴۹ء میں ختم کرنا پڑا کیونکہ اِس کے تحت درآمدات میں اِضافہ ہوا تھا۔

ستمبر ۱۹۴۹ء میں رُوپے کی قیمت میں کمی کے ساتھ ہماری بیرونی تجارت میں نیا موڑ آیا۔ درآمدات گھٹ گیئں اور برآمدات میں اضافہ ہونے لگا۔ تقلیل قدر کا اثر تو تھا ہی، اسی دَوران کوریا کی لڑائی کی وجہ سے امریکہ نے بڑے پیمانے پر خریداری اور چیزوں کا ذخیرہ کرنا شروع کیا جس کی وجہ سے ہماری برآمدات اِتنی بڑھ گیئں جتنی پہلے کبھی نہیں بڑھی تھیں۔ لیکن یہ فائدے عارضی تھے جو ۱۹۵۱ء

کے شروع ہوتے ہوتے ختم ہوگئے۔ فروری ۱۹۵۱ء میں حکومت نے بیرونی تجارت کی پالیسی پر نظرثانی کی۔ اب برآمدات کی ہمت افزائی کرنے کے بجائے اشیا کو اندرونی طلب کی کشش کے لیے روکا جارہا تھا۔ حکومت نے بہت سی چیزوں کی برآمد ممنوع قرار دے دی مثلاً نان فیرس میٹل، خام کھالیں، سوتی کپڑے، خام روئی، روغنی بیج اور دوسری بہت سی چیزوں کی برآمد پر پابندی عائد کردی۔ سوتی کپڑوں اور جوٹ کے سامان پر اکسپورٹ ڈیوٹی بڑھادی گئی اور کالی مرچ اور خام اُون پر نئی اکسپورٹ ڈیوٹی عائد کی گئی۔

یکم اپریل ۱۹۵۱ء میں پہلے پلان کے آغاز کے ساتھ ہندوستان میں ترقیاتی منصوبہ بندی پہلی بار شروع ہوئی۔ پہلے پلان کے تحت بیرونی تجارت کے بنیادی اصول دو تھے، ایک تو یہ کہ برآمدات کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے اور صرف وہ اشیا درآمد کی جائیں جو قومی مفاد میں اور ترقیاتی منصوبہ بندی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ضروری ہوں۔ دوسرا اصول یہ تھا کہ توازن ادائیگی کے خسارے کو ملک کے حاصل زرِمبادلہ کے وسائل سے باہر نہ ہونے دیا جائے

پہلا پلان بناتے وقت کمیشن نے سوچا تھا کہ پورے پانچ برسوں میں زرمبادلہ کے ریزرو میں سے ۲۹۰ کروڑ کے بقدر لگانے کی ضرورت پڑیگی۔ لیکن بیرونی تجارت کے رواں کھاتے میں واقعی خسارہ ۱۲۱ کروڑ روپے ہوا۔ اِس طرح زرمبادلہ کے ریزرو میں ۵۹۷ کروڑ کی رقم بچ رہی۔ پہلے پلان کے دوران خسارہ کم ہونے کی وجہ یہ تھی کہ زراعتی پیداوار بڑھی تھی اور اس طرح اناج، روئی اور جوٹ کی درآمد کم کرنا ممکن ہوا تھا۔ زراعتی پیداوار میں عام بہتری اور بھاری آلات اور مصنوعات کی درآمد پر خرچ میں تخفیف کی وجہ سے حکومت کو درآمد کی ایسی پالیسی اپنانے کا موقع ملا جس کے تحت منتخب اشیا کی درآمد میں نرمی برتی جاسکے۔ چنانچہ پہلے پلان کے دوران ہماری امپورٹ کنٹرول پالیسی دو مقصد کے درمیان پس وپیش میں پڑی رہی، ایک کا تعلق قیمتوں کے استحکام کی ضرورت سے تھا اور دوسرے کا توازن ادائیگی کی ضروریات سے نتیجہ یہ ہوا کہ پلان کے آخری مراحل میں حکومت نے نجی درآمد کرنے والوں کو اس قبیل کی صَرفی اشیا درآمد کرنے کی اجازت دے دی جن کی طلب اندرونی پیداوار پوری نہیں کرسکتی تھی۔

دوسرا پلان اس مفروضے پر شروع ہوا کہ اشیا کی درآمد پلان کے پہلے سال ۸۴۰ کروڑ، دوسرے سال ۹۰۰ کروڑ، تیسرے سال ۱۰۰۰ کروڑ کے بقدر ہوگی اور بعد کے دو برسوں میں گھٹ کر ۸۰۰ کروڑ سالانہ ہوجائیگی اِس طرح مجموعی درآمد ۴۲۴۰ کروڑ ہوگی۔ دوسری یہ فرض کیا گیا کہ برآمدات

سے ہر سال ۶۰۰ کروڑ یعنی مجموعی طور سے پانچ برسوں میں ۳۰۰۰ کروڑ کی آمدنی ہوگی۔ پلان کے دوران فاضل سرمائے کے لیے ۲۲۵ کروڑ قرض کی توقع کی گئی۔ چنانچہ سوچا یہ گیا کہ زرمبادلہ کے ریزرو میں عدم توازن ۱۰۱۵ کروڑ کے بقدر ہوگا۔ صورت حال یونہی کیا کم مشکل تھی لیکن جس چیز نے اسے بحران میں بدل دیا وہ یہ تھی کہ دوسرے پلان کے پہلے سال میں ملک کے نظامِ پیداوار کے بے لوچ ہونے کے باوجود سرمایہ لگانے کی مد میں اخراجات بہت تیزی سے بڑھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے پلان کے دوران زرِمبادلہ کا بحران اور توازن ادائیگی کی بگڑتی ہوئی حالت کی براہِ راست وجہ یہ تھی کہ ملک کی معیشت میں بیک وقت دو متضاد خصوصیات موجود تھیں۔ برآمدات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ہماری معیشت اب بھی گزر بسر والی معیشت کی منزل میں ہے لیکن درآمدات کے بدلتے ہوئے نقشے سے معیشت کی ترقی پزیری ظاہر ہوتی تھی۔ یہ بات خاص کر تشویش ناک تھی کہ ۵۶-۱۹۵۵ء کے دوران درآمدات ۱۰۱۰ کروڑ قیمت کی ہوئیں جبکہ برآمدات صرف ۶۲۹ کروڑ کی تھیں۔

زرمبادلہ کے اس بحران کا مقابلہ کرنے کے لیے حکومت نے یکم جولائی ۱۹۵۷ء سے درآمدات پر سخت پابندی عائد کر دی۔ نئی پالیسی یہ تھی کہ درآمدات کو سختی کے ساتھ منضبط کیا جائے لیکن ضروری خام مال آنے دیا جائے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ۱۹۵۷ء کی امپورٹ پالیسی اب تک بدستور ہے اگرچہ کچھ چیزوں میں پالیسی نرم کر دی گئی ہے۔ اس امپورٹ پالیسی کا لب لباب یہ ہے: زرِمبادلہ کی منظوری اس عام اصول کے تحت دی جائے کہ "کور پراجکٹ" یعنی بنیادی پروجکٹ اور ایسے پروجیکٹ جو تکمیل کے قریب ہیں، جاری رہ سکیں۔ ساتھ ہی ان درآمدات کو ترجیح دی جائے جو روزگار اور معیشت کی سطح کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں مثلاً خام مال اور اسپیئر پارٹس وغیرہ۔ درآمدات کی نئی پالیسی کے تحت بعض صنعتوں کے برآمداتی اِمکانات پر خاص توجہ دی گئی۔ حکومت کو ایسی صنعتوں کی خاص طور سے امداد کرنی ہے تاکہ یہ اپنی پیداوار بڑھا سکیں اور اُسے باہر فروخت کر سکیں۔

لیکن اس سخت امپورٹ پالیسی کے باوجود ۱۹۵۸ء کے دوران تجارتی صورت حال مجموعی طور سے اور بگڑ گئی۔ اس سال درآمدات ۱۲۱۷ کروڑ تک پہنچ گئیں جبکہ برآمدات گھٹ کر ۶۹۲ کروڑ پر آگئیں۔ لیکن ۱۹۵۷ء کے کھنچاؤ کے بعد ۱۹۵۸ء میں توازن ادائیگی میں نمایاں بہتری واقع ہوئی۔ اِس کا سبب برآمدات کی بہت افزائی اور تجارتی اشیا کی درآمد میں بھاری کمی تھی جو امپورٹ کی اُس کڑی پالیسی کا نتیجہ تھی جو ۱۹۵۷ء کے وسط میں شروع کی گئی تھی۔

زرمبادلہ کے ریزرو میں تخفیف کا رجحان جو اپریل ۱۹۶۰ء سے برابر جاری تھا، اکتوبر ۱۹۶۰ء میں ختم گیا۔ نومبر سے تھوڑا تھوڑا اضافہ شروع ہوا اور سال کے آخری دو ماہ میں ریزرو میں معمولی اضافہ واقع ہوا۔ ریزرو کی سطح جو دسمبر ۱۹۵۹ء کے ۴۴۸ کروڑ سے گھٹ کر اکتوبر ۱۹۶۰ء میں ۳۴۰ کروڑ ہو گئی تھی، دسمبر ۱۹۶۰ء کے آخر میں ۸ کروڑ بڑھی اور ۳۴۸ کروڑ پر آگئی لیکن مارچ ۱۹۶۱ء میں پھر گھٹ کر ۳۰۲ر۶ کروڑ رہ گئی۔ مختصر یہ کہ ۱۹۶۱-۶۲ء کے درمیان ہندوستان کا توازن ادائیگی بحیثیت مجموعی خراب رہا۔

تیسرے پلان کے دوسرے سال یعنی اپریل ۱۹۶۲ء اور مارچ ۱۹۶۳ء کے دوران ملک کے توازن ادائیگی پر دباؤ میں نمایاں کمی واقع ہوئی۔ ۱۹۶۱-۶۲ء میں مونٹری فنڈ سے ۴۰ر۵۰ کروڑ روپے ملنے کے باوجود زرمبادلہ کے ریزرو میں ۳ر۶ کروڑ کی کمی واقع ہوئی اور ۷ر۴۶ کروڑ کے ریزرو پر کافی دباؤ پڑا۔ ۱۹۶۲-۶۳ء میں پچھلے سال کے دیکھتے ریزرو پر دباؤ کم رہا۔ وجہ یہ تھی کہ سرکاری قرضوں اور امداد کی مد میں زیادہ آمدنی ہوئی تھی، ملک میں بینکی سرمایہ آیا تھا، برآمدات میں اضافہ ہوا تھا اور نجی درآمدات میں تخفیف ہوئی تھی۔

اپریل ۱۹۶۳ء اور مارچ ۱۹۶۴ء کے دوران زرمبادلہ کے ریزرو میں ۷ء۱ کروڑ کا معمولی اضافہ ہوا۔ اس نسبتاً بہتر صورت حال کی وجہ یہ تھی کہ برآمدات سے ہونے والی آمدنی نمایاں طور سے بڑھی تھی، غیر مرئی کھاتہ (INVISIBLE .. ACCOUNT) کچھ موافق ہوا تھا اور سرکاری قرضوں کی مد میں زیادہ آمدنی ہوئی تھی۔

لیکن اپریل ۱۹۶۴ء سے حالت پھر بگڑی۔ ۱۹۶۴-۶۵ء کے درمیان بیرونی تجارت کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ایک طرف درآمدات میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا اور دوسری طرف برآمدات گھٹتی جا رہی تھیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ ملک کے زرمبادلہ کے ریزرو پر مسلسل دباؤ پڑ رہا تھا۔ یہ صورت حال ۱۹۶۳-۶۴ء کی صورت کے برعکس تھی جب ریزرو میں کافی اضافہ واقع ہو رہا تھا۔ جب امداد کی مد میں زیادہ آمدنی کے باوجود ریزرو میں برابر کمی ہوتی رہی تو مجبوراً مونٹری فنڈ سے احتیاطی قرض کا معاہدہ کرنا پڑا۔ تاکہ بوقت ضرورت قرض حاصل ہو سکے۔ ۱۹۶۵ء کے اپریل اور جون کے مہینوں میں صورت حال بدستور رہی اور زرمبادلہ کے ریزرو پر دباؤ اور بڑھ گیا جس کی وجہ سے مونٹری فنڈ سے مزید ۲۳ر۸ کروڑ قرض لیے گئے۔ یہ تشویشناک صورت بدستور رہی۔ ۱۹۶۵-۶۶ء میں درآمدات ۱۳۹۰ کروڑ کے مقابلے میں برآمدات صرف ۸۰۶ کروڑ تھیں چنانچہ ۵ جون ۱۹۶۶ء کو حکومت کو روپے کی قیمت میں ۳۶ر۵ فی صدی کی کمی

کرنی پڑی۔ اس تقلیل قدر کے بعد بھی زر مبادلہ کے ریزرو میں معمولی کمی واقع ہوئی۔ نومبر ۱۹۶۶ء میں ریزرو میں ۲۷۱٫۴۳ کروڑ روپے تھے جو نومبر ۱۹۶۷ء میں گھٹ کر ۲۵۴٫۹۹ کروڑ روپے رہ گئے۔ (اس رقم میں سونا نہیں شامل ہے جس کی قیمت ۱۸۲٫۵۲ کروڑ تھی)۔ ریزرو میں اس بھاری کمی کی وجہ پچھلے قرضوں کے سلسلے کی بھاری ادائگیاں اور اناج کی درآمد کے اخراجات تھے۔

حکومت ہند کی حال کی اکسپورٹ امپورٹ پالسی کا تجزیہ ان حقائق اور اعداد شمار کا پس منظر میں کرنا چاہیے۔ ۳۱ر اکتوبر کو حکومت نے اگلے چھے مہینوں کے لیے امپورٹ پالسی کا اعلان کیا۔ اس پالسی کا مقصد یہ تھا کہ درآمدات پر سخت پابندی جاری رکھی جائے لیکن صنعتی خام مال اور اسپیئر پارٹس کی درآمد میں معمولی اضافہ کر دیا جائے۔ نئی پالسی میں سوتی کپڑے صنعت کے برآمد کرنے والے یونٹوں کو انعام دینے کی دو اسکیمیں شامل تھیں تاکہ انھیں اپنی منفرد ضروریات کے مطابق برآمد کرنے کی زیادہ سہولت حاصل ہو۔ پہلی اسکیم کے تحت ہر ٹکسٹائل مل اور ہینڈلوم کوا پریٹیو کو اس کی اجازت تھی کہ جتنا مال اس نے برآمد کیا ہو اس کی ایک مقررہ فی صدی قیمت کے رنگ اور کیمیاوی سامان درآمد کر سکتے تھے۔ دوسری اسکیم کے تحت سوتی ملوں کو کارخانوں کی بحالی اور تجدید کے لیے نئی مشینیں درآمد کرنے کی اجازت تھی بشرطیکہ یہ اپنی برآمدات بڑھانے اور قسم کو بہتر بنانے کا وعدہ کریں۔

یکم اپریل ۱۹۵۹ء کو اگلے چھے ماہ کی امپورٹ پالسی کا اعلان کیا گیا۔ پہلے کی طرح حکومت نے امکانی کوشش کی کہ درآمدات پر پابندیاں بدستور رہیں لیکن ساتھ ہی اس کی بھی پوری کوشش کی گئی کہ برآمد کرنے والوں کو زیادہ سہولتیں فراہم کر کے برآمدات بڑھائی جائیں۔ اِس پالسی کے تحت صنعتی خام مال کی درآمد کے لیے نسبتاً لمبی مدت (۹ سے ۱۲ مہینوں) کے لیے لائسنس جاری کیے گئے۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء سے مارچ ۱۹۶۰ء تک کے لیے امپورٹ پالسی میں کفایت، برآمدات کی ہمت افزائی اور صنعتی خام مال کی رسد پر زور دیا گیا۔ علاوہ ان تبدیلیوں کے جو ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ضروری تھیں، اِس پالسی اور پچھلے چھے ماہ کی پالسی میں کوئی بنیادی فرق نہیں تھا۔

۱۹۵۹-۶۰ء میں توازن ادائگی میں کچھ بہتری آئی جس کی وجہ سے اپریل ستمبر کی امپورٹ پالسی میں کچھ نرمی لانا ممکن ہوا۔ اِس پالسی کی خصوصیت یہ تھی کہ ضروری خام مال اور آلات کی درآمد اور نرم کر دی گئی لیکن اکتوبر ۱۹۶۰ء تا مارچ ۱۹۶۱ء کے چھے ماہ کے لیے جس پالسی کا اعلان کیا گیا اُس کا مقصد صرفی اشیا کی درآمد پر زیادہ پابندی عائد کرنا تھا۔ بہت قسم کے صنعتی سامان اور کیمیاوی اجزا کے امپورٹ کوٹے میں کمی کر دی گئی مثلاً لوہے اور فولاد کا سامان، بجلی کا سامان، موٹر پارٹس وغیرہ۔

تقریباً ۱۴۰ چیزوں پر درآمد کی پابندیاں یا تو سخت کر دی گئیں یا ان کی درآمد ممنوع قرار دے دی گئی۔ ان اشیا میں بنے ہوئے سلفر سے لے کر آرٹسٹوں کے برش، ٹائم پیس گھڑیاں اور نیومیٹک ڈرل شامل تھے۔

ایک مدت سے یہ طریقہ چلا آرہا تھا کہ امپورٹ پالیسی کا اعلان چھے چھے مہینوں کے لیے کیا جاتا تھا۔ یکم اپریل ۱۹۶۲ء کو حکومت نے اس طریقے سے انحراف کیا اور ۶۳-۱۹۶۲ء کے پورے مالی سال کے لیے پالیسی کا اعلان کر دیا۔ اس پالیسی کے تحت ۶۵ اشیا کی درآمد پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ان دونوں چیزوں کا تعلق خاندانی منصوبہ بندی سے تھا۔ ۶۴-۱۹۶۳ء کے مالی سال کے لیے ضروری درآمدات میں معمولی اضافہ کیا گیا۔ اس نرمی سے صنعتی خام مال، اسپیئر پارٹس اور معیشت کی دوسری ضروری اشیا کو خاص طور سے فائدہ پہنچا۔ اگرچہ اس کے تحت کچھ صَرفی اشیا بھی آگئیں جن میں کچھ آسائشات بھی شامل تھیں جن کی درآمد ۶۳-۱۹۶۲ء میں ممنوع تھی اور یہ بالکل ناپید ہو گئی تھیں۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ چھوٹی صنعتوں کو جنھیں ۶۳-۱۹۶۲ء کے دوران سخت کٹوتی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اب ۶۴-۱۹۶۳ء میں ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایک کروڑ روپے کی اشیا درآمد کرنے کی اجازت مل گئی۔

زرمبادلہ کی صورت خراب ہونے کی وجہ سے ۶۶-۱۹۶۵ء کے مالی سال کی امپورٹ پالیسی میں درآمدات پر مزید پابندی عائد کی گئی۔ مخصوص اشیا کی درآمد میں کمی کر دی گئی۔ یہ کمی یکساں طور پر نہیں کی گئی۔ اُن اشیا میں سب سے کم کمی کی گئی جو ضروری شمار کی گئیں مثلاً دوائیں، ایکسرے فلم، کتابیں، خام مال اور صنعتی آلات وغیرہ۔ اُن اشیا کی درآمد میں کئی بار کمی کی گئی جو ضروری نہیں تھیں۔ اشیا کی ایک تیسری قسم بھی تھی جن کی درآمد بالکل ممنوع قرار دی گئی۔ ۶۷-۱۹۶۶ء کی امپورٹ پالیسی جس کا اعلان روپے کی قیمت میں کمی کرنے سے پہلے کر دیا گیا تھا قدرتاً پہلے ہی جیسی سخت تھی اور اس کے باوجود کہ بیشتر صنعتیں خام مال اور آلات کی کمی کی وجہ سے اپنی پوری استعداد کے مطابق نہیں کام کر رہی تھیں، ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بہت معمولی رعایت دی جا سکی۔ جون ۱۹۶۶ء میں تعلیل قدر کے ساتھ حکومت نے امپورٹ پالیسی میں نرمی کا اعلان کیا۔ جون ۱۹۶۶ء کے تیسرے ہفتے میں حکومت نے پالیسی کو نرم کرنے کی طرف پہلا قدم اٹھایا اور ۵۹ ترجیحی صنعتوں کی فہرست شائع کی۔ ان میں وہ صنعتیں شامل تھیں جو کیمیاوی اشیا، زراعتی مشینیں، الکٹرانک آلات، سرجیکل اور سائنٹفک آلات بناتی تھیں۔ ان صنعتوں کو پوری استعداد

کے مطابق کام کرنے کے لیے خام مال، آلات اور اسپیئر پارٹس کی درآمد کی اجازت چھ مہینوں کے لیے دے دی گئی۔ ان چھوٹی صنعتوں کو جو ترجیحی صنعتوں کی طرح متذکرہ بالا اشیا بناتی تھیں، انھیں ۶۵-۱۹۶۴ء کے لائسنس کے تین گنے کے برابر سامان منگانے کی اجازت دی گئی۔ دوسری چھوٹی صنعتوں کو ۶۵-۱۹۶۴ء کے مقابلے میں دوگنی قیمت کا لائسنس دیا گیا۔ لیکن بھاری مشینیں اور آلات اور غیر ضروری اشیا کی درآمد میں کوئی نرمی نہیں کی گئی۔ ۶۷-۱۹۶۶ء کے مالی سال کی امپورٹ پالیسی کی یہ خصوصیت تھی کہ ۵۹ ترجیحی صنعتوں کو جن میں بڑے پیمانے اور چھوٹے پیمانے کی صنعتیں شامل تھیں، مزید رعایتیں دی گئیں اور غیر ترجیحی صنعتوں کے لیے لائسنس کا طریقہ آسان کر دیا گیا۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ ہندوستان تقلیل قدر سے پیدا ہونے والی ابتدائی مشکلات پر قابو پانے میں کامیاب ہوا اور برآمدات بڑھنا شروع ہو گئیں۔ ۶۸-۱۹۶۷ء کے پہلے سات مہینوں میں ۶۹۳ء۲ کروڑ کی مالیت کا سامان برآمد کیا گیا جو ۶۷-۱۹۶۶ء کے ان سات مہینوں کے مقابلے میں ۸۷ء۵ کروڑ کے بقدر زیادہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۶۷-۱۹۶۶ء میں برآمدات ۵ فی صدی بڑھیں۔

۱۹۶۸ء کے شروع کے نو مہینوں میں ۱۹۶۷ء کے نو مہینوں کے مقابلے میں برآمدات میں ۱۰ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ توقع ہے کہ ۱۹۶۹ء میں برآمدات میں ۱۰۰ کروڑ کا اضافہ ہوگا اور یہ مجموعی طور سے ۱۴۵۰ کروڑ تک پہنچ جائے گا۔ یہ پیشین گوئی وزارت تجارت نے اس مفروضے پر کی ہے کہ برآمد کی جانے والی روایتی اور غیر روایتی اشیا اس اضافے میں شریک ہوں گی۔ ان اشیا میں سے صرف لوہے اور فولاد کو مستثنیٰ رکھا گیا کیونکہ اندرونی طلب بڑھ گئی ہے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ چوتھے پلان کے نئے مسودے میں بیرونی امداد کو نصف کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ برآمدات میں ۷ فی صدی کا اضافہ کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

یکم اپریل ۱۹۶۸ء کو ۶۹-۱۹۶۸ء کے مالی سال کی جس پالیسی کا اعلان کیا گیا وہ پچھلے مالی سال کی پالیسی کی توسیع تھی۔ ۶۹-۱۹۶۸ء کی پالیسی میں برآمدات کو بڑھانے کی غرض سے سزا اور جزا کا امتزاج رکھا گیا تھا اور بدیسی چیزوں کی جگہ پردیسی سامان کے استعمال کے بڑھانے کی کوشش میں ۴۶۹ اشیا کی برآمد یا تو ممنوع قرار دی گئی یا ان کی برآمد پر پابندی عائد کی گئی۔ اس کے تحت ان غیر ترجیحی صنعتوں کو ترجیح دینا تجویز تھا جو براہ راست استعمال کی غیر روایتی اشیا بناتی تھیں اور جنھوں نے اپنی پیداوار کا ۱۰ فی صدی ۶۸-۱۹۶۷ء میں برآمد کیا تھا۔ غرضیکہ ۶۹ صنعتوں کے ترجیحی حلقے کے اندر یا باہر کوئی بھی یونٹ اپنی پیداواری استعداد بڑھانے کے لیے سرکاری امداد کا حقدار تھا بشرطیکہ وہ یہ ظاہر کر سکے کہ

اس نے اپنی پیداوار کا ۱۰ فی صدی حصہ برآمد کیا تھا۔ ہر ایسا یونٹ نئی مشینیں اور بھاری آلات درامد کرنے کا لائسنس حاصل کر سکتا تھا

یکم اپریل ۱۹۶۹ء کو ۷۰-۱۹۶۹ء کے مالی سال کے لیے نئی امپورٹ پالسی کا اعلان کیا گیا۔ اس میں پچھلے سال کی پالسی کے تسلسل کو باقی رکھتے ہوئے درآمدات کو نیا رُخ دینے کی کوشش کی گئی۔ نئی پالسی میں برآمدات کی ہمت افزائی اور درآمدات کم کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ برآمدات اور درآمدات کی تنظیم میں اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن کے رول کو وسعت دی گئی ہے۔ برآمدات بڑھانے کے لیے سزا اور جزا کا جو طریقہ ۶۹-۱۹۶۸ء میں شروع کیا گیا تھا اس میں مزید توسیع کی گئی اور بہت سی اشیا کی درآمد یا تو ممنوع کر دی گئی یا اس پر پابندی بڑھا دی گئی۔ اس پالسی کے تحت کچھ نئے اقدام بھی تجویز کیے گئے جن سے برآمدات میں اضافے اور درآمدات کی جگہ پردیسی اشیا کا استعمال بڑھنے کی توقع ہے۔ ان اقدام کے تحت تسلیم شدہ برآمداتی اداروں کو تقویت دی جائے گی جن سے برآمدات بڑھنے کی توقع ظاہر ہوگی

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ راما سوامی مڈلیار کمیٹی نے (امپورٹ ایکسپورٹ پالسی کمیٹی) جس کی سفارشات ۱۹۶۲ء کے ابتدائی تین مہینوں میں شائع ہوئیں، تجویز کیا کہ امپورٹ لائسنس سال میں دو بار کے بجائے ایک بار دیے جایا کریں اور یہ کہ ۲۵ سے لے کر ۳۰ کروڑ ٹنک کا ایک فنڈ قائم کیا جائے جس سے ان صنعتوں کو مدد دی جائے جو برآمد کیا جانے والا مال تیار کرتی ہیں تاکہ یہ صنعتیں اپنی ضرورت کا خام مال باہر سے منگا سکیں۔ مڈلیار کمیٹی نے یہ بھی تجویز کیا کہ برآمدات بڑھانے کے لیے مزید محرکات فراہم کی جائیں مثلاً برآمدات سے آمدنی پر ٹیکس کی رعایت۔ یہ رعایت سلیب کی بنیاد پر دی جائے اور برآمد کرنے والے اس رقم سے برآمدات کی ترقی کے لیے ریزرو فنڈ قائم کریں۔

امپورٹ ایکسپورٹ پالسی کمیٹی کا کہنا تھا کہ امپورٹ کنٹرول کو صنعتی ترقی، زر مبادلہ کی بچت اور برآمدات کی ترقی کا آلۂ کار اور ذریعہ ہونا چاہیے۔ مختصراً پالسی یہ ہونا چاہیے کہ تمام موجودہ صنعتوں کو خام مال درآمد کرنے کی سہولت دی جائے لیکن پاور، نقل وحمل اور برآمداتی صنعتوں کو ترجیح حاصل ہو۔ مڈلیار کمیٹی نے سفارش کی کہ برآمدات کا ایک سالانہ منصوبہ تیار کیا جائے جس میں صنعتوں اور اشیا کے مطابق نشانے متعین ہوں اور یہ نشانے پبلک اور پرائیویٹ سکٹر کے ترقیاتی پروجکٹوں سے منسلک ہوں۔ ڈائرکٹریٹ آف ایکسپورٹ پروموشن میں ایک مخصوص شعبہ کھولا جائے جس کی یہ ذمہ داری ہو کہ وہ امداد پانے والی صنعتوں کی برآمداتی کارگزاری کا ریکارڈ رکھے، ان کی ترقی پر نظر رکھے اور یہ دیکھے

یہ صنعتیں اپنے فرائض پورے کر رہی ہیں۔ آخر میں کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی کہ برآمد کی جانے والی اشیا کی باربرداری پر ریلوے ۲۵ فی صدی کی رعایت دے۔

چنانچہ ۶۳-۱۹۶۲ء سے لے کر ۶۹-۱۹۶۸ء تک کے مالی سالوں کی امپورٹ پالسی بناتے وقت کمیٹی کی سفارشات کو سامنے رکھا گیا اور امپورٹ لائسنس کے طریقے کو آسان بنایا گیا۔ سالانہ لائسنسنگ کا طریقہ شروع کیا گیا جس کے تحت شیڈیولڈ اور نان شیڈیولڈ سکٹروں کے اُن صارفوں کی ضروریات آتی تھیں جو درآمد کی ہوئی اشیا خود استعمال کرتے تھے۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ درآمدات میں تخفیف ہمارے توازن ادائیگی کے مسئلے کا جزوی حل ہے۔ فوری ضرورت اس بات کی ہے کہ برآمدات بڑھائی جائیں اور پیداواری استعداد کا زیادہ مؤثر استعمال ہو۔ پیداوار بڑھانے کے ایک سے زیادہ طریقے ہیں۔ جہاں ممکن ہو وہاں ایک شفٹ سے زیادہ میں کام ہو، موجودہ مشینوں میں توازن پیدا کرنے والے حاشیائی آلات بڑھائے جائیں جن سے موجودہ استعداد کا پورا استعمال ہو سکے، کارخانوں میں جدید آلات لگائے جائیں۔ ان اقدام سے پیداآوری بڑھائی جا سکتی ہے لیکن توازن ادائیگی کی تشویش ناک صورت کے پیش نظر جو علاج آزمایا گیا وہ روپے کی تقلیل قدر تھی۔ ۶ جون ۱۹۶۶ء سے روپے کی قیمت میں ۳۶٫۵ فی صدی کی کمی کر دی گئی۔ بدقسمتی سے تقلیل قدر کے بعد بھی برآمدات میں فوری اضافہ نہیں ہوا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہماری برآمدات ۶۷-۱۹۶۶ء میں پچھلے سال کے مقابلے میں ۱۰۱ کروڑ کم ہو گئیں۔ برآمدات گھٹنے کے کئی سبب تھے مثلاً روپے کی قیمت کم کرنے کے بعد ایک عرصے تک صورت حال مذبذب رہی، صنعتوں کے لیے خام مال اور آلات کی قلت رہی اور دو برس کی مسلسل خشک سالی نے ہماری برآمدات کو نقصان پہنچایا۔ (نوٹ: سکشن ملاحظہ ہو "جون ۱۹۶۶ء میں روپے کی قیمت میں کمی، متوقع فائدے اور اثرات" ــــ باب ۱۳ صفحات تا)

ہماری جیسی ترقی پذیر معیشت میں برآمداتی دباؤ کافی عرصے تک قائم رہے گا چنانچہ حکومت کو بیک وقت غیر ضروری اشیا کی درآمد کم کرنی چاہیے، ملک کی پیداوار بڑھانی چاہیے اور برآمدات کو ترقی دینے کے مسئلے پر کافی توجہ دینا چاہیے۔ ہماری حکومت یہی کر رہی ہے۔ پچھلے کچھ مہینوں میں حکومت نے بہت سے اقدام کیے ہیں جن کا مقصد نہ صرف روایتی برآمدات سے آمدنی بڑھانا ہے بلکہ نئی پیداوار کے لیے نئی منڈیاں کھول کر اپنی بیرونی تجارت کو متنوع بنانا ہے۔ برآمد کی جانے والی بہت سی اشیا کے لیے اکسپورٹ پروموشن کونسل قائم کر دی گئی ہے۔ برآمد کرنے والوں کے لیے

بینک کے قرض کی سہولتیں بڑھانے اور برآمداتی جوکھم سے تحفظ کے لیے اکسپورٹ کریڈٹ اینڈ گارنٹی کارپوریشن بنا دیا گیا ہے۔ برآمداتی پالسی کی تال میل کے لیے برطانوی نمونے پر ایک بورڈ آف ٹریڈ قائم کیا گیا ہے۔ اکسپورٹ بلز کو ریزرو بینک کی بل مارکٹ اسکیم کے تحت لانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بینک کم سود پر قرض فراہم کر رہا ہے۔ بیرونی ملکوں میں مارکٹنگ کے مصارف کے لیے اکسپورٹ مارکٹنگ ڈیولپمنٹ الاؤنس کی شکل میں ٹیکس اور محصولی ادائگی کی رعایتیں دی جا رہی ہیں۔ جن ملکوں میں ہمارے مال کی زیادہ کھپت ہے وہاں صنعتی اور دوستانہ مشن بھیجے جاتے ہیں۔ ان تمام اقدام سے یہ ظاہر ہے کہ ہماری حکومت نہایت خلوص کے ساتھ اُن مسائل سے نپٹنے کی کوشش کر رہی ہے جو قومی معیشت کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۹۶۶-۶۷ء کے دوران ہندوستان کی بیرونی تجارت کا ایک تشویش ناک پہلو یہ تھا کہ برآمدات اور درآمدات کے درمیان خلا برابر بڑھ رہا تھا۔ درحقیقت ۱۹۵۰ کروڑ کی درآمدات کے مقابلے میں برآمدات صرف ۱۲۷۰ کروڑ کی تھیں اور اس طرح خسارہ ۶۸۰ کروڑ تھا۔ توازن تجارت کے بگڑنے میں غذائی بحران کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ مشینوں، پرزوں، روئی اور نان فیرس میٹل کی درآمد میں کافی اضافہ ہوا تھا۔ بہرحال ۱۹۶۷-۶۸ء میں برآمدات پھر بڑھیں۔ اِس اضافے میں جن اشیا کا زیادہ حصہ تھا وہ تھیں چائے، لوہا اور فولاد، تمباکو اور دستکاری کی اشیا۔ ان کی برآمد سے مجموعی آمدنی میں ۲٫۹ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۶۸-۶۹ء میں بھی اضافے کا رجحان جاری رہا اور حالت میں کافی بہتری آئی۔

ہندوستان کی برآمدات کو اگر قومی آمدنی کے تناسب کے اعتبار سے دیکھا جائے اور دوسرے ملکوں سے مقابلہ کیا جائے تو ہماری قومی آمدنی میں ان کا تناسب بہت کم نظر آتا ہے۔ برطانیہ میں یہ تناسب ۱۹ فی صدی، مغربی جرمنی میں ۱۲ فی صدی اور جاپان میں ۱۳ فی صدی ہے۔ اِس کے مقابلے میں ہماری قومی آمدنی میں برآمدات کا حصہ صرف ۱۱ فی صدی ہے۔ چنانچہ برآمدات کو ترقی دینے کی شدید ضرورت ہے۔

حال میں مسٹر ڈونلڈ میک ڈوگل نے ہندوستان میں برآمدات کو ترقی دینے کی سرگرمیوں کا بہت دلچسپ مطالعہ کیا ہے۔ مسٹر ڈونلڈ کا خیال ہے کہ ہندوستان دُنیا کی برآمداتی منڈی میں اپنی نئی مصنوعات کے لیے ۲ فی صدی حصہ بنا سکتا ہے۔ جو بہت معمولی ہے اور سویڈن، سوئٹزرلینڈ، ہالینڈ، بلجیم جیسے ملکوں سے بھی کم ہے۔

موصوف کا تخمینہ اس بنیاد پر ہے کہ اگرچہ پانچویں پلان کے دَوران بیرونی امداد برابر آتی

بہے گی اور اس وقت تک درآمدات بچانے والی بہت سی اسکیمیں مکمل ہو چکی ہوں گی لیکن درآمدات کو ۱۴۰۰ کروڑ کی سطح پر رکھنا پڑے گا ۱۴۰۰ کروڑ میں سے ۱۰۰۰ کروڑ ضروریات زندگی کے لیے اور ۴۰۰ کروڑ ترقیاتی کاموں کے لیے)۔ گویا درآمدات ہماری قومی آمدنی کی ۱/۲ ۵ فی صدی کے برابر ہوں گی قومی آمدنی اور درآمدات کا یہ تناسب بہت کم ہے کیونکہ روس اور چین کو چھوڑ کر چند ہی ترقی پزیر ملک اس تناسب کو مزید کم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ چوتھے پلان تک ہندوستان نے جو قرض لیے ہیں اُن کے سُود وغیرہ کی ادائیگی پر چوتھے پلان میں سالانہ ۲۰۰ کروڑ خرچ کرنے ہونگے اس میں سے آدھی رقم مجرمرئی آمدنی کی شکل میں واپس مل جائیگی۔ اس طرح ہمیں ۱۹۷۱ء سے آگے کے برسوں میں ہر سال ۵۰۰ کروڑ کا زرمبادلہ کمانا چاہیے جو اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ہم اپنی برآمدات میں کافی اضافہ نہ کریں۔ چنانچہ برآمدات کو ترقی دینا چوتھے پلان کا بنیادی کام ہے۔

ہندوستان کی تجارتی پالیسی اور تجارتی معاہدے G.A.T.T اور ای سی ایم کے حوالے

(الف) دوسری جنگ عظیم کے ختم تک ہماری کمرشل پالسی: ۱۹۲۳ء تک ہندوستان آزاد تجارت کی پالیسی پر کاربند تھا۔ یہ پالیسی حکومت کی اُس معاشی پالسی کا نتیجہ تھی جس کے تحت حکومت تجارتی معاملات میں دخل دینے سے احتراز کرتی ہے۔ ۱۹۲۳ء میں امتیازی تحفظ کی پالسی شروع کرنے کے بعد قدرتاً آزاد تجارت کی پالسی ختم ہو گئی۔

۱۹۳۰ء اور اس کے بعد کے برسوں میں جو عظیم بحران آیا اُس کی وجہ سے ہندوستان کی بیرونی تجارت قیمت اور حجم دونوں اعتبار سے گھٹ گئی۔ وجہ یہ تھی کہ عام عالمی طلب میں کمی واقع ہوئی تھی اور زراعتی اشیا کی قیمتیں کافی گر گئیں اور زراعتی اشیا ہی ہماری برآمدات کا بڑا حصہ تھیں۔ بحران کے زمانے میں برطانیہ نے ایک مخصوص پالسی شروع کی جس کو امپیریل پریفرنس کا نام دیا۔ یہ ایک ترجیحی پالسی تھی جس کے ذریعے برطانیہ نے سلطنت برطانیہ کے ملکوں سے تجارت بڑھانے کی کوشش کی۔ اس پالسی کی تشکیل کے لیے ۱۹۳۲ء میں آٹوا (کناڈا) میں امپیریل اکنامک کانفرنس منعقد کی گئی۔

اس کانفرنس میں سلطنت برطانیہ کے دوسرے ملکوں کے ساتھ ہندوستان نے ایک تجارتی معاہدے پر دستخط کیے۔ اس معاہدے کے تحت ہندوستان نے برطانیہ سے آنے والی

کچھ چیزوں پر ٹیکس کی رعایت دینا منظور کیا۔ یہ رعایت کچھ خاص قسم کی موٹروں پر ۱/۲ ، فی صدی اور بجلی کے سامان، اونی کپڑوں، خوشبوؤں اور اسپرٹ پر ۱۰ فی صدی تھی۔ اِس کے عوض برطانیہ نے ہندوستان سے جانے والی بہت سی چیزوں پر ڈیوٹی ۱۰ فی صدی کم کر دی اور بعض چیزوں کو ڈیوٹی سے مستثنیٰ کر دیا۔ آٹوا کا معاہدہ اس طرح تیار کیا گیا تھا کہ اِس سے ہندوستان کے مقابلے میں برطانیہ کو زیادہ فائدہ تھا۔ برطانوی مصنوعات کے لیے جو ترجیح حاصل کی گئی تھی اُس سے برطانیہ کی برآمداتی صنعتوں کو بحالی میں کافی مدد ملی۔ اِن صنعتوں کی بحالی کی وجہ سے برطانوی معیشت کے دوسرے حلقوں میں پیداوار روزگار میں اضافہ ہوا اور برطانیہ کو بدحالی کی گہرائی سے نکلنے کا موقع ملا۔

ہندوستانی مال کو جو ترجیح حاصل ہوئی تھی اُس سے ہندوستانی برآمدات کی قیمت میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کی برآمدات بیشتر زراعتی اشیا پر مشتمل تھیں جن کی قیمتوں کی بحالی میں کافی وقت لگا۔ اس کے علاوہ جن اشیا کو ترجیح ملی تھی وہ سب کی سب وہ نہیں تھیں جن سے ہندوستان کو خصوصی فائدہ پہنچتا۔ اِس طرح آٹوا معاہدے کی آڑ میں برطانیہ ہندوستان، برما اور سیلون جیسے تابع ملکوں کے ساتھ غریب پڑوسی کی پالیسی پر مؤثر طریقے سے عمل پیرا ہو سکا۔ اِس معاہدے سے بیشتر فائدہ برطانیہ کو تھا جس نے ہندوستان سے پورے طور پر فائدہ اٹھایا۔ چائے کے باغات کے انگریز مالکوں اور جوٹ کے انگریز تاجروں نے خوب منافع کمایا کیونکہ آٹوا معاہدے کی وجہ سے چائے اور جوٹ کے سامان کی برآمد بڑھ گئی۔

ہندوستان کے عوام اور پڑھے لوگوں نے اس معاہدے پر شدت کے ساتھ اعتراض کیا چنانچہ ۱۹۳۶ء میں ہندوستان کی لیجسلیٹو اسمبلی نے اس معاہدے کو منسوخ کر دیا لیکن وائسرائے نے اپنے اختیارات خصوصی سے اِسے دوبارہ نافذ کر دیا اور یہ ۱۹۳۹ء تک برقرار رہا۔ ۱۹۳۹ء میں برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان دوسرا معاہدہ ہوا۔ یہ معاہدہ بھی محض اشک شوئی تھا اور اس سے بھی معاہدے کی بنیادی خامیاں دور نہیں ہوئیں۔ اس معاہدے کے تحت ہندوستان نے برطانیہ سے آنے والی بیس اشیا پر ٹیکس کی ۱/۲ ، فی صدی سے لے کر ۱۰ فی صدی تک کی رعایت دی جس کے عوض برطانیہ نے بعض قسم کے ہندوستانی مال کو ترجیح دی اور بعض کو ڈیوٹی سے مستثنیٰ کر دیا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران برآمد اور درآمد پر سخت پابندیاں عائد تھیں اور ہندوستانی

تجارتی پالیسی جنگ کے زمانے کی ہنگامی ضروریات کے تابع تھی۔ دشمن ملک کے ساتھ تجارت ممنوع تھی اور غیر جانب دار اور دوست ملکوں کے ساتھ بھی تجارت پر بہت سی پابندیاں تھیں۔

(ب) آزادی کے بعد کی تجارتی پالیسی : آزادی کے بعد ہندوستان نے نئی منڈیاں حاصل کرنے اور برآمدات کے لیے نئی راہیں کھولنے کی غرض سے کامن ویلتھ کے باہر کے ملکوں کے ساتھ کئی تجارتی معاہدے کیے۔ ترقیاتی منصوبہ بندی شروع ہونے کے بعد سے ہندوستان نے چین، روس، پولینڈ، چیکوسلواکیا، ہنگری، اٹلی، ناروے اور یورپ کے اُن دوسرے ملکوں کے ساتھ دوطرفی معاہدے کیے جو ہندوستان سے چائے، جوٹ کا سامان اور گھریلو دستکاری کی پیداوار خریدنے اور اپنی بھاری مشینیں اور خام مال ہندوستان کے ہاتھ بیچنے پر آمادہ تھے جن کی ہندوستان کو اپنے منصوبوں کے لیے ضرورت تھی۔

اگرچہ ماضی میں ہندوستان نے بہت سے ملکوں کے ساتھ دوطرفی معاہدے کیے لیکن چونکہ ہندوستان G.A.T.T کا ممبر ہے اس لیے کثیرالاطراف تجارتی معاہدوں (MULTI-LATERAL) کا شدّت کے ساتھ حامی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ۲۳ ملک وِی اینا میں جمع ہوئے اور ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کا نام G.A.T.T یعنی جنرل ایگریمنٹ آن ٹریڈ اینڈ ٹارف ہے۔ اِس معاہدے میں ہندوستان بھی شامل ہے۔ اِس کا مقصد اکسپورٹ ڈیوٹی کم کرنا ہے۔ اِس معاہدے کے تحت کئی ملکوں نے ہندوستان کو رعایتیں دی ہیں اور ان کے بدلے میں ہندوستان نے اُن ملکوں کو رعایتیں دی ہیں۔ اس معاہدے میں شریک ملکوں کو ہندوستان جو مال برآمد کرتا ہے اُس میں ۵۰ فی صدی کو معاہدے کے تحت رعایت حاصل ہے۔

بحیثیت ایک کم ترقی یافتہ ملک کے جو مرکزی منصوبہ بندی کے ذریعے تیز معاشی ترقی کے لیے کوشاں ہے، ہندوستان کو اس معاہدے کی رکنیت سے کافی فائدہ ہوسکتا ہے۔ ۱۹۵۳ء میں جنیوا میں G.A.T.T کے نویں سیشن میں اِس بات پر سب نے اِتّفاق کیا کہ وہ کم ترقی یافتہ ممالک جو معاشی ترقی کے پروگرام پورے کرنے کی کوشش کر رہے تھے، مزید رعایتوں کے حقدار تھے۔ مثلاً یہ کہ انھیں اپنی درآمدات پر مقداری پابندی عائد کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ تاکہ یہ اپنے معاشی ترقی کے پروگرام پورے کرنے کے لیے زرمبادلہ کے مناسب ریزرو قائم کرسکیں۔ ۱۹۵۸ء میں G.A.T.T کے بارھویں اجلاس میں اِس بات پر عام اِتّفاق تھا کہ یورپین کامن مارکٹ کی اسکیم کے تحت ترقی یافتہ ملکوں کی ٹارف کی پالیسی سے زراعتی اور کم ترقی یافتہ ملکوں کی تجارت کو سخت نقصان پہنچے گا۔

چنانچہ تجویز کیا گیا کہ چائے، کافی، تمباکو اور شکر برآمد کرنے والے کم ترقی یافتہ ممالک درآمد کرنے والے ملکوں سے ٹیکس کم کرنے کی مشترکہ درخواست کریں۔ چنانچہ چائے برآمد کرنے والے ممالک نے درآمد کرنے والے ملکوں سے ٹارف کم کرنے کی درخواست کی لیکن ۱۹۵۹ء میں ٹوکیو میں گیٹ کے پندرھویں اجلاس کے بعد یہ خبر ملی کہ ہندوستانی مال پر درآمداتی پابندیاں رفتہ رفتہ کم کردی جائیں گی۔ مثلاً دسمبر ۱۹۵۹ء میں اعلان کیا گیا کہ مغربی جرمنی نے دو برسوں کے اندر ہندوستان کے جوٹ کے سامان پر سے برآمد کی پابندیاں ختم کرنا منظور کر لیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ناریل کے ریشے سے بنا ہوا سامان، ہینڈلوم اور دستکاری کی اشیا کو بھی رعایت دی جائیگی۔ خوشی کی بات ہے کہ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۳ء دونوں برسوں میں "گیٹ" کے ممبر ملکوں سے اپیل کی گئی کہ وہ چائے، کافی، کوکو اور اُن اشیا پر ٹارف کم کردیں جو کم ترقی یافتہ ملک انھیں برآمد کرتے تھے۔ یہ اپیل "گیٹ" کے اُس اجلاس میں کی گئی جو یہ غور کرنے کے لیے بلایا گیا تھا کہ کس طرح کم ترقی یافتہ ملکوں کی راہ سے وہ رکاوٹیں دُور کی جائیں جو اُن کی برآمداتی ترقی میں مانع ہیں۔ یہ بات اہم ہے کہ معاہدے کا نیا باب ترقی پزیر ملکوں کے زیادہ موافق ہے۔ معاہدے کی اس حصّے پر جنوری ۱۹۶۶ء میں تقریباً تمام ملکوں نے دستخط کر دیے۔ گویا یہ بات سرکاری طور سے تسلیم کر لی گئی کہ ترقی پزیر ملکوں کو نئی مصنوعات کے لیے نئی منڈیوں کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ترقی یافتہ ملکوں سے درخواست کی گئی کہ وہ ترقی پزیر ملکوں کی موجودہ برآمدات پر نئے ٹیکس یا نئی پابندیاں نہ عائد کریں۔ لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان رعایتوں کے عوض ترقی پزیر ملکوں کے لیے یہ رعایتیں دینا ضروری نہیں ہے۔ اس طرح ہندوستان کو دُہرا فائدہ ہے، ایک طرف تو "گیٹ" کے کچھ ممبروں نے ٹیکس کی جو رعایت دی ہے اُس کی وجہ سے ہندوستانی برآمدات بڑھ رہی ہیں، دوسری طرف ہندوستان کو درآمدات پر مقداری پابندی عائد کرنے کی اجازت ہے تاکہ وہ زرمبادلہ کے ریزرو کو بچا سکے۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جون ۱۹۶۷ء میں ہندوستان سمیت ۴۸ ملکوں نے جنیوا میں کینیڈی راؤنڈ کی دستاویز پر دستخط کیے۔ یہ معاہدہ دنیا کا سب سے بڑا معاہدہ ہے جس کا مقصد ٹارف کم کرنا ہے جس سے ترقی یافتہ اور کم ترقی یافتہ ملکوں کے درمیان تجارت کو بڑھاوا ملے گا۔ ہندوستان کو اُمید ہے کہ ٹارف میں کمی سے ہندوستان کو امریکہ کے ساتھ تجارت بڑھانے میں مدد ملیگی۔ امریکہ نے ٹارف میں ۵۰ فی صدی کی کمی کرنے کی پیش کش کی ہے۔ اس کمی سے ہندوستان کی جن برآمداتی اشیا کو فائدہ پہنچے گا اُن میں گرم مسالے، چمڑا اور چمڑے کی بنی چیزیں

ناریل کے ریشے سے بنی چیزیں اور قالین جیسی روایتی اشیا شامل ہیں۔

امپیریل پریفرنس کے سوال کا "گیٹ" سے قریبی تعلق ہے۔ امپیریل پریفرنس، اب جس کا نام کامن ولتھ پریفرنس ہے، اب بھی باقی ہے لیکن ہماری حکومت اس کو اس طرح استعمال کر رہی ہے کہ اس سے ہمارے ترقیاتی پروگراموں کو فائدہ پہنچے۔ یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ کامن ولتھ پریفرنس سے صنعتی ملکوں کو بہت فائدہ ہے اور زراعتی خام مال پیدا کرنے والوں کو نقصان ہے۔ اسی لیے اب تک بیشتر فائدہ برطانیہ کو پہنچا ہے لیکن جب سے ہمارے پانچ سالہ منصوبے شروع ہوئے ہیں، ہمارا ملک بھی صنعتی ملک بن گیا ہے جس کی وجہ سے حکومت کو کامن ولتھ پریفرنس کو اپنے موافق بنانے کا موقع مل رہا ہے۔

(ج) **یوریپین کامن مارکٹ، برطانیہ اور ہندوستان:** اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ برطانیہ کے یوریپین کامن مارکٹ میں شامل ہونے کا ہندوستان پر کیا اثر پڑیگا۔ یاد رہنا چاہیے کہ کامن مارکٹ ایک مخصوص قسم کا محدود حلقہ ہے جس کے ممبر فرانس، مغربی جرمنی، اٹلی، بلجیم، ہالینڈ اور لکسمبرگ ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں چھے ملکوں نے معاہدے پر دستخط کیے اور یہ حلقہ قائم کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر برطانیہ اس حلقے میں تحفظات کے بغیر اور موجودہ ٹارف میں تبدیلی لائے بغیر شامل ہوا تو ہندوستان کو نقصان پہنچے گا۔ یہ نقصان اس لیے ناگزیر ہے کیونکہ اب تک ہندوستان کا مال کسی مقداری پابندی اور امپورٹ ڈیوٹی کے بغیر برطانیہ میں داخل ہوتا ہے۔ یہ دونوں فائدے اُن فائدوں کے علاوہ ہیں جو کامن ولتھ پریفرنس کے تحت حاصل ہیں اور جن سے اب برطانیہ کو برائے نام ہی فائدہ ہے۔ اگر برطانیہ کامن مارکٹ میں شامل ہوتا ہے تو ہندوستان کے مال کو نہ صرف ٹیکس کی رعایت ملنا بند ہو جائے گی بلکہ اس پر یورپی ملکوں کے مال کے مقابلے میں زیادہ ڈیوٹی عائد ہوگی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ چائے، کافی، سوتی کپڑوں اور جوٹ کے سامان کو سخت نقصان پہنچے گا اور یہی ہماری اصل برآمدات ہیں۔ دوسری طرف اکسپورٹ سے آمدنی کم ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے اپنے ترقیاتی پروگرام کے مصارف پورے کرنا مشکل ہو جائیگا۔ اب تک یہ بات واضح نہیں ہے کہ برطانیہ کامن مارکٹ میں داخل ہو سکے گا یا نہیں۔ جنوری ۱۹۶۳ء میں برسیلز میں اس سلسلے میں گفت و شنید ناکام رہی۔ برطانیہ نے کامن مارکٹ میں داخلے کی دوبارہ درخواست کی اور مئی ۱۹۶۷ء میں پھر بات چیت ہوئی لیکن جون ۱۹۶۸ء تک فرانس برطانیہ کے ساتھ چھے ملکوں کا جلسہ بلانے کی مخالفت کرتا رہا اور اس طرح اس نے برطانیہ کی درخواست پر گفت و شنید نہ ہونے دی۔

لیکن چند ماہ بعد اس سلسلے میں بات کچھ آگے بڑھی کہ برطانیہ کی درخواست پر غور کرنے کا کیا طریقہ ہو۔ آئیے دیکھیں کہ برطانیہ کے داخلے کا ہندوستان پر کیا اثر پڑیگا۔

کامن مارکٹ کے چھے ملکوں سے ہندوستان جو مال درآمد کرتا ہے وہ برطانیہ سے کچھ زیادہ ہے۔ لیکن جہاں تک برآمدات کا سوال ہے، ہندوستان ان ملکوں کو جو مال بھیجتا ہے وہ برطانیہ بھیجے جانے والے مال کے ½ سے کچھ کم ہے۔ اِس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کا مال برطانیہ میں کسی ڈیوٹی اور پابندی کے بغیر داخل ہوتا ہے لیکن کامن مارکٹ کے ملکوں میں اِس مال پر ڈیوٹی لگتی ہے اور کوٹے کی بھی پابندی ہے۔

برطانیہ کی منڈی اگر ہندوستان کے لیے اسی طرح موافق رہتی جیسی اب ہے تو بھی کامن مارکٹ ممالک اور ہندوستان کے درمیان تجارتی خلا کا پُر کرنا مشکل ہوتا۔ لیکن برطانیہ سے ملنے والی رعایتیں نہیں باقی رہیں گی۔ چھے ملکوں کے کلب میں ساتواں ممبر یعنی برطانیہ جب داخل ہوجائیگا تو کامن ولتھ کے دوسرے ملکوں کے ساتھ برطانیہ جانے والے ہمارے مال پر بھی ڈیوٹی لگے گی۔ ساتھ ہی برطانیہ کو جو مال یورپ کے ممالک اور ان کے شریک افریقی ممالک بھیجتے ہیں اُس پر ڈیوٹی ختم ہو جائیگی۔ چنانچہ کامن ولتھ پریفرنس جو اس وقت تو ہندوستان کے موافق ہے لیکن اس وقت صورت بالکل اس کے برعکس ہو جائیگی۔ اِس میں شک نہیں کہ ہندوستان کو بہت سی یقین دہانیاں دی گئی ہیں کہ یہ تبدیلیاں کافی لمبی مدّت پر پھیلادی جائیں گی اور کامن ولتھ تجارت کے لیے خاص تحفظات ہوں گے لیکن اب تک کی گفت وشنید سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحفظات بہت محدود ہونگے اور عبوری دَور آٹھ سال سے زیادہ لمبا نہیں ہوگا۔

مسئلے کی اصل بنیاد یہ ہے کہ ہندوستان اور دو ایک دوسرے ترقی پزیر ملکوں کو چھوڑ کر کامن ولتھ کے باقی ممبر مطمئن ہوجائیں گے اگر برطانیہ کے ساتھ ان کی موجودہ تجارت برقرار رہے یا اسی کے بقدر ان کے مال کی نکاسی کے دوسرے راستے نکل آئیں۔ کامن مارکٹ کے چھے ملک صرف اتنی ہی بات پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہیں اور اِس میں سے بھی کتنا وہ تسلیم کرینگے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

ہندوستان کا مسئلہ بالکل مختلف ہے۔ ظاہر ہے ہندوستان جتنی بھی تجارت برطانیہ کے ساتھ باقی رکھ سکے وہ تو رکھنا ہی چاہیے لیکن وہ کافی نہیں ہے۔ موجودہ تجارت سے زیادہ اہم تجارتی امکانات ہیں۔ ہندوستان کو اپنے موجودہ معیار زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی برآمد

اگلے دس برسوں میں دوگنی کرنی چاہیئے۔

دُوسرا پلان اور زرمبادلہ کا بُحران

پہلے پلان کے دوران زرمبادلہ کے کوئی بہت مشکل مسائل نہیں تھے۔ اِس پلان کے پہلے سال کوریا کی لڑائی سے پیدا ہونے والی خوشحالی کی وجہ سے برآمداتی آمدنی کافی بڑھ گئی۔ پلان کے پہلے تین برسوں میں ابتدائی مشکلات کی وجہ سے پلان کی رفتار سست رہی اور فولاد کے کارخانوں اور دوسری بھاری صنعتوں کے قیام میں تاخیر ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منصوبے کے مطابق جتنی تیزی سے سرمایہ لگنا چاہیے تھا وہ نہیں لگا اور اس مقصد کے لیے بیرونی زرمبادلہ جو ہم نے حاصل کیا تھا وہ نہیں استعمال کر سکے۔ حتیٰ کہ ہم وہ اسٹرلنگ بھی نہیں استعمال کر سکے جو استعمال کے لیے آزاد کیے گئے تھے۔ اپریل ۱۹۵۱ء میں پلان شروع ہوتے وقت توقع تھی کہ پلان کے پانچ برسوں میں ۲۹۰ کروڑ کے بقدر زرمبادلہ کی ضرورت ہوگی لیکن زراعتی پیداوار میں کافی اضافے، ترقیاتی مصارف کی سستی اور ضروری درآمدات پر کنٹرول کی وجہ سے تجارتی خسارہ کم ہوا اور ہم نے صرف ۱۲۱ کروڑ کے بقدر زرمبادلہ استعمال کیا۔ اِس طرح زرمبادلہ کے ریزرو میں ۹۵، کروڑ روپیے پھر بھی بچ رہے۔

دوسرے پلان میں ہم نے کچھ زیادہ جوش اور حوصلے کا اظہار کیا چونکہ اِس پلان میں بھاری صنعتوں پر خاص تاکید تھی اِس لیے ظاہر تھا کہ پلان کو کامیاب بنانے کے لیے بھاری مشینیں اور سامان بڑی مقدار میں درآمد کرنا پڑیگا۔ پلان بناتے وقت یہ بھی اندازہ تھا کہ جب تک ترقیاتی پروجکٹ مکمل نہیں ہوتے اور بھاری صنعتوں کی بنیاد نہیں پڑتی اس وقت تک برآمدات میں زیادہ اضافہ کرنا ممکن نہ ہوگا چنانچہ تخمینہ تھا کہ دوسرے پلان کے دوران برآمدات کے مقابلے میں درآمدات ۵،۱۳۱ کروڑ کے بقدر زائد ہونگی۔ اِس میں سے ۲۲۵ کروڑ غیر مرئی آمدنی سے پوری کی جا سکیں گی اور اِس طرح ۱۱۰۰ کروڑ کی کمی رہے گی۔ اسٹرلنگ ریزرو سے ۲۰۰ کروڑ روپیے ملنے تھے اور ۱۰۰ کروڑ نجی سرمائے کی شکل میں۔ اِس طرح بحیثیت مجموعی زرمبادلہ کا خسارہ ۸۰۰ کروڑ تھا [۱۱۰۰ − (۲۰۰ + ۱۰۰)]۔

۵۷-۱۹۵۶ء کے دوران بھاری مشینوں کی درآمد بڑے پیمانے پر ہوئی لیکن برآمدات میں اِس کے مطابق اِضافہ نہ ہوا جس کی وجہ سے تجارتی توازن میں خسارہ رہا۔ ۵۷-۱۹۵۶ء میں درآمدات ۱۰۷،۷ کروڑ تک پہنچ گئیں جبکہ برآمدات صرف ۶۳،۷ کروڑ ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ اِس خلا کو پُر کرنے کے لیے زرمبادلہ کے ریزرو سے رقم نکالنی پڑی۔ صورت بگڑتی گئی اور زرمبادلہ پر دباؤ تیزی سے بڑھتا رہا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے پلان کے ابتدائی ڈیڑھ برس میں ریزرو بینک کے زرمبادلہ کے اثاثے میں ۲۹۲ کروڑ کی کمی واقع ہو گئی۔ اگر مونٹری فنڈ سے ۹۵ کروڑ نہ ملتے تو یہ کمی ۳۹۱ کروڑ تک پہنچ جاتی جو اس متوقع ۴۰۰ کروڑ کا ۳/۴ ہو گئی ہے جو پورے پلان کی مدت کے لیے فرض کی گئی تھی۔ درحقیقت ظاہر یہ ہوا کہ زرمبادلہ کے خرچ کی شرح جو ۱۹۵۶ء میں ۱۵ سے لے کر ۲۰ کروڑ تک تھی ۱۹۵۷ء میں بڑھ کر ۴۰ سے ۴۵ کروڑ تک پہنچ گئی۔

زرمبادلہ کے ریزرو میں اِتنی کمی کے پیش نظر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے۔ زرمبادلہ میں اِتنی تیزی سے کمی واقع ہونے کی بنیادی وجہ ضرورت سے زیادہ حوصلہ مند پلان تھا۔ سرمایہ لگانے کی مجوزہ شرح غیر معمولی اُونچی تھی۔ چنانچہ دوسرے پلان کے پہلے سال بھاری مشینوں کی درآمد بہت تیز کرنی پڑی۔ ریزرو بینک کے اعداد و شمار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے پلان کے آخری سال درآمد کیے گئے بھاری مال کی بیرونی قیمت پہلے پلان کے مقابلے میں ۱۰ فی صدی سے ۱۶ فی صدی تک زیادہ تھی۔ اِس کا سبب نہر سویز کا بحران اور بیرونی ممالک میں قیمتوں کا عام اضافہ تھا۔ اِس سب پر طرّہ یہ ہوا کہ نجی حلقے نے دوسرے پلان کے آخری برسوں میں پیدا ہونے والے زرمبادلہ کے بحران کا اندازہ کر کے اُس سامان کی خریداری پہلے ہی سے شروع کر دی جس کی ضرورت انھیں اگلے پلان کے شروع میں پڑنے والی تھی۔ یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ اگر حکومت نے مطالبات کی اِسکریننگ کا مؤثر انتظام نہ کیا ہوتا تو درآمد کیے ہوئے لوہے اور فولاد کا بڑا حصّہ مکانات اور بڑی عمارتیں بنانے میں لگ جاتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے پلان کے پہلے سال نجی حلقے نے جو مشینیں درآمد کیں اس میں سے کافی سامان اِیرکنڈیشننگ اور ریفریجریشن کا رہا ہو۔ اِس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ زرمبادلہ کے بحران کا بنیادی سبب یہ تھا کہ ترقیاتی کاموں کے لیے درآمدات بھاری مقدار میں کی گئیں کیونکہ یہ سرکاری اور نجی دونوں حلقے کی توسیع اور ترقی کے لیے ضروری تھیں۔ درآمد کی جانے والی اشیا میں بیشتر بھاری مشینیں تھیں جن کی وجہ سے زرمبادلہ کے ریزرو پر غیر معمولی دباؤ پڑا۔

اتنا ہی اہم ایک دوسرا سبب یہ تھا کہ ہمیں اچانک اناج کی درآمد بڑھانی پڑی۔ ہمارے ملک میں آبپاشی کی سہولتوں اور دوسری ترقی کے باوجود اناج کی پیداوار مانسون کے رحم و کرم پر ہے۔ اگر پیداوار میں ۵ فی صدی کی کمی ہو گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اناج میں ۳۰ لاکھ ٹن کی کمی ہو گئی۔ ۱۹۵۷ء میں یہی ہوا۔ یہ اناج باہر سے منگانے کی وجہ سے زرمبادلہ کا بحران اور بڑھتا ہے۔

اِس سلسلے میں درج ذیل اعداد شمار کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۲۲۸ کروڑ روپے کا اناج درآمد کیا گیا۔ ۱۹۵۵-۵۶ء میں صرف ۲۹ کروڑ کا اناج درآمد ہوا یعنی ۱۹۵۱-۵۲ء کے مقابلے میں ۲۰۰ کروڑ روپے کم۔ ۱۹۵۶-۵۷ء میں اناج کی درآمد میں پھر اضافہ ہوا اور درآمدات کا بل ۱۵۲ کروڑ ہوگیا۔ اِس طرح اناج کی درآمد کی سطح نہ صرف توازن ادائیگی کو غیر مستحکم بناتی ہے بلکہ زرمبادلہ کے بحران کا بھی اہم سبب ہے۔

اِس بحران میں پلان کے باہر کے مصارف کا بھی کافی ہاتھ ہے مثلاً بحری اور ہوائی فوج کی بڑھتی ہوئی ضرورت کے سلسلے میں دفاعی مصارف میں اضافہ۔ دوسرے پلان کے پہلے دو برسوں میں کچھ ایسے مصارف بھی تھے جو پچھلے پلان میں ہونے چاہیے تھے۔ بھاری صنعتوں اور بجلی کے کچھ ایسے پروجکٹ تھے جو پہلے پلان کے دوران نہیں شروع کیے جاسکے یا مکمل نہ ہوسکے۔ اِن پروجکٹوں کو دوسرے پلان کے شروع میں جلدی جلدی شروع یا مکمل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اِن مصارف کی وجہ سے رواں پلان میں زرمبادلہ کا دباؤ کافی بڑھ گیا۔ اس کے علاوہ پلان کے پہلے دو برسوں میں بڑھی ہوئی درآمدات کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ معیشت کی بنیادی سطح پر کچھ امدادی سرمایہ لگانا پڑا جس کی مناسب گنجائش پلان بناتے وقت نہیں رکھی گئی تھی۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ صنعتی حلقے کی منصوبہ بند ترقی کے ساتھ کچھ چھوٹی صنعتوں اور غیر ملکی یونٹوں کی بھی ترقی ہوگی اور یہ بھی اپنی استعداد بڑھائیں گے۔ ان کی وجہ سے بھی مشینوں اور خام مال کی درآماتی طلب بڑھے گی۔

زرمبادلہ کے بحران کی ایک ضمنی اور کم اہم وجہ معیشت کے اندر کی بڑھتی ہوئی وہ صَرفی طلب بھی ہوسکتی ہے جو دیسی پیداوار سے پورے طور پر نہیں پوری ہوسکی تھی کیونکہ دیسی صنعتوں کا بیشتر انحصار گھریلو اور دیہی صنعتوں پر تھا۔ دوسرے پلان کے جائزے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کھادی اور ہینڈلوم کی پیداوار نشانے سے کم تھی۔ دوسرا پلان تیار کرتے وقت امبر چرخے پر بہت بھروسہ کیا گیا تھا۔ یہ توقع غلط ثابت ہوئی جس سے ثابت ہے کہ بھاری امداد کے باوجود دیہی صنعتوں کے لیے صَرفی اشیا کی پیداوار مقررہ نشانوں تک پہنچانا بہت مشکل تھا۔ مثلاً دوسرے پلان کے پہلے سال امبر چرخے سے صرف ۳ کروڑ ۴۵ لاکھ مربع گز کپڑا تیار کیا گیا جبکہ پلان میں اوسط سالانہ پیداوار ۶ کروڑ مربع گز رکھی گئی تھی۔ شہروں کی طرف رجحان زیادہ ہونے اور آبادی بڑھنے کی وجہ سے دوسرے پلان کے دوران خصوصاً ابتدائی برسوں میں صرفی طلب میں نمایاں اضافہ ہوا۔ یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اناج کی قلت دور کرنے کے لیے کافی مقدار میں اناج باہر سے منگانا پڑا۔

اس کے علاوہ ۵۷-۱۹۵۶ء کے ابتدائی چھ مہینوں میں سرکاری کنٹرول اور لائسنس کے ضابطوں کے باوجود کافی مقدار میں غیر ضروری اشیا درآمد ہوئیں۔ بعد میں حکومت نے امپورٹ کنٹرول کی کو ڈور کیا اور تیار مال کی درآمد پر سخت پابندی عائد کی۔ غرضیکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زرمبادلہ کے خسارے کی ایک وجہ صرفی اشیا کی بڑھی ہوئی طلب بھی تھی

مختصر یہ کہ دوسرے پلان کے دوران زرمبادلہ کا بحران بنیادی طور سے ترقیاتی درآمدات کی اونچی شرح کا نتیجہ تھا۔ ان میں بھاری مشینوں کو سب سے اہم جگہ حاصل تھی۔ پلان کے باہر کے اخراجات اناج کی بڑھی ہوئی درآمد ضروری صرفی اشیا اور تیار مال کی بڑھتی ہوئی طلب نے اس بحران کو اور بھی شدید کر دیا۔

زرِمبادلہ کی قلّت اور سرکاری اقدام (نئی گولڈ پالیسی)

دوسرے پلان کے پہلے سال کی سرگرمیاں ختم ہوتے ہی معیشت پر شدید دباؤ اور تناؤ محسوس ہونے لگا۔ جولائی ۱۹۵۷ء میں زرمبادلہ کا ریزرو پست ترین سطح پر پہنچ گیا۔ اگست ۱۹۵۷ء کے شروع میں ریزرو بینک کے اشوڈ پارٹمنٹ میں غیر ملکی سیکیورٹیوں کی رقم گھٹ کر ۳۷۵،۵۲ کروڑ پر آگئی جس نے حکومت کو ریزرو بینک کی کم سے کم کرنسی ریزرو کی قانونی حد چھ ماہ کے لیے گھٹانی پڑی۔ چنانچہ یہ حد ۴۰۰ سے گھٹا کر ۳۰۰ کروڑ کر دی گئی۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو راشٹرپتی نے ایک آرڈیننس جاری کیا جس کے ذریعے ریزرو بینک ایکٹ میں ترمیم کرکے زرمبادلہ کے ریزرو میں بھاری کمی کی گئی۔ ترمیم کے تحت ریزرو بینک کو کرنسی کی پشت پناہی کے لیے مجموعی طور سے ۲۰۰ کروڑ روپے کی کم سے کم ریزرو رکھنا تھا جس میں سے کم از کم ۱۱۵ کروڑ روپے سونے کے سکّوں یا سونے کی شکل میں ہونا ضروری تھا۔ اب تک ریزرو بینک کے ترمیمی ایکٹ ۱۹۵۶ء کی دفع ۳۳ کے تحت غیر ملکی سیکیورٹیوں اور سونے کی الگ الگ کم سے کم حدیں مقرر تھیں۔ بینک کو اپنے اشو شعبے میں ۱۱۵ کروڑ سونے کی شکل میں اور ۴۰۰ کروڑ غیر ملکی سیکیورٹیوں کی شکل میں رکھنے پڑتے تھے۔ مجبوری کی حالت میں سیکیورٹیاں ۴۰۰ کے بجائے ۳۰۰ کروڑ ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ آرڈیننس کا مجموعی اثر یہ پڑا کہ ریزرو میں سونے کا حصہ برقرار رہا لیکن غیر ملکی سیکیورٹی کی مؤثر کم سے کم حد ۸۵ کروڑ ہو گئی۔ حکومت یہ جرأت مندانہ فیصلہ اس وقت بھی کر سکتی تھی جب اگست ۱۹۵۷ء میں اس نے ریزرو بینک کو چھ ماہ کے لیے قانونی کم سے کم ریزرو

کی سطح ۴۰۰ سے گھٹا کر ۳۰۰ کروڑ کرنے کی اجازت دی تھی۔

یاد رہے کہ ہندوستان جیسی مائل بہ ترقی معیشت کو سونے اور غیر ملکی سیکیورٹیوں کی شکل میں کچھ ریزرو کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِس ریزرو کی ضرورت کرنسی کے پھیلاؤ کی پشت پناہی کے لیے بھی ہوتی ہے اور ترقیاتی مقاصد کے لیے مخصوص رقم کی حیثیت سے بھی۔ ایک ترقی پزیر معیشت میں سنٹرل بینکنگ کا بنیادی اصول مناسب ریزرو بنانا ہوتا ہے۔ جسے ترقی کے عمل کو جاری اور ہموار رکھنے کے لیے استعمال کیا جائے۔ ریزرو کے قاعدوں میں بار بار اور بنیادی تبدیلیاں لانے سے نہ صرف ساکھ بگڑ جاتی ہے بلکہ ترقیاتی عمل پر بھی خراب اثر پڑتا ہے خواہ یہ تبدیلیاں ہنگامی صورت کی وجہ سے لائی گئی ہوں۔

حکومت کو ایک بہت پیچیدہ مسئلہ درپیش ہے۔ یہ مسئلہ صرف زرمبادلہ کی قلت ہی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کی ایک وجہ قیمتوں میں بے حد اضافہ بھی ہے۔ چونکہ حکومت نہایت ثابت قدمی سے اِس مسئلے سے دست و گریباں ہے اِس لیے ہمیں درآمدات اور برآمدات کے محاذ پر توجہ مرکوز کرنا چاہیے اور ساتھ ہی حکومت کی سونے سے متعلق نئی پالیسی کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔

ایسا لگتا ہے کہ جون ۱۹۶۶ء میں روپے کی قیمت گھٹانے کے بعد بھی بھاری مشینوں اور غیر ضروری اشیا کی درآمد کی اجازت نہیں دی جائے گی لیکن خام مال اور ضروری کل پرزوں کے لیے کافی زرمبادلہ فراہم کیا جائیگا تاکہ خام مال کی قلت موجودہ پیداواری استعداد کے پورے استعمال میں مانع نہ ہو۔ اگر ہندوستان نسبتاً کم مدت میں اپنی برآمدات بڑھانے کا خواہشمند ہے تو اُسے اپنی پیداوار کے ایک حصے کو اندرونی منڈی سے ہٹا کر بیرونی منڈی کی طرف منتقل کرنا ہوگا۔

اکتوبر ۱۹۶۲ء میں چینی جارحانہ حملے کے بعد حکومت نے ہنگامی صورت حال کی روشنی میں زرمبادلہ کی قلت کا تجزیہ کیا اور نومبر ۱۹۶۲ء اور جنوری ۱۹۶۳ء کے درمیان سونے کی بابت نئی پالیسی کا اعلان کیا تاکہ لوگوں کا سونا رکھنے کا شوق کم ہو۔ پہلے تو گولڈ بانڈ جاری کیے گئے تاکہ ملک کے سونے کا ذخیرہ مستحکم بنایا جاسکے۔ لوگ یہ بانڈ خرید سکتے تھے جن کی مدت ۱۵ برس تھی اور جن پر ۶ فی صدی سود تھا۔ جو سونا ان بانڈوں پر لگایا جاتا تھا اُس کی قیمت مونٹری فنڈ کی مقرر کردہ شرح سے متعین کی گئی یعنی ۶۲ر۵ روپے فی تولہ یا ۵۳ر۵۸ روپے فی ۱۰ گرام۔ دوسرے حکومت نے سونے کی پیشگی خرید و فروخت سارے ملک میں ممنوع قرار دے دی تاکہ سونے کی بنیاد پر ہونے والی سٹے کی خرید و فروخت روکی جاسکے۔ تیسرے یہ کہ ۹ جنوری ۱۹۶۳ء کو حکومت نے بہت دلیرانہ قدم اُٹھایا

اور ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت گولڈ کنٹرول آرڈر نافذ کر دیا۔ اس آرڈر کے تحت زیورات کے علاوہ سونا ڈکلیر کیے بغیر رکھنا جرم قرار دیا گیا۔ آرڈر میں یہ بھی کہا گیا کہ آئندہ جو بھی زیورات ملک میں بنیں وہ ۱۴ کیرٹ گولڈ سے زیادہ کے نہ ہوں چاہے وہ موجودہ زیورات کو توڑ کر ہی بنائے گئے ہوں۔ اگر کسی کے پاس ۵۰ تولے سے زیادہ سونا ہے (زیورات کے علاوہ) تو وہ اس آرڈر کے اجرا کے ایک ماہ کے اندر حکومت کو اس کی اطلاع کرے۔ تخمینہ تھا کہ اعلان سے قبل لوگوں کے پاس ۰۰۰ ...۱۴ کروڑ روپے کا سونا تھا لیکن صرف ۱۴ کروڑ کے غیر زیوراتی سونے کا اعلان معینہ مدت کے اندر کیا گیا۔

ہمارے ملک میں سونے کی مانگ بے حد ہے کیونکہ ہماری عورتوں کو سونے سے بڑا لگاؤ ہے۔ بلیک مارکٹ کرنے والے اور رشوت خور اپنی غیر قانونی آمدنی کو جلد از جلد سونے میں تبدیل کر لینا چاہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بڑھتی ہوئی قیمتوں کے دور میں سونے میں لگا ہوا روپیہ زیادہ محفوظ ہے کیونکہ سونے کی قیمت زیادہ تیزی سے بڑھے گی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سونے کی اتنی مانگ اور اونچی قیمت کی وجہ سے سونے کی اسمگلنگ نفع بخش ہو جاتی ہے اور اسمگلنگ کی وجہ سے زرمبادلہ کی صورت اور خراب ہو جاتی ہے۔ اگر ایک بار کسی طرح ملک میں سونا چوری سے لے آیا جائے تو کھلے بازار میں اس کا بیچنا بہت آسان ہے ورنہ اس کی شکل بدلی جا سکتی ہے۔ تاکہ معلوم ہو کہ یہ سونا ملک میں پہلے سے موجود تھا۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ لوگوں سے ان کے موجودہ سونے کا اعلان کرنے کو کہا جائے تاکہ وہ اسمگل کیے ہوئے سونے میں نہ شمار ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی توقع تھی کہ اگر سونے کے زیورات کی طلب کم ہو جائے تو بازار میں سونے کی قیمت گھٹ کر بین الاقوامی سطح پر آجائے گی اور اس وقت اسمگلنگ خود بخود بند ہو جائے گی۔

بدقسمتی سے یہ توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ حکومت کی سونے کی پالسی سونے کی قیمت کو نہیں کنٹرول کر سکی کیونکہ جن لوگوں کے پاس سونا تھا وہ اسے اپنے پاس سے الگ یا کم کیرٹ کے زیورات میں تبدیل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ سونے کی پالسی کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عام چیزوں کی گرانی نے سونے کی قیمت بڑھا دی تھی۔ ۱۴ لاکھ سناروں کی بحالی ایک بہت بڑا مسئلہ تھی۔ اس کے علاوہ بے چینی صرف سناروں میں ہی نہیں تھی بلکہ عام لوگ بھی ناراض تھے۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۶۳ء میں حکومت نے گولڈ کنٹرول میں نرمی کا اعلان کیا۔ نئی ترمیم کے تحت خود روزگار سنار (SELF EMPLOYED) سونے کے موجودہ زیورات کو جو ۱۴ کیرٹ سے زیادہ کے

تھے انھیں ۱۴ کیرٹ کے زیورات میں بدل سکتے تھے۔ مختلف سمتوں سے دباؤ پڑنے کی وجہ سے حکومت کو گولڈ کنٹرول آرڈر میں مزید ترمیم کرنی پڑی اور ۲ نومبر ۱۹۶۶ء سے بکنے بھی کیرٹ گولڈ کے زیورات بنانے کی اجازت دے دی گئی۔ نئے قانون کے تحت وہ افراد جن کے پاس سونے کے زیورات ۲۰۰۰ گرام کے اوپر تھے یا وہ خاندان جن کے پاس ۴۰۰۰ گرام سے اوپر سونے کے زیورات تھے انھیں ان کی تفصیل حکومت کو دینی تھی۔ اِن اقدام سے مصیبت زدہ سناروں کو کافی مدد ملی۔

ترقیاتی منصوبہ بندی کے دوران ریاستی تجارت

تیز ترقی کی غرض سے ترقیاتی منصوبہ بندی نے ہماری حکومت کو آمدنی کے مزید وسائل کے لیے ہر امکانی کوشش کرنے پر مجبور کیا۔ عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ ترقیاتی منصوبہ بندی کے عمل کے دوران افراطِ زر کی صورت میں سرکاری آمدنی بڑھانے کے لیے حکومت اشیائی تجارت کر سکتی ہے۔ جو لوگ سرکاری تجارت کے حق میں ہیں وہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اشیا پر ٹیکس لگانے کے مقابلے میں سرکاری تجارت بہتر ہے خصوصاً اس صورت میں جب سرکاری تجارت کا مقصد اس بڑھتے ہوئے منافع کو پُر کرنا ہو جو اشیا کی قیمت طلب اور قیمت رسد میں منصوبہ بند رسد کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہو۔ ٹیکس کی بدلتی ہوئی شرح پر مبنی مالیاتی پالیسی بدلتے ہوئے خلا کے مطابق جلد نہیں ڈھالی جاسکتی۔ ٹیکس پالیسی کی اِس خامی کی وجہ سے نجی تاجر قیمتوں کے بڑھنے کے زمانے میں خوب نفع کماتے ہیں۔

قیمت طلب اور قیمت رسد کے خلا کو سرکاری تجارت آسانی سے پُر کر سکتی ہے کیونکہ حکومت عموماً طلب اور رسد دونوں کی صورت حال سے واقف ہوتی ہے اور خلا کو پُر کرنے کے لیے قیمتوں میں مناسب ردوبدل کر سکتی ہے۔ اِس طرح سرکاری تجارت ایک پس ماندہ ملک میں حوصلہ مند منصوبہ بندی کا اہم جُز ہوتی ہے۔ افراطِ زر کی صورت میں سرکاری تجارت کے ذریعے قیمت رسد کو قیمت طلب کے مطابق بنایا جا سکتا ہے اور اس طرح حاصل ہونے والے منافع کو ترقی کے کاموں میں لگایا جا سکتا ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ جنوری ۱۹۶۵ء سے فوڈ کارپوریشن اناج کی خرید و فروخت اور ذخیرہ بنانے میں سرگرمی کے ساتھ مصروف ہے۔

آزادی کے بعد سے حکومت نے سرکاری تجارت کے سوال کو کافی اہمیت دی ہے۔ اِس مسئلے پر دو کمیٹیوں نے غور کیا۔ پہلی کمیٹی جس کے چیرمین ڈاکٹر دیش مکھ تھے ۱۹۴۹ء میں مقرر ہوئی۔

اس کمیٹی نے سفارش کیا کہ حکومت اناج اور مصنوعی کھادسے متعلق اپنے کام ایک قانونی ادارے کے سپرد کر دے جس کا نام اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن ہو۔ دلیش مکھ کمیٹی نے یہ بھی تجویز کیا کہ اس وقت حکومت کے مختلف شعبے تجارتی قسم کی درآمد اور برآمد کا جو کام کرتے ہیں وہ بھی اس کارپوریشن کے سپرد کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ کارپوریشن مشرقی افریقہ کی روئی کی درآمد اور چھوٹے ریشے کی روئی اور گھریلو صنعتوں کی مصنوعات کی برآمد کا کام بھی کر سکتی ہے۔ کمیٹی کی رائے تھی کہ سرکاری تجارت کا یہ جواز کہ اس سے حکومت کی آمدنی بڑھائی جا سکتی ہے صرف اس وقت قابل غور ہو سکتا ہے جب زیر بحث اشیا ریاستی تجارت کے لیے موزوں ہوں۔ بہ ہر حال کمیٹی کا خیال تھا کہ آمدنی بڑھانے کی غرض سے بعض آسائشات کو ریاستی تجارت کے تحت لایا جا سکتا ہے جن کی قیمت عام طور سے اونچی رہتی ہے۔

دوسری کمیٹی کے چیرمین مسٹر کرشنا مورتی تھے۔ اس کمیٹی نے پہلے پلان کے دوسرے مرحلے میں ریاستی تجارت کے مسئلے پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ عالمی منڈی کی بدلتی ہوئی حالت کے پیش نظر اناج، روئی اور کھاد کی برآمد ٹریڈنگ کارپوریشن کے لیے کرنا ضروری نہیں تھا۔ بہر حال ہینڈلوم اور گھریلو صنعتوں کی بعض پیداوار کی برآمد کے لیے ٹریڈنگ کارپوریشن کے قیام کی سفارش کی۔ اس طرح دونوں کمیٹیاں محدود سرکاری تجارت کے حق میں تھیں۔

۱۹۵۳-۵۴ء کے ٹیکس انکوائری کمیشن نے بھی سرکاری تجارت کے مسئلے پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ریاستی تجارت کے لیے مخصوص تجارتی تجربہ رکھنے والے عملے کی ضرورت تھی اور یہ کہ اس سے کوئی بہت شاندار نتائج برآمد ہونے کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔ کمیشن کی رائے تھی کہ اس وقت کی سرکاری مشینری ریاستی تجارت کے بوجھ کو نہ اٹھا سکے گی۔ کمیشن کا یہ بھی خیال تھا کہ ریاستی تجارت کی توسیع کا بہترین موقع وہ ہوتا ہے جب قیمتیں عام طور سے چڑھ رہی ہوں۔ موجودہ صورت میں ریاستی تجارت کو زیادہ پھیلانا مناسب نہیں ہے۔

مئی ۱۹۵۶ء میں اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن بالکل سرکاری ادارے کی حیثیت سے قائم ہوا۔ اب کارپوریشن ۵ کروڑ کے سرمائے کا مجاز ہے۔ ۱۹۵۶-۵۷ء میں بیباق سرمایہ ایک کروڑ تھا جو ۱۹۵۸-۵۹ء میں دو کروڑ ہو گیا۔ مئی ۱۹۵۶ء میں اپنے قیام کے وقت سے کارپوریشن ہندوستان کی برآمدات بڑھانے اور بہتر قیمت پر ضروری اشیا درآمد کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کارپوریشن نے بڑی مقدار میں اشیا کی خریداری کی ہے اور بہت سی ضروری اشیا کی تقسیم کا بھی کام کیا ہے

مثلاً سیمنٹ، سوڈا ایش، کاسٹک سوڈا، خام سِلک، مصنوعی کھاد، جپسم، پاؤڈر ملک، رنگائی کا سامان، کافور، پارہ اور اخباری کاغذ۔ خریداری کی مقدار اور وقت کے تعین میں اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ رسد میں رکاوٹ نہ پڑے اور ملک میں اشیا کی پیداوار کے لیے حالات موافق رہیں۔ کارپوریشن نے جن اشیا کی برآمد کا انتظام کیا ہے ان میں خام لوہا اور مینگنیز، خام جوٹ، جوتے، دستکاری کا سامان، نمک، کپڑے، چائے، کافی اور اونی سامان شامل ہے۔ جولائی ۱۹۶۰ء میں حکومت نے کارپوریشن کے سپرد یہ بھی کام کیا کہ وہ سیمنٹ درآمد کرے اور اُسے ایسی قیمت پر تقسیم کرے کہ ملک کے ہر اسٹیشن پر اس کی قیمت یکساں ہو۔ حال میں کارپوریشن نے کان کے مالکوں اور برآمد کرنے والوں کے ساتھ مل کر مینگنیز کی برآمد کا انتظام بہت کامیابی کے ساتھ کیا۔ ۶۳-۱۹۶۲ء میں کارپوریشن نے چھوٹی صنعتوں کی پیداوار بڑھانے میں مدد دینے کی ایک اسکیم شروع کی۔ ۶۷-۱۹۶۶ء سے کارپوریشن نے غیر روایتی اشیا کی برآمد شروع کی۔ مثلاً ریلوے ویگن، بجلی کے بلب، روشنی کا آرائشی سامان، پی۔ وی۔ سی تار، سائیکل کے پُرزے اور اسپرین۔ یہ چیزیں پہلے کبھی نہیں برآمد کی گئی تھیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ۶۹-۱۹۶۸ء میں کارپوریشن نے ۸۴ کروڑ کا مال برآمد کیا۔

کارپوریشن کی براہِ راست اور بالواسطہ تجارت بحیثیت مجموعی ۵۷-۱۹۵۶ء میں ۹ کروڑ تھی جو بڑھ کر ۶۶-۱۹۶۵ء میں ۱۵۶٫۴۴ کروڑ ہو گئی۔ اس میں سے ۱۰۱٫۵ کروڑ کی براہِ راست تجارت اور ۵۴٫۹ کروڑ کی بالواسطہ تجارت تھی۔ یہ بات بڑی امید افزا ہے کہ کارپوریشن کی براہِ راست تجارت ۶۸-۱۹۶۷ء میں ۱۶۰ کروڑ تھی جو پچھلے سال کے مقابلے میں ۵۸٫۵ کروڑ زیادہ ہے۔

۵۹-۱۹۵۸ء سے کارپوریشن بہت بڑے اور قیمتی ٹھیکے لینے میں کامیاب رہا ہے اور اُسے کچھ منافع بھی ہے۔ برآمدات کے میدان میں معدنیات کی برآمد کو منظم اور مستحکم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہی کارپوریشن کے برآمداتی کاروبار کا بڑا حصہ رہی ہے۔ کارپوریشن نے ہندوستان کے بنے جوتوں، مشین کے پُرزوں، کیمیاوی اشیا، عمدہ سِلک کی اشیا، اونی کپڑوں اور دستکاری کی چیزوں کے لیے نئی منڈیاں بنائی ہیں۔ سیمنٹ، اخباری کاغذ، پارہ، کافور، رنگائی کا سامان، خام سلک، ٹکسٹائل مشین، صنعتی کیمیاوی اشیا، مکھن نکلے دودھ کا پاؤڈر، نائلان کا دھاگہ، سویابین آئل، فوٹوگرافی کا سامان، کاسٹک سوڈا اور سوڈا ایش جیسی اشیا کی درآمد کا ایسا انتظام کیا ہے جس میں کفایت ہو۔ اُن ملکوں کے ساتھ تو جہاں سرکاری ادارے کاروبار کرتے ہیں کارپوریشن نے اپنی برآمد اور درآمد کو بڑھایا ہی ہے، لیکن ساتھ ہی جاپان، امریکہ، ترکی، سوئٹزر لینڈ، ہانگ کانگ،

انڈونیشیا، سیلون، مغربی اور مشرقی جرمنی جیسے ملکوں کے ساتھ بھی تجارتی تعلقات قائم کیے گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کارپوریشن برآمد کے میدان میں نمایاں کام انجام دے رہا ہے۔ ہندوستان کو زرمبادلہ کی شدید قلت کا سامنا ہے اور اُسے برآمدات کی ترقی اور درآمدات پر پابندی کی پالیسی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ برآمدات کو ترقی دینے اور منتخب اشیا براہِ راست برآمد کرنے کے علاوہ کارپوریشن کو خاص احتیاط برتنی چاہیئے جو بنیادی اہمیت کے ترقیاتی پروجکٹوں کے کام آتی ہیں۔ یہ اِس لیے کہ ان اشیا کی رسد بروقت اور یقینی ہونی چاہیے جو شاید نجی تجارت نہ کر سکے۔ یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ ترقیاتی منصوبہ بندی کے دوران جب قیمتیں بڑھ رہی ہوں، ریاستی تجارت کے دو مقاصد ہوتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے منسلک ہیں: ایک مقصد حکومت کی آمدنی بڑھانا ہوتا ہے تاکہ ترقیاتی پروگرام پورے ہو سکیں اور دوسرا مقصد درآمد برآمد کو صحیح راستے پر ڈالنا ہوتا ہے تاکہ انھیں مستحکم بنایا جائے۔ اِن باتوں کے پیشِ نظر سرکاری تجارت کے نظام اور اُس کی تنظیم کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

باب ۲۲

داخلی تجارت اور نقل وحمل

داخلی تجارت کا مختصر جائزہ

خارجی تجارت کے مقابلے میں ہماری داخلی تجارت کا حجم بہت زیادہ ہے لیکن داخلی تجارت کی ساخت اور اُس کے حجم کا تخمینہ اِس لیے مشکل ہے کیونکہ کافی اور معتبر اعداد وشمار دستیاب نہیں ہیں۔ ریل سے جانے والے مال اور بینک کلیرنس (CLEARANCE) سے صرف موٹے طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ بہت سا مال بیل گاڑیوں سے بھی لے جایا جاتا ہے۔ آزادی سے پہلے نیشنل پلاننگ کمیٹی کی ایک ضمنی کمیٹی نے جو خیال ظاہر کیا تھا اُس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ کمیٹی کا خیال تھا کہ ۱۹۳۹ء میں ہماری داخلی تجارت ۷۰۰۰ کروڑ سے کم نہیں تھی (۱۹۳۸ء میں خارجی تجارت ۵۰۰ کروڑ تھی)۔ آزادی کے بعد جب سے ترقیاتی منصوبہ بندی شروع ہوئی تو بڑھی ہوئی معاشی سرگرمی کی وجہ سے داخلی تجارت کافی بڑھ گئی ہے۔

ہماری داخلی تجارت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ۶۰ فی صدی مال کی آمد ورفت تجارتی مراکز اور بندرگاہوں کے درمیان ہوتی ہے اور باقی ۴۰ فی صدی لین دین اندرونی منڈیوں میں ہوتا ہے۔ تجارتی مراکز اور بندرگاہوں کے درمیان مال کی اتنی زیادہ آمد ورفت کی وجہ ہمارے ریلوے سسٹم کی ناہمواری ہے۔ ریلیں جب شروع ہوئی تھیں اس وقت بنیادی مقصد دُور افتادہ اندرونی علاقوں کو بندرگاہوں سے جوڑنا تھا۔ اِس کے علاوہ ریلوے محصول بھی اسی خیال کے پیشِ نظر مقرر کیا گیا تھا کہ اس سے بندرگاہوں اور اندرونی مراکز کے درمیان باربرداری میں اِضافہ ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی بہت ناہموار رہی۔ بندرگاہوں کی خوشحالی خوب بڑھی اور یہ

کثیر الآباد تجارتی مراکز بن گئے۔ دوسری طرف اندرونی اضلاع پس ماندہ رہے اور ان کی حالت بہت خراب ہوگئی۔ بہ ہر حال پانچ سالہ منصوبوں کے دوران نقل وحمل، رسل ورسائل اور بینکنگ کی منصوبہ بند ترقی کی وجہ سے ہماری داخلی تجارت کی متوازن ترقی ہو رہی ہے۔

ذرائع نقل وحمل اور ترقیاتی منصوبہ بندی

صنعتی پروگرام پر مبنی معاشی ترقی کے پلان کی کامیابی کے لیے نقل وحمل اور رسل ورسائل کا اچھا انتظام بہت ضروری ہے۔ ماضی میں نقل وحمل اور رسل ورسائل کی ترقی میں تجارت اور انتظامی سہولتوں کا سب سے زیادہ خیال رکھا جاتا تھا لیکن ترقیاتی منصوبہ بندی شروع ہونے کے بعد سے نقل وحمل کو تیز صنعتی ترقی کی ضروریات کے پیشِ نظر ترقی دی جا رہی ہے۔

پہلے پلان میں بنیادی کام اُس اثاثے کی حتیّ الامکان بحالی تھی جس پر دورانِ جنگ غیر معمولی دباؤ پڑا تھا۔ پہلے پلان میں نقل وحمل اور رسل ورسائل کے لیے ۵۷ کروڑ رکھے گئے تھے لیکن صرف ۵۲۲ کروڑ واقعی خرچ ہو سکے۔ دوسرے پلان میں نقل وحمل خصوصاً ریلوے کی توسیع بڑے پیمانے پر رکھی گئی تھی۔ اِس کام کے لیے ۱۳۸۵ کروڑ (یعنی پبلک سکٹر کے مجموعی اخراجات کا ۲۹ فی صدی) تجویز تھے لیکن ان کاموں پر واقعی صرف ۸ر۱۲۹۹ کروڑ تھا۔ تیسرے پلان میں اِن مدات پر اخراجات کے لیے ۱۴۸۶ کروڑ کی رقم فراہم کی گئی تھی لیکن تیسرے پلان کے منظور شدہ پروگرام کی لاگت ۱۶۲۰ کروڑ تھی۔ تیسرے پلان کے پانچ برسوں میں واقعی مصارف ۱۹۲۵ کروڑ تھے۔ چوتھے پلان کے مسودے میں نقل وحمل اور رسل ورسائل کے لیے ۳۱۷۳ کروڑ تجویز ہیں جس میں ۲۶۵۰ کروڑ مرکزی حلقے کے لیے اور ۵۲۳ کروڑ صوبائی منصوبوں کے لیے ہیں۔

ریلوے

پچھلے ۱۰۶ برسوں میں جب سے ہندوستانی ریلوے وجود میں آئی اس نے بہت نمایاں ترقی کی ہے۔ پہلی ریلوے لائن اپریل ۱۸۵۳ء میں کھولی گئی لیکن اس نے واقعی کام ۱۸۶۳ء سے شروع کیا۔ ۱۸۵۳ء اور ۱۹۶۷ء کے درمیان ریلوے لائن کی لمبائی ۳۲ کیلومیٹر سے بڑھ کر ۵۹۰۷۵ کیلومیٹر پر پہنچ گئی۔ ہندوستانی ریلوے ۱۸۵۳ء میں نجی کاروبار کی حیثیت سے بہت معمولی پیمانے پر شروع ہوئی تھی اور اب ۶۷-۱۹۶۶ء میں یہ سب سے بڑا قومی کاروبار ہے جس میں

۶۰۴۴ کروڑ کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ ملک میں مجموعی طور سے مال جتنا لایا لے جایا جاتا ہے اُس میں سے ۸۰ فی صدی باربرداری اور ۷۰ فی صدی مسافروں کی آمد و رفت ریلوں کے ذریعے ہوتی ہے۔

۱۸۵۳ء سے ریلوے لائن کی تعمیر اور اس کا انتظام برطانوی کمپنیوں نے کیا ہے اور حکومت ان کے منافع کی ضامن رہی ہے۔ ملک کے بعض حصوں میں خود حکومت نے بھی ریلوے لائن بنائی اور ریلیں چلائیں۔ ۱۹۲۱ء میں اکورتھ کمیٹی (ACWORTH) نے سفارش کی کہ ریلوے کا انتظام رفتہ رفتہ سرکار کے ہاتھ میں لے آیا جائے۔ ۱۹۲۵ء سے قومیانے کا عمل شروع ہوا جو اگلے ۲۰ برسوں میں مکمل ہوا۔ ۱۹۴۴ء کے ختم تک ہندوستانی ریلوے پورے طور پر قومی ملکیت بن گئی۔

آزادی کے بعد سے محسوس کیا گیا کہ مؤثر انتظام اور تال میل کے لیے ہندوستانی ریلوے کی نئی حلقہ وار تنظیم ضروری تھی۔ اس سے کام، انتظام کی بہتری اور مالیاتی کنٹرول میں کفایت کی توقع تھی۔ اپریل ۱۹۵۱ء سے اکتوبر ۱۹۶۶ء تک حلقوں کی ترتیب مکمل کر لی گئی۔ اب ریلوے کے مندرجہ ذیل حلقے ہیں:

(۱) سدرن ریلوے میں ایم، ایس، ایم، ایس، آئی اور میسور اسٹیٹ ریلوے شامل ہیں ان کا ہیڈ کوارٹر مدراس ہے۔

(۲) ویسٹرن ریلوے میں بی، بی، سی، آئی، سوراشٹر کچھ راجستھان جے پور ریلوے شامل ہیں۔ ان کا ہیڈکوارٹر بمبئی ہے۔

(۳) سنٹرل ریلوے، جی، آئی، پی، سندھیا اور دھولپور ریلوے پر مشتمل ہے۔ اس کا ہیڈکوارٹر بمبئی ہے۔

(۴) ناردرن ریلوے میں ای، پی، جودھپور بیکانیر اور ای، آئی، آر کے تین اوپری ڈویژن شامل ہیں۔ اس کا ہیڈکوارٹر دہلی ہے۔

(۵) ایسٹرن ریلوے۔ اس میں ای، آئی، آر کے بقیہ ڈویژن شامل ہیں۔ اس کا ہیڈکوارٹر کلکتہ ہے۔

(۶) نارتھ ویسٹرن ریلوے۔ او، ٹی، آسام ریلوے کا کچھ حصہ اور بی، بی، سی، آئی کا فتح گڈھ ڈسٹرکٹ شامل ہے۔ اس کا ہیڈکوارٹر گورکھپور ہے۔

(۷) نارتھ ایسٹ فرنٹیئر ریلوے۔ یہ آسام ریلوے کے بقیہ حصے اور او، ٹی، آر کے بقیہ حصے پر مشتمل ہے۔ ہیڈکوارٹر پانڈو (آسام) ہے۔

(۸) ساؤتھ سنٹرل ریلوے میں سنٹرل ریلوے کے شولاپور اور سکندر آباد ڈویژن اور سدرن ریلوے کے ہبلی اور وجے واڑا ڈویژن شامل ہیں۔ ہیڈکوارٹر سکندر آباد ہے۔

(۹) ساؤتھ ایسٹرن ریلوے بنگال ناگپور ریلوے پر مشتمل ہے۔ اس کا ہیڈکوارٹر کلکتہ ہے۔

شروع میں حلقہ وار تقسیم کی وجہ سے کچھ مشکلات اور کام میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں، لیکن دشواریاں رفع ہوگئیں اور بڑے پیمانے کے انتظام کی کفایت ظاہر ہونا شروع ہوگئی ہے اور ریلوے سے منافع بڑھ رہا ہے۔ اس حلقہ بندی کی وجہ سے کام کی دُہراہٹ دُور ہوگئی ہے اور ریلوے کی مالی حالت میں استحکام آیا ہے۔ ملک بھر میں کرایہ اور مسافروں کے لیے سہولتیں یکساں طور سے مہیا کی جا رہی ہیں۔

پہلا پلان شروع ہونے کے دس برس پہلے سے ریلوے پر بڑا بوجھ پڑ رہا تھا چنانچہ پہلے پلان میں ریلوے کی بحالی اور رولنگ اسٹاک اور قائم اثاثے کو جدید بنانے کے کام کو ایک دوسرے سے منسلک کر دیا گیا لیکن پلان کا مقصد ریلوے کے نظام کو زراعت اور صنعت کی ترقیاتی ضروریات کے مطابق بنانا تھا۔ مسافروں کے لیے زیادہ سہولتوں اور کارکنوں کے لیے بہتر رہائشی انتظام اور اُن کی فلاح و بہبود کے لیے وسائل فراہم کیے گئے۔ پہلے پلان میں ان مقاصد کو پورا کرنے کی برابر کوشش کی گئی۔

پہلے پلان میں ریلوے پروگرام کے لیے ۴۰۰ کروڑ رکھے گئے تھے جس میں سے ۱۵۰ کروڑ اخراجات فرسودگی تھے۔ لیکن واقعی خرچ ۴۲۳٫۷۳ کروڑ ہوا۔ صرف میں یہ اضافہ پلان کے آخری تین برسوں میں انجن اور ڈبوں کی خریداری بڑھا دینے کی وجہ سے واقع ہوا۔

ریلوے کے اثاثے کی بحالی اور تجدید کے علاوہ دوسرے پلان میں مزید ریلوے لائنیں بچھائی گئیں اور انجنوں اور ڈبوں کی تعداد بڑھائی گئی تاکہ معیشت کے مختلف سکٹروں میں پیداوار بڑھنے کی وجہ سے ریلوے کی بڑھتی ہوئی ضرورت پوری کی جاسکے۔ دوسرے پلان میں ریلوے سے متعلق نشانے متعین کرتے وقت اس بات کی کوشش کی گئی کہ زراعت، کوئلے، خام معدنیات، لوہے اور فولاد، سیمنٹ، کھاد، بھاری اور ہلکی مشینوں اور صرفی اشیا کے نشانوں اور ریلوے کے نشانوں میں ہم وقتی اور ہم آہنگی قائم ہو۔ دوسرے پلان میں ریلوے کی ترقی کے لیے ۹۰۰ کروڑ روپے فراہم کیے گئے۔ اس کے علاوہ مصارف فرسودگی کے لیے ۲۲۵ کروڑ رکھے گئے۔ توقع یہ کی گئی کہ اس میں

سے ۱۵۰ کروڑ ریلوے اپنی آمدنی میں سے لگائیگی اور باقی ۷۵۰ کروڑ مرکزی حکومت کی عام آمدنی سے ملیں گے۔

دوسرے پلان کے پہلے سال کا کام پورا ہونے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ ریلوے کے متعینہ پروگرام پورے کرنے کے لیے مزید وسائل کی ضرورت ہوگی۔ ریلوے بورڈ نے دوبارہ تخمینہ تیار کیا اور دوسرے پلان کے ترقیاتی کاموں کو مکمل کرنے کے لیے ۹۰۰ کروڑ کے بجائے ۱۴۸۰ کروڑ روپے طلب کیے۔ لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے ۵ر۱۱۲۱ کروڑ کی منظوری مل سکی۔ اس ۵ر۱۱۲۱ کروڑ میں سے ۵۰۰ کروڑ خود ریلوے نے فراہم کیے۔ اس رقم میں سے ۲۲۰ کروڑ اثاثے کی بحالی پر صرف ہوئے۔ ۸۰۰ میل کی نئی مجوزہ لائن میں سے ۶۱۵ میل پوری ہوسکی۔ بقیہ پر کام تکمیل کی آخری منزل میں ہے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۶۱ء تک بحیثیت مجموعی ۶ر۸۷۶ کروڑ روپے، یعنی مجوزہ رقم کی ۸۰ فی صدی خرچ ہو چکے تھے۔

سڑکوں کی ترقی اور روڈ ٹرانسپورٹ

ترقیاتی منصوبہ بندی کے عمل کے دوران روڈ ٹرانسپورٹ کا رول بہت اہم ہوتا ہے کیونکہ صنعتی ترقی تیزی سے عمل میں آتی ہے۔ روڈ ٹرانسپورٹ کی ترقی سے صنعتی کاروبار کو محنت کے وہ وسائل دستیاب ہو جاتے ہیں جن تک پہلے رسائی نہیں تھی۔ اس طرح حاصل وسائل کو مجتمع کرنے اور انھیں کام سے لگانے میں مدد ملتی ہے۔ روڈ ٹرانسپورٹ کی ترقی کی وجہ سے دُور افتادہ دیہی علاقوں کی علیحدگی دور ہوتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان جیسے کم ترقی یافتہ ملک میں جہاں تیز معاشی ترقی کی کوشش کی جارہی ہے روڈ ٹرانسپورٹ کو مخصوص اہمیت دینا ضروری ہے۔ شاہراہوں کے قومی نظام تیار کرتے وقت ہمیں صرف نئی سڑکوں اور شاہراہوں کی تعمیر پر نہیں دھیان دینا چاہیے بلکہ موجودہ سڑکوں کی دیکھ بھال اور مرمت کا بھی انتظام کرنا چاہیے۔ شاہراہوں کے نظام کو اگر ٹھیک سے ترقی دی جائے اور اُن کی دیکھ ریکھ کی جائے تو مجموعی خرچ میں کفایت ہوگی جو ہمارے جیسے ملک کے لیے مفید ہے جہاں ترقیاتی منصوبہ بندی کی راہ میں مالی وسائل کی کمی حائل ہے۔ روڈ ٹرانسپورٹ کی ترقی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دیہی علاقوں کو اسی کے ذریعے کھولا جاسکتا ہے اور ملک کے عوام میں اتحاد پیدا کیا جاسکتا ہے جو ہمارے پانچ سالہ منصوبوں کی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔

ملک میں لمبی دُوری کا ٹریفک بحیثیت مجموعی ۲۰ کروڑ ٹن تھا۔ اس میں سے ریلوے نے دوسرے پلان کے ختم تک ۱۰ کروڑ ٹن مال ڈھونے کا منصوبہ بنایا تھا۔ مجموعی مصارف ۱۴۸۰ کروڑ تجویز تھے۔ ملک کے لیے اتنا روپیہ فراہم کرنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ ۱۱۲۱ر۵ کروڑ روپے پلاننگ کمیشن نے منظور کیے۔ منظور شدہ رقم خرچ کرکے ریلوے ۶۱-۱۹۶۰ء تک ۱۶ کروڑ ٹن مال ڈھونے کے لائق ہو سکی جو نشانے سے ۴ کروڑ ٹن کم تھا۔ صورت صرف یہی تھی کہ کم سے کم خلا کو پُر کرنے کے لیے لمبی دُوری کے روڈ ٹرانسپورٹ کو ترقی دی جائے۔ اس سب کے لیے سڑکوں کی مناسب ترقی ضروری ہے۔

۱۹۴۳ء میں ناگپور میں ہونے والی چیف انجینیروں کی کانفرنس میں اس حقیقت کو پہلی بار تسلیم کیا گیا کہ سڑکوں کی ترقی اقتصادی ترقی کی پہلی شرط ہے۔ اس کانفرنس نے سڑکوں کی ترقی کا ایک پلان مرتب کیا جسے ناگپور پلان کہتے ہیں۔ اس پلان میں سڑکوں کو چار درجوں میں تقسیم کیا گیا (۱) نیشنل ہائی ویز یا قومی شاہراہیں (۲) اسٹیٹ ہائی ویز یا صوبائی شاہراہیں (۳) ضلعوں کی چھوٹی بڑی سڑکیں اور (۴) گاؤں کی سڑکیں۔ پلان میں موجودہ سڑکوں کی دیکھ بھال اور مرمت اور نئی سڑکیں بنانے کا پروگرام شامل تھا۔ اس میں چاروں قسم کی سڑکوں کی منصوبہ بند ترقی دس برسوں میں تجویز کی گئی تھی۔

ناگپور پلان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ترقی یافتہ دیہی علاقے کا کوئی بھی گاؤں بڑی سڑک سے ۵ میل سے زیادہ کی دوری پر نہ ہو اور دوسرے علاقوں کے گاؤں بڑی سڑک سے ۲۰ میل سے زیادہ فاصلے پر رہیں۔ مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں نے ناگپور پلان کی بنیادی باتیں تسلیم کرلیں۔ مرکزی حکومت نے یکم اپریل سے قومی شاہراہوں کی ذمّہ داری سنبھال لی جن کی لمبائی ۱۲۴۰۰ میل تھی۔ مرکزی حکومت نے سڑکوں کی ترقی کا پانچ سالہ منصوبہ تیار کیا جس کے تحت ۸۰ ہزار میل لمبی سڑکوں کی تعمیر اور دیکھ بھال پر ۱۲۰ کروڑ روپے خرچ ہونے تھے۔

سڑکوں کی ترقی سے متعلق جو پروگرام پہلے اور دوسرے منصوبوں میں شامل کیا گیا تھا وہ ناگپور پلان پر مبنی تھا۔ پہلے پلان کے دوران ہماری کارگزاری خاصی امید افزا رہی۔ پلان کے ابتدا میں ہندوستان میں ۹۷۰۰۰ میل لمبی پکّی اور ۱۴۷۰۰۰ میل لمبی کچّی سڑکیں تھیں۔ پلان کے دوران ۱۰۰۰۰ میل لمبی پکّی اور ۲۰۰۰۰ میل معمولی سڑکوں کا اضافہ کیا گیا۔

دوسرا پلان زیادہ متحرک اور حوصلہ مند تھا جس میں ملک کے نظامِ نقل و حمل کی بڑی اہمیت

تھی اور سڑکوں کو قومی ضروریات پوری کرنے میں نمایاں رول ادا کرنا تھا۔ چنانچہ دوسرے پلان میں سڑکوں اور روڈ ٹرانسپورٹ کی ترقی کی مد میں پہلے پلان کے ۱۴۷ کروڑ کے مقابلے میں ۲۴۲ کروڑ روپے رکھے گئے۔ تیسرے پلان میں اس کام کے لیے ۲۵۰ کروڑ روپے فراہم کیے گئے جس میں ۲۹ کروڑ کا وہ قرض شامل تھا جو انڈسٹریل ڈیولپمنٹ اسوسیئیشن سے لیا گیا تھا۔ ۶۱-۱۹۶۰ء میں ناگپور پلان کا تجویز کردہ نشانہ پورا کرلیا گیا جس کے مطابق ۱۲۳۰۰۰ میل لمبی پکی سڑکیں اور ۲۰۸۰۰۰ میل لمبی کچی سڑکیں بنی تھیں۔ تیسرے پلان کے ۴۰۲۰۰ کیلومیٹر پکی سڑکوں کے نشانے کے مقابلے میں ۱۹۶۴ء کے ختم تک ۳۰۲۵۰ کیلومیٹر لمبی سڑکیں بنی تھیں۔ اِس مدّت میں ۱۱۲۶۵۰ کیلومیٹر کچی سڑکوں کا بھی اضافہ کیا گیا۔ دوسرے پلان میں قومی شاہراہوں کے لیے ۵۵ کروڑ روپے رکھے گئے تھے۔ قومی شاہراہوں کے پروگرام کے تحت دوسرے پلان کے دوران ۱۲۰۰ میل لمبی ایسی سڑکیں بنی تھیں جو سڑکوں کے درمیان خلا کو پُر کرتی تھیں یا نئے موڑ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان میں ۴۶۱ میل کی وہ سڑکیں بھی شامل تھیں جن پر پہلے پلان کے آخری دنوں میں کام شروع ہو چکا تھا۔ مارچ ۱۹۵۸ء میں حکومت نے بین الریاستی ٹرانسپورٹ کمیشن کے قیام کا اعلان کیا۔ کمیشن کا بنیادی کام مشورہ دینا اور رابطہ قائم کرنا ہے۔ یہ بین الریاستی نقل و حمل کو منضبط کرنے اور اُس میں تال میل پیدا کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ یہ متعلقہ پارٹیوں کو آمادہ کرتا ہے کہ یہ مشترک اسکیموں پر عمل کریں اور اس طرح روڈ ٹرانسپورٹ کی ترقی میں حائل رکاوٹوں کو دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

پہلے پلان میں روڈ ٹرانسپورٹ کے اِس حصّے کے لیے جو قومی ملکیت میں لایا جا چکا تھا ۱۲ کروڑ روپے رکھے گئے تھے۔ اِس میں سے ۱۰ کروڑ روپے صرف ہو سکے۔ دوسرے پلان میں ۱۳٫۵ کروڑ فراہم کیے گئے اور صوبائی حکومتوں کو مشورہ دیا گیا کہ وہ ۱۹۵۰ء کے روڈ ٹرانسپورٹ ایکٹ کے تحت کارپوریشن قائم کریں۔ تیسرے پلان میں قومی ملکیت کے روڈ ٹرانسپورٹ کے عملے کے لیے ۲۶ کروڑ روپے فراہم کیے گئے۔ یہ عملہ پسنجر ٹریفک سے متعلق ہے۔

بحری نقل و حمل (جہاز رانی)

۱۹۴۷ء میں ری کانسٹرکشن پالیسی سب کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ ہندوستانی جہاز رانی کو ۵ سے ۷ برس کے اندر ۲۰ لاکھ گراس رجسٹرڈ ٹن کے وزن تک پہنچا دیا جائے لیکن پلان کے ختم پر ہمارے جہازی وزن میں ۵ لاکھ ٹن کا اضافہ ہو سکا۔ مارچ ۱۹۶۱ء کے ختم تک ہمارے

جہازی وزن میں ۱۹ لاکھ ٹن کا اضافہ ہوا لیکن یہ دنیا کے جہازی وزن کا صرف ۰.۵ء فی صدی تھا۔ سنہ [illegible]ء میں مرکزی حکومت نے یہ بات تسلیم کرلی کہ ساحلی تجارت صرف ہندوستانی جہازوں کے ذریعے کی جائے۔ حکومت نے تجارتی بیڑے کے عملے کی تربیت کی ذمہ داری بھی قبول کی۔ تجارتی بیڑے کے افسروں کی تربیت کے لیے ڈفرن ٹریننگ شپ کے علاوہ بمبئی میں ناٹکل اور انجینئرنگ کالج اور کلکتے میں میرین انجینئرنگ کالج قائم کیے گئے۔ جہازی وزن میں اضافے کے لیے وشاکھاپٹنم میں سندھیا نیوی گیشن کمپنی کا جہاز بنانے کا کارخانہ مارچ سنہ ۵۲ء میں خرید لیا گیا اور اُسے ہندوستان شپ یارڈ لیمیٹڈ کے سپرد کردیا گیا جس میں دو تہائی شیر حکومت کے ہیں۔ فروری سنہ ۶۵ء میں ہندوستانی حکومت نے ایک جاپانی فرم متسوبی شی (MITSOBISHI) کے ساتھ دوسرا کارخانہ کوچین میں قائم کرنے کا معاہدہ کیا۔ مکمل ہونے کے بعد اس کارخانے میں ۶۰،۰۰۰ سے ۸۰،۰۰۰ ٹن تک کے بڑے سے بڑے جہاز بن سکیں گے۔ اِس کارخانے میں اور باتوں کے علاوہ ۳۰،۰۰۰ ٹن وزن کی ایک گودی ہوگی اور ۱۵۰۰۰ ٹن وزن کا ایک شپ وے (SHIPWAY) ہوگا۔ اِس پروجکٹ پر ۲۶ کروڑ روپے خرچ کا تخمینہ ہے جس میں سے ۵ کروڑ زرِ مبادلہ ہوگا۔ اِس موقع پر یہ بھی ذکر کردینا چاہیے کہ چوتھے پلان میں کوچین شپ یارڈ کے لیے جو جاپانی تعاون سے بن رہا ہے، ۲۵ء۱۷ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔

سنہ ۵۸ء میں نیا مرچنٹ شپنگ ایکٹ بنا۔ اِس ایکٹ کے تحت اپریل سنہ ۵۹ء میں نیشنل شپنگ بورڈ قائم کیا گیا جس کا کام حکومت کو مشورہ دینا تھا۔ اِس کے علاوہ لیپس نہ ہونے والا (NON-LAPSABLE) نیشنل شپنگ فنڈ سنہ ۵۹ء کے شروع میں قائم کیا گیا۔ اعلان کیا گیا کہ یہ فنڈ قرضوں اور سرکاری امداد سے بنایا جائے گا اور جہاز رانی کی ترقی کے لیے روپے کی شکل میں وسائل کی فراہمی کا مستقل ذریعہ ہوگا۔

پہلے پلان کے شروع میں ہندوستان کے پاس ۳۹۰۷۰۷ ٹن جہازی وزن تھا۔ پہلے پلان میں ۲۱۵۰۰۰ ٹن کے اضافے کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ وزن کا نشانہ ۶۰،۰۰۰ ٹن کی فرسودگی اور بیکاری کی رعایت رکھ کر مقرر کیا گیا تھا۔ یہ نشانہ تقریباً پورا کرلیا گیا اور پہلے پلان کے ختم پر ہمارا جہازی وزن ۶۰۰۷۰۷ ٹن تھا۔ دوسرے پلان میں یہ تجویز تھا کہ ۹۰۰۰۰ ٹن کی فرسودگی کی رعایت رکھ کر ۳۰۰۰۰۰ ٹن کا اضافہ ہونا چاہیے۔ یہ بڑی اُمید افزا بات ہے کہ دوسرے پلان کے ختم پر ہمارا مجموعی جہازی وزن ۹۰۰۰۰۰ ٹن تھا۔ تیسرے پلان کا نشانہ ۱۰۴۵۰۰۰ ٹن تھا۔ یہ نشانہ

بھی پورا ہوا۔ چوتھے پلان میں ۲۵،۰۰،۰۰۰ ٹن کا نشانہ متعین کیا گیا ہے۔

پہلے پلان میں جہازرانی کے لیے ۱۹ر۵ کروڑ رکھے گئے تھے۔ بعد میں رقم بڑھا کر ۲۶ر۳ کروڑ کردی گئی۔ لیکن پلان کے دوران مجموعی مصارف ۱۸ر۷ کروڑ ہوئے۔ دوسرے پلان میں مجموعی مصارف ۵۲ر۷ کروڑ ہوئے۔ تیسرے پلان کی مجوزہ رقم ۵۲ر۷ کروڑ تھی۔ اس رقم کے علاوہ ۴ کروڑ روپے شپنگ ڈیولپمنٹ میں ملنے کی توقع ہے۔

ایر ٹرانسپورٹ (CIVIL AVIATION)

حکومت ہند نے ۱۹۲۰ء میں بمبئی، کلکتے اور رنگون کے لیے ہوائی سروس شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ہوائی اڈے کی تعمیر اور ضروری آلات اور سہولتوں کی فراہمی کا کام شروع کیا گیا۔ سول ایوئیشن ڈپارٹمنٹ ۱۹۲۷ء میں قائم ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں ٹاٹا ایرویز نے اندرونی سروس شروع کی اور ۱۹۳۸ء میں امپائر ایر میل سروس شروع ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں حکومت نے اعلان کیا کہ سول ایوئیشن کی پالیسی کا مقصد قابل اعتبار نجی کمپنیوں کے ذریعے داخلی اور خارجی سروس کی ترقی اور ہمت افزائی تھا۔ ۱۹۴۶ء میں ایر ٹرانسپورٹ لائسنسنگ بورڈ قائم کیا گیا۔

۱۹۴۷ء سے لے کر پہلے پلان کے آغاز تک ہوائی اڈوں کی ترقی اور دوسری سہولتوں کی فراہمی پر ۶ر۶ کروڑ روپے صرف کیے گئے۔ ۷ کروڑ روپے پہلے پلان کے دوران خرچ کیے گئے۔ دوسرے پلان میں جو کام شروع کیے گئے ان پر خرچ کا تخمینہ ۱۰ کروڑ تھا۔ لیکن پلان میں ۱۲ر۵ کروڑ رکھے گئے۔ تیسرے پلان میں سول ٹرانسپورٹ کی مد میں ۵۵ کروڑ روپے فراہم کیے گئے اور چوتھے پلان میں ۲۰۰۲ کروڑ تجویز ہیں۔

ہوائی سروس کو قومی ملکیت میں لانے کا کام پہلے پلان کے دوران مکمل ہوگیا۔ ۱۹۵۳ء میں دو ایر ٹرانسپورٹ کارپوریشن قائم کیے گئے۔ ایر انڈیا انٹرنیشنل اور انڈین ایرلائنز کارپوریشن۔ ان دو کارپوریشنوں نے ہندوستان کی داخلی اور خارجی ہوائی سروس کی تنظیم میں کافی کامیابی حاصل کی ہے اور توسیع کے پروگرام پر عمل کیا ہے۔ پہلے پلان میں ۹ر۵ کروڑ خرچ کی ابتدائی تجویز کے مقابلے میں دونوں کارپوریشنوں کا واقعی خرچ ۱۵ر۳ کروڑ تھا۔ دوسرے پلان میں ۱۶ کروڑ انڈین ایرلائنز کے لیے اور ۱۴ر۵ کروڑ ایر انڈیا کے لیے یعنی مجموعی طور سے ۳۰ر۵ کروڑ روپے فراہم کیے گئے۔ یہ رقم پلان کے دوران پوری خرچ کرلی گئی۔ تیسرے پلان میں ۲۹ر۵ کروڑ فراہم

کیے گئے، ۵ اکروڑ انڈین ایر لائنز کے لیے اور ۵ر۳ اکروڑ ایر انڈیا کے لیے۔
دونوں کارپوریشنوں کی ترقی پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں تک خارجی سروس کا تعلق ہے، قومی ملکیت میں لانے کا بہت معمولی اثر پڑا ہے۔ ایر انڈیا انٹرنیشنل لمیٹڈ ایک مشترک کاروبار تھا جس میں حکومت کے شیئر ۴۹ فی صدی تھے۔ ۱۹۵۳ء میں اس کو ایر انڈیا انٹرنیشنل کارپوریشن میں بدل دیا گیا۔ لیکن مشترک انتظام جیوں کا تیوں باقی رکھا گیا۔ اس سے ادارے کو فائدہ پہنچا اور اس کا انتظام ہموار اور نفع بخش طریقے سے چلتا رہا۔ دوسرے پلان کی ابتدا ایر انڈیا کے لیے سخت امتحان کا موقع تھا۔ زرمبادلہ کی شدید قلت کی وجہ سے سیر و تفریح کے لیے لوگوں کے سفر پر پابندی لگادی گئی جس کا کارپوریشن کی آمدنی پر خراب اثر پڑا۔ ۱۹۶۵ء سے پہلے کے تین برسوں میں متواتر ایر انڈیا نے ۲ کروڑ روپے سے زیادہ کا منافع کمایا اور اس کی اوسط شرح صنعت کی اوسط سے زیادہ تھی۔ لیکن ۶۶-۱۹۶۵ء میں حالات ناموافق رہے جس کا ایر انڈیا کی سروس اور اس کے منافع پر شدید اثر پڑا اور نفع گھٹ کر ۷ر۱ کروڑ ہوگیا۔
قومی ملکیت میں لانے سے قبل داخلی سروس ۹ نجی کمپنیوں کے ہاتھ میں تھی۔ ظاہر ہے کہ ان کے درمیان غیر ضروری اور نقصان دہ مقابلہ تھا۔ قومی ملکیت میں لانے کے بعد ان سب کو ملاکر ایک کارپوریشن یعنی انڈین ایر لائنز میں تبدیل کر دیا گیا جس کی وجہ سے انتظام اور سروس میں بہتری آئی اور نقصان دہ مقابلہ ختم ہونے سے مالی استحکام بھی پیدا ہوا۔ داخلی سروس کو قومی ملکیت میں لانے سے ایر روٹس کا نقشہ بہتر اور مربوط ہوگیا ہے۔ لیکن ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۷ء کے درمیان داخلی کارپوریشن کو بڑا خسارہ ہوا جس کی وجہ وہ مصارف تھے جو قومی ملکیت میں لانے کے بعد تال میل پیدا کرنے اور تیزی سے ترقی دینے کے سلسلے میں کرنے پڑے۔ اس کے بعد خسارہ رفتہ رفتہ کم ہونے لگا۔ لیکن اب یہ معلوم ہوا ہے کہ ۶۷-۱۹۶۶ء کے دوران ۶ر۴ کروڑ کے خسارے کا تخمینہ ہے۔ اس خسارے کا بنیادی سبب روپے کی قیمت میں کمی ہے جس کی وجہ سے کارپوریشن کو انشیورنس اور اسپیئر پارٹس کی قیمت زیادہ ادا کرنی پڑی۔ مئی ۱۹۶۶ء میں کارپوریشن نے کرائے میں ۱۰ فی صدی کے اضافے کا اعلان کیا۔ ۶۷-۱۹۶۶ء کے بجٹ میں ہوائی جہاز کے پٹرول اور اسپیئر پارٹس پر نئے ٹیکس کی وجہ سے یہ اضافہ ضروری تھا۔ جولائی ۱۹۶۷ء میں کرائے میں مزید اضافے کا اعلان کیا گیا۔ یہ اضافہ جو پہلی اگست سے نافذ ہوا۔ آسام کو چھوڑ کر باقی تمام حلقوں کے لیے ۱۰ فی صدی تھا۔ توقع ہے کہ اس اضافے کی وجہ سے کارپوریشن مسافروں کو بہتر سہولتیں فراہم کرسکے گا اور اس کا خسارہ

رفتہ رفتہ کم ہوجائیگا۔

قومی ملکیت میں لانے کے فائدہ مند اثرات کے ظاہر ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ ایر ڈنس کا بنیادی مربوط نقشہ بن گیا ہے، ایک مستحکم انتظامی ڈھانچہ بھی وجود میں آگیا ہے، قواعد و ضوابط بن گئے ہیں، عقلی بنیاد پر کرایوں کا تعین ہوگیا ہے، دوران پرواز سہولتیں فراہم ہیں اور جدید ہوائی جہازوں کا استعمال شروع ہوگیا ہے۔

ترقیاتی منصوبہ بندی کے تحت نقل و حمل میں تال میل (نیوگی کمیٹی رپورٹ)

تیز معاشی ترقی میں نقل و حمل کی ترقی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ متحرک معاشی منصوبہ بندی کے لیے نقل و حمل کی نہ صرف توسیع کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ مختلف قسم کے ٹرانسپورٹ کے ترقیاتی پروگرام میں تال میل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس تال میل کی وجہ سے مختلف قسم کے ٹرانسپورٹ کو ایک دوسرے سے مقابلہ کیے بغیر اپنا کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ معیشت کے مختلف حلقوں کی متوازن ترقی کے منصوبہ بند پروگرام کے لیے ٹرانسپورٹ کا ایک مربوط نقشہ اولین شرط ہے۔ قدرتی وسائل کا استحصال، زراعت کی ترقی اور صنعتی ارتقا کی تیزی، یہ تمام باتیں نقل و حمل کے ایک مربوط نظام پر منحصر ہیں۔ نقل و حمل کی ترقی کا ایک پہلو اور بھی اہم ہے۔ ہمارے جیسے کم ترقی یافتہ ملک کا عام خریدار غریب ہوتا ہے اور نئی مصنوعات کے صرف چند ہی عدد خرید سکتا ہے۔ چنانچہ بڑے پیمانے کی پیداوار صرف تب ہی ممکن ہے کہ جب زیادہ سے زیادہ خریداروں تک پہنچا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے منڈی دور تک پھیلی ہوئی ہو اور منصوبہ بند ترقی کے دوران نقل و حمل کا ایک مربوط پروگرام ہو۔

جولائی ۱۹۵۹ء میں ٹرانسپورٹ پالیسی کو آرڈنیشن کمیٹی بنائی گئی۔ اس کو نیوگی کمیٹی کہا جاتا ہے۔ اس کمیٹی کا کام ٹرانسپورٹ پالیسی کے بارے میں مشورہ دینا اور اس پالیسی کے پس منظر میں اگلے پانچ سے دس برسوں کے لیے مختلف قسم کے ٹرانسپورٹ کے رول کی وضاحت کرنا ہے۔ اس کمیٹی نے ریل روڈ کوآرڈنیشن سے متعلق تفصیلی مواد پیش کیا ہے اور ملک کے لیے لمبی مدت کی پالیسی بنانے کے پیش نظر اہم سوال اٹھائے ہیں۔ رپورٹ میں کمیٹی نے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ریلوے کو مختلف سکشنوں کی لائن کی استعداد کا منصوبہ بناتے وقت متعلقہ حلقوں میں روڈ ٹرانسپورٹ کی اس ممکن ترقی کو ذہن میں رکھنا ہوگا جو آئندہ ہوگی۔

ظاہر ہے کہ معیشت کی موجودہ منزل میں جب ذرائع نقل وحمل ترقی کر رہے ہیں، ان تمام مختلف ذریعوں میں تال میل پیدا کرنا اشد ضروری ہے۔ تال میل کا مسئلہ صرف ریلوں اور سڑکوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ریل اور سمندری نقل وحمل میں بھی تال میل اتنا ہی ضروری ہے۔ ساحلی جہازرانی سے ریلوے ٹرانسپورٹ کو مدد مل سکتی ہے۔ ان دونوں کے نظام میں ربط پیدا کرنے کے مسئلے سے کچھ اہم سوالات اٹھتے ہیں مثلاً محصول کی شرحیں، سیدھے راستوں اور محصول کی مشترک شرح کے لیے دونوں کی مشترک سروس کا قیام اور دونوں میں مقابلے کی روک تھام، تاکہ ایک ایجنسی دوسرے کے اس حلقۂ عمل میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرے جس میں وہ ایجنسی کم خرچ اور بہتر سروس دے رہی ہے۔

پلاننگ کمیشن کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ نقل وحمل کی تال میل ترقیاتی منصوبہ بندی کا لازمی جزو ہے چنانچہ اس نے پہلے پلان کے لیے نقل وحمل کا ایک مربوط پروگرام تیار کیا۔ دوسرے پلان میں بھی مختلف قسم کے ٹرانسپورٹ میں بہتر تال میل پیدا کرنے اور ان کی ہم وقت ترقی کی کوشش کی گئی۔ یہ بھی کوشش کی گئی کہ ہر قسم کے ٹرانسپورٹ کے حلقوں کے دائرۂ عمل کو ان کی موزونیت کی پیش نظر قانون اور ضوابط کے ذریعے متعین کر کے ان تمام قسموں میں رابطہ پیدا کیا جائے۔

تیسرے پلان میں ریل اور روڈ ٹرانسپورٹ اور ریل اور سمندری ٹرانسپورٹ کے درمیان تال میل پر ازحد زور دیا گیا۔ مختصر یہ کہ پانچ سالہ منصوبوں میں ہر قسم کے نقل وحمل کی زیادہ سے زیادہ ترقی اور ان میں تال میل کو مدِنظر رکھا گیا تاکہ ان میں سے ہر ایک کے سپرد وہ کام ہو سکے جس کے لیے وہ سب سے زیادہ موزوں ہوں۔ ہماری توسیع پذیر معیشت پر نقل وحمل کے اس تال میل نے گہرا اثر ڈالا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم اس بات کو پورے طور پر سمجھ گئے ہیں کہ تیز معاشی ترقی کے ساتھ نقل وحمل میں بھی منصوبہ بند انقلاب لانا ضروری ہے۔

حصّہ ۸ کا ضمیمہ

۸-ہندوستان کے زرمبادلہ کے ریزرو اور توازن ادائگی

ٹیبل نمبر ۸—۱

ہندوستان کے زرمبادلہ کے ریزرو

سال	سونا[1]	زرمبادلہ[2]	مجموعی محفوظ رقم (1+2)	پچھلے سال یا مہینوں میں گھٹ بڑھ	آئی-ایم-اف سے کشید	آئی-ایم-اف سے دوبارہ خرید
۱۹۶۱-۶۲	۱۱۷۷۶	۱۷۹۵۵	۲۹۷۳۱	-۶۳۰	۱۱۹۰۵	۶۰۷۰
۱۹۶۲-۶۳	۱۱۷۷۶	۱۷۷۳۴	۲۹۵۱۰	-۲۲۱	۱۱۹۰	-
۱۹۶۳-۶۴	۱۱۷۷۶	۱۸۸۰۵	۳۰۵۸۱	+۱۰۷۱	-	۲۳۸۰
۱۹۶۴-۶۵	۱۳۳۷۶	۱۱۵۹۲	۲۴۹۶۸	-۵۶۱۳	۴۷۶۲	۴۷۶۱
۱۹۶۵-۶۶	۱۱۵۸۹	۱۸۲۰۹	۲۹۷۹۸	+۴۸۳۰	۶۵۴۶	۳۵۷۱
۱۹۶۶-۶۷	۱۸۲۵۳	۲۹۵۹۱	۴۷۸۴۴	+۱۸۰۴۶	۸۹۲۹	۴۳۰۹
۱۹۶۷-۶۸	۱۸۲۵۳	۳۵۶۰۲	۵۳۸۵۵	+۶۰۱۱	۶۷۵۸	۴۳۲۳
۱۹۶۸-۶۹	۱۸۲۵۳	۳۹۴۱۷	۵۷۶۷۰	+۳۸۱۵	-	۵۸۵۰
اپریل ۱۹۶۸	۱۸۲۵۳	۳۶۱۹۵	۵۴۴۴۸	+۵۹۳	-	-
مئی ″	۱۸۲۵۳	۳۷۱۱۵	۵۵۳۶۸	+۹۲۰	-	-
جون ″	۱۸۲۵۳	۳۵۷۳۲	۵۳۹۸۵	-۱۳۸۳	-	-
جولائی ″	۱۸۲۵۳	۳۵۶۷۵	۵۳۹۲۸	-۵۷	-	-
اگست ″	۱۸۲۵۳	۳۵۲۸۸	۵۳۵۴۱	-۳۸۷	-	-
ستمبر ″	۱۸۲۵۳	۳۸۳۱۴	۵۶۵۶۷	+۳۰۲۶	-	-
اکتوبر ″	۱۸۲۵۳	۳۹۹۲۹	۵۸۱۸۲	+۱۶۱۵	-	--
نومبر ″	۱۸۲۵۳	۳۶۷۴۰	۵۴۹۹۳	-۳۱۸۹	-	-

دسمبر ۱۹۶۸	۱۸۲۵۳	۳۲۸۹۹	۵۱۱۵۲	-۳۸۴۱	-	۳۰۰۳
جنوری ۱۹۶۹	۱۸۲۵۳	۳۲۵۷۲	۵۰۸۲۵	- ۳۲۷	-	۲۲۸۷
فروری ״	۱۸۲۵۲	۱۸۲۵۳	۵۳۱۵۹	+۲۳۳۳	-	-
مارچ ״	۱۸۲۵۳	۱۹۳۱۷	۵۷۶۷۰	+۳۵۱۱	-	۵۶۰

۱۔ مئی ۱۹۶۶ء تک سونے کی قیمت ۸۵٫۵۳ روپے فی ۱۰ گرام لگائی گئی اور اس کے بعد سے ۸۴٫۳۹ روپے فی ۱۰ گرام۔

۲۔ ریزروبینک کا غیر ملکی اثاثہ اور بیرونی ملکوں میں سرکار کی فاضل رقم شامل ہے۔

۳۔ اضافہ (+)، تخفیف (-)۔

SOURCE: RESERV BANK OF INDIA BULLETIN MAY 1969.

ٹیبل نمبر ۸-۲

ہندوستان کا توازن ادائیگی

	جولائی-ستمبر ۱۹۶۶ء	جولائی-ستمبر ۱۹۶۷ء	جولائی-ستمبر ۱۹۶۸ء×
	کروڑ روپے		
A۔ کرنٹ اکاؤنٹ			
امپورٹ			
(الف) نجی	۱۷۸٫۵	۲۰۰٫۴	۱۹۹٫۱
(ب) سرکاری	۳۰۲٫۲	۳۰۴٫۷	۲۵۰٫۸
میزان (الف اور ب)	۴۸۰٫۷	۵۰۵٫۱	۴۱۹٫۹
برآمد F.O.B	۲۷۶٫۰	۲۹۷٫۵	۳۳۹٫۷
توازنِ تجارت	-۲۰۴٫۷	-۲۰۷٫۶	-۸۰٫۲
غیر سکہ جاتی سونے کی آمد و رفت (خالص)			
سرکاری ٹرانسفر پیمنٹ	+۲٫۴	+۳٫۸	+۱۸٫۳
دوسری غیر مرئی (خالص)	+۸٫۲	-۱۶٫۱	-۱۱٫۱

× ابتدائی

	جولائی-ستمبر ۶۶ء	جولائی-ستمبر ۶۷ء	جولائی-ستمبر ۶۸ء
		کروڑ روپے	
کرنٹ اکاؤنٹ (خالص)	−۱۹۳٫۱	−۲۱۹٫۹	−۷۳٫۰
B. فروگذاشت	+ ۱۵٫۹	− ۵٫۰	− ۵٫۸
C. کیپیٹل اکاؤنٹ			
نجی پونجی (خالص)	− ۲٫۵	+ ۶٫۰	− ۳٫۰
(الف) لمبی مدت کی	− ۳٫۲	+ ۸٫۰	− ۴٫۳
(ب) قلیل المدت	+ ۰٫۷	− ۲٫۰	+ ۱٫۳
بینکی پونجی (خالص)	+ ۲٫۰	−۸٫۲	−۲٫۹
سرکاری پونجی (خالص)	+ ۹۰٫۲	+۱۹۹٫۸	+۱۱۰٫۵
(الف) قرض	+۱۱۸٫۲	+۱۹۵٫۹	+۱۲۸٫۲
(ب) آئی۔ایم۔ایف سے دی گئی رقم	−۳۷٫۵	−	−
(ج) تخفیف قرض	−۳۹٫۱	−۴۹٫۸	−۳۸٫۴
(د) متفرق	+۴۸٫۶	+ ۵۳٫۷	+ ۲۰٫۷
کیپیٹل اکاؤنٹ (خالص)	+۹۸٫۷	+۱۹۷٫۶	+۱۴۶٫۶
D. ریزرو میں کمی (−)، بیشی (+)	−۸۸٫۵	−۲۷٫۳	+ ۲۵٫۸

SOURCE: RESERVE BANK BULLETIN . MAY 1969.

B۔ ریلوے، جہازرانی اور سول ایوئیشن

ٹیبل نمبر ۸ — ۳

۱۸۵۳ء تا ۱۹۶۷ء انڈین ریلویز کی ترقی

آمدنی خام	مصارف کار	آمدنی خالص	کیپیٹل ایٹ چارج	لمبائی میل میں	سال
۰٫۴۹	۰٫۴۱	۰٫۹۰	۳۸	۲۰	۱۸۵۳
۸۷	۱۳۳	۲۲۰	۵۳۰۰	۲۵۰۷	۱۸۶۳
۳۴۵	۳۷۸	۷۲۳	۹۱۷۳	۵۶۹۷	۱۸۷۳
۸۴۲	۷۹۷	۱۶۳۹	۱۴۸۳۱	۱۰۴۴۷	۱۸۸۳
۱۲۷۳	۱۱۳۵	۲۴۰۸	۲۳۳۱۸	۱۸۴۵۹	۱۸۹۳
۱۸۹۰	۱۷۱۱	۳۶۰۱	۳۴۱۱۱	۲۶۹۵۶	۱۹۰۳
۳۰۶۶	۳۲۹۳	۶۳۵۹	۴۹۵۰۹	۳۴۶۵۶	۱۹۱۳ — ۱۴
۳۹۳۵	۶۸۴۵	۱۰۷۸۰	۷۱۷۹۳	۳۸۰۳۹	۱۹۲۳ — ۲۴
۳۰۰۴	۶۹۵۴	۹۹۵۸	۸۸۴۴۱	۴۲۹۵۳	۱۹۳۳ — ۳۴
۸۵۲۱	۱۱۴۱۱	۱۹۹۳۲	۸۵۸۵۴	۴۰۵۱۲	۱۹۴۳ — ۴۴ [a]
۱۹۷۵	۱۶۳۹۴	۱۸۳۶۹	۷۴۲۲۰	۳۳۹۸۵	۱۹۴۷ — ۴۸ [b]
۵۰۲۳	۲۱۴۳۹	۲۶۴۶۲	۸۳۸۱۸	۳۴۰۷۹	۱۹۵۰ — ۵۱
۵۷۲۴	۲۶۱۰۷	۳۱۷۵۱	۹۷۵۵۰	۳۴۷۳۶	۱۹۵۵ — ۵۶
۸۶۵۸	۳۳۷۴۸	۴۲۴۰۶	۱۴۳۸۷۵	۳۵۲۱۳	۱۹۵۹ — ۶۰
۹۷۵۰	۳۶۱۸۸	۴۵۹۳۸	۱۵۲۷۸۳	۳۵۳۹۵	۱۹۶۰ — ۶۱
۱۰۹۹۳	۳۹۲۳۵	۵۰۲۲۹	۱۶۹۰۰۷	۳۵۴۶۸	۱۹۶۱ — ۶۲
۱۳۸۰۸	۴۳۱۱۷	۵۶۹۷۵	۱۹۰۳۶۱	۳۵۷۴۴	۱۹۶۲ — ۶۳
۱۵۹۱۰	۴۷۴۷۴	۶۳۳۸۴	۲۱۶۶۴۹	۳۵۸۹۵	۱۹۶۳ — ۶۴
۱۳۴۷۷	۵۳۱۲۷	۶۶۶۰۴	۲۴۴۱۸۹	۳۶۱۰۳	۱۹۶۴ — ۶۵
۱۳۲۸۴	۵۸۳۰۴	۷۴۶۳۱	۲۶۸۰۳۲	۳۸۷۶۴	۱۹۶۵ — ۶۶
۱۱۸۴۹	۶۹۴۸۳	۸۳۰۵۵	۲۹۹۱۵۷	۳۸۹۷۳	۱۹۶۶ — ۶۷

a- برما ریلوے ۱۹۳۷ میں الگ کردی گئی۔

b- اگست ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے بعد ۱۵ ۱۹۴۷

مندرجہ ذیل سے یہ اعداد وشمار لیے گئے :

SOURCE. (1) INDIAN RAILWAYS (ANNUAL)

(2) A REVIEW OF THE PERFORMANC OF INDIAN GOV-ERNMENT (RAILWAYS 1966)

ٹیبل نمبر ۸ — ۴

ہندوستان میں ریل کے ذریعے نقل وحمل (۱۸۷۱-۱۹۶۷)

سال	مسافروں کی تعداد (ہزار)	مسافروں سے آمدنی (لاکھ روپے)	لے جائے گئے مال کا وزن (ہزار ٹن)	باربرداری سے آمدنی (لاکھ روپے)
۱۸۷۱	۱۹۲۸۳	۲۰۲	۳۵۴۲	۴۲۰
۱۸۸۱	۵۴۷۶۴	۳۷۹	۱۳۲۱۴	۹۵۶
۱۸۹۱	۱۲۲۸۵۵	۶۸۶	۲۶۱۵۹	۱۵۶۱
۱۹۰۱	۱۹۴۷۴۹	۱۰۰۷	۳۴۳۹۲	۲۱۲۴
۱۹۱۱	۳۸۹۸۶۳	۱۸۴۹	۷۱۲۶۸	۳۲۹۳
۱۹۲۱ — ۲۲	۵۶۹۶۸۴	۳۴۲۹	۹۰۱۴۲	۴۹۵۲
۱۹۳۱ — ۳۲	۵۰۵۸۳۶	۳۱۳۵	۷۴۵۷۵	۵۸۷۳
۱۹۴۱ — ۴۲ [a]	۶۲۳۰۷۲	۳۹۶۹	۹۶۹۷۷	۸۹۶۳
۱۹۵۱ — ۵۲ [a]	۱۲۳۲۰۷۳	۱۱۱۴۲	۹۸۰۲۵	.۵۳۹۵
۱۹۵۵ — ۵۶	۱۲۹۷۴۳۱	۱۰۸۷۵	۱۱۵۲۸۳	۱۷۷۹۲
۱۹۵۷ — ۵۸	۱۴۳۱۰۵۹	۱۲۰۰۸	۱۳۳۳۶۵	۲۲۵۷۲
۱۹۵۸ — ۵۹	۱۴۴۰۹۲۰	۱۱۷۵۸	۱۳۶۵۵۹	۲۳۷۰۴
۱۹۵۹ — ۶۰	۱۵۲۸۶۰۲	۱۲۶۵۰	۱۴۵۵۳۷	۲۵۶۱۲
۱۹۶۰ — ۶۱	۱۶۱۵۸۹۴	۱۳۲۵۲	۱۵۴۸۸۹	۲۸۱۲۶
۱۹۶۱ — ۶۱	۱۷۱۲۸۳۹	۱۵۱۸۰	۱۶۱۸۸۶۰	۳۰۰۸۱

۱۹۴۲ - ۴۳	۱۷۷۰۰۲۱	۱۷۰۱۸	۱۸۰۱۳۷۹	۳۳۳۴۰
۱۹۴۳ - ۴۴	۱۸۸۸۰۳۲	۱۸۶۱۸	۱۹۳۴۴۵۸	۳۸۷۰۴
۱۹۴۴ - ۴۵	۲۰۱۴۶۱۱	۲۰۰۴۲	۱۹۵۱۱۳۷	۳۹۹۸۱
۱۹۴۵ - ۴۶	۲۱۲۰۰۱۲	۲۱۹۱۷	۲۰۴۲۳۵۶	۴۶۵۴۹
۱۹۴۶ - ۴۷	۲۳۱۲۹۱۳	۲۵۵۲۵	۲۰۲۷۱۳۹	۵۰۹۰۱

a - برما ریلوے ۱۹۳۷ میں الگ کردی گئی - b - ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے بعد

SOURCE : (1) INDIAN RAILWAYS -- ONE HUNDRED YEARS 1853 - 1953

(2) A REVIEW OF THE PERFORMANCE OF THE INDIAN GOVERNMENT RAILWAYS (1966)

(3) INDIAN RAILWAY (ANNUAL)

ٹیبل نمبر ۸—۵

سڑکوں کی ترقی

	کچی سڑکیں	پکی سڑکیں
ناگپور پلان کا نشانہ	۳۰۰۰۰۰	۱۲۳۰۰۰
یکم اپریل ۱۹۵۱ء	۱۵۱۰۰۰	۹۸۰۰۰
۳۱ مارچ ۱۹۵۶ء	۳۱۵۳۲۱	۱۲۲۰۰۰
" " ۱۹۵۸ء	۳۹۷۱۶۴	۱۲۳۶۱۰
" " ۱۹۶۱ء	۴۷۲۳۳۰	۲۳۵۷۹۰
" " ۱۹۶۶ء ×	۶۹۸۲۰۱	۲۹۴۲۰۰

× تخمینہ

SOURCE: REPORT OF THE ROAD TRANSPORT REORGANISATION COMMITTEE.

ٹیبل نمبر ۸—۶

پانچ سالہ منصوبوں میں جہاز رانی کا وزن

رجسٹرڈ ٹن (خام)	پہلے پلان کے قبل	پہلے پلان کے ختم پر	دوسرے پلان کے ختم پر	تیسرے پلان کے ختم پر
ساحلی اور ساحل سے متصل	۲۱۷۲۰۲	۳۱۲۲۰۲	۴۱۲۲۰۰	۶۹۱۳۰۰
بیرونی	۱۷۳۵۰۵	۸۳۵۰۵	۴۰۵۵۰۵	۹۰۸۷۲۷۱
ٹریمپس TRAMPS	–	–	۶۰۰۰۰	۷۰۰۰۰
ٹینکر TANKERS	–	۵۰۰۰	۲۳۰۰۰	۴۱۰۰۰
سال وج ٹگ SALVAGE TUGS	–	–	۱۰۰۰	۳۰۰۰
میزان	۳۹۰۷۰۷	۶۰۰۷۰۷	۹۰۱۷۰۷	۱۵۲۲۵۷۱

SOURCE: THIRD FIVE YEAR PLAN REPORT (1961) AND INDIAN SHIPPING (MONTHLY)

ٹیبل نمبر ۸—۷

ہندوستان میں سول ایوئیشن

سال	طے کیا ہوا فاصلہ	مسافر (ہزار)	مال (ہزار پونڈ)	ڈاک (ہزار پونڈ)
۱۹۴۸	۱۲۰۴۹	۳۳۱	۱۱۹۷۵	۱۵۸۳
۱۹۴۹	۱۵۰۹۸	۳۵۷	۲۲۵۰۰	۵۰۳۲
۱۹۵۰	۱۰۸۹۶	۴۵۳	۸۰۰۰۷	۸۳۵۶
۱۹۵۱	۱۹۴۹۸	۴۴۹	۸۷۶۶۵	۷۱۸۲
۱۹۵۲	۱۹۵۶۲	۴۳۴	۸۶۰۳۸	۸۳۷۷
۱۹۵۳	۱۹۲۰۲	۴۰۴	۸۴۸۲۰	۸۸۴۶
۱۹۵۴	۱۹۷۹۸	۴۳۲	۸۶۴۱۵	۱۰۶۳۳
۱۹۵۵	۲۱۲۶۷	۴۶۹	۹۸۲۰۰	۱۱۴۷۸
۱۹۵۷	۲۳۴۹۶	۶۱۵	۸۵۶۹۱	۱۳۰۸۱
۱۹۵۸	۲۴۵۷۸	۶۹۶	۹۳۶۴۰	۱۳۶۰۸
۱۹۵۹	۲۴۷۴۲	۷۳۶	۷۳۸۷۷	۱۵۰۴۹
۱۹۶۰	۲۶۳۶۱	۸۵۵	۸۴۲۳۰	۱۵۰۲۹
۱۹۶۱	۲۷۴۵۲	۹۷۳	۸۸۳۵۹	۱۶۲۲۸
۱۹۶۲	۲۷۷۲۱	۱۰۳۳	۲۶۲۴۲	۱۸۹۹۸
۱۹۶۳	۲۷۹۹۷	۱۱۷۶	۸۶۰۰۱	۲۱۴۷۶
۱۹۶۴	۲۸۱۰۲	۱۳۴۵	۸۵۸۸۹	۲۵۷۸۷
۱۹۶۵	۲۸۹۹۸	۱۵۲۱	۸۶۹۱۲	۲۵۹۷۸
۱۹۶۶	۳۰۴۳۸	۱۵۴۲	۸۴۶۳۴	۴۱۷۳۹
۱۹۶۷ ×	۳۲۱۰۳	۱۸۱۷	۷۶۶۱۳	۴۸۷۸۶

× تخمینہ

SOURCE: ANNUAL REPORT PUBLISHED BY THE MINISTRY OF TOURISM AND CIVIL AVIATION

مطبوعات نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا

۱۹۵۷ء میں حکومتِ ہند کی وزارتِ تعلیم نے نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے نام سے ایک بڑے اور خود مختار اشاعتی ادارے کی داغ بیل ڈالی۔ اس ادارے کا اوّلین مقصد ملک میں ایک ایسی ہمہ گیر تحریک چلانا تھا، جس کے ذریعے ہندوستان کے عوام میں کتابیں پڑھنے کا زیادہ سے زیادہ شوق پیدا کیا جائے۔ نیشنل بک ٹرسٹ کو اپنے اس مقصد کے حصول میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ یہ ادارہ اب تک سات سو سے زیادہ کتابیں ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں میں شایع کر چکا ہے ——— ان میں مندرجہ ذیل کتابیں اردو میں شایع کی گئی ہیں۔

آدان پردان

اس سلسلے کے تحت ہندوستانی زبانوں کے منتخب ادب کے ترجمے پیش کیے جاتے ہیں

گنگا چیل کے پنکھ

(ایل، این، بورا) مترجم: رضیہ سجاد ظہیر

آسام کی بدلتی ہوئی زندگی اور معاشرے کے بارے میں ایک بہت ہی دل چسپ ناول جس میں تہذیب بھی ہے اور رومان بھی!

قیمت: 6/75

برہمن لڑکی

(شری دھر ونکیٹش کیتکر) مترجم: اگر سین نارنگ

مراٹھی زبان کا ایک عظیم ناول جس میں سماج میں عورت کی حالت اور تعلیم نسواں کے موضوع کو بڑے ماہرانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

قیمت: =/7

شاعر

(تاراشنکر بندوپادھیائے) مترجم: پریمیش کمار ڈے

تاراشنکر میں کردارنگاری کی بے پناہ صلاحیت تھی، ان کی اس خوبی نے اس ناول کو بھی بنگال کا ایک عظیم و مقبول ناول بنا دیا تھا۔

قیمت: 8/75

بنگر واڑی (وی، ماڈگولکر) مترجم : عرشی ملسیانی

ایک ایسا عظیم ناول جس میں مہاراشٹر کی دیہاتی زندگی اپنی تمام دلچسپیوں اور تلخیوں کے ساتھ موجود ہے۔ قیمت : 5/25

چار دیواروں میں (ایم۔ ٹی۔ واسودیون نائر) مترجم : ظفر ادیب

کیرالا کا مٹتا ہوا معاشرہ اور نئی ابھرتی ہوئی زندگی اس ناول کی بنیاد ہے۔ زندگی کے حقائق تلخ ہوتے ہیں مگر نئی اُمیدوں کے ساتھ انہیں گھونٹ گھونٹ پینا ہی پڑتا ہے۔ قیمت : 7/75

زندگی، ایک ناٹک (پنالال، پٹیل) مترجم : کشور سلطان

گجرات میں پڑنے والے قحط پر جیتے جاگتے کرداروں کی کہانی جو اپنے پڑھنے والوں کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔ قیمت : 10/=

فاطمہ کی بکری اور بچپن کی ساتھی (ویکم محمد بشیر) مترجم : اطہر پرویز

کیرالا کے مسلم معاشرے اور زندگی کی عکاسی کے نقطہ نظر سے یہ بشیر کی بہترین تخلیق ہے۔ قیمت : 5/75

آب حیات (مولانا محمد حسین آزاد) تلخیص و مقدمہ : احتشام حسین

اُردو کی ایسی تاریخی دستاویز جس کا مطالعہ ادب کے ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے۔ قیمت : 6/75

تاش کے محل (مپال رنگنا یکما) مترجم : زینت ساجدہ

عورت ہر دور میں ہر سماج میں دبی رہی ہے، اس لیے یہ کہانی صرف آندھرا کی عورت کی نہیں بلکہ ہندوستان کی عورت کی ہے۔ قیمت : 5/50

سفید خون (نانک سنگھ) مترجم : رتن سنگھ

پنجابی زبان کے اس ناول میں زندگی کی تلخیاں اپنی پوری سچائیوں کے ساتھ پیش کر دی گئی ہیں۔ کہانی اتنی تیزی سے آگے بڑھتی ہے کہ قاری کھو کر رہ جاتا ہے۔ قیمت : 8/=

مٹتی بنتی تصویریں (بھگوتی چرن ورما) مترجم : رضیہ سجاد ظہیر

ہندی زبان کا وہ شاہکار ناول جس میں ہندوستانی سماج کے بدلتے ہوئے رجحانات کی عکاسی کی گئی ہے۔ قیمت : 5/=

ہندوستان کی مختلف زبانوں کے بہترین افسانوں کے انتخابات جن کا مطالعہ متعلقہ زبان کے ارتقا، کلچر اور تمدن کے بارے میں تفصیلی معلومات مہیا کرتا ہے

پنجابی افسانے ..... (مرتبہ : ہربھجن سنگھ) مترجم : مخمور جالندھری 7/=

هندی افسانے ...... (مرتبہ: نامور سنگھ) مترجم: اگرسین نارنگ 9/=

تامل افسانے ...... (مرتبہ: ی، پا، سوم سندرم) مترجم: حسرت سہروردی 8/=

ملیالم افسانے ...... (مرتبہ: ادم چیری این این پلے) مترجم: جیلانی بانو 8/75

اُردو افسانے ...... (مرتبہ: رضیہ سجاد ظہیر) 10/50

قومی سوانح حیات کا سلسلہ

ہندوستان کی عظیم شخصیات کی زندگی کے حالات اس سلسلے کے تحت شائع کیے جاتے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق اہم ہستیاں اس سلسلے میں شامل ہیں۔

پنڈت وشنو دگامبر ...... (وی۔ آر۔ اٹھاولے) مترجم: ش۔ قدوائی 2/25

کبیر ...... (پارس ناتھ تواری) مترجم: ایم کے درانی 2/50

گرونانک ...... (گوپال سنگھ) مترجم: مخمور جالندھری 3/25

گروگوبند سنگھ ...... (گوپال سنگھ) مترجم: مخمور جالندھری 3/=

رنجیت سنگھ ...... (ڈی۔ آر۔ سود) مترجم: مخمور جالندھری 2/75

قاضی نذرالاسلام ...... (بسودھا چکرورتی) مترجم: عرش ملسیانی 2/25

اروبندو گھوش ...... (نواجاتا) مترجم: اشفاق حسین 4/50

سوامی رام تیرتھ ...... (ڈی۔ آر۔ سود) مترجم: مخمور جالندھری 3/75

متفرق

آبادی (ایس۔ اگروال) مترجم: مخمور جالندھری

بڑھتی ہوئی آبادی ہندوستان کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے جس سے ہماری اقتصادیات اور معیشت سب سے زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ اس کتاب میں اس مسئلے کے حل بھی پیش کیے گئے ہیں۔ قیمت: 5/25

جدوجہد آزادی میں مجلس قانون ساز کا رول (منورنجن جھا) مترجم: غلام ربانی تاباں قیمت: 9/50

منتخب قومی شاعری (مرتبہ: سردار جعفری)

آزادی کے بعد اردو شاعری میں کون سے نئے موڑ آئے کن رجحانات نے جگہ بنائی؟ یہ جاننے کے لیے اس انتخاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ قیمت: 4/=

جدوجہد آزادی (ستیش چندر، املیش ترپاٹھی، برن ڈے) مترجم: غلام ربانی تاباں

یہ ہماری آزادی کی ایسی اجمالی تاریخ ہے جو بڑی احتیاط، معلومات اور سلیقے سے مرتب کی گئی ہے اور جو تحریک آزادی کے ہر پہلو کی عکاسی کرتی ہے۔ قیمت: 5/50

عظیم باغی (ڈینس کنیڈی) مترجم: پرما تماسرن قیمت: 5/50

اکبر (لارنس بنین) مترجم: رضیہ سجاد ظہیر قیمت: 6/25

کچھوا اور خرگوش (ذاکر حسین) مجلد ایڈیشن: 2/= عام ایڈیشن: 1/=